خصوصی مشترکہ شمارہ

ISSN 2279 0403

کتابی سلسلہ ۱۲-۱۱

اشاعت کا تیسرا سال

سہ ماہی

آمد

ادب کے زندہ لہو کی گردش

مدیر

عظیمہ فردوسی

مدیر اعزازی

خورشید اکبر

اردو کے ممتاز فکشن نگار شوکت حیات کی رہائش گاہ پر سلام بن رزّاق کے اعزاز میں
منعقدہ ادبی نشست اور فکشن سمینار کے موقع سے مدعوشرکاء کی دو یادگار تصویریں

دائیں سے: سلام بن رزّاق، شوکت حیات، وہاب اشرفی (مرحوم)، سلطان اختر، خورشید اکبر
پشت پر کھڑے دائیں سے: شان الرحمٰن، صفدر امام قادری اور ایم. ٹی. خان

دائیں سے: ڈاکٹر منظر اعجاز، پیغام آفاقی، خورشید اکبر اور شوکت حیات
پشت پر: غزال ضیغم، علی احمد فاطمی، غضنفر، مشتاق احمد نوری، صغیر افراہیم، طارق چھتاری
پشت پر ایستادہ: عبدالصمد (دائیں) اور مولا بخش (بائیں)

ISSN 2279 0403

ادب کے زندہ لہو کی گردش

[خصوصی مشترکہ شمارہ]

نظریاتی ادّعائیت کے خلاف

کشادہ ذہنی رویّوں [نجات پسندی] کی دستاویز

جلد : (۴) اپریل تا ستمبر ۲۰۱۴ء شمارہ: (۷،۸)

مدیر
عظیمہ فردوسی

مدیر اعزازی
خورشید اکبر

e-mail: khursheidakbar@gmail.com
Contact:09631629952 / 07677266932

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ:
آرزو منزل، شیش محل کالونی، پوسٹ آفس: گلزار باغ، عالم گنج، پٹنہ - ۸۰۰۰۰۷

☆ ازراہِ کرم بینک ڈرافٹ پر صرف Azeema Firdausi لکھیں۔
Canara Bank A/c No. 196710100912,Boring Rd,Patna
IFSC Code : CNRB0001967(For Money Transfer within India)
SWIFT Code: CNRBINBBPER(For Internatioal Banking)

Title Code : BIHBIL 00337/04/1/2012-TC
[Approved by RNI]

SEHMAAHI
AAMAD

April to September 2014

Volume : 2 Issue : 7,8

Editor
Azeema Firdausi

Honorary Editor
Khursheid Akbar

اشاعت	:	اپریل تا ستمبر ۲۰۱۴ء [مشترکہ شمارہ]
تعدادِ اشاعت	:	سات سو پچاس [۷۵۰]
زرِتعاون فی شمارہ	:	ایک سو پچاس روپے [150/=] ۲۰/ امریکی ڈالر
مشترکہ شمارہ کی قیمت	:	تین سو روپے [300/=] ۴۰/ امریکی ڈالر
زرِتعاون سالانہ [چار شمارے]	:	۶۰۰/ چھ سو روپے [بشمول رجسٹرڈ ڈاک، ہندستان میں]
برطانیہ	:	۶۰/ پاؤنڈ / امریکہ [و دیگر یوروپی ممالک]: ۸۰/ امریکی ڈالر
خلیجی و دیگر ایشیائی ممالک [بیرونِ ہند]	:	۶۰/ امریکی ڈالر / ساڑھے تین ہزار ہندستانی روپے
خصوصی معاونین / ادارہ جات سے	:	ایک ہزار روپے [سالانہ]
کمپوزنگ	:	ریاض احمد خان [دی پرنٹ زون، پٹنہ۔ موبائل: 9934610612]
طباعت	:	پاکیزہ آفسٹ، شاہ گنج، پٹنہ۔ ۸۰۰۰۰۶
سرورق	:	ذوالفقار حیدر، سبزی باغ، پٹنہ۔ ۴
قانونی مشیر	:	سیّد محمد کمال الدین، ایڈوکیٹ [پٹنہ ہائی کورٹ]

- 'آمد' کے مشمولات سے ادارہ کا متفق ہونا لازمی نہیں ہے۔
- 'آمد' سے متعلق تنازعات کی قانونی چارہ جوئی پٹنہ کی عدالتوں میں ہوگی۔
- 'آمد' ایک غیر کاروباری رسالہ ہے جس سے منسلک افراد بغیر معاوضے کے اپنی خدمات انجام دیتے ہیں۔
- ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر اور پروپرائٹر عظیمہ فردوسی نے اسے پاکیزہ آفسٹ، شاہ گنج، پٹنہ ۶ سے چھپوا کر آرزو منزل، شیش محل کالونی، عالم گنج، پٹنہ ۷ سے شائع کیا۔

کائناتِ آمد

شہرِ رحمت

● اشرف عادل

حمد

ہے سبق یہ میں نے پڑھا ہوا تری شان جلّہ جلالہٗ
ہے فلک فلک ترا دبدبہ، تری شان جلّہ جلالہٗ
مری جستجو ہے نبیؐ نبیؐ، مری آرزو ہے نبیؐ نبیؐ
کوئی پوچھے میرا سلسلہ، تری شان جلّہ جلالہٗ
تری رحمتوں کا شمار کیا، تری کائنات کا راز کیا
مری آرزو کی ہے التجا، تری شان جلّہ جلالہٗ
تری رحمتوں میں چھپی چھپی تری عظمتوں سے سجی سجی
مجھے آ رہی ہے تری صدا، تری شان جلّہ جلالہٗ
کہیں برگِ گل پہ لکھا ہوا، کہیں آبجو میں رواں دواں
کہیں چاندنی میں تری ضیا، تری شان جلّہ جلالہٗ
ہے زمین پر بھی ترا کرم، ہے نظام تیرا فلک فلک
ہے کہاں کہاں ترا سلسلہ، تری شان جلّہ جلالہٗ

● رضوان الرضا رضوان

نعت پاک

فکر ساری مسترد کردی گئی
آپ کی سیرت سند کردی گئی
امتیازِ حق و باطل ہوگیا
جب تمیزِ نیک و بد کردی گئی
خلق و کردار و شرافت دہر میں
ذاتِ احمد پر توحد کر دی گئی
لٹ رہا ہے دَر کا صدقہ صبح و شام
بادشاہت نا مزد کر دی گئی
کس نے سمجھا ہے مقامِ مصطفےٰ
صَرف سب عقل وخرد کر دی گئی
ان کی عظمت کا جو منکر ہوگیا
ہر عبادت اس کی رَد کر دی گئی
نام پر ان کے جو رضواںؔ مٹ گیا
پُرضیا اس کی لحد کر دی گئی

شہرِ مدّعا

میرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کر دے
میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کو گھر کر دے

[افتخار عارف]

" France and Britain no longer occupy centre stage in world politics ; the American imperium has displaced them. A vast web of interests now links all parts of the former colonial world to the United States , just as a proliferation of academic subspecialities divides (and yet connects) all the former philological and European-based disciplines like Orientalism. The area specialist, as he is now called, lays claims to regional expertise, which is put at the service of government or business or both........................A wide variety of hybrid representations of the Orient now roam the culture. Japan, Indonesia, China, India, Pakistan : their representations have had , and continue to have,wide repercussions, and they have been discussed in many places for obvious reasons. Islam and the Arabs have their own representations, too, and we shall treat them here as they occur in that fragmentary------yet powefully and ideologically coherent ----persistence , a far less frequently discussed one, into which, in the United States , traditional Euoropean Orientalism disbursed itself."

['Orientalism' : Edward W. Said, pub:Penguine Books,Reprint:1995, page: 285]

آمد میں تاخیر ہوئی !

● خورشید اکبر

'آمد' کا یہ شمارہ آپ تک بہت تاخیر سے پہنچ رہا ہے جس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔ اگر میں اس کے اسباب بیان کرنے لگ جاؤں تو داستان طولانی ہو جائے گی اس لیے مختصراً عرض کر دوں کہ لوک سبھا کے عام چناؤ میں بہ حیثیت ایک سرکاری ملازم کے دوڈھائی مہینے تک مسلسل مصروف رہنے کی وجہ سے 'آمد' کی ترتیب کے لیے ذرا بھی وقت نہیں نکال سکا۔ جب قدرے فرصت ملی اور تھوڑا سا اطمینان نصیب ہوا تو دفتری اوقات کے بعد کا زیادہ سے زیادہ وقت 'آمد' کی تیاری میں صرف ہوا۔ ایک اندازے کے مطابق یہ شمارہ جولائی کے آخری ہفتے تک منظر عام پر ہوتا لیکن رمضان شریف اور عید سعید کی آمد آمد سے بھی رسالہ 'آمد' کی متوقع اشاعت متاثر ہوئی۔ پھر اس کے بعد نیپال میں بھاری بارش اور زمین دھنسنے [Landslide] کی ناگہانی واردات کے سبب بہار کے سرحدی اضلاع: ارریا، سوپول، مدھے پورہ، سہرسا، کٹیہار اور کھگڑیا میں سیلاب کی خطرناک صورتِ حال پیدا ہونے سے ان علاقوں میں بہار سرکار نے ریڈ الرٹ کا اعلان کر دیا اور سبھی سرکاری افسران و ملازمین کو ریلیف کے کاموں میں لگنا پڑا۔ مگر اللہ کا شکر ہے کہ بہت جلد اس قدرتی آفت سے نجات مل گئی اس لیے کہ نیپال سرکار نے پانی کے اضافی ذخیرے کو رفتہ رفتہ خارج کرنے پر رضامندی ظاہر کی ورنہ مذکورہ ضلعوں میں ناقابلِ بیان تباہی کا اندیشہ تھا، جو فی الحال ٹل سا گیا ہے۔

اب 'آمد' کا یہ مشترکہ شمارہ: ۱۱-۱۲ آپ کے سامنے ہے جسے اردو فکشن پر وافر تخلیقی و تنقیدی مواد نیز دیگر لائقِ توجہ مشمولات کے پیشِ نظر ''خصوصی مشترکہ شمارہ'' کا نام دیا گیا ہے اور اس طرح مدتِ تاخیر کی تلافی کے لیے بھی ایک سبیل نکالی گئی ہے۔ یقین ہے کہ قارئینِ کرام اسے خوش دلی کے ساتھ گوارہ کر لیں گے اور خاکسار کو درگزر فرمائیں گے!

اس بار پرچے کی دُگنی ضخامت ۶۴۰ رصفحات پر مشتمل ہونے کے اعتبار سے مشمولات کی

گنجایش نکالی گئی ہے۔ 'شہرِ رحمت' میں جواں سال شعرا کے طور پر اشرف عادل اور رضوان الرضا رضوان پہلی بار شریک ہوئے ہیں جن کی تخلیق کردہ حمد اور نعت روایتی نوعیت کی ہوتے ہوئے بھی اپنے خاص شعری آہنگ اور معنوی انسلاکات سے پُر ہیں۔

'شہرِ نجات' کے پہلے حصے میں اردو کے ممتاز مابعد جدید نقاد ناصر عباس نیّر حسبِ سابق ایک نہایت فکر انگیز تجزیاتی مضمون کے ساتھ جلوہ افروز ہیں۔ اس سے قبل بھی ان کی ایک ایسی ہی تحریر 'وطن اور جلاوطنی' کے عنوان سے 'آمد' کے صفحات کی زینت بن چکی ہے، جو سیاہ فام افریقی ادب کے امام چنوا اچیبے کے خطبات کے تذکرے اور تفصیلی تجزیے پر مبنی تھی جسے قارئین نے پسند کیا تھا۔ اس بار انھوں نے ایڈورڈ سعید جیسے عالمی شہرت یافتہ مفکر، دانشور اور مشرقیت پسند مابعد نوآبادیاتی نقاد کے ان خطبات کو موضوعِ بحث بنایا جو انھوں ۱۹۹۳ء میں بی بی سی ریڈیو پر اس کے پہلے ڈائرکٹر جنرل لارڈ جان ریتھ کے یادگاری خطبات کے طور پر پیش کیے تھے۔ سعید فلسطینی نژاد امریکی شہری ہونے کی وجہ سے دوہری شہریت کے حامل تھے۔ اسی دوہری شہریت نے ان کی تحریر و تقریر میں 'وطن اور جلاوطنی' کے دوہرے اور متضاد بلکہ جدلیاتی تناظر کو ممکن بنایا ہے۔ ناصر عباس نیّر کے مطابق یہی ثنویت زدہ سچائی سعید کے نظامِ فکر کی اساس ہے۔ سعید نے اپنے خطبات میں کم و بیش انھی باتوں کا اعادہ یا ان میں کہیں کہیں قدرے اضافہ کیا ہے جو باتیں بنیادی مفروضات و مباحث کے طور پر ان کی شہرۂ آفاق کتابوں: 'Orientalism' [1978] اور 'Imperialism and Culture' [1993] میں شامل ہیں۔ ان خطبات میں سعید کے نظامِ فکر کی تشریح و تعبیر کے بنیادی نکات موجود ہیں جن کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ آزادی، کشادہ نظری اور جمہوریت کے سچے تقاضوں پر ان کا ایمان ہے، مغرب کی بالا دستی کے فکری اور سیاسی حربوں پر ان کی کڑی نگاہ ہے اور 'مشرقیت' [orientalism] کی مغربی تعبیرات کے منکر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اسے مغرب کی سیاسی تشکیل یا اقتداری رثقافتی بالادستی کا ایک بالواسطہ وسیلہ بھی تصور کرتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں، مابعد جدیدیت کے فلسفیانہ تضادات اور بعض ادبی انتہاؤں پر بھی ان کی گہری نظر ہے، یہی سبب ہے کہ وہ مابعد جدیدیت کے نام پر روا رکھی جانے والی لسانی فلسفہ طرازیوں کو بھی مستحسن نہیں سمجھتے۔ انھوں نے دانشورانہ اظہارات کے متعدد خصائص اور موجودہ تناظر میں ایک سچے دانشور کی شناخت بھی متعین کی ہے جس سے کسی حد تک بعض لوگوں کا اختلاف تو ہوسکتا ہے مگر اس کا مکمل انکار ممکن نہیں۔ ہر چند کہ ایڈورڈ سعید کے تمام تر فکری رویے 'جبر' کے خلاف اور 'نجات پسندی' کے حق میں ہیں لیکن انھوں نے راقم الحروف کی طرح 'نجات' کو اپنے فکری نظام کا مرکز و محور نہیں بنایا ہے یا 'نجات پسندی' کی فکری یا ادبی اصطلاح سے بحث نہیں کی ہے۔ گویا 'نجات پسندی' سے ان کے فکر و فلسفے کی مشابہت محض ایک اتفاق ہے۔

اس کے برعکس 'شہرِ نجات' کے دوسرے حصے میں افروز اشرفی 'نجات پسندی' کو ادبی اصطلاح کی بجائے 'سیاسی اسلوب طرازی' سے تعبیر کرنے پر مصر نظر آتے ہیں اور اس ضمن میں حاشیائی ادب [subalternism] کے خصوصی حوالے کے ساتھ ادب میں اشرافیہ اقدار کی بحالی کے ایجنڈے کے ساتھ رونق افروز ہیں۔ خاکسار نے ان کے اس مخصوص مراسلے پر ایک مختصر سا جوابی نوٹ چسپاں کر دیا ہے [جس کی سرے سے ضرورت نہیں تھی] تا کہ مطلع قدرے صاف ہو سکے۔ اس سلسلے میں افروز اشرفی اگر مناسب سمجھیں تو ایڈورڈ سعید کے مذکورہ خطبات یا ناصر عباس نیّر کے مضمون کی روشنی میں بھی نئے سرے سے مباحث قائم کر سکتے ہیں۔ بہر حال، ان کی تحریر کو میں ذاتی طور پر 'نجات' کی در پردہ ہم نوائی کے تناظر میں دیکھتا ہوں۔ پھر بھی 'آمد' کے قارئین پر آگے کی بحث رکھ چھوڑتا ہوں!

'شہرِ نقد و نظر' سے لے کر 'شہرِ آئینہ' تک کل اُنیس [۱۹] مضامین اور پانچ [۵] تبصرے شامل ہیں جو اس شمارے کے بھر پور ہونے کی گواہی پیش کر رہے ہیں۔ تنقید کے باب میں بھی تحریریں فکشن مرکوز ہیں۔ جوشؔ کی خود نوشت سوانح [جو فکشن سے کسی درجہ کم نہیں ہے] کی انشا پردازانہ خوبیوں اور اس میں در آئی مبالغہ آرائیوں کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر خالد علوی نے کئی اہم اور دلچسپ نکات پیش کیے ہیں، نیز چند بشری تقاضوں اور شاعرانہ غلو کو بھی منہا نہیں ہونے دیا ہے۔ ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط نے 'اردو معاشرے کو افسانہ نگاری کی دین' کے عنوان سے متعدد عمومی نکات کو نشان زد کیا ہے جہاں اصلاحی اور اخلاقی پہلوؤں کا انھوں نے خاص خیال رکھا ہے۔ اظہار خضر نے 'حاشیائی کرداروں' کی نئی تعریف متعین کرتے ہوئے اردو فکشن میں اس کے تفاعل سے بحث کی ہے اور اس ضمن میں بیدی، الیاس احمد گدی اور قرۃ العین حیدر کے بعض کرداروں کے حوالے سے اپنا نقطۂ نظر واضح کرنا چاہا ہے۔ اسی طرح کرشن چندر اور خواجہ احمد عباس پر تین مضامین کی شمولیت کا بھی خصوصی جواز یہ ہے کہ ہم اپنے ادبی اسلاف کے بے مثال کارناموں سے روشنی حاصل کرتے رہیں اور گاہے گاہے ان کی یادوں کو تازہ بھی کرتے رہیں۔ اس کڑی میں منٹو اور عصمت کا ذکر ناگزیر ہوگا۔ یہی سبب ہے کہ ان کے تعلق سے بھی مضامین شامل ہیں۔ اس طرح یہ شمارہ فکشن کے ان بڑے فن کاروں کے ذکرِ خاص سے خصوصی کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے، اس پر درجن بھر ہم عصر اور تازہ تر افسانوں کی شمولیت مستزاد۔ واضح رہے کہ آفتاب احمد آفاقی ایک طرف 'یرقان' کو جاہت کا المیہ قرار دے رہے ہیں تو دوسری طرف رحمٰن عباس کرشن چندر کے بہانے جدیدیت کی بے اعتدالیوں پر، تو اکرم پرویز منٹو تعبیر کے تناظر میں نام نہاد ترقی پسندی کو آئینہ دکھانے پر آمادہ ہیں۔ یہ تحریریں اگر آمد کے قارئین کو نئے سرے سے کچھ سوچنے پر مجبور کر سکیں تو ان کی معنویت از خود روشن ہوگی۔ صغیر افراہیم نے خواجہ احمد عباس کے منتخب افسانوں پر اچھی گفتگو کی ہے۔

وصیہ عرفانہ اور پرویز شہریار اپنے اپنے طور پر عصمت اور بیدی کے افسانوں: 'بھول بھلیاں' اور 'اپنے دکھ مجھے دے دو' کے اہم کرداروں کی نفسیاتی گتھیوں کو سلجھانے میں منہمک ہیں۔

تنقیدی مضامین کے تعلق سے 'شہرِ امکانات' کی بھی اپنی الگ اہمیت ہے حالانکہ اس سیکشن کے سبھی لکھاری نوخیزانِ ادب کی سی حیثیت رکھتے ہیں لیکن ان کی سنجیدہ فکری میں کسی کو کلام نہیں۔ ایک جانب میر کے شاعرانہ آرٹ کے متعلق نثار احمد فاروقی کی تحقیقی کاوشوں پر ساجد ذکی فہمی کے خیالات لائقِ توجہ ہیں تو دوسری جانب ڈاکٹر زیبا محمود 'تفہیمِ غالب' کی موشگافیوں کے لیے شمس الرحمن فاروقی کو دادو تحسین کا مستحق قرار دیتی ہیں۔ اسی طرح آفتاب عالم آروی نے "حالی اور لفظ 'تنقید' کی تحقیق" کے عنوان سے استدلال و شواہد کے ساتھ سیر حاصل مکالمہ قائم کیا ہے اور حالی و شبلی کے حوالے سے بعض نام نہاد بڑے ناقدین کی مناسب طریقے سے گرفت بھی کی ہے جس کی جتنی پذیرائی ہو کم ہے۔ ٹیگور اور اقبال کی حب الوطنی پر، قومی ترانے کے تناظر میں، حافظ جہانگیر اکرم نے کئی اہم سوالات قائم کیے ہیں جو ان کی غیر معمولی جسارت کا پتہ دیتے ہیں۔ یہ تمام نگارشات چونکہ نو وارد نسل کی سنجیدہ ادبی کاوشوں کا بہتر ثبوت ہیں اس لیے ان سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ یوں بھی اپنے پیش رووں کے حوالے سے بالکل تازہ ترین نسل کی یہ تنقیدی تحریریں اپنا خاص تناظر رکھتی ہیں اور ان نئے لکھاریوں کے خوش آیند مستقبل کی بشارت بھی دیتی ہیں۔

'شہرِ تحقیق' پاکستان کے معروف ادیب و انشا پرداز راشد اشرف اور ہندستان کے کرشن بھاؤک کی تحریروں سے آراستہ ہے۔ راشد اشرف نے مولانا عبدالسلام نیازی کی گوناگوں خوبیوں اور قلندرانہ و بے نیازانہ شخصیت کا بہترین مرقع پیش کیا ہے اور بھرپور دادِ تحقیق دی ہے۔ کرشن بھاؤک نے ان چند مشہورِ زمانہ اور زبان زدِ عام اشعار کا مختصر گوشوارہ پیش کیا ہے جن کی تحقیقی حیثیت پر ہنوز سوالات کی گنجائش باقی ہے، ممکن ہے اربابِ تحقیق اس پر مزید مکالمہ قائم کرنے میں حق بجانب ہوں۔

پرچے کی ضخامت کو دیکھتے ہوئے اس بار غزلوں کی تعداد زیادہ نہیں کہی جا سکتی مگر جتنی بھی شامل ہیں وہ آج کی غزلیہ شاعری کے تئیں بے زاری کے عام رویے کی تردید ضرور کرتی ہیں۔ ندا فاضلی کی چار عدد تازہ غزلیں اپنے مخصوص ڈکشن، بانکپن بھرے لہجے اور پُر کشش شعری اسلوب کے سبب ہماری شعری روایت میں اضافے کا ثبوت فراہم کریں گی۔ سلطان اختر کی دو غزلیں کلاسیکی رچاؤ کے ساتھ جدید حسیت کی غماز ہیں۔ عبدالرحیم نشتر کے یہاں تا ہنوز شعری تازہ کاری اور لہجے میں شوخی اور چلبلے پن کی سی کیفیت خلق کرنے کا عمل جاری ہے۔ مدحت الاختر کی شعری متانت اور اظہار کی سنجیدگی نے طویل مسافت طے کی ہے۔ ڈاکٹر صفدر کے تیور بھی تخلیقی اجتہاد کے عزائم سے لبریز ہیں۔ پی پی سری واستو رند کی

کہنہ مشقی داد طلب ہے۔ سردار آصف کا یہ کہنا کہ: 'غزل کیسی بھی ہو، اس کے بدن سے ہار جاتی ہے'، ہماری موجودہ غزل کے لیے ایک بڑا سوال اور ایک کھلا چیلنج ہی تو ہے! جمال اویسی اور شکیل اعظمی نمایندہ شعرا کی صف میں شامل ہیں اس لیے ان کی شاعری سے مکالمہ قائم کیے بغیر گزرنا آسان نہیں۔

حالانکہ ادارہ 'آمد' کسی بھی طرح کے امتیاز کو فروغ دینے کے حق میں نہیں ہے بالخصوص علاقائی اور نسلی تفریق کا مخالف ہے مگر ایک سچے فنکار کے بے لوث حسنِ طلب کے پیشِ نظر جنوب سے محمد حنیف کاتب اور شمال سے عابد علی عابد کی دس دس خاص غزلوں کا تحفہ قارئین کی نذر کرنے کی جسارت کر رہا ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ اسے قبولیت کا شرف حاصل ہوتا ہے یا شعروں کا انتخاب رسوائی کا سامان فراہم کرتا ہے؟ طارق متین، اصغر شمیم، کلیم اختر اور حفیظ انجم پہلے بھی 'آمد' میں شائع ہوئے ہیں۔ ان کی غزلیں اپنے پختہ رنگ و آہنگ سے شناخت کی جا سکتی ہیں۔ مدن موہن دانش، شکیل احمد شکیل، ڈاکٹر افضال عاقل، اشفاق الرحمٰن مظہر، نثار احمد نثار اور نواب آرزو پہلی بار شریکِ آمد ہیں۔ احمد صغیر صدیقی [پاکستان] اور افروز عالم کی سوغات غزلیں بھی اپنا الگ مزاج رکھتی ہیں۔ یہ سبھی شعرا اگر اپنے تخلیقی انہماک کا ثبوت فراہم کر رہے ہیں تو ان کی خاطر خواہ پذیرائی ہم پر عین واجب ٹھہرتی ہے۔

شہرِ آہنگ کی نظمیں بھی اپنے کیف و اثر اور تخلیقی وژن کے اعتبار سے لائقِ اعتنا ہیں۔ شاہد عزیز کی ۶ر پیش رو نظمیں اپنے خاص رنگ و آہنگ سے عبارت ہیں جو پہلی قراءت میں اظہار کی سطح پر سہل پسندی کا اشتباہ پیدا کرتی ہیں مگر ان کے استعاراتی نظام پر غور و فکر کریں تو وجود کے تضادات کا منظر نامہ رفتہ رفتہ تہہ دار ہوتا چلا جاتا ہے اور اپنی راکھ سے دوبارہ جی اٹھنے کی سی کیفیتوں کے مراقباتی عہد نامے میں ڈھلتا ہوا سا محسوس ہوتا ہے۔ ان کی نظمیہ شاعری اپنے قاری کی خصوصی توجہ سے زیادہ اپنی معصومانہ طرفگی پر مصر نظر آتی ہے اور یہی رنگِ رایگانی اس کا تخلیقی ماحصل ہے۔

خورشید اکبر کی بیس نظمیں ایک خاص موڈ بلکہ تخلیقی وفور کے بے نیاز لمحوں کی بے ضرری کاوشوں کی گواہ ہیں۔ پہلی بار اس کے ذہن کے دروازے پر اتنی ساری عشق پیشہ نظموں نے یکے بعد دیگرے مسلسل پندرہ دنوں تک دستک دی جن کا کھلے دل سے ایک شاعرِ کم مایہ نے استقبال کیا اور ان کی آمد سے پیدا شدہ خوش گمانیوں کو اس نے راحتِ جاں تصور کیا کہ شاید یہ تخلیقی رغیر تجریدی شہادتیں کتابِ عشق کی حاشیہ آرائی کے کسی کام کی نکل آئیں۔ یہ تمام کچی پکی نظمیں فیس بک پر ایک پردہ نشیں 'معشوق مشکوک' کے نام محفوظ ہو چکی ہیں اور چند ہم خیال احباب کے ذاتی اصرار اور تخلیق کار کی خواہشِ بے جا کے نتیجے میں صفحاتِ آمد کی زیاں پر آمادہ ہیں، ممکن ہے کہ آپ قارئین مروتاً بھی انھیں گوارہ فرمالیں، ورنہ [بہ صورتِ دیگر] ع۔ صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے!!

جمال اویسی کی پانچ نظمیں دانشورانہ اضطراب اور اندیشۂ غیاب، راشد انور راشد کی آٹھ عدد نظمیں رومان پرور حجاب سے زیادہ باطن کے پیچ وتاب، کہکشاں تبسم کی تین نظمیں اسطور وتمثیلات کے محاوراتی خیال وخواب کے پردے میں مژدۂ انقلاب اور نواب آرزو کی دو عدد منظومات شعری احتساب کی غماز ہیں، جن کی تشریحات وتعبیرات کو ایک دفتر چاہیے۔ ان کے علاوہ احمد صغیر صدیقی اور صبا اکرام کی سوغات نظمیں بھی قابلِ قدر ہیں۔

شہر افسانہ کی تحویل میں کل چودہ افسانے ہیں جو کسی نہ کسی جہت سے محبت/جنس/نجات کی مرکزیت پر قائم ہیں۔ اقبال مجید کا افسانہ تانیثی نجات کی معنویت کو نئے تناظر میں پیش کرتا ہے۔ اسی طرح زاہدہ حنا کا افسانہ برصغیر میں آزادی کے مفہوم پر نیا سوال قائم کرنے والا ہے۔ سائرہ غلام نبی کی 'یہ کہانی تو نہیں' عہد حاضر کے نسوانی شعور کے حوالے سے مرداساس معاشرے کی نام نہاد مردانگی کے تصور کی آئرنی Irony پیش کرتی ہے۔ قمر جہاں کی کہانی منٹو کی مشہور کہانی 'بو' سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے لیکن منظر نامہ اور صورت حال بالکل مختلف ہے۔ علی امام کا افسانہ ایک لمبے عرصے کے بعد قارئین کے سامنے ہے۔ جس میں محبت کی ایک معصوم کہانی اپنے تمام تر تاریخی، ثقافتی، مقامی اور محاوراتی تناظر میں ناسٹلجیا کی تخلیقی بازیافت اور بہار کے خطہ مگدھ میں مسلم معاشرے کے تہذیبی زوال کی تصویر کشی سے عبارت ہے۔ اسی طرح دیگر بھی کہانیاں محبت/جنس کے بنیادی محور پر گردش کرتی ہوئی جذبۂ نجات کی بنیادی /فطری جبلت کی تخلیقی دستاویز کے طور پر پیش ہوئی ہیں جن پر قارئین کی خصوصی توجہ ہونی چاہیے۔ کیونکہ کسی بھی ادبی رسالے میں ایک ساتھ چودہ تازہ بہ تازہ افسانوں کی شمولیت اس کے فکشن دوست رویے کا واضح ثبوت ہی تو ہے۔

شہر حیات مشرف عالم ذوقی کے تازہ ترین ناول 'نالۂ شب گیر' کے ایک مکمل باب پر مشتمل ہے جس کے مطالعے سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ذوقی کا جہانِ فکشن روز افزوں تخلیقی تجربے اور موضوعاتی تنوع کے ساتھ وسعت پذیر ہے۔ اس ناول میں مرد اور عورت کے کلیدی رشتے نیز ازدواجی نشیب وفراز سے پیدا شدہ وجودی تصادم کی پیچیدگیوں کو فنکارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے، ساتھ ہی ایک مرد کی بے چارگی اور آزادیٔ نسواں کی علمبردار ایک عورت، جو ایک شریک حیات سے زیادہ اپنے وجود کے اثبات پر مصر ہے، کے نجات پسندانہ رویے کو نشان زد کرنے کے تخلیقی اطوار موجود ہیں۔ مرد اپنی بے چارگی کے باوجود ایک کمسن لڑکی کو متبادل شریک حیات کے طور پر اپنے گھر میں ترحم کے جذبے کے زیر اثر پناہ دیتا ہے اور اس کے معصوم جذبات سے ہم آہنگ ہونے کی شعوری کاوش میں مصروف نظر آتا ہے۔ ناول کا پہلا باب ہی اتنا بھرپور، دلچسپ، تحیر آمیز اور اُتار چڑھاؤ سے بھرا ہوا ہے کہ اسے پڑھنے کے بعد

قاری 'نالۂ شب گیر' کا مکمل مطالعہ کیے بغیر رہ نہیں سکتا۔

اس مرتبہ شہرِ اشتراک کا دامن بھی کافی کشادہ ہے۔ اکبر لغاری کی سندھی کہانی 'چاند کہاں ہے' اپنے تخلیقی برتاؤ اور افسانویت کے لحاظ سے اس قدر پرلطف، پراثر اور تجسس انگیز ہے کہ اس کی جتنی بھی ستائش کی جائے کم ہے۔ اردو میں ایسے افسانے خال خال دیکھنے کو ملتے ہیں جس میں خالص کہانی پن کے ساتھ نہایت فطری انداز میں پورے معاشرتی اور سیاسی نظام کو فنکارانہ طور پر آئینہ دکھایا گیا ہو۔ اسی طرح موہن راکیش اور ہمایوں جمیل کی ہندی کہانیوں کے ساتھ گنگادھر گانگل کی مراٹھی کہانی کا بھی الگ الگ انداز ہے۔ ان کے علاوہ رفیق انجم کی ترجمہ کردہ تمل، گجراتی اور طبع زاد نظموں کے شانہ بہ شانہ صبا اکرام نے سویڈش نظم کا خوبصورت ترجمہ پیش کیا ہے اور اسلم مرزا نے مراٹھی کے معروف دیہاتی شاعر نا۔دھو۔مہانور کی متعدد نظموں کا ترجمہ اور تعارف تحریر کیا ہے جن سے اردو کے قارئین استفادہ کر سکتے ہیں اور تقابل کی نئی صورتیں سامنے آ سکتی ہیں۔

شہرِ عشق اردو کے ممتاز فکشن نگار قاضی عبدالستار کی رودادِ عشق پر مبنی ہے۔ ڈاکٹر راشد انور راشد نے بحیثیت مصاحبہ کار قاضی صاحب سے طویل انٹرویو کیا ہے اور باتوں باتوں میں ان کے دل کے نہاں خانوں میں جھانکنے کی بلیغ کوشش کی ہے۔ یکے بعد دیگرے پانچ معاشقوں کا تفصیلی تذکرہ آنکھوں کو رُلانے والا اور دل کو ہلا دینے والا محسوس ہوتا ہے۔ ان معاشقوں کے مقدر میں المیہ انجام جیسے کاتبِ ازل نے پہلے سے لکھ رکھا ہو۔ اس کے باوجود قاضی عبدالستار کی ہمتِ مردانہ انھیں صبر و استقلال سے ذرّہ برابر بھی منحرف نہیں ہونے دیتی۔ ان کے آدابِ عشق میں اردو معاشرے کا نہ صرف ماضی سانس لیتا ہے بلکہ پرشکوہ اندازِ بیان کے ایک ایک لفظ سے تہذیبی اور ثقافتی معنویت کی دھندلی لکیریں بھی روشن ہوتی چلی جاتی ہیں۔

شہرِ شناسائی میں عابد سہیل کی سوانح 'جو یاد رہا' پر اقبال مجید کی بے باک تحریر کو ان دو بڑے لکھنے والوں کے دوستانہ تعلقات کے باوجود ادبی دیانت داری بشمول بشری تقاضوں کے تناظر میں دیکھنا چاہیے کہ اب ایسی والہانہ دل نوازیاں اور غیر ریاکارانہ شکوہ طرازیاں بھی خواب و خیال ہوتی جارہی ہیں، شاید۔ اسی طرح فیض اور چراغ حسن حسرت کے حوالے سے ظہیر جاوید (فرزندِ چراغ حسن حسرت) کا نوشتہ بھی اہم اور یادگار ہے۔ یہ اہم اور قابلِ قدر تحریر راشد اشرف نے ازراہِ محبت 'آمد' کو عنایت فرمائی ہے۔ ادارہ ان کا شکر گزار ہے۔

شہرِ طنز و مزاح میں محمد بشیر مالیر کوٹلوی کا انشائیہ 'ادبی وبائیں' اور ڈاکٹر فیصل حنیف خیال (دوحہ، قطر) کا تحریر کردہ خاکہ بعنوان 'بشر ہے کیا کہیے' بھی طنز کے تیر اور مزاح کی چاشنی میں ڈوبے

ہوئے ہیں جو ہمارے طنزیہ ومزاحیہ ادب میں شاید کچھ اضافہ کرسکیں۔

شہرِ استقبال میں پروین شیر کا سفرنامہ 'چند سیپیاں ـ سمندروں سے' پر عتیق اللہ کا تعارفی مضمون بذات خود تنقید سے زیادہ تخلیقی نثر کا نمونہ ہے۔ پروین کا یہ سفرنامہ صرف سیر وتفریح کا بیانیہ ہی نہیں ہے بلکہ انسانی آبادی کے ایسے خطوں کی عبرت انگیز اور بصیرت افروز تخلیقی دستاویز بھی ہے جسے اردو سفرناموں کے باب میں ایک خوشگوار اضافہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ پروین نے جنوبی افریقہ کی سیاہ فام بستیوں کی تنگ حالی اور شمالی امریکہ کے تموّل کے درمیان ایک واضح خطِ فاصل کھینچنے کی کوشش کی ہے اور سفرنامہ کے بہانے ایک حسّاس وجود کی ذاتی دریافت کا منظرنامہ بھی خلق کیا گیا ہے۔ جس کی خاطر خواہ پذیرائی ہونی چاہیے۔ یوں تو پروین شیر بنیادی طور پر ایک شاعرہ اور مصورہ ہیں لیکن اس بار سفرنامہ لکھ کر انھوں نے خود کو باطن کے سیاح کے طور پر بھی متعارف کرانے کا بیڑا اٹھایا ہے اور ایک نئی جست اور جسارت کو نئی منزل سے ہمکنار کیا ہے۔ مبارک باد!

شہرِ ملال میں محمد علی صدیقی پر صبا اکرام اور ممتاز جدید شاعر صدیق مجیبی پر ڈاکٹر رونق شہری کے مضامین ہمیں مرحومین کے بارے میں از سرِ نو غور وفکر کرنے کی ترغیب دیتے ہیں کہ ان کے فن وشخصیت پر محض رسمی تحریریں کافی نہیں ہیں بلکہ یہ تو صرف آغاز کے بطور ہیں۔

شہرِ آئینہ کے تبصرے، شہرِ آمد اور شہرِ خیر وخبر کے مشمولات بھی قارئین سے خصوصی توجہ چاہتے ہیں۔

قارئین کرام! آمد کا یہ مشترکہ شمارہ جن نامساعد حالات میں آپ کے سامنے پیش کیا جارہا ہے اس کی تفصیل میں جاؤں تو کئی اہم ادبی شخصیات کی درپردہ سازشوں اور عدم تعاون کی مصلحت پسند حکمتِ عملی کے بے نقاب ہونے کا خطرہ ہے۔ اس لیے بس اتنا عرض کرنا ہے کہ جس حوصلے اور اُمنگ کے ساتھ 'آمد' کے گذشتہ شمارے مسلسل پابندیِ وقت کے ساتھ آپ تک پہنچتے رہے ہیں اب شاید مالی مشکلات اور اردو کے نام نہاد ادب نوازوں کے جذبۂ اعزاز پسندی کے سبب ویسا کرپانا ممکن نہیں ہو، پھر بھی تھوڑی بہت بے ضابطگی اور عدم تسلسل کے ساتھ یہ رسالہ محبانِ آمد تک پہنچتا رہے گا۔ انشاء اللہ۔

آمد کے تمام قارئین اور باشندگانِ ہند کو یوم آزادی کی ۶۸ ویں سالگرہ کی دلی مبارکباد!

خادم ادب
خورشید اکبر
مدیر اعزازی 'آمد'

مدھے پورہ
۱۵/اگست ۲۰۱۴ء

سلسلۂ مکالمات

"No one today is purely one thing. Labels like Indian, or woman, or Muslim, or American are no more than starting-points, which is followed into actual experience for only a moment are quickly left behind. Imperialism consolidated the mixture of cultures and identities on a global scale. But its worst and most paradoxical gift was to allow people to believe that they were only, mainly,exclusively, white, or black,or Western, or Oriental. Yet just as human beings make their own history, they also make their cultures and ethnic identities. No one can deny the persisting continuities of long traditions, sustained habitations, national languages, and cultural geographies, but there seems no reason except fear and prejudice to keep missing on their separartion and distinctiveness, as if that was all human life was about.Survival in fact is about the connections between things ; in Eliot's phrase, reality can not be deprived of the 'other echoes[that] inhabit the garden'. It is more rewarding --and more difficult--to think concretely and sympathetically, contrapuntally, about others than only about 'us'. But this also means not trying to rule others, not trying to classify them or put them in hierarchies, above all, not constantly reiterating how 'our' culture or country is number one (or not number one, for that matter). For the intellectual there is quite enough of value to do without that."

['Culture And Imperialism': Edward W. Said,Pub. by 'Vintage',1994; Page:407-408]

(۱)

دانش ور کے اظہارات

● ڈاکٹر ناصر عباس نیّر [پاکستان]

''دانش ور کے اظہارات''، ایڈورڈ ڈبلیو سعید کے خطبات کا مجموعہ ہے۔ انھیں ۱۹۹۳ میں بی بی سی ریڈیو پر ریتھ خطبات کے طور پر پیش کیا گیا تھا (بی بی سی نے اپنے پہلے ڈائریکٹر جنرل لارڈ جان ریتھ کی خدمات کے اعتراف میں ۱۹۴۸ میں ریتھ خطبات کا آغاز کیا تھا۔ اوّلین خطبات کے لیے برٹرینڈ رسل کو دعوت دی گئی تھی۔ ان کے علاوہ آرنلڈ ٹائن بی، ایڈورڈ لیچ، جان سرل، وول سوئنکا جیسے معروف مفکرین یہ خطبات پیش کر چکے ہیں)۔ ایڈورڈ سعید (۱۹۳۵۔۲۰۰۳) فلسطینی نژاد امریکی دانش ور تھے، یعنی دوہری شہریت کے حامل تھے۔ دوہری شہریت، دوہرے تناظر کو ممکن بناتی ہے: وطن اور جلاوطنی کا تناظر۔ یہ دوہرا تناظر ہمیں سعید کے نظام فکر کی بنیاد میں کارفرما محسوس ہوتا ہے۔ عالمی تنقید میں جسے سعید کا اہم اضافہ کہا جا سکتا ہے، اسے مابعد نوآبادیاتی تنقید کا نام ملا ہے۔ نوآبادیاتی مغرب نے کس طور مشرق، اسلام اور افریقا کے 'علم' کو طاقت کے حصول کا ذریعہ بنایا؛ مشرق اور مغرب، یا 'ہم' اور 'وہ' کی تفریق قائم کی، جس میں 'ہم' کو 'وہ' پر فوقیت حاصل رہتی ہے، نیز 'ہم' ایک ایسے مرتبے کا حامل رہتا ہے، جہاں سے اسے 'وہ' کی من مانی ترجمانی کا اختیار حاصل رہتا ہے۔ مابعد نوآبادتی تنقید کا یہ بنیادی تصور، سعید کے دوہرے تناظر کا مرہون ہے۔ وہ ایک ایسے امریکی عالم تھے، جن کی روح ایک وطن پرست فلسطینی باشندے کی تھی۔ سعید کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی وطن پرستی کو ایک جبلی جذبے تک محدود نہیں ہونے دیا، بلکہ اسے ایک استعارہ بنایا [اگر وہ ایسا نہ کرتے تو غالباً آزادیِ فلسطین کے ہتھیار بند مجاہد ہوتے]۔ پھیلاو، استعارے کی بنیادی خصوصیت ہے۔ چناں چہ سعید 'نوآبادیاتی تدبیروں، سازشوں سے تارتار وطن کے تجربے' کو مشرق و ایشیا میں استعماری حربوں کی تفہیم کا استعارہ بناتے ہیں۔ لہٰذا ان کی آواز فقط ایک فلسطینی عرب کی نہیں رہ جاتی، مشرق و افریقا کی آواز بن جاتی ہے۔ دوسری طرف وہ تفہیم اور اس کے اظہار کے لیے 'مغرب' کے علم اور زبان کو بروے کار لاتے ہیں۔ انھوں نے 'وہ' کا استغاثہ مغرب کے علم اور مغرب کی زبان میں پیش کیا ہے۔ ان سب باتوں کی بازگشت ان خطبات میں بھی شدت سے سنائی دیتی ہے۔

خطبات کے پیش لفظ میں سعید نے انگریزوں کے اس ردِعمل کا ذکر کیا ہے، جو۱۹۹۲ میں ان کے خطبات کے اعلان کے فوراً بعد ہوا۔ اس ردِعمل سے ظاہر ہوتا ہے کہ سعید کی 'فلسطینی امریکی شناخت' میں فلسطینی عنصر ہی کو برطانوی صحافیوں نے توجہ دی، اور اس حوالے سے طرح طرح کے اعتراضات کا نشانہ بنایا۔ انھیں فلسطینیوں کے حقوق کی جنگ میں فعال ہونے کا الزام دیا گیا، اور اس بنیاد پر یہ رائے ظاہر کی گئی کہ وہ کسی معتبر پلیٹ فارم پر گفتگو کرنے کے لیے موزوں نہیں۔ بعض نے تو انھیں طعنہ دیتے ہوئے کہا کہ وہ[ہر تحریر، خطبے میں] اپنے سوانح کو پیش کرتے ہیں۔ اس کا سیدھا سادھا مطلب تھا کہ انھیں ایک فلسطینی سے کوئی دل چسپی نہیں۔ سنڈے ٹیلی گراف میں انھیں ''مغرب مخالف'' قرار دیا گیا، اور کہا گیا کہ ان کی تمام تحریریں مغرب کو الزام دینے پر مرکوز ہیں، جن میں تیسری دنیا کی تمام برائیوں کا ذمہ دار مغرب کو قرار دیا گیا ہے۔ ایک صحافی نے تو دانش ور کے اظہارات کو موضوع بنانے کو غیر انگریزانہ (Un-English) کہا۔ اس تنقید کے جواب میں سعید نے لکھا ہے کہ ''یہ بڑی حد تک دانش ور کے سلسلے میں برطانوی رویوں کو منکشف کرتی ہے''۔ سعید سماجی رویوں کو فطری نہیں، ایک تشکیل سمجھتے ہیں۔ چناں چہ کہتے ہیں کہ یہ رویے صحافیوں کے ذریعے برطانوی عوام کو ملے ہیں، مگر ان کی تکرار انھیں موجودہ سماجی استناد دیتی ہے۔ گویا جسے برطانوی صحافیوں نے غیر انگریزانہ کہا، وہ انگریزی تہذیب کا کوئی بنیادی عنصر نہیں، بلکہ برطانوی عوام کا وہ رویہ ہے، جسے ذرائع ابلاغ کی مقتدر شخصیتوں نے پیدا کیا ہے۔ سعید عوام اور رائے ساز مقتدر شخصیتوں کے اس رشتے کا تجزیہ نہیں کرتے، جس میں عوام مجہول انداز میں، کسی تنقیدی شعور کے بغیر آرا کو قبول کر لیتے ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ سعید کی فکر کا محور اقتداری سیاست ہے، جس میں رائے کی تشکیل سے لے کر اس کے اظہار تک کے تمام اختیارات ایک ہی طبقے میں مرتکز ہوتے ہیں۔ سعید اسی طبقے کی حکمت عملیوں کا تجزیہ کرتے ہیں۔ اسی رو میں وہ یہ واضح کرتے ہیں کہ برطانوی صحافی اور عوام مشرق ومغرب کی اسطور (متھ) کے اسیر ہیں۔ سعید کی نظر میں مشرق ومغرب، فکشن ہیں؛ یہ ایسی ''اساطیری تجریدات'' ہیں جو جھوٹ پر مبنی ہیں۔ یعنی مغرب نے اس تفریق کے ذریعے جن باتوں کی بنیاد پر مغرب کو مشرق سے مختلف قرار دیا، وہ باتیں حقیقتاً مشرق میں موجود ہی نہیں؛ جیسے مشرق کو مذہب کا، اور مغرب کو سائنس و عقلیت کا علم بردار سمجھنا، اور مشرق کی تاریخ میں موجود سائنس وعقلیت پسندی کے واقعات کو مشرق کی اسطور کی تشکیل کرتے ہوئے خارج کرنا۔ سعید نے اپنی کتابوں شرق شناسی(۱۹۷۸) اور ثقافت اور استعماریت (۱۹۹۳) میں ان موضوعات پر تفصیل سے لکھا ہے۔ خطبات کے پیش لفظ میں وہ اس امر کا گلہ کرتے ہیں کہ انھوں نے ان کتابوں میں جو کچھ لکھا، انھیں یکسر نظر انداز کرتے ہوئے، ان پر تنقید کی گئی۔ سعید نے ثقافت اور استعماریت میں جین آسٹن کے ناول *Mansfiled Park* میں جہاں آنٹیگوا (ویسٹ انڈیز کا جزیرہ) میں غلامی اور برطانوی ملکیت کے علاقوں میں گنّے کی کاشت سے متعلق کچھ نہ کچھ موجود ہے۔ جو کچھ آسٹن

نے لکھا ہے، کیا وہی کچھ اس کے قارئین سمجھتے ہیں؟ سعید کی شکایت یہ ہے کہ جین آسٹن پر [برطانوی] لوگوں کی توجہ ہے، مگر اس کے قارئین کو خارج رکھا گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں آسٹن پر ان کی تنقید کو نہیں پرکھا گیا۔

سعید برطانوی صحافیوں کے لیے کہیں دانش ور کا لفظ استعمال نہیں کرتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ دانش ور کا تصور ایک ایسے شخص کے طور پر کرتے ہیں جس کی عوامی کارکردگی کی نہ پیش گوئی کی جاسکتی ہے، نہ اس کی کارکردگی کو کسی نعرے، راسخ العقیدگی، پارٹی لائن یا عقیدے (ڈاگما) میں بدلا جاسکتا ہے۔ دانش ور اپنی جماعتی وابستگی، قومی پس منظر، مذہبی وفاداری کے باوجود انسانی بدحالی سے متعلق سچائی کے کڑے معیار سے جڑا رہتا ہے۔ جب کہ برطانوی (ہمارے یہاں کے بھی) صحافی قومی پس منظر اور ادارہ جاتی، مذہبی، نظریاتی وفاداریوں کے پابند نظر آتے ہیں: ایسے لوگوں کے خیالات کی پیش گوئی کی جاسکتی ہے۔ سعید یہ رائے قائم کرتے محسوس ہوتے ہیں کہ دانش ور 'سچائی کے کڑے معیار' کی پابندی کے باوجود اس راسخ العقیدگی کا شکار نہیں ہوتا، جس کی پیش گوئی کی جاسکتی ہو۔ اس کے یہاں لازماً تشکیک کا عنصر ہوتا ہے جو اسے مسلسل سوال اٹھانے پر مجبور رکھتا ہے۔ حقیقی دانش ور سچائی کے کڑے معیار کا بھی وقتاً فوقتاً جائزہ لیتا رہتا ہے۔ سعید نے دانش ور کے اس تصور پر آگے بھی اظہار خیال کیا ہے، لہٰذا مزید بحث آگے آرہی ہے۔

سعید کے ضمن میں برطانوی ذرائع ابلاغ کا رویہ 'شناختوں کی سیاست' کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ کسی سماج میں کسی مفکر کے افکار میں سے کس پہلو یا کسی تخلیق کار سے متعلق کس رائے کو اہمیت ملتی ہے؟ ایک مفکر یا تخلیق کار کے یہاں عموماً تنوع ہوتا ہے، (کیوں کہ اگر کوئی تخلیق کار ایک ہی خیال کی مسلسل رٹ لگائے تو اس کی تخلیقیت ہی مشکوک ہوجاتی ہے) مگر اس کے کسی خاص پہلو کو منتخب کرلیا جاتا اور اسے اس کی واحد شناخت ٹھہرا دیا جاتا ہے۔ جیسے ٹیگور کی ہندوستانی تخلیق کار کی شناخت اور اقبال کی امتِ مسلمہ کے شاعر کی شناخت۔ چناں چہ ٹیگور کے یہاں ہندوستانی ثقافتی روح کی تلاش کو مرکزی اہمیت دی جاتی اور اقبال کے یہاں امتِ مسلمہ کی ترجمانی کو۔ ان دو موضوعات کے علاوہ جو کچھ ہے، اسے یا تو نظر انداز کیا جاتا ہے، یا ان کی من مرضی کی تعبیریں کی جانے لگتی ہیں۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شخصیات اپنی مخصوص شناختوں کے ساتھ دو کینن، دو عظیم دیوتا بن جاتے ہیں، جن کی تقدیس کی حفاظت کا ذمہ بعض بزرجمہر لے لیتے ہیں۔ بحث و گفتگو کا کھلا آزادانہ ماحول، جس سے دانش وری کو فروغ ملتا ہے، اسے دیوتا پرستی اور حفظِ تقدیس محال بنا دیتے ہیں۔ شخصیات کے علاوہ بعض نظریات، آئیڈیالوجیوں کو بھی جب سماج اپنی اٹل شناخت بنالیتے ، اور انھیں دیوتا کا مرتبہ تفویض کر دیتے ہیں تو دانش وروں کے 'مختلف، متبادل، یا متوازی' نظریات کے اظہار تک کو محال بنا دیا جاتا ہے۔ (ملازمت سے برخاستگی، کفر کے فتوے، معاشی، جنسی بدعنوانی کے الزامات تو معمولی باتیں ہیں: قتل سے بھی گریز نہیں کیا جاتا)۔ جس صورت حال کا سامنا سعید کو برطانیہ میں نسبتاً کم

مشکل انداز میں کرنا پڑا، اس کی شدید صورتیں ہمارے یہاں موجود ہیں۔ تاہم 'شناختوں کی سیاست' کا کھیل جمہوری ملکوں، اور پاکستان جیسے نام نہاد جمہوری ملکوں میں کھیلا جاتا ہے۔

سعید نے پیش لفظ میں اپنے خطبات کے بیش تر نکات کو دہرایا ہے، لہٰذا ان پر بحث تو آگے کی جائے گی، تاہم ایک اور نکتہ ایسا ہے جسے انھوں نے خطبات میں پیش نہیں کیا، صرف پیش لفظ میں اس پر مختصر گفتگو کی ہے۔ اس کا ذکر ضروری ہے۔ جب کوئی دانش ور بے اختیار ہو، مگر افسوس ناک حالات کا سامنا کر رہا ہو تو کیا کرے؟ سعید اس کے جواب میں میشل فوکو کے ان تھک تبحر علمی (relentless erudition) کا تصور پیش کرتے ہیں، جس کے تحت مدفون دستاویزات، فراموش شدہ، یا ترک کردہ تاریخوں کو کھنگالا جاتا ہے۔ یہ اظہار کے متبادل ذرائع ثابت ہوتے ہیں۔ گویا دانش ور کو کبھی خاموش نہیں ہونا چاہیے۔ اگر وہ اپنے عصر سے متعلق راست اظہار کے سلسلے میں بے بس ہو، موت کے خطرے سے دوچار ہو تو اظہار کا متبادل ذریعہ اختیار کرے۔ اپنے اظہار پر مسلط خاموشی کا 'ثنی'، تاریخ کی خاموش دستاویزات میں تلاش کرے۔ تاہم یہ اظہار کا متبادل ذریعہ اس وقت بن سکتا ہے، جب یہ حال کی درشتی سے گھبرا کر ماضی میں پناہ لینے کا وسیلہ نہ بنے؛ خطرے کا سامنے سے مقابلہ کرنے کی بجائے، اوٹ میں جا کر خطرے سے نبرد آزما ہونے کی تدبیر بنے۔ اگر مدفون دستاویزات پر تحقیق، معاصر عہد کے سلگتے ہوئے سوالات یا کم از کم بنیادی نوعیت کے انسانی سوالات سے لاتعلق رہے تو یہ ساری تحقیق ایک بے رس اکیڈمک سرگرمی بن کر رہ جاتی ہے۔ اردو کی ماضی کی دستاویزات سے متعلق تحقیق کا المیہ یہی ہے کہ یہ متبادل دانش ورانہ اظہار نہیں ہے۔ تاہم جدید اردو فکشن نے اس رمز کو پالیا تھا۔ قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کا فکشن خصوصاً فراموش کردہ ماضی کی 'خاموشی' میں اپنے لیے اظہار کے نئے، متبادل اسالیب کی دریافت کرتا ہے: داستانی، اساطیری بیانیوں کی علامتیت کو سطحی حقیقت پسندی کا متبادل بنا کر پیش کرتا ہے۔

سعید نے چھ خطبات دیے۔ پہلا خطبہ 'دانش ور کے اظہارات' کے عنوان سے ہے، جسے کتاب کا عنوان بھی بنایا گیا ہے۔

پہلے خطبے کا آغاز سعید اس سوال سے کرتے ہیں کہ کیا دانش ور، اعلیٰ طرز پر منتخب لوگوں کا، ایک چھوٹا یا بڑا گروہ ہے؟ دانش ور سے متعلق یہ بنیادی سوال نہیں۔ دانش ور کون ہے؟ یہ بنیادی سوال ہے۔ اس سوال کے دو جواب اٹلی کے انتونیو گرامشی (۱۸۹۱۔۱۹۳۷) اور فرانس کے ژولیاں بندا (۱۸۶۷۔۱۹۵۶) نے دیے۔ اطالوی مارکسی، سیاسی فلسفی گرامشی (جسے مسولینی نے ۱۹۲۶ تا ۱۹۳۷ قید میں رکھا) نے 'جیل کی ڈائری' میں لکھا کہ تمام آدمی دانش ور ہیں مگر تمام لوگ دانش وری کا فریضہ ادا نہیں کرتے، جب کہ ژولیاں بندا نے دانش ور کو فیض یافتہ، فلسفی بادشاہوں کا قلیل گروہ قرار دیا جو انسانیت کے ضمیر کی تشکیل کرتے ہیں۔ سعید اپنی بحث کا مدار ان دو مختلف آرا پر رکھتے ہیں جو بڑی حد تک توقع کے خلاف

ہے۔ افتتاحی خطبے میں وہ دانش ور سے متعلق نظری بحث نہیں کرتے، جس کی توقع ان کی دیگر تحریروں کے مطالعے سے پیدا ہوتی ہے۔ (مثلاً Beginnings : Intention and Method میں وہ 'اصل' کی فلسفیانہ جہت سے بحث کرتے ہیں، یا شرق شناسی میں شرق شناسی کے ڈسکورس پر نظری بحث کرتے ہیں) ۔ دانش ور پر نظری بحث کی عدم موجودگی کی بنا پر یہ واضح نہیں ہو پاتا کہ دانش ہے کیا چیز، اور اسے حاصل کیسے کیا جاتا ہے؟ ایک انٹیلکچوئل کے پاس علم ہوتا ہے، یا حکمت ودانش؟ بادی النظر میں تو انٹیلکچوئل کے پاس intellect ہے، دانش (wisdom) نہیں۔ ہمارے یہاں حکیم کا لفظ صاحب حکمت کے معنوں میں رائج رہا ہے: لفظ دانش ور کا استعمال انٹیلکچوئل کے معنی میں استعمال ہونا شروع ہوا۔ دانش ور کے رواج نے 'حکیم' کے لفظ کو روز مرّہ کی لغت سے خارج ہی کر دیا۔ البتہ طب یونانی کے ماہر کو حکیم کہنے کا رواج اب بھی ہے۔

بعض اوقات حکمت و دانش کو محض علم کے معنوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے حکمتِ فرنگ، یا دانش فرنگ ۔ بہ قول اقبال: خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانش فرنگ / سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ ونجف؛ یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے / وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو۔ تاہم ان دونوں 'اصطلاحوں' میں معانی کا فرق موجود ہے۔ نور اللغات کے مطابق ''اصطلاح میں حکمت عبارت ہے، احوال موجودات کے علم سے جیسا کہ وہ نفس الامر میں ہے''۔ موضوع کے اعتبار سے حکمت کی تین شاخیں بیان کی گئی ہیں: طبعی ، ریاضی اور الٰہی ۔ حکمت کو نظری اور عملی میں بانٹا گیا ہے۔ اس طور حکمت بڑی حد تک فلسفہ وسائنس کا مفہوم رکھتی ہے۔ جب کہ دانش کا مفہوم، عقل، فہم، دانائی ہے۔ دوسرے لفظوں میں حکمت کی اصطلاح ان کلاسیکی مشرقی علوم کے لیے مستعمل تھی، جنھیں خاص طریق کار کے تحت حاصل کیا جاتا تھا، جب کہ دانش، عام زندگی کے تجربات سے حاصل ہونے والا 'علم' تھا، اس لیے دانش کا دائرہ وسیع تھا؛ دانشمند اس شخص کو کہا جاتا تھا، جو زندگی کے مقصد ومنتہا سے متعلق ایک ایسی بصیرت رکھتا ہو، جسے اس نے گزرانِ وقت کے ساتھ، گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے کے بعد، اور زندگی کی اونچ نیچ کے متنوع تجربات کے بعد حاصل کیا ہو۔ ویبسٹر ڈکشنری میں wisdom کا مفہوم اس سے ملتا جلتا ہے: وہ علم جسے زندگی سے متعلق کئی تجربات کے بعد حاصل کیا گیا ہو۔ زندگی کے متنوع تجربات سے متعلق ہونے کی بنا پر، یہ علم اخلاقی جہت کا حامل ہو جاتا ہے۔ اخلاقی جرأت ودیانت کا تقاضا دانشمند سے لازماً کیا جاتا ہے، جب کہ کسی خاص علم کے متخصص سے عموماً۔ ہر چند دانشمند کا یہ قدیم تصور ہے، اور اس کی جگہ دانش ور کے نئے تصور نے لے لی ہے، جو زندگی کے محض تجربات پر انحصار نہیں کرتا، بلکہ باقاعدہ تحقیق سے کام لیتا ہے، مگر اخلاقی اقدار کے پاس دار ہونے کا مفہوم اب بھی اس سے وابستہ ہے۔ مثلاً دانش وری کا انحصار سچائی کی دریافت اور اظہار پر ہے، یہ دونوں اخلاقی جرأت کا مطالبہ کرتے ہیں۔

گرامشی اور بندا کی دانش ور کی تعریفوں کے تجزیے کے دوران میں اور اس کے نتیجے میں، سعید

اپنا نقطہ نظر واضح کرتے ہیں۔ گرامشی دانش کو کسی ایک طبقے کا خصوصی استحقاق نہیں سمجھتے۔ ایک مارکسی مفکر کے طور پر وہ دانش کے سلسلے میں طبقاتی تفریق کے قائل نہیں۔ گرامشی کے مطابق ہر آدمی کے پاس فہم وخرد کی صلاحیت ہے جسے وہ استعمال کرتا ہے، تاہم ہر شخص سماج میں دانش ور کا فریضہ (Function) ادا نہیں کرتا۔ سعید گرامشی کی اس رائے کا تجزیہ نہیں کرتے، جس کا یہ مطلب لیا جا سکتا ہے کہ وہ اسے درست تسلیم کرتے ہیں۔ سعید یہ سوال نہیں اٹھاتے کہ کیا دانش ور کا انحصار کلی فہم کی اسی صلاحیت پر ہے جسے تمام لوگ اپنی روزمرہ زندگی میں بروے کار لاتے ہیں؟ اس سوال کا جواب، ہاں میں دینے سے، ایک بڑا سوال ہمارے سامنے منھ پھاڑے کھڑا نظر آتا ہے۔ اگر تمام لوگ دانش ور ہیں تو پھر 'تمام لوگ' مقتدر طبقوں کی آرا کو مجہول انداز میں کیوں قبول کر لیتے ہیں؟ حکمران طبقوں کے نظریات، ان کے ذہنوں پر کیوں غلبہ پا لیتے، اور ان کی نظروں سے معاشی، فکری، ثقافتی استحصال کی ظاہر و مخفی صورتوں کو کیوں اوجھل کر ڈالتے ہیں؟ اینگلز کے لفظوں میں لوگ اس 'باطل شعور' کا شکار کیوں ہوتے ہیں جو انھیں سرمایہ داریت کی قبیح صورتوں کو پہچاننے اور پھر انھیں مسترد کرنے کے ناقابل بنا دیتا ہے؟ خود گرامشی کا اجارہ داری کا نظریہ کہتا ہے کہ پولیٹیکل سوسائٹی کے نظریات، میڈیا، جامعات اور ثقافتی اوضاع کے ذریعے سول سوسائٹی پر اجارہ حاصل کر لیتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ جہاں تک دانش ور کو عوام سے الگ، ممتاز سماجی گروہ قرار دینے کا تعلق ہے، تو اسے ہم گرامشی کے لفظوں میں جھوٹا (اسطور) کہہ سکتے ہیں ہیں، کیوں کہ اس سے ایک طرف مخصوص علم کے سلسلے میں مخصوص طبقے کی اجارہ داری قائم کرنے کا شائبہ ہوتا ہے، اور دوسری طرف عوام اور دانش ور میں فاصلے کی وہی دیوار اٹھانے کی 'حکمت عملی' نظر آتی ہے، جو بادشاہوں، نوآبادیاتی آقاؤں اور غلاموں کے بیچ کھڑی کی جاتی ہے، تاکہ بادشاہ اور آقا کی ہر بات فرمان سمجھی جائے۔ لیکن جہاں تک ہر شخص کے دانش ور ہونے کا سوال ہے تو گرامشی کی دلیل بالکل ایسے ہی ہے جیسے یہ کہنا کہ چوں کہ تمام لوگ کوئی ایک زبان بولتے ہیں، اور شاعری زبان ہی میں ہوتی ہے، اس لیے تمام لوگ شاعر ہیں۔ قصہ یہ ہے کہ جس طرح شاعری میں زبان کا خاص استعمال (استعاراتی) ہوتا ہے، اسی طرح دانش وری میں بھی فہم و خرد کی صلاحیت خاص انداز میں (یعنی سوال اٹھانے، واضح رائے قائم کرنے اور اس کا بے خوف اظہار کرنے) بروے کار آتی ہے۔ بلاشبہ فہم و ادراک کی صلاحیت پر کسی ایک طبقاتی یا صنفی گروہ کا اجارہ نہیں، مگر محض اس صلاحیت کی موجودگی کسی کو دانش ور ثابت نہیں کرتی۔

یہاں ہمیں ابن رشد کا خیال آتا ہے۔ انھوں نے لوگوں کو تین درجوں میں تقسیم کیا تھا۔ ''پہلا جو سب سے بڑا ہے، ان لوگوں کا ہے جو منبر پر سے دیے جانے والے وعظ سن سن کر مذہبی عقائد پر ایمان رکھنے لگتے ہیں۔ خطابت کے زور سے ان کو جس طرف بھی چاہیے موڑا جا سکتا ہے۔ یہ سادہ ذہن راسخ العقیدہ لوگوں کا طبقہ ہے۔ [اسی طبقے سے خودکش بمبار پیدا ہوتے ہیں۔ ن ع ن] دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے، جن کی مذہب

کے بارے میں جو سمجھ بوجھ ہے، اس کا دارومدار کچھ تو استدلال پر ہے، لیکن زیادہ تر ان مقدمات پر جن کو بے چوں و چرا مان کر استدلال آگے بڑھتا ہے۔ یہ طبقہ مدرسی علما اور متکلمین کا ہے۔ تیسرا اور آخری طبقہ جو ان سب سے چھوٹا اور مختصر ہے، اس میں وہ لوگ شامل ہیں جو مذہب کی عقلی سمجھ بوجھ رکھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ان کے عقائد کی بنیاد ان مقدمات پر ہوتی ہے جن کا بہت اچھے طریقے سے تجزیہ کیا جا چکا ہوتا ہے، اور وہ ثابت ہو چکے ہوتے ہیں''۔ (محمد کاظم، مسلم فکر و فلسفہ، ص ۲۵۹)۔ تیسرے طبقے کو ابن رشد فلاسفہ کہتے ہیں، اور آج کی اصطلاح میں ہم انھیں دانش ور کہہ سکتے ہیں۔ فلاسفہ کی طرح دانش وروں کا طبقہ بھی مختصر ہوتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ یہ طبقہ خصوصی طور پر فیض یافتہ ہے، بلکہ اس لیے کہ مذہبی مقدمات یا سماجی و ثقافتی روشوں کا عقلی تجزیہ کرنے کے لیے جس محنت، ارتکاز توجہ، مشکل سوالات اٹھانے کی ضرورت ہے، اکثر لوگ اپنی طبعی کاہلی یا مصلحت پسندی کی وجہ سے، اس پر آمادہ نہیں ہوتے۔

سعید گرامشی کی رائے کے دوسرے حصے کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں، جس میں کہا گیا ہے کہ دو قسم کے لوگ دانش وری کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔ روایتی دانش ور اور تنظیمی (جن کے لیے گرامشی Organic کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں) دانش ور۔ سعید گرامشی کے حوالے سے واضح کرتے ہیں کہ ''روایتی دانش وروں میں اساتذہ، پادری اور وہ منتظمین ہیں جو نسل در نسل ایک ہی کام کیے چلے جاتے ہیں، (ابن رشد کی وضاحت کی رو سے یہ لوگ عوام ہی کا ایک طبقہ ہیں، دانش ور نہیں) جب کہ تنظیمی دانش ور طبقات یا تنظیم سے براہ راست وابستہ ہو کر زیادہ طاقت اور زیادہ اختیار حاصل کرتے ہیں۔ سرمایہ دار اور تاجر اپنے ساتھ صنعتی ماہرین، سیاسی معیشت کے متخصصین، نئے کلچر اور نئے قانونی نظام کے منتظمین تخلیق کرتا ہے''۔ سعید کے نزدیک گرامشی نے سرمایہ دارانہ کلچر میں دانش ور کے کردار کی صحیح تشخیص کر لی تھی، مگر بندا نے دانش ور کا قدامت پسندانہ تصور پیش کیا ہے۔

بندا نے اپنی کتاب دانش وروں کی غداری (۱۹۲۷) میں ان دانش وروں پر سخت تنقید کی تھی جنھوں نے اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک نہیں کہا اور اصولوں پر سمجھوتے کیے۔ بندا کے پیش نظر دانش ور کا جو پروٹو ٹائپ تھا، قدیم تاریخ میں اس کی مثال سقراط اور حضرت عیسیٰؑ تھے، اور تمام اہل کلیسا جو حضرت عیسیٰؑ کی وراثت کے محافظ تھے، نیز بندا کی نظر میں اہل کلیسا سچائی اور انصاف کے ابدی معیارات کے علم بردار ہیں۔ بندا، دانش ور کے مذہبی پروٹو ٹائپ میں سقراط کے علاوہ کچھ فلسفیوں کو بھی شامل کر لیتے ہیں، جیسے سپائی نوزا، والٹیئر، ارنسٹ ریناں اور نطشے۔ ریناں نے نپولین کے تشدد کی مذمت کی اور نطشے نے فرانس پر جرمنوں کی بربریت کے خلاف آواز اٹھائی۔ بندا مزید کہتے ہیں کہ ''اصل دانش ور وہ ہے جس کی سرگرمی بنیادی طور پر عملی مقاصد کے تابع نہیں ہوتی۔ وہ اپنی مسرت آرٹ، سائنس یا مابعد الطبیعیاتی غور و فکر میں تلاش کرتا ہے'' اور یہ اعلان کرتا ہے کہ ''یہ دنیا میری مملکت نہیں''۔ بندا کے مطابق حقیقی دانش ور جلاوطنی یا صلیب پر چڑھنے

کے لیے تیار رہتا ہے۔ بندا افسوس سے کہتے ہیں کہ آج کے دانش ور کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ اس نے فرقہ واریت، عوامی احساسات، قومی جنگوں، طبقاتی مفادات کے آگے اپنی اخلاقی طاقت کو ہار دیا ہے۔ اسے بندا دانش ور کی غداری سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ سعید کا خیال ہے کہ بندا پہلی عالمی جنگ اور ڈریفس افیئر (جس کا آغاز ۱۸۹۴ میں فرانسیسی فوجی، مذہباً یہودی الفریڈ ڈریفس پر جرمنوں کو فرانس کے عسکری راز فراہم کرنے سے متعلق غداری کے الزامات سے ہوا، جس میں اسے سزا ملی) کی روحانی تشکیل تھا۔ ان دونوں واقعات نے فرانسیسی دانش وروں کو کٹھن آزمائش سے دوچار کیا؛ ان کے پاس ایک راستہ یہ تھا کہ وہ سامی مخالف رویوں، عسکری ناانصافی اور قومی جوش کے خلاف جرأت سے بولیں؛ دوسرا راستہ یہ تھا کہ بزدلانہ طور پر ہجوم کا ساتھ دیں، یہودی الفریڈ ڈریفس کے دفاع سے انکار کرتے ہوئے، جرمنوں کے خلاف جنگجویانہ ترانے گائیں۔

سعید یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اگرچہ بندا کا دانش ور کا تصور قدامت پسندانہ ہے، مگر یہ طاقت کے خلاف سخت گونج دار لے میں اپنا اظہار کرتا ہے، اور اس کی نظر میں کوئی دنیوی طاقت ایسی نہیں، جس پر تنقید نہ کی جاسکتی ہو اور جس کا محاسبہ نہ کیا جاسکتا ہو۔ 'روایتی دانش ور' بڑی سے بڑی دنیوی طاقت کے آگے بے باکانہ کلمۂ حق کہنے کی جرأت کہاں سے کشید کرتا ہے؟ بندا کے یہاں اس سوال کا بالواسطہ جواب موجود ہے۔ 'روایتی دانش ور' اپنی سرگرمی کو غیر مادی، مابعد الطبیعیاتی اغراض سے وابستہ کرتا ہے؛ اس کی نظر اس دنیا کے بجائے اُس دنیا پر ہوتی ہے، اس لیے اس دنیا کی ترغیب اور خوف اُس پر غالب نہیں آتے۔ سعید، بندا کے دانش ور کی بے خوفی کی تعریف کرنے کے باوجود اسے قبول نہیں کرتے۔ ان کا پہلا اعتراض فلسفیانہ نوعیت کا ہے۔ بہ قول سعید، بندا سچائی اور انصاف کے جن ابدی معیارات کو دانش ور کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں، وہ اس ہماری دنیا کے نہیں ہیں، نیز یہ واضح نہیں ہوتا کہ ابدی اصولوں کی بصیرت کیوں کر حاصل ہوتی ہے۔ سعید کو دوسرا اعتراض یہ ہے کہ بندا کے زمانے میں عوامی ذرائع ابلاغ (ماس میڈیا) موجود نہیں تھے، اس لیے وہ براڈ کاسٹر، کمپیوٹر تجزیہ کار، کھیلوں اور میڈیا کے آئینی ماہرین، پالیسی ماہرین، حکومتی مشیروں، خصوصی مارکیٹ رپورٹ کے متخصصین جیسے دانش وروں کے سماج میں کردار کا اندازہ نہیں کر سکے۔ گرامشی نے جنھیں تنظیمی دانش ور کہا ہے، مذکورہ ماہرین انھی کی قسمیں ہیں۔ لہٰذا سعید کی نظر میں گرامشی کا دانش ور کا تصور حقیقت پسندانہ ہے۔

گرامشی کے تصور کو حقیقت پسندانہ قرار دینے کے پس منظر میں، سعید کا اپنا ترجیحاتی تصورِ کائنات بھی کارفرما ہے۔ سعید مذہبی تصورِ کائنات پر سیکولر تصورِ کائنات کو ترجیح دیتے ہیں۔ سعید کا سیکولر تصورِ کائنات بڑی حد تک اطالوی مفکر گیامبتستا وکو (۱۶۶۸۔۱۷۴۴) کے اس نظریے پر مبنی ہے کہ ہم جس دنیا میں رہتے ہیں، وہ انسانی دنیا ہے، اسے انسانوں نے اپنے ارادوں سے تشکیل دیا ہے، اور سماجی دنیا کا ہر رویہ، ادارہ، رواج، نظریہ

تاریخ کے محور پر تشکیل پایا اور اس سارے عمل میں فطرت یا الوہی قوتوں کا ہاتھ نہیں۔ انسانی سماج میں الوہی قوتیں مداخلت نہیں کرتیں۔ جو لوگ تاریخ کے عمل میں الوہی کردار کا نظریہ پیش کرتے ہیں، وہ دراصل اپنی حکم رانی کا جواز گھڑتے ہیں۔ چناں چہ اس دنیا کو ہم الوہی قوانین کی مدد سے نہیں، فہم کے سیکولر انسانی طریقوں سے سمجھ سکتے ہیں۔ ظاہر ہے اس تصورِ کائنات میں بندا کے روایتی دانش ور کی جگہ نہیں۔

سعید، گرامشی کے دانش ور کے تصور کو حقیقت پسندانہ سمجھنے کے باوجود، اسے کافی نہیں سمجھتے۔ وہ امریکی ماہر عمرانیات الوِن گولڈنر کے حوالے سے کہتے ہیں کہ موجودہ زمانے میں دانش ور نے امرا کے طبقے کی جگہ لے لی ہے (کیوں کہ صنعتی معاشرے میں علم کی صنعت کو حقیقی پیداوار کی صنعت پر برتری حاصل ہو گئی ہے، اور اوّل الذکر صنعت سے وابستہ افراد کافی مالدار ہو گئے ہیں)، مگر وہ وسیع عوام کو مخاطب نہیں کرتے۔ وہ مخصوص زبان میں محدود لوگوں کو مخاطب کرتے ہیں، اور وہی ان کی زبان سمجھتے ہیں۔ وہ فوکو کی یہ رائے بھی درج کرتے ہیں کہ 'آفاقی دانش ور' (جیسے سارتر) کی جگہ 'خصوصی دانش ور' نے لے لی ہے۔ سعید ان خطبات میں ان خصوصی یا تنظیمی دانش وروں کو جگہ جگہ سخت تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔

دانش ور سے متعلق خود سعید اپنا نقطۂ نظر بھی واضح کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں دانش ور ایک ایسا فرد ہے جسے عوام کے لیے کسی پیغام، نقطۂ نظر، رویے، فلسفے، رائے کی نمائندگی، تجسیم اور تشکیل کی صلاحیت ودیعت ہوئی ہے۔ وہ مشکل سوالات اٹھاتا ہے۔ راسخ العقیدگی اور عقیدے (ڈاگما) کا مقابلہ کرتا ہے، نہ کہ انھیں پیدا کرتا ہے۔ دانش ور کی وجہِ جواز تمام لوگوں کے ان تمام مسائل کی نمائندگی ہے، جنھیں فراموش کر دیا گیا یا چھپا دیا گیا ہے۔ سعید دانش ور کے لیے خیال کی تشکیل اور ترسیل کو بہ یک وقت اہمیت دیتے ہیں۔ 'خیال کی تشکیل' کا یہ مفہوم لیا جا سکتا ہے کہ دانش ور کسی راسخ العقیدہ نظریے یا آئیڈیالوجی کا حامل نہیں ہوتا، بلکہ وہ معاصر دنیا کی مختلف روشوں پر سوال اٹھاتا، یا فراموش شدہ مسائل و معاملات کی چھان پھٹک کرتا ہے، اور پھر اسی عمل کے دوران میں 'خیال کی تشکیل' کرتا ہے۔ سعید دانش ور کے لیے آفاقی (اخلاقی) اصولوں کی پابندی تو ضروری قرار دیتے ہیں، مگر کسی راسخ العقیدہ نظریے کی نہیں۔ خیال کی تشکیل ہی سے اس کی ترسیل کا سوال جڑا ہے۔ سعید کے مطابق دانش ور کو ایک ایسا اسلوب اختیار کرنا چاہیے، جو نہ صرف خود دانش ور کی مخصوص آواز کا نمائندہ ہو (جیسے برٹرینڈ رسل یا سارتر)، بلکہ عوام کے لیے قابلِ فہم بھی ہو۔ سعید یہاں اس بحث میں نہیں پڑتے کہ کیا خیال کی تشکیل کا عمل خود ہی اپنے اسلوب کا تعین نہیں کرتا؟ سعید دانش ور کے اسلوب کے لیے ترغیب (Persuasion) کا لفظ استعمال کرتے ہیں، جس سے ان کے دانش ور کے تصور میں ایک گڑبڑ پیدا ہوتی ہے۔ اگر دانش ور کا کام سوال اٹھانا ہے تو وہ اس کام سے ذہن کو جھنجھوڑتا ہے، نہ کہ کسی خاص جواب کو قبول کرنے کے لیے ذہن کو آمادہ کرتا ہے۔ ترغیب، حکومتوں، سیاسی جماعتوں، تجارتی تنظیموں، مذہبی مبلغین کا طریق کار ہے، جنھیں سعید حقیقی دانش ور تسلیم نہیں

کرتے۔ تاہم آگے چل کر سعید یہ کہتے ہیں کہ دانش ور نہ تو مصالحت کرانے والا ہے، نہ رائے ساز، بلکہ تنقیدی شعور کا حامل ہے۔ وہ سرکاری بیانیوں، میڈیا انڈسٹری کی تمثالوں، آسان فارمولوں، بنے بنائے کلیشوں، نیز سٹیٹس کو کی حامل سب قوتوں کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے۔ سعید یہ واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ دانش ور کا کام ہر وقت حکومت پر نکتہ چینی نہیں، تاہم مستقل ذہنی تحرک اس کی بنیادی خصوصیت ضرور ہے۔ سعید دانش ور کو چست و توانا (اتھلیٹک) عقلی توانائی کا حامل سمجھتے ہیں۔

سعید کے مطابق دانش ور کی سرگرمی کا بنیادی مقصد انسانی آزادی اور علم کی ترقی ہے۔ یہ مقصد تنظیمی دانش وروں کے مقصد سے متصادم ہے۔ تنظیمی یا جماعتی دانش ور اپنی اعلیٰ ترین ذہنی صلاحیتوں کو متعلقہ ادارے (جہاں سے وہ تنخواہ لیتا ہے) کی ترقی کے لیے کام میں لاتا ہے۔ وہ آفاقی اخلاقی اصولوں کی جگہ اپنے ادارے کے قواعد کی پابندی کرتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ دانش ور کسی تنظیم یا ادارے سے وابستہ نہیں ہوسکتا۔ دانش ور کے ساتھ بھی پیٹ لگا ہے۔ اصل سوال یہ ہے ایک حقیقی دانش ور کسی ادارے سے وابستگی کا کیا مطلب لیتا ہے؟ کیا وہ تنخواہ لینے کے عوض میں اپنے ضمیر کی آواز فروخت کرتا ہے، یا محض مہارت؟ ایک بات بالکل واضح ہے کہ دانش ور کی ذہنی دنیا اتنی محدود نہیں ہوسکتی کہ وہ کسی بھی ادارے یا تنظیم کے مقاصد کے دائرے میں سما جائے۔ چوں کہ وہ بہت کچھ ایسا لکھتا ہے، جو اس کے تنظیمی فرائض سے مختلف اور الگ ہوتا ہے، اس لیے وہ اپنی ہی تنظیم کے حاشیے پر ہوتا ہے۔ اس ضمن میں سعید امریکی ماہر عمرانیات سی رائٹ ملس کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ آزاد دانش ور یا تو اپنی حاشیائی حیثیت کی وجہ سے بے بسی کا مایوس کن احساس رکھتے ہیں یا اداروں، کارپوریشنوں، یا حکومتوں میں نسبتاً چھوٹے عہدے سنبھالنے کا امکان رکھتے ہیں جو اہم فیصلے غیر ذمہ داری کے ساتھ کرتے ہیں۔ اس کی مثال میں ہم پاکستان و ہندوستان کی یونیورسٹیوں کے متعدد اساتذہ کی مثال پیش کر سکتے ہیں، جنھیں اپنی دانش وری کی خاطر اپنی پیشہ ورانہ ترقیوں کی بھینٹ دینا پڑتی ہے، اور بعض اوقات ملازمتوں سے بھی ہاتھ دھونا پڑتے ہیں۔

سعید دانش ور کے لیے آفاقی اصولوں، اقدار کا ذکر دہراتے ہیں۔ آفاقیت سعید سمیت متعدد مفکروں کے لیے سانپ کے منھ میں چھچھوندر کی مانند ہے، جسے نہ نگلا جا سکتا ہے نہ اُگلا۔ اپنے پہلے خطبے کے خاتمے پر وہ لیوتار کے اس نظریے سے برملا اختلاف کرتے ہیں کہ ''عہد جدید کے آزادی اور روشن خیالی کے کبیری بیانیے مابعد جدید عہد میں باقی نہیں رہے''۔ سعید مابعد جدید مفکروں پر یہ الزام بھی عائد کرتے ہیں کہ وہ مقامی صورت حال، لسانی کھیل اور اظہارات و نمائندگیوں (competence) کو اہمیت دیتے ہیں، اور یوں آفاقیت کو نظر انداز کرتے ہیں، مگر اگلے خطبے ''قوموں اور روایتوں کو فاصلے پر رکھتے ہوئے'' میں جن مباحث کو چھیڑتے ہیں، ان سے واضح ہوتا ہے کہ آفاقیت ایک تجرید ہے، اور دوسری عمومی تجریدوں کی مانند اس کا بھی سیاسی استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً اس خطبے کے آغاز ہی میں کہتے ہیں کہ ہندا کا دانش ور کو آفاقی دنیا کا

باشندہ کہنا درست نہیں۔ بندا دانش ور کو قومی یا نسلی شناخت سے ماورا اور ان ''ماورائی اقدار'' کا حامل سمجھتے ہیں جن کا اطلاق تمام قوموں پر ہوتا ہے۔ سعید کی رائے ہے کہ بندا جسے آفاقی دنیا کہہ رہے ہیں وہ حقیقتاً یورپی دنیا ہے (سوائے حضرت عیسیٰ کے)؛ انیسویں صدی میں یورپ کی 'مقامی اقدار' کو آفاقی بنا کر پیش کیے جانے کا آغاز ہوا تھا۔ سعید واضح کرتے ہیں کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد نوآبادیوں کے ختم ہونے، سرد جنگ کے شروع ہونے، اور تیسری دنیا کے وجود میں آنے کے بعد، نیز سفر اور ابلاغ کے وسائل میں اضافے کے بعد ''یورپ اور مغرب پوری دنیا کے لیے معیار ساز نہیں رہے''۔ یہاں سعید مابعد جدید مفکروں ہی کی اصطلاحات فرق (Difference)، دوسراپن (Otherness) اور مقامیت کاری (Localisation) استعمال کرتے ہیں۔ فرق، دوسرے پن اور مقامیت کاری کی آگاہی بڑھی ہے۔ اب یہ تسلیم کیا جانے لگا ہے کہ فرانسیسی دانش ور، چینی دانش ور کی طرح نہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ پاکستانی دانش ور چینی دانش ور کی مانند نہیں۔ سعید واضح لفظوں میں قبول کرتے ہیں کہ ''دانش ور کے آفاقی ہونے کا تصور لازماً تحلیل ہوا ہے''۔

دانش ور کے آفاقی تصور کو جو باتیں محال بناتی ہیں، ان میں سب سے اہم قومیت ہے۔ قومیت سے جڑا اہم لفظ قوم پرستی ہے۔ سعید یہ بات اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ قوم پرستی کی تشکیل میں زبان کا کردار بنیادی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسل سے لے کر چومسکی تک کوئی اسپرانتو (مصنوعی عالمی زبان) میں نہیں لکھتا۔ ''ہر دانش ور ایک زبان میں پیدا ہوتا ہے اور زیادہ تر اسی زبان میں اظہار کرتے اپنی عمر بسر کر دیتا ہے، جو دانش ورانہ سرگرمی کے اظہار کا ذریعہ ہے''۔ یہیں دانش ور ایک خاص مسئلے سے دوچار ہوتا ہے۔ وہ جس زبان میں اظہار کرتا ہے، وہ پہلے سے موجود ہوتی ہے۔ گویا دانش ور، زبان ایجاد نہیں، اختیار کرتا ہے۔ دانش ور کا مسئلہ یہ ہے کہ زبان میں اظہار کے بعض ایسے رویے غالب ہوتے ہیں، جن کا کام ہی یہ ہے کہ وہ 'سٹیٹس کو' کو قائم، اور کچھ چیزوں کی پہلے سے موجود آگاہی کو جوں کا توں برقرار رکھیں۔ سعید یہاں جارج آرول کے مشہور مضمون 'Politics and the English Language' (مطبوعہ ۱۹۴۶) کا حوالہ دیتے ہیں۔ آرول کے مطابق کلیشے، مردہ استعارے، بے حس تحریریں زبان کے انحطاط کی علامتیں ہیں۔ انھیں پڑھ اور سن کر ذہن سُن ہو جاتا ہے۔ ان کا اثر ذہن پر اس پس منظری موسیقی کا سا ہوتا ہے جو کسی سپر مارکیٹ میں مدھم سروں میں بج رہی ہوتی ہے، جو شعور پر حاوی ہو جاتی اور خیالات وجذبات کو (اشیا کی) منفعل قبولیت کے لیے بہکاتی ہے۔ کلیشے صرف زبان کا انحطاط نہیں، خیالات اور قوت ایجاد کا انحطاط بھی ہے، مگر اس انحطاط کا فائدہ سیاست دان اٹھاتے ہیں۔ وہ کلیشوں کے ذریعے کئی قسم کی جھوٹی باتوں کو سچ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ سعید اس ضمن میں ان قومی کارپوریٹ شناختوں کا ذکر کرتے ہیں جنھیں ''ہم'' (we) اور ''ہمیں'' (us) جیسے الفاظ سے مستحکم کیا جاتا ہے۔ قومی زبانوں میں جاری ہونے والے اخبارات میں ''ہم

امریکی''،''ہم برطانوی'' اور اردو میں ''ہم پاکستانی'' جیسے الفاظ اس قومی شناخت کا تصور راسخ کرتے ہیں ، جو اصل میں تجرید ہے۔ سعید کے مطابق ''صحافت اس شے کو واضح اور ٹھوس بناتی ہے جو قومی زبان میں مضمر ہوتی ہے''۔ قومی زبان میں ''ہم'' کے علاوہ ''انھیں'' (them) کا تصور بھی ہوتا ہے۔ سعید کا تجزیہ ہے کہ ''ہم'' کے ذریعے اگر ایک طرف قومی شناخت پیدا ہوتی ہے، تو دوسری طرف اس شناخت کو ''انھیں'' کی وجہ سے خطرے میں ہونے کا احساس بھی پیدا ہوتا ہے۔ چناں چہ ''اس [تفریقی شناخت] کے زیر اثر علم اور کمیونٹی [آفاقی نوعیت کی] نہیں، عدم رواداری اور خوف پیدا ہوتا ہے''۔ عدم رواداری اور خوف حقیقی اور لفظی جنگوں کا باعث بنتے ہیں۔

اس بحث کے ذریعے سعید یہ واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ دانش ور کو کس قسم کی بندشوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آخر ایک دانش وران فصیلوں سے باہر کیسے نکلے جو قوم یا کسی دوسری قسم کی کمیونٹی (جیسے یورپ، مغرب، ایشیا، افریقا) نے تعمیر کر رکھی ہیں؟ بہ قول سعید عوامی گفتگو میں ''انگریز''، ''عرب''، ''امریکی'' یا ''افریقی'' سے بڑھ کر کوئی دوسرے الفاظ عام نہیں۔ ان میں سے ہر لفظ نہ صرف پورے کلچر بلکہ ایک خاص ذہنی رویے (مائنڈ سیٹ) کا حامل بھی ہے۔ قومی کارپوریٹ شناختوں سے عبارت ان الفاظ کے ذریعے کسی کمیونٹی میں حقیقی طور پر موجود مختلف و غیر متجانس عناصر کا انکار کیا جاتا ہے۔ یہاں سعید مغرب کے اسلام کی طرف 'کارپوریٹ رویے' کا ذکر کرتے ہیں۔ امریکی اور برطانوی اکیڈمک دانش ور، ایک ارب مسلمانوں کے بارے میں، جو نصف درجن (حقیقتاً کہیں زیادہ) زبانیں بولتے ہیں، غیر ذمہ دارانہ انداز میں گفتگو کرتے ہیں۔ وہ اسلام کی ڈیڑھ ہزار سالہ تاریخ کے بارے میں کبیری تعمیمات سے کام لیتے ہیں، اور اسلام اور جمہوریت، اسلام اور انسانی حقوق، اسلام اور ترقی میں عدم مطابقت سے متعلق ڈھٹائی سے آرا قائم کرتے ہیں۔ سعید اسلام کو ایک مذہب اور کلچر سمجھتے ہیں: یہ دونوں کسی واحد کلیے کے اسیر نہیں ہیں؛ ان کی متعدد تعبیریں ہیں۔ وہ شامی مسلم دانش ور ادونس کے حوالے سے کہتے ہیں کہ کیا اسلام حکمرانوں کا ہے، یا انحراف پسند شعرا اور مسالک کا؟ مغرب اسلام کے غیر متجانس کردار پر زور دیتا ہے، اور اس کی تاریخ میں عقلیت و سائنس اور اجتہادی فکر کے حامل عناصر کی نفی کرتا ہے۔ یہاں سعید کا اشارہ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد اسلام سے متعلق اس امریکی ڈسکورس کی طرف ہے، جس میں اشتراکیت کی جگہ اسلام کو ملی ہے۔ سعید کے یہ خطبات گیارہ ستمبر (نائن الیون) کے واقعے سے پہلے دیے گئے تھے۔ اس واقعے کے بعد اسلام کی بابت امریکی ڈسکورس میں شدت پیدا ہوئی ہے۔

سعید کے نزدیک قوم پرستی سے متعلق کارپوریٹ فکر سے آزاد ہونے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ دانش ور متجسس، تشکیک پسند فرد کا کردار اختیار کرے۔ وہ ایک بار پھر یہ واضح کرتے ہیں کہ قوم اور گروہ فطری یا خدائی عطیہ نہیں، بلکہ تشکیل اور بعض صورتوں میں ایجاد ہیں، جن کے پیچھے جدوجہد اور فتح کی تاریخ

ہے۔ قوم کے تاریخی طور پر تشکیل پانے کا یہ علم، دانش ور کو ذہنی آزادی دیتا ہے: وہ کسی عقیدے، اسطور، آئیڈیالوجی کے زیر اثر نہیں آتا؛ وہ انسانی معاملات کا تجزیہ اس انسانی علم کی مدد سے کرتا ہے، جسے ماورائے خطا ہونے کا گھمنڈ نہیں ہوتا۔ دانش ور کی نظر میں کوئی روایت اتنی مقدس نہیں ہوتی کہ اس کی تاریخ اور انسانوں پر اس کے اثرات کے ضمن میں سوالات قائم نہ کیے جاسکیں۔ چوں کہ قوم کی تاریخ جدوجہد اور تسخیر سے عبارت ہے، اس لیے دو طبقے وجود میں آتے ہیں: فاتح اور مغلوب: غالب اور نمائندگی سے محروم۔ دانش ور اگر کسی آفاقی اخلاقیات کا حامل ہوسکتا ہے تو وہ ہے، مغلوب، غیر نمائندگی پذیر، فراموش کردہ، نظر انداز کردہ طبقے کی خاموشی کو آواز دینا۔ سعید ماہر عمرانیات ایڈورڈ شلس کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ دانش ور دو انتہاؤں پر کھڑے ہیں: وہ یا تو غالب اقدار، اصولوں کے خلاف ہیں یا مصلحت آمیز انداز میں وہ عوامی زندگی میں تنظیم اور تسلسل مہیا کرتے ہیں۔ سعید کی رائے ہے کہ جدید دانش ور کے لیے اوّل الذکر کردار ہی حقیقی ہے، یعنی غالب رجحانات کو چیلنج کرنا، کیوں کہ غالب اقدار و اصول قوم سے جڑے ہیں جو ہمیشہ تسخیر پسند ہیں، اسے اختیار و مرتبہ حاصل ہے: قوم، دانش ور سے تحقیق اور تجزیے کی بجائے وفاداری اور متابعت کا تقاضا کرتی ہے۔ دانش ور کو اس تقاضے کے آگے جھکنے سے انکار کر دینا چاہیے۔ اسے اپنی دانش ورانہ فکر کے سوا کسی سے وفادار نہیں ہونا چاہیے۔

اس خطبے کے آخری حصے میں دو اہم سوال سعید نے اٹھائے ہیں۔ ایک یہ کہ دانش وران لسانی بندشوں سے کیسے آزاد ہو، جن سے قومی شناخت مستحکم (اور ساتھ ہی خطرے سے دوچار) ہوتی ہے؟ سعید کا خیال ہے کہ قومی زبانیں ہمارے ارد گرد برائے استعمال موجود نہیں ہوتیں، بلکہ انھیں 'اپنانا' (appropriate) پڑتا ہے۔ 'اپنانا' دراصل دانش ور کا موقف ہے۔ عام لوگوں کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ وہ قومی زبانوں کی تمام عمومی علامتوں کو بے چون وچرا قبول کر لیتے اور ان کی مدد سے اپنے تخیل میں قومی شناخت کا ایک پر شکوہ قلعہ تعمیر کر لیتے ہیں۔ وہ زبان کو 'اپناتے' نہیں، زبان کو موقع دیتے ہیں کہ وہ انھیں اپنا لے۔ جب کہ دانش ور سوال اٹھا کر، انحراف کی روش اپنا کر زبان کو اپناتا ہے۔ وہ عمومی علامتوں، کلیشوں وغیرہ میں اظہار کرنے کے بجائے، ان پر سوال قائم کرتا ہے؛ جن عمومی علامتوں سے ذہن سُن ہوجاتے ہیں، انھیں نہ صرف تحلیل و تجزیہ کا موضوع بناتا ہے، بلکہ ایک غیر عمومی اسلوب بھی اختیار کرتا ہے۔ یہیں ہمیں اس سوال کا جواب بھی ملتا ہے کہ کیوں دانش ور اپنا اظہار نئی اصطلاحات میں کرتے ہیں، اور کیوں خطیبانہ اور شاعرانہ اسلوب سے بیزار ہوتے ہیں۔ نسبتاً نامانوس زبان، ایک حقیقی تخلیق کار ہی کی نہیں، دانش ور کی بھی ضرورت ہے۔ محاورات، کہاوتوں، معروف شعری استعاروں سے لبریز زبان ذہن کو لوری دیتی ہے، (جسے بعض لوگ لطفِ زبان یا لطفِ سخن کہتے ہیں) جگاتی نہیں۔

دانش ور کی قومی وفاداری کی کیا حقیقت ہے؟ اس دوسرے سوال کے ضمن میں سعید یہ تو تسلیم

کرتے ہیں کہ ہم سب بغیر کسی استثنیٰ کے قومی، مذہبی یا نسلی کمیونٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہم خواہ کس قدر مزاحمت واحتجاج کرلیں، اپنے خاندان اور قومیت سے جدا نہیں ہو سکتے۔ سعید قوم و مذہب سے جڑے رہنے اور وفاداری کو مترادف نہیں سمجھتے۔ یوں بھی قوم سے علٰیحدگی کے بعد دانش ور مخاطب کس کو کرے گا؟ سعید کی رائے میں جب کوئی قوم سیاسی یا حقیقی طور پر کسی خطرے سے دوچار ہو (جیسے فلسطین و بوسنیا، یا طالبان کے ہاتھوں پاکستان) تو قومی دشمنوں کے خلاف دفاع لازم ہے۔ اسے وہ 'دفاعی قوم پرستی' کہتے ہیں۔ یعنی ایمر جنسی کی حالت میں قوم کی بقا باقی لوگوں کے ساتھ دانش ور کے لیے بھی اہمیت اختیار کر جاتی ہے۔ تاہم وہ فرانز فینن کا حوالہ دے کر لکھتے ہیں کہ ''استعمار مخالف قوم پرستی کے مقبول گیت (جیسے پارٹی اور لیڈر شپ کی تائید) کا ساتھ کافی نہیں''۔ نیز ''کیا ہم نوآبادیات سے خود کو نجات دلانے کے لیے لڑ رہے ہیں یا ہم یہ سوچ رہے ہیں کہ جب آخری سفید پولیس والا چلا جائے گا تو ہم کیا کریں گے؟ مقامی دانش ور کا مقصد محض سفید پولیس والے کو اس کے مقامی ہم منصب سے بدلنا نہیں، بلکہ نئی 'روحوں' کی ایجاد ہے''۔ سعید واضح لفظوں میں لکھتے ہیں کہ بقا کے لیے اجتماعی جنگ سے وفاداری، دانش ور کی تنقیدی حس کو سُن نہیں کر سکتی۔ اس دوران میں بھی اسے اپنی لیڈر شپ کی ان روشوں پر تنقید کرنی چاہیے، جن کی وجہ سے کچھ خیالات، معاملات حاشیے پر چلے جاتے ہیں دانش ور کو دفاعی قوم پرستی اور لیڈر شپ پر تنقید کے علاوہ ایک تیسرا کام بھی کرنا چاہیے۔ مقامی بحران کو آفاقی بنانا؛ اپنی قوم کی تکالیف کو وسیع انسانی مفہوم دینا، اپنے تجربے کو دوسروں کے مصائب سے وابستہ کرنا۔

حاشیے کا تصور سعید کی فکر میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ دانش ور طاقت کے ان تمام مظاہر اور علامتوں کا پردہ چاک کرتا ہے، جو اخلاقی و علمی اہمیت کے حامل معاملات کو حاشیائی حیثیت سے ہم کنار کرتی ہیں۔ اس موضوع کی مزید وضاحت، سعید اپنے تیسرے خطبے بہ عنوان ''دانش ورانہ جلاوطنی: وطن بدر اور حاشیائی دانش ور''، میں کرتے ہیں۔ خطبے کے آغاز میں سعید قبل جدید عہد اور جدید عہد کی جلاوطنی میں فرق کرتے ہیں۔ قبل جدید عہد میں مخصوص افراد کو جلاوطنی پر مجبور کیا جاتا تھا۔ ان کے لیے وطن بدری ایک جذامی تجربہ تھا؛ جلاوطن کو اچھوت سمجھا جاتا تھا۔ جدید عہد میں جلاوطنی پورے سماج کی ظالمانہ سزا میں بدل گئی ہے۔ (سعید یہاں آرمینیائی لوگوں کی مثال دیتے ہیں۔ مشرقی بحیرہ روم کے یہ باشندے ترکوں کے ہاتھوں نسل کشی کی وجہ سے الیپو، یروشلم اور قاہرہ میں آباد ہوئے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد پھر دربدر ہوئے۔ سعید پاکستان کی طرف مسلمان مہاجرین اور اسرائیل کی طرف یورپی و ایشیائی یہودیوں کی ہجرت کی مثال بھی دیتے ہیں)۔ سعید اس مقبول عام مگر مکمل طور پر غلط مفروضے کی نفی کرتے ہیں کہ جلاوطن لوگ اپنی جنم بھومی سے یکسر کٹ جاتے، بیگانہ ہو جاتے، یا مایوسانہ طور پر الگ ہو جاتے ہیں۔ قبل جدید عہد میں جلاوطن شخص کو کوئی شے اپنے وطن کی یاد دلانے کو موجود نہیں ہوتی تھی؛ وہ ماضی کے سلسلے میں حد درجہ دل شکستہ اور حال

و مستقبل کے ضمن میں تلخی کے احساسات رکھتا تھا، جب کہ جدید زمانے میں متعدد چیزیں ایک جلاوطن شخص کو اپنے وطن و ماضی کی یاد دلاتی ہیں (جیسے وہاں کے لوگوں، اشیا، مصنوعات کی مسلسل آمد و رفت سے، اور ذرائع ابلاغ کی خبریں، رپورٹیں وغیرہ)۔ چناں چہ بہ قول سعید آج کا جلاوطن ایک وسطی حالت میں رہتا ہے: وہ نہ تو پورے طور پر نئے ماحول سے ہم آہنگ ہوتا، نہ قدیم ماحول سے مکمل طور پر آزاد ہوتا ہے: وہ نیم شرکت اور نیم علیحدگی سے مغلوب رہتا ہے: ایک سطح پر ناسٹلجیائی اور جذباتی ہوتا ہے، اور دوسری سطح پر (نئے ماحول کی) ماہرانہ انداز میں نقل کرنے والا، ایک خاموش آوارہ وطن ہوتا ہے۔ سعید اس ضمن میں وی ایس نائپال کے ناول Bend in the River کے مرکزی کردار سلیم کی مثال دیتے ہیں جو ہندوستانی نژاد مشرقی افریقی مسلمان ہے۔

سعید جلاوطن کمیونٹی کی صورت حال کا خیال انگیز تجزیہ کرتے ہیں۔ وہ پاکستان اور اسرائیل کے مہاجرین پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کی ہجرت، تقسیم اور علیحدگی کی آئیڈیالوجی کے تحت ہوئی تھی۔ اس آئیڈیالوجی نے فرقہ وارانہ مسائل کو حل کرنے کی بجائے انھیں زندہ رکھا ہے۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ (جلاوطن گروہوں کے) دانش ور جب تک خود کو بے خانماں کمیونٹی کو متاثر کرنے والی صورتِ حال کا حصہ سمجھتے ہیں، وہ ثقافتی آمیزش (acculturation) سے زیادہ، ثقافتی عدم توازن کا سرچشمہ بننے کا امکان رکھتے ہیں۔ حقیقتاً یہ دانش ور اپنی قدیمی شناخت اور نئی، نسبتاً مختلف ثقافتی صورت حال میں موجود خلا کو پُر کرنے کی کوشش کرنے کے بجائے، اسے اُبھارنے اور اس کی بنیاد پر مراعات حاصل کرنے کی سیاست کرتے ہیں۔

اس خطبے کا انتہائی فکر انگیز نکتہ جلاوطنی کو ایک استعاراتی حالت کہنا ہے۔ سعید کے مطابق اگرچہ جلاوطنی ایک حقیقی حالت ہے، ساتھ ہی یہ ایک استعاراتی حالت بھی ہے۔ نیز جلاوطنی محض ہجرت اور بے دخلی کی سیاسی تاریخ تک محدود نہیں۔ سعید اس بات کی وضاحت میں کہتے ہیں کہ کسی معاشرے کے تاحیات شہری بھی درونی / مانوس (insiders) اور بیرونی / اجنبی (outsiders) افراد میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔ درونی افراد کسی بغاوت و انحراف کی واضح آواز کے بغیر جی حضوریے (yea-sayers) ہوتے ہیں: وہ سماج کا ساتھ دینے کے بدلے ترقی پاتے ہیں۔ دوسرے انکار پسند (nay-sayers) ہوتے ہیں: ان کے سماج سے تعلقات ناہموار ہوتے ہیں: بغاوت و انحراف کی اونچی لے کی وجہ سے وہ مراعات، طاقت، اختیارات اور اعزازات نہیں پاتے۔

جلاوطنی کی حقیقی صورت حال عبارت ہے، مقامی لوگوں کی مانوس فضا میں خود کو اجنبی محسوس کرنے سے۔ تمام بیرونی دانش ور خود کو اپنے ہی سماج میں اجنبی پاتے ہیں۔ سعید کی رائے میں، اس مابعد الطبیعیاتی مفہوم میں جلاوطنی کا مطلب ہے، بے چینی، بے قراری، مستقل طور پر مضطرب ہونا اور مضطرب رکھنا۔ گھر واپسی

کا ناممکن ہونا اور نئی جگہ میں بے خانماں ہونے کا احساس ہی، تمام اضطراب کا باعث ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ جلاوطن دانش ور اس اضطراب کو دبانے کی بجائے، اسے اپنی فکر کی غذا بناتا ہے۔ جلاوطنی اپنے بھرپور استعاراتی دلالتوں کے ساتھ، اس کا طرزِ فکر بن جاتی ہے۔ یہاں سعید تھیوڈور ڈبلیو اڈورنو (۱۹۰۳۔۱۹۶۹) کی مثال پیش کرتے ہیں۔ ۱۹۳۰ کی دہائی میں نازی جرمنی سے ہجرت کر کے، پہلے لندن اور پھر امریکا جانے والے، اور ۱۹۴۹ میں واپس جرمنی آنے والے اڈورنو ایسے مفکر ہیں جنھیں سعید 'بیسویں صدی کا ممتاز دانش ورانہ ضمیر' قرار دیتے ہیں۔ اگرچہ اڈورنو کا نیویارک میں پانچ سال (۱۹۳۶ تا ۱۹۴۱) قیام رہا، مگر انھوں نے جلاوطنی کو اس کے حقیقی و استعاراتی معنوں میں ایک گہرا تجربہ بنایا۔ بہ قول سعید وہ اپنے جوہر میں دانش ور تھا، یعنی تمام نظاموں سے نفرت کرنے والا، خواہ وہ 'ہمارے' ہوں یا 'ان کے'۔ اڈورنو ایک مستقل جلاوطن دانش ور تھا۔ اڈورنو کہتے ہیں کہ حقیقی معنوں میں قیام اب ناممکن ہے۔ وہ روایتی قیام گاہیں، جہاں ہم پلے بڑھے، اب ناقابلِ برداشت ہوگئی ہیں؛ ان کی آسائش کی قیمت علم کے ظہور (اور نئے انکشافات) سے ادا کی جاچکی ہے۔ اڈورنو مزید کہتے ہیں کہ گھر اب قصۂ ماضی ہے۔ نئی اخلاقیات کا تقاضا ہے کہ 'گھر میں بے گھر رہا جائے'۔ نیز غلط زندگی صحیح طور پر نہیں گزاری جاسکتی۔ سعید، اڈورنو کے موقف کی وضاحت میں کہتے ہیں کہ جلاوطنی جس وسطی حالت کی علم بردار ہے، وہ حالت بھی ایک جامد آئیڈیالوجی میں بدل سکتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں کوئی شخص، گھر اور بے گھری کی حالت سے وابستہ اضطراب کا عادی ہوسکتا ہے، جس کا مطلب دانش ورانہ جوہر (بے چینی) کی موت کے سوا کچھ نہیں۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ کلاسیکی اردو شاعری میں گھر اور بے گھری کے تجربے سے وابستہ اضطراب کا اظہار عام ملتا ہے۔ جسے سعید نے مابعد الطبیعیاتی جلاوطنی کا نام دیا ہے، اس کی اتنی کیفیتیں اردو شاعری میں ملتی ہیں کہ ان پر الگ ایک مقالہ لکھا جاسکتا ہے۔ جلاوطنی کے مضمون کی تہہ میں کہیں تو وحدت الوجودی فکر کام کررہی ہے، کہیں عشق کی غارت گری، کہیں ناقدریِ زمانہ، کہیں روح و بدن کی کش مکش اور کہیں اپنے عہد سے اجنبیت کا احساس۔ یہ چند اشعار دیکھیے:

مسافر ہو کے آئے ہیں جہاں میں تس پہ وحشت ہے
قیامت تھی اگر ہم اس خرابہ میں وطن کرتے

انعام اللہ یقیں

رہے پھرتے دریا میں گرداب سے
وطن میں بھی ہیں ہم سفر میں بھی ہیں

میر تقی میر

کون و مکاں سے ہے دلِ وحشی کنارہ گیر
اس خانماں خراب نے ڈھونڈا ہے گھر کہاں

الطاف حسین حالی

تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

مرزا غالب

نہ پوچھو مجھ سے لذت خانماں برباد رہنے کی　　نشیمن سیکڑوں میں نے بنا کر پھونک ڈالے ہیں

علامہ اقبال

ذکر ہو رہا تھا اڈورنو کا۔ ان کی فکر کی ترجمانی ان کے اس اندازِ تحریر میں ہوتی ہے، جو انتہائی حدوں میں تشکیل پاتا ہے۔ ایقان شکن تشکیک اور اطمینان کو پارہ پارہ کرنے والا استفہام ہی، دانش ور کو انتہائی حدوں میں لے جاتے ہیں۔ اڈورنو کہتے ہیں کہ جس کے پاس گھر نہیں، اس کے لیے، اس کی تحریر ہی رہنے کی جگہ ہے۔ اڈورنو کی دانش میں چوں کہ قیام ناممکن ہے، اس لیے تحریر بھی مستقل ٹھکانہ نہیں ہو سکتا۔ مستقل ٹھکانہ، حد یا منجمد آئیڈیالوجی میں بدلنے کا امکان رکھتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ادیب بردانش ور تحریر سے جلاوطن کیسے ہو؟ اسے اپنی تحریر کو مخصوص اسلوب، کلیشوں، چند گنے چنے سوالات، پیش گوئی کیے جانے والے استفہامیوں کی آماج گاہ نہیں بننے دینا چاہیے۔ بہ قول سعید دانش ور بنیادی طور پر علم اور آزادی کا علم بردار ہے (یہ ایک تجریدی بات نہیں، ایک حقیقی تجربہ ہے)۔ وہ رابن کروسو کی طرح نہیں جس کا مقصد ایک چھوٹے جزیرے کو نو آبادی بنانا ہے، مارکو پولو کی مانند ہے جو ہر مقام پر خود کو عارضی مہمان سمجھتا ہے؛ حملہ آور اور فاتح نہیں۔ ادیب بردانش ور کے لیے روا نہیں کہ وہ اپنی تحریر کو اپنی نو آبادی بنائے؛ اسے اپنی ہر تحریر کو عارضی ٹھکانہ بنانا چاہیے۔ یہ ان لوگوں کے لیے لمحہ فکریہ ہے جو اپنے اسلوب خاص پر فخر کرتے ہیں۔

اڈورنو دانش ورانہ فکر کو جن انتہائی حدوں میں لے جانے کی تجویز پیش کرتے ہیں، ان کا نتیجہ یاسیت اور کلبیت ہو سکتا ہے۔ سعید دانش ور کے لیے تشکیک، شوخی اور طنز کو تو ضروری قرار دیتے ہیں، مگر کلبیت کو نہیں۔ دانش ور کی جلاوطنی اسے سماج میں حاشیائی مقام دیتی ہے؛ انعامات و اعزازات، ایک طرح سے گھر کی فضا سے عبارت ہیں۔ انعام و اعزاز کی مانوس دنیا میں دانش ور کی اجنبیت اسے حاشیائی حیثیت دیتی ہے۔ اگر دانش ور اپنی جلاوطنی کو گریہ وزاری میں بدل لیتا ہے، تو اس کا کلبی ہو جانا یقینی ہے۔ انعامات و اعزازات سے محرومی کا قلق اسے ایک مایوس روح میں بدل سکتا ہے۔ سعید اس خیال کے حامی محسوس ہوتے ہیں کہ تحریر، دانش ور کا گھر ہو سکتی ہے۔ دانش ورانہ تحریر کے اپنے اعزازات ہیں اور تحریر ایک اور قسم کے گھر کی فضا کی حامل ہو سکتی ہے۔ اڈورنو کے یہاں نطشے کی عدمیت کا عکس محسوس ہوتا ہے، جو تمام اخلاقی اقدار کی معروضی بنیاد کا یکسر انکار کرتی ہے۔ جب کہ سعید ان اقدار پر سوال قائم کرتے ہیں، جو دنیا کو محروم اور مراعات یافتہ طبقوں میں تقسیم کرتی ہیں۔ سعید تجریدی فلسفیانہ فکر پر سماجی، سیکولر فکر کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ ایک انوکھا اتفاق ہے کہ اردو میں مرزا غالب دانش ور کے اسی تصور کے حامل محسوس ہوتے ہیں، جسے سعید ان خطبات میں دہراتے ہیں۔ تشکیک، شوخی اور طنز غالب کی شاعری کے اساسی عناصر ہیں۔ غالب ان تمام کبیری تصورات پر شوخ و طنزیہ انداز میں استفہام قائم کرتے ہیں، جو اپنی اصل میں تجرید ہیں۔ مثلاً غالب کا یہ شعر: مَتا ہے فوت فرصتِ ہستی کا غم کوئی / عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو، دانش

ورانہ شوخی کا کیسا عمدہ اظہار ہے۔

سعید کے نزدیک جلاوطنی کا سب سے اہم تحفہ 'دوہرا تناظر' ہے۔ جلاوطنی کا ہر منظر یا صورتِ حال ،گھر کے منظر یا صورتِ حال کی طرف دھیان منتقل کرتی ہے۔ بہ قول سعید عقلی طور پر اس کا مطلب ہے کہ ہر خیال یا تجربہ، دوسرے خیال یا تجربے کے روبرو ہے۔ نئے ملک اور پرانے ملک کے تناظرات کے دوبدو ہونے سے، دونوں ایک نئی روشنی میں آجاتے ہیں، اور ایک ایسے علم کو ممکن بناتے ہیں جس کی پہلے پیش گوئی نہیں کی جاسکتی۔ دوہرا تناظر اس بات کو ممکن بناتا ہے کہ ہم اپنے وطن کو دوسروں کی نظر سے اور دوسروں کو اپنے وطن کی نگاہ سے دیکھ سکیں۔ بسا اوقات حب الوطنی ہمیں تنگ نظری و تعصب کا شکار کرتی ہے، دوہرا تناظر ہمیں ان سے آزادی دلاتا ہے۔ یہاں سعید ایک بار پھر مغرب کے اسلام سے متعلق ڈسکورس کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''میں نے محسوس کیا ہے کہ اسلامی بنیاد پرستی سے متعلق یورپ کی انتہائی ناقص بحثیں دانش ورانہ طور پر اشتعال انگیز ہیں، کیوں کہ ان کا موازنہ یہودی یا عیسائی بنیاد پرستی سے نہیں کیا گیا، جو مشرق وسطی کے میرے تجربے کے مطابق غالب اور نفرت انگیز ہیں''۔ گویا ان بحثوں پر یورپ کا محض ایک، مقامی تناظر حاوی ہے۔ سعید خود مسلمان ملکوں میں اسلام کی بحثوں کا حوالہ نہیں دیتے، جہاں ایک طرف اسلام کے نام پر بادشاہت کے ظالمانہ نظام کی دہشت سے لے کر فرقہ وارانہ قتل و غارت کا بازار گرم ہے، اور دوسری طرف مغرب کی سیکولر فکر کے ساتھ وہی سلوک کیا جاتا ہے جو اسلام کے سلسلے میں مغرب کے دانش ور کرتے ہیں۔ دونوں جگہ واحد، مقامی تناظر حاوی ہے۔ مغرب میں اسلام کی بحثیں اور مسلم دنیا میں مغربی تہذیب کی بحثیں، دو انتہاؤں پر ہیں۔ اس 'انتہا پسندی' کا نقصان مغرب کو کم، مگر مسلم دنیا کو زیادہ ہے۔ عام طور پر مسلم دنیا کے دانش ور، اسلام سے متعلق مغربی مباحث کو بنیاد بنا کر سیکولر انسانی تہذیب کے حقیقی ثمرات سے نفرت کا پرچار کرتے ہیں۔ لہٰذا مسلمان ملکوں کے تناظر میں بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا یہاں اس ایقان شکن تشکیک کے لیے فضا سازگار ہے، جو دانش وری کی اساس ہے؟ ظاہر ہے اس سوال کو اخباری کالم نویس، اینکر پرسن اور ان کے پروگراموں میں روزانہ شام کو گل افشانیِ گفتار کا مظاہرہ کرنے والے 'ماہرین' زیرِ بحث لانے سے تو رہے!

کیا ایک دانش ور پوری آزادی کے ساتھ، من موجی انداز میں کام کرسکتا ہے؟ معاشی اعتبار سے کسی کا مرہونِ منت، اور نظریاتی لحاظ سے کسی کا وفادار ہوئے بغیر کیا وہ دانش ورانہ سرگرمی جاری رکھ سکتا ہے؟ انیسویں صدی میں بوہیمین دانش ور کا تصور سامنے آیا تھا، جب کہ بیسویں صدی میں کیفے فلسفی، ٹی ہاؤس دانش ور کی جگہ تنظیمی دانش وروں نے لے لی: بیسویں صدی میں علم کی صنعت کے غیر معمولی فروغ سے 'دانش وروں' کی بہتات ہوگئی۔ یہ 'دانش ور' سرکاری، نیم سرکاری، نجی اداروں اور سیاسی، مذہبی، فلاحی جماعتوں سے وابستہ ہیں اور تنخواہ اور مراعات حاصل کرتے ہیں۔ ان سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے

دارے یا جماعت کے معاشی و نظریاتی مفادات سے وفاداری کا مظاہرہ کریں۔ اسی تناظر میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم ایک ایسے دانش ور کا آج تصور کر سکتے ہیں جو کارپوریٹ فکر کی بجائے، انفرادیت پسند فکر کا حامل ہو؟ سعید یہ سوال اپنے چوتھے خطبے ''پیشہ ور اور باذوق دانش ور'' میں اٹھاتے ہیں۔ ان کا مئوقف ہے کہ مذکورہ سوال کا جواب ضروری ہے، کیوں کہ یہ جواب، دانش ور کے ہم سے خطاب کی توقعات کو متاثر کرتا ہے۔ کیا اس کا نقطہء نظر ایک آزاد شخص کا نقطہء نظر سمجھا جائے، یا حکومت، منظم سیاسی جماعت، کسی لابی کا نقطہء نظر؟ سعید یہ تسلیم کرتے ہیں کہ آج انیسویں صدی کے بوہیمین دانش ور کا تصور ممکن نہیں؛ آج ہر دانش ور کسی نہ کسی ادارے سے وابستہ ہے۔ لیکن کیا ادارے سے وابستگی، اس کی آزادانہ رائے کو ناممکن بناتی ہے؟ سعید کہتے ہیں کہ اس سوال کا جواب مثالیت اور حقیقت کے امتزاج کی روشنی میں زیر بحث لایا جاسکتا ہے، نہ کہ کلبیت کی روشنی میں۔ کلبی شخص بہ قول آسکر وائلڈ، وہ شخص ہے جو ہر شے کی قیمت جانتا ہے، مگر قدر کسی کی نہیں۔ سعید کے مطابق یہ سمجھنا ایک کلبی رویہ ہوگا کہ پورا معاشرہ اس قدر بدعنوان ہوگیا ہے کہ ہر شخص دولت کے آگے جھک جاتا ہے۔ اسی طرح ایک مکمل بے نیاز، خود نگر دانش ور کا وجود بھی غیر حقیقی ہے۔ گویا ادارے سے وابستگی کے باوجود ایک شخص، حقیقی دانش ور کا کردار ادا کرسکتا ہے۔ گویا بوہیمین دانش ور کا تصور مثالی، مگر ادارے سے وابستگی کے باوجود اپنی انفرادیت کو قائم رکھنا حقیقت پسندانہ تصور ہے۔ تاہم وہ اکیڈمک دانش وروں کے ضمن میں یہ ضرور کہتے ہیں کہ بیسویں صدی میں ان کی تحریریں فقط عوامی مباحث پر مرکوز نہیں، بلکہ تنقید اور بت شکنی سے متعلق ہیں، جن میں قدیم روایات کے جھوٹے پیغمبروں کو بے نقاب کیا گیا اور کھوکھلے ناموں کا بھانڈا پھوڑا گیا ہے۔ یہاں ان کا واضح اشارہ نئی تنقیدی تھیوری کی طرف ہے، جو اتھارٹی کی ہر شکل کو معرض سوال میں لاتی ہے۔

سعید اپنے خطبات میں دانش ور کی انفرادیت پر جا بجا زور دیتے ہیں۔ ان کی نظر میں دانش ور کو کارپوریٹ فکر کا شکار ہونے اور اس کا ترجمان بننے سے اگر کوئی شے بچا سکتی ہے تو وہ اس کی انفرادیت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کارپوریٹ فکر کی آکاس بیل، دانش ور کے بنیادی جوہر ہی کو چوس لیتی ہے۔ بوہیمین دانش ور کو یہ سہولت حاصل تھی کہ وہ ان تمام تنظیموں سے بے زاری کی حد تک دور تھا، جو اسے سٹیریو ٹائپ فکر کے دام میں لا سکتی تھیں، اور اس طرح وہ اپنی شدید انفرادیت کا تحفظ کرسکتا تھا، مگر جدید دانش ور اس سہولت سے محروم ہے۔ اردو میں بوہیمین دانش ور کا اوّلین، اور نسبتاً نامکمل تصور ہمیں توبۃ النصوح کے کلیم کی شکل میں ملتا ہے۔ وہ جب اپنے باپ سے کہتا ہے: ''مجھ کو تمھارے ماں باپ ہونے سے انکار نہیں۔ گفتگو اس باب میں ہے کہ تم کو میرے افعال میں زبردستی دخل دینے کا اختیار ہے یا نہیں۔ سو میں سمجھتا ہوں کہ نہیں ہے''، تو وہ اپنی انفرادیت کا تحفظ کرتا ہے۔ باپ کی اتھارٹی سے انکار، استعاراتی طور پر سماج کی مقتدر قوتوں سے انکار ہے۔ اس کے انکار کی بنیاد، شاعری سمیت دیگر فنون سے اس کی دل چسپی میں ہے۔ کلیم کا رویہ

ایک باذوق شخص (amateur) کا رویہ ہے۔ یہ اسی باذوق دانش ور کی تصویر ہے، جسے سعید اپنے زیر بحث خطبے میں تنظیمی دانش ور کے مقابلے میں پیش کرتے ہیں۔ بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں میراجی کلیم کی بوہیمین دانش ور کی نامکمل تصویر کو مکمل کرتے ہیں۔ جو چیز کلیم کے یہاں استعارے کی سطح پر تھی، وہ میراجی کے یہاں ایک حقیقت بن جاتی ہے؛ میراجی سماجی اشرافیہ کی سب اہم علامتوں کے منکر تھے۔ میراجی کی انفرادیت اپنا مفہوم، اشرافیہ کلچر کی کارپوریٹ فکر کا مضحکہ اڑانے کی صورت میں متعین کرتی ہے۔ یہی کام ایک دوسرے انداز میں منٹو نے کیا۔

دانش ور کی انفرادیت، ایک بات ہے اور اس انفرادیت کا 'اثر' دوسری بات ہے۔ سعید نے یہ نکتہ اجاگر نہیں کیا۔ قصہ یہ ہے کہ دانش ور کی انفرادیت کا اثر سماج میں اس صورت میں، اور اسی حد تک پڑ سکتا ہے، جہاں تک سماجی رشتے اس امر کی اجازت دیں۔ اسی سے ہم اس سوال کا جواب بھی تلاش کر سکتے ہیں کہ دانش وروں کے غیر معمولی خیالات کے باوجود، سماج میں ان کی روشنی میں کوئی تبدیلی کیوں رونما نہیں ہوتی۔ جسے ہم تبدیلی کہتے ہیں، وہ دانش ور اور سماج کے درمیان ابلاغ کا دوطرفہ رشتہ قائم ہو جانے کا نتیجہ ہے۔ نیز اس سوال کا جواب بھی مل جاتا ہے کہ کیوں ایک معاشرے میں دانش ور کی تحریریں، بیانات واضح اثر رکھتے ہیں اور کسی دوسرے معاشرے میں کیوں بے اثر رہتے ہیں؟

سعید کی رائے ہے کہ آج مغربی اور غیر مغربی دنیا میں دانش ور کو اگر کسی طرف سے خطرہ ہے تو وہ اکیڈمی ہے، نہ مضافات ہیں، صحافت کی جادو اثر صارفیت ہے نہ پبلشنگ ہاؤس، بلکہ اس رویے سے ہے، جسے میں پیشہ وریت (پروفیشنل ازم) کہتا ہوں۔ اگر کوئی شخص اپنی دانش ورانہ فکر اور اپنی معاشی فکر میں حد فاصل قائم نہ رکھے؛ وہ اپنے دانش ورانہ کام کو بھی روٹی روزی کے کام کی طرح سمجھے، جس میں نو تا پانچ آنکھ گھڑی پر لگی رہتی ہے، اور کوئی متنازع بات نہیں کہی جاتی ہے، خود کو ادارے یا منڈی کی ضرورت کے مطابق ڈھالا جاتا ہے، تو یہی پیشہ وریت ہے۔ پیشہ وریت کا سادہ مفہوم اپنی ذہانت اور علم کو کسی ایسے مقصد کے لیے کام میں لانا ہے، جس کا تعین ادارے اور تنظیمیں اپنے محدود مفادات کے لیے کرتی ہیں۔ یہ اپنے علم و مہارت کی سیدھی سادھی فروخت ہے۔ اس پر سوالیہ نشان اس وقت قائم ہوتا ہے، جب اس مہارت کو دانش کہنے پر اصرار کیا جائے۔ علم و مہارت کی فروخت کی ایک اور صورت بھی ہے۔ انعام و اعزاز۔ چوں کہ یہ حکومتوں، مقتدر اداروں کی طرف سے ملتے ہیں، اس لیے انھی لوگوں کو ملتے ہیں جو انھیں للکارتے نہیں؛ وہ ان کی روشوں پر سوال اٹھانے کی بجائے، ان کے نظریات و اعمال کی توثیق کرتے ہیں۔ اس کے بدلے ہی میں انھیں انعام و اعزاز ملتے ہیں۔ سارتر (جنھوں نے ۱۹۶۴ میں ادب کا نوبل انعام ٹھکرا دیا تھا) تو یہاں تک کہتے ہیں کہ جب تک کوئی شخص سوسائٹی کے مطالبات و ترغیبات میں گھرا ہے، وہ دانش ور ہی نہیں ہو سکتا۔ سعید دراصل دانش ور کے لیے حاشیائی حیثیت کو اصول بنا لیتے ہیں۔ دانش ور کو اپنے ادارے،

سوسائٹی، ملک میں طاقت کے مرکز سے دور، حاشیے پر رہنا چاہیے، تاکہ وہ مرکز پر سوال قائم کرتا رہے۔

سعید کی نظر میں پیشہ وریت، دانش ور پر چار قسم کے دباؤ ڈالتی ہے۔ اوّل تخصیص کاری۔ آج سب سے زیادہ اسی کی ضرورت سمجھی جاتی ہے۔ سعید کے مطابق تخصیص کا مفہوم ہے، آرٹ یا علم کو تشکیل دینے والی خام قوتوں (تاریخ وسیاست) کے سلسلے میں بے بصری۔ تخصیص سے دریافت اور جوش کی وہ حس ہی ختم ہوجاتی ہے، جس پر دانش ور کا بنیادی انحصار ہوتا ہے؛ تخصیص کار مکمل طور پر دوسروں کی آرا کے رحم وکرم پر ہوتا ہے۔ دوم سندی نوعیت کی مہارت۔ بہ قول سعید، اس میں تسلیم شدہ معیارات کی جگالی ہوتی ہے۔ جو لوگ، ادارے، تنظیمیں ان معیارات کو مسلمہ قرار دیتی ہیں، وہ دیگر، مختلف معیارات کے سلسلے میں عدم رواداری کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ سوم طاقت واتھارٹی کی طرف جھکاؤ۔ پیشہ وریت، طاقت واتھارٹی کی طرف جھکنے کا میلان رکھتی ہے، تاکہ اسے اپنی خدمات بیچ کر مراعات حاصل کر سکے۔ اس ضمن میں سعید امریکا سمیت مختلف ملکوں کے حکومتی اداروں کی طرف سے تحقیقی گرانٹس کا ذکر کرتے ہیں، جنھیں سماجی سائنس کے پیشہ ور ماہرین حاصل کرتے اور متعلقہ اتھارٹی کے ایجنڈے کے مطابق نظریات وضع کرتے ہیں۔ تاہم سعید یہاں یہ بات بھی واضح کرتے ہیں کہ امریکا ویورپ میں 'کرائے کی تحقیق' کے متوازی حقیقی، بے غرض تحقیق کی اہمیت کا احساس باقی رہا ہے۔ اس ضمن میں وہ نوم چومسکی کی مثال لاتے ہیں۔ بھارت میں ارون دھتی رائے اس حقیقی، دانش ورانہ تحقیق کی اہم مثال ہیں۔

پیشہ وریت کے اس جبر سے آزادی کی کیا صورت ہے؟ سعید ایک لفظ میں جواب دیتے ہیں: غیر پیشہ وریت (amateurism)۔ کلاسیکی مفہوم میں غیر پیشہ ور، باذوق دانش ور کسی دباو اور جبر کی پروا نہیں کرتا، نہ کسی لالچ وترغیب کے دام میں گرفتار ہوتا ہے؛ آرٹ اور علم سے اس کا تعلق غیر افادی ہوتا ہے۔ اگر آرٹ کی روح، حسن اور علم کی روح، بصیرت ہے تو اسے فقط ان سے غرض ہے۔ سعید 'غیر پیشہ ور، باذوق دانش ور' کے کلاسیکی تصور کو پورے طور پر قبول کرتے محسوس نہیں ہوتے۔ شاید اس لیے کہ کلاسیکی مفہوم میں 'باذوق، غیر پیشہ ور شخص' آرٹ وعلم کی سماجی افادیت پر توجہ نہیں کرتا (جیسے کلیم یا میرا جی)، جب کہ سعید دانش ور کے سیاسی وسماجی کردار کے شدت سے حامی ہیں۔ اسی طرح وہ تحقیق کے پیشہ ورانہ اصولوں اور رسمیات کے جبر سے تو انکار کرتے ہیں، مگر بذاتہ ان سے نہیں۔ چناں چہ کہتے ہیں کہ باذوق دانش ور معاشرے کے ایک سوچنے والے، مضطرب رکن کے طور پر اسے اپنا حق سمجھتا ہے کہ وہ اپنی ٹیکنیکل اور پروفیشنل سرگرمی کے عین دوران میں اخلاقی سوال اٹھائے۔ خاص طور پر یہ سوال کہ کس بات سے کون فائدہ اٹھاتا ہے؟ اس طرح وہ ان قوتوں کی نشان دہی کی کوشش کرتا ہے، جو کسی ڈسکورس سے بہ ظاہر فاصلے پر ہوتی ہیں، مگر اس سے منفعت حاصل کر رہی ہوتی ہیں۔ غیر پیشہ ور دانش ور کے سامنے یہ سوال بھی ہوتا ہے کہ آیا اس کے قارئین ایک صارف کی طرح مطمئن ہو رہے ہیں، یا انھیں چیلنج کیا جا رہا ہے، یعنی انھیں مکمل اختلاف

کی تحریک دے کر معاشرے میں جمہوری شرکت کے قابل بنایا جا رہا ہے، یا نہیں؟ سعید دانش کے نام پر خاص طرح کے خیالات کی اجارہ داری کو ناپسند کرتے ہیں۔ اگر دانش وری کا اہم فریضہ جھوٹے پیغمبروں کو بے نقاب کرنا اور بت شکنی ہے، تو خود دانش ور کیوں کر ایک پیغمبر اور بت کے طور پر اپنی نمائندگی کا ارتکاب کر سکتا ہے؟

'طاقت ور کے سامنے کلمہ حق' سعید کے پانچویں خطبے کا عنوان ہے۔ سعید کے مطابق دانش ور کے لیے بنیادی سوال یہ ہیں کہ کوئی شخص سچ کیسے بولتا ہے؟ کون سا سچ؟ کس کے لیے؟ کہاں؟ سعید کہتے ہیں کہ بد قسمتی سے کوئی ایسا نظام یا طریقہ، کار موجود نہیں جو اس قدر وسیع اور یقینی ہو کہ دانش ور کو ان سوالات کے راست جواب دے سکے۔ کچھ نظام فکر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ سچائی کا حتمی علم رکھتے ہیں۔ سعید غالباً انھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ ہماری دنیا سیکولر ہے، اس مفہوم میں کہ اس کی تعمیر انسانی کوششوں سے ہوئی ہے۔ لہٰذا دانش ور مذکورہ سوالات کے جواب تلاش کرنے کے لیے سیکولر طریقے (تاریخی وسماجی تجزیے کے طریقے) ہی کام میں لاسکتا ہے۔ سعید تسلیم کرتے ہیں کہ وحی والہام نجی زندگی [کے معاملات کی] تفہیم کے لیے مکمل طور پر قابل عمل طریقے ہیں، لیکن اس وقت یہ تباہ کن بلکہ وحشیانہ بن جاتے ہیں، جب نظریاتی ذہن کے حامل مرد و عورت انھیں استعمال کرتے ہیں۔ بہ قول سعید: ''لاریب، مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ دانش ور کو لازماً مقدس وژن یا متن کے محافظوں سے تاحیات بحث میں شریک رہنا چاہیے، جن کی غارت گری کی کوئی حد نہیں، جن کی سخت گیری کسی اختلاف رائے کو برداشت نہیں کر سکتی، اور اس طرح [سماج میں] تنوع پیدا نہیں ہوتا''۔ گویا ذاتی زندگی میں مذہب ایک نعمت، مگر ایک سماجی نظریے کے طور پر تباہ کن ہے۔ نشاۃ ثانیہ کے بعد مغربی فکر نے دنیا کو مادی مظہر ہی سمجھا اور اس کی تفہیم میں عقلی طریقوں کو استعمال کیا ہے۔ اردو میں سر سید نے (بیسویں صدی کے سیکولر انسان دوست فلسفی برٹرینڈ رسل سے پہلے) انیسویں صدی کے اواخر میں لکھا تھا کہ ''قدیم اصول یہ ہے کہ مذہب روحانی اور جسمانی یعنی دینی و دنیوی دونوں کاموں سے متعلق ہے۔ جدید اصول یہ ہے کہ مذہب صرف روحانی کاموں سے متعلق ہے''۔ سعید اور سر سید کے یہ خیالات آج پاکستان میں جاری مذہبی شدت پسندی کے سلسلے میں کس قدر برمحل معلوم ہوتے ہیں، یہ واضح کرنے کی ضرورت نہیں۔ مذہبی گروہوں کی غارت گری، مقدس متن کے نام پر ہے۔ اقبال نے سیاست کے دین سے جدا ہونے کو چنگیزی کہا تھا، مگر مذہبی گروہوں، مذہبی سیاسی جماعتوں میں دین و سیاست کی آمیزش، چنگیزیت کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ پاکستان کے اہل دانش کا مخمصہ اس قدر انوکھا ہے کہ شاید اس کی کہیں مثال بھی نہ ہوگی۔ مذہب کے نام پر وجود میں آنے والی ریاست میں، ایسے گروہوں کو وجود میں آنے سے کیسے روکا جا سکتا ہے جو ریاست کے تمام قوانین کو مذہبی بنانے کی جدوجہد کو مقصدِ حیات بنالیں، اور جو لوگ مذہب کو ذاتی زندگی تک محدود رکھنے کے قائل ہوں، ان کے خلاف صف آرا نہ ہوں؟ یہ

ایک ایسا مخمصہ ہے، جس سے نکلنے کے لیے کبھی کبھی قائداعظم کی گیارہ اگست کی مشہور تقریر کا حوالہ دیا جاتا ہے ، جس میں انھوں نے پاکستانی شہریت کی تعریف بلا مذہب وفرقہ کی تھی ، مگر اس کے جواب میں قائداعظم کے متعدد ایسے خیالات پیش کیے جاتے ہیں جو پاکستان کو اسلام کی تجربہ گاہ بنانے سے متعلق تھے۔اس کا نتیجہ کنفیوژن ہے، نتیجہ خیز مباحثہ نہیں۔

سعید کو یہ ماننے میں تامل نہیں کہ الوہی صداقت میں یقین رکھنے والوں کو اپنی رائے کے اظہار کا حق ہے، اور یہ حق انھیں سیکولر دنیا دیتی ہے۔ سیکولر دنیا بحث مباحثے میں تمام لوگوں کی جمہوری شرکت کی قائل ہے۔ سیکولر دانش ور رائے ظاہر کرنے میں یقین رکھتا ہے، مسلط کرنے میں نہیں۔ یہی اصول مذہبی دانش وروں کے لیے بھی ہے۔ بہ قول سعید، سیکولر دانش ور کا اگر کوئی قلعہ ہوسکتا ہے تو وہ رائے کی تشکیل اور اظہار کی آزادی ہے۔ اسی اصول کی بنا پر سعید سلمان رشدی کے حق میں آواز بلند کرنا بھی ضروری خیال کرتے ہیں۔

کیا سیکولر ہونے کا مطلب سچائی کے ایک غیر متنازع تصور کا حامل ہونا ہے؟ کیا سیکولر سچائی ایک معروضی سچائی ہے؟ اگر اس کا جواب ہاں میں ہو تو ایک سیکولر اور ایک مذہبی دانش ور میں کیا فرق باقی رہ جاتا ہے! سعید کو بھی اس نزاکت کو احساس ہے، اس لیے وہ امریکی مؤرخ پیٹر نووک کی کتاب *That Noble Dream* (مطبوعہ ۱۹۸۸) کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ حقیقت/سچائی سے متعلق اتفاق رائے غائب ہوگیا ہے۔ نیز روایتی اتھارٹی بھی باقی نہیں رہی، بہ شمول خدا اور مصنف۔ ظاہر ہے یہاں اشارہ نئی تھیوری کی طرف ہے، جس نے سچائی کو ایک سماجی تشکیل کہا ہے۔ سعید اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''یہ کہنا سچ ہے کہ معروضیت اور اتھارٹی کی تنقید نے مثبت خدمت انجام دی، کیوں کہ اس تنقید سے یہ واضح ہوا کہ بنی نوع انسان نے کس طرح سیکولر دنیا میں سچائیاں تشکیل دیں''۔ یہیں سعید اپنے محبوب موضوع مابعد نوآبادیات کی طرف پلٹتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ سفید آدمی کی برتری بھی ایک 'معروضی سچائی' سمجھی گئی تھی۔ ایشیا وافریقا پر حکم رانی، اسی 'معروضی سچائی' کو اتھارٹی سمجھ کر کی گئی۔ سعید نے اپنی کتابوں میں تفصیل سے واضح کیا ہے کہ کس طرح سفید آدمی نے 'ہم' کو ایک آفاقی صداقت قرار دے کر مقامی ثقافتوں کا استحصال کیا، حالاں کہ 'ہم' خود ایک مقامی یورپی تصور تھا۔ اتھارٹی کی تنقید سے آفاقیت معرض سوال میں آئی ہے۔ آفاقیت کی جگہ مقامیت نے لے لی ہے۔ عقلی طور پر مقامیت کا مطلب ہے کہ سچائی غیر معین یعنی contingent ہے۔ آج اور یہاں کی سچائی، ضروری نہیں کہ کل اور وہاں کی سچائی کے عین مطابق ہو، یا اس کے لیے معیار ہو۔ مطابقت اور معیار بننے کا امکان ہوسکتا ہے، لازمی اصول نہیں۔ یہی وہ سچ ہے جس کا اظہار دانش ور کو طاقت ور کے سامنے کرنا چاہیے۔

عالمی دانش ور کے سامنے اب بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ کس طرح مقامی شناختوں کو دیگر مقامی شناختوں سے ہم آہنگ کیا جائے؟ اس ضمن میں وہ ایک اہم بات یہ کہتے ہیں کہ آج کسی دانش ور کے شایان

شان نہیں کہ وہ اپنی ثقافت کی شان وشوکت کے قصیدے لکھے۔ یہ قصیدے دوسری مختلف ثقافتوں کی موجودگی میں کوئی جواز نہیں رکھتے۔ اپنی ثقافتی عظمت کا ترانہ، دوسری ثقافتوں سے ہم آہنگی میں ایک بڑی رکاوٹ بن جاتا ہے۔ سعید دانش ور کو ثقافتی سفیر کے طور پر نہیں دیکھتے۔ ان کی نظر میں دانش ور کے لیے معقول رویہ، یہ ہے کہ وہ اپنے اور دیگر معاشروں میں موجود اختیارات کی حامل ان طاقتوں کو موضوع بنائے جو اپنے شہریوں کو جواب دہ ہیں۔ طاقت کو موضوع بنانے، اس کی حکمت عملیوں اور ان کے اثرات کو منکشف کرنے کے لیے ضروری ہے کہ دانش ور غیر معمولی تحقیق اور سخت محنت کرے۔ وہ ان دانش وروں کو ملامت کرتے ہیں جو دوسروں کے لیے تو اصولی اور مشکل مؤقف اختیار کرنے کی بات کرتے ہیں، مگر خود اس سے گریز کرتے ہیں کہ کہیں ان پر سیاسی ہونے کی چھاپ نہ لگ جائے، یا جو متنازع ہونے سے ڈرتے ہیں۔ نیز وہ متوازن، معتدل ہونے کی شہرت چاہتے ہیں، یا یہ خواہش رکھتے ہیں کہ انھیں کسی باوقار بورڈ میں شامل کرلیا جائے، وہ فیصلہ سازوں کی مین سٹریم میں رہیں، اور امید رکھیں کہ انھیں کوئی اعزازی ڈگری مل جائے، کوئی بڑا انعام یا شاید سفارت۔ سعید کے نزدیک دانش ور کے لیے اگر کوئی شے اس کی پر جوش دانش ورانہ زندگی کی خاصیت بدل سکتی، اسے بے اثر اور بالآخر اسے قتل کرنے والی ہے تو ان عادات کو 'داخلی بنانا' ہے۔ دانش ور کے خوف اور ترغیبات، اس کی ذہنی زندگی کو زہر آلود کرتے ہیں، جس کا اثر اس کی تحریروں میں بھی ظاہر ہوتا ہے: وہ طاقت کے آگے کلمۂ حق کہنے کی بجائے، طاقت کی رضامندی کا طالب رہنے لگتا، اور مشکل وقت پڑنے پر طاقت کی آئیڈیالوجی کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ تاہم سعید یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ طاقت کے سامنے اظہار کوئی سادہ لوح قسم کی مثالیت پسندی نہیں۔ بہ قول سعید دانش ور کا کلمۂ حق دراصل متبادلات کا محتاط جائزہ ہے، یعنی صحیح بات کا انتخاب، اور اس کی قابل فہم انداز میں نمائندگی، اور اس پلیٹ فارم سے نمائندگی جہاں یہ زیادہ مؤثر ہو اور صحیح تبدیلی کا سبب بن سکے۔

ان خطبات میں سعید اس مؤقف کو کئی بار دہراتے ہیں کہ دانش ورانہ سرگرمی، سیاست سے الگ نہیں رہ سکتی۔ سیاست ہر شے میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ یہ سعید کا پسندیدہ مقولہ لگتا ہے۔ نیز وہ دانش ور کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں کہ وہ تبدیلی کے عمل کا حصہ بھی بنے۔ ایسے میں اس بات کا امکان ہے کہ دانش ور کسی سیاسی جماعت میں شامل ہوجائے، لیکن ساتھ ہی سعید اس اندیشے کا اظہار کرتے ہیں کہ اس کی جماعت میں شمولیت اسے دانش ور کی بجائے جماعتی نظریے کا معتقد بناسکتی ہے۔ اس سوال پر وہ بحث اپنے آخری خطبے ''دیوتا جو سدا ناکام ہوتے ہیں'' میں کرتے ہیں۔ خطبے کا یہ عنوان انھوں نے رچرڈ کراس مین کی کتاب *The God that Failed* (مطبوعہ ۱۹۴۹) سے لیا ہے۔

ایک دانش ور کے طور پر سعید کسی دیوتا میں یقین نہیں رکھتے۔ لکھتے ہیں: ''میں کسی بھی قسم کے سیاسی دیوتا میں اعتقاد کے خلاف ہوں''۔ سعید بعض تاریخی مثالوں سے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ سیاسی

دیوتاؤں میں دانش ور کے اعتقاد کا انجام بالآخر اعتراف گناہ کی اذیت ہے۔ وہ اپنے ایک ایرانی دوست کی کہانی لکھتے ہیں، جو خمینی انقلاب کا پر جوش حامی تھا۔ انقلاب کے بعد خمینی حکومت کا حصہ بنا، بعد میں مایوس ہوا۔ جب اسلامی انقلاب کے ممکنہ نتائج سامنے نہیں آئے، تو وہ امریکا آ گیا۔ یہی نہیں بلکہ خلیج کی جنگ کے دوران میں اس نے امریکا کی حمایت بھی کی۔ گویا ایک دیوتا سے مایوس ہوکر، دوسرے دیوتا میں اعتقاد پختہ کر لیا۔ بہ قول سعید اس کا رویہ، بائیں بازو کے یورپی دانش وروں کا ساتھا، جو فاشزم اور امپیریل ازم میں سے امپیریل ازم کا انتخاب کرتے ہیں۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''دانش ورانہ اور سیاسی طور پر مطلوب رویہ، یہ تھا کہ فاشزم اور امپیریل ازم دونوں کو رد کیا جاتا''۔ برصغیر کے بائیں بازو کے دانش وروں نے بھی دوسری عالمی جنگ کے دوران میں فاشزم کے مقابلے میں برطانوی امپیریل ازم کا ساتھ دیا تھا۔ سعید نے یہ واضح نہیں کیا کہ بائیں بازو کے یورپی دانش وروں نے فاشزم کی مخالفت میں کیوں امپریل ازم کا انتخاب کیا؟ بائیں بازو کے یورپی دانش ور ہوں یا برصغیر کے، ان کی فکر طاقت کی حرکیات میں اسیر تھی؛ ان کے لیے یہ بات قابل فہم تھی کہ طاقت کی ایک سفاک شکل کا خاتمہ، طاقت کی دوسری زبردست صورت سے کیا جا سکتا ہے۔ ایک طاقت کے مقابلے میں دوسری طاقت کے انتخاب کا 'جبر'، دوسری عالمی جنگ (جس میں فاشسٹ جرمنی واٹلی کے مقابلے میں اتحادی ملکوں میں سوویت یونین بھی شامل تھا، جو بائیں بازو کی جماعتوں کی دانش ورانہ فکر کا قبلہ تھا) کی پیداوار تھا۔ سوال یہ ہے کہ اس میں آج کے دانش ور کے لیے کیا پیغام ہے؟ ہماری رائے میں بڑا سادہ پیغام ہے۔ دانش ور کو طاقت کے مراکز سے فاصلہ رکھنا چاہیے، تاکہ وہ طاقت، جبر، استحصال کی واضح اور مخفی یعنی مادی، نفسیاتی اور علمیاتی صورتوں کا پردہ چاک کر سکے۔ یہ دانش ور کا حاشیائی مقام ہے، مگر اس کی دانش کی ساری طاقت کا خزینہ یہیں دفن ہے۔

رچرڈ کراس مین کی کتاب میں ممتاز مغربی دانش وروں، جیسے آندرے ژید، آرتھر کوسلر کے ماسکو کی طرف جانے اور پھر واپس غیر کمیونسٹ ملکوں میں آ کر 'اعتراف گناہ' کے قصے ہیں۔ بہ قول سعید سرد جنگ کے زمانے میں اکثر لوگوں کے 'دانش ورانہ کیریئر' کی بنیاد دانش ورانہ کامیابیوں کے بجائے کمیونزم کی برائیوں کو ثابت کرنے، نیز کمیونسٹ ملکوں میں جا کر رہنے کے ناکام تجربے پر ندامت کے اظہار پر تھی۔ اس پر سعید طنزاً کہتے ہیں: ''میں پوچھنا چاہتا ہوں، ایک دانش ور کے طور پر آپ کیوں دیوتا میں یقین رکھتے ہیں؟ مزید براں آپ کو یہ حق کس نے دیا ہے کہ آپ یہ تصور کریں کہ آپ کا سابقہ اعتقاد اور بعد کی التباس شکنی [ہمارے لیے] اس قدر اہم ہیں؟'' سعید دیوتا میں یقین کو تشدد سے وابستہ دیکھتے ہیں۔ نئے نظریے کو مذہب بنانے والے، اور پرانے نظریے کی طرف مراجعت کرنے والے اکثر عدم رواداراور متشدد ہوتے ہیں۔ قصہ مختصر، دانش ور کے لیے دیوتا ہمیشہ ناکام ہوتے ہیں۔

[دانشور کے اظہارات (Representations of the Intellectual) ونٹاژ بکس، نیو یارک سے ۱۹۹۴ میں پہلی مرتبہ شایع ہوئی۔ اس تحریر میں کتاب کا پہلا ایڈیشن ہی سامنے رکھا گیا ہے۔ ن ع ن]

☆☆☆

التماس

ادبا اور شعرا سے مخلصانہ التماس ہے کہ اپنی نگارشات اردو ان پیج (Inpage) میں کمپوز شدہ درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجنے کی زحمت گوارہ فرمائیں۔ ساتھ ہی تخلیقات / مضامین کی ہارڈ کاپی (Print out) ڈاک سے 'آمد' کے پتے پر ارسال فرمائیں:

email : khursheidakbar@gmail.com
Address: Arzoo Manzil, Sheesh Mahal Colony,
Alam Ganj, P.O. Gulzar Bagh
Patna-800007, Bihar (INIDIA)
Mob : 09631629952/ 09471223959

(۲)

'نجات پسندی': ادبی اصطلاح یا

سیاسی اسلوب طرازی؟

● افروز اشرفی

کسی بھی ادب کی تاریخ میں ادبی تحریکیں اسی طرح ظہور پذیر ہوتی ہیں جس طرح کسی باغ میں نئے پھول کھلتے ہیں اور اپنی مدت پوری کر کے فنا ہو جاتے ہیں۔ مدت طویل وقلیل ہو سکتی ہے، لیکن اس کی خوشبو سے سماں معطر رہتا ہے۔ ادب کی کیفیت بھی کچھ اسی طرح کی ہے۔ یہاں بھی خیالات کے جنگل ہوتے ہیں، تصورات جنم لیتے ہیں اور پھر اپنی میعاد پوری کر کے فنا ہو جاتے ہیں، میں نے کبھی سنجیدگی سے نہیں سوچا کہ ادب میں رونما ہونے والی تحریکیں آخر کہاں غائب ہو جاتی ہیں۔ مختلف رجحانات پر مبنی ایسی تحریکیں جو آئیں اور غائب ہو گئیں لیکن ان کے اثرات زمانے تک محسوس کیے جاتے رہے۔ بعض اوقات یہ بھی ہوا کہ تحریک زوال پذیر ہو گئی، لیکن اس کے نقوش انسانی ذہن پر ثبت رہے۔ آج ہم ما بعد جدید دور سے گزر رہے ہیں، جہاں تک مشرق کا تعلق ہے گو کہ مغرب میں مابعد جدیدیت کی ہوا بھی کسی دوسری جانب بہنے لگی ہے، یا پھر یوں کہیے کہ اس کے اثرات اس طرح تحلیل ہو گئے جیسے دیگر تحریکیں مسمار ہو گئیں۔

ابھی حال میں ہی ''آمد'' کے مدیر اعزازی خورشید اکبر نے اپنے رسالے کے توسط سے ایک نئی بحث کا آغاز کیا اور اس بحث میں کچھ نامور ناقدین وادباء بھی شامل ہو گئے۔ زیر بحث کچھ ایسے نکات ضرور تھے، جن پر تفصیلی گفتگو ہونی چاہئے۔ خورشید اکبر نے ادب میں 'نجات پسندی' کی ایک نئی اصطلاح ایجاد کی اور اس پر دعوت گفتگو بھی دی۔ سوال یہ ہے کہ 'نجات پسندی' سے کیا مراد ہے، اور اس کے امتیازات کیا کیا ہیں؟ بہ قول مدیر ''آمد'' نجات پسندی ادب میں ایک نئی تنقیدی روش کا آغاز ہے، جس کے مطابق کوئی بھی ادب پارہ کسی ناقد کی تنقید کی مرہون منت نہیں رہے گا، اور خاص کر ایک ایسے قبیل کے ناقدین جن کا تعلق کسی

مخصوص فکر سے ہے، ان کی تنقید صرف اس لیے رد کر دینی چاہئے، کیوں کہ وہ اشرافیہ ہیں اور ان کے اندر ادب کی تفہیم کے عمل میں تعصب بستا ہے، ان کی تنقید نقد و شعر کی معنویت سے انکار ہے، یا ان کے [کی] تنقید کے Parameters مصنف کی ذات سے Determine ہوتے ہیں۔ اگر ناقد کا تعلق اشرافیہ سے ہے تو ان کی تنقید معتبر نہیں تسلیم کی جانی چاہئے، کیوں کہ ان کے Evaluation میں نہ تو معروضیت ہوگی اور نہ ہی ادب پارے کو برتنے میں کوئی تنقیدی اصول۔ یہ ایک نئی فکر کی پیدائش ہے اور مجھے احساس ہوتا ہے کہ اب ادب میں سیاست بھی پناہ لینا چاہتی ہے، گویا ادب کو خانوں میں تقسیم کریں اور مصنف کی Biography پر نظر رکھتے ہوئے کسی بھی فن پارے کا محاسبہ کریں۔ آج تک اور ابھی تک سراپا مشرقی ادب مغربی تعصب کا شکار رہا اور اس کے ادب کو نہ کوئی اہمیت دی گئی اور نہ ہی اسے لائق توجہ سمجھا گیا، کیوں کہ آبادیاتی نظام کے تحت صرف مغرب نے اپنا سیاسی نامہ جاری کیا، اپنی دسترس بنائے رکھی، شعر و نقد کے تصورات تھوپے گئے اور صرف مشرق ہی میں نہیں بلکہ عالم گیر سطح پر اس کی سیاسی بالا دستی اسکے ادب کے فروغ کا سبب بنی۔ بہت سارے سوالات ایسے ہیں جن کا تعلق براہ راست احساس برتری سے ہے، وہ مغرب جو خود اپنے گھر کے آنگن کی حفاظت نہ کر سکا، جہاں Blacks کے حقوق زمانے تک دبے رہے، جہاں رنگ و نسل پر ادب فہمی چلتی رہی، جہاں کالوں کا ادب الگ خانے میں رکھا گیا۔ گوروں کی تحریر بہتر نہ ہونے کے باوجود اچھی سمجھی گئی، گویا کالوں کا اجتماعی شعور اس حد تک مجروح ہوا کہ ان کو اپنے ادب کی تشکیل ایک نئے [نئی] شناخت کے ساتھ کرنی پڑی جسے Black Literature کا نام دیا گیا اور بعد میں اسے Literature of Apartheid سے منسوب کیا گیا، لیکن کیا Alan Paton, Alex La Guma, Chinua Achebe اور Ama Ata Aido جیسے مصنف صرف اس لیے پیدا ہوئے کہ وہ ادب کے ذریعہ مغربی سیاسی بالادستی کا مقابلہ کر سکے، کیا انھیں یہ شعور تھا کہ ان کی تحریر سے پیدا ہونے والے انگارے کالوں کے حصول آزادی کا پروانہ ہوں گے؟ اور کیا ان کی تحریریں کسی انقلاب کا روپ لے لیں گی؟ سوال کیا جا سکتا ہے کہ جب مغرب نے تمام ممالک کے ادب کو Others کے خانے میں ڈال کر اپنی تحریر کو ہی قابل ستائش سمجھا اور نو آبادیاتی Conditions میں بھی اپنی علم فہمی کے گمان سے کبھی دستبردار نہیں ہوا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ جب مغرب کے اندر ہی سے ایک تحریک شروع ہوئی جس نے مغربی ادب کی بالادستی پر نہ صرف سوال کیے بلکہ ادبی فن پاروں کو سیاسی طاقت کا نتیجہ کہا۔ انگریزوں نے مذہب، سیاست اور ثقافت کے شعبوں میں اپنے تعصب کا رنگ ڈالا لیکن ہم نے بھی کبھی یہ فکر نہیں کی کہ آخر ہم مغربی شعر و نقد کا تعاقب کیوں کر رہے ہیں؟ کیا ہمارا ادب کسی مغربی تنقیدی اصول کا محتاج ہے؟ ہم اپنے ادب کے معنی و تفہیم میں فعال نہیں بن سکے اور مغربی تحریکوں کو لبیک کہتے چلے گئے۔ دراصل ہمارے ادب کے ساتھ ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہم کئی خانوں میں منقسم ہو چکے ہیں۔ اب ادب آفاقی نہ ہو کر علاقائی ہو گیا، مذہبی نہ ہو کر کسی خاص

گروپ کے عقیدہ کا نمائندہ، جسے خورشید اکبر کی زباں میں 'نجات پسندی' کہا جائے گا[؟]۔ خورشید اکبر نجات پسندی کے حوالے سے کیا کہنا چاہتے ہیں؟ انھیں کس سے نجات چاہیے؟ ادب کی زبان میں کہیے تو وہ کون ناقدین ہیں جن کی تنقید پر انھیں اعتراضات ہیں اور اعتراضات اتنے شدید ہیں کہ وہ ان کی تنقید کو رد کرنے کی حد تک پیروی کرتے ہیں۔ نظام صنعتی سے نجات، اشرافیہ سے نجات، کسی خاص نفسیات سے نجات، کسی مکتبہ فکر سے نجات، کسی قوم سے نجات؟ آخر نجات کی کیا صورت ہوگی؟ میں نے ایک خط جو مدیر ''آمد'' کے نام لکھا تھا اور اسے انھوں نے من وعن شائع بھی کیا تھا، اس میں بھی ہمارے سوالات کی نوعیت کم و بیش وہی تھی، لیکن پھر جناب مدیر کا اصرار ایک مضمون کا ہوگیا تو میں نے بھی سوچا کہ کیوں نہ ایک مثبت بحث کا دروازہ کھولا جائے، جس سے 'نجات پسندی' کی مبہم اصطلاح میں کوئی واضح فکر کی صورت نکل سکے۔
خورشید اکبر مدیر ''آمد'' شمارہ ۸ کے اداریہ میں لکھتے ہیں۔

''ادب کس لیے ہے؟ یا ادب کس کے لیے ہے؟ اس کا سیدھا سا جواب پہلی نظر میں یہی ہوسکتا ہے کہ ادب انسان کے فائدے اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے ہے، کیوں کہ ادب اگر نقصاندہ ہو جائے تو اسے کوئی استعمال میں لانا نہیں چاہے گا، حالانکہ بعض غیر معمولی اور استثنائی صورتوں میں لوگ ضرر رساں اشیاء کا استعمال کرنے سے بھی نہیں چوکتے، بلکہ اس سے محظوظ و مسرور بھی ہوتے ہیں۔'' (صفحہ ۱۱)

سمجھا جاسکتا ہے کہ خورشید اکبر کے پاس جو ادب کا نظریہ ہے وہ بنیادی طور پر اصلاحی ہے [؟]، ان کا پہلا سوال ہے ادب کس لیے ہے؟ اور ادب کس کے لیے ہے؟ دونوں سوالات بنیادی ہیں یعنی تشکیل ادب کے اغراض کی جستجو میں خورشید اکبر اسے ایک اصلاحی نکتہ پر مرکوز کرتے ہوئے اسے محض دل جوئی کا سبب قرار دیتے ہیں[؟]، جب کہ ادب کا شیوہ صرف اصلاح تک محدود نہیں ہے۔ ادب ایک مذہب کا، معاشرے کا آئینہ ہوتا ہے، اور اس کے مزاج و میلان کا عکاس بھی، اخلاقیات سے وابستہ معاشرے کے تمام مسائل پر اس کی نظر ہوتی ہے، میرا مقصد خورشید اکبر کو ادب کی تعریف سمجھانا نہیں بلکہ میرا موقف صرف اتنا ہے کہ ادب کے وجود کا جواز تلاش کروں۔ اگر ہم اپنی مشرقی تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو ڈپٹی نذیر احمد اور پریم چند بنیادی طور پر اصلاحی تخلیق کی دہائی دیتے رہے، جن کا مقصد سماج کو اقدار سے روشناس کرانا تھا۔ ادب صرف Entertainment کا نام نہیں بلکہ اس وسیع و عریض خطۂ ارض میں ادب سے زندگی کی مقصدیت منسوب ہے۔
خورشید اکبر آگے لکھتے ہیں۔

''ادب خواہ وہ کسی نوعیت کا ہو وہ زندگی کے حوالے کے بغیر ادب نہیں کہا جاسکتا۔ پھر 'ادب برائے زندگی' کی تخصیص کیوں؟ کیا زندگی کے بغیر بھی ادب کا تصور کیا جاسکتا ہے؟ دراصل ترقی پسندوں کے یہاں ادب برائے زندگی سیاست کا ترجمان رہا ہے اور ادب کی خودمختاری کے لیے سم قاتل بھی ثابت ہوا ہے، ادب کو محض زندگی کی مرکزیت تک محدود نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ اس کا علاقہ ماقبل حیات اور مابعد حیات کے

معاملات اور تصورات سے بھی قائم ہوسکتا ہے۔"

خورشید اکبر کا خیال ہے کہ ادب کی وابستگی براہ راست انسان کے وجود سے ہے اور ادب کے وجود کا جواز بھی انسانی سماج ہے۔ مجھے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آج جب ہم ادب کے مختلف اغراض ومقاصد سے واقف ہو چکے ہیں تو پھر خورشید اکبر کے ذہن میں یہ سوال کیوں آیا؟ ادب برائے زندگی اور ادب برائے ادب یہ تمام تصورات ۱۹ ویں صدی میں پیدا ہوئے اور ان تصورات پر مغرب میں طویل بحث بھی چلی۔ ظاہر ہے ادب برائے ادب کسی بھی زندہ سماج میں پروان نہیں چڑھ سکتا ہے، کیوں کہ آج ادب کے تقاضے بھی بدل گئے ہیں، ٹھیک اسی طرح جیسے زندگی بدل رہی ہے۔ Art for art sake محض ایک تصور رہا ہے اور انسانی معاشرے کے کسی بھی Stage پر ادب برائے ادب کو فروغ نہیں حاصل ہوا تھا [؟]، باوجود اسکے Walter Pater نے اس کی زبردست حمایت کی تھی، کیوں کہ ادب زندگی کے حقائق سے علاحدہ نہیں ہوسکتا۔ Walter Pater کا خیال تھا کہ ادب میں اصلاحی عنصر ناگزیر ہے، کیوں کہ کسی بھی سماج کا تصور اقدار کے بغیر نہیں کیا جاسکتا ہے، لہٰذا اخلاقیات کی تشکیل کے لیے یہ ضروری ہے کہ ادب زندگی کے مسائل میں نہ الجھے۔ دراصل Walter Pater ادب کو Sentimentality سے الگ رکھنا چاہتے تھے۔ ان کا موقف تھا کہ ادب کو لازماً اصلاحی ہونا چاہئے، جس کے تقاضے کچھ حد تک پریم چند نے پورے کیے، لیکن ایک ترقی پذیر معاشرے میں کوئی بھی نظامِ اقدار مستقل نہیں ہوتا ہے کیوں کہ Values بدلتے رہتے ہیں، رشتوں کی نوعیت بھی بدلتی رہتی ہے اور سماج ان تمام تغیرات کو بنا کسی غوغا کے تسلیم کرلیتا ہے۔ مثال کے طور پر منٹو کے افسانے یا ڈی ایچ لارنس کی کہانیاں۔ ایک وقت تھا کہ جب Lady's Chatterley Lover کی کاپیاں لندن کی سڑکوں پر جلائی گئی تھیں اور ایک وقت تھا جب منٹو کو جنسی افسانہ نگار قرار دیا گیا تھا، لیکن بعد میں دونوں کے تئیں تصورات بدل گئے اور دونوں اپنے اپنے ادب کے عظیم فنکار قرار دیے گئے۔ ادب برائے ادب کا وجود فرانس میں ہوا تھا جسے L' Art Pour L' Art کہا گیا، جس کے معنی یہ ہوئے کہ ادب کو سماجیات، سیاست اور اخلاقی تصورات سے دور رہنا چاہئے اور یہ وہی وقت تھا جب Morris, Burne-Jones De Morgan Webb وغیرہ ادب برائے ادب کی حمایت میں Aesthetics کو رد کر رہے تھے۔

ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

"By the end of the19th Century ,some critics were undertaking to exploere the concept of a poem as a hetrocosm, a world of its own, independent of the world into which we are born, whose end is not to instruct or please but simply to exist."

یہ نظریہ ادب برائے ادب کا تھا، کسی بھی ادب پارے کو کسی بھی مقصد سے ہمکنار نہیں کرنا چاہئے۔ اگر کوئی نظم ہے تو خالص نظم کی طرح پڑھی جانی چاہئے اور اس کے اشارات کو زندگی کے کسی بھی شعبہ سے وابستہ نہیں کرنا چاہئے، ادب برائے ادب کی مدت قلیل رہی کیوں کہ اس کے فوراً بعد Biographical Criticism منظر عام پر آ گئی، جس نے تنقید کی سمت ہی بدل ڈالی۔ سوال یہ نہیں ہے کہ خورشید اکبر کیوں ادب برائے ادب کا جواز تلاش کرنا چاہتے ہیں[؟]، سوال یہ بھی نہیں ہے کہ ادب برائے زندگی کے مطالبات کیا ہیں؟ خورشید اکبر کا مقصد ایک نئی فکر کی پیروی ہے، جسے وہ 'نجات پسندی' کہتے ہیں۔ ظاہر ہے موصوف کا اشارہ اشرافیہ کی تنقید کی جانب ہے جسے وہ معتبر نہیں سمجھتے ہیں۔ Subalternism کی Genesis کو بھی Trace کرنا ضروری ہے، کیوں کہ اس حوالے سے بھی ہم 'نجات پسندی' کے فکری عوامل دیکھ سکتے ہیں۔ ادب میں ہمیشہ سے ایک سوال رہا ہے اور وہ اہم بھی ہے کہ تنقید میں تعصب کہاں تک کسی فن پارے کو متاثر کرتا ہے، کیوں کہ Personal bias in literary criticism روز اول سے ایک مسئلہ رہا ہے، لیکن یہ ایک Deviation ہوگا، کیوں کہ ہم بات ابھی Subalternism کی کر رہے ہیں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ایسے ادب کا محاسبہ کریں جہاں اشرافیہ یعنی Elites کے تشکیل کردہ ادب میں پسماندہ طبقہ کی حق تلفی ہوئی ہے یا Politics of representation میں کہیں نہ کہیں اشرافیہ نے دانستہ طور پر پسماندہ ادب کی نمائندگی میں کوئی رخنہ ڈالا ہو۔

۱۹۸۰ء کے آخر میں ہندوستان میں ایک مکتبۂ فکر کا نم[جنم؟] ہوا جسے Subaltern studies کا نام دیا گیا اور رفتہ رفتہ یہ دنیا کے مختلف ممالک تک پہنچ گیا، حتیٰ کہ اسے Latin Studies, African Studies اور Cultural Studies بھی کہا گیا۔ ہندوستان میں جنگ آزادی کو Elites کی جنگ کہا گیا اور آزادی کو Elites کی آزادی قرار دیا گیا۔ جبکہ Subaltern لفظ حاشیہ پر رہا۔ پچھلے تیس برسوں میں یہ آواز تیز ہوتی گئی، جس کا تعلق بھی مغرب سے ہے۔ ظاہر ہے جب مغرب نے سیاسی بالا دستی کو ادب وثقافت کے فروغ کے لیے استعمال کرنا شروع کیا اور آبادیاتی سے لے کر نو آبادیاتی تک اسکی صدائے بازگشت ایوان افکار میں گونجتے رہے[؟]، جس کے نتیجہ میں چند ایسی آوازیں ضرور اٹھیں جس نے مغرب کی سیاسی طاقت کو نہ صرف Challenge کیا بلکہ مشرق کے اجتماعی شعور کی نمائندگی بھی کی۔ لیکن یہ کسی 'نجات'[؟] کے تصور پر مبنی نہیں تھا، تاہم Political Power کے Excesses کے خلاف ایک آواز ضرور تھی، سب سے پہلے ایڈورڈ سعد نے صدا بلند کی تھی، جس میں Subaltern کی بات نہیں تھی[؟] بلکہ Anti Imperial Writings کے نقوش تھے۔ ایڈورڈ سعد نے مغرب کو مورد الزام ٹھہرایا تھا کہ اس نے تمام دنیا کے ادب کو Others کہہ کر اپنے ادب کے فروغ کی راہ ہموار کی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ خورشید اکبر کے ذہن میں بھی نجات کا سوال ایسی تحریروں کو پڑھنے کے بعد ہی آیا ہوگا، گو کہ وہ صاف الفاظ میں اپنا موقف

بیان نہیں کرتے ہیں۔ ایڈورڈ سعد سے قبل Subaltern کی اصطلاح Antonio Gramsci نے استعمال کی تھی، اور وہ بھی طبقاتی کشمکش کے پیش نظر۔ اس کا خیال تھا کہ ادب اشرافیہ کے قید و بند سے آزاد ہو کر ان طبقات کی بھی نمائندگی کرے جو حاشیہ پر ہیں، یا جن کی نمائندگی ادب میں ہو نہیں پا رہی ہے، جس کے قطعی یہ معنی نہیں ہوئے کہ اس نے Subaltern کے استعمال کے ذریعہ Elites کی [؟] تشکیل کردہ ادب کو رد کیا ہو۔ خورشید اکبر جس تناظر میں نجات پسندی کا استعمال کر رہے ہیں وہ یقیناً Gramsci کی اصطلاح سے حد درجہ مختلف ہے۔ یہاں خورشید اکبر اردو ادب میں تنقید کی فضا سے برہم ہیں اور لفظ نجات کے حوالے سے وہ کسی نہ کسی طرح یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اشرافیہ ناقدین ایک محدود کینوس پر متحرک ہیں اور ان کی تنقید کے توسط سے دانستہ طور پر کچھ طبقات کی اندیکھی ہوئی ہے، یا انکی نمائندگی کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا ہے [؟]۔ دراصل جب دلت ادب کے نام سے تحریر شروع ہوئی، جس میں جیوتی با پھولے، لیمبلے، مکتی بودھ، ارجن ڈانگلے، اوم پرکاش بالمیکی، نامدیو دھسال، بابو دیو سونانی، بندھو مادھو، دیا پوار شنکر راو کھرت اور مہا شویتا دیوی وغیرہ شامل ہیں۔ اس میں بیشتر مراٹھی ہیں اور ان تمام مصنفین کا مقصد ایک ایسے ادب کی تشکیل تھی جہاں دبے کچلے کی آواز ادب کے توسط سے لوگوں تک پہنچے۔ دراصل یہ بنیادی طور پر مراٹھی تحریک تھی، جس کے تحت سماج کا وہ طبقہ جو خود کو Alienated یا Ostracised سمجھتا تھا، اس قسم کی تحریروں کے ذریعہ ایک نئے ادب کی تشکیل کرنا چاہ رہا تھا اور پھر آہستہ آہستہ اسے Fashion کی طرح استعمال کیا گیا۔ اگر متعلقہ مصنفین نے بغاوت کا اعلان کیا تھا تو اس کے اپنے اسباب تھے، کیوں کہ ہندو معاشرے نے منوواد کے ذریعہ ان پر کافی تشدد بھی کیا تھا اور اسی ظلم و ستم کے باعث دلت ادب ظہور پذیر ہوا۔ مغرب میں بھی حصول حقوق کے لیے Blacks نے ایک طویل جدوجہد کی تھی اور اس احتجاج کے عمل سے بھی ایک نیا ادب دنیا کے سامنے آیا تھا، جسے Aparthied کہا گیا، یعنی نسل کی بنیاد پر جو تفریق ہوئی تھی جس میں چند اہم مصنفین شامل تھے۔ Frantz Fanon، Alex Haley اور Richard Wright وغیرہ کا نام نمایاں طور پر لیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک تخلیقات کا سوال ہے تو ان میں بھی تین کتابوں کو ہم آفاقی کہہ سکتے ہیں، وہ تین کتابیں ہیں:

The Auto Biography of Malcom X, Wrethced of the Earth اور Oreintalism۔ یہ تمام کتابیں Liberation کے فلسفہ پر مبنی ہیں یعنی حکمرانِ وقت کے ساتھ حصول حقوق کے لیے ایک سنجیدہ جدوجہد جہاں انسانی معاشرے میں تفریق کی فضا نہ ہو۔ گو کہ ایسے نظام کو ہم صرف Utopia کہہ سکتے ہیں [؟]۔ یہ نجات کی صدا نہیں تھی [؟] بلکہ انسانی آزادی اور انسانی وقار کے سوالات زیادہ اہم تھے [؟] اس باب میں ذیل میں ایک اقتباس درج ہے:

"I am black , I am in total fusion with the world , in

sympathetic affinity with earth, losing my id in the heart of the cosmos and the white man, however intelligent he may be, incapable of understanding Loius Armstrong or songs from Congo. I am Black not because of a curse, but because of my skin has been able to capture all the cosmic effuvia. I am truly a drop of sun under the earth. (Frantz Fanon, Black Skin white Mask)

مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہے کہ Frantz Fanon نے نسل و رنگ کے امتیازات کو انسانیت کے خلاف قرار دیا تھا، اس کا جسم کالا ہے تو وہ کسی کی بددعا کے تحت نہیں بلکہ اس کے چمڑے میں دنیا کے تمام رنگ کو جذب کرنے کی صلاحیت ہے، Effuvia سے مراد گسی سڑے ہوئے گیس سے ہے جو گوروں کی نفرت کا مظہر بھی۔ یہ تمام تحریریں ایک بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ انسان کو انسانی شرف حاصل ہو یعنی کسی بھی سطح پر Discrimination قبول نہیں کیا جا سکتا ہے۔

'نجات پسندی' بھی شاید اسی طرح کی ایک اصطلاح ہو جس میں ادب کے حوالے سے کیے جا رہے Discrimination کو بے نقاب کرنے کی کوشش ہو لیکن مجھے نہیں لگتا کہ مسلم معاشرے یا اردو ادب میں کوئی ایسی ایسی با ضابطہ تحریک چلی ہو، جس کے تحت اشرافیہ نے پسماندہ ادب کے تئیں کوئی Indefference برتا ہو[؟]۔ ممکن ہے خورشید اکبر کے ذہن میں Subaltern کی تعریف 'نجات پسندی' سے تعبیر کی گئی ہو، گو کہ Subalternism ایک خالص سیاسی نکتہ نگاہ ہے کیوں کہ مغربی ادب کی بالادستی اور نوآبادیاتی اثرات کو ختم کرنے کے لیے Homi Bhabha, Edward Said, اور Gayatri Spivak نے مشترکہ طور پر ایک تحریک شروع کی تھی جس سے مغربی برتری کو ختم کیا جا سکے، کیوں کہ Edward Said نے مشرقی ادب کے تعلق سے کہا تھا کہ مغرب کو کوئی حق نہیں ہے کہ وہ اپنی ثقافت کو دنیا پر تھوپ دے اور اپنی تہذیب کو ادب کے حوالے سے برتر ثابت کرے۔ Spivak نے اپنے شہرہ آفاق مضمون Can the Subaltern speak میں کئی ایسے سوالات کیے تھے جس سے Marginalized اور Econimically Dispossessed طبقات کی خاطر خواہ نمائندگی ہو سکے۔ دراصل Gramsci کی اصطلاح Subaltern کو رنجیت گوہا نے معاشی طور پر بدحال لوگوں کے لیے استعمال کیا تھا، Sipvak یہ بھی تسلیم کرتی ہیں کہ ہندوستانی بدحال طبقات Epistemic Violence کے شکار ہیں، ان کا خیال ہے ان طبقات کی اپنی آواز ہونی چاہئے نہ کہ ان کے لیے کوئی آواز ہو۔

اب ہم خورشید اکبر سے سوال کر سکتے ہیں کہ کیا ان کے ذہن میں بھی اس قسم کا کوئی Wave یا Current موجود ہے، جس سے وہ یہ ثابت کر سکیں کہ نجات پسندی Subalternism کی کوئی نئی شکل ہے

یا کوئی ایسی اصطلاح جسے اشرافیہ ناقدین کے خلاف ایک آواز کہا جائے[؟]۔میں سمجھتا ہوں کہ نجات پسندی خالص سیاسی خیال ہے اور ادب کو اس کا ضامن بنانا قطعی موزوں نہیں، کیوں کہ اگر واقعی اشرافیہ تنقید لائق اعتبار نہیں تو اس کی نشاندہی ہونی چاہئے، اسکے پختہ ثبوت ہونے چاہئیں، جس سے یہ ثابت ہو جائے کہ ادب کو بھی ہم سیاسی مفاد کے لیے استعمال کر سکتے ہیں، اس کے اجتماعی شعور ثقافت کو بھی ختم کر سکتے ہیں، پسماندہ ادب کو ہم ایک مخصوص تناظر میں دیکھ سکتے ہیں یا پھر نجات کی ایسی صورت جس سے انسانی اقدار میں اضافہ ہو۔[؟] خورشید اکبر رقم طراز ہیں:

''اردو ادب پر موجودہ عہد میں تنقید کی بالادستی، سیاسی حکمت عملی ضرورت سے زیادہ حاوی ہے ....اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنی ادبی شعریات Poetics اپنی مشترکہ کاوشوں سے ازسرنو وضع رمرتب کریں اور اپنے ادب کو نظریاتی غلامی سے نجات' [آزادی رخود مختاری رکشادگی] پر آمادہ کریں۔''

خورشید اکبر کس شعریات کی تشکیل کی تبلیغ کر رہے ہیں اور نجات پسندی کو تغیر کی بشارت بھی قرار دے رہے ہیں۔ بات سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ وہ اردو ادب پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ وہ مغرب کی نقل میں اپنی عقل گنوا چکی ہے، کیسے؟ ایک سوال ہے: کہتے ہیں نظریاتی غلامی سے نجات لیکن کون سا نظریہ؟ کون سی فکر؟ نجات کی وضاحت نہیں کرتے ہیں، آزادی، خود مختاری یہ تمام الفاظ مبہم ہیں، آزادی سے کیا مراد ہے؟ ادب کو کس طرح Autonomy چاہئے؟ کیسی خود مختاری؟ کیا سڑک پر کھڑے ہو کر تمام مفکرین کو اعلان کر دینا چاہئے کہ اب اردو ادب خود مختار ہو گیا ہے، اس کی شعریات تیار ہو گئی ہے اور وہ کسی بھی ادب کی کسی بھی Theory کو تسلیم نہیں کرے گا۔ زبان کی تشکیل کسی ایک عنصر سے نہیں ہوتی ہے، ادب ایک روز میں تیار نہیں ہوتا، اس کی اپنی تاریخ ہوتی ہے، اس کی اپنی Borrowsings ہوتی ہیں، جسے رد نہیں کیا جا سکتا۔ مغرب کو کیا ضرورت تھی کہ وہ یونانی ادبی Models کو معیار سمجھ کر اپنے ادبی فن پاروں کا احتساب کرتا، افلاطون اور ارسطو کے خیالات سے استفادہ کرتا، انکی شعریات، بوطیقا کو مغربی نظام فکر کا حصہ بناتا، خورشید اکبر کی نظر علاقی [علاقائی] ہے، انھیں عالمی منظرنامے پر بھی نگاہ ڈالنی چاہئے۔ دوسری اہم بات یہ کہ دنیا کا کوئی بھی ادب خود مختار نہیں ہے[؟]، کیوں کہ ادب سیاسی طاقت کا نمائندہ نہیں ہوتا[؟]، بلکہ اپنے ملک کے ادب کو دیگر ممالک کے تناظر میں دیکھتا ہے۔ اگر ہم ارسطو کو مانتے ہیں، اس کی Theories کا اطلاق اپنے فن پاروں پر کرتے ہیں تو اس کے یہ معنی قطعی نہیں ہوئے کہ ہم اپنی شعریات کی تشکیل کرنے کے اہل نہیں ہیں۔ کیا سنسکرت زبان نے اپنی شعریات تیار نہیں کی[؟]، کیا فارسی زبان کا قاعدہ عربی اور اردو زبانوں سے اخذ کیا ہوا ہے؟ کوئی بھی زبان و ادب ترقی پذیر تبھی ہو سکتا ہے، جب اس کی نگاہ عالمی ادب پر ہو ورنہ اپنی ڈفلی اپنا راگ۔[؟]

آج ہم Bourgoise Voluntarism سے برہم ہیں، خاص کر مدیر'' آمد'' خورشید

اکبر[؟]، لیکن انھیں یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ Hypothesis کی بنیاد پر تنقید نہیں ہوتی[؟]، اس باب میں ذیل میں ایک اقتباس نقل کر رہا ہوں:

"There is a damaging and self defeating assumption that theory is necessarily the elite language of the socially and culturally privileged. (Homi Bhabha, Location of Culture p19)"

ھومی بھابھا نے واضح کر دیا کہ ہمیں تمام Hypothesis سے گریز کرنا چاہیے، کیوں کہ کوئی بھی theory اشرافیہ کی نافذ نہیں کی ہوئی ہے[؟]، بلکہ یہ ایک Erronoeous تصور ہے جسے Disillusioned مصنفین نے اپنا کوچہ بنایا ہے، اگر کسی کے فن میں کوئی ادبی صفت نہ ہو تو کیا ہم اسے اعلیٰ وافضل صرف اس لیے کہہ دیں کہ وہ So called کمزور طبقہ کا مصنف ہے یا تخلیق کو غیر معیاری ہوتے ہوئے بھی اسے معیاری تسلیم کر لیا جائے[؟]۔ بھائی خورشید اکبر، نجات پسندی نہ تو Liberal Pragmatiusm کی دلیل ہے اور نہ ہی Academicist Pluralism کی تبلیغ[؟]۔ نجات پسندی کو Subaltern Manifesto بھی نہیں قرار دے سکتے ہیں[؟]، کیوں کہ تصورِ نجات پر مبنی کوئی بھی ادب Secterian ہو سکتا ہے[؟]، Secular نہیں[؟]۔ لہٰذا میرے نزدیک نجات پسندی نہ تو اشرافیہ تنقید کی رد و قبول ہے اور نہ ہی ایسی کوئی منطقی اصطلاح جس کو ہم ادب پارے پر منطبق کر سکتے ہیں[؟]۔ میرا خیال ہے کہ ادب میں سیاست کے لیے کوئی Space نہیں ہے[؟]، اس لیے مجھے کہنا چاہیے کہ کوئی بھی ادب اس طرح کی حد بندی[؟] کو قبول نہیں کرے گا۔

حوالہ جات:

۱. آمد شمارہ ۔ ۸

۲. 'ما بعد جدیدیت: ممکنات و مضمرات': وہاب اشرفی

3. Location of Culture:Bhabha Homi
4. Orientalism: Said Edward
5. Black Skin, white Mask:Fannon Frantz
6. The wretched of the Earth:Fannon Frantz
7. Fiction of the Apartheid:
8. Exploration of Indian History:Lal Vinay
9. Can the subaltern Speak:Spivak Gayatri.

☆

نوٹ: برادرم افروز اشرفی صاحب، خاکسار آپ کے تئیں تشکر کے جذبات سے لبریز ہے کہ آپ نے اس کے اصرار پر ایسا پُر مغز اور بحث طلب مقالہ 'آمد' کے لیے ارسال فرمایا! چونکہ آپ بنیادی طور پر انگریزی ادب کے استاذ ہیں اور اُردو ادب کی سیاحی کا بھی پورا حوصلہ رکھتے ہیں اس لیے ادارہ 'آمد' بھی

آپ کوخوش آمدید کہتا ہے!!

اب آپ کے فکر انگیز سوالات پر چند مختصر معروضات ہیچمداں بھی پیش کرنا چاہتا ہے:

(۱) آپ نے 'نجات پسندی' کو محض 'آمد' کتابی سلسلہ۔۸ کا اداریہ دیکھ کر موضوع بحث بنایا اور بعض فردِ جرم عاید کرنے کے ساتھ چند ایسی باتیں بھی خاکسار سے منسوب کر ڈالیں جن کا یہ بندہ سرے سے مرتکب نہیں ہوا ہے۔ اگر آپ نے 'آمد'۔۷ کا اداریہ: 'ادب کا فلسفۂ نجات' پڑھنے کے بعد اپنا مراسلہ تحریر کیا ہوتا تو اغلب تھا کہ آپ کا ذہن چند غیر ضروری اشکال و اہمال سے محفوظ رہتا لیکن آپ تو 'کا تا اور لے دوڑی' کی کیفیت سے مغلوب ہوئے، شاید! بہر حال، میں بھی آزادیِ اظہار پر قدغن کا طرف دار نہیں ہوسکتا۔ 'پسند اپنی اپنی، خیال اپنا اپنا'۔ یہی تو 'نجات پسندی' کی منطق ہے۔

(۲) آپ نے سوال پوچھا ہے کہ: ''نجات پسندی سے مراد کیا ہے؟ اور اس کے امتیازات کیا کیا ہیں؟'' ان سوالات کا جواب راقم الحروف نے 'آمد'۔۷ کے اداریہ میں پہلے ہی دے رکھا ہے، پھر اس کی تکرار کیوں؟ آپ نے 'بقولِ مدیر آمد' کے سابقے [prefix] کے ساتھ متعدد غیر متعلقہ باتوں کے علاوہ یہ جملہ بھی اس کم علم کے نام منسوب کیا ہے: ''اگر ناقد کا تعلق اشرافیہ سے ہے تو ان کی تنقید معتبر نہیں تسلیم کی جانی چاہئے، کیوں کہ ان کے Evaluation میں نہ تو معروضیت ہوگی اور نہ ہی ادب پارے کو برتنے میں کوئی تنقیدی اصول۔'' اتنی دور کی کوڑی تو کسی بلند پایہ علمی منصب پر فائز شخص ہی لا سکتا ہے، یہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں! مثالیں کتنی دی جائیں۔ گویا پورا مراسلہ صرف یہ باور کرانے کے لیے تحریر کیا گیا ہے کہ: خورشید اکبر کی خود ساختہ 'نجات پسندی' کا واحد مقصد 'اشرافیہ' [نام نہاد] کی نفی ہے۔ اور اس کے برعکس افروز اشرفی کا نومسلمانہ جوشِ تنقید اشرافیہ اقدار کے فروغ و تبلیغ کے لیے وقف ہے۔ کاش! قومِ مسلم کی زبوں حالی اور اردو معاشرے کی زوال آمادگی تیز دنیا کی دیگر قوموں کی روز افزوں ترقیات کے پیش نظر آپ یہ سمجھ پاتے کہ ہم واقعی 'اشرافیہ' کہلانے کے مجاز ہیں یا ہماری صورتِ حالات غیر اشرافیہ سے بھی بدتر ہے؟ مگر اس نفسیاتی مرض کا کیا علاج کہ 'ہم آخر فاتح قوم کی اولاد جو ٹھہرے'!

(۳) واضح رہے کہ 'نجات پسندی' کوئی مذہبی، اصلاحی، مقصدی یا خالص تشہیری اصطلاح نہیں ہے بلکہ شعور/فکر/احساس/تصور/تخیل اور بہ حیثیتِ مجموعی ہمارے ذہنی رویّے کی سطح پر ایک ایسی صورتِ حال کا مظہر ہے جو ادب/زندگی/ثقافت/سماج/سیاست/معیشت وغیرہ کی ہمہ جہت سرگرمیوں میں ڈوبتی اُبھرتی رہتی ہے اور کبھی تھک ہار کر ہمارے لاشعور میں پناہ گزیں ہو جاتی ہے اور بہ طور عقبی/غیبی ترغیبات کے بھی پسِ پردہ کام کرتی رہتی ہے۔ اس ضمن میں راقم الحروف پہلے بھی 'آمد'۔۷ کے اداریہ میں عرض کر چکا ہے کہ: 'نجات' ہر طرح کے جبر کی نفی سے عبارت ہے۔ اب کوئی چاہے تو اس پر ہزاروں

صفحات سیاہ کیے جاسکتے ہیں۔ پھر افروز اشرفی کے یہ سوالات کہ: ''خورشید اکبر نجات پسندی کے حوالے سے کیا کہنا چاہتے ہیں؟ انھیں کس سے نجات چاہیے؟'' کا جواز کہاں رہ جاتا ہے۔

(۴) آپ سیاہ فام افریقی ادب [Black Literature]، حاشیائی ادب [Sub-altern Literature]، دلت ادب [Dalit Literature] کے ساتھ چینوا اچیبے، ایڈورڈ سعید، اوم پرکاش والمیکی، مہا شویتا دیوی وغیرہ کے حوالے سے گفتگو تو کرتے ہیں مگر آپ کے مباحث سے اس بات کا ثبوت فراہم نہیں ہوتا ہے کہ آپ نے واقعی ان مفکرین اور مصنفین سے کے افکار و خیالات سے کچھ روشنی بھی حاصل کی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو آپ 'نجات پسندی' سے اس قدر بدظن نظر نہیں آتے۔ ممکن ہے کہ آپ 'تجاہلِ عارفانہ' سے کام لے رہے ہوں! ورنہ ایڈورڈ سعید کی تحریروں میں موجزن 'انسانی آزادی' اور 'انسانی وقار' کی آوازوں کو ''نجات کی صدا'' ماننے سے انکار کی وجہ؟ حالانکہ یہ بھی سچ ہے کہ خاکسار نے ''نجات پسندی'' کو آزادی، کشادگی، خود مختاری اور نجات کے تدریجی مراحل میں دیکھنے کی جسارت کی ہے یا دوسرے لفظوں میں انھیں ''نجات پسندی'' کے اجزاے ترکیبی کے بہ طور بھی سمجھا جا سکتا ہے۔

(۵) افروز اشرفی صاحب کے اس مراسلے کے بعض متضاد اور مبہم بیانات کے سامنے قوسین کے اندر علامتِ استفہام / سوالیہ نشانات سے راقم السطور نے قارئین کو آگاہ اور متوجہ کرنا چاہا ہے، شاید کہ فاضل مراسلہ نگار بھی دوبارہ غور و فکر سے کام لیں۔

(۶) ''نجات پسندی''، ترقی پسندی / جدیدیت / مابعد جدیدیت کے نجات پسندانہ عناصر کی توسیع اور ان سب سے آگے کی منزلیں ہیں، جن کے زیر اثر ہر وہ ادبی / تخلیقی / ذہنی رویہ شامل ہے جو جبر کی کسی بھی منطق / عہد نامہ کے خلاف ہے۔ اس لیے تکثیریت، حاشیائیت، مقامیت، سیکولرزم، دلت / پسماندہ شعور وغیرہ سب 'نجات پسندی' کے دائرۂ کار اور سلسلۂ مکالمات [ڈسکورس] کے اہم سروکار ہیں۔ 'نجات پسندی' کی نفی دراصل انسانی آزادی / خود مختاری / وقار / ذہنی کشادگی اور تمام عالمِ انسانیت کی تذلیل کے برابر ہے!!!!!

[خورشید اکبر]

☆☆☆

شہرِ نقد و نظر

کرشن چندر

خواجہ احمد عبّاس

عصمت چغتائی

راجندر سنگھ بیدی

اور

منٹو

کے

نام

جوشؔ کی 'یادوں کی برات'

● ڈاکٹر خالد علوی

ہمارے عہد کے سخت گیر محقق رشید حسن خاں نے جوش ملیح آبادی کی خودنوشت 'یادوں کی برات' کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دلچسپی کے لحاظ سے بہت کم کتابیں اس کے برابر رکھی جا سکتی ہیں اور یہ دلچسپی انشا پردازی کی پیدا کی ہوئی ہے۔ چند ماہ قبل میں نے اپنے ایک انگریزی مضمون میں 'یادوں کی برات' کو 'آبِ حیات' اور 'باغ و بہار' سے بہتر اور جوش کو دونوں آزادوں (محمد حسین آزاد اور ابوالکلام آزاد) سے برتر انشا پرداز قرار دیا تھا۔ اس وقت تک رشید حسن خاں کی یہ تحریر میری نظر سے نہ گزری تھی۔ رشید حسن خاں کو ہم خیال پانے کے بعد مزید حوصلہ ملا اور میرا نظریہ مزید راسخ ہو گیا۔

مشتاق احمد یوسفی نے 'یادوں کی برات' کو جوش کی 'شہوانح عمری' قرار دیا ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ کیا کسی عیش پرست انسان کو اپنی سوانح عمری لکھنے کا حق نہیں ہے؟ برصغیر کی متعدد اہم شخصیات کی ذاتی زندگیاں ہماری نظر میں ہیں۔ کیا ہم اس سربراہِ مملکت کو بھول گئے ہیں جس نے 'قوم کے نام' پیغام بھی نشے کی ترنگ میں نشر کیا تھا۔ اس کی دوسری عیاشیوں کے قصے بھی زبان زدِ خاص و عام تھے۔ دیوان جرمنی داس کی دو انگریزی کتابیں 'مہاراجہ' اور 'مہارانی' ہمیں نہ صرف والیانِ ریاست کی زندگی کے مخفی گوشوں کی سیر کراتی ہیں بلکہ عیش کوشی کے نت نئے طریقوں سے بھی متعارف کراتی ہیں لیکن ان لوگوں میں سے کسی کو حق گوئی کا حوصلہ نہ ہوا۔ اگر سوانح عمری لکھی بھی تو اخلاقیات اور مذہبیات کے سمندر میں غرق ہو کر، سچ بولنے کا حوصلہ صرف اردو کے ایک شاعر نے دکھایا بقول فراز:

حق کی بات تو کوئی کہاں تھا مری طرف

جوش ملیح آبادی کی خودنوشت 'یادوں کی برات' برصغیر میں لکھی جانے والی سب سے دلچسپ سوانح عمری ہے۔ اردو، ہندی، بنگلہ، پنجابی اور انگریزی میں لکھی جانے والی خودنوشتوں میں کوئی بھی 'یادوں کی

برات' کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ 'یادوں کی برات' کی اشاعت کے بعد اردو میں تو خود نوشتوں کا انداز ہی بدل گیا۔ کچھ ادیبوں نے 'یادوں کی برات' کے انداز کو شعوری طور پر اپنانے کی سعی کی۔ یہ الگ بات ہے کہ تقریباً مقلدین بری طرح ناکام رہے۔ ایسے لوگوں میں قدرت اللہ شہاب، کشور ناہید، سعیدہ بانو اور نفیس بانو شمع کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ (اگر سوانحی ناول بھی شامل کریں تو احمد بشیر کا 'دل بھٹکے گا' اور 'گیان سنگھ شاطر' از گیان سنگھ شاطر کے نام بھی لیے جاسکتے ہیں) کچھ لوگوں نے شعوری طور پر 'یادوں کی برات' کے انداز سے بچنے کی کوشش کی لیکن 'یادوں کی برات' کو نظرانداز کرنا ممکن نہ ہوا۔

اگر 'یادوں کی برات' کو سوانح عمری کے معیار پر پرکھا جائے یا حق و باطل کی کسوٹی پر کسا جائے تو بہت مایوسی ہوتی ہے لیکن اگر جوش کی ناقابل ترجمہ اردو اور پُرشکوہ نثر کو معیار بنایا جائے تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ برصغیر کی کسی زبان میں ایسی کتاب نہیں لکھی گئی۔ ہندوستان میں لکھی گئی انگریزی شاعرہ کملاداس (جو تبدیلی مذہب کے بعد ثریاؔ کے نام سے موسوم ہوئیں) کی سوانح عمری 'مائی اسٹوری' بھی کافی مشہور ہوئی لیکن 'مائی اسٹوری' کی شہرت کی کچھ غیر ادبی وجوہات تھیں۔ 'یادوں کی برات' اور 'مائی اسٹوری' میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ کملاداس نے اپنی اوائل عمری کے معاشقے بے محابا بیان کیے ہیں اور جوش صاحب نے اپنے عاشقانہ معاملات مبالغہ آرائی کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ اس میدان میں ان کی حق گوئی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے صراحت کر دی ہے کہ ان کے اولین دو عشق لڑکوں سے تھے پہلا عشق ناکام ہوا اور دوسرا منطقی انجام کو پہنچا۔

ایسی ناگفتہ باتیں جو آدمی خود سے بھی پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرے، ایک تحریری دستاویز کی شکل میں منتقل کر دینا جوش صاحب کو ہی سزاوار ہے۔ ایسے واقعات جو، حق پر مبنی ہونے کے باوجود نسل در نسل پریشانی کا باعث بن سکتے ہیں۔ جوش کو اپنی قوم سے یہی شکایت ہے کہ جنسی معاملات کو پردے میں رکھتی ہے۔ اسی کمزوری کی بنا پر جوش پوری قوم کو نامرد قرار دیتے ہیں۔ بہت سے تنقید نگار جوش کو ان خصوصیات کی بنا پر ترقی پسند قرار دیتے ہیں۔

'یادوں کی برات' پر جتنی خامہ فرسائی کی گئی ہے شاید کسی سوانح عمری پر نہیں کی گئی۔ پاکستان میں ان پر مقدمے چلائے گئے۔ ہندوستان میں انگلش، ہندی اور اردو پریس نے جوش صاحب کی تعریف و تائید اور تنقیص میں کشتوں کے پشتے لگا دیے۔ اسی وجہ سے 'یادوں کی برات' پر آزادی ذہن کے ساتھ اظہار خیال ناممکن ہو گیا۔ اردو کے کچھ غیر جانب دار نقادوں کا خیال ہے کہ اردو نثر کی اتنی عظیم کتاب اس سے قبل نہیں لکھی گئی لیکن یہ افسانوی ادب کے زمرے میں رکھی جاسکتی ہے، فکشن ہے فیکٹ نہیں ہے۔

میرا ذاتی خیال ہے کہ اردو نثر کی اتنی پرشکوہ کتاب نہ اس سے قبل لکھی گئی ہے نہ مستقبل قریب میں امید نظر آتی ہے۔[؟] 'یادوں کی برات' کا موازنہ اگر 'باغ و بہار'، 'فسانۂ عجائب'، 'آبِ حیات' سے کیا جاتا

ہے تو پرشکوہ نثری تخلیق کی شکل میں صرف 'یادوں کی برات' ٹھہرتی ہے۔ 'آب حیات' کو مقام دوئم پر رکھا جاسکتا ہے۔ ابوالکلام آزاد، جن کی نثر کو متفقہ رائے سے بہت بڑا نثر نگار تسلیم کرلیا گیا ہے جوش کی نثر کے سامنے نہایت غیر دلچسپ اور اکھڑی اکھڑی مفرس ومعرب (بلکہ فارسی گزیدہ اور عربی گزیدہ) نثر نظر آتے ہیں۔

ہندو کے دونوں محترم 'آزادوں' کی کمزوریاں بھی ان کی شخصیات کی طرح عظیم ہیں۔ محمد حسین آزاد کو جب کوئی کہانی سوجھتی ہے تو وہ ایک شعر کہہ کر اس کہانی کو تقویت دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر کوئی شعر ہاتھ آجاتا ہے تو فوراً مناسب کہانی گھڑ لیتے ہیں جو عام طور پر حقیقت سے زیادہ دلچسپ ہوتی ہے۔ ابوالکلام آزاد کچھ ذہنی تحفظات کا شکار ہیں۔ وہ صرف عربی، فارسی اور اردو اشعار کو پرونے کے لیے نثر لکھتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ التزام بھی رکھتے ہیں کہ ہر شعر بیسویں صدی سے قبل کے کسی شاعر کا ہو۔ اس کے باوجود ان کی نثر دلچسپ نہیں ہے بلکہ اردو، فارسی اور عربی کے مشکل الفاظ کا مجموعہ ہے۔

جوش کی 'یادوں کی برات' کے بارے میں عام طور پر کہا گیا کہ حقیقت نگاری کے نام پر غیر ثقہ واقعات کو عام کیا گیا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ بہت سے تاریخی واقعات اور تاریخی شخصیات کو توڑ مروڑ کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ بھی کہا گیا کہ جس طرح جوش نے اپنی شاعری سے اخلاقی اور مذہبی مسلمات کو مجروح کیا ہے یہ بھی ان کی اسی شعوری کوشش کی توسیع ہے۔ 'یادوں کی برات' کے شائع ہوتے ہی ہندوستان کی تمام بڑی زبانوں میں ایک طوفان آگیا اور بشمول انگریزی تمام زبانوں کے بڑے اخبارات میں یہ تاثر دیا گیا کہ ایک تارک وطن شاعر نے ہمارے بڑے رہنماؤں نہرو اور آزاد پر بعد از مرگ بدنامی کی خاک اڑانے کی نامسعود کوشش کی ہے۔ پاکستان میں اکثر کہا گیا کہ جوش ملیح آبادی اتنا عرصہ پاکستان میں رہنے کے باوجود بھی ایک ملحد ہندوستانی کی طرح سوچتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ محولہ بالا متضاد اور متصادم بیانات کو 'یادوں کی برات' کے ذریعے ثابت بھی کیا جاسکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جوش کا مقصد یہ نہ تھا۔ تاریخ نگاری اور بت شکنی بھی مقصود نہ تھا۔ ان کا مقصد ایک خاص طرح کی امیج سازی تھا اور اس عمل میں انھوں نے بہت سی اختراعاتِ فائقہ کا سہارا لیا۔ میرا عندیہ یہ ہے کہ یہ کذب وافترا ہم پر گراں نہیں گزرتے بلکہ دلچسپ معلوم ہوتے ہیں۔ یہ تمام 'غیر حقیقی سچ' نہایت سادگی اور معصومیت سے بولے گئے ہیں۔ ابتدا ہی میں جوش اپنی غلط بیانی کو حق بجانب ٹھہرانے کی ناکام کوشش کرتے ہیں:

> ''میں کبھی قوی حافظے کا مالک نہیں رہا۔ اور اب تو یہ عالم ہوگیا ہے کہ رات کیا چیز کھائی تھی صبح کو یاد نہیں رہتا۔ کئی مہینوں پہلے کی بات ہے کہ تاروں کی چھاؤں میں ٹہلنے نکلا تھا۔ واپسی میں گھر کا راستہ بھول گیا.... ایک دن خط لکھنے کے بعد جب دستخط کی نوبت آئی تو اپنا تخلص بھول گیا۔ چند سیکنڈ تک مجھ پر عجیب کیفیت طاری

رہی دل دھڑ دھڑ کرنے لگا اور اگر دو چار سیکنڈ کے اندر اپنا تخلص نہ یاد آ جاتا، تو یقین فرمایئے کہ میرا دم نکل جاتا........ میں نے یہ بات اس واسطے لکھ دی کہ اگر میری زندگی کے کسی واقع میں کمی بیشی، یا تقدم و تاخر نظر آئے تو آپ اسے میرا ارادی فعل نہ سمجھیں اور میری حالت پر ترس کھا کر اسے معاف کر دیں۔'' ص ۱۳

یہاں ہم سوانح نگار کی آدھی بات مانتے ہیں یعنی واقعات کی کمی بیشی اور تقدم و تاخر کے لیے تو تیار ہو جاتے ہیں، معاف کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ جس کے لیے سوانح نگار خواستگار ہے اور یہ اعتراف اسی لیے کیا گیا ہے۔

اگر ہم غور و خوض کریں تو ہمیں ہلکی سی فسانہ طرازی کا احساس ہوتا ہے۔ جوش نے آٹھ دہائیوں میں پھیلی ہوئی وسیع و عریض زندگی کا کوئی کونہ تاریکی میں نہیں رہنے دیا۔ ایام طفولیت کی تمام تفاصیل کی تصویر کشی، بسم اللہ کی تمام رسوم کے علاوہ چاندی کی پلیٹ اور سونے کے قلم کے علاوہ یہ بھی یاد ہے کہ دادا نے کہا تھا:

قلم گوید کہ من شاہ زمانم

نسیان جسے لوٹ رہا ہو وہ یادوں کے جواہر کی اتنی تندہی سے حفاظت نہیں کر سکتا۔ یہ بات الگ ہے کہ جوش صرف وہی باتیں یاد رکھتے ہیں جو یاد رکھنا چاہتے ہیں۔ کتاب کی ابتدا میں ہی جس طرح ضعیف حافظے کو ڈھال بنایا گیا ہے وہ معصومیت کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ جب یہ باطل دنیا کسی کی گفتنی ناگفتنی کا محاسبہ کرتی ہے تو ایسے معصوم اور بے ضرر عذر کو شعوری طور پر نظر انداز کرتی ہے جو 'یادوں کی برات' کے سلسلے میں بھی ہوا ہے۔ جب بھی 'یادوں کی برات' کو حق و باطل کی کسوٹی پر پرکھا گیا ہے جوش کے اعتراف ضعفِ یادداشت کا ذکر بھی نہیں ہوا۔

جوش نے 'یادوں کی برات' کے بارے میں جہاں بھی کوئی 'ہوشیاری' دکھانے کی کوشش کی ہے وہ اور زیادہ معصوم نظر آتے ہیں۔ ذاتی زندگی میں بھی ایسے بہت سے حوالے ہیں جہاں جوش صاحب کی معصومیت ہی ان کی سب سے بڑی سپر تھی۔

ٹونک کے نواب کو وزارت خزانہ میں کوئی اہم کام درپیش تھا۔ بسمل سعیدی نے نواب صاحب کو مشورہ دیا کہ آپ جوش ملیح آبادی کی مدد سے مطلب براری کر سکتے ہیں۔ جوش صاحب کا پنڈت نہرو سے بہت قلبی تعلق ہے وہ ضرور آپ کی مدد کریں گے۔ نواب صاحب نے جوش کو ٹونک آنے کی دعوت دی، جوش صاحب اپنی بیگم کے ساتھ ٹونک پہنچے اور کئی دن تک ان کے مہمان رہے۔ جب تک جوش صاحب ٹونک میں رہے نواب کی نئی بیوک کار ان کی خدمت میں رہی۔ نواب صاحب نے جوش کی بیگم کی خدمت میں چالیس ہزار روپیہ کے زیورات بھی تحفتاً پیش کیے۔ جوش صاحب واپس آنے لگے تو جوش نے نواب صاحب سے کہا کہ اتنے دنوں تک ٹونک کے لوگوں نے بیوک میں گھومتے دیکھا ہے وہ مجھے بس میں سفر کرتے دیکھیں گے تو

شرمندگی ہوگی۔ اگر آپ اجازت دیں تو نوائی تک لے جاؤں۔ نواب صاحب نے بخوشی اجازت دے دی۔ نوائی پہنچ کر جوش صاحب نے پیغام بھیجا اگر اجازت ہو تو جے پور تک کار لے جاؤں جہاں سے ٹرین مل جائے گی۔ جے پور پہنچ کر جوش صاحب نے پیغام بھیجا کہ جے پور میں ٹرین چھوٹ گئی ہے اگر اجازت ہو تو دلی تک اسی سے چلے جائیں۔

دہلی پہنچ کر جوش صاحب نے فون کیا کہ جب سے دہلی آیا ہوں آپ کی نئی بیوک میں گھوم رہا ہوں۔ جواہر لال نہرو سے بھی اسی کار میں ملنے گیا تھا۔ یہاں یہ شہرت ہوگئی ہے کہ آپ نے یہ کار مجھے تحفہ میں دی ہے۔ اگر آپ کہیں تو میں یہ کار آپ کو واپس کردوں۔

نواب صاحب کا جواب تھا۔ ''نہیں نہیں۔ یہ کار اب آپ ہی رکھ لیجیے۔ اس طرح جوش صاحب کو اپنی کھٹارہ کار سے نجات مل گئی جس کے بارے میں یہ شعر بہت مشہور تھا:

ایسی بگڑی ہے عقل یاروں کی
جوش صاحب کی جیسے موٹر کار

اس واقعے کے راوی مخمور سعیدی ہیں۔ اگرچہ اس کہانی میں کئی جھول ہیں۔ چھٹی دہائی میں ہندوستان میں فون کی وہ سہولت نہیں تھی جو آج ہے اس لیے ہر دس بیس میل کے بعد پیغام بھیجنا آسان نہ تھا لیکن مخمور سعیدی ثقہ راوی ہیں انھوں نے یہ واقعہ بسمل سعیدی کی زندگی میں لکھا تھا جو اس واقعے کے گواہ تھے۔

عام طور پر یہ کہانی جوش صاحب کی چالاکی اور دنیوی شعور ظاہر کرنے کے لیے بیان کی جاتی ہے لیکن اگر یہ واقعہ حق پر مبنی ہے تو جوش کی سادگی اور معصومیت کی بہترین مثال ہے۔ اس زمانے میں نواب نے چالیس ہزار کے زیورات جوش کی بیگم کی نذر کیے وہ اس سے آدھی رقم کی کار پیش کرنے میں کیا ہچکچاہٹ محسوس کرتے، (یہ واقعہ آزادی کے چند سال بعد کا ہے اس وقت بہترین کار پندرہ بیس ہزار میں آجاتی تھی) جب کہ انھیں جوش صاحب کی مدد بھی درکار تھی۔

جوش صاحب کے اٹھارہ معاشقوں پر بھی کافی کہرام مچا۔ دراصل یہ سارے معاشقے ضمنی اور فروعی ہیں۔ جوش صاحب کا اصلی عشق ان کی اپنی ذات سے ہے۔ ان کی شخصیت کو مبدءِ فیاض نے نہ صرف تمام صلاحیتوں سے مالا مال کیا ہے بلکہ جسمانی وجاہت اور خوبصورتی کے خزانے بھی لٹائے ہیں۔ جواہر لال نہرو سے پہلی ملاقات کا ذکر اس انداز میں کرتے ہیں:

> ''... جب میں لڑکپن میں اپنے باپ کے ساتھ، ان کے باپ کے مکان میں ٹھہرا اور وہاں سب سے پہلے ان کو دیکھا تھا۔ اس وقت وہ بھی قیامت تھے اور میں بھی۔'' ص ۱۹۴

پرنس قدر کے سلسلے میں بھی لکھتے ہیں:

"میرے مور خان طفلی وشباب میں اب صرف مرزا ہی باقی رہ گئے ہیں وہ مجھے یاد دلاتے ہیں کہ میں کس قدر نازک اندام وحسین تھا۔" ص ۴۴۸

یہی نہیں اپنا تفصیلی سراپا بھی بڑے عاشقانہ یا معشوقانہ انداز میں بیان کرتے ہیں:

"گالوں پر سرخی کے ہلکورے، آنکھوں میں گلابی ڈورے — چھریرا بدن، پتلی کمر، گھنیرے بال، پتلے پتلے ہونٹ، لانبی لانبی پلکیں، — بر میں ریشمی کرتہ، کرتے پر روئی بھری مخملی صدری، سر پر آڑی جرنیلی ٹوپی، ٹوپی کے گرد آگرے کا سنہرا فیتہ، اور داہنے کان میں ہلتا ہوا سونے کا جھلاجھل دُر، اُف میں کس قدر حسین ہوں۔ زندگی میں پہلی بار پتہ چلا۔ اللہ بھلا کرے طلوع صبح کی رنگینی کا، جس نے میرا پوشیدہ جمال مجھ پر آشکار کر دیا۔" ص ۵۱

جوش پر ان کا جمال دیر سے آشکار ہوا۔ قاری پر تو ان کی نرگسیت ابتدائی صفحات میں ہی واضح ہو جاتی ہے۔ جہاں ان کے گوش مبارک میں شاعری پہ افسوں پھونک چکی ہے کہ حضور اقدس واعلیٰ بیسویں صدی کے سب سے عظیم شاعر یعنی اشعر الشعرا ہیں.....ص ۱۶

جوش جب کوئی نکتہ سامنے لانا چاہتے ہیں تو فوراً کوئی کہانی بنا کر دفاع کرتے ہیں۔ غالبؔ نے نہایت خلوص سے ایک خط میں لکھا تھا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ دنیا میں، اگر دنیا میں نہیں تو ہندوستان میں اگر ہندوستان میں ممکن نہیں تو دلّی میں کوئی بھوکا ننگا نظر نہ آئے، بالکل یہی خواہش جوش صاحب کی بھی ہے:

"جب کسی مفلس کے گھر کے چولھے میں آگ روشن نہیں ہوتی۔ میرے سینے سے دھواں اٹھنے لگتا ہے۔ جب کسی، یتیم کی پسلیاں نظر آتی ہیں تو میرے بدن میں میری ہڈیاں سلگنے لگتی ہیں۔ جب کسی گوشے سے رونے کی آواز آتی ہے تو میری آنکھیں رونے لگتی ہیں۔ جب کسی کے گھر سے جنازہ اٹھتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ جنازہ خود میرے ہی گھر سے نکل رہا ہے۔" ص ۲۳

لیجیے غالبؔ نے بھوکا ننگا نظر نہ آنے کی بات کہی تھی، جوش صاحب کو جنازہ دیکھنا بھی مشکل نظر آیا۔ غالب نے لکھا تھا کہ 'ہم مغل بچے بھی غضب ہیں جس پہ مرتے ہیں اسے مار کے رکھ دیتے ہیں۔" احمد فراز نے ایک شعر میں یہی بات دوہرائی ہے:

ہم محبت میں بھی غالبؔ کے مقلد ہیں فرازؔ
جس پہ مرتے ہیں اسے مار کے رکھ دیتے ہیں

غالبؔ کے بے ضرر سے جملے کو جوش صاحب نے اپنے اٹھارہ بلکہ انیس معاشقوں کی بنیاد بنالیا۔ مرکزی خیال وہی رہا کہ خواتین ان پر مرتی ہیں۔ 'یادوں کی برات' کا پہلا ایڈیشن شائع ہونے سے قبل یہ عشق ان کی وجیہہ شخصیت اور شاعری کی وجہ سے رہے ہوں گے لیکن ایک عشق 'یادوں کی برات' کے کھاتے میں بھی

موجود ہے:

''میں نے اشارہ کیا صوفے کی طرف، لیکن میرے اشارے کی پروا نہ کرتے ہوئے وہ آئی اور آ کر میری پائنتی بیٹھ گئی اور جیسے ہی میں نے چاہا کہ پاؤں کھینچ لوں اس نے اپنی ملائم اور گرم ہتھیلیوں سے میرے دونوں گھٹنے پکڑ کر کہا نہیں نہیں آپ آرام سے لیٹے رہیں اور اس کی گرم ہتھیلیوں کا رس میرے خون میں کھد بدانے لگا۔۔۔اللہ اتنا فلسفی بھی نہ ہو کر رہ جائے کوئی۔ میں آپ کے پاس اس شوق سے آئی اور آپ نے شاعر کی نظر سے، میری طرف نگاہ نہیں اٹھائی، کس کام کی ایسی رکھائی۔ حالانکہ مجھ کو آپ سے۔۔۔آپ سے بہت...... میں نے آپ کا سارا کلام اور'یادوں کی برات' پڑھی ہے۔.....یہ تلاطم دیکھ کر میرا فلسفی مرگیا اور میرا شاعر جی اٹھا میں نے پھر تو آؤ دیکھا نہ تاؤ، اس کو خوب بھینچ کر اپنے کلیجے سے لگا لیا اور ڈھل ڈھل بہنے لگے مرے آنسو بھی....''

اس حوالے میں بھی کئی دلچسپ باتیں ہیں۔ لڑکی فلسفے کی طالبہ ہے اور جوش کو بھی فلسفی سمجھتی ہے۔ جوش بھی خود کو شاعر کے ساتھ فلسفی بھی سمجھتے ہیں۔ اب تک خواتین جوش کی شاعری پر جان دیتی تھیں۔ پہلی بار جوش کے فلسفے اور سوانح عمری کو زینۂ عشق بنایا گیا ہے۔ غور کرنے پر اس کہانی میں بھی بہت سی خامیاں ہیں۔ میں نے مشاعروں کے بعد آنند نرائن ملا، حسرت جے پوری اور جاوید اختر جیسے شاعروں کو بھی خواتین سے گھرا ہوا دیکھا ہے لیکن وہ جسم کی پیاس لے کر شاعروں کے پاس نہیں آتیں۔

جہاں تک جوش صاحب کے اٹھارہ معاشقوں کا تعلق ہے اس کا ذکر احتشام حسین نے اپنے مختصر کتابچے میں بھی کیا ہے۔ 'جوش ملیح آبادی' از احتشام حسین میں جوش صاحب کی ابتدائی زندگی کا احاطہ کیا گیا ہے (ص ۲۲)۔ احتشام حسین نے جب جوش صاحب سے ان کی سوانح لکھنے کا عندیہ ظاہر کیا تو جوش صاحب نے ہر ممکنہ تعاون کا یقین دلایا تھا۔ اس کتاب میں جوش کی ابتدائی چالیس سالہ زندگی کے بارے میں معلومات درج کی گئی ہیں۔ (یہ کتاب حال ہی میں اردو اکیڈمی لکھنؤ، نے دوبارہ شائع کی ہے) اس عمر میں ہی جوش صاحب نے اپنے معاشقوں کی تعداد طے کر دی تھی۔ باقی چالیس سالہ زندگی رائیگاں گزر گئی۔ احتشام حسین نے جوش کے خاندان کے تجزیے میں بہت دلچسپ بات لکھی ہے۔ جوش جس طرح اپنے دادا کی حد سے بڑھی ہوئی جنسی قوت کا ذکر کرتے ہیں جنسی نفسیات پر غور کرنے والے یہی کہیں گے کہ جسمانی طاقت کے اظہار کا موقع میدان جنگ میں نہ ملا اس لیے اس نے شہوانی خواہشات کا بھیس بدل لیا۔ جوش بھی اپنے قوی میلان جنسی میں اپنے بزرگوں کے خون کی گرمی دیکھتے ہیں اور کسی نہ کسی شکل میں اس کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ (ص ۲۲)

'یادوں کی برات' کے مصنف میں ایسی نرگسیت ہے جو اس کو اپنی شخصیت کے طلسمی حصار سے

باہر نکلنے ہی نہیں دیتی۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ جولکھ رہا ہے آپ ضرور یقین کریں گے۔ ان کا یہ خیال ہے کہ انھیں 'نوبل پرائز' ملنا چاہیے:

'کاش کوئی نوبل پرائز ارباب حل وعقد سے کہہ دے کہ اے سخن ناشناسو، اور اے قدامت پرست اندھو، اگر تم ادب کے قدردان ہو تو شاعر کے کلام کو اس کی زبان میں پڑھو۔ خود نہیں پڑھ سکتے تو اس کے ہم زبان اکابر کی ایک کمیٹی بنا کر اس کے سپرد کر دو کہ وہ اپنی رائے سے تم کو مطلع کرے۔

تمھیں آخر کون سا دماغی مرض لاحق ہوگیا ہے کہ تم شاعری کے جیتے جاگتے جسم کی جانب تو کوئی اعتنا نہیں کرتے اور جب ترجمہ میں اس گرم جسم کو ٹھنڈی لاش میں تبدیل کر دیتا ہے تو اس لاش کو تم کلیجے سے لگا لیتے ہو۔ اے جسم بے زار ولاش نواز لوگو۔ ادب کی دیوی تمھاری بے سوادی پر ماتم کر رہی ہے۔'' ص ۲۰۰

جوش کی بہت سی نفسیاتی کمزوریوں میں ایک یہ بھی ہے کہ ان کی دنیا میں ہر آدمی باون گز کا ہے۔ خود تو وہ دنیا کی وجیہہ ترین شخصیت ہیں ہی وہ اپنی خوبصورتی، اپنے چمپئی رنگ اپنی لانبی لانبی پلکوں کا اشتہار خود کرتے ہیں کبھی کسی کمسن دوشیزہ کی زبانی کراتے ہیں۔ شاعر تو انھیں دنیا مانتی ہے جوش صاحب شاعر کے ساتھ فلسفی بھی سمجھتے ہیں اور فلسفی ہونے کی تائید میں بی اے سال سوئم کی فلسفے کی طالبہ علم کی سند بھی لاتے ہیں۔ کبھی کبھی جسم اور روح کے بارے میں ابتدائی اور طالب علمانہ باتیں کرتے ہیں اور ان کو فلسفہ سمجھتے ہیں۔

جوش کو یقین تھا کہ 'یادوں کی برات' کی اشاعت کے بعد اس کتاب کو ان تمام الزامات کا تیر بہدف جواب مانا جائے گا جو ان کی شخصیت پر پاکستان میں لگائے گئے تھے، پاکستان میں لگائے گئے الزامات میں سنگین ترین الزامات یہ تھے کہ جوش ملحد ہیں اور وہ پاکستان کے قیام کے ہی خلاف تھے۔ جوش نے ہر الزام کا جواب دینے کی کوشش کی لیکن ان کی معصومیت ہر جگہ آڑے آتی ہیں اور ان کے جوابات محض لفاظی اور فسانہ طرازی بن کر رہ جاتے ہیں۔ قیام پاکستان کا مخالف ہونے کا جواب اس طرح دیتے ہیں:

''میں کلیم کے آخری دور میں پاکستان کا حامی بن گیا تھا اور پاکستان کی حمایت میں ایک بہت بڑے مجمع کے سامنے گنگا پرشاد میموریل ہال کی چھت کے نیچے ایک ایسی گھن گرج نظم پڑھی کہ ہال گونجنے لگا اور میرے سینکڑوں کانگریسی دوستوں کو مجھ سے شکایت پیدا ہوگئی۔'' ص ۲۴۹

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر آپ قیام پاکستان کے حامی تھے تو اپنے نظریے پر قائم کیوں نہیں رہے۔ اگر قائم رہے تو ہمیشہ اس کا اظہار کیوں نہیں کیا؟ کیا یہ دونوں ہاتھوں میں لڈو رکھنے کی معصومانہ کوشش تھی!

اپنے اوپر لگائے گئے دوسرے بڑے الزام یعنی 'ملحد' کے ردّ کے لیے جوش صاحب باقاعدہ پلاننگ کرتے نظر آتے ہیں:

> ''رات کے وقت جب خلافت کمیٹی کے اجلاس میں شریک ہونے کے لیے روانہ ہوکر پنڈال سے گزرنے لگا (جہاں روشنی اور آمد و رفت بہت کم تھی) تو میں ایک والنٹیر لڑکی کا دیوانہ وار بوسہ لے لیا اور میرے بوسہ لیتے ہی پنڈال سے آواز بلند ہوئی۔ ''نصرٌ مِن اللہ فتحٌ قریب۔'' ص ۱۹۵

اس مقدّس فریضے سے فارغ ہوکر چھوٹے دادا کے ساتھ اجمیر کی زیارت کو نکلے۔ اجمیر سے دو چار اسٹیشن قبل ایک بلا کی حسین لڑکی سامنے کھڑی ہوئی تھی اس کے حسن نے مجبور کردیا کہ اس کو پاس جاکر دیکھیں۔ اس کے حسن سے اتنا مسحور ہوئے کہ گاڑی چھوٹ گئی دوسری گاڑی سے شام کے وقت اجمیر پہنچے۔ جب چھوٹے دادا نے کہا کہ بھائی شبیر حسن خاں آؤ زیارت کر آئیں۔ جوش صاحب نے کہا آپ جائیں میں خواجہ صاحب کا مہمان ہوں اور جب تک خود میزبان بلانے نہیں آئیں گے میں نہیں جاؤں گا۔ باقی کہانی جوش صاحب کی ہی زبانی سنیے:

> ''جوتا اور شیروانی اُتارے بغیر میں چارپائی پر دراز ہوگیا اور اسی عالم میں یہ خواب دیکھا کہ ایک مرد بزرگ، میرے سرہانے کھڑے بڑی دلداری کے ساتھ مسکرا رہے ہیں۔ میں نے پوچھا آپ کا اسم گرامی۔ انھوں نے عجیب مشفقانہ انداز سے کہا۔ میرا نام ہے معین الدین اور میزبان کی حیثیت سے آپ کو بلانے آیا ہوں۔ شرط آپ کی پوری ہوگئی، اب تو آیئے گا نا۔'' ص ۱۹۲

صرف یہی نہیں وہ ایک ایسا خواب بیان کرتے ہیں کہ ہر مذہبی مسلمان ان کے ہاتھ چومنے پر مجبور ہوجائے:

> ''ہاں تو خواب یہ دیکھا کہ ایک تاب ناک چہرے کے مرد بزرگ میرے سامنے کھڑے ہوئے ہیں اور چاند اُن کا طواف کررہا ہے۔ میں نے ان کی طرف نگاہ اٹھائی، آنکھوں میں خیرگی آئی۔ بار بار میں نے آنکھیں ملیں غور سے ان کو دیکھا۔ پل بھر میں حافظہ جگمگا اٹھا، میں پہچان کر ان کے قدموں پر گر گیا اور منھ ملنے لگا ان کے نعلین پر۔ انھوں نے ہاتھوں کا سہارا دے کر مجھے اٹھالیا۔ میں نے روتے ہوئے پوچھا کیا آپ ہی میرے رسول ہیں، جنھوں نے اپنا دیدار لڑکپن میں مجھے دکھایا تھا...
>
> ...انھوں نے میری پائنتی کی جانب اشارہ کرکے حکم دیا کہ تم اس شخص کے پاس چلے جاؤ، میں نے ادھر نگاہ اٹھائی تو یہ دیکھا کہ ایک بادشاہ سر جھکائے اور ہاتھ

باندھے کھڑا ہے۔ میں نے کہا اے میرے رسول یہ کون ہے؟ انھوں نے ارشاد فرمایا یہ نظام دکن ہے تم کو دس برس تک اس کے زیر سایہ رہنا ہے؟'' ص ۲۰۵

جوش جب فسانہ طرازی کرتے ہیں تو بہت زیادہ سوچ بچار کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ بس آپ یقین کرلیں۔ اس کہانی کی حقیقت یہ ہے کہ جوش نے نظام حیدر آباد کو خط لکھا کہ وہ (جوش) فارسی شاعر فردوسی کی طرز پر نظام کے خاندان کی تاریخ لکھنا چاہتے ہیں اس خط کے ساتھ جوش صاحب نے ایک مختصر منظوم باب بھی ارسال کیا تھا۔ یہ منظوم باب اور دیگر کاغذات آج بھی موجود ہیں (بحوالہ جوش ملیح آبادی: مرتبہ قمر رئیس، ص ۲۹۰)۔ اس طرح کی کہانیاں جوش صاحب اس لیے بھی سناتے ہیں کہ ایک مارکسی شاعر نظام حیدر آباد کے دامن دولت سے وابستگی کی توضیح کر سکے۔

ایک اور مقام پر جوش روحوں کو بلانے اور گفتگو کرنے کے مدعی ہیں۔ جوش صاحب نہ صرف خود دعوی کرتے ہیں بلکہ ان کے قول کے مطابق راجہ کشن پرشاد کول، فانی بدایونی اور آزاد انصاری کو بھی یقین تھا کہ جوش روحوں سے اپنے سوالات کا جواب حاصل کر سکتے ہیں۔ بہت سی ناقابل یقین کہانیاں بیان کرنے کے بعد جوش لکھتے ہیں:

> ''فانی صاحب نے ایک رات میر تقی میر کی روح کو بلا کر پوچھا، اقبال کیسے شاعر ہیں؟ روح نے جواب دیا میں ان کو آدھا شاعر مانتا ہوں۔ اس لیے کہ وہ دوسروں کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں اور ان کی ذاتی پونجی بالکل اوچھی ہے۔'' (ص ۴۹۲)

روحوں پر نقد وانتقاد کی ذمہ داری ڈالنا جوش صاحب کو ہی زیب دیتا ہے اور وہ بھی اقبال کے بارے میں، جن کو جوش اپنا مقابل اور متقابل سمجھتے ہیں۔ روح بھی اتنی سعادت مند کہ اوچھی پونجی والے اقبال کا ذرا بھی خیال نہ کیا۔ ''فانی نہ صرف خود روحوں کو بلاتے تھے بلکہ جوش کو بھی اس ڈھرّے پر لگا دیا۔''

> ''ایک بار فانی، آزاد انصاری، علی اختر اور مودودی وغیرہ کے سامنے میں نے غالب کی روح کو بلا کر کہا اپنا اسم گرامی لکھ دیجیے، روح نے چِٹ پر غالب مغلوب لکھ دیا، میں نے کہا کہ مغلوبیت کیسی؟ پلان چِٹ نے جواباً یہ لکھا۔ اہل دنیا کی ناقدر شناسی کے باعث، اب تک اپنے کو مغلوب سمجھ رہا تھا۔ میں نے کہا کہ میں پرسوں آپ کے مزار پر گیا تھا۔ انھوں نے لکھا۔ ''میرا قیام مزار میں نہیں ہے۔
>
> ...میں نے آزادی انصاری کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ میرے داہنے طرف کون بیٹھے ہیں انھوں نے لکھا کہ میرا پوتا ہے۔ میں نے کہا آپ مغل ہیں اور یہ انصاری، آپ کے پوتے کیسے ہو سکتے ہیں؟ 'انھوں نے' لکھا یہ میرے شاگرد حالی کے شاگرد اور اس رشتے سے میرے معنوی پوتے ہیں۔'' ص ۴۹۲

جوش صاحب کو احساس ہوا کہ روحوں کو بلانے کا معاملہ اتنی آسانی سے گلے اترنے والا نہیں ہے اس لیے وہ اس کھیل میں فانی کو بھی شریک کار ظاہر کرتے ہیں۔ ایک بار مہاراجہ کشن پرشاد نے فانی سے ایک روح بلانے کو کہا۔ فانی نے کہا کہ ''یہ مشکل کام ہے۔ آج کل جوش کی مشق چڑھی ہوئی ہے ان سے کہیے! اور جوش نے فوراً مطلوبہ روح کو بلالیا۔ بعد میں معلوم ہوا وہ کشن پرشاد کے والد کی روح تھی'' (ص ۴۹۳)۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ قدرت اللہ شہاب نے اپنی سوانح عمری 'شہاب نامہ' میں بھی بالکل جوش صاحب کی طرز پر ایک روح سے تحریری جوابات حاصل کرتے ہیں۔ اس روح کا نام 'نائنٹی' ہے۔

خود ہی نہیں جوش کے ایسے کئی دوست بھی ہیں جو پیش گوئی کردیتے ہیں۔ محبوب شاہ مجذوب ہیں جو دلوں کا حال جان لیتے ہیں (ص ۵۸۳)۔ ALVERO ہیں جو ہر آدمی کے سوال کا صحیح جواب دیتے ہیں اور سوچے گئے سوالوں کے جوابات دے دیتے ہیں۔ (ص ۵۸۶)

جوش کی دنیا میں ہر آدمی کسی نہ کسی غیر معمولی خصوصیت کا حامل ہے۔ جوش اس کی وہ تصویر دکھاتے ہیں جو دکھانا چاہتے ہیں لیکن کسی طرح بھی وہ شخصیت جوش سے بلند نہیں ہونی چاہیے۔ اس لیے تھوڑی سی تعریف و تحسین کے بعد ایک آدھ جملہ ایسا لکھ جاتے ہیں کہ کیے کرائے پر پانی پھر جاتا ہے۔ ٹیگور کی وسیع المشربی اور آزاد خیالی کی تحسین کرتے ہیں پھر جھٹکا دیتے ہیں:

> ''لیکن ایک چیز ان میں ایسی تھی جو میرے دل میں کھٹکا کرتی تھی اور وہ تھی ان کی نمود و نمائش کی عادت۔ میں نے ہمیشہ اس بات کو بری نظر سے دیکھا کہ جب کوئی غیر ملکی، انٹرویو کے واسطے ان سے ملنے آتا تھا تو اس کے آنے سے پیشتر وہ بن سنور کر ایک نمایاں مقام پر بیٹھ جاتے تھے۔ عود ان کی پشت پر سلگا دیا جاتا تھا اور وہ حسین لڑکیوں کو اپنے گرد و پیش کھڑا کر کے یوں انٹرویو دیا کرتے تھے کہ آنے والے کو یہ گمان ہونے لگے کہ میں کسی پراسرار دیوتا کو دیکھ رہا ہوں۔'' ص ۲۰۲

اس کے باوجود ٹیگور کو نوبل پرائز دے دیا گیا۔ نوبل پرائز کے ارباب حل و عقد کی عقل پر تو جوش پہلے ہی ماتم کر چکے ہیں۔ اقبال کو پہلے ہی 'آدھا شاعر' قرار دیا جا چکا ہے۔ جوش کسی کی تعریف کرتے ہیں پھر ایک جملے سے اس کا کام تمام کر دیتے ہیں۔ فانی کو غزل کا بڑا شاعر قرار دیتے ہیں اور آخر میں لکھتے ہیں ''فانی سارا وقت اپنی محبوبہ کے گھر میں گزارتے باقی سارا وقت اپنی محبوبہ کی داستان سناتے۔'' (ص ۴۸۹)۔ سہا بھوپالی کے وسعتِ مطالعہ کی تعریف کرتے ہیں لیکن یہ بھی بتاتے ہیں کہ عورت اور شراب کے اس قدر رسیا تھے کہ دونوں کی بو پا کر دوڑ پڑتے تھے اور 'ایک بوسہ ایک بوسہ' کی تکرار کرتے تھے۔ کنجو خاں ہیں جو اللہ میاں سے لڑتے ہیں۔ امیر احمد خاں ہیں جو نت نئی گالیاں ایجاد کرتے ہیں۔

ڈاکٹر سکسینہ ہندو کالج میں فلسفے کے استاد ہیں لیکن بیوی سے بہت ڈرتے ہیں ایک بار کار میں بیٹھے ہوئے جوش کے ساتھ شراب پی رہے تھے ایک کانسٹبل نے دیکھ لیا۔ سکسینہ کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ گیا ، جلدی سے پولیس کمشنر کے گھر بھاگے۔ پولیس کمشنر شنکر پرشاد اُن کا دیرینہ دوست تھا۔ وہ آٹھ دن تک شنکر پرشاد کے گھر میں چھپے رہے۔ کہانی دلچسپ ہے۔ (ص ۴۵۶) لیکن پولیس کمشنر کا قریبی دوست کانسٹبل سے اس درجہ ڈر سکتا ہے؟

وصل بلگرامی ہیں جو سفر کرتی ہوئی دوشیزگان کا بوسہ لے لیتے ہیں (ص ۵۰۵)۔ آغا شاعر قزلباش ہیں جو زور کی آواز سے ڈر جاتے ہیں اور گھر میں چھپ جاتے ہیں۔ کرنل اشرف الحق ہیں جو ڈپٹی نذیر احمد کے بھانجے ہیں اور فحش شاعری کرتے ہیں۔ اپنی دختر کے ساتھ فحش جنسی اشارے بے محابا کرتے ہیں۔ بڑے ڈاکٹر ہیں لیکن پر مریض کو A D T دیتے ہیں۔ ADT اشرف الحق کا اپنے کمپاؤنڈر سے خفیہ اشارہ ہے جس کا مطلب ہے ANY DAMN THING (ص ۵۰۴) مانسی جائسی ہیں جو ایک یوریشین لڑکے کے عشق میں تباہ ہو رہے ہیں۔ مجاز ہیں جو شراب پی کر خود کو تباہ کر رہے ہیں۔ قاضی خورشید احمد ہیں جو ہم جنسیت کے ماہر خصوصی ہیں لیکن اس فعل کے خلاف ایک کلمہ بھی مداخلت فی الدین سمجھتے ہیں (ص ۴۲۷)۔ کموڈ میں پلاؤ کھا لیتے ہیں کوئی نوجوان ان سے ملتا ہے تو پوچھتے ہیں کہ کیا ہم کبھی آپ کو استعمال کر چکے ہیں۔ رفیع احمد خاں فحش شاعری کرتے ہیں اور فحشیات کے امام ہیں۔ رات میں شرفا کے گھروں کے دروازوں پر دشنام طرازی کرتے ہیں۔ الغرض کوئی شخص ایسا نہیں ہے کہ جو کسی مضحکہ خیزی سے دوچار نہ ہو۔ خیال آتا ہے کہ ان سب سے تو جوش ہی بہتر ہیں۔

جوش صاحب سوشلسٹ اور مارکسسٹ ہیں اور اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ بچپن میں ایئر گن سے نائی کے لڑکے کو اس لیے گولی ماردی تھی کہ سلام نہیں کیا تھا۔ (ص ۳۶) گھر کے ملازم غلام حسین کو چھڑی سے مار مار کر کھال اتار دی اور دادا میاں نے تیور دیکھ کر والد صاحب کو بشارت دے دی کہ تمھارا بیٹا بادشاہوں سے ٹکر لے گا (یہ حیدر آباد کے واقعے کی پیش بندی ہے جسے نظام اخراج حیدر آباد اور جوش ٹکر لینے سے منسوب کرتے تھے)۔ (ص ۳۶) ایک دن جوش اینگلو انڈین محبوبہ کے ساتھ تانگے میں جا رہے تھے راستے میں ایک انگریز نے اعتراض کیا۔ جوش نے کوچوان کا ہنٹر چھین کر تابڑ توڑ پٹائی کر دی۔ ایک خوبصورت لڑکے کو اپنی محبت کا یقین دلانے کے لیے چھری اٹھا کر اپنے سینے میں مار لی۔ ایک اپنی محبوبہ کو گود میں بٹھائے ہوئے شراب پلا رہے تھے کہ اس کے انگریز بچا نے یہ منظر دیکھ کر گولی چلا دی۔

یہ سارے واقعات بظاہر حقیقت سے کوسوں دور نظر آتے ہیں لیکن غلط بیانی کے باوجود بھی جوش صاحب کی امیج سازی میں کچھ معاونت نہیں کرتے ، ایسے واقعات کا کتاب میں شامل کرنا گناہ بے لذت بن گیا ہے۔ صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ جوش صاحب مختلف اوقات میں اپنی مختلف امیج بنانا چاہتے ہیں کبھی

سرفروش عاشق، کبھی سوشلسٹ انقلابی، کبھی خاندانی زمیندار اور ہر امیج 'یادوں کی برات' میں اس طرح گڈمڈ ہوگئی ہے کہ کوئی بھی شکل لہولہان ہونے سے محفوظ نہیں رہی۔ اس بات پر کون یقین کرے گا کہ جوش صاحب کو سقوط بنگال سے دس برس قبل ہی کسی غیبی قوت نے کان میں کہہ دیا تھا کہ بنگال پاکستان کے ساتھ نہیں رہے گا۔ (ص ۷۳۵) لیکن وہ اس طرح کے دعوے روشن ضمیر ثابت کرنے کے لیے کرتے ہیں لیکن پاکستانیوں نے اس طرح غور ہی نہیں کیا۔

میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ خودنوشت سمجھ کر مطالعہ کرنے سے بہت سی ذہنی الجھنوں کا سامنا کرنا پڑے گا لیکن دلچسپ نثری شہہ پارہ سمجھ کر پڑھیں تو آنکھوں کی روشنی بڑھ جاتی ہے۔ خاص طور سے جب موسم، جوانی یا قدرتی مناظر کا ذکر کرتے ہیں۔ اردو نظم و نثر میں متعدد جگہ برسات کا ذکر پڑھا ہوگا لیکن جوش صاحب کی سی برسات کہیں نہ دیکھی ہوگی۔

> ''جھومتی، ٹمکتی، جھولتی، جھرجھراتی، چھم چھماتی، چھم چھم برستی، جوبن والی جوئی برسات، گھپ اندھیروں اور گھنگھور گھٹاؤں کی چھاؤں میں گھرتی، گھومتی، مرتی، گنگناتی، ٹمکتی، گاتی، گرجتی، گونجتی، گھڑگھڑاتی گھونگروالی برکھا''
>
> آسمان کو گھماتی، زمین کو نچاتی، فضا کو چلاتی، شمس وقمر کو گہناتی، چوپائی کو تھپتھپاتی، طوفان پر طوفان اٹھاتی، زلفیں جھٹکاتی، کجریاں سناتی، کھیتیاں لہلہاتی، زمین کی پوریں چٹخاتی اور چھڑے کو کڑے سے بجاتی برکھا، ابر سیاہ بیاباں در بیاباں ، گلستاں در گلستاں، گل چکاں، گوہر فشاں رقصاں، پرّاں وغلطاں، رواں دواں، اف وہ بجلیوں کی کڑک، وہ بدلیوں کی لٹک اور وہ بانکی دھنک، وہ مینڈکوں کا شور، وہ پُروا کا زور اور وہ گھٹائیں گھنگھور ــــ وہ جھینگروں کی جھنکار، وہ موروں کی پکار اور نہروں پر وہ مرغابیوں کی قطار اندر قطار۔ وہ شاخ ساروں کی گلنچپ، وہ انبیوں کی ٹہاٹپ، وہ امریوں کے جھومتے جھامتے جھولے، وہ الھڑوں کے گھومتے کولھے، وہ برستے گیت پر گیت، وہ مچلتی پیت کی ریت، وہ یاروں کے چہچہے، وہ نگاروں کے قہقہے، وہ آڑھی ترچھی پھواریں، وہ ستاروں کی آریں آریں۔ وہ ہوا کی گھوم وہ بوچھار کی دھوم، وہ متوالی پی ہو، وہ نشیلی کوکو، وہ جگنوؤں کے غول وہ بارہ ماسوں کے بول، وہ دوب کا مخمل وہ بیر بہوٹیوں کی ہلچل، وہ جل تھل میدان، وہ پرنالوں کا ہیجان، وہ موجوں کی روانی، وہ پھرتی بورانی وہ چھاجوں پانی، وہ چھوکریوں سے چھیڑ خانی اور وہ ہائے زمانے ہائے جوانی....'' ص ۶۸

حوالہ مختصر کرتا ہوں ورنہ اس جادونگار قلم کی برسات ابھی تھمی نہیں ہے۔ برسات کے بہانے جان عالم واجد علی شاہ پر بھی آنسو بہاتے ہیں۔" اے میرے فرض شناس، جفا کوش، عدالت پناہ اور فقیر منش بادشاہ، اے میرے شرافت سنج ہنرور، نکتہ رس، علم نواز اور ادب پرست شاعر اے میرے صبح کے سپاہی اور شہریار اور اے میرے شام کے موسیقار، فن کار مالک، آپ کے سپہ سالار اور گورنر فقیر محمد گویا کا یہ پرپوتا جوش ملیح آبادی آپ کے آستان عالی پر سر رکھ رہا ہے اس بندۂ ناچیز کا سلام قبول فرمایئے۔" ص ۷۰

مسعود حسن رضوی ادیب کے بعد جوش ملیح آبادی دوسرے بزرگ ہیں جو جان عالم پر سلام بھیج رہے ہیں۔ الفاظ کا انتخاب ایسا ہے کہ برسات فلم کی طرح نظر کے سامنے برسنے لگتی ہے۔ یہی نہیں برسات میں اور سب کچھ تو ہونا ہی تھا جولڑکیاں جوش کو جھولا جھلاتی تھیں وہ بھی:

"ایسی جوالا مکھی کی سی جوانیوں والی ہوتی تھیں کہ اگر بھرپور انگڑائی لیں تو انگیا کے بدن ٹوٹ جائیں۔" ص ۶۹

الٰہی کیا قباحت ہے وہ جب لیتے ہیں انگڑائی
مرے سینے میں سب زخموں کے ٹانکے ٹوٹ جاتے ہیں

جوش جب نسوانی حسن کی قصیدہ خوانی کرتے ہیں تو خود بھی تلذذ حاصل کرتے ہیں اور قارئین کو بھی شریک کرتے ہیں۔ چاہے وہ جھولا جھلانے والیاں ہو یا شراب پلانے والی طوائف:

"وہ سولہ سترہ کا سن، وہ مرادوں کی راتیں مرادوں کے دن، وہ چھلا سی کمر، وہ صراحی دار گردن، وہ کسمساتا بدن، وہ کھدبداتا جوبن، وہ سینے کا پاپی ابھار وہ ریشمی پلو کی سطح ناہموار، گالوں کی کندنی کاغذی جلد، جلد کے نیچے سے چھنتا ہوا اور چہکتا ہوا گلابی رنگ، وہ ستواں ناک تیکل نقشہ، دمکتی پیشانی پر بولتا قشقہ، نکلتا قد، چھنتا پنڈا، سرخ انگھڑیوں سے اٹھتی رنگین گھٹائیں، لانبی نکیلی پلکوں کی جھپک میں وہ گجری کے کٹتے بول۔ سرمے کے دنبالے میں وہ کجلائی ہوئی دھنک........ جھل جھل کرتی جست انگیا کی کٹوریوں میں وہ زیر تعمیر تاج محل کی ہمکار..." (ص ۱۸۲)

خوبصورت اور قابل تعریف اشیاء کے علاوہ بدصورت اور بدمزاج موسم گرما کا ذکر بھی دیکھیے:

"ارے پھٹے سے منھ کا موسم گرما، دھوپیا، دندکیا، دہکاریا، پسینا نچوڑیا، بھاڑیا جھنجھوڑیا، تنوریا، چنگیزیا، چنگاریاں، اکل کھرا، جل ککڑا، گھننا، روڑھا، بڑوتا، بہرا، جھینگا، بڑدنا، شیاطین کی آنکھ کا تارہ، لو کا راج دلارا، الاؤ کا گہوارہ اور شعلوں کا فوارا — خونی ریچھ، لاگو بھیڑیا..." (ص 64)

لگے ہاتھوں موسم سرما کا بھی نظارہ کر لیجیے:

"چمپئی، شربتی، گلابی جاڑا — کندن سی دہکتی انگیٹھیوں کا گل راز، دل کا سرور

آنکھوں کا نور، دھند لکے کا راگ جھٹپٹے کا سہاگ، قصیر النہار، طویل الیل، شمس
در آستین، قمر جبین ...... ماہ رو، سوسن خو، گبھرو، چکیلا چھریرا، چکنا، مدھر بھرا بانکا،
ترچھا، نکیلا، رسیلا، چھبیلا، جبیلا، سانولا، سلونا اور سہانا جاڑا۔"

اگر معلوم نہ ہو کہ گفتگو موسم کے بارے میں ہو رہی ہے تو کسی معشوق کے ذکر کا گمان ہو۔ ’یادوں کی برات‘ کے ہر لفظ سے جوش کی معصومیت اور علمیت بیک وقت ظاہر ہوتی ہے لیکن اگر زبان کی تخلیقیت اور خوبصورتی کو نظر انداز کر دیں تو کتاب خامیوں کا پلندہ ہے۔

سوانح عمری میں جوش کی زندگی کی کوئی اہم تاریخ موجود نہیں ہے۔ یہاں تک کہ تاریخ پیدائش کا مسئلہ بھی حل نہیں ہوتا۔ کب حیدر آباد گئے کب دلّی تشریف لائے، کب ’کلیم‘ شائع کیا کب فلمی دنیا سے متعلق ہوئے۔ آپ حساب لگاتے رہیے جوش صاحب تو کچھ بتانے والے نہیں ہیں۔ اگر آپ ان تاریخوں کا حساب لگا بھی لیں تو بھی سب کچھ گڈمڈ ہو جائے گا لیکن حقیقت کی تہہ تک پہنچنا ناممکن ہے۔ ’یادوں کی برات‘ میں کوئی واقعہ تاریخ کے اعتبار سے درج نہیں ہے، جو واقعہ جہاں یاد آ گیا وہیں درج کر دیا۔

جوش کی زندگی سے برِصغیر کی زیر وزبر ہوتی سیاست وتہذیب کا قریبی تعلق ہے۔ جلیان والا باغ، سوراج آندولن، نمک ستیہ گرہ، سائمن کمیشن، تحریک عدم تعاون، دوسری جنگ عظیم، آزادی اور تقسیم وطن، حیدر آباد کا پولیس ایکشن اور پاکستان میں فوجی حکومت جیسے اہم واقعات کے چشم دید گواہ ہونے کے باوجود جوش صاحب نے عمداً چشم پوشی کی۔ یا وہ بھی ان کی ڈوبتی ہوئی یادداشت کے ساتھ غرق ہو گئے کہا نہیں جا سکتا۔

جواہر لال نہرو کے اس لیے عاشق نہیں ہیں کہ وہ تیسری دنیا کے عظیم رہنما تھے بلکہ اس لیے کہ "جب پہلی بار ان کو دیکھا تھا تو وہ بھی قیامت تھے اور میں بھی۔" ایک بات جوش صاحب مصلحتاً نظر انداز کر گئے ہیں وہ ہے نہرو کی جمال پرستی۔ غالباً یہ بھی ان کی عقیدت کی وجوہات میں سے ایک تھی۔ جوش صاحب کی سیاسی بصیرت کا یہ حال ہے کہ وہ گاندھی جی کو انسانی مسرت کا سب سے بڑا دشمن سمجھتے ہیں وجہ صرف یہ ہے کہ گاندھی نے شہر سے طوائفوں کو نکالنے اور مے خانوں کو مسمار کرنے کا ’فتنہ‘ اٹھایا ہوا تھا۔

ظاہر ہے جوش صاحب فلسفی ہیں نہیں، سمجھتے ہیں وہ مارکسسٹ ہیں نہیں، سمجھتے ہیں وہ سیاسی تجزیہ کار ہیں نہیں سمجھتے ہیں۔ اس لیے کسی ایسی شے کی تلاش ’یادوں کی برات‘ بے سود ہے۔

اگر گذشتہ صدی کی ابتدائی چند دہائیوں کی زندگی، زمیندارانہ نظام، عید، دیوالی، ہولی، رمضان، شادی، ختنہ، خواتین کے زیورات، حویلیاں، بچوں کی پرورش، طوائفوں کے ناز وغمزے، ایک جادوگر کی زبان سے سننے ہوں تو ’یادوں کی برات‘ ٹھہر ٹھہر کر پڑھیے۔ یہ اردو نثر کی عظیم ترین کتاب ہے جو ناقابل ترجمہ اردو میں لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کے ذریعے پہلی بار غیر استعمال شدہ لاکھوں الفاظ کو دھوپ دکھائی گئی ہے۔

یہ تمام الفاظ دنیا کی کسی ایک لغت میں نہیں ملیں گے۔ تمام رسوم، حویلیاں، جائداد جوش صاحب نے اپنی شخصیت سے منسوب کرکے رقم کی ہیں۔ آپ ان کی کذب و اختراع اور غلط بیانی نہ سمجھئے بلکہ خواہشات سمجھ کر معاف کردیجیے۔

کتابیات

1 یادوں کی برات: جوش ملیح آبادی، مکتبہ شان ہند، دہلی، 1982

2 جوش ملیح آبادی: سید احتشام حسین، اردو اکادمی لکھنو، 1982

3 جوش ملیح آبادی: مرتبہ قمر رئیس، دلی، 2001

☆☆☆

ایک ضروری اعلان

پاکستان کے ادبا، شعرا اور ادب نواز حضرات سے خصوصی گزارش ہے کہ سہ ماہی آمد میں اشاعت کے لئے اپنی تخلیقات/مضامین وغیرہ/تبصرے کے لئے کتابیں اور زرِ تعاون براہ راست صبا اکرام صاحب کو درج ذیل پتے پر بھیج سکتے ہیں:

☆Saba Ekram [N.Haque], G.M.Admin & H.R., Compak Limited, Plots-11&26, Sector-20, Korangi Industrial Area, Karachi-74900 [Pakistan]

اردو معاشرے کو افسانہ نگاری کی دین

● ڈاکٹر یحییٰ نشیط

انسان کا سماجی شعور جب سے بیدار ہوا، تحفظِ ذات اور افرادِ خانہ کی خاطر راتوں میں جاگنے کے لیے کہانی کو وسیلہ بنایا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب تمدّن کا سورج طلوع ہو رہا تھا۔ تہذیب انسانی آنکھیں کھولنے لگی تھی۔ تاریخِ عالم کی سیج پر روایتوں کی سلوٹیں نہیں پڑی تھیں کہ درایت کے ہاتھوں انھیں دور کیا جا سکے۔ ماہرین عمرانیات کے اس مفروضے کو صحیح مان بھی لیا جائے تو افسانہ اور انسانیت کے ارتقاء کا زمانہ ایک ہی تسلیم کرنا پڑے گا۔

افسانوں نے آدمی کی تنہائی دور کی، 'اکیلے پن' کو گروہی طرزِ زندگی میں بدل کر سماجی نظام کی تشکیل کی۔ اس اجتماعی زندگی سے آدمی کے اندر کا انجانا اور موہوم خوف زائل ہوا۔ محبت، ہمدردی اور باہمی ایثار و امداد جیسے صالح جذبات کو افسانوں کی وجہ سے مہمیز ملی اور آدمی کے اندر سماجی سلیقہ اور طرزِ تمدن پروان چڑھنے لگا۔

اصنافِ ادب میں افسانہ ایک ایسی صنف ہے جو فکرِ انسانی کو زیادہ اپیل کرتی ہے، خوابیدہ اذہان کو جگاتی ہے اور جذبات و احساسات کے اُبھارنے میں دیگر اصناف سے زیادہ موثر اور زوردار ہے۔ صحائفِ آسمانی سے لے کر ہماری قدیم ترین کتابوں تک میں افسانوں کا اثر ونفوذ دکھائی دیتا ہے۔ قرآنِ حکیم میں سورۂ قصص کے وہ چھوٹے چھوٹے قصّے جن میں نبیوں کے احوال درج ہیں، عرب معاشرے کو یکسر بدل دینے میں ممد و معاون ثابت ہوئے۔ نجاشی دربار میں سورۂ مریم کی تلاوت بادشاہ کے دل میں مسلمان مہاجروں کے لیے نرم گوشہ پیدا کر دیتی ہے۔ قرآنی قصص کی اس اثر آفرینی اور افادیت کو اللہ رب العزت نے بار بار بیان کیا ہے۔

(۱) "اور جو قصّے ہم تمھیں سناتے ہیں یہ وہ چیزیں ہیں جن کے ذریعہ ہم تمھارے دل کو مظبوط کرتے ہیں۔ ان کے اندر تم کو حقیقت کا علم ملا اور ایمان لانے والوں کو نصیحت اور بیداری نصیب ہوئی۔" (سورۂ ھود، آیت ۱۲۰)

سورۂ یوسف میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

(۳) ''ان قصوں میں عقل رکھنے والوں کے لیے عبرت ہے۔''

حضرت محمد ﷺ نے اسی لیے شاعری پر قصص کو ترجیح دی اور قصص وحکایات کے پردے میں دینی واصلاحی تعلیم فرماتے رہے۔ مندرجہ بالا نصوص واحادیث کی روشنی میں ان ناقدین کے اقوال کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی جو شاعری کے مقابلے میں افسانے کو کمتر سمجھتے ہیں۔

تاریخ عالم میں ایک ایسا واقعہ بھی ظہور پذیر ہوا جس کا محرک ادب عالیہ میں افسانہ رہا ہے۔ چنانچہ سایمنڈ اپنی کتاب "Renaissance In Italy" میں یوروپ کی نشاۃ الثانیہ کی اصل وجہ اطالوی زبان کی اچانک ترقی اور بوکیچو (م ۱۳۷۵ء) کے نظریۂ ''نشاطِ حیات'' کو بتاتا ہے۔ یہ نظریہ اس نے اپنی کتاب DECAMERON یعنی ''عشرۃ اللیلۃ'' یا دس راتیں میں پیش کیا ہے۔ بوکیچو نے یہ کتاب ''الف لیلۃ'' سے متاثر ہو کر لکھی تھی۔ اس کتاب سے یوروپ میں زبردست انقلاب برپا ہوا جسے ہم یوروپ کا نشاۃ الثانیہ کہتے ہیں۔

ذیل کے تاریخی واقعات بھی افسانوں کی اثر آفرینی کے مظہر ہیں:

(الف) کلیلہ دمنہ کے افسانوں نے عربوں کو ہندوستانی معیشت سے روشناس کرایا۔

(ب) ہتوپدیش اور جاتک کتھاوں نے چین وجاپان اور تبت وبرما میں ہندوستان کے مذہبی کلچر کو عام کیا۔

(ج) لقمان حکیم اور افراسیاب کے قصوں سے عرب وایران کی تہذیبیں متاثر ہوئیں۔

(د) پنچ تنتر اور ایسب کتھاؤں نے چانکیہ کے ''ارتھ شاستر'' کو متاثر کیا۔ یہ وہی کتاب ہے جس کے نظریات کو عملاً استعمال کر کے چانکیہ نے گپت سیاست میں زبردست تبدیلی لائی تھی۔ بھارت کی قدیم تاریخ کا یہ روشن باب ہے۔

ان تاریخی شواہد کی روشنی میں جب ہم ''اردو معاشرے کو افسانہ نگاری کی دین'' پر غور کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ افسانہ نگاری نے اردو معاشرے کو بہت کچھ دیا ہے، جس کا اجمالی جائزہ یہاں پیش کیا جاتا ہے:

(۱) تعلیمِ نسواں کا شعور:

اگر چہ اسلام میں ''طلب العلم فریضۃ علیٰ کلِ مسلم ومسلماۃ'' کی واضح حدیث موجود ہے لیکن پردے کی صحیح تاویل نہ کی جانے کی وجہ سے طبقۂ اناث تعلیم سے بے بہرہ رہا۔ سرسید احمد خان اور ان کے رفقاء نے اس معاملے میں چند اعمال واقدام بھی کیے تھے۔ ''تہذیب الاخلاق'' کے اوراق میں اس کی بازگشت سنائی دینے لگی تھی لیکن عوام الناس پر اس کا کوئی خاطر خواہ اثر ونفوذ دکھائی نہیں دیا۔ ڈپٹی نذیر احمد نے سب سے پہلے اپنے ناولوں ''بنات النعش'' اور ''مراۃ العروس'' میں مسلم معاشرے کے اس تاریک گوشے کو اجاگر کیا۔ وہ حقوق نسواں اور تعلیم الاناث کے زبردست حامی تھے۔ عبدالحلیم شرر کی افسانوی تخلیقات میں بھی کہیں کہیں

تعلیم نسواں کے مسئلہ کو چھیڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مولانا راشد الخیری جو ڈپٹی نذیر احمد کے صحیح جانشین کہے جاتے ہیں، عورتوں کے ہمدرد، مونس و غم گسار تھے۔ ''عصمت'' کی کہانیاں ''زہرۂ مغرب''، ''صبح زندگی'' اور ''شامِ زندگی'' میں عورت کی تعلیم اور اس کے حقوق کی بازیافت کے لیے کسک اور تڑپ دکھائی دیتی ہے۔ خواجہ حسن نظامی کی ''محرم نامہ'' اور ''بیوی کی تعلیم'' میں بھی تعلیم نسواں کی طرف سماج و معاشرے کو متوجہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

(۲) مساواتِ مرد و زن کا مسئلہ:

اللہ رب العزت نے مرد و عورت کو ایک ہی ساخت پر پیدا کیا اور ایک کو دوسرے کے لیے سامانِ انبساط بنایا، لیکن سماج کے فرسودہ رسم و رواج اور غلط روایات نے عورت کے سماجی مقام کو متزلزل کر کے رکھ دیا تھا۔ عورت پامال ہوتی جارہی تھی۔ اس کی عزت و توقیر کا تصور تک سماج کے اذہان سے مٹ چکا تھا۔ یہ مقامی اثرات ہمارے معاشرے میں بھی عود کر آئے۔ مثلاً بیوہ کے نکاح کو ہمارے یہاں بھی معیوب سمجھا جانے لگا تھا۔ الطاف حسین حالی نے سب سے پہلے بیوہ عورت کی اس سماجی ابتری کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ لیکن پریم چند کی ''بیوہ'' نے سماج کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ عورت کے متعلق ایسے بہت سارے سماجی اور خاندانی مسائل کے سدِ باب کے لیے راشد الخیری، پریم چند، سدرشن، رام لعل، خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی، صالحہ عابد حسین، آمنہ ابوالحسن، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، ہاجرہ مسرور، اور رضیہ بٹ جیسے کئی افسانہ نگاروں کے یہاں آواز اٹھائی گئی ہے۔ خواتین افسانہ نگاروں کے یہاں البتہ عورت کے سماجی status کے مسئلہ کی گونج کچھ زیادہ سنائی دیتی ہے۔

(۳) نسوانی مردانگی:

ہمارے داستانی ادب میں محبوب کی خاطر عاشق صادق زمین و آسمان کو زیر و زبر کرنے کی جرات کر گزرتے تھے۔ دیویوں، جنوں، بھوتوں اور راکشسوں سے بھڑ جاتے تھے۔ دشوار گزار جنگلوں میں سحر کی چالوں کو توڑ کر محبوب کے محل تک پہنچنے کی سعی لاحاصل کرتے تھے۔ البتہ اپنے ابتدائی دور میں مختصر افسانوں نے ''عزم عمل'' کے لیے ''مفاہمت'' کے جذبے کو پروان چڑھایا، جسے سماج نے بہ صمیم قلب اپنالیا۔ پریم چند کا ''میدانِ عمل'' اس رویہ کی بہترین مثال ہے۔ اختر اورینوی، ش مظفر پوری اور علی عباس حسینی کے افسانوں میں اس روئیے کی زیریں لہریں ہلکورے لیتے ہوئے دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن یہ امر موجب تعجب ہے کہ انقلابی جوش کے حامل افسانوں نے محبت میں پائے پامردی، جوش اور ولولے کے اپنے کرداروں کو محبوب کی زلف گرہ گیر کی اسیری میں مگن کر دیا اور دیوانہ وار دشت نوردی کی بجائے خانہ نشینی پر اکسایا۔ اردو معاشرے میں اس کے اثر سے نوجوانوں میں ''نسائی محاربت'' کے جذبے کو تقویت ملی۔ ہمارے سماج میں پھیلے ہوئے ''روڈ سائیڈ

رومیو ان افسانوں کے ہیروؤں کی بہترین مثالیں آئے دن پیش کرتے رہتے ہیں۔ اس منفی رجحان کے متعلق پروفیسر عبدالمغنی رقم طراز ہیں:۔

''اشتراکیت پسندوں کی ''محاربت'' کا شاخسانہ دل و دماغ کی نسائیت ہے۔۔۔اس وقت ہمارے افسانوں میں عشق، خارا شگافی کا محرک نہیں رہ گیا ہے صرف شیشہ سازی کا باعث ہے۔ ایک مجہول قسم کا گھریلو پن۔۔ پریم چند کے میدانِ عمل کرشن چندر کے ''ایک عورت ہزار دیوانے'' تک اردو افسانے نے قصہ گوئی میں شاید ترقی کی ہو تو کی ہو ذہنی حرکت صریح طور سے مائل بہ تنزل ہے۔''

[عبدالمغنی: ''جادہ اعتدال''، اردو افسانے کا ایک رخ صفحہ ۳۴۹]

(۴) تہذیبی ٹکراؤ کا کرب:

سائنسی ترقیات کی وجہ سے ہماری معیشت قومی حدود سے نکل کر بین الاقوامی بن گئی ہے۔ اس پر طرفہ معاشی مسائل کے حل کے لیے مغربی ممالک میں ملازمت کا رجحان۔ اس سے اردو معاشرے کے بہت سارے خاندان جو مشرقی تہذیب کے پروردہ تھے مغربی زندگی کا شکار ہوئے ہیں۔ انھیں مادی آسودگی تو نصیب ہو گئی لیکن تہذیبی مسائل سے دوچار ہونے کی وجہ سے وہ ذہنی کرب، تشکیک اور تذبذب میں مبتلا ہو گئے۔ اردو کی نئی آبادیوں کی دریافت پر جہاں ہم بغلیں بجاتے ہیں وہاں ان آبادیوں میں سسکتی ہوئی اور سنگین مسائل میں گھری ہوئی اردو معاشرت کو دیکھ کر افسردہ بھی ہو جاتے ہیں۔ یہ افسردگی شاعری سے زیادہ افسانوں میں نمایاں ہوئی ہے۔ دو تہذیبوں کے ٹکراؤ کی اس کیفیت کو ہری چرن چاولہ نے نہایت موثر انداز میں اپنے ایک افسانے میں پیش کیا ہے:

''لڑکی کی اٹھارویں سال گرہ پر ہندوستان کے احباب ناروے پہنچتے ہیں۔ مشرقی روایات کے مطابق رسومات ہو رہی ہیں کہ بوڑھوں کا آشیرواد لینے کے لیے لڑکی کو بلایا جاتا ہے۔ لیکن لڑکی یہ کہتی ہوئی دوسری منزل کی سیڑھیاں چڑھنے لگتی ہے کہ میرے بوائے فرینڈز میرا انتظار کر رہے ہیں، لڑکی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ پس منظر میں مغربی موسیقی کی دھنیں ابھرنے لگتی ہیں۔ اسکاچ کے کارک کھلنے کی آوازیں اور لڑکے لڑکیوں کے مستی بھرے قہقہے ان بوڑھوں کو سنائی دیتے ہیں۔ شرمندگی سے سب کی نگاہیں جھک جاتی ہیں۔''

انوار شیخ نے انگلینڈ کی زمین پر بسنے والے مشرقی تہذیب کے دلدادہ ایک خاندان کا بڑا نفسیاتی تجزیہ اپنے افسانے میں کیا ہے:۔

''مشرقی وضع داری کی پابند لڑکی کالج میں پڑھتی ہے۔ وہاں جنسی بے راہ روی کا ماحول ہے۔ اس لڑکی پر ہیجانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ لڑکے لڑکیوں کے طنز و مذاق کا وہ نشانہ بن جاتی ہے۔ ایک دن نہایت غصے کے عالم میں وہ گھر پہنچتی ہے۔ لیکن والدین کو اپنی بپتا سنانے کی بجائے وہ رونے لگتی ہے۔ ماں باپ اپنی معصوم بچی کے ذہنی کرب کو پہنچان لیتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں اور آنکھیں جھکا

لیتے ہیں۔ بچّی کو سمجھانے کی ہمت ان دونوں میں نہیں ہے۔"

نعیمہ ضیاء کے افسانوی مجموعہ "منفرد" میں بھی دو تہذیبوں کے ٹکراو میں بکھری انسانیت کے کرب کو بڑے ہیجان انگیز اور جذباتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔:

"جرمن خاتون اپنی ہندوستانی پڑوسن سے کہتی ہے، میری بچّی اب کالج میں قدم رکھ رہی ہے۔ میں روزانہ رات کے وقت ایک گلاس گرم دودھ اور ایک گولی اس کے سرہانے خاموشی سے رکھ دیتی ہوں۔ گولی کا نام سن کر پڑوسن کو تعجب ہوتا ہے تو جرمن خاتون ہنس کر وضاحت کرتی ہے کہ شادی سے پہلے ماں بننے سے روکنے والی گولی۔۔۔ پڑوسن کی لڑکی جب کالج کی دہلیز میں قدم رکھتی ہے تو ماں بادلِ ناخواستہ بیٹی کے سرہانے ایک گلاس گرم دودھ اور ایک "گولی" رکھنے کا جتن کرتی ہے۔"

نعیمہ ضیاء نے "گولی" رکھنے کے کرب کو بڑے نفسیاتی انداز میں پیش کیا ہے اور مشرقی ماں کی غیرت اور تذبذب وحیا کی لفظی تصویر کھینچی ہے کہ پڑھ کر غیرت شرم سے پانی پانی ہو جاتی ہے۔

(۵) تقسیم وطن کے مسائل کا ادراک:

"تقسیم ملک" اردو معاشرے کے لیے زبردست سانحہ تھا۔ برصغیر میں یہ ایک قیامتِ صغریٰ تھی جس کی زد میں آئی ہوئی ہر دو جانب کی انسانیت آج تک سسکیاں لے رہی ہے اور اس کی آہوں کی گونج اردو ادب میں آج بھی سنائی دیتی ہے۔ سیاسی اعتبار سے اس تقسیم کے مثبت اثرات قائم ہوئے ہوں تو ہوئے ہوں، لیکن سماجی لحاظ سے اس کے منفی اثرات اتنے گہرے ہیں کہ اردو سماج اس کے کاری زخموں سے بلبلا رہا ہے۔ صدیوں سے ساتھ رہنے والے خاندان اس تقسیم سے منتشر ہو گئے۔ دل ٹوٹ گئے، برادریاں بکھر گئیں۔ محبت نفرت میں اور دوستی دشمنی میں بدل گئیں۔ انتشار اور بکھراو کی اس کیفیت نے اردو ادب بالخصوص افسانے پر بڑے گہرے نقوش مرتسم کیے ہیں، ہمارے افسانہ نگاروں نے ان مسائل کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ ان مسائل میں:

(۱) فسادات کا المیہ

(۲) مہاجرت کا غم

(۳) بے سروسامانی اور بے گھری کا کرب

(۴) عصمتوں کی پامالی کا دکھ اور

(۵) مغویہ کا مسئلہ وغیرہ نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔

تقسیم کے سانحہ پر لکھنے والے افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی، جیلانی بانو، انتظار حسین، رشید احمد، اشفاق احمد وغیرہ کے نام سرِ فہرست رکھے جا سکتے ہیں۔

"ہم وحشی ہیں" میں کرشن چندر نے تقسیم کے فسادات کی لفظی تصویر کشی کی ہے۔ اگرچہ یہ ہنگامی

اور عارضی موضوع تھا لیکن کرشن چندر نے اس کی افسانویت میں کمی نہیں آنے دی اور فن و معنویت کا پورا پورا لحاظ رکھا۔ اثر آفرینی کے لحاظ سے ''ہم وحشی ہیں'' کے افسانے لاجواب ہیں۔ دوستی کا زوال اور انسانیت کے خاتمہ پر کرشن چندر کے یہ افسانے ''نوحہء انسانیت'' بن گئے ہیں۔

خواجہ احمد عباس نے ''میری موت'' میں فسادات کے کرب کو بڑے موثر ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ کوثر چاند پوری ان کے افسانے ''سردار جی'' (میری موت) کے متعلق لکھتے ہیں:

''ایک اور افسانہ جو اسلوب، فن اور بے باک حقیقت نگاری کے لحاظ سے فسادات کے افسانوی ادب میں زبردست اہمیت اور انفرادیت کا حامل ہے، خواجہ احمد عباس کا ''سردار جی'' (میری موت) ہے۔''

راجندر سنگھ بیدی کی ''لاجونتی'' میں مغویہ (اغوا شدہ عورت) کے مسئلہ کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ عورتوں کا اغوا تہذیب انسانیت کا نہایت الم ناک مسئلہ ہے، جس کا حل عفو و درگزر کے حوصلہ میں پنہاں ہے۔ وہ عورتیں جو تقسیم وطن کے وقت اغوا کر لی گئی تھیں، آزادی کے برسوں بعد انھیں دوبارہ قبول کرنے میں تامل ہو رہا تھا۔ بھائی، بہن کا اور باپ، بیٹی کا انکار کر رہا تھا۔ گھرانوں کی عزت بچانے کے لیے اپنا خون بھی پرایا ہو گیا تھا۔ سماج کے یہ ''آب گینے'' بلا کسی جرم کے آزمائش کی بھٹی میں جھونکے جا رہے تھے۔ ذہنی تناؤ کی کیفیت بہت سارے خاندانوں میں پیدا ہو گئی تھی۔ ''ابلہ ناری کی کرون کہانی اور مریم وقت کے قصے حقیقت بن کر سماج میں ابھر رہے تھے۔ لیکن ان کے دکھوں کا مداوا، درد کا درماں اور ان کے مسائل کا حل سماج میں کہیں بھی نہیں تھا۔

ہمارے افسانہ نگاروں میں سوائے راجندر سنگھ بیدی کے اغوا شدہ عورت کے اس سماجی مسئلہ کو کسی نے بھی نہیں چھیڑا۔ ''لاجونتی'' ہی کی یہ دین ہے کہ پنجاب میں اس کی وجہ سے اغوا شدہ عورتوں کے کئی گھر آباد ہوئے، ہمارے معاشرے نے بھی ان عورتوں کے متعلق مثبت اقدام کیے ہیں اور وہ مسلم خواتین جو اپنی عصمت تو نہیں بچا سکیں، لیکن ایمان کو بچائے رکھا تھا، ان کے نکاح عزت و اکرام کے ساتھ کر دیے گئے اور آج وہ اپنے خاندانوں میں نہایت خوش و خرم زندگیاں گزار رہی ہیں۔

جیلانی بانو نے تقسیم سے پہلے متوسط طبقہ کے مسلم گھرانوں کی جذباتی زندگیاں اور تقسیم کے بعد انسانوں کے بدلتے ہوئے رشتوں پر بہت شگفتہ تحریریں چھوڑی ہیں۔

رشید امجد نے ملک کی تقسیم کے بعد مہاجروں کی بے سروسامانی اور بے گھری کے مسئلہ کی تصویر کشی اپنے افسانوی مجموعہ ''جلاوطن'' میں نہایت حسن و خوبی اور فنی چابکدستی سے کی ہے۔ ایک مکالمہ ملاحظہ ہو:

''صاحب ایک بات پوچھوں؟

پوچھو!

وہ کچھ دیر تذبذب میں رہتا ہے پھر کہتا ہے، آپ کا گھر کہاں ہے؟

میں نفی میں سر ہلاتا ہوں۔

کسی دوسرے شہر میں؟

میں پھر نفی میں سر ہلاتا ہوں۔

کہیں بھی نہیں؟ وہ بے یقینی سے کہتا ہے، آپ کے رشتہ دار تو ہوں گے کہیں نہ کہیں؟

کوئی بھی نہیں۔ وہ حیرت کی مٹّی میں پھڑ پھڑاتا ہے

ان افسانوں کے علاوہ قرۃ العین حیدر کے ناول ''آخرِ شب کے ہم سفر'' انتظار حسین کے افسانہ'' شہرِ افسوس''، ''ہندوستان سے ایک خط'' اور ''مشکوک لوگ''، مسعود اشعر کی کہانی ''دکھ جو مٹی نے دیئے'' اور اشفاق احمد کے ''گڈریا'' میں فسادات کے کرب، نقلِ مکانی کی ابتلا اور مہاجرت کے مصائب کو بیان کیا گیا ہے۔

(۶) مذہبی بے یقینی اور عقیدت میں تشکیکی رجحان:

ہمارے افسانوں نے اردو معاشرے میں مذہبی بے یقینی اور عقیدت میں تشکیکی رجحان پیدا کر دیا ہے۔ ایسے زمانے میں جبکہ مذہب بیزاری عام ہے، عصری علوم نے مذہبی اقدار کی پامالی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے۔ ان حالات میں مذہب کی طرف افسانوں کی مراجعت سے بعض ناقدین ادب بغلیں بجانے لگے ہیں، بعض کی پیشانیوں پر بل پڑ گئے ہیں۔ لیکن ان افسانوں کے پورے کینوس پر نظر ڈالیں تو حقیقت کچھ دوسری مترشح ہوتی ہے۔ اس مراجعت کے پس پشت افسانہ نگاروں کا مذہب کے متعلق تشکیک اور بے یقینی کا رجحان کارفرما دکھائی دیتا ہے۔ یہ وہ افسانے ہیں جنھوں نے اردو معاشرے کے اجتماعی احساسات کو ''بے یقینی'' اور شک وشبہات کی نفسیاتی بیساکھی دے رکھی ہے کہ باوجود ایمانی قوت صحیح وسالم ہونے کے وہ اس بیساکھی کو نہیں چھوڑ رہا ہے۔

مذہب کی طرف مراجعت کرنے والے افسانہ نگاروں کی تخلیقات میں انتظار حسین کا افسانہ ''تین ناقہ سوار'' محمد منشایاد کا ''تماشا''، رحمٰن شریف کا ''فیل سوار''، مقصود الٰہی شیخ کا ''اصحاب کہف'' کے متعلق قصہ اور مالک بن دینار کے خواب کا قصہ وغیرہ نمائندہ افسانے ہیں۔ ایسے ہی ہندو اسطور اور دیومالائی رجحان کے حامل افسانہ نگاروں میں قرۃ العین حیدر، راجندر سنگھ بیدی، سدرشن، ممتاز شیریں، سریندر پرکاش وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

محمد منشایاد کے افسانہ ''تماشا'' میں مذہب کے متعلق منفی رجحان ملاحظہ ہو:

ابا بگلیں ہیں پتر۔ بڑا کہتا ہے۔

ہاں ابا! پورا لشکر ہے۔

دانا دنکا ڈھونڈ رہی ہوگی پتر۔

کچھ اور ڈھونڈ رہی ہوں ابا؟

اور کیا پتر؟

ہاتھیوں کو ابا۔

نہیں پتر! یہ وہ ابابیلیں نہیں۔ یہ تو ہاتھیوں پر بیٹھ کر چہچہانے والی ابابیلیں ہیں۔

یہاں سے نکل چلیں ابا! یہ ٹھیک جگہ نہیں ہے۔

اب رحمٰن شریف کے یہاں واقعہ فیل کا یہ منفی تاثر ملاحظہ کیجئے:

''دیکھتے دیکھتے سارا آسمان ابابیلوں سے چھپ جاتا ہے۔ کچھ ہی دیر بعد کنکریاں فیل سواروں پر پڑنے لگتی ہیں۔ لوگ جوش میں آکر نعرے لگاتے ہیں۔ لیکن ان کا جوش خروش ماند پڑنے لگتا ہے۔ کنکریاں آہن پوش فیل سواروں اور ہاتھیوں کے لیے بے ضرر ثابت ہو رہی ہیں۔ فیل سوار دیوانہ وار قہقہے لگاتے ہیں اور بندوقوں کا رخ آسمانوں کی طرف ہو جاتا ہے اور ساری زمین مردہ ابابیلوں تلے چھپ جاتی ہے۔''

انتظار حسین کے ''تین ناقہ سوار'' میں بھی تشکیک کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ وہ خود ہی سوال اٹھاتے ہیں:

''یہی میں سوچتا ہوں کہ کوفہ کیا اور کیوں؟ بار بار اس خیال کو رفع کرتا ہوں اور بار بار یہ خیال دامن گیر ہوتا ہے کہ مبارک قریوں کے بیچ کوفہ کیسے نمودار ہوا۔ ہجرت کو ابھی ایسا کون سا زمانہ گزر گیا ہے؟''

اس افسانے کا ایک کردار منصور بن نعمان الحدیدی بصد حسرت و یاس بولا:

''ہاں مکہ ہمارا خواب ہے، تقدیر ہماری کوفہ ہے اور ہم خراب و خستہ ہو کر پھر کوفہ میں آگئے اور پھر چوہے دان کے اندر چکر کاٹنے لگے۔''

اس افسانے میں حسرت و یاسیت کا رنگ بڑا گہرا ہے۔ جس کے پس پشت فرقہ وارانہ عصبیت کے عوامل کارفرما ہیں ہیں۔ ''کوفہ'' کو واقعہ کربلا سے بدنام کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ شہر ۷ا ھ میں حضرت عمرؓ نے تعمیر کروایا تھا۔ اسلام سے پہلے نعمان بن منذر کا خاندان جو عراق اور عرب کا فرماں روا تھا ان کا پایہ تخت یہی مقام تھا۔ سرزمین عرب میں قدرتی منظر اور حسن، فطرت و دلکشی میں یہ مقام بڑا مشہور تھا اور اہل عرب اسے عارضِ محبوب'' کہتے تھے۔ انتظار حسین کا منصور بن نعمان کی زبانی اس شہر کو ''چوہے دان'' کہنا واقعتاً درست نہیں ہے کیونکہ ایک تو یہ شہر ''عارضِ محبوب'' کہلاتا تھا اور دوسرا یہ کہ منصور کے باپ نعمان کا یہ پایہ تخت بھی رہا تھا۔ باپ کے وطن اور خوبصورت شہر کو ''چوہے دان'' کہنا طبعاً کیسے درست ہو سکتا ہے۔ بہر حال! اس طرح کے افسانوں سے شیعہ، سنی تعلقات بگڑنے لگے اور اس کے دور رس اثرات آج ہم اپنے پڑوس میں دیکھ رہے ہیں۔

(۷) چیختی عصمتوں کی بازگشت:

ہمارے افسانوں میں پامال عصمتوں اور داغدار دامنوں والی عورتوں کی معصوم کراہوں اور بے بس

آہوں کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ان کی بازگشت ہمارے معاشرے میں صاف سنائی دیتی ہے۔
طوائف، سماج جسے گری ہوئی بے عزت قرار دیتا ہے، ہمارے افسانوں میں اس کا بھی ایک وقار ہے۔ اور یہ اسی طرح ہمدردی کے لائق ہے جس طرح ایک شریف عورت کے ساتھ ہمدردی کا سلوک کیا جاتا ہے۔ اگرچہ طوائف کا وجود شرافت و ناموس کی تسلیم کردہ حدود سے باہر سمجھا گیا ہے لیکن ہمارے افسانہ نگاروں نے اس کی پاکی کی گواہی دی ہے۔ انھوں نے اس کی زندگی کی ایسی تصویر کشی کی ہے کہ آنکھیں ڈبڈبا آتی ہیں اور آدمی اس کی مجبوریوں اور دکھوں کے متعلق سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ہمارے افسانہ نگار صحیح معنوں میں طوائفوں کی چیختی عصمتوں کے نقیب ہیں۔ ان افسانہ نگاروں میں رسوا، منٹو، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، رام لعل، عصمت چغتائی، بھگوتی چرن ورما اور علیم مسرور کے نام زیادہ اہم ہیں۔ انھوں نے عورت کے جنسی اور اقتصادی استحصال کے پیچھے مردوں کی ہوس رانی کے علاوہ سماج میں پنپنے والے اور دیگر عوامل کو بے نقاب کیا ہے۔
منٹو کے یہاں جنسیات کا ذکر بار بار ملتا ہے، بلکہ اس معاملہ میں وہ اردو کے بدنام افسانہ نگار ہیں۔ ان کے اکثر افسانوں میں طوائف کا کردار بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے عیاشوں، طوائفوں، شرابیوں اور ملزموں کو قریب سے دیکھا ہے، ان کی اچھائیوں اور برائیوں کو پرکھا ہے۔ طوائف کی مجبوری اور مردوں کی ہوس رانی کا تجزیہ کیا ہے، اس لیے خود غرض مردوں کے ذریعہ ستائی گئی طوائف کے تئیں ان کے دل میں نرم گوشہ ہے۔ وہ طوائف کے یہاں مصلے نہیں ڈھونڈتے بلکہ طوائف کے اندر کی عورت کو تلاش کرتے ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مرد کے جبر نے اور عورت کو خواہش کی تکمیل کا ذریعہ سمجھنے کے سماجی تصور نے عورت کو طوائف بنا دیا ہے۔ اس لیے منٹو بار بار طوائف کو اپنے افسانوں میں پیش کر کے سماج کو جھنجھوڑتے ہیں اور اس کے لیے سماج کی ہمدردی حاصل کر لیتے ہیں۔
قرۃ العین نے انگریزوں کے ہاتھوں عورت کے استحصال کی داستان بیان کی ہے۔ راجندر سنگھ بیدی نے بھی طوائف کے اندر کی عورت کی بازیافت کی ہے، لیکن منٹو کی سی عریانیت ان کے یہاں نہیں ہے۔ "گرہن"، "لاجونتی" وغیرہ جیسے بعض افسانوں میں عورت کی عصمت کی چیخیں صاف سنائی دیتی ہیں، جن کو سن کر سماج چونک جاتا ہے۔
رسوا کی "امراؤ جان ادا" میں تو طوائف سماج کی اہم شخصیت ہے جس کے ایوان میں نوابوں اور جاگیرداروں کو بھی سنبھل کر قدم رکھنے پڑتے ہیں۔ بہر حال ہمارے افسانوی ادب نے طوائفوں کی چیختی عصمتوں کے لیے سماج میں ہمدردی اور غم گساری کا جذبہ ضرور پیدا کیا۔

(۸) عصری مسائل کا احساس:

قدیم افسانے عصری مسائل کو بھلانے کے لیے لکھے جاتے تھے۔ لیکن جدید افسانوں نے سماج کو عصری مسائل کا احساس دلایا ہے اور ان کے حل کی راہیں ہموار کی ہیں۔ اقدار کی شکست اور زندگی کے تلخ حقائق کا نوحہ ہی جدید افسانوں میں نہیں ہے بلکہ جبریت اور استحصال کے خلاف صدائے احتجاج بھی ہے اور سماج کو جھنجھوڑنے کا فن بھی ان میں موجود ہے۔ جدید افسانوں نے صنعتی معاشرے کے تشنج زدہ نظام میں

جکڑی ہوئی انسانیت کی رہائی کے لیے سماج کو معذوریت کا نہیں مبارزت کا سلیقہ سکھایا ہے۔

سلام بن رزاق کا افسانہ ''ننگی دوپہر کا سپاہی''، احمد یوسف کے ''شادکامی کا دوسرا لمحہ'' اور ''تجدید جنوں''، رشید عارف کا ''سورج کا چکر''، طالب زیدی کی ''مٹی کہانیاں'' محمد منشایاد کے ''ماس اور مٹی''، اقبال مجید کے ''دو بھیگے ہوئے لوگ'' مسعود اشعر کے ''آنکھوں پر دونوں ہاتھ'' شوکت حیات کے ''بھسینڈا''، ''اپنا گوشت'' اور ''چیخیں''، انجم عثمانی کے ''منظر ابھی بدلا نہیں''، ''چھوٹی اینٹ کا مکان'' انور خاں کے ''راستے اور کھڑکیاں''، نیر مسعود کے ''عطر کافور'' اور ''طاؤس چمن کی مینا، اور طارق چھتاری کے ''کھوکھلا پہیا'' وغیرہ افسانوں میں عصری مسائل کی گونج صاف سنائی دیتی ہے، جس سے سماج کے بالا خانے بھی گونجنے لگتے ہیں۔ ۱۹۷۰ء سے پہلے کے افسانہ نگاروں میں پریم چند، خواجہ احمد عباس حسینی، راجندر سنگھ بیدی، جوگیندر پال، اور رام لعل کئی نام ہیں جن کے افسانوں میں عصری مسائل موجود ہیں اور عصمت چغتائی، آمنہ ابوالحسن، صالحہ عابد حسین، قرۃ العین حیدر، مسرور جہاں، بانو سرتاج، رضیہ بٹ، شمیم صادقہ اور جیلانی بانو وغیرہ کئی خواتین افسانہ نگاروں کی نگارشات میں بھی ملتے ہیں۔ لیکن ان کے یہاں پیش کش میں فولادی صلابت نہیں آبگینوں کی سی نازکی ہے۔ عورت کی فطرت بالآخر ان کے افسانوں پر حاوی ہوگئی ہے۔ ان افسانوں میں ٹکراؤ کی بہ نسبت سمجھوتے کا رجحان زیادہ ہے۔

عصری مسائل میں ''تہذیبی سالمیت کے بکھراؤ'' کا مسئلہ بھسما سور جیسا بن گیا ہے کہ یہ اپنے وردان دینے والے ہی پر حاوی ہوگیا ہے۔ سماج کا ہر فرد اس سے دوچار ہے۔ شاید یہی وجہ رہی ہو کہ ہمارا افسانہ نگار اجتماعی احساس کا ترجمان نہیں بن پا رہا ہے۔ وہ اس بات کا بڑا جتن کر رہا ہے کہ تہذیبی بکھراؤ کا کوئی ایسا سرا مل جائے جس سے انتشار ختم ہو اور اجتماع کی صورت نکل آئے۔ اس کے لیے وہ سماج کو چوکنا بھی کرتا رہتا ہے۔ مانک ٹالا، رتن سنگھ، سلام بن رزاق، ناصر بغدادی، گلزار، بلراج ورما، اقبال متین، اور ہمت رائے شرما کے افسانوں میں تہذیبی سالمیت کے بکھراؤ کو روکنے کی کوشش کو بہ نظر استحسان دیکھا جاتا ہے۔ گلزار کے افسانوی مجموعہ ''دھواں'' میں اس تہذیبی بکھراؤ کو دھویں کی مانند پھیلنے کی کیفیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ''ایک بار پھر'' میں م۔ ناگ نے عصری ناہمواریوں کو کاٹ دار لہجہ اور کھردرا اسلوب دیا ہے۔ احمد بشیر نے ''ایک تھا راجا'' میں حالات کی جبریت اور عصری تناؤ سے بکھری سماجی سالمیت کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ ''اخبار آ گیا ہے'' میں سعید انجم خواب اور تعبیر وسمتوں کو یکجا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر نریش نے ''برہم گیان'' میں بھوک اور مذہب کے ٹکراؤ کی کیفیت کو بیان کیا ہے۔

(۹) دیہی تہذیب کا شعور:

ہندوستان کے افسانوی ادب میں گاؤں کی تہذیب کو پیش کرنے کا سہرا رابندر ناتھ ٹیگور کے سر بندھتا ہے۔ دارالخلافہ میں رہنے کے باوجود انھوں نے گاؤں کی طرف مراجعت کی۔ وہاں کے لوگوں کے مسائل سمجھے، کسانوں کی دشواریوں، ان کی حیاتی پریشانیوں کا ادراک کیا اور اپنی کہانیوں میں انھیں بڑی سادگی کے ساتھ پیش کیا۔ اردو میں پریم چند کو یہ شعور ٹیگور ہی سے حاصل ہوا، چنانچہ اپنے افسانوں میں انھوں نے دیہی تہذیب کے

مختلف گوشوں کو کردار، پلاٹ، مکالمے وغیرہ کی صورت میں برتنے کی کوشش کی ہے۔ ''گلی ڈنڈا''، ''ہیرا موتی''، ''نمک کا داروغہ'' وغیرہ کہانیوں میں پریم چند کے یہاں دیہاتی زندگی کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ پریم چند کے معاصر افسانہ نگاروں میں سدرشن، اعظم کریوی علی عباس حسینی اور سلطان حیدر جوش کے افسانوں میں دیہی عناصر کی بہتات دکھائی دیتی ہے۔ علی عباس نے تو اپنے افسانوں کے مجموعوں کو گاؤں کی تہذیب ہی سے جوڑ دیا ہے۔ ''گاؤں کی لاج'' ان کا بہترین افسانہ ہے، جس میں گاؤں کے ہندو مسلم اتحاد کو بڑے موثر انداز میں افسانے کا پلاٹ بنا کر پیش کیا ہے۔ اسی روایت کو قاضی عبدالستار نے بھی اپنایا ہے۔ ان کا ''پیتل کا گھنٹہ'' گاؤں میں جاگیردارانہ تہذیب کے زوال کا المیہ ہے۔ گھر آئے داماد کی مہمان نوازی کے لیے بالآخر، پیتل کے گھنٹے کو گروی رکھ دیا جاتا ہے۔ اس افسانے کا اختتام بڑا جذباتی ہے۔ پڑھتے وقت قاری پر رقت طاری ہو جاتی ہے۔ ۱۹۷۰ء کے بعد کے لکھنے والوں میں غیاث احمد گدی، اقبال مجید، محمد منشا یاد، شوکت حیات، سلام بن رزاق، انیس رفیع، رشید امجد، عبدالصمد، نیر مسعود، طارق چھتاری، اور بیگ احساس کے یہاں دیہی ماحول کی عکاسی ہوئی ہے۔ انیس رفیع کی کہانیوں میں بنگال اور بہار کا دیہی ماحول اپنی دھوپ چھاؤں، سردی گرمی اور بارش و خشک سالی کے اثرات کے ساتھ نمایاں ہے۔ ان کہانیوں میں انیس رفیع نے دیہی سیاست کی گرم بازاری کو بھی پیش کیا ہے۔

(۱۰) تہذیب، اخلاق اور روحانیت:

اگرچہ اخلاق اور روحانیت کی مذہبیت و تہذیب کے لیے دینی درس گاہیں اور بزرگوں کی خانقاہیں زبردست مراکز رہی ہیں۔ لیکن آسائش و آسودگی اور مادی ضروریاتِ زندگی نے خواص و عوام دونوں کو ان سے دور کر دیا ہے۔ بہ استثنائے چند، عوام الناس گھروں میں حاصل کردہ تربیت سے آگے بڑھ کر تحصیل علم کے لیے ان تربیت گاہوں میں جانے سے کتراتے رہتے ہیں۔ ایسے حالات میں ہمارے افسانوں نے جاہل و عالم ہر دو طبقے کی اخلاقی و روحانی تہذیب میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ ملا وجہی کی ''سب رس''، میر امن کی ''باغ و بہار''، عطا حسین تحسین کی ''نو طرز مرصع'' وغیرہ داستانوں میں اخلاق و روحانیت کا حسین سنگم ہوا ہے، جن کے مطالعہ سے اردو معاشرے کے روحانی و اخلاقی اقدار مجلا ہوئے اور ان کی مدھم لو تیز ہوگئی۔ نذیر احمد کی ''توبۃ النصوح''، راشد الخیری کی اخلاقی کہانیاں اور خواجہ حسن نظامی کے نظریات کے حامل قصص و حکایات نے ہمارے اردو معاشرے کے سماجی معاملات کو صالح جذبات سے مربوط کرنے کی کوشش کی ہے۔

(۱۱) نثری اسلوب:

اردو افسانوں نے ہمارے معاشرے کو نثری اسلوب عطا کیا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ اردو نثر کی ابتداء افسانوں ہی کی مرہون منت ہے۔ نثر میں سب سے پہلے جو لکھا گیا وہ افسانوی ادب ہی تھا۔ متصوفانہ اور مذہبی کتابیں، قرآن مجید کے تراجم، خطوط نگاری اور دوسرے عصری علوم کی کتابیں یہ تمام قصے کہانیوں کے بعد کے نثری ادب میں شمار ہوتی ہیں۔ مرصع، مسجع اور مقفیٰ عبارت آرائی اور اس کی مینا کاری بھی افسانوں ہی کی دین ہے۔

رجب علی بیگ سرور کی "فسانہ عجائب" اور سرشار کی "فسانہ آزاد" اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

(۱۲) لایعنیت:

تجریدی افسانوں کا رنگ واسلوب اور طرز وڈھنگ کچھ اس طرح کا ہے کہ باوجود پڑھتے چلے جانے کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ صرف الفاظ کا گورکھ دھندا اور منتشر خیالات پروئے ہوئے جملے ہوتے ہیں۔ ہوسکتا ہے یہ میرے فہم وادراک کی نارسائی اور کمزوری ہو۔ لیکن مجھے ایسے افسانوں میں کہانی پن دکھائی نہیں دیتا جس سے کچھ حاصل کیا جاسکے۔ ایسے افسانوں نے سماج کو صرف "لایعنیت" کے مبہم اور غیر واضح خیالات کے تانوں بانوں میں الجھائے رکھا ہے اور کچھ نہیں۔ یہاں ایک افسانہ "نیش عقرب" کو بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے کہ اس میں خصیوں کے بیضے اچھالنے کا کھیل کھیلا گیا ہے۔

(۱۳) سائنسی ایجادات وانکشافات:

سائنسی نقطۂ نظر نے ہمارے سماج کو سائنسی شعور عطا کیا ہے، جس سے اوہام پرستی کا بڑی حد تک سدباب ہوا۔ سائنس کی ایجادات اور اکتشافات کو افسانوی رنگ دے کر سماج کے اذہان کو توہم پرستی سے پاک کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کمپیوٹر، راکٹ کے افسانوں اور مصنوعی سیاروں کی کہانیوں کی مدد سے طلسم وسحر کے جالوں کو جھاڑا جارہا ہے۔ ہمارے زمانے میں تو سائنسی کہانیاں لکھنے کی شعوری کوششیں ہورہی ہیں۔ غضنفر اور ف۔س۔اعجاز کے نام اس ضمن میں کافی اہم ہیں۔ اطہر پرویز، محمد امین، نجمہ خان، اے حمید، قیصر سرمست اور وکیل نجیب درسیاتی نقطۂ نظر سے بچوں کی کہانیوں میں سائنسی موضوعات کو شامل کرنے کا جتن کررہے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بہت سارے عطایا ہیں جنھیں افسانہ نگاروں نے اردو معاشرے کو دیا ہے۔ ان سب کا احاطہ تحقیق طلب بھی ہے اور دشوار بھی۔ اس مقالے میں میں نے ان افسانہ نگاروں کا تذکرہ نہیں کیا جو نضر بن الحارث کی تقلید کرنے والے ہیں اور حق کے مقابلے میں باطل کو ابھارنے کی کوشش کرتے ہیں۔

☆☆☆

حاشیائی کرداروں کا سماجی تصور اور اردو فکشن میں اس کا تفاعل!

● اظہار خضر

ادب کے حوالے سے حاشیائی کرداروں پر گفتگو کرتے ہوئے اس نکتہ کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ ادب کے تار و پود چونکہ زندگی سے تیار ہوتے ہیں لہذا بہر صورت اس میں فرد اور سماج اور اس سے جڑے مسائل و واقعات اور ان کے مضمرات و اثرات کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب روحِ عصر کا ترجمان ہے، نری عصریت ادبی تخلیقات کے لیے سمِ قاتل کا درجہ رکھتی ہے۔ سرور صاحب نے ''نظر اور نظریے'' میں ادب اور فنون لطیفہ کے حوالے سے علم و فن کے اس نظری پہلو پر بڑی ہی جامع اور مدلل گفتگو کی ہے۔ عرض یہ کرنا ہے کہ اگر ادب زندگی کا پیمانہ ہے تو ظاہر ہے کہ اس میں فرد، زندگی اور سماج اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوں گے۔ اور اس کی بہترین قدریں ہمارے محسوسات کو انگیز کریں گی۔ مطلب یہ کہ ادب زندگی کا اقداری پیمانہ ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس میں فکر و تصور و تخیل کو کلیدی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے کہ اس کے بغیر ادب فنِ لطیف کے دائرے میں داخل ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ بھی ذہن نشیں رکھیے کہ اب مافوق الفطری اور طلسماتی تخلیقی فضا بندی کا زمانہ نہیں رہا۔ آج ہم ماورائے عصر تصور ادب کی سرحد کو پار کر کے روحِ عصر کی سطح پر جدید ادبی تصور کی شیرازہ بندی اور صف بندی میں مصروف عمل ہیں۔

آج کے ادب کا سنجیدہ اور ترقی یافتہ قاری ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کے دو الگ الگ خانوں کا قائل نہیں ہے! وہ ادب کو ایک Totality کی صورت میں دیکھنا چاہتا ہے اور دیکھ بھی رہا ہے۔ جس میں نظامِ حیات اپنی تمام تر اقداری صورتوں میں دکھائی پڑتا ہے۔ یہی وہ خطِ فاصل ہے جو ادب اور سائنس نیز ادب اور غیر ادب میں مابہ الامتیاز کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ بیان کردہ نکات ادب کی سماجیات سے تعلق رکھتے ہیں جو میرے خیال میں حاشیائی کرداروں کے فکر و فہم کے لیے ضروری ہیں۔

اس مختصر سی تمہیدی گفتگو کو پیش نظر رکھیے اور غور فرمائیے کہ اردو اور دیگر ہندوستانی زبانوں کے تخلیقی

فنکاروں نے بنی نوع انسانی کی متذکرہ مثلیث (فرد، زندگی اور سماج) کو اپنے فکر وفن کا حصہ کیونکر بنایا، کس نہج سے بنایا اور کس طرح بنایا؟ میری اس گفتگو کا یہی وہ Focus Point ہے جو سماج کے دلت اور حاشیائی کرداروں کی مجموعی صورت حال اور ان کی وجودی حیثیت کو متعین کرنے کی راہ کچھ حد تک ہموار کر سکے گا۔

حاشیائی کرداروں پر گفتگو کرتے ہوئے بادی النظر میں دلت کا تصور بھی ذہن میں ابھرتا ہے۔ جبکہ دونوں میں فرق ہے۔ سب سے پہلے سماج کے حاشیائی اور دلت کردار کی ایک عمومی تعریف سن لیجیے: اس میں فکر کی مادّی توجیہ پسندی کو آپ واضح طور پر محسوس کریں گے۔ ہاں، تو عرض یہ کرنا ہے کہ سماجی، تعلیمی اور اقتصادی سطح پر پس ماندہ وہ طبقہ دلت اور حاشیائی ہے جو سماجی نظام کے مین اسٹریم سے بہ ظاہر الگ تھلگ نظر آتا ہے۔ میرے نزدیک یہ حاشیائی اور دلت کرداروں کا ایک Apparent Definition ہے۔ کیونکہ بہ ظاہر تو وہ الگ تھلگ نظر آتے ہیں لیکن بہ باطن ہمارے سماجی، تعلیمی اور اقتصادی نظام میں ان کی شمولیت اور حصہ داری بھی فعال و متحرک نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ وہ بیداری ہے جو فکر و قدر اور تہذیبی سطح پر دوسروں کے ساتھ ان کو بھی بلند و برتر کیے ہوئے ہے۔ بھلے ہی سماج کا Dominating اور Deciding Factor انھیں تسلیم نہ کرے۔ یہاں اس فرق کو بھی ذہن نشیں رکھیے کہ حاشیائی کردار سماجی، تعلیمی اور اقتصادی سطح پر بلند بھی ہو سکتے ہیں اور پست بھی۔ اس میں اعلیٰ ادنیٰ اور دلت سبھی شامل ہیں۔ جبکہ دلت کہتے ہی ہیں سماج کے اس طبقہ کو جس کا حال ابتر ہے، ماضی سوکھی ٹھٹھریوں کی طرح اور مستقبل تاریک۔ اس میں ان کا قصور نہیں ہے، بلکہ ہمارے سماجی نظام کا قصور ہے۔ دلت کی معنوی تخصیص میں حزن و یاس اور رنج والم شامل ہیں! لیکن چونکہ آج سماجی جکڑ بندیوں اور پابندیوں کی زنجیریں ٹوٹتی چلی جا رہی ہیں اور ایک وسیع تر روشن خیالی کا منظر نامہ ہماری سماجی زندگی پر چھا چکا ہے۔ اس لیے ممکن ہے کہ وہ بھی تہذیب و قدر سے معمور ہوں۔ لیکن پھر بھی ان کا یہ معمورۂ فکر و قدر Marginalise ہی نظر آتا ہے۔ بھلا صدیوں کا قیدی لمحوں کی آس کیونکر لگائے! لیکن دلوں پر تو پہرے لگائے نہیں جا سکتے۔ تاریکی کی تہہ سے ہی اُجالے کی نمود ہوتی ہے۔ بھلے ہی اجالے کی یہ کرن سہمی سہمی اور ڈری ڈری ہوئی ہو! لیکن یہ ہمارے سماجی فکر و تصور کو متور ضرور کر رہی ہے۔ لہٰذا اس فکری مشاہدے کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ تہذیب و اخلاق کی بلندی ہی حاشیائی اور دلت کرداروں کا وہ بنیادی معیاری پیمانہ ہے جو اس کے بامعنی وجود کی بقا کا ضامن ہے۔

میرے نزدیک افراد کے ایک متموّل گروہ کا نام Elite نہیں ہے۔ بلکہ افراد کی اس دانشورانہ سوچ پر مشتمل اس گروہ کو Elite کہتے ہیں جو لوگوں کے ذہنی سانچے اور اس کی فکر و سوچ کی تربیت مثبت انداز نظر سے کرے۔ اس میں متموّل بھی ہو سکتے ہیں اور غریب و نادار بھی۔ اس کے باوجود یہ Elite طبقہ Marginalise ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔ اور اگر Marginalise ہوتا ہے تو کیونکر ہوتا ہے اور کس طرح؟ اس کو ایک مثال سے سمجھیے:

زید سماجی، اقتصادی اور تعلیمی سطح پر بلند ہے۔ وہ ایک دفتر میں کام کرتا ہے۔ دفتری امور کے نپٹارے میں وہ چست درست ہے۔ لیکن پھر بھی انتظامیہ کی نظر میں وہ ناپسندیدہ ہے۔ اتنا ہی نہیں علوم وفنون کے میدان میں بھی یکتائے روزگار ہے۔ لیکن اس میدان میں بھی وہ حاشیے ہی پر ہے۔ حالانکہ اس کی روشن ضمیری سے اس کا وجود چمکتا رہتا ہے۔ لیکن کیا کیجیے کہ وہ بے ضمیری کا سودا کر نہیں سکتا۔ جبر واستحصال کا شکار ہے۔ خاموش تماشائی بنا رہتا ہے۔ اس کی خاموشی اس کی شرافتِ نفس اور خود اعتمادی کا اشاریہ ہے۔ میرے نزدیک یہ سماج کا ایک حاشیائی کردار ہے جو فکر وقدر کی سطح پر اوروں سے بلند ہے۔ ممکن ہے کہ میری اس توجیہ پسندی کو آپ دل خوش کن باتوں پر محمول کریں۔ لیکن یہ ایک تلخ سماجی حقیقت ہے جس سے روگردانی ممکن نہیں۔ آپ نام نہاد مہذب اور متمدن سماج کی بے حسی اور ساتھ ہی نام نہاد طبقۂ اشراف اور دانشوروں کی فکری کج روی کا جتنا بھی ماتم کریں کم ہے کہ اندرون خانہ کا منظر ایسا ہی گھناونا ہوتا ہے!

ہمارے اردو اور دیگر ہندوستانی زبانوں کے قلمکاروں نے اس تلخ حقیقت کو شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ ان کے محسوسات کے دائرے میں یہ سماجی حقیقت سرگرم وفعال نظر آتی ہے۔ وہ اس حقیقت کو تخلیق فن کا حصہ بنا کر اپنی تخلیقی جوابدہی سے عہدہ برآ بھی ہوئے، یہ بڑی بات ہے۔

ذیل کی سطور میں اردو فکشن کے حوالے سے حاشیائی کرداروں پر کی جانے والی گفتگو انھی متذکرہ نکات پر مرکوز رہے گی جس میں کرداروں کی فکر وقدر اور ان کی بلند تہذیبی اور سماجی سطح کو ہی فوکس کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس صراحت کے ساتھ کہ تنقید ادبی تاریخ نویسی نہیں ہے بلکہ یہ ایک اعلیٰ قسم کی اقداری تحریر ہوتی ہے جس میں نقاد تخلیقی فن پاروں میں پیش کردہ فکری نظام کی معنویت وجواز پر اپنے مشاہدہ ومطالعہ کی روشنی میں گفتگو کرتا ہے۔ لہٰذا عملی تنقید کے جو نمونے جہاں تہاں سے یہاں پیش کیے جا رہے ہیں ان میں تقاضائے سخن کو اختیار کردہ موقف کے دائرے میں ہی رکھنے کی کوشش کی جائے گی۔

''گرہن'' بیدی کا ایک خوبصورت اور گہری سماجی بصیرت کا حامل افسانہ ہے:

ہولی اس افسانے کی مرکزی کردار ہے۔ یہ کردار حاشیے پر کھڑا نظر آتا ہے اور ہمارے فکر وشعور پر تازیانہ کا کام کرتا ہے۔ قصہ یوں ہے کہ ہولی رہنے کو تو اپنے سسرال میں رہ رہی تھی، لیکن اس کے ساتھ کتوں سے بھی برا سلوک ہوتا تھا۔ گجرات کے اساڑھی کائستھوں کا بھی عجب حال ہے۔ وہ اپنی بہوؤں کو بچہ جننے کی مشین سمجھتے ہیں۔ ہر سال ڈیڑھ سال پر ایک بچے کا وارد ہونا لازمی ہے۔ اور کہیں کوکھ جلی نکلی تو پھر قیامت۔ اب یہ دیکھیے کہ ہولی پہلے سے ہی تلے اوپر چار بچوں کو جنم دے چکی تھی۔ کیڑوں کی طرح یہ بچے ابھی رینگ ہی رہے تھے کہ پانچویں کی متوقع آمد سسرال والوں کے لیے مژدۂ جانفزا سے کم نہ تھی۔ بھلے ہی نحیف ونزار ہولی کی جان ہی چلی جائے۔ سسرال والوں کے سامنے ہولی کی ایک نہ چلتی۔ بالخصوص فراخ نتھنوں والی ساس ہٹیلی میا کے طعن وتشنیع اور ناز ونخرے تو اس کے لیے وبال جان بن گئے تھے۔ ہولی میکے سے

یہ سبق یاد کر کے آئی تھی کہ ایک وفا شعار بیوی بن کر رہنا ہے۔ سسرال والوں کی تابعداری اس پر فرض ہے۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ سسرال میں وہ حاشیے پر کھڑی تھی۔ مجبور محض۔ ایسی بات نہ تھی کہ ہولی غریب و نادار تھی۔ وہ ایک ساہوکار کی بیٹی تھی۔ لیکن ایک مثالی ہندوستانی عورت کی وفا شعاری اور تابعداری کو کوئی سمجھے تب تو۔ ہولی کا وجود گہنا چکا تھا۔ اساڑھی کا یہ موں کے سامنے تو نسل پروری ہی اصل چیز تھی۔ ہولی کی بھی اپنی کوئی شخصیت ہے۔ اس کی بھی اپنی آرزوئیں اور تمنائیں ہیں۔ اس کے بھی اپنے کچھ آتم سمان ہیں۔ یہ محسوس کرنے کے لیے کوئی تیار ہی نہ تھا۔ اس سے بڑی حاشیائی صورت حال اور کیا ہو سکتی ہے۔ فنکار بیدی بھی اپنی اس تخلیقی فضا بندی سے جھلا اٹھتا ہے۔ بھلا ایسا بھی ہوتا ہے کہ چاند گرہن کی رات آتے ہی ساس کی جانب سے قسم قسم کی پابندیاں عائد کر دی جائیں۔ کوئی کپڑا نہ پھاڑے۔ پیٹ میں بچے کے کان پھٹ جائیں گے۔ وہ سی نہ سکتی تھی۔ منہ سلا بچہ پیدا ہوگا۔ ازیں قبیل۔ اب یہ دیکھیے کہ بیدی کے مشاہدے کی تیز آنچ سے طنز کی تیز دھار اور دھاردار کس طرح ہو جاتی ہے: ”گویا وہ بدزیب فراخ نتھنوں والی، ہٹیلی میا اپنی بہو حمیدہ بانو کے پیٹ سے کسی اکبر اعظم کی متوقع ہے“ یہ افسانہ ادب کی سماجیات کے حوالے سے ایک عمدہ تخلیقی نمونہ ہے جو Marginalisation کے تفہیمی شعور کو جلا بخشتا نظر آتا ہے۔

بیدی کی تخلیقی کارکردگیوں میں ان کے ناولٹ ”ایک چادر میلی سی“ کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ اس ناولٹ کا مطالعہ بھی ادب کی سماجیات کے حوالے سے ہی کیا جانا بہتر ہوگا۔ کیونکہ بیدی نے سماجی برائیوں اور فرسودہ رسم و رواج کو ہی تخلیقی فن کا حصہ بنایا ہے۔ بیدی بنیادی طور پر ادب کی سماجیات کے ہی تخلیقی فنکار ہیں۔ رانو، اس ناولٹ کی مرکزی کردار ہے، جس کے اردگرد ہی کہانی کا تانا بانا بنا گیا ہے۔ رانو کے کردار میں بھی صبر و ضبط اور سماجی بندھنوں کی پاسداری کی جھلک ملتی ہے۔ تلوکا، رانو کا شوہر ہے، جس کے ظلم و ستم کو وہ سسرال میں ہر وقت سہتی رہتی۔ اتنا ہی نہیں ساس، سسر کے طعن و تشنیع کی وجہ سے اس بدنصیب کی زندگی تلخ ہو کر رہ گئی تھی۔ لیکن اس کی شخصیت میں رچی بسی فکر و سوچ، حوصلہ مندیوں اور برق آسا صلاحیتوں سے عبارت تھی۔ وہ معاملہ فہم بھی تھی۔ لیکن پھر بھی حاشیے پر تھی۔

ناولٹ کی ابتدا قتل کے واقعہ سے ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ ناولٹ کے دوسرے باب میں تلوکے کا قتل ہو جاتا ہے۔ تلوکا کے قتل سے رانو کی زندگی تو سنسان ہو ہی جاتی ہے۔ لیکن سماج اور سسرال والوں نے اتنا ہی پر بس نہیں کیا! یوں سمجھئے کہ اس کے وجود میں محبت کے پھول کم اور نفرت کے تیروں کی بارش زیادہ ہونے لگی۔ اس پر تلے اوپر تین بچے اور سب سے بڑی بیٹی۔ قتل در قتل کے دو واقعات کو پیش نظر رکھیے اور غور فرمائیے کہ ناولٹ کے اختتامی حصہ میں مزید قتل کے ایک اور واقعہ کے رونما ہو جانے کا امکان غالب ہو چکا تھا۔ کہ فنکار بیدی کا فکر و فن اس سے اجتناب کرتا نظر آتا ہے۔ بہ خوف طوالت تفصیل سے گریز کرتے ہوئے صرف یہ بتاتا چلوں کہ رانو کی دوسری شادی منگل سے ہو جاتی ہے! منگل رانو کی بیٹی ”بڑی“ کے لیے ایک لڑکا

دیکھتا ہے۔ اور اُس سے اس کا بیاہ طے کر دیتا ہے۔ اس میں رانو کی رضا مندی بھی شامل تھی۔ لیکن جب رانو، لڑکے کو دیکھتی ہے تو وہ چونک جاتی ہے اور اس پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ یہ لڑکا تو وہی ہے جس کے باپ نے تلو کے کا قتل کیا تھا! غور فرمایئے کہ قتل در قتل کے دو واقعات رونما ہو چکے تھے۔ ایک بار پھر کو تلے کے دروازے پر ایک اور قتل دستک دے رہا تھا۔ لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ رانو معاملہ فہم تھی۔ صبر و ضبط کی پیکر تھی۔ وہ جانتی تھی کہ نفرت کی دیوار اگر ڈھادی جائے تو اس میں فرد اور سماج کی بہتری ہے۔

رانو کی مثالیت پسندی ہمارے نام نہاد مہذب سماج کے لیے عبرت کا مقام رکھتی ہے۔ رانو اس ناولٹ کی ایک حاشیائی کردار ہے جو سماجی، تعلیمی اور اقتصادی سطح پر پست ہے۔ لیکن فکر وقدر اور تہذیب و اخلاق میں مثالی۔ غور فرمایئے کہ اگر یہ قتل رونما ہو جاتا تو پھر کہانی سے فنکار کی دانشورانہ فکر ونظر ہی غائب ہو جاتی۔ اور بیدی کے فن پر یہ سوالیہ نشان لگ جاتا کہ بیدی سماج میں وحشیانہ تشدد کو Promote کر رہے ہیں۔ بیدی نے رانو کو سماجی زندگی کے حاشیہ پر کھڑا کر کے فکر ونظر کے ایک عدیم المثال Dynamism کی کرافٹنگ کی ہے۔

اردو افسانے کا ایک بہت ہی فکر انگیز حاشیائی کردار احمد ندیم قاسمی کا پرمیشر سنگھ ہے۔ تقسیم اور فساد کے پس منظر میں لکھے گئے اس افسانے میں انسانی دردمندیاں اور ہمدردیاں فکر وفن کی سطح پر اپنے اوج کمال پر نظر آتی ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ تقسیم کا سب سے زیادہ اثر غیر منقسم صوبہ پنجاب پر پڑا۔ مسلمانوں اور سکھوں کی پوری کی پوری آبادی سرحد کے اس پار اور اُس پار منتقل ہو گئی۔ خونریزیوں کی جو خوفناک داستان پڑھنے کو ملتی ہے اس سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس حوالے سے کرشن چندر کا "پشاور ایکسپریس" تو ایک شاہکار ہے۔ دونوں فرقوں کے درمیان نفرتوں کا زخم اتنا گہرا ہو چکا تھا کہ اس کے مندمل ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ برصغیر ہند و پاک کے تخلیقی فنکاروں نے اس تشویشناک اور ہولناک صورت حال کو شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ قاسمی اس تہذیبی اور سماجی بکھراو کے دوراہے پر کھڑے تھے اور تمام واقعات وحالات کے چشم دید گواہ تھے۔ ایسے میں انھوں نے ایک آئیڈیل دردمند کردار پرمیشر سنگھ کو پیش کر کے اپنی ایماندارانہ اور ذمہ دارانہ تخلیقی جوابدہی کا ثبوت پیش کیا۔ زہر آلود فضا کو ہموار کرنے کی جانب قاسمی کی اس تخلیقی کاوش کے اثرات کس حد تک مرتب ہوئے اس کے لیے ہمیں اپنی فکری اور ذہنی توفیق کے Quantum کو پڑھنا اور اس کا جائزہ لینا ہوگا! جس کا یہاں موقع نہیں ہے۔ عرض یہ کرنا ہے کہ قاسمی نے اپنے اس سکھ کردار کو آپ کے فکر وشعور کے اوپر تھوپا نہیں ہے بلکہ یہ تو صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے۔

اب یہ دیکھئے کہ سرحد پار کرنے والے قافلے میں پانچ سالہ اختر اور اس کی ماں بھی تھی۔ لیکن اس ریلم ریل اور ٹھیلم ٹھیل میں اختر بچھڑ گیا۔ اور اس کی ماں لاٹھی تھامے پاکستان چلی گئی اور اختر ہندوستانی سرحد میں داخل ہو گیا جو امرتسر کا ایک نواحی علاقہ تھا۔

کھیت میں کھڑا وہ بلبلا رہا تھا کہ اچانک چند سکھوں نے اختر کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔

انھی میں پرمیشر سنگھ بھی تھا۔ اختر شاید موت کے گھاٹ اتار ہی دیا جاتا کہ پرمیشر سنگھ چلا اٹھا۔ کیوں مارتے ہو اس معصوم کو یارو۔ اس کو بھی تو واہے گرو جی نے ہی پیدا کیا ہے۔ جس طرح ہمارے پانچ سالہ معصوم کرتارے کو جو سرحد اس پار ہی قافلے سے بچھڑ گیا۔ پرمیشر سنگھ کی شفقتوں اور دردمندیوں سے اختر کی زندگی بچ گئی اور اسے اپنے ساتھ لے آیا۔ یہیں سے پرمیشر سنگھ کی Marginalisation کی کہانی شروع ہوتی ہے۔

پرمیشر سنگھ صرف اتنا چاہتا تھا کہ آگ اور خون کی ہولناکیوں میں کچھ کمی ہو تو اختر کو اس کی ماں کے پاس واپس کردوں۔ لیکن کوئی اُس کے اس لطیف جذبہ واحساس کو محسوس کرے تب تو۔ یہاں تو چہار جانب وحشیانہ تشدد اور نفرت کا بازار گرم تھا۔ گاؤں کی ساری برادری، گرنتھی جی اور گھر والے سب اس بات پر مصر تھے کہ اگر اختر کو رکھنا ہے تو سکھ بنا کر رکھو ورنہ مار ڈالو:

> ''تم کتنے ظالم لوگ ہو یارو۔ اختر کو کرتارا بناتے ہو۔ اور اگر اُدھر کوئی کرتارے کو اختر بنا لے تو؟ اسے ظالم ہی کہو گے نا'' پھر اس کی آواز میں گرج آگئی ''یہ لڑکا مسلمان ہی رہے گا۔''

پرمیشر سنگھ فکر وسوچ کی سطح پر حاشیے پر کھڑا تھا۔ لیکن گاؤں کے گرنتھی کی آخری وارننگ پر چاروناچار پرمیشر سنگھ نے اختر کے بال بڑھوا دیئے، سر پر پگڑی اور ہاتھ میں کڑا پہنا دیئے لیکن اندر ہی اندر سماج کے اس جبر و استحصال سے سلگتا رہا۔ فرد، زندگی اور سماج کے تئیں اس کی اپنی سوچ تھی۔ اپنی سمجھ تھی۔ وہ ایک دردمند اور انسان دوست سکھ تھا۔ لیکن اس کی دردمندیاں اور ہمدردیاں جبر واستحصال اور نفرت وحقارت کی قربان گاہ پر چڑھی ہوئی تھیں۔ اختر کی زندگی کو بچانے کے لیے پرمیشر سنگھ کی اس وقتی مصلحت اور مصالحت میں ہی عافیت تھی۔ حالات کے نارمل ہونے کے انتظار میں وقت گزرتا رہا اور اختر کے شب و روز پرمیشر سنگھ کی آغوش میں گزرتے رہے۔ پرمیشر سنگھ جانتا تھا کہ یہ اختر کی جائے اماں نہیں ہے۔ وہ اختر کی زندگی کی اس بے اماں صورت حال سے حد درجہ دل گرفتہ تھا۔ ادھر گرنتھی جی اور گاؤں والے بھی جان کھائے ہوئے تھے۔ ایک روز موقع پا کر پرمیشر سنگھ کھیتوں کے راستے اختر کو سرحد کے قریب لے ہی آیا:

> ''جاؤ بیٹے تمھیں تمھاری اماں نے پکارا ہے۔
> بس تم اس آواز کی سیدھ میں.................
> اور تمھیں کرتارا نام کا کوئی لڑکا ملے تو اُسے اِدھر بھیج دینا''

کرتارا کی کسک اور ٹیس سے اس کا دل جتنا چور ہو رہا تھا، اسی Quantum میں وہ اختر کی ماں کی کسک اور ٹیس کو بھی محسوس کر رہا تھا۔ اس بیچ ہوا یہ کہ پرمیشر سنگھ اچانک Border Line کو پار کر کے تیزی سے اختر کے پیچھے دوڑ پڑا کہ فوجیوں نے گولی چلا دی: ''مجھے کیوں مارا تم نے۔ میں تو اختر کے کیس کاٹنا بھول گیا تھا۔ میں تو اختر کو اس کا دھرم واپس دینے آیا تھا یارو''۔

یہ افسانہ ایک دردمند دل کا عدیم المثال تخلیقی منظرنامہ ہے۔ پورے افسانے میں المیہ نگاری کا فن اپنی انتہا پر نظر آتا ہے۔ اس افسانے کا المیاتی حسن ہی اس کی جمالیات ہے۔

اس تجزیاتی گفتگو سے یہ بھی محسوس کیجئے کہ ان حاشیائی کرداروں کے عزم وارادے کتنے آہنی ہوتے ہیں۔ یہ افسانہ اور اس کا حاشیائی کردار آج بھی ہماری سماجی زندگی کے لیے لمحہ فکریہ فراہم کرتا ہے۔ ڈیمائی سائز میں مطبوعہ ۱۲ صفحات پر مشتمل یہ مختصر سی روداد آپ کے فکر وشعور کو مہمیز کرنے کی غرض سے پیش کی گئی ہے۔

الیاس احمد گدی کا ناول ''فائرایریا'' دلت اور بدحال طبقہ کی زندگی کی بہترین عکاسی کرتا نظر آتا ہے۔ یہاں تو قدم قدم پر جبر واستحصال کا کھیل دیکھنے کو ملتا ہے۔ کولیری کے مزدوروں کی دُکھی زندگی کی فنکارانہ مصوری اس سے بہتر اردو اور ہندی کے کسی اور ناول میں دیکھنے کو نہیں ملتی ہے۔ گدی کا چابکدست فنکارانہ قلم کتنا برق آسا تھا اس کی آگہی وآشنائی کے لیے اس ناول کو ضرور پڑھیے۔ ناول کے تمام ترفنی لوازم اور جزئیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے سسکتی، بلکتی زندگی کی ایک ایسی تخلیقی فضابندی کی گئی ہے کہ محسوس ہوتا ہے کہ اثرانگیزی اپنے اوج کمال پر پہنچ گئی ہے۔

سہدیو پرساد رمانی کو اس ناول میں مرکزی کردار کی حیثیت حاصل ہے۔ دیگر کردار اسی کے گرد گھومتے نظر آتے ہیں۔ ناول کے فکری اور تخلیقی تناظر سے ان سبھی کرداروں کی براہ راست وابستگیاں نظر آتی ہیں۔ بقیہ جو کردار ہیں وہ ان کرداروں کے Offshoots ہیں جن کا تعلق جبر واستحصال سے ہے۔ عرض یہ کرنا ہے کہ ناول کے فکری دھارے سے جُڑے سبھی کردار حاشیائی کردار ہیں جو اتفاق سے دلت سماج سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی سماجی، تعلیمی اور اقتصادی سطح حد درجہ پست ہے۔ لیکن غور کرنے کی بات یہ ہے کہ زندگی اور سماج کے حوالے سے ان کی اپنی بھی کچھ ترجیحات ہیں، کچھ ذمے داریاں ہیں۔ بہت بہتر سماجی زندگی کے خواب تو یہ نہیں دیکھ رہے تھے۔ لیکن کم از کم اتنا تو ضرور ہو کہ عزت وآبرو کے ساتھ اپنا اور بال بچوں کا پیٹ بھر جائے۔ اور سماجی تحفظ بھی فراہم ہو جائے! فکر وسوچ کی یہ خود رَو سوجھ بوجھ بے اطمینانی اور بے چینی سے پاک معاشرے کی تشکیل کا اشاریہ ہے۔ لیکن ان کی یہ سوچ بھی ساہوکاروں، منافع خوروں اور مختلف قسم کے اقتصادی دلالوں کی نذر ہو جاتی ہے۔ جبر واستحصال کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اس المیہ کو ملاحظہ فرمائیے:

کوئلہ کاٹنے والے ملکٹوں کا یہی مقدر رہتا ہے۔ دن بھر کی محنت ومشقت کے بعد ان کی ہتھیلیوں پر چند ٹھیکرے رکھ دیئے جاتے ہیں۔ ان چند کھنکھناتے سکوں سے وہ پیٹ کی آگ بجھاتے ہیں اور اپنی بے انتہا تکان کو دور کرنے کی خاطر مہوا سے بنے شراب کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔ اور پھر لڑکھڑاتے ڈگمگاتے قدم سے اپنی اپنی کھولیوں (جسے کولیری کی زبان میں دھوڑا کہا جاتا ہے) میں جا کر رات کے جھوٹے خوابوں کی دنیا میں گم ہو جاتے ہیں۔ اس ناول میں استحصال کئی سطحوں پر نظر آتا ہے۔ کولیری کے مالکوں کی سطح پر، یونین کے لیڈروں کی سطح پر،

اور انتظامیہ کی سطح پر! زمین اگلتی ہے کالا سونا اور مزدوروں کے حصے میں چند ٹھیکرے آتے ہیں۔ یا یوں کہیے کہ مالکوں کے لیے کالا نا سونا اور مزدوروں کے لئے کالا پتھر۔ ذرا تصور کیجئے کہ زمین کے اندر دُور بہت دُور اندھیری سرنگ انھیں ہڑپ لیتی ہے اور جب شام کو باہر نکلتے ہیں تو ادھ مری سسکتی، بلکتی زندگی رات کے جھوٹے خوابوں کی دنیا میں بسیرا کر لیتی ہے۔ اور پھر اس کو بیچ بنانے کی خاطر دوسری صبح گلے سے لگا لیتی ہے۔ اس عزم و حوصلے کے ساتھ کہ خورشید کا سامان سفر پھر تازہ ہوگا! لیکن یہ سفر کتنا کربناک اور المناک ہوتا ہے اس کا اندازہ آپ خود ہی لگا سکتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ کولیری کے کام جوکھم بھرے ہوتے ہیں اور مزدور اس سے آگاہ بھی رہتے ہیں۔ لیکن اس کے بدلے ان پر دولت کی بارش ہو یہ تمنا کبھی نہیں رہتی ہے۔ البتہ اتنے پیسوں کی تو ضرور خواہش رہتی ہے کہ Minimum Life level بحال ہو جائے۔ لیکن جبر و استحصال کا شکنجہ ایسا کسار ہتا ہے کہ کم سے کم خواہش بھی پھڑ پھڑاتی رہتی ہے۔ اس ناول کا تخلیقی دھارا حاشیے کی جانب بہتا نظر آتا ہے اور اس کے کردار بھی سماجی زندگی کے حاشیے پر ہی کھڑے نظر آتے ہیں۔ اس ناول کو بھی ادب کی سماجیات کے تناظر میں ہی دیکھا جانا چاہیے۔

قرۃ العین حیدر کا افسانہ ''حسب نسب'' حاشیائی کرداروں کے عزم و ارادے کے حوالے سے ایک عمدہ تخلیقی نمونہ ہے۔ چھمی بیگم اس افسانے کی مرکزی کردار ہے۔ جس کے عزم و ارادے اور حوصلے دیکھنے کے لائق ہیں۔ چھمی بیگم اعلیٰ نسب تھیں اور اپنی اعلیٰ نسبی پر نازاں بھی تھیں۔ ماں باپ خالص اصل نسل، روہیلے پٹھان۔ دادا پردادا ہفت ہزاری نہ سہی ایک ہزاری، دو ہزاری۔ چنانچہ زندگی جب پُر کیف و پُر نشاط تھی، اُس وقت تو وہ اپنی اعلیٰ نسبی پر شاداں و فرحاں تھیں ہی، لیکن جب زندگی خزاں رسیدہ ہوگئی اور ہواؤں کے تیز و تند جھکڑ چلنے لگے تو بھی اپنے حسب و نسب کے استحفاظ کی خاطر اپنے انا پسند وجود کا سودا نہ کیا۔ چھمی بیگم کی اس انا پسندی میں ان کا جذبہ خود شناسی حد درجہ فعال و متحرک نظر آتا ہے۔

قصہ یوں ہے کہ چھمی بیگم کے ابا اور اجو بھائی کے ابا ایک ساتھ رہتے تھے۔ چھمی بی کے پیدا ہوتے ہی، اجو بھائی سے منگنی ہوگئی۔ جب چھمی بیگم سولہ سال کی ہوئیں تو شادی کی تاریخ مقرر ہوگئی۔ دونوں طرف دھوم دھام سے تیاریاں ہونے لگیں کہ اچانک موت نے اس سکھی اور خوش حال گھرانے کی بساط الٹ دی۔ ہیضے کی وبا پھیلی اور چھمی بیگم کے اماں اور ابا دونوں چٹ پٹ! چھمی بیگم پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ لیکن غم کی اس گھڑی میں دلاسا کے لیے یہ تسلی کم نہ تھی کہ اجو بھائی سے بیاہ ہو جانے کے بعد اکیلی زندگی پُر رونق اور پُر بہار ہو ہی جائے گی۔ تھوڑے دنوں کے لیے شادی کی تاریخ ملتوی ہوگئی کہ اچانک بڑے ابا (اجو بھائی کے والد) کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ بڑے ابا کے مرتے ہی اجو بھائی یہ کہہ کر لکھنؤ چلے گئے کہ چند مقدموں کے معاملات کے نپٹارے کرنے ہیں۔ یہیں سے چھمی بیگم کی Marginalisation کی کہانی شروع ہوتی ہے۔

چھمی بیگم کی اس حاشیائی کہانی میں ان کی اعلیٰ نسبی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اب یہ دیکھئے کہ اجو بھائی لکھنؤ گئے تو وہیں کے ہو رہے۔ نہ آنے کی طرح طرح کی بہانے بازیوں سے کام لیتے رہے۔ اسی بیچ اجو بھائی کی

اماں پر بھی دل کا دورہ پڑا اور وہ بھی چل بسیں۔ چمی بیگم کی تن تنہا خزاں رسیدہ زندگی ہی اس افسانے کا وہ بنیادی فکری مرکز ومحور ہے جس میں الیوں کی فنکارانہ رنگ آمیزی محسوسات کو جھنجھوڑتی نظر آتی ہے۔ چمی بیگم انیس سال کی ہو چکی تھیں۔ اپنے غم والم کے کلبۂ احزاں میں بیٹھی روتی رہتیں: ''جبھی سے چمی بیگم تاریک غسل خانے کے کونے میں میلے کپڑوں کے ڈھیر پر بیٹھ کر چپکے چپکے رونے لگیں۔''

چمی بیگم کی زندگی کی یہ حاشیائی صورت حال، زمیندارانہ ذہنیت کی دین تھی، جس میں استحصال کی جھلک واضح طور پر دکھائی پڑتی ہے۔ لیکن چمی بیگم کی رگوں میں روہیلے پٹھان کا لہو دوڑ رہا تھا۔ اپنی خود اعتمادی، خودداری اور اعلیٰ نسبی کی پاسداری کو وہ اپنے سینے سے چمٹائے رہیں۔ اس افسانے میں ایک عورت کے چٹان جیسے عزم وحوصلے دیکھنے کے لائق ہیں۔ پورے افسانے کے بین السطور میں چمی بیگم کے اس عزم وحوصلے کی گونج واضح طور پر سنائی پڑتی ہے۔ بخوف طوالت تفصیل سے گریز کرتے ہوئے صرف یہ بتاتا چلوں کہ ابو بھائی نے لکھنؤ میں کلو طوائف سے نکاح کر کے خاندان کا حسب نسب ملیامیٹ کر دیا۔ خاندانی جاہ وحشمت کے حوالے سے چمی بیگم کے یہ احساسات افسانے میں ایک پُر وقار تخلیقی اور فکری منظر نامہ مرتب کرتے نظر آتے ہیں۔ حالانکہ اس میں چمی بیگم کی حق تلفی کے نتیجے میں ان کے مجروح ہوتے جذبات کی عکاسی بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس بیچ ہوا یہ کہ ابو بھائی دلّی گئے اور فساد میں وہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ چمی بیگم کی جاہ وحشمت تو جا ہی چکی تھی۔ ویران اور عسرت بھری زندگی کو سہارا دینے والا کوئی نہ تھا۔ دو وقت کی روٹی کے لالے پڑ گئے۔ بڑھاپے کی دہلیز پر قدم بھی رکھ چکی تھیں۔ اب چمی بیگم کا غصہ سرد پڑ چکا تھا۔ جوش وخروش، طنطنے اور جلال میں کمی آ گئی تھی۔ غم گساروں کے سمجھانے بجھانے پر کہ اس تنگ دستی اور تنہائی میں کب تک بسر کرو گی۔ دلّی چلی جاؤ۔ صبیح الدین صاحب کے پاس عزت کے ساتھ بڑھاپا کٹ جائے گا۔

چمی بیگم کی صورت میں اس حاشیائی کردار کے پیش نظر صرف دو باتیں تھیں۔ غربت وافلاس کے باوجود وقار وتمکنت بحال رہے اور عزت وآبرو کے ساتھ دو وقت کی روٹی میسّر ہو جائے۔ چنانچہ چمی بیگم دلّی چلی گئیں اور بیگم صبیح الدین کے ہاں ان کے بچوں کی دینی تعلیم پر مامور ہو گئیں۔ اس روز سے چمی بیگم بنت جمعہ خاں زمیندار شاہجہاں پور، مغلانی جی بن گئیں۔ پورے وقار وتمکنت کے ساتھ'' چمی بیگم نے بیگم صبیح الدین کے ہاں بارہ سال گزار دیئے۔ اس دوران بچے سب بڑے ہو گئے اور اپنے اپنے ٹھکانوں کی جانب رواں دواں ہو گئے۔ بیگم صبیح الدین کو چمی بیگم کی ضرورت نہ رہی۔ لیکن اللہ بڑا کارساز ہے۔ کوئی نہ کوئی راستہ نکال ہی دیتا ہے۔ چنانچہ بیگم صاحبہ نے جاتے جاتے چمی بیگم کو اپنی دوست بیگم راشد علی کے ہاں رکھوا دیا۔ چمی بیگم یہاں ہاؤس کیپر بن گئیں اور ساتھ ہی مغلانی جی بھی کہلاتی رہیں۔ کیونکہ غربت وافلاس کے باوجود چمی بیگم کو اپنی توقیر کا زبردست احساس تھا۔ چمی بیگم زندگی کے حاشیے پر کھڑی تھیں۔ لیکن وقار وتمکنت کے دامن کو پکڑی نظر آتی ہیں۔ پانچ برس چمی بیگم نے راشد علی صاحب کے گھر میں کاٹ دیئے۔ جب راشد صاحب کا تبادلہ ہندوستانی سفارت خانے واشنگٹن

میں ہونے لگا تو بیگم راشد علی کو " ممی بیگم کی فکر لاحق ہوگئی۔ لیکن اس پالنہار کی ڈیوڑھی سے کوئی مایوس تو لوٹتا نہیں۔" ممی بیگم کے رزق کا انتظام بمبئی کی ایک الٹرا ماڈرن خاتون مسز رضیہ بانو کے ہاں ہوگیا۔ یہ " ممی بیگم کی زندگی کا تیسرا اور آخری پڑاؤ تھا۔ کیونکہ اب وہ پیرانہ سالی کی دہلیز پر قدم رکھ چکی تھیں۔ لیکن عزم وارادے اب بھی توانا تھے۔ خودداری اسی طرح تھی، جیسی زندگی کے ابتدائی ایام میں۔ میرا خیال ہے کہ فکر وسوچ کی یہ پختگی، افسانہ نگار قرۃ العین کی توانا تخلیقی فکر کا اشاریہ ہے۔ خیر قصہ کوتاہ یہ کہ " ممی بیگم جیسے تیسے بمبئی مسز رضیہ بانو کی جدید ترین سہولتوں سے مزین و آراستہ فلیٹ پر پہنچ گئیں۔ اب یہ دیکھئے کہ مسز رضیہ بانو، " ممی بیگم سے کس طرح مخاطب ہوتی ہیں!!" آجاؤ بُوا، بیٹھو" اس انداز تخاطب کا Repercussion " ممی بیگم پر کس انداز سے ہوا، اس سلسلے میں ذیل کا یہ فکر انگیز مکالمہ ملاحظہ فرمائیے: "جب سے " ممی بیگم برقع سر پر ڈال کر حق حلال کی روزی کمانے باپ دادا کی دہلیز سے باہر نکلی تھیں آج تک انہیں کسی نے بُوا نہیں کہا تھا۔ "اب تک " ممی بیگم مغلانی جی کہلاتی رہیں۔ لفظ "بُوا" سے " ممی بیگم کی خوددار طبیعت تلملا اٹھی۔ یہ ان کی اعلیٰ نسبی پر ایک چوٹ تھی۔ لیکن چونکہ " ممی بیگم اب معاملہ فہم ہوچکی تھیں۔ ان میں بُردباری بھی پیدا ہوچکی تھی۔ ایسے میں ان چھوٹی موٹی نزاکتوں سے اپنی بنی بنائی زندگی کو وہ کیونکر تباہ کرتیں۔ حالات سے سمجھوتہ کرنے کا ہنر وہ سیکھ چکی تھیں، چنانچہ "بُوا" ہوتے ہوئے بھی " ممی بیگم کے وقار پر کوئی آنچ نہیں آئی "پاک پروردگار نے ان کے باپ دادا کی لاج، ان کے حسب نسب کی عزت رکھ لی اور ایک بار پھر ایک شریف گھرانے کی حق حلال کی کمائی میں ان کا حصہ بھی لگا دیا" آخر میں " ممی بیگم کے کردار کے اس توانا پہلو کی جانب آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں جہاں وہ فتو بھائی کی بے وفائی پر واویلا مچاتی نظر نہیں آتی ہیں۔ اور نہ ہی احتجاج کرتی ہیں۔ بلکہ اپنی زندگی کو سنوارنے اور سجانے میں لگ جاتی ہیں کہ یہی ایک صحت مند معاشرے کی تشکیل کی صورت ہے۔ یہ افسانہ نگار قرۃ العین کی Intelligent اور Intellectual تخلیقی سوچ کا مظہر ہے۔ پورے افسانے میں قرۃ العین کی وہی محبوب و مخصوص Aristorcratic اور بورژوائی تخلیقی ذہنیت کی گونج صاف طور پر سنائی پڑتی ہے۔ اب رہی بات یہ کہ قرۃ العین کے نزدیک " ممی بیگم ایک حاشیائی کردار تھیں یا نہیں؟ یہ تو کہنا مشکل ہے۔ لیکن خاکسار نے موضوع سخن کے پیش نظر اپنے مطالعے ومشاہدے کی روشنی میں " ممی بیگم کو ایک حاشیائی کردار کی صورت میں Traceout کرنے کی بساط بھر کوشش کی ہے۔ ڈیمائی سائز میں مطبوعہ ۱۸ صفحات پر مشتمل اس افسانے کی یہ مختصر سی تجزیاتی روداد ہماری سماجی زندگی کے حاشیے پر کھڑی ایک عورت کی داستان درد والم ہے جو اپنے بامعنی تانیثی وجود کے جواز کو بھی پیش کرتی ہے۔ یہ افسانہ بھی ادب کی سماجیات سے ہی تعلق رکھتا ہے۔ اردو فکشن کے یہ آفت رسیدہ حاشیائی کردار ظہیر دہلوی کے اس شعر کے بہترین ترجمان ہیں۔

مژگانِ یار ہوں یا رگِ تاکِ بُریدہ ہوں
جو کچھ کہ ہوں سو ہوں غرض آفت رسیدہ ہوں

☆☆☆

'یرقان': چاہت اور ناکامی کا المیہ

● آفتاب احمد آفاقی

کرشن چندر کا شمار ان ترقی پسند تخلیق کاروں میں ہوتا ہے جو ایک زبردست خلاق ذہن کے مالک اور فنی سطح پر مختلف النوع ابعاد کے حامل ہیں۔ وہ اپنے معاصرین میں اس لحاظ سے بھی اختصاص رکھتے ہیں کہ انھوں نے تکنیک اور ہیئت کے تجربے بھی کیے اور متعدد نثری اصناف میں طبع آزمائی بھی کی۔ علاوہ ازیں انھوں نے مختلف ادبی رجحان اور رویے کا گہرا مطالعہ بھی کیا اور روایتی طرز تحریر سے قطع نظر تبدیلی کو اپنا شیوہ بنایا۔ تبدیلی کا یہ رویہ ان کے فن میں بدیہی طور پر نظر آتا ہے، بلکہ اسی تبدیلی اور بدلاؤ کا اطلاق وہ سماجی سطح پر کرنے کے خواہش مند نظر آتے ہیں۔ ترقی پسند ادبی نظریے کی طرف توجہ اصلاً اسی مقصد کے حصول کا ثمرہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ وہ فرسودہ اور روایتی اقداری نظام کے مقابلے ایک ایسے معاشرے کی تعمیر و تشکیل کے موید نظر آتے ہیں جو استحصال اور نابرابری سے عاری اور بشریت کا حامل ہو۔

یوں تو کرشن چندر کے افسانوں کا اصل موضوع سماجی اور طبقاتی کشمکش ہے لیکن انھوں نے انسانی اقدار اور رشتوں کو جس خوبصورتی سے پیش کیا ہے وہ انھی کا خاصہ ہے۔ قومی تحریک اور قومی یکجہتی، آزادی اور جمہوریت دراصل انسانی سماج، آزادیِ رائے اور فلاح و بہبود کے لیے ضروری ہیں۔ کرشن چندر کی تخلیقات میں یہ اقدار پوری طرح مترشح ہوئی ہیں۔ بہ الفاظ دیگر کرشن چندر ادب کو سماج، جماعت یا افراد کی تعمیر کا ایک موثر ذریعہ تسلیم کرتے ہیں اور انسانیت کے فروغ اور ظلم و جبر کے خاتمے کا آلہ گردانتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ اپنے عہد اور معاصر تخلیق کاروں مثلاً سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری اور مجنوں گورکھپوری کی رومانیت سے بے خبر تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ دوسرے ادیبوں کی طرح کرشن چندر کا فن بھی ارتقائی مرحلے سے گزرا ہے۔ ان کے ابتدائی دور کے افسانوں پر رومان کی ایک دبیز تہہ دکھائی دیتی ہے اور فطرت اور حسن پرستی ان کے فکر و خیال کا محبوب موضوع اور مرکز رہا ہے۔ البتہ بعد کو ان میں ایک خوش گوار تبدیلی در آئی ہے اور ان کی طبیعت رومان پروری کے پہلو بہ پہلو سماجی حقیقت نگاری کی طرف متوجہ ہوئی ہے۔

یہ امر ملحوظ خاطر رہے کہ رومانوی تحریک کے زیر اثر ایک نیا رجحان وجود میں آیا جہاں روایت پرست زندگی اور دنیا کے بکھیڑوں سے نجات کی گونج سنائی دیتی ہے۔ زندگی سے فرار اختیار کرنے اور خیالی دنیا میں گم ہو کر سکون کی تلاش کا عمل نیا نہیں ہے۔ اردو کا داستانوی ادب صحیح معنوں میں غم غلط کرنے کا ایک اہم ذریعہ قرار دیا جاسکتا ہے جہاں خیالی دنیا میں چند لمحوں کے لیے ہی سہی

سکون میسر آتی ہے اور دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر تخیل کے سمندر میں غوطہ زن رہنا ہوتا ہے۔ لیکن رومانی تحریروں کی روایت، ہماری داستانوی کہانیوں سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ رومانی تحریک زیادہ منظم اور بااثر تھی۔ رومانی تخلیق کاروں نے حسن کی رنگینی، سحر آفرینی، تخیلی و تصوراتی اور آزاد دنیا کی بڑی فنکاری سے سیر کرائی۔ فطرت کے نظارے اور اس کے اسرار و رموز بتائے۔ اس رومانی رجحان نے اپنے عہد اور بعد کے ادیبوں پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ اردو افسانہ نگاروں نے اپنی نگارشات میں عمومی طور پر حسن و عشق کے چرچے اور تخیلی و تصوراتی دنیا تو بسائی لیکن اپنی و طبعی عمر اور بدلتے وقت کے ساتھ اس روش کو ترک کر کے زندگی کے اصل روپ پر ہی اکتفا کرنے لگے۔ البتہ معدودے چند قلم کاروں نے شروع سے آخر تک اس رنگ کو برقرار رکھا۔ کرشن چندر اصلاً انھی تخلیق کاروں میں سے ایک ہیں جن کا افسانوی اسلوب کبھی کسی ایک رجحان یا زندگی کی حقیقتوں سے فرار کا قائل نہیں رہا۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے تمام افسانے زندگی کی مکمل داستانیں ہیں۔ ان میں عام زندگیوں کی کربناکیاں اور تلخیاں بھی ہیں اور حسن و شباب کی سرمستیاں بھی۔ لہٰذا کرشن چندر کی رومانیت کو کسی مخصوص عہد کا زائیدہ قرار دینے کے بجائے ان کی نگارشات کو پورے دور کے تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ابتدائی دور کے افسانوں میں یہ رجحان غالب ہے۔ آگے چل کر وہ فیض کی طرح رومان و حقیقت کی آمیزش سے اپنے افسانوں کا خمیر تیار کرتے ہیں۔ جس کا اعتراف بجا طور پر علی حیدر ملک نے کیا ہے۔ چناں چہ وہ لکھتے ہیں:

''فیض کی طرح کرشن چندر کے فن میں بھی حقیقتوں کا سلسلہ رومانوں میں جا ملتا ہے اور رومانوں کا سلسلہ حقیقتوں سے اور ایسا اس لیے ہے کہ انھیں حسن سے بھی لگاؤ ہے اور زندگی بھی عزیز ہے۔ زندگی خود ایک حقیقت ہے اور رومانی دوسری حقیقت۔ کرشن چندر ان بظاہر دو مختلف بلکہ متضاد حقیقتوں کو ایک وحدت کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔''

متذکرہ خصوصیات کی روشنی میں کرشن چندر کا افسانہ ''یرقان'' کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے ابتدائی دور کے اس افسانے میں تخیل، جذباتی شدت، معصومیت، فطرت کی سادگی اور پرکاری، وجدانی تاثر اور خوابوں اور احساس جمال کی فراوانی جیسے وہ بنیادی عناصر، جو رومانیت کے اہم اجزا ہیں، بدرجہ اتم موجود ہیں۔

کہانی کا عنوان ''یرقان'' کے پس پردہ کرشن چندر کے خلاقانہ ذہن کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ جس کے وسیلے سے پروان چڑھنے والی یک طرفہ محبت، اس کی نزاکتیں، اس کی کربناکی اور پیچیدگی کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ محبت خوابوں خیالوں میں ہی پروان چڑھتی ہے اور آخر دم تک پائے تکمیل تک نہیں پہنچتی۔ چاہت اور پانے کی حسرت کے درمیان رقابت کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوتا ہے جس میں عاشق کی تمنائیں دم توڑ دیتی ہیں اور ''یرقان'' کے مریض کی طرح یہ محبت محض تخیلی ٹھہرتی ہے۔ ہر شئے زرد ہی زرد نظر آتی ہے جب کہ حقیقت کچھ اور ہوتی ہے۔

واضح رہے کہ ''یرقان'' ایک ایسی بیماری ہے جس میں آنکھ اور بدن زرد ہو جاتا ہے، جسم لاغر و نحیف، سستی اور کمزوری، ذہن اور اعصاب کو مضمحل کرتے ہیں۔ لیکن کرشن چندر کا کمال یہ ہے کہ اس جان لیوا بیماری کے وسیلے سے حسن اور رومان کی ایک سبیل تلاش کر لیتے ہیں۔ یہاں کرشن چندر نے ''یرقان'' کی جو کیفیت بیان کی ہے وہ قابل توجہ ہے:

''جس طرح ساون کے اندھے کو ہر طرف سبزہ ہی دکھائی دیتا ہے اسی طرح ''یرقان'' میں آدمی کو ہر طرف زردی ہی

زردی نظر آتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کسی غیبی ہاتھ میں کل کائنات پر زعفران انڈیل دیا ہو اور بس۔ اس کے مرض کا ایک وجہ ہے، زندگی کی ایک منزل ہے۔ جہاں سب دوئی مٹ جاتی ہے اور مجھا یسا شریف گنوار نروان حاصل کرلیتا ہے۔''

متذکرہ اقتباس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ افسانے کے عنوان کا تعین محض اتفاقیہ نہیں بلکہ تخلیق کار نے شعوری طور پر اسے اپنی کہانی کا عنوان بنایا ہے۔ ہر چند کہ یہ ایک بیماری ہے اور اس کے مضر اثرات مسلم ہیں لیکن کرشن چندر نے اسی کے سہارے اپنی رومانی آرزوؤں اور بل کھاتی تمناؤں کو پروان چڑھانے کی سعی کی ہے۔ کرشن چندر کے جملہ تخلیقی نگارشات میں حسن و فطرت کا حسین امتزاج انھیں دوسرے ادیبوں پر تفوق عطا کرتا ہے۔ واضح رہے کہ کرشن چندر کے مزاج میں بے پناہ رومانیت اور حسن سے تعلق کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ ان کا بچپن زیادہ تر کشمیر کی وادی میں گزرا، برف پوشی اور مرغزاروں کے درمیان ان کے ذہن و فکر پروان چڑھے یہی وجہ ہے کہ فطرت کی جمال آرائیوں کے ساتھ وہ اپنی تخلیقی نگارشات پیش کرتے ہیں۔ ''یرقان'' میں'' ہر طرف زردی ہی زردی''، جب کہ اس مرض میں دوئی مٹ جاتی ہے اور تخلیق کار نروان حاصل کر لیتا ہے، جیسے بلیغ جملے اس بات کے گواہ ہیں کہ اس مہلک بیماری میں بھی اپنے تخیل کی بلندی اور قوت مشاہدہ کی بدولت کائنات کا حسن تلاش کر لیتے ہیں۔ نیز زعفرانی اور زرد رنگوں کے وسیلے سے ایک ایسی دنیا خلق کرتے ہیں جس میں شادابی ہے، امنگیں ہیں، جوش و ولولہ ہے اور دل میں اٹھتی ہوئی ترنگیں ہیں اور نقش دوئی کو مٹانے کا جذبہ کارفرما ہے۔ افسانہ نگار ''یرقان'' کو بیماری نہیں بلکہ ڈاکٹروں کا ایک مفروضہ قرار دیتا ہے۔ اس لیے کہ اسی بیماری کے طفیل میں اس کی یک طرفہ محبت پروان چڑھتی ہے۔ شاما جو بے حد حسین و خوبصورت ہے، وہ اپنے خاوند سے بے پناہ محبت کرتی ہے، جو چکوال میں اینٹوں کے ایک بھٹے پر ملازم ہے۔ کرشن چندر کے الفاظ میں وہ:

''بیس روپے تنخواہ پاتا ہے اور بھٹے پر کام کرنے والے مزدوروں کی حاضری لگاتا ہے۔ اور کبھی کبھی حسین بیوی کو خط لکھ دیتا ہے جس میں اکثر سیف الملوک شاہ بہرام اور حسن بانو کے پاکیزہ اشعار درج ہوتے ہیں۔ شاما وہ خط اکثر مجھ سے پڑھوایا کرتی ہے۔ اس وقت اس کا چہرہ شرم سے لال ہو جاتا ہے، بچاری ان پڑھ ہے نا۔ اور جب میں سیف الملوک ملوک الکلام کی تشریح اپنے مخصوص یرقانی انداز میں کرتا ہوں تو کسی قدر گھبرا جاتی ہے، لجاتی ہے اور پیاری معلوم ہوتی ہے۔ گل عارض پر چمک اور آنکھوں میں دمک آجاتی ہے۔ لب کانپتے ہیں اور پھر مجھے یکا یک اس کی مہین شیریں آواز سنائی دیتی ہے۔''

یہاں کرشن چندر نے داستانی کرداروں کے وسیلے سے نادر تشبیہات و استعارات کا استعمال کر کے قاری کو ایک طلسمی دنیا کی سیر کرائی ہے، جہاں تجسس ہے، تخیل اور استعجاب ہے، عشق و عاشقی کی متحیر داستان ہے اور نہ پوری ہونے والی تمنائیں ہیں۔ سیف الملوک شاہ بہرام اور حسن بانو کے قصے سے ہماری کلاسیکی منظوم و نثری داستانیں بھری پڑی ہیں۔ یہ کردار ایک طرف حسن اور عشق کی داستان خلق کرتے ہیں تو دوسری طرف ہماری قدیم تاریخی و تہذیبی روایت کی علامت بھی ہیں۔ ان میں گل و بلبل کے ہزار رنگ اور اشجار اور آبشاروں کے محاکاتی مناظر بھی ہیں، سحر انگیز و دلفریب نظارے بھی، خواب زار ماحول، مست ہوائیں، مہکتے پھول، چہکتے ہوئے پنچھی کے پس منظر کے ساتھ دو حسین اور جوان دلوں کی دھڑکنیں ان علامتوں میں پوشیدہ ہیں۔

اس کہانی میں ایک شدید قسم کی جذباتیت اور رومان پرستی نظر آتی ہے۔ جو شیلے رس بھرے تخیل کی رنگینی اور رعنائی نے ایک ایسی طلسمی فضا پیدا کی ہے جس میں بے قراری اور بے چینی ہے، خلش وحسرت ہے۔ وہ فطرت کے سہارے جنس و رومان کے رازہائے سربستہ کو مترشح کرتے ہیں بالکل انوکھے اور البیلے انداز میں۔ جدت وندرت کی ایسی مثالیں شاذ و نادر ہی ملیں گی۔ وہ ریشم کے کیڑوں کے ذریعے معاشقہ کی مثالیں دیتے ہیں اور کبھی عورت کی فطرت کے دورخے پن کی تشریح وتعبیر پیش کرتے ہیں۔ کرشن چندر کی رومانیت زندگی سے فرار کی بجائے اس سے محبت کا ہنر سکھاتی ہے۔ ان کے نزدیک انسانی زندگی بیک وقت رنج وغم اور عیش ونشاط کی یکجائی کا مجموعہ ہے۔ چنانچہ ان کی نظر زندگی کے ان دونوں پہلوؤں پر رہتی ہے اور اسے پوری سچائی و بے باکی کے ساتھ پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ کرشن چندر کے نزدیک حسن و عشق کا جذبہ ایک فطری عمل ہے جو محض انسان ہی نہیں بلکہ ایک حقیر کیڑے میں بھی یہ جبلی قوت موجود ہے۔ تاہم ایک حقیر کیڑے کے معاشقے اور اس کی نوعیت کو تخلیقی جامہ پہنانا ایک مشکل فن ہے۔ کرشن چندر نے اپنی فنی چابکدستی اور گہرے مشاہدے کی بدولت ریشم کے کیڑے، جو سفید اور زردی مائل ہوتے ہیں اور جو اپنے کویوں سے نکل کر نہ کچھ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں اور محض سات روز زندہ رہتے ہیں، کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ قاری اس قلیل مدتی جاندار کی جبلت اور حیاتِ معاشقہ سے بخوبی واقف ہو جاتا ہے۔ یہ اقتباس دیکھیے:

''میں ان ریشم کے کیڑوں سے کھیل رہا تھا ان میں چار نر تھے اور ایک مادہ بڑے بڑے زرد پروں والی جو خاموش بیٹھی نر کیڑوں کی طرف دزدیدہ نگاہوں سے تک رہی تھی۔ وہ کسے پسند کرے گی، کس پر اس کی نظر انتخاب پڑے گی۔ وہ کون خوش نصیب ہوگا جو اس سیمیں تن حسینہ کا محبوب ہوگا۔ آپ سچ جانیے مقابلہ واقعی سخت تھا نر کیڑے دیوانہ وار بھنوروں کی طرح اس کی طرف اُڑ اُڑ کر چلے جاتے تھے۔ وہ پروانوں کی طرح شمع کے گرد طواف کرتے تھے۔ کبھی وہ آپس میں گتھ جاتے۔ اس طرح کے مجھے ان میں سے کسی ایک کی ہلاکت کا شبہ ہو جاتا پھر بھی جلدی سے انھیں الگ الگ کر دیتا وہ کچھ دیر چپ بیٹھے رہتے۔ بالکل خاموش، بے حس وحرکت مگر جلد ہی وہ حسین مجسمہ انھیں اپنی طرف مائل کر لیتا۔ کبھی دوسرا اُڑ کر مادہ کے پاس جاتا اور اپنے منھ کو اس کے منھ کے قریب لا کر نہایت چرب زبانی سے اپنے عشق کا اظہار کرتا۔ وہ کافر ادا کبھی مسکراتی اور کبھی بے اعتنائی سے منھ موڑ کر پرے ہو جاتی۔ نر بیچارہ اپنا سا منھ لے کر رہ جاتا۔''

کرشن چندر نے نر اور مادہ کیڑوں کی فطرت کی جو منظر کشی کی ہے وہ حقیقتاً انسانی عادات اور اس کے حرکات و سکنات کا ہی روپ ہیں۔ یہاں ''کافر ادا کبھی مسکراتی اور کبھی بے اعتنائی سے منھ موڑ کر پرے ہو جاتی۔ نر بیچارہ اپنا سا منھ لے کر رہ جاتا'' نہایت معنی خیز جملہ ہے۔ جو معشوق یا محبوب کی فطرت کا اشاریہ ہے۔ اس کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

''ایک ہی نظر سے یہ گھاو بھی پیدا کرتی ہے اور اس پر پھاہا بھی رکھ دیتی ہے۔ دل تڑپا دیتی ہے اور تسکین بھی پہنچاتی ہے ستم بھی اس کو پھبتا ہے، کرم بھی اس کے شایان ہے۔''

اصل بات یہ ہے کہ کرشن چندر نے اس افسانے کے ابتدائی حصے میں مختلف تشبیہوں کے وسیلے سے شاما سے

اپنی والہانہ اور بے پناہ لگاؤ اور اس کی بے اعتنائی پر گہرا طنز کیا ہے۔ یرقان میں جو دو چیزیں انھیں مرغوب تھیں وہ ایک خوبانی اور دوسری شاما اور جب دونوں چیزیں اکٹھی مل جائیں تو ایک عاشق کی کیفیت دیدنی ہو جاتی ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے

''کچھ دیر ہم دونوں صم بکم بیٹھے رہے۔ میں نہ جانتا تھا کہ مجھے کیا کہنا چاہیے۔ دل میں جذبات کا طوفان امڈ رہا تھا۔ اپنے غم اور ان غصے کا مظاہرہ کرنا چاہتا تھا۔ مگر یکا یک زبان گنگ ہو گئی، دل میں شکایتوں کا ہجوم تھا۔ مگر لب جیسے کسی نے سی دیے تھے، دل میں بے چینی کا طوفان تھا مگر آنکھیں اس کے چہرے کو دیکھ کر مسرور ہو گئیں۔''

کرشن چندر تصور کو موضوع میں تبدیل کرنے پر قادر ہیں، یہی موضوع اسلوب کو جنم دیتا ہے۔ ایک بڑے رومانی افسانہ نگار کے یہاں رومانیت کی شناخت موضوع اور اسلوب دونوں کی یکجائی سے قائم ہوتی ہے۔ واقعہ رومانی فکر کے سانچے میں ڈھلتا چلا جاتا ہے اور کردار اپنی جذباتی کیفیتوں اور اپنے داخلی ہیجانات سے پہچانے جاتے ہیں:

''تم کس قدر خوبصورت ہو شاما... میری آنکھوں اور تمہارے حسن کے درمیان ایک زرد پردہ حائل ہے۔ مگر پھر بھی تم مجھے بہت حسین نظر آتی ہو، اگر یہ پردہ سامنے سے ہٹ جائے تو پھر کیا یہ تابناک حسن میری آنکھوں کو خیرہ نہ کر دے گی۔ اور تمہاری آنکھیں کس قدر روشن ہیں صاف اور پاکیزہ نیلوفر کی طرح کھلی ہوئیں۔''

کرشن چندر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ رومان اور قدرت کے ملے جلے رنگوں سے اپنی کہانی کا پلاٹ تیار کرتے ہیں۔ وہ جسمانی حسن، اس کے خال وخط کا ہی نقشہ نہیں کھینچتے بلکہ اس بے کراں کائنات کے ہر منظر کو اپنے فن میں سمو لیتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر ان کا رومان فطرت سے ہم آہنگ ہو کر ابدی اور لافانی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ افسانہ 'یرقان' میں فطری جذبات اور قدرت کے ملے جلے رنگوں سے تیار کیا ہوا ایک منظر ملاحظہ ہو، رومان کا اتنا حری اور طاقتور تصور شاید ہی کسی ادیب کے یہاں موجود ہوگا:

''ساون برسات کا مہینہ ہے، ساون میں جھولے پڑتے ہیں۔ شاعر اور ندی نالے طغیانی پر آجاتے ہیں دل میں امنگیں اٹھتی ہیں۔ شاید خون کچا ہوتا ہے، جوش مارتا ہے۔ میں نے بھی اپنی کوٹھری چھوڑ دی اور باغ میں آرہا۔ سرول کے ایک گھنے چھتنارے کے نیچے میرا بستر تھا اس کے نزدیک ہی ایک چنار پر میری چھوٹی بہن نے ایک جھولا ڈلوا دیا تھا۔ قصبہ بھر کی لڑکیاں دوشیزائیں اور نویلی بہوئیں ہمارے یہاں جھولا جھولنے آتی تھیں۔ بڑا دلکش منظر ہوتا تھا۔ جب شاما پینگ بڑھاتی تو میرا دل بلبلوں اچھلنے لگتا اور جب وہ پینگ بڑھاتے بڑھاتے دور اور چنار کی ٹہنیوں کے سبز پتوں میں ایک لمحے کے لئے گم ہو جاتی تو میرا دل اچک کر گلے میں آرہتا۔''

اس افسانے میں رومان کا ایک دوسرا پہلو اس وقت نظر آتا ہے جب سیدھا سادا نوکر رالی، شاما کے لئے گیہوں پسانے جاتا ہے اور مسلا دھار بارش اور اٹھان پر آتی ندی کو عبور کر کے تا دیر رات اس لئے واپس آتا ہے کہ کہیں شاما ''بھوکی رہے گی'' ایک عاشق پر جو کچھ گزری اسے ملاحظہ کیجیے:

''جواب سن کر بھونچکا رہ گیا۔ اس کے بعد یہ بینگن کے پودے میں انگور کے خوشے کیسے، تلخ لہجے میں اس سے پوچھا ''اور اگر تم ندی میں غرق ہو جاتے تو.....'' رالی تھوڑی دیر چپ رہا، پھر ہکلانے لگا ''میرا

کیا ہے بابو جی یہ زندگی ک...ک... کسی کے کام آجاتی، میں اپنے آپ کو بھاگوان سمجھتا۔'' ''اب شمع زرد پڑ چکی تھی۔ زرد اور بالکل ساکن، صرف ایک پروانہ اس کے گرد گھوم رہا تھا، میں غنودگی سے لبریز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا پروانہ...شمع...رالی۔''

یہ جوش رقابت بھی رومان کا ایک حصہ ہے۔ عشق بہ ذات خود ایک بغاوت ہے اور رقیب بغاوت کی دوسری شکل۔ رومان، حسن و عشق کی واردات کا خیالی اظہار محض نہیں ہے بلکہ یہ بقول احتشام حسین:

''اور بات سے بغاوت نئی دنیا کی، خوابوں اور خیالوں سے محبت۔ ان دیکھے حسن کی جستجو، وفور تخیل، وفور جذبات، رومانیت میں ڈوبی ہوئی انفرادیت۔ آزادی خیال، حسن سے تا بہ مقدور لطف اٹھانے میں ناآسودگی کا احساس اور کرب۔''

احساس کرب میں اس وقت مزید اضافہ ہوتا ہے جب کرشن چندر کو یہ اطلاع بہم پہنچتی ہے کہ رالی نے لگاتار بارش سے منہدم ہو گئے مندر سے شاما کو بڑی جواں مردی سے بچانے میں کامیاب ہو گیا۔ مندر کی گرتی ہوئی دیواریں اور ٹھاٹھیں مارتے ہوئے پانی کے ریلوں سے شاما کو بچانے میں رالی بری طرح زخمی ہو گیا تھا۔ ایک رقیب کے ذریعے معشوق پر جان نچھاور کرنے کا عمل عاشق پر شاق گزرنے کا ایک ایسا لمحہ ہے جہاں ہر آن عاشق کی آرزوؤں اور تمناؤں کا خون ہوتا ہے اس پر متضاد یہ کہ شاما اپنے خاوند کے ہمراہ چکوال چلی گئی۔ اس کیفیت کو تخلیق کار نے کس طرح جذباتی انداز میں پیش کیا ہے:

''اور وہ چلی گئی۔ چپ چاپ، خاموش سر جھکائے ہوئے مجرم کی طرح۔ کائنات کا ہر ذرہ بے مصرف ہے اور انسان کی ہر کوشش بے سود۔'' ''یہ انسان کتنا حقیر ہے اور یہ دنیا اس سے بھی حقیر تر۔ عقدہ لاینحل کیا ہے؟ اور کس لئے؟ اور پھر اگر تمام زندگی کو یوں مٹھی میں بند کر کے چر مر کر دیا جائے اس طرح کہ اس کے ریزے ریزے ہو کر بکھر جائیں اور کوئی ان کی ہوا تک نہیں پا سکے۔ تو پھر... تو پھر کیا ہو.. کس لئے؟ کیوں کر؟ دل میں ہزار خیال تھے بے سود، سب بے سود۔''

محبت کی ناکامی مایوسی اور افسردگی کے ساتھ افسانے کا اختتام ایک عام قاری کے نزدیک بھلے ہی روایتی انداز میں ہو۔ لیکن کرشن چندر کے تخلیقی وفور نے ان کے نثری اسلوب کو جس طرح رومانی بنا دیا ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ یوں تو افسانہ یکطرفہ عشق کی کہانی محض ہے لیکن رومان اور قدرت کے رنگوں کی یکجائی سے جو تحریر ابھری ہے اس میں بڑی توانائی اور حرکت ہے اور مسحور کرنے والا اسلوب۔ ایک ایسا اسلوب جو فطرت، جذبہ اور شعور کی پختگی سے وجود میں آتا ہے اور جس میں غنائیت کی ساری قوتیں موجود ہوتی ہیں۔ بقول علی سردار جعفری: ''کرشن چندر کی نثر پر مجھے رشک آتا ہے۔ وہ بے ایمان شاعر سے افسانہ نگار کا روپ دھار کے آتا ہے بڑی بڑی محفلوں اور مشاعروں میں ہم سب ترقی پسند شاعروں کو شرمندہ کر کے چلا جاتا ہے۔ وہ اپنے ایک ایک جملے اور فقرے پہ غزل کے اشعار کی طرح داد لیتا ہے اور میں دل ہی دل میں خوش ہوتا ہوں کہ اچھا ہوا اس ظالم کو مصرع موزوں کرنے کا سلیقہ نہ آیا۔ ورنہ کسی شاعر کو پنپنے نہ دیتا۔''

☆☆☆

ترقی پسندی، جدیدیت اور کرشن چندر

● رحمٰن عبّاس

Good intentions have been the ruin of the
world, The only poeple who have achieved anything have
been those who have had no intentions at all.
Oscar Wilde

کرشن چندر کا شمار ہمارے بڑے فکشن نگاروں میں ہوتا ہے، جن کی تخلیقات زندگی اور اس کے مسائل سے براہ راست سروکار رکھتی ہیں۔ کرشن چندر نے افسانہ، ناول، طنز و مزاح، ڈرامے، رپورتاژ اور فلم اسکرپٹ بھی لکھی ہے لیکن ان کی شناخت بحیثیت افسانہ نگار قائم ہے۔ کرشن چندر کے افسانوں اور ناولوں میں عموماً جو باتیں سامنے آتی ہیں ان میں فطرت کی بے پناہ وسعت، انسان دوستی، عشق کی رعنائیاں، حسن اور فطرت کے درمیان موجود کرشماتی ہم آہنگی، طبقاتی کشمکش اور آدمی کے اطراف کی زندگی اور اس زندگی کو تبدیل کرنے کی خواہش ہے۔ کرشن چندر امیر اور غریب کے افتراق اور آویزش کو انسانی جمالیات کے بجائے مارکسی اور اشتراکی اخلاقیات کے فریم میں پیش کرتے ہیں۔ کرشن چندر کی نثر ان کی ایک بڑی خوبی ہے۔ اس خوبی میں البتہ ایک خرابی یہ ہے کہ شعریت کی حد درجہ مٹھاس حقیقت نگاری کے جسم میں سرایت کر کے کئی مقامات پر تخلیق کو ذیابیطس میں بدل دیتی ہے۔ ذیابیطس کیسے کیسے قوی اور صحت مند لوگوں کو اندر سے چاٹ کر کھوکھلا کر دیتی ہے۔ یہی حال شعریت کی حد درجہ مٹھاس کا ہے جو تخلیق کو نان آرٹ میں بدل دیتی ہے۔

دوسری طرف انسان دوستی، طبقاتی کشمکش اور اطراف کی زندگی کو بدلنے کی خواہش ایک سراب ہے، جو آرٹ کے لیے اکثر خطرناک ہوتا ہے اس لیے نئی صدی میں جب ہم مڑ کر دیکھتے ہیں تو کرشن چندر کا آدرش واد ایک ادھورا اور ٹوٹا ہوا خواب دکھائی دیتا ہے۔ اپنی شکستگی کے باوجود کرشن کے دیکھے ہوئے خواب ان نابینا اور سماعت سے محروم بہروپیوں کی قلابازیوں سے بہتر ہیں جو خواب کی محرومی کے سبب ادب کو بیماریاں پھینکنے کی کچرا پیٹی [Dustbin] سمجھتے ہیں۔ کرشن

چندر کی فن کاری میں بہت ساری کمیاں ہیں اس کے باوجود ان کی تخلیقی دنیا میں حسن اور جادوگری کا ایک نگار خانہ ہے۔ محمد حسن عسکری نے کرشن چندر کی کہانی 'زندگی کے موڑ پر' کی تعریف جن الفاظ میں کی ہے ایسی تحسین گذشتہ صدی میں منٹو کے علاوہ شاید ہی کسی دوسرے فن کار کی محمد حسن عسکری نے کی ہوگی۔ عسکری نے لکھا ہے کہ 'زندگی کے موڑ پر' کا سا عظیم الشان خاتمہ آج تک کسی اردو افسانے کو نصیب نہیں ہوا۔ گوپی چند نارنگ نے کرشن چندر پر ایک مختصر نوٹ لکھا ہے، جس میں کرشن چندر کی افسانہ نگاری کو انھوں نے 'ایک سمندر' کہا ہے۔ وارث علوی نے کرشن چندر پر ایک طویل، سخت، مدلل اور کرشن چندر کی فن کاری کی گراوٹ اور بلندی پر ادبی مباحث کا دروازہ وا کرنے والا مضمون لکھا ہے، جس کے ابتدائی الفاظ ہیں: 'میں کرشن چندر کا مداح بھی ہوں اور نکتہ چیں بھی'۔ (کرشن چندر کی افسانہ نگاری: وارث علوی) گوپی چند نارنگ نے اپنے مختصر نوٹ میں کرشن چندر کی فن کاری کے اہم عناصر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: 'ان کی شعری زبان کی حلاوت اور جذباتیت، ان کی رومان پسندی، فطرت پرستی، انسان دوستی اور بہتر سماج کی آرزومندی ایسے عناصر ہیں جو مل جل کر ایسی کائنات کی تخلیق کرتے ہیں جس کا بہت سا حصہ اگرچہ وقت کی چھلنی سے چھن کر کالعدم قرار پائے گا، لیکن کچھ حصہ ایسا پھر بھی باقی رہے گا جو زندگی کے حسن اور جذبے کی آنچ، آرزومندی اور تخلیقیت کی تابکاری کی وجہ سے کھرا قرار پائے گا'۔ (کرشن چندر اور ان کے افسانے: گوپی چند نارنگ)۔ دوسری طرف وارث علوی نے اپنے مضمون میں کرشن چندر کی افسانہ نگاری پر ترقی پسند نقادوں کی تنقید پر تنقید کی ہے۔ کرشن چندر کی حقیقت پرستی، انسان دوستی، ادبی و نظریاتی انسلاکات، ظرافت کی غیر ادبیت اور نثر کی فنی کوتاہیوں پر بہت سخت گرفت کی ہے ساتھ ہی ساتھ کرشن چندر کے ان چند کامیاب افسانوں کی خوبیوں کو بھی پیش کیا ہے، جو وقت کی چھلنی سے گزر کر ادب کی معیاری روایت کا حصہ بن چکے ہیں۔ وارث علوی کا مضمون کرشن چندر اور ترقی پسند فکر پر ایک شدید شب خون ہے لیکن تین دہائیوں بعد بھی کوئی ایسا ترقی پسند نقاد سامنے نہیں آیا جس نے وارث علوی کے مضمون میں اٹھائے گیے سوالات کا مدلل، فنی اور ادبی تاریخ کے آئینے میں جواب دیا ہو۔ کرشن چندر سے محبت کے باوجود میں وارث علوی کے کرشن چندر پر اعتراضات کو حق بجانب سمجھتا ہوں۔ خود وارث علوی کا مضمون ان کی کرشن چندر سے عقیدت اور محبت کا مظہر بھی ہے۔ اس سخت گیر مضمون کے اختتامی پیراگرفس میں وارث علوی لکھتے ہیں: 'کرشن چندر اردو کے بڑے افسانہ نگار ہیں۔ ان کی تمام کمزوریوں کے باوجود ان کا نام ہمیشہ منٹو، بیدی، عصمت، عزیز احمد اور غلام عباس کے ساتھ لیا جائے گا۔ وہ دوئم درجے کے لکھنے والے نہیں ہیں۔ اول درجے کے لکھنے والے ہیں گو ان کی تمام تخلیقات اول درجے کی نہیں ہیں'۔ (ایضاً)

☆☆

اردو فکشن کے تین اہم ناقدین محمد حسن عسکری، وارث علوی اور گوپی چند نارنگ کے مذکورہ بیانات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کرشن چندر کی اچھی تحریروں کو کسی نظریاتی بیساکھی کی ضرورت نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ بہت ساری فنی کوتاہیوں اور خامیوں کے باوجود کرشن چندر اردو فکشن کے صفِ اول کے قلم کار ہیں۔ وقت کی سفاک چھلنی اور ادبی معیار کے بے رحم پل صراط پر سے گزرنے کے بعد کرشن چندر کے پاس کم از کم درجن بھر افسانے ایسے ہیں جو اب میں اپنی آب و تاب قائم رکھتے ہیں۔ 'زندگی کے موڑ پر'، 'بالکونی'، 'کالو بھنگی'، 'دو فرلانگ لمبی سڑک'، 'شہتوت کا درخت'، 'مہالکشمی کا پل'، 'ان داتا'، 'دوپٹی'، 'شہزادہ'، 'تائی ایسری'، 'گرجن کی

ایک شام، بھوت، غیرہ ایسے افسانے ہیں جو اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ ترقی پسند تحریک پر ہزار اعتراضات کیے جا سکتے ہیں اس کے باوجود جتنا اچھا اور زیادہ فکشن اس عہد میں لکھا گیا اس کے مقابلے میں عشر عشیر بھی فکشن بھی معترضین نہیں لکھ سکے۔ کرشن چندر کے پاس درجن بھر عمدہ افسانے ہیں جبکہ جدیدیت کی پوری تحریک کے پاس کل کتنے افسانے ہیں کسی کو ٹھیک سے معلوم نہیں، کچھ لوگ چند افسانوں کا نام لے سکتے ہیں لیکن ان افسانوں سے اردو معاشرہ بے بہرہ ہے۔ یہ افسانے اردو معاشرے میں قبولیت حاصل نہیں کر سکے اور ادب کا پل صراط وقت، قاری اور ادب سے جڑے سنجیدہ اذہان (ان میں ناقدین کا بھی شمار ہوتا ہے) کی اکثریت طے کرتی ہے۔ آج کرشن چندر اردو پڑھنے والوں کے دلوں میں دھڑکتے ہیں۔ فکشن لکھنے والے بھی خود کو کرشن چندر سے مربوط محسوس کرتے ہیں۔ فنی کوتاہیوں پر بے لاگ تنقید کے باوجود کرشن چندر کی تخلیقیت کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ جدیدیت کے نام پر آڑی ترچھی لکیروں میں ذات کا درد رقم کرنے کے دعوے دار افسانہ نگاران دونوں سطحوں پر محروم ہیں چنانچہ جدیدیت کے سرکردہ نقادوں کو پیرو مرشد قرار دیتے ہیں کہ اس طرح ان نقادوں کی تھوڑی بہت نظرِ عنایت نصیب ہو جائے۔

کسی بھی زبان میں ادب وہی زندہ رہتا ہے جو لوگوں کے لیے قابل قبول ہو۔ پروپیگنڈہ ادب کو زندہ نہیں رکھ سکتا۔ ترقی پسند تحریک کی تاریخ بھی اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ جن تحریروں کو پروپیگیٹ کیا گیا اب صفحۂ ہستی سے مٹ گئی ہیں۔ وہ تنقید بھی بے معنی ہو چکی ہے جو نظریات کا لوبان پھونک کر نعرے بازی اور خطابت کو دوام دینا چاہتی تھی۔ کم و بیش یہی بات جدیدیت کے نقادوں کے پروموشنل اور کمرشیل مضامین پر صادق آتی ہے۔ جدیدیت نواز علامتی نقادوں نے جن ناولوں اور افسانوں کو خالص فن کہہ کر اردو قارئین پر لادنا چاہا تھا معاشرے نے انھیں رد کر دیا ہے۔ اس ضمن میں مجھے وارث علوی کی ایک بات یاد آتی ہے کہ قاری کے اعصاب زندہ ہوتے ہیں اور جھوٹ نہیں بولتے۔ تنقید جھوٹ بولتی ہے کیونکہ تنقید نظریاتی اور گروہی پاسداریوں کے تحت یا اپنی عالمانہ نخوت اور بلند جبینی کی نمائش کی خاطر پرفریب بیانات دینے کے ہتھکنڈوں سے واقف ہوتی ہے۔ (جدید افسانہ اور اس کے مسائل، وارث علوی)۔ اردو جدیدیت نے ترقی پسندوں کی کمزوریوں پر بہت کہرام مچایا لیکن ترقی پسندوں کی خوش گمانیوں سے سبق حاصل نہیں کیا۔

☆☆

کرشن چندر نے مختلف اصناف میں لکھا، تکنیک اور اسلوب میں متعدد تجربات کیے۔ ممکن ہے بیشتر تجربات ناکام ہوں کیونکہ ان تجربات کے پس منظر میں مقصدیت کے مختلف شیڈس حاوی ہیں۔ اشتراکیت اور انقلاب کی خواہش ہے۔ غیر فنی حقیقت پرستی اور آدرش واد ہے جو آرٹ کو بری طرح سے متاثر کرتا ہے۔ کرشن چندر کی فن کاری پر سب سے بڑا الزام بھی مقصدیت ہے۔ (جسے وارث علوی نے منصوبہ بند اور آئیڈیولوجی کے تحت لکھی گئی تحریریں کہا ہے)۔ یہ بھی سچ ہے کہ ترقی پسند تحریک کی اساس مارکسزم اور سماجی کمٹ منٹ پر تھی۔ شمیم حنفی کے مطابق 'مارکسزم اشتراکی حقیقت نگاری کی بنیاد ہے۔ اور اشتراکی حقیقت نگاری بین الاقوامی سطح پر ادب میں ترقی پسند تحریک کا سرچشمہ فیض۔' (جدیدیت کی فلسفیانہ اساس: شمیم حنفی) جبکہ جدیدیت خود کو سیاسی اور سماجی سروکار سے ماورا انسان کے باطن کے تجربات اور انسان کی روح کی کیفیات کا دفتر تصور کرتی تھی۔ جدیدیت کے بارے میں وارث علوی کی رائے یوں ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد صورت حال کچھ ایسی پیدا ہوئی تھی کہ جدید فنکار خود کو ایک عظیم تہذیبی روایت،

ایک بڑے تمدن، ایک معتبر آئیڈیولوجی، اور فلسفۂ حیات کا وارث سمجھنے کا اہل نہیں رہا تھا۔(کمٹ منٹ: وارث علوی)
شمیم حنفی نے اسی خیال کو اپنے طور پر یوں بیان کیا ہے کہ 'واقعہ یہ ہے کہ ادب کسی سیاسی نظریے سے کلیتہً ہم آہنگ ہونے کے بعد نہ صرف یہ کہ اپنے منصب سے دور ہو جاتا ہے، اس کی اپیل کی بنیادیں بھی فنی اور تخلیقی نہیں رہ جاتیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے ترجمانوں کو اس خوف سے کبھی بھی آزادی نہیں مل سکی کہ سیاست سے ادب کا بے حجاب انسلاک انہیں ادب کے دائرے سے الگ کردے گا۔' (جدیدیت کی فلسفیانہ اساس: شمیم حنفی)۔ شمیم حنفی اور وارث علوی کے یہ بیانات مختصراً ترقی پسندی اور جدیدیت کی اساس کی طرف اشارہ ہیں۔ یہ مکالمہ بہت دلچسپ ہے۔ اس کے باوجود مقصدیت کی تعریف ہمارے یہاں غیر تسلی بخش اور کمٹ منٹ کی بحث ادھوری ہے۔ کیا صرف ترقی پسند خیالات، سماج کو بدلنے کی خواہش، غریبوں اور مظلوموں کی جدوجہد کی طرف داری، انسان دوستی مقصدیت ہے، جو آئیڈیالوجی کی پیداوار ہے؟ اگر مقصدیت کی تعریف صرف ترقی پسندی تک محدود ہے تو اس ادھوری تعریف کو رد کر دینا چاہیے۔ نئی صدی کے فن کار کو خود سے یہ پوچھنا چاہیے کہ ادب میں کمٹ منٹ کیا ہے اور مقصدیت کیا ہے؟ جہاں مارکسزم، اشتراکیت اور آئیڈیولوجی مقصدیت کو جنم دیتی ہے وہیں دوسری طرف تخلیق کو منصوبہ بند طریقے پر مبہم، علامتی، غیر سماجی اور چیستان بنانا بھی ایک قسم کی مقصدیت ہے۔ اشتراکیت کے سبب پیدا ہونے والی مقصدیت سے ادب کو جتنا نقصان ہوا ہے اسی طرح منصوبہ بند جدیدیت کے سبب بھی ادب کو نقصان ہوا لیکن علامت پرست نقاد آڑی ترچھی لکیروں کو بانس پر چڑھا کر ان تحریروں کو خالص ادب قرار دیتے رہے۔ ایسے نقادوں کی خام خیالی کو وارث علوی نے جس سخت لہجے میں تنقید کا نشانہ بنایا وہ اسی کی مستحق لگتی ہے۔ وارث علوی لکھتے ہیں 'علامتی نقادوں کی حالت ضبط تولید کے ان رضا کاروں کی سی ہوگئی ہے جو دفتر کے اندراجات پر کرنے کے لیے لنجے لنگڑے بوڑھے بھکاریوں تک کو خصی کر ڈالتے ہیں۔' (افسانہ نگار اور قاری: وارث علوی)

کرشن چندر کی مقصدیت پر معترضوں سے دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا مقصدیت بذاتِ خود عیب ہے؟ اگر ہے تو پھر تاریخی پس منظر میں افسانہ اور ناول لکھنا یا بیماری اور موت کے بیان سے افسانے یا ناول کو سرکاری اسپتال کے کینسر وارڈ میں بدلنا بھی مقصدیت ہے اور عیب ہے۔ اس مقصدیت کو کس بنا پر آپ نے 'خالص ادب' تصور کیا؟ مقصدیت کی دوہری تعریف نہیں ہو سکتی۔ ہر طرح کی منصوبہ بندی ادب میں عیب ہے۔ نظریاتی وابستگی کے سبب ان کی حمایت تھوڑی دیر کے لیے کی جا سکتی ہے لیکن اردو قاری کو مستقل بے وقوف نہیں بنایا جا سکتا۔ جس طرح ترقی پسند ادب میں خارجیت، نعرے بازی اور خطابت مقصدیت ہے اسی میزان پر جدیدیت کے ماتحت لکھے گئے ادب میں غیر فطری داخلیت، فرضی یاسیت، منصوبہ بند فراریت، غیر فنی ابہام، تاریخ پرستی اور علامتوں کا گورکھ دھندہ بھی مقصدیت ہے۔

☆☆
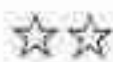
ادب میں نظریہ مقصد کی پیداوار ہے۔ ایک نظریہ دوسرے نظریے کو کالعدم قرار دیتے ہوئے اس کے مقاصد کو ہدف بناتا ہے۔ گذشتہ ساٹھ ستر سال ادبی مباحث کی سطح پر اردو میں ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کی کشمکش کے سال قرار

دیئے جاسکتے ہیں۔ اس آویزش میں ادب کا نقصان زیادہ ہوا اور ہمارے پڑھے لکھے نقادوں کی صلاحیتیں بھی کسی حد تک ضائع ہوئیں۔ کرشن چندر، غلام عباس، عصمت چغتائی، احمد علی، عزیز احمد اور تیر مسعود جیسے بڑے فن کاروں پر توجہ کم دی گئی جبکہ دوسرے درجے کے لکھنے والے اچھے اور اہم فن کاروں کو پوری طرح سے نظر انداز کیا گیا۔ نظریاتی مباحث سے مفر نہیں لیکن فن کاروں کو نظر انداز کرنے کی قیمت پر نظریاتی مباحث عالمانہ نخوت کے علاوہ کچھ نہیں۔ دوسری طرف ترقی پسندی اور جدیدیت کی معرکہ آرائی کے دوران فکری مباحث اور فکر کی سطح پر مثبت اجتہادات بھی کم دکھائی دیتے ہیں جبکہ اپنی ادبی ترجیحات کو بلند ادبی آدرش اور دوسروں کی ادبی ترجیحات کو غیر ادبی ہتھکنڈا ثابت کرنے کی بڑی غیر صحت مند کوشش ہوئی ہے۔ اس رویے کا بھی منفی اثر فن کاروں اور فن پر ہوا۔ کرشن چندر بھی اس منفی رویے کا شکار ہوئے۔ ترقی پسندوں کے پاس ایک نظریہ (مارکسزم) اور ایک 'مثالی ریاست' USSR تھی۔ 'مثالی ریاست' جب طاقت کے نشے میں چور ہوئی اور مارکسزم کو پھیلانے کے لیے فوج کا استعمال کرنے لگی تو اس کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکنے کے لیے امریکی ہتھیار اور ڈالر کام میں لائے گئے۔ پاکستانی فوج کی جہادی فیکٹری کو مارکسزم کو شکست دینے کے لیے استعمال کیا گیا۔ جہاد مغربی استعماریت کا ایک ہتھیار بن گیا اور جہادیوں نے 'مثالی ریاست' کی فوج کو ایسا روندا کے پھر مثالی ریاست کبھی ابھر نہیں پائی۔ بالآخر USSR، 26 دسمبر 1991 کو ٹوٹ پھوٹ کر پاش پاش ہوگیا۔ دوسری طرف اردو جدیدیت کے پاس بھی ایک ادبی نکتہ نظر اور ایک سرخیل نقاد تھا۔ نظریہ مذہب کی طرح ہوتا ہے اس کی تعبیر سماج، انسان اور ذہنی منظرنامے کے ساتھ ساتھ تہذیبی، علمی، اور فکری پس منظر کی محتاج ہوتی ہے۔ تہذیب، تاریخ، سماج، سیاست اور سماج میں افکار کی تاریخ اور فطری ارتقاء بھی ایک اہم شئے ہے۔ ان سب کو ایک طرف رکھ کر مغرب کے ایک، بہت ہی چھوٹے سے ادبی اسکول کے اسلوب کی تقلید اور پیروی نے اردو جدیدیت کو گھیٹو Ghetto میں بدل دیا۔ اپنے گھیٹو کی فنی گراوٹ پر تنقید کرنے کے بجائے جدیدیت کے پیش امام مارکسی ریاست کے انہدام پر دوران بیانِ تفسیرِ لایعنیت مسکراتے اور معتقدین اس مسکراہٹ کو الہامی اشارہ سمجھتے۔ نتیجتاً مزید مبہم اور بے معنی افسانے اردو میں معرض وجود میں آئے۔ افسوس، ہم نے ان برسوں یہ بھی نہیں دیکھا کہ ملک میں ہندی، مراٹھی، بنگالی اور انگریزی میں اسی عرصے میں کس طرح کا ادب تخلیق ہو رہا ہے۔ جس طرح قدر لایعنیت اور ہئیت پر ہمارے یہاں صلاحیتیں صرف ہوئیں کسی دوسری ہندوستانی زبان میں شاید ایسا نہیں ہوا۔ فن کی سطح پر یک رخی اور محدود تنقید نے اردو جدیدیت کو ایک نیم ادبی رجحان میں بدل دیا۔ بالآخر جدیدیت کو بڑا دھچکا بیسویں صدی کی آخری دہائی میں کسی اور نے نہیں بلکہ خود جدیدیت کے سرخیل نے پلاٹ، کردار اور ایک مخصوص ماحول کو بیان کرنے والے افسانے لکھ کر پہنچایا۔ معتقدین پکار اٹھے: ان عناصر کو تو فن افسانہ نگاری سے منہا کرنے کا حکم صادر ہو چکا تھا۔ پیش امام مسکرائے۔ انھیں مسکراتے ہوئے دیکھ کر کسی نے زیر لب پیش امام کا ایک سابقہ فرمان دوہرایا: 'ہر نسل کو اپنا نقاد خود پیدا کرنا چاہئے'۔ اکیسویں صدی میں اردو جدیدیت کی سماجی حقیقت پسندی کی طرف یہ مراجعت (مانا کہ اس میں بیان کیا گیا سماج دو سو سال پرانا ہے اور بائیں بازو سے وابستہ کچھ ادیب اس ماضی پرستی کو غیر تحریری طور پر دائیں بازو کی فکر کا نتیجہ قرار دے رہے ہیں۔ حالانکہ ابھی اس بات سے اتفاق آسان نہیں۔) دراصل پریم چند، کرشن چندر، بیدی اور منٹو کی افسانوی روایت کا ایک طرح سے اعتراف کرنا ہے۔

اکیسویں صدی کے اردو قاری اور ادیب کے لیے ترقی پسند تحریک اور جدیدیت دونوں بیسویں صدی کی تلخ و شیریں یادیں ہیں۔ ترقی پسند تحریک نے جتنا اردو فکشن کو متاثر کیا ہماری ادبی تاریخ میں اس کی دوسری مثال نہیں ملتی۔ اس تحریک کے اثرات کرشن چندر، عصمت چغتائی، غلام عباس، خواجہ احمد عباس کے ساتھ ساتھ کسی حد تک سعادت حسن منٹو اور راجندر سنگھ بیدی پر بھی پڑے۔ کرشن چندر کو فکشن میں ترقی پسند تحریک کی نمائندہ آواز بھی کہا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف جدیدیت نے جتنا نقصان اردو فکشن کو پہنچایا اس کی مثال بھی ہماری ادبی تاریخ میں دوسری نہیں ہے۔ حالانکہ یہ کہنا ناانصافی ہوگی کہ اپنی ساری منفیت کے باوجود اس تحریک کے ماتحت چند قابل مطالعہ تحریریں بھی وجود میں آئی ہیں۔ جدیدیت کے پاس کوئی عمدہ ناول نہیں ہے، البتہ خراب ناولوں کے دو تین نمونے ہیں جنھیں کئی بار سر خیل نقاد نے ململ اور کم خواب میں لپیٹ کر ادب کے قارئین کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی لیکن اردو معاشرے نے ہئیت کے سروگیٹ Sarogate تجربے کو ادب کا فطری تجربہ ماننے سے انکار کیا ہے۔ سر خیل نقاد نے جب بھی قارئین کو ردعمل کرتے ہوئے دیکھا۔ انھوں نے ترسیل کے المیے کی بحث میں امان تلاش کیا اور یہ کہا :لوگ علامت، اشاروں اور کنایوں کو سمجھنے کی قدرتی صلاحیت سے محروم ہیں کیونکہ یہ عام لوگ ہیں۔ ادب ایک مخصوص طبقے (طبقۂ اشرافیہ) کے ظرف کی تسکین اور فہم کے لیے معرضِ وجود میں آنے والا 'ظروف' ہے۔ اس پس منظر کے سبب نئی صدی میں ہمیں ترقی پسندی اور جدیدیت کا مطالعہ غیر جانبداری سے کرنا ہوگا۔ وقت سب سے کھرا میزان ہے۔ ادب میں غیر ادب کو فنا ہوتے ہوئے وقت نہیں لگتا۔ ترقی پسند تحریک کے عہد کی خارجیت، نعرے بازی، پروپیگنڈا بہت جلد یادداشت سے محو ہو گیا ہے بالکل اسی طرح جدیدیت کی تشہیر کردہ منفیت، منصوبہ بند غم زدگی اور غیر حقیقی یاسیت بھی بہت جلد غائب ہو جائے گی۔ ان تحریکوں کی ناکامی اور ان کے محاسن پر گفتگو لازمی ہے۔ اکیسویں صدی میں نئے اذہان کو ترقی پسند تحریک اور اردو جدیدیت کے دوران لکھے گئے ادب اور تنقید کا معروضی طور پر احتساب کرنا ہوگا۔ اسی دوران یہ بات بھی نظر آئے گی کہ کرشن چندر کی بے جا تعریف ترقی پسند نقادوں نے کی جبکہ جدیدیت کے نظریات کو پروموٹ کرنے والے اہم نقادوں نے کرشن چندر کے نام پر بڑی کافرانہ سرد مہری کا مظاہرہ کیا۔ کرشن کو نظر انداز کرنا آسان نہیں۔ کرشن چندر کی فن کاری میں مقصدیت، خطابت اور مارکسی پروپیگنڈا ہے۔ مانا کہ ان عناصر نے ان کی تخلیقیت کو نقصان پہنچایا۔ مانا کہ خطابت، مقصدیت اور نظریے کی تبلیغ فن کا عیب ہے لیکن جدیدیت سے وابستہ نقادوں نے فن کاری کی ان چند کمزوریوں کو جواز بنا کر جس طرح سے کرشن چندر کو نظر انداز کیا وہ بے حد افسوس ناک ہے۔ اکیسویں صدی کے اردو ناقدین اور قارئین کو کرشن چندر کی بازیافت کرنا ہوگی۔ غیر جانبداری سے کرشن چندر کے اسالیب، افسانوں کی تکنیک، تجربات اور موضوعات کی پیش کش کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ کرشن چندر پر سخت سے سخت تنقید ہو سکتی ہے لیکن کرشن چندر کی فن کاری کو پھلانگ کر اردو فکشن پر مکالمہ ناممکن ہے۔

☆☆☆

خواجہ احمد عبّاس کے منتخب افسانے: ایک مطالعہ

● پروفیسر صغیر افراہیم

"انگارے" کی اشاعت (نومبر ۱۹۳۲ء) اور پھر اُس کے ضبط کیے جانے (مارچ ۱۹۳۳ء) کے بعد اردو افسانہ نے برق رفتاری کے ساتھ تشکیلی اور تعمیری دور کو عبور کیا ہے۔ رومانی افسانہ نگار جن کا اسلوب بیان افسانے کے قاری کو وقتی مسرت و انبساط میں مبتلا کیے ہوئے تھا، وہ کھلی آنکھوں سے مسائل کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ اصلاحی مکتبِ فکر کے افسانہ نگاروں نے بھی اپنا مبلغانہ اندازِ تخاطب بدلا تھا، جو فن کار اس تیز رو سفر میں طرزِ کہن اور نئے اندازکی آویزش کے شکار ہوئے وہ خود بخود افسانے کے قافلے سے دُور ہوتے گئے یا پھر انھوں نے آہستہ آہستہ کسی دوسری صنفِ ادب میں طبع آزمائی شروع کردی۔ بزرگوں میں پریم چند نے افسانے کو خوب سے خوب تر بناتے ہوئے ۱۹۳۵ء میں "کفن" خلق کیا (اشاعت جامعہ دہلی، دسمبر ۱۹۳۵ء) جس نے اردو افسانے کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت اختیار کرلی۔ نوجوان افسانہ نگاروں میں خواجہ احمد عباس نے اُسی سال افسانہ "ابابیل" لکھا (اشاعت جامعہ دہلی، جون ۱۹۳۶ء) جو "انگارے" کے منظرِ عام پر آنے کے بعد سے اُن کے ذہن میں ترتیب پا رہا تھا۔

خواجہ احمد عباس نے ۱۹۳۳ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی۔ اے۔ اور ۱۹۳۵ء میں ایل ایل۔ بی۔ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ کیمپس میں "انگارے" کا چرچا تھا کہ اُس نے روایت سے زبردست انحراف کیا ہے۔ اتفاق کہ بزرگ و خورد (پریم چند اور خواجہ احمد عباس) دونوں نے ۱۹۳۵ء میں صنفِ افسانہ کے فکری اور فنّی مزاج کو بدل دیا۔ چونکہ اس مضمون میں محض خواجہ احمد عباس کی افسانہ نگاری کا عمومی جائزہ مقصود ہے لہٰذا میں اپنی بات کو اسی دائرے تک محدود رکھنا چاہتا ہوں۔

خواجہ احمد عباس نے اپنے نصف صدی کے ادبی سفر میں تقریباً سو سے زائد افسانے لکھے ہیں۔ پہلا "ابابیل" اور آخری افسانہ "کیپٹن ملّی" ہے۔ ہمہ جہت شخصیت اور کثیر التصانیف مصنف نے کُل کتنے افسانے لکھے ہیں، اس پر حتمی رائے دینا آسان نہیں ہے۔ دس افسانوں پر مشتمل اُن کا پہلا مجموعہ "ایک لڑکی" کے نام سے ۱۹۴۲ء میں منظرِ عام پر آیا۔ ۱۹۴۸ء میں دو مجموعے "پاؤں میں پھول" اور "زعفران کے

پھول'' کے نام سے شائع ہوئے۔ اول الذکر میں آٹھ افسانے اور کرشن چندر کا تعارف شامل ہے۔ ثانی الذکر چھ افسانوں پر محیط ہے۔ چوتھا مجموعہ ''میں کون ہوں'' کے نام سے ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا۔ اس میں دس افسانے اور ایک مضمون 'کہانی کی کہانی' کے عنوان سے شامل ہے۔ ۱۹۵۳ء میں تین طویل افسانوں کا مجموعہ ''کہتے ہیں جس کو عشق'' اور ۱۹۵۵ء میں سات افسانوں کا مجموعہ ''گیہوں اور گلاب'' کے نام سے منظر عام پر آیا۔ ۱۹۵۹ء میں ''دیا جلے ساری رات'' کے نام سے شائع ہونے والے مجموعہ میں آٹھ افسانے، مقدمہ اور کرشن چندر کا انٹرویو شامل ہے۔ سولہ افسانوں پر مشتمل ''نئی دھرتی نئے انسان'' ۱۹۷۷ء میں منظر عام پر آیا۔ ''مجھے کچھ کہنا ہے'' کے عنوان سے اس میں ایک بھرپور تحریر بھی موجود ہے۔ سات افسانوں پر مشتمل ''نیلی ساری'' ۱۹۸۲ء میں چھپا اور اُن کے انتقال سے ایک سال قبل ''سونے چاندی کے بُت'' (۱۹۸۶ء) منظر عام پر آیا۔ اس میں نو افسانوں کے علاوہ دس خاکے اور چھ مضامین تھے۔ ''پیرس کی ایک شام''، ''بیسویں صدی کے لیلیٰ مجنوں''، ''چراغ تلے''، ''اداس دیواریں''، ''اندھیرا اجالا''، ''اگر مجھ سے ملنا ہے''، ''پھول اور دوسری کہانیاں'' بھی ان کے مجموعے ہیں مگر ان میں زیادہ تر وہ افسانے شامل ہیں جو مذکورۂ بالا مجموعوں میں شائع ہو چکے تھے یا پھر عنوان بدل کر داخل ہوئے ہیں۔ گمان غالب ہے کہ ان مجموعوں کے علاوہ خواجہ احمد عباس کے اور بھی افسانے ہیں جن کی دستیابی، ترتیب و تنظیم کے بعد صحیح تعداد معلوم ہو سکے گی۔

خواجہ احمد عباس کا ادب کے خارزاروں میں قدم رکھنے کا مقصد استحصالی نظام کے خلاف مورچہ قائم کرنا اور دبے کچلے انسانوں کی حمایت کرنا تھا۔ اپنے ترقی پسند معاصرین کی طرح اُن کا بھی نقطۂ نظر یہ تھا کہ ادب زندگی کا عکاس ہے تو اسے زندگی کو اسی طرح پیش کرنا چاہیے جیسی کہ وہ ہے۔ عینیت پسندی، رومانیت یا مثالیت حقائق پر پردہ ڈال دیتی ہیں لہٰذا پسِ پشت واقعات کو اجاگر کرتے ہوئے سماجی، معاشی، سیاسی اور طبقاتی تصادم کو خواجہ احمد عباس نے بطور خاص موضوع بنایا تاکہ معاشرے سے عدم توجہی اور بے گانگی کے احساس کو ختم کرتے ہوئے اسے متحرک، فعال اور توانا بنایا جا سکے۔ اس سے نہ صرف مظلوم طبقے میں اپنی استعداد کے مطابق ترقی کی راہ پر آگے بڑھنے کا حوصلہ ملے گا بلکہ ان میں خود فہمی اور خود شناسی کا جوہر بھی جاگ سکے گا۔ اپنے اس نصب العین کا ذکر انھوں نے بعض تحریروں میں کیا ہے مثلاً ''مجھے کچھ کہنا ہے'' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

> ''...... بدلتا ہوا ہندوستان اور بدلتے ہوئے ہندوستانی میرے افسانوں کا موضوع ہیں۔ میرے ان افسانوں میں آپ کو اپنے ہم عصر ہندوستانی ملیں گے۔ نئے کسان، نئے ہریجن، نئے امیر، نئے غریب، نئی عورتیں، نئے لکھے پڑھے نوجوان، اور ساتھ میں ان سماجی قوتوں کا تجزیہ بھی ملے گا۔''

انسانوں کے بدلتے ہوئے کرداروں اور قسمتوں میں جو انقلاب برپا ہو رہا ہے اُس کے تعلق سے

وہ مزید لکھتے ہیں:

"تخلیقی ادب کے ذریعے یہ انقلابی کام جہاں دنیا کے عظیم ترین ادیب کر رہے ہیں، چھوٹے پیمانے پر میں بھی انجام دے رہا ہوں یا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں حقیقت نگاری کی روایت جو سماجی اور نفسیاتی زاویوں سے معاشرے کو دیکھ رہی تھی، ہجرت اور غریب الوطنی کے دور میں بے حد متاثر ہوتی ہے۔ جغرافیائی تبدیلی نے صرف سرحدیں قائم نہیں کیں بلکہ تمام مشترکہ روایات کے تانے بانے کو بکھیر دیا۔ خواجہ احمد عباس نے ان بکھرے ہوئے تاروں کو یکجا کرنے کی کوشش کی بلکہ انتشار کے اسباب و علل بھی تلاش کیے ہیں۔ وہ افسانوی مجموعہ "نیلی ساری" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"انسان کی ترقی کا راز ہم آہنگی میں ہے، بھائی چارے میں ہے، آپسی میل جول اور اتفاق میں ہے۔ اس لیے میں ان چیزوں کے حق میں ہوں جو ہم آہنگی اور اتحاد کو فروغ دیتی ہیں اور ان سب کے خلاف ہوں جو ان کی کاٹ کرتی ہیں۔ میں اپنی کہانیوں کے ذریعے بہتر انسان کی تخلیق کرنا چاہتا ہوں۔" (ص:۲)

"زعفران کے پھول"، "میرے بچے"، "ابابیل"، "سونے کی چوڑیاں"، "اجنتا"، "رفیق"، "بھولی"، "ٹڈی"، "انتقام"، "سردار جی" اور "بارہ گھنٹے" اُن کی بہترین کہانیاں قرار دی جاتی ہیں۔ تقسیم ہند نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ہر طرف قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا۔ ایسے پُر آشوب دور میں انسانی جان و مال کے تحفظ کے لیے ملک کا ہر صوبہ فکر مند تھا۔ خواجہ احمد عباس، کرشن چندر اور رامانند ساگر ایک تثلیث کی شکل میں خصوصاً کشمیر کے تئیں مثبت رُجحان کے لیے اپنے قلم کا سارا زور صرف کرتے ہیں۔ "اور انسان مر گیا"، "ہم وحشی ہیں"، "شکست"، "زعفران کے پھول"، "میرے بچے"، "رفیق" وغیرہ میں اس پہلو پر بھر پور توجہ دی گئی ہے۔

خواجہ احمد عباس کی فنی اعتبار سے کامیاب کہانی "زعفران کے پھول" ڈوگرہ راج کے ظلم و جبر اور دیہاتی کشمیری دوشیزہ 'زعفران' کی جدو جہد کی روداد ہے۔ مرکزی کردار زعفرانی کا خواب قرب و جوار کے لوگوں کو تعلیم یافتہ اور صحت مند دیکھنا ہے تاکہ وہ غربت اور جہالت میں بھٹک نہ سکیں یا تپ دق کا شکار ہو کر خون تھوکتے ہوئے مر نہ سکیں۔ "میرے بچے" بھی وادی کشمیر میں برپا ظلم و ستم کی کہانی ہے۔ وحشت اور بربریت میں 'زونی' کا سب کچھ ختم ہو جاتا ہے، باقی رہ جاتا ہے تو معصوم بچہ جس کے سہارے وہ مستقبل کے سہانے خواب دیکھتی ہے مگر دوسروں کو بچانے کی خاطر حبسِ دم سے وہ سہارا بھی ختم ہو جاتا ہے تاہم مصیبتوں میں گھرا ہوا قافلہ سلامتی کی سرحدوں میں داخل ہو جاتا ہے۔

"ابابیل" میں مرکزیت رحیم خان کو حاصل ہے جس کا عمل اپنے نام کے بالکل برعکس ہے۔ وہ معصوم بچوں اور بے زبان جانوروں تک کو معاف نہیں کرتا ہے۔ یہ رویہ اس کو بالکل تنہا کر دیتا ہے۔ بچوں

کے جانے کے بعد جب بیوی بھی اُسے چھوڑ کر چلی جاتی ہے تو تنہائی میں اس کا ذہن لاشعوری طور پر خود احتسابی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ کھپریل کی چھت میں ابابیل کے گھونسلے کو دیکھ کر وہ اُس پر جھپٹنا چاہتا ہے مگر گھونسلے کے اندر بیٹھے دو بچوں کی حفاظت کرتے ہوئے ابابیل کے جوڑے خصوصاً ماں کو حملہ آور دیکھ کر اپنے اندر تبدیلی محسوس کرتا ہے اور پھر تخریب تعمیر میں بدل جاتی ہے۔ چار صفحے کی اس کہانی میں مصنف رحمت کے ظلم اور اس ظلم کے اچانک ترک کرنے کا کوئی واضح سبب بیان نہیں کرتا ہے۔ عنوان کی مناسبت سے بھی کوئی حتمی رائے قائم نہیں ہونے پاتی ہے۔ دلائل و جواز کے لیے قاری اسے بیوی کے جانے کے بعد پہنچی ٹھیس سے بھی جوڑ سکتا ہے، ماورائی حقیقت سے بھی اور ابرہہ اور سورۂ فیل کے تاریخی واقعے سے بھی اور شاید یہی اس کی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ بھی ہے کہ کہانی جس تناؤ بھرے لمحہ اور مشکوک حالت میں ختم ہوتی ہے، قاری کے ذہن میں وہیں سے دوسری کہانیوں کے تانے بانے ترتیب پانے لگتے ہیں۔

مذکورہ بالا کہانی کی طرح "سونے کی چوڑیاں" بھی قلب ماہیت کی خوبصورت اور پُر اثر کہانی ہے۔ جس میں شنکر ریکا ایک منفی رویے پر قابو پا کر مثبت راہوں پر چل نکلتا ہے۔ برتاؤ اور پیش کش کے اعتبار سے یہ دونوں کہانیاں نیکی اور دردمندی پر انسان کے اعتماد کو استحکام بخشتی ہیں۔ افسانہ "اجنتا" کا منظر بمبئی کا ہولناک ہندو مسلم فساد ہے مگر پس منظر میں "اجنتا" کے پُر وقار غار کو وراثت کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ خواجہ احمد عباس اُس کے حسین نقش و نگار کا اعتراف کرتے ہوئے یہ چبھتا ہوا سوال بھی قائم کرتے ہیں کہ کاش برسوں پتھروں کو تراشنے کے بجائے انسانی رشتوں کو استوار کیا جاتا تو ارضیت کا حسن دوبالا ہوتا۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> "بہتر ہوتا کہ اتنی محنت پتھروں میں گل کاری کرنے کے بجائے انسانوں کو انسان بنانے میں صرف کی جاتی تا کہ آج وہ ایک دوسرے کا خون نہ کرتے ہوتے۔"

قتل و غارتگری اور خون خرابے پر لعن طعن کرنے والا یہ افسانہ نگار "رفیق" میں دو ایسے فوجی دوستوں کی کہانی بیان کرتا ہے جو ملک کی حفاظت کی خاطر سرحد پر آمنے سامنے کھڑے ہونے پر مجبور ہوتے ہیں اور پھر فرض کو نبھاتے ہوئے ایک دوست کے ہاتھوں دوسرا دوست مارا جاتا ہے۔ امن کے پیغام کو تقویت دینے والے اس فن پارے میں افسانہ نگار قاری کے توسط سے دریافت کرتا ہے کہ ایسی نوبت کیوں کر آئی؟ اس صورتِ حال سے کس طرح بچا جا سکتا ہے؟ اور پھر قاری بین السطور میں ان کے جوابات بھی پڑھ لیتا ہے۔ خواجہ احمد عباس کی یہی فنکاری ہے کہ وہ نصب العین کو واضح کرنے کے باوجود فن کو مجروح نہیں ہونے دیتے ہیں، بلکہ خوش فہمی کے بجائے خود فہمی پر زور دیتے ہوئے انسانی خوبیوں کو اُجاگر کرتے ہیں۔ مجموعہ "نئی دھرتی نئے انسان" میں "مجھے کچھ کہنا ہے" کے تحت لکھتے ہیں:

> "میں اپنے افسانوں میں ان کے چہرے اور کردار دکھانا چاہتا ہوں، نہ صرف اوروں کو بلکہ خود کو، انسان کو، سماج کو شیشہ دکھانا ایک انقلابی فعل ہو سکتا ہے کیونکہ —— اپنی ذات کو سمجھانا بھی بڑی سماجی اور نفسیاتی تبدیلیوں کو حرکت میں لا سکتا ہے۔" (ص: ۷)

کہانی "بھولی" یہ تاثر دینے میں کامیاب ہے کہ مجبوری اور بے بسی جب حد سے گزر جاتی ہے تو بے زبان کو

بھی قوتِ گویائی مل جاتی ہے۔ مرکزی کردار بھولی اس کی واضح مثال ہے۔ جس نے جہیز کے خلاف ایسا زبردست احتجاج کیا کہ قاری حیرت میں مبتلا ہو کر اس کا ہمنوا ہو جاتا ہے۔ قاری کے ذہن کو مائل کر لینے کا ہنر خواجہ احمد عباس خوب جانتے ہیں۔ انھوں نے "ٹڈی" میں محنت کش کسان کی ایک حسین تصویر بنائی ہے جس میں طنزِ ملیح سے خوب کام لیا گیا ہے۔ مرکزی کردار کی نظریں اپنے کھیت، آسمان اور لاجو کے گلے پر رہتی ہیں کہ اوپر والے کے کرم سے فصل اچھی ہو اور وہ لاجو کے لیے ایک ہنسلی بنوا سکے۔ جب خواب پورے ہوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں تو ٹڈیاں مصیبت بن جاتی ہیں۔ اپنے منصوبے، عزم و حوصلے سے وہ آفتِ ناگہانی سے تو بچ جاتا ہے مگر بنسی دھر اور کروڑی مل جیسے استحصالی ساہوکاروں سے کیسے مقابلہ کیا جائے؟ اس کا حل وہ تلاش نہیں کر پاتا ہے۔ شاید یہی اس کا المیہ ہے۔

"انتقام" ذہنی تناؤ سے بھری ہوئی کہانی ہے۔ مرکزی کردار ہری داس کے سامنے اس کی جوان بیٹی جانکی کو بے رحمی سے قتل کیا جاتا ہے۔ انتقاماً وہ بھی ایک مسلمان لڑکی پر حملہ آور ہوتا ہے مگر اس کے ملتجانہ چہرے کو دیکھ کر جذبۂ انتقام کو بھلا دیتا ہے۔ "سردار جی" جو بعد میں "میری موت / اور میں مر گیا" کے نام سے شائع ہوا، یہ افسانہ بھی بے حد تناؤ اور کش مکش سے بھرا ہوا ہے۔ اس کی بُنت اور پیش کش میں یہ نُدرت ہے کہ حیران کُن پیچ و خم سے گزر کر اختتام کو نہ صرف مثبت و موثر بناتا ہے بلکہ قاری کو بہت دیر تک سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ مذکورہ افسانہ کے عنوان پر کچھ لوگوں کے اختلاف کے باوجود اس کی اہمیت اور افادیت اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ ۱۹۵۰ء میں خوشونت سنگھ نے پنجاب پر لکھی گئی کہانیوں کا انتخاب انگریزی میں شائع کیا تو "سردار جی" کو سرِ فہرست رکھا۔ اس افسانہ میں نہایت ہنر مندی سے مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان پھیلائی گئی منافرت کو انسانی جذبات، احساسات اور نفسیات کے توسط سے پیش کیا گیا ہے۔

فکشن کے علاوہ اس موضوع پر اپنے اداریوں میں بھی وہ تیکھے لہجے اور بے باکانہ انداز میں لکھتے رہے ہیں۔ "اور انسان مر گیا" کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

> "یہ صحیح ہے کہ غیر ملکی حکمرانوں نے فرقہ واریت کا بیج بویا اور اُسے ہوا دی، لیکن آج مذہب کے نام پر جو بربریت، درندگی، قتل و غارت گری کا بازار گرم ہے اس کے لیے ہندوستان میں ہندو اور سکھ اور پاکستان میں مسلمان ذمہ دار ہیں۔ صرف ہندو مہا سبھا اور جن سنگھ ہی نہیں بلکہ کانگریس، مسلم لیگ، کمیونسٹ پارٹی بھی اس حیوانیت کی اتنی ہی ذمہ دار ہیں جتنے کہ فرقہ پرست عناصر کیونکہ ان جماعتوں نے سیاسی نعرے تو لگائے، سیاسی شعور پیدا نہیں کیا اور نہ اپنے کارکنوں کو ادب و تہذیب اور اونچے انسانی آدرشوں سے روشناس کرایا......"

قومی یکجہتی کے اس علمبردار افسانہ نگار نے ہر طبقے کی ناراضگی برداشت کی مثلاً "بارہ گھنٹے" پر ہندوؤں کا ایک طبقہ مشتعل ہوا، تو سرکشی پر کچھ مسلمان برہم ہوئے اور "سردار جی" پر سکھوں نے احتجاج کیا مگر خدمتِ خلق کا حامل یہ فن کار اپنی ڈگر سے ہٹا نہیں۔ اُن کے تقریباً تمام افسانے استحصال، انقلاب، مثالیت، حقیقت، جمہوریت اور انسانیت کے دائرے میں گردش کرتے ہوئے بہتر معاشرے کے فروغ کی وکالت کرتے نظر آتے ہیں تاہم آزادیٔ ہند سے قبل شائع ہونے والا افسانہ "بارہ

گھنٹے" ڈگر سے کچھ ہٹ کر ہے کہ اس میں ذہنی اور جنسی آزادی غالب نظر آتی ہے۔ آخر کیوں؟ جواز یہ مہیا کیا جا سکتا ہے ــــــ

سماجی اور اقتصادی حالات اگر عملی جدوجہد کا پیش خیمہ ہوا کرتے ہیں تو کبھی کبھار خواہشوں کی عدم تکمیل نفسیاتی دباؤ میں بھی مبتلا کر دیتی ہے۔ اسی کشاکش میں باطنی کیفیات رد و انتخاب میں معاون رہتی ہیں۔ یہی نکات افسانہ "بارہ گھنٹے" کے مرکز و محور ہیں۔ ادھیڑ عمر کے انقلابی کی صرف ایک رات کی روداد جو قربانی کے جذبے سے سرشار لڑکی کی زبانی بیان کی گئی ہے۔ وجے "بارہ گھنٹے" کی ملی ہوئی آزادی میں آزاد رہنا چاہتا ہے۔ اسی فضا میں وہ سنیما دیکھنے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے۔ سر رات میں فلم "طوفان میل" حرکات و سکنات میں طوفان برپا کر دیتی ہے۔ فضا آفرینی کا یہ کمال ہے کہ قاری بھی صورت حال کا ہمنوا ہو جاتا ہے کہ انسان پر کبھی کبھی فطری اور جبلی ضرورتیں اس طرح حاوی ہو جاتی ہیں کہ ان کی تکمیل میں ہی عافیت محسوس ہوتی ہے۔ خواجہ احمد عباس نے نہایت خوبی اور فنی چابکدستی سے دبی دبی خواہشوں کے اچانک ابال کی کیفیتوں اور پیچیدگیوں کو نزاکت و نفاست کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر اُتار دیا ہے۔

دونوں کردار، بینا اور وجے انقلابی ہیں۔ بینا کے سپرد پہلی بار کوئی اہم کام کیا گیا ہے۔ وجے منجھا ہوا کامریڈ ہے۔ پہلا اپنی پسندکی منزل کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔ دوسرا قید و بند میں سولہ سال گزار کر صرف بارہ گھنٹے کے لیے آزادی کی فضا میں باہر آیا ہے۔ بینا کی اضطرابی کیفیت قاری کے سامنے ہوتی ہے اور وجے کی ذہنی ہلچل زیریں سطروں میں بالواسطہ طور پر بیان کی گئی ہے۔ بینا محسوس کرتی ہے کہ اسی کے ویران گھر میں رات گزارنے والا وجے سنگھ جنسی ہیجان میں مبتلا ہے۔ وہ اپنی جوانی کے حسین لمحات انقلابی تحریک پر قربان کر چکا ہے۔ اُسے اس کا بھی احساس ہے کہ آج کی رات کے بعد اسے پھر جیل کی آہنی دیواروں کے پیچھے ڈھکیل دیا جائے گا۔ بے حد تناؤ بھری صورت حال میں وہ جنسی آسودگی سے محروم انقلابی کے لیے جو فیصلہ لیتی ہے وہ غیر مہذب ہوتے ہوئے بھی واقعات و جذبات کے تناظر میں لمحاتی طور پر فطری محسوس ہوتا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ بینا کی شخصیت کو مشکوک اور اس کے عمل کو مشتبہ بھی بنا دیتا ہے۔ تضاد و تصادم کی یہی کیفیت افسانے کو جلا بخشتی ہے اور فنکار کی فنی گرفت کی غمازی کرتی ہے۔

ان گیارہ منتخب افسانوں کے منظر و پس منظر کو اُبھارنے کا بنیادی مقصد خواجہ احمد عباس کی فکری بصیرت اور فنی ہنر مندی کو اُجاگر کرنا ہے۔ یہ افسانے ان کے افکار و خیالات اور عصری صورت حال پر اُن کی نگاہِ عمیق نیز فنِ افسانہ نگاری پر دسترس کے ضامن ہیں۔ دراصل یہ ایسے موضوعات کے منظر نامے ہیں جن میں آفاقی صداقتوں کا بیان بھی ہوا ہے اور نفسیاتی سچائی کی رعایت بھی موجود ہے۔ اس کے لیے انھوں نے اشاروں اور استعاروں کو اس طرح برتا ہے کہ وہ خارج سے مسلط کیے ہوئے نظر نہ آئیں بلکہ فن پارے ہی سے نکل کر اور باہم مربوط ہو کر ایک وحدت تشکیل دیں۔ تکنیک، موضوع اور برتاؤ کے اعتبار سے بھی مذکورہ افسانے اپنی الگ شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہیں بلکہ ایک عہد بدلنے کے بعد وہ آج بھی اپنے قاری کو دعوتِ غور و فکر دے رہے ہیں۔

☆☆☆

عصمت چغتائی اور بھول بھلیّاں

● وصیہ عرفانہ

عصمت چغتائی کا شمار اردو کے ان ممتاز افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے تخلیقی شعور سے اردو افسانے کو فن کی بلندیوں تک پہنچایا۔ اردو افسانے کے منظرنامے میں عصمت چغتائی جو موضوعات و مسائل اور انداز تحریر لے کر داخل ہوئیں، وہ ایک نئے عنوان سے عبارت ہے۔ انھوں نے زندگی کی بعض خفیہ حقیقتوں کی وسعت اور گہرائی کو دیکھا، محسوس کیا اور نہایت بے باکی کے ساتھ انھیں پیش کر دیا۔ ان کے افسانوں کے حوالے سے اردو افسانہ پہلی بار عورتوں کے داخلی تضادات اور نفسیات سے روشناس ہوا۔ عصمت چغتائی کا مقصد دراصل ان معاشرتی ناہمواریوں کی نشاندہی کرنا تھا جن کے نتیجے میں نفسیاتی مسائل ابھرتے ہیں اور جنسی کجرویاں پنپتی ہیں۔ عصمت نے ماحول کے مشاہدے اور ذاتی تجربے پر اپنے افسانوں کی اساس رکھی۔ ان کی فکر کو چند لفظوں میں سمیٹا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے عورتوں کے استحصال، طبقاتی اور جنسی تفریق، عدم مساوات، اعلیٰ طبقے کی ریاکاریوں اور متوسط طبقے کی مصلحت کوشیوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ اس تمام مرحلے میں گھریلو بول چال سے رچی ہوئی فطری زبان کے استعمال سے انھوں نے اپنی ایک واضح اور منفرد شناخت قائم کی۔ عصمت چغتائی اپنے موضوعات کی ندرت، حقیقت کے بیان میں غیر معمولی جسارت اور بیانیہ پر مضبوط گرفت کی وجہ سے راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو اور کرشن چندر جیسے عہد ساز افسانہ نگاروں کی صف میں شامل ہو کر اپنے عہد میں اردو افسانے کا چوتھا ستون قرار پائیں۔

عصمت چغتائی کا تخلیقی سفر بیسویں صدی کی چوتھی دہائی سے شروع ہوا۔ یہی وہ عہد تھا جب 'انگارے' کی اشاعت نے نئی نسل کے فکر اور احساس پر انقلاب انگیز اثرات مرتسم کیے۔ معاشرے کے مروجہ اخلاقی اقدار اور سماجی کجرویوں کے خلاف بلند آہنگ باغیانہ آوازوں کا مجموعہ 'انگارے' کی شکل میں ظہور پذیر ہوا۔ 'انگارے' کے افسانوں کے ذریعے نہ صرف موضوعاتی سطح پر روایت سے انحراف کیا گیا تھا بلکہ ان میں فن اور تکنیک کا بھی نیا تصور پیش ہوا تھا۔ اس مجموعے کے مصنفین میں ایک اہم نام ڈاکٹر رشید جہاں کا تھا جنھوں نے متوسط طبقہ کی عورتوں کی معاشرتی حیثیت کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ انھوں نے اپنی

کہانیوں کے توسط سے عورت اور مرد کے لیے یکساں حیثیت اور یکساں ضابطہ اخلاق کی آواز بلند کی۔ دراصل رشید جہاں نے اپنے افسانوں میں سماج کی جن ناہمواریوں اور عورتوں کی دبی کچلی شخصیت کی جیسی جھلکیاں دکھائیں، عصمت کا افسانوی منظرنامہ اسی کی مکمل اور جاندار تصویر کشی سے عبارت ہے۔

عصمت چغتائی سے قبل خواتین افسانہ نگاروں کے افسانے زیادہ تر اخلاقی تعلیمات اور اصلاح معاشرہ جیسے موضوعات پر مبنی ہوا کرتے تھے۔ ان کہانیوں کے کردار روایتی ہوتے جن میں عام معلومات کی بھی کمی رہتی۔ روایت کے ایسے ہی گھٹاٹوپ اندھیرے میں عصمت نے ان باتوں کو بہ بانگ دہل کہنا شروع کیا جنھیں عورتیں سرگوشیوں میں کرنا بھی اخلاقی طور پر برا سمجھتی تھیں۔ قرۃ العین حیدر نے درست لکھا ہے:

''عصمت چغتائی نے اردو افسانوں اور ناولوں میں جرأت و بے باکی کی ایک نئی مثال قائم کی۔ ان شعلہ بار تحریروں نے ان لکھنے والیوں کو پس پشت ڈال دیا، جن کا انداز رومانی تھا اور جو دبے دبے الفاظ میں اپنی بات کہتی تھیں۔ ادب میں ان کی جگہ باغیانہ سماجی حقیقت پسندی نے لے لی۔''

(بحوالہ صغریٰ مہدی، ''نیا افسانہ: مسائل ومیلانات''، مرتب: قمر رئیس، ص: ۳۹)

عصمت چغتائی نے اپنے افسانوں میں جس معاشرے کی زندگی کو پیش کیا، وہ جاگیردارانہ اور زمیندارانہ زوال پذیر معاشرہ تھا۔ اس معاشرے میں عورتوں کی حالت بے حد قابل رحم تھی جسے تعلیم کی روشنی سے محروم رکھا جاتا تھا لیکن وفاشعاری، شوہر پرستی اور پاکبازی کی ابتدائے عمر سے ہی تلقین کی جاتی تھی تاکہ وہ کسی بھی قسم کے استحصال کے خلاف آواز بلند کرنے کی جرأت نہ کریں اور مردانہ سماج کی ہر روش پر سر تسلیم خم کرنے کی خوگر ہوں۔ عصمت نے اپنے افسانوں کے حوالے سے مردوں کی جبریت کے اسی پیراہن کو تار تار کرنے کی کوشش کی ساتھ ہی انھوں نے عورتوں کی کمزوریوں کو بھی نشانہ بنایا۔ عصمت کا احساس شدید اور مشاہدہ گہرا تھا۔ انھیں چھوٹی سے چھوٹی بات کو وسیع پس منظر میں پیش کرنے کا ہنر آتا تھا۔

عصمت چغتائی نے نہ صرف معاشرتی ناہمواریوں پر نظر رکھی بلکہ وہ انسانی نفسیات کی گہرائیوں میں بھی غوطہ زن ہوتی رہیں۔ انھوں نے متعدد افسانوں میں ایسی لڑکیوں کو اپنے مطالعے کا موضوع بنایا جن میں جنسی احساس پہلی بار موہوم کروٹ لے رہا ہو۔ ایسی لڑکیوں کے نفسیاتی پیچ وخم، ان کے خیالات و احساسات، ان کی نشست و برخاست اور دیگر چھوٹی بڑی باتوں کا تجزیہ انھوں نے نہایت ماہرانہ اور فنکارانہ انداز میں کیا ہے۔ عصمت کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے عورت ہونے کے ناتے عورتوں کے ذہن و دل کی پر پیچ اور دشوار گزار راہوں کا سفر نہایت باریکی سے طے کیا ہے۔ اس سلسلے میں سعادت حسن منٹو کا خیال ہے:

''عصمت اگر بالکل عورت نہ ہوتی تو اس کے مجموعوں میں بھول بھلیاں، تل، لحاف، اور گیندا جیسے نازک اور ملائم افسانے کبھی نظر نہ آتے۔ یہ افسانے عورت کی مختلف ادائیں ہیں۔ صاف۔ شفاف۔ ہر قسم کے تصنع سے پاک۔ یہ ادائیں، وہ عشوے، وہ غمزے نہیں جن کا تیر بنا کر مردوں کے دل اور کلیجے چھلنی کیے جاتے ہیں۔ جسم کی بھونڈی حرکتوں سے ان اداؤں کا کوئی تعلق نہیں۔ ان روحانی اشاروں کی منزل مقصود انسان کا ضمیر ہے، جس کے ساتھ وہ عورت ہی کی انجانی۔ ان بوجھی مگر مخلیں فطرت لیے بغل گیر ہو جاتے ہیں۔''

(مکالمات، عصمت چغتائی نمبر، دسمبر ۱۹۹۱ء، ص: ۵۸)

عصمت چغتائی نے بڑی دیدہ ریزی سے ایک خاص عمر کے لڑکے اور لڑکیوں کی زندگی اور ان کے احساسات کی ترجمانی کی ہے۔انھیں اس بات پر اصرار تھا کہ ان کے افسانوں کی اساس ان کے مشاہدات وتجربات پر ہے۔لہٰذا ان کے افسانے حقیقت کی مصوری نہیں بلکہ فوٹو گرافی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کے زیادہ جرأت آمیز افسانے صیغۂ واحد متکلم میں تحریر کردہ ہیں جس سے واقعات کے بیان میں خودنوشت کا تاثر ابھرتا ہے اور باتیں قرین قیاس معلوم ہونے لگتی ہیں۔دراصل عصمت چغتائی کے یہاں جنس کا شعور نہایت واضح ہے۔وہ نفسیاتی تجزیے کے ذریعے جنسی مسائل کو اجاگر کرنے کے ہنر سے آگاہ تھیں۔اس قبیل کے افسانوں میں ''گیندا''، ''جال'' اور ''بھول بھلیاں'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

''بھول بھلیاں'' ایک لطیف رومانی افسانہ ہے جس میں بنیادی طور پر سن بلوغ میں داخل ہوتے ہوئے لڑکے اور ایک نوجوان لڑکی کی نفسیاتی اور جذباتی کشمکش کی عکاسی کی گئی ہے۔عصمت چغتائی نے اس افسانے میں ان حالات و ماحول کا احاطہ کیا ہے جن کی تحریک سے جنسی بیداری کی لہریں انسانی شخصیت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہیں۔انھوں نے نہایت باریکی اور اشاریت سے شباب کے اس زور آور طوفان کی تصویر کشی کی ہے جو کانوں کو گنگ کر دیتا ہے اور آنکھوں میں میٹھی میٹھی کھٹک والی ریت بھر دیتا ہے۔پھر شروع ہوتا ہے سلسلہ آنکھ مچولیوں اور بھول بھلیوں کے سفر کا جس میں ساری عاقبت اندیشی ہوا ہو جاتی ہے۔

عصمت چغتائی نے اس کہانی میں بڑی ملائمیت سے رفیعہ اور صلومیاں کی بے چین اور سلگتی ہوئی کیفیت کا نقشہ کھینچا ہے اور اس تصویر کشی کے لیے انھوں نے ایک مخصوص ماحول اور حالات کی تشکیل کی ہے۔کہانی کی شروعات بڑے دلچسپ انداز سے ہوتی ہے۔کچھ بچّے ہیں جو فوج فوج کا کھیل کھیل رہے ہیں۔اس کھیل کے کپتان صلومیاں ہیں جنھوں نے سیاہی سے مونچھ بنا رکھی ہے۔یہ فوج لفٹ رائٹ، لفٹ رائٹ اور کوئک مارچ کرتی ہوئی کرسیوں اور میزوں کی خندق اور کھائی میں دب جاتی ہے۔ان کے شوروغل پر سرزنش کرنے کے لیے چچی جان رفیعہ کو بھیجتی ہیں۔بظاہر غیر متعلق سی اس تصویر کے ذریعے عصمت چغتائی نے ابتدا میں ہی رفیعہ اور صلومیاں کی عمر، رتبے اور شعور کے فرق کو غیر محسوس انداز میں نمایاں کر دیا ہے۔رفیعہ حصول تعلیم کے سلسلے میں چچا کے یہاں رہنے آئی ہے اور صلومیاں چچا کے اکلوتے صاحبزادے ہیں۔صلومیاں کا تعارف عصمت نے رفیعہ کی زبانی یوں پیش کیا ہے:

''صلاح الدین میرے چچا کا اکلوتا سپوت تھا۔چھوٹی آنکھ کا بھی تو ایک تارا تھا.... جناب کی انگلی دکھے تو بکرے صدقے کیے جانے لگیں۔منتیں مانی جائیں۔گھر میں کوئی زور سے نہ بولے، جوتے اتار کر چلو، برتن نہ کھڑکے لاڈلے کی آنکھ کھل جائے گی۔''

بڑی ناز ونعمت سے صلومیاں کی پرورش ہو رہی تھی۔اماں نظریں اتارتیں، دادا نبض دیکھتے رہتے اور بہنیں سارے ارمان بھرے پروگرام صلومیاں کی شادی کے لیے اٹھا رکھتیں۔لیکن اتنی زیادہ توجہ اور محبتوں کی بوچھار سے وہ گھبرا چکا تھا:

"ماں، بہنوں کا لاڈ اسے کڑوا لگنے لگا تھا اور وہ سارے وقت مجھی سے الجھتا۔ لوگوں کے نان وائلنس سے وہ تنگ آ گیا تھا۔ یہی بات تھی کہ وہ جان جان کر مجھے چھیڑتا۔ کیونکہ میں اسے بری طرح ڈانٹ دیتی اور کبھی کبھی چپت بھی رسید کر دیتی۔"

صلو میاں ہمہ وقت رفیعہ کے ساتھ شرارتیں کرتے رہتے۔ کبھی اس کے پیروں میں گدگدی کرتے تو کبھی اس کے سامان کو الٹ پلٹ کرتے اور کبھی رفیعہ کی کمر میں سر اڑا کر لیٹ جاتے۔ رفیعہ اس کو ڈانٹتی، جھڑکتی، شکایتیں لگانے کی دھمکیاں دیتی مگر صلو میاں اسی کے پاس گھسے رہتے۔

چھوٹے موٹے واقعات کے تانے بانے میں الجھ کر کہانی آگے بڑھتی رہتی ہے۔ صلو میاں کی شرارتیں عروج پر اور رفیعہ کی پریشانی اپنی جگہ برقرار رہتی ہے۔ وہ کبھی کبھی چچی جان سے شکایت بھی کرتی مگر حالات صلو میاں کے موافق ہی رہتے۔ گھر والے ان شرارتوں کو کوئی اہمیت نہ دیتے۔ رفیعہ اس سے پریشان بھی رہتی لیکن اس کی غیر موجودگی میں اسے جیسے کسی چیز کی کمی سی محسوس ہوتی۔ عصمت چغتائی نے ان موہوم اشاروں کی مدد سے کہانی کی فضا بندی کے ساتھ ساتھ رفیعہ اور صلو میاں کے داخلی مدوجزر کو بھی نمایاں کیا ہے۔ لپٹنے جھپٹنے، دانت کاٹنے اور گدگدی کرنے جیسی حرکتوں کی تحریک سے صلو میاں کے اندر جنسی بیداری کی لہریں اٹھنے لگتی ہیں۔ رفیعہ کے وجود سے اسے رومان انگیز دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے قرب میں وہ مضطرب اور نڈھال ہونے لگتا، اس کے ہاتھ کانپنے لگتے، سانسیں گہری ہو جاتیں اور وہ سسکیاں بھرنے لگتا۔ یہ ساری کیفیات جنسی جذبے کے غیر محسوس عمل کے نتیجے میں ابھرتیں لیکن اس ان بوجھی سلگتی آگ کو نہ تو رفیعہ سمجھ پاتی ہے اور نہ صلو میاں:

"نہ جانے آج مجھے ان آنکھوں میں کیا نظر آ رہا تھا۔ میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ وہ شوخی سے تھرکنے کے بجائے چڑھی ہوئی اور گہری تھیں۔ کچھ پاگل سی! کچھ عجیب! مجھے تھوڑی دیر کے لئے یہ معلوم ہوا گویا اندھیرے پیچ دار راستوں میں پریشان چکر لگا رہی ہوں، اور کوئی دروازہ نہیں۔"

صلو میاں کے اندر یہ نو بیدار جذبہ بڑی تیزی سے ابھرنے لگتا ہے۔ وہ ہر کونے، ہر موڑ پر رفیعہ کی تاک میں رہتا۔ اسے چھیڑتا گدگداتا اور قریب رہنے کے بہانے تراشتا۔ عصمت نے بڑی مہارت اور باریک بینی سے جنسی جذبے کے موہوم مظاہر کو گرفت میں لیا ہے اور واقعیت کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ مخصوص واقعے کی پیشکش میں فضا بندی کے جز و پر عصمت کی خاص توجہ رہتی ہے۔ وہ بظاہر غیر اہم اور معمولی نکات کے ذریعے قاری کے ذہن کو ایک مخصوص سمت پر ڈال دیتی ہیں جبکہ خارجی نقطۂ نظر سے افسانہ بے سمت معلوم ہوتا ہے۔

امتحان سے فارغ ہونے کے بعد رفیعہ اپنے گھر چلی جاتی ہے لیکن دو سال بعد صلو میاں کی بڑی بہن کی شادی کے موقع پر وہ پھر اپنے چچا کے گھر آتی ہے۔ صلو میاں ایک لچکتے ہوئے پودے سے نوخیز درخت میں تبدیل ہو چکے تھے لیکن روش وہی پرانی تھی۔ ہر وقت رفیعہ کے تعاقب میں، ہر لمحہ اس کی قربت کے خواہاں۔ اب اس کی بچکانہ شرارتوں میں پختگی اور گہرائی آ چکی تھی۔ رفیعہ کی ذہنی کیفیت متزلزل رہتی ہے۔ کبھی وہ گریز کی راہ اختیار کرتی تو کبھی اپنی آمد پر پچھتاتی لیکن...

"شادی کا گھر اور وہ بھی ہندوستانی طریق۔ گھر کیا ہوتا ہے ایک بھول بھلیاں کا راستہ جس میں مزے سے آنکھ مچولی کھیلو۔"

رفیعہ اس آنکھ مچولی سے پریشان ہو جاتی ہے۔ اس کی ہنسی اسے جتا دیتی ہے کہ لوگوں کی نگاہیں اس آنکھ مچولی پر ہیں اور اس قسم کی آنکھ مچولی میں چور ہمیشہ عورت قرار پاتی ہے۔ اسے الجھنوں کا کوئی سرا نہیں ملتا تو وہ صلو سے لڑائی کر بیٹھتی ہے اور مطمئن ہو جاتی ہے کہ ساری مصیبتوں سے نجات مل گئی۔ لیکن یہ خود فریبی عارضی ثابت ہوتی ہے۔ صلو کا گریز رفیعہ کی فطرت میں دبی چنگاری کو ہوا دیتا ہے اور اس کے نسوانی جذبات میں لپک پیدا ہونے لگتی ہے:

"گھر کے ہر کونے اور ہر موڑ پر اب کوئی نہ تھا؟ گویا امن، چین اور سکون! لیکن یہ پھر پریشانی کیسی؟ ایک فکری، ایک پستی گویا کمان اتر گئی، دھار ہو گئی، گویا کچھ ہے ہی نہیں..... شادی کے گھر میں معلوم ہوتا ہے موت ہو گئی۔ ایک موت نہیں سینکڑوں موتیں۔ ہزاروں خیالات سینکڑوں جذبات اور انگنت مسکراہٹیں مردہ پڑی ہیں۔ گھر بھائیں بھائیں کر رہا ہے۔"

معاشرے کی نگاہوں میں دونوں کی قربت بھی چبھتی تھی اور اب یہ غیر معمولی فاصلے بھی کھٹکنے لگے۔ دل اور دماغ الگ دہائیاں دے رہے تھے۔ آخر کار میل ملاپ کرنا پڑا:

"اور پھر وہی آنکھ مچولی! وہی بھول بھلیاں! اور عاقبت؟ ایک دفعہ کو عاقبت بھی کھلکھلا پڑی۔ کونا کونا مسحور کن نغموں سے گونج اٹھا۔ کان گنگ ہو گئے اور آنکھوں میں ریت بھر گئی۔ میٹھی میٹھی کھنک والی ریت!"

عصمت چغتائی بڑی نزاکت اور رمز و اشاریت کے پیرائے میں وسیع پس منظر کی تشکیل کر جاتی ہیں۔ اس افسانے میں جنس اور جذبے کے تال میل سے تعمیر پایا ہوا پورا منظر نامہ چند الفاظ میں سمٹ آیا ہے۔ جذبات کی فراوانی اور نو عمر جنسی عمل کا رد عمل ملاحظہ ہو:

"کچی شاخ میں جھولا ڈالو تو آپ ہی چرچرائے گی۔ بھئی خوب ٹھونک بجا کر دیکھ لینا چاہیے کہ گدا اکمزور تو نہیں۔ رسی تو گھنی گھنائی نہیں۔ ورنہ آپ ہی پچنی لگے گی۔"

عورت اور مرد کا ملنا فطرت کے بنائے ہوئے قانون کے تکمیل کی ایک شکل ہے، تو ایک کلبلاتی ہوئی جاندار شئے کا دونوں کے درمیان آپڑنا دوسری صورت۔ بھول بھلیوں میں بھٹکتا افسانہ سرعت سے مطلب نمایاں کرتا ہے تو ابتدائی حروف سے آخری جملے تک مناسب، درست اور متوازن معلوم ہونے لگتے ہیں اور آخری سطروں میں حیرت اور مسرت کے امتزاج سے قاری عجیب سی آسودگی محسوس کرتا ہے۔

صلو لڑائی پر جانے سے پہلے رفیعہ سے ملنے آئے تو ننھے کو لفٹ رائٹ لفٹ رائٹ کرتے ہوئے دیکھ کر چونک پڑے۔ پرسش کرنے پر رفیعہ کہتی ہے کہ وہ ننھے کو دل بہلانے کے لیے یتیم خانے سے لائی ہے لیکن صلو میاں کا فہم و ادراک اس بات کو تسلیم کرنے سے عاجز تھا۔ کہانی کی اختتامی صورت حال کو عصمت نے بڑی چابکدستی سے استوار کیا ہے:

اور ان کی رنگت بدلی۔ "بے چارہ بچہ! مر گیا اس کا باپ شاید!" تلخی سے کہا گیا۔

"خاک تمھارے منہ میں۔ خدا نہ کرے۔" میں نے ننھے کو کلیجے سے لگا لیا۔

"ٹھائیں....." ننھے نے موقع پا کر بندوق چلائی۔

"ہائیں.... پاجی.. ابا کو مارتا ہے۔" میں نے بندوق چھین لی۔

بقول منتوان چار سطروں میں عصمت نے عورت کی روح نچوڑ کر رکھ دی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ عورتوں بالخصوص نوجوان لڑکیوں کی نفسیات کے جاندار نقوش پیش کرنے میں عصمت ماہر رہی ہیں۔ اس ضمن میں وقار عظیم کی رائے ہے:

"عصمت نے شباب کی منزل میں پہلا قدم رکھنے والی لڑکیوں کی زندگی کے جو رنگ برنگے نقوش اپنے افسانوں میں ہمیں دکھائے ہیں وہ انھوں نے گہرے مشاہدے اور براہِ راست مطالعے سے حاصل کیے ہیں اور اس لیے ان تصویروں کے پردے میں ہمیں جو کچھ نظر آتا ہے اسے ہم اس طرح ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں جیسے کوئی ماہرِ فن اپنی ساری زندگی کے تجربہ اور تحقیق کا نچوڑ ہمارے سامنے پیش کر رہا ہے۔"

[نیا افسانہ، ص:۱۱۶]

عصمت اپنے کرداروں کی دلی کیفیت اور ذہنی واردات دونوں پر نظر رکھتی ہیں۔ کرداروں کا نفسیاتی تحلیل و تجزیہ کرنا ان کا محبوب موضوع ہے۔ وہ کرداروں کا تجزیہ بڑی چابکدستی سے کرتی ہیں۔ ایسی باتیں جو بظاہر عام اور معمولی معلوم ہوتی ہیں، عصمت کے کرداروں کے ذریعے ادا ہو کر نفسیاتی کیفیات کے نئے دروبست کھولتی ہیں۔ کہانی میں رفیعہ کا کردار جیتا جاگتا محسوس ہوتا ہے۔ وہ ایک تعلیم یافتہ ذہین اور باشعور لڑکی ہے لیکن نسوانی جبلت سے محروم نہیں ہے۔ چنانچہ خود سے کم عمر لڑکے کی والہانہ وابستگی اسے عاجز رکھنے کے ساتھ ساتھ اس کے ذہن و دل کے لطیف احساسات کو چھیڑتی بھی ہے۔ معاشرتی قدروں اور اخلاقی پابندیوں کا اسے پورا احساس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ صلو میاں کے والہانہ پن پر بندش لگانے کی کوشش کرتی ہے لیکن پھر اس کی بے اعتنائی اور مغائرت کو وہ برداشت بھی نہیں کر پاتی ہے۔ بالآخر وہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کر صلو کے والہانہ پن کا خیر مقدم کرتی ہے اور یہ خیر مقدمی جس انداز میں انجام پذیر ہوتی ہے، اس کا سامنا بھی بڑی جرأت کے ساتھ کرتی ہے۔ عورتوں کو عموماً خطروں سے کھیلنے کا شوق نہیں ہوتا لیکن اگر وہ خطرے اور پریشانی میں گھر جائیں تو ان کا سامنا اولوالعزمی اور گہری لگن کے ساتھ کرتی ہیں۔ عصمت چغتائی نسوانی نفسیات کی گہری نباض ہیں۔ رفیعہ کے کردار کے حوالے سے انھوں نے اپنی نبض شناسی کا پختہ ثبوت دیا ہے۔ رفیعہ اس کہانی کا متکلم کردار ہے اس لیے اس کی شخصیت اس افسانے میں زیادہ نمایاں ہوئی ہے۔ صلو کے کردار کے حوالے سے عصمت چغتائی نے نیم بلوغت کے احساسات اور جذبات کو نہایت خوبی سے ابھارا ہے۔ انھوں نے نفسیاتی اسرار و رموز کی پیشکش میں نکتہ دانی کا ثبوت دیا ہے لیکن بعض مقامات پر جہاں صلو کی شخصیت کا تجزیہ رفیعہ کے ذاتی نقطۂ نظر کے حوالے سے پیش ہوا ہے، وہاں صلو کا کردار کچھ دب سا جاتا ہے۔

"اور اس کے بعد اس میں ایک غیر معمولی انقلاب ہو گیا۔ وہی رات والی پاگل گہری اور چڑھی ہوئی آنکھیں کبھی بغیر بخار اور ہذیان کے بھی کچھ عجیب ہو جاتیں۔ وہ مجھے پہلے سے بھی زیادہ چھیڑنے اور چڑھانے لگا۔ مجھ سے ہر وقت الجھتا اور پھر بالکل پاگل ہو جاتا۔ وہ میرے قریب میں رہنے کے بہانے تراشتا۔ ہر جگہ، ہر کمرے، ہر موڑ اور ہر کونے پر وہ میری تاک میں مجھے ڈرانے اور گدگدانے کے لیے چھپا رہتا۔ میں اس کی ضرورت سے زیادہ توجہ سے کبھی بے طرح پریشان ہو جاتی، اور کبھی مجھے وہ سب ایک الھڑ لڑکے کی شرارتیں معلوم ہوتیں۔ اور یہ شرارتیں کس تیزی سے بڑھ رہی تھیں۔"

"بھول بھلیاں" میں کہانی کی پیشکش کا انداز نہایت انوکھا اور دلفریب ہے۔ واقعات کے چھوٹے بڑے بے

ترتیب ٹکڑے ہیں لیکن ان میں، بہ نظر غائر دیکھا جائے تو ایک منطقی تسلسل ہے۔ بعض حصے بظاہر غیر ضروری محسوس ہوتے ہیں لیکن کہانی ختم ہو جانے کے بعد ان کی اہمیت روشن ہوتی ہے۔ مثلاً کہانی کے ابتدائی حصے میں بچوں کے کھیل کا بیان ہے جس کے توسط سے عصمت نے کرداروں کو متعارف کرایا ہے۔ اسی ٹکڑے سے صلو میاں کے کردار کے متعدد رخ سامنے آتے ہیں۔ صلو میاں کو کمانڈنگ کا شوق ہے۔ ان کے دل میں چڑھائی کرنے اور غالب آنے کی امنگ ہے۔ وہ غیر مساعد حالات کا سامنا کرنے والوں میں سے ہیں اور ابھی وہ اتنے چھوٹے ہیں کہ سیاہی سے مونچھیں بنانی پڑتی ہیں۔ گویا بچوں کے کھیل کی واردات کے حوالے سے نہ صرف صلو میاں کا تعارف حاصل ہو جاتا ہے بلکہ یہ اطلاع بھی فراہم ہو جاتی ہے کہ رفیعہ صلو میاں سے اتنی بڑی ہے کہ ان کی سرزنش کر سکے۔ اسی طرح کہانی کے مختلف ٹکڑے ہیں جن کے درمیان باہمی ربط کہانی کے خاتمے کے بعد ہی واضح ہوتا ہے۔ کرشن چندر نے اس کہانی کی فنی صناعی کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے:

"بھول بھلیاں کے اس جنگل میں پڑھنے والا فکری اعتبار سے بار بار بھٹکتا ہے۔ اس کے درختوں اور جھاڑیوں سے بار بار الجھتا ہے، چیختا ہے، چلاتا ہے، کوسنے دیتا ہے۔ نہ صرف فکری اعتبار سے بلکہ خارجی نقطۂ نگاہ سے بھی عصمت چغتائی نے اس افسانے کی انشا میں، اس کے فقروں کے نشست و برخاست میں، اس کے مختلف نثری ٹکڑوں کی تدریجی ارتقا میں اس صناعی کو ملحوظ خاطر رکھا ہے اور افسانے کے آخری چند فقروں میں جب مطلب ایک بجلی کی لپک کی طرح کوندتا ہے افسانے کی نہج مکمل طور پر روشن ہو جاتی ہے۔۔۔۔ سمت کو چھپانے میں، پڑھنے والے کو حیرت و اضطراب میں گم کر دینے میں اور پھر یکا یک آخر میں اس اضطراب اور حیرت کو مسرت میں مبدل کر دینے کی صنعت میں عصمت اور منٹو ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں اور اس فن میں اردو کے بہت کم افسانہ نگار ان کے حریف ہیں۔"

(دیباچہ، چوٹیں، ص ۱۴)

اس صناعی کی پیشکش میں عصمت چغتائی کی زبان اور ان کا اسلوب نہایت معاون ہوتا ہے۔ ان کا اسلوب ایک بے تکلف اور رواں اسلوب ہے، جس میں طنز و مزاح کی آمیزش نے ندرت پیدا کر دی ہے۔ "بھول بھلیاں" میں ان کے اسلوب کا یہ جادو پوری افسانوی فضا پر محیط ہے۔ ان کی بیشتر کہانیوں کی طرح اس افسانے میں بھی واقعات مکالموں کے ذریعہ آگے بڑھتے نظر آتے ہیں۔ مکالموں کی زبان سادہ ٹھوس اور مختلف کیفیات سے مملو زبان ہے:

"میرا دل گھبرا رہا ہے۔"

"چچی جان کو جگاؤں۔" میں نے چاہا آرام سے اس کا سر تکیہ پر رکھ دوں۔

"نہیں۔۔۔۔ ہلو مت!" اس نے اپنے پتلے پتلے ہاتھ میری کمر میں ڈال دیئے۔ "دل گھبرا رہا ہے بجو!" وہ تیزی سے گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش نہ کی اور اس کی پیشانی پونچھنے لگی۔ وہ اور بھی پریشان ہو گیا۔ اس نے جلدی جلدی میرا نام لے کر بڑبڑانا شروع کیا۔ سسکیاں! وہ سسکیاں بھرنے لگا۔ عجیب سوکھی اکھڑی ہوئی سانسیں۔ میں سمجھی کمبخت کو سرسام ہو گیا، یا کیا۔ اور اسے لٹانے کی کوشش کرنے لگی۔

"بجو جاؤ مت۔۔۔ میں مر جاؤں گا۔" اور بری طرح بچوں کی طرح مجھ سے لپٹ گیا اور اس کی آنکھیں! وہ جیسے۔۔۔ نہ جانے آج مجھے ان آنکھوں میں کیا نظر آ رہا تھا۔ میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ وہ شوخی سے تھرکنے کے بجائے چڑھی ہوئی اور گہری تھیں۔ کچھ پاگل سی! کچھ عجیب! مجھے تھوڑی دیر کے لیے یہ معلوم ہوا گویا اندھیرے پیچ دار راستوں میں پریشان چکر لگا رہی ہوں، اور کوئی دروازہ نہیں۔۔۔"

کوئی قریب کے پلنگ پر کلبلایا۔ اور وہ جلدی سے چونک پڑا۔ ''جاؤ... رابعہ جاگ گئی!'' اس نے خوفزدہ ہو کر مجھے دور دھکیل دیا۔ ''جاؤ جلدی۔'' وہ خود دوڑ کر چادر میں چھپ گیا۔ میں پریشان لیٹ گئی۔ یا اللہ! کیا واقعی یہ پاگل ہو رہا ہے! رابعہ جاگ گئی تو کیا ہوا؟ مجھے چچی جان پر رحم آنے لگا۔ خدانخواستہ... خیر...''

مندرجہ بالا اقتباس اپنی سادہ بیانی کے باوجود ایک خاص وقت، ماحول اور صلو میاں کی کیفیات کی بھرپور عکاسی میں کامیاب ہے۔ ایسی باتیں جو بظاہر عام اور معمولی معلوم ہوتی ہیں، عصمت کے کرداروں کے ذریعے ادا ہو کر نفسیاتی کیفیات کے نئے در وبست کھولتی ہیں۔ دراصل یہی عصمت چغتائی کا فن ہے۔ عصمت کا مشاہدہ گہرا، احساس شدید، تجربات پختہ اور فکر عمیق تھی۔ وہ اپنے افکار و احساسات اور تجربات و مشاہدات کو تخلیقی سطح پر پیش کرنے کی مہارت اور قدرت رکھتی تھیں۔

عصمت چغتائی کا ذہن بہت زرخیز تھا۔ معاشرے کی ہر کروٹ اور فطرت کا ہر اشارہ ان کے لئے کہانی کا ایک عنوان تھا۔ ''بھول بھلیاں'' میں انھوں نے صلو میاں اور رفیعہ کی فطرت کے لطیف ارتعاشات کو بڑی مضبوطی سے گرفت میں لیا ہے۔ فطری تبدیلیاں ان کے اندر مختلف اور پراسرار احساسات پیدا کرتے ہیں مگر ان احساسات کی شناخت سے ناآشنا ان کا ذہن ہمیشہ ''ارے، مگر آخر کیوں؟'' وغیرہ پر آ کر اٹک جاتا ہے۔ الجھا ہوا ذہن بے تعلقی اور بیزاری کی ایک بے نام سی کیفیت میں ڈوبنے ابھرنے لگتا گویا سارے راستے گم ہو گئے ہوں۔ اس افسانے کے حوالے سے عصمت چغتائی نے معصوم اور شریر بچپن کی حدوں سے نئی عمر کی سرحدوں میں داخل ہونے والے نوجوان لڑکے لڑکیوں کی فطرت میں پنہاں عمیق گہرائیوں پر بڑی باریک بینی سے نگاہ ڈالی ہے اور تمام جزئیات کے ساتھ اپنے مشاہدات کو پیش کر دیا ہے۔ عصمت کا یہ افسانہ زندگی کی بعض مخفی صداقتوں کے حوالے سے نئی منزلوں کا نشان راہ ہے۔

☆☆☆

"اپنے دکھ مجھے دے دو" کا تنقیدی جائزہ

● ڈاکٹر پرویز شہریار

اردو ادب میں راجندر سنگھ بیدی اپنے منفرد اسلوب سے پہچانے جاتے ہیں۔ان کی کہانیوں میں عام طور سے ہمارے ملک ہندوستان کے اساطیری عناصر کسی نہ کسی رنگ میں جلوہ افروز نظر آتے ہیں۔ان کے یہاں موضوعات میں اگرچہ تنوع اور تکثیریت بدرجہ اتم موجود ہے،تاہم ان کے موضوعات ایان و توران سے نہیں آتے بلکہ اسی سرزمین سے مستعار ہوتے ہیں۔شہری ہو یا دیہی ان کے کردار بھی اپنی بنیادی تشکیلی خصلت میں صدیوں پرانی ہند آریائی تہذیبی عقائد سے جڑے ہوتے ہیں۔البتہ افسانے کی کرافٹ مین شپ کی بات کی جائے تو بیدی کے یہاں چیخوف، گوگول، شوپنہار کے اثرات تلاش کیے جا سکتے ہیں۔مثال کے طور پر ان کا افسانہ "بھولا" ہو یا "گرم کوٹ"، "اپنے دکھ مجھے دے دو" ہو یا "دس منٹ بارش میں" ایسے اور بھی کئی افسانے پیش کیے جاسکتے ہیں۔جہاں ہیئت اور تکنیک کی سطح پر مغربی ماسٹر کرافٹ سے مماثل عناصر تلاش کیے جاسکتے ہیں۔یوں دیکھیے تو ان کی ہر کہانی میں فکر وفن کے حوالے سے کوئی نہ کوئی خاص بات ضرور نظر آجاتی ہے۔

"اپنے دکھ مجھے دے دو" بھی راجندر سنگھ بیدی کا ایک ایسا ہی شاہکار افسانہ ہے، جس میں رشتۂ ازدواج میں بندھنے کے بعد میاں بیوی کے گرہست جیون کے سکھ دکھ سے پیدا ہونے والی ہمدردی اور یگانگت سے باہمی رشتے میں انحصار اور اعتماد کی ہر دم ایک نئی لہر سی دوڑتی رہتی ہے جو زندگی کی کونپلوں کو ہر پل تازہ اور توانا رکھتی ہے۔افسانے کے ہیرو مدن اور ہیروئن اندو کی زندگی بھی گرہستی کے ان ہی دھوپ چھاؤں سے عبارت ہے۔ اس افسانے میں خاص بات یہ ہے کہ گندے بروزے کا کاروبار کرنے والے مدن کے سارے دکھوں کو اندو دھرتی کی طرح اپنے دامن میں سمو لیتی ہے۔جس کے باعث ان کی زندگی کے مشکل ڈگر کی کٹھنائیاں دور ہوجاتی ہیں اور ان کی زندگی کا سفر بنی نوع انسان کے آفاقی سفرِ حیات میں تبدیل ہوجاتا ہے۔

مدن اور اندو کی چھوٹی سی گرہستی میں مدن کے باپ بابو دھنی رام ریلوے میل سروس میں ہیڈ کلرک

ہیں۔ مدن کی ماں کی موت پہلے ہی ہو چکی تھی۔ مدن کے دو چھوٹے بھائی ہیں کندن اور پاشی اور ایک سب سے چھوٹی بہن دلاری منی ہے۔ اندو بھی اپنے مائکے میں ماں باپ اور بھائی بہن اور بھابیوں کے علاوہ بیسیوں رشتے دار کو چھوڑ کر آئی ہے۔ اندو پڑھی لکھی نہیں ہے لیکن بہت سمجھ دار لڑکی ہے۔ مدن بروزے کا کاروبار کرتا ہے۔ پھر مدن اور اندو کے اپنے دو بیٹے ہوتے ہیں اور سب سے چھوٹی ایک بیٹی ہوتی ہے۔ اپنی گرہستی کے 15 برسوں میں اندو کی مدد سے مدن اپنے بھائی بہنوں کی پڑھائی لکھائی اور شادی کا خرچ برداشت کرتا ہے۔ چھوٹے بھائی کندن کی بیوی رانی کے کارن بھائیوں میں جھگڑا ہو جاتا ہے اور جائیداد کا بٹوارہ ہو جاتا ہے۔ ان کے علاوہ، مہمان کرداروں میں چکلی بھابی، دریا آباد والی پھوپی اور جے پی چاچا قابل ذکر ہیں جن سے کہانی کے آغاز اور وسط میں کہیں کہیں واقعات کے سلسلے کو آگے بڑھانے میں تھوڑی بہت مدد ملتی ہے۔ بیدی کی اکثر و بیشتر کہانیوں میں جانوروں اور پیڑ پودوں سے قدرے غیر مانوس جذبے اور احساس کو واضح کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔ اس افسانے میں پڑوسی سیٹھے کی پھنکارتی ہوئی بھینس کو اس لحاظ سے فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔

اس افسانے کی ابتدا جس جملے سے ہوتی ہے وہ انتہائی معنی خیز ہے اور یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ کہانی ایک غیر معمولی واقعے کی طرف انگلی تھام کر قاری کو اپنے ساتھ ساتھ آگے چلنے پر راغب کر دیتی ہے:

''شادی کی رات بالکل وہ نہ ہوا جو مدن نے سوچا تھا۔''

یہ ایک مکالمہ ہے، ایک ڈسکورس ہے جو بیدی اپنے قارئین کے ساتھ شروع کرتے ہیں۔ دراصل، بات یہ تھی کہ ہر نوجوان کی طرح شب عروسی میں مدن بھی بہت کچھ سوچ کے بیٹھا تھا لیکن اندو ایک سگھڑ لڑکی تھی جو مدن کے ان گھڑ پن کو بھی راہ راست پر لے آتی ہے۔ اپنے تمام رشتے داروں کے تعارف کے بعد وہ ایک دوسرے سے قدرے مانوس ہو جاتے ہیں اور اجنبیت کا احساس جب دور ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ اپنائیت لینے لگتی ہے تو مدن اپنا دکھڑا کہہ کر دل کے پھپھولے پھوڑتا ہے:

''جتنی دیر زندہ رہی بچاری۔'' مدن نے کہا۔ ''بابوجی کے ہاتھ میں دوائی کی شیشیاں ہی رہیں۔ ہم اسپتال کی سیڑھیوں پر اور چھوٹا پاشی گھر میں چیونٹیوں کے بل پر سوتے رہے اور آخر ایک دن ۲۸ مارچ کی شام۔''

مدن کی اس دکھ بھری باتوں سے اندو کا دل پسیج جاتا ہے وہ اسے اپنے سینے سے لگا کر دلاسہ دیتی ہے اور اپنے اندر کی قوتِ تحمل اور برداشت کو بروئے کار لا کر غایت درجہ اپنائیت سے کہتی ہے:

''میں اب تمھاری ہوں۔ اپنے بدلے میں تم سے ایک ہی چیز مانگتی ہوں۔''...اندو نے مدن کے سخت اور پھیلے ہوئے ہاتھوں کو اپنے ملائم ہاتھوں میں سمیٹتے اور ان پر اپنے گال رکھتے ہوئے کہا: ''تم اپنے دکھ مجھے دے دو۔''

مدن اس بات پر سخت حیران ہوتا ہے اور اسے اندو کی ذہانت اور ہمدردی پر یقین نہیں آتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ ماں یا کسی سہیلی کا رٹا ہوا فقرہ ہوگا جو اندو نے کہہ دیا۔ لیکن جب اس کے ہاتھ کی پشت پر جب ایک جلتا ہوا آنسو کا قطرہ گرتا ہے تو وہ اپنی سوچ پر نادم ہوتا ہے۔ اس کا بوجھ بھی اتر جاتا ہے۔ اس واقعہ کا مدن کی زندگی پر مثبت اثر پڑتا ہے۔ اس

کی بہیمیت ختم ہو جاتی ہے اور وہ اپنی آنے والی زندگی میں اندو کی مدد کرتا ہے اس کا حد سے زیادہ خیال رکھتا ہے۔

اندو کی اپنی خوبیاں تھیں کہ وہ جلد ہی گھر کے چھوٹے بڑے تمام افراد کو اپنا گرویدہ بنا لیتی ہے۔ چھوٹا پاشی اور دلاری منی کو ماں کی طرح ٹوٹ کر پیار کرتی ہے۔ کیا بچے کیا بوڑھے سبھی اس کے اس اپنائیت والے رویے سے دیوانے پروانے بن جاتے ہیں یہی کیفیت اس کے سسر دھنی رام کی بھی ہوتی ہے۔

اسی اثنا اندو کے سسر دھنی رام کا تبادلہ سہارن پور ہو جاتا ہے اور وہ کالکاجی، نئی دہلی سے سہارن پور کے لیے تنہا روانہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان کا وہاں جی نہیں لگتا۔ بعد کو اندو اور بچے بھی سہارن پور بابو جی کو دیکھنے چلے جاتے ہیں۔ وہاں سب کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اندو دھنی رام کی چہیتی بہو ہے اور محلے والے بھی اس کے اپنائیت والے رویے سے مرغوب ہو جاتے ہیں۔ سبھی عورتیں اس کی تعریفیں کرتی ہیں۔

ادھر مدن کی تنہائی کاٹے نہیں کٹتی ہے۔ احتیاج اسے اس قدر ڈھیٹ اور بے شرم بنا دیتی ہے کہ وہ ضد کر کے اندو کو واپس بلا لیتا ہے۔ لیکن اندو کو ہر ایک کا خیال ہے۔ وہ کہتی ہے:

"تم مرد لوگ کیا جانو؟۔۔۔ جس سے پیار ہوتا ہے اس کے سبھی چھوٹے بڑے پیارے معلوم ہوتے ہیں۔ کیا باپ کیا بھائی اور کیا بہن۔"

"سچ پوچھو تو تم نے مجھے یہاں بلوا کر بابو جی پر بڑا ظلم کیا ہے۔"

"بابو جی کو یہاں بلا لو۔ ان کا وہاں جی بھی نہیں لگتا۔ وہ دکھی ہوں گے تو کیا تم دکھی نہیں ہو گے؟"

مدن کو دراصل اپنے بابو جی سے بہت پیار ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ ماں کی موت کے بعد اب باپ کی چھتر چھایا بھی سر سے اٹھ جائے۔ لیکن اس کی مجبوری یہ ہے کہ ابھی وہ نو بیاہتا ہے اور پہلی بار انھیں بابو جی کے تبادلے کے بعد آزادی ملی ہے۔ وہ اس آزادی کے ساتھ اپنی ازدواجی زندگی سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے۔ تاہم تیسرے چوتھے روز دھنی رام کا آنسوؤں میں ڈوبا ہوا خط آ جاتا ہے کہ:

"بہو کے یہاں ہونے پر میرے تو وہی پرانے دن لوٹ آئے تھے۔ تمھاری ماں کے دن، جب ہماری نئی نئی شادی ہوئی تھی تو وہ بھی ایسی ہی الھڑ تھی۔ ایسے ہی اتارے ہوئے کپڑے ادھر ادھر پھینک دیتی اور پتا جی سمیٹتے پھرتے۔ وہی صندل کا صندوق، وہی بیسیوں خلجگن۔۔۔ میں بازار جا رہا ہوں، کچھ نہیں تو وہی بڑے یار بڑی لا رہا ہوں۔ اب گھر میں کوئی نہیں۔ وہ جگہ جہاں صندل کا صندوق پڑا تھا، خالی ہے۔"

"بہو کا خیال رکھنا، اسے کسی ایسی ویسی دایہ کے حوالے مت کرنا۔"

مدن اندو کے پیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

"کتنی شرم کی بات ہے۔ ابھی چھے آٹھ مہینے شادی کو ہوئے ہیں اور چلا آیا ہے۔"

لیکن اندو اسے قدرت کا عظیم عطیہ سمجھتی ہے اور اسے بتاتی ہے کہ پوچھو، ان سے جن کے نہیں ہوتا۔ پھر وہ کیا کرتی ہیں؟ پیروں فقیروں کے پاس جاتی ہیں۔ سمادھیوں، مجاوروں پر

چوٹیاں باندھتی، شرم حیا کو تج کر، دریاؤں کے کنارے ننگی ہو کر سرکنڈے کاٹتی---- شمشانوں میں مسان جگاتی----'' لیکن مدن اس کی بات کاٹ دیتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اولاد پیدا کرنے کے لیے ابھی بہت عمر پڑی ہے۔ وہ اسم بامسمّی ہے اور کام دیو جس کا دوسرا نام مدن بھی ہے۔ اسی کام دیو کے ارادے کی ترجمانی کرتا ہوا کہتا ہے:

''چار دن تو مزے لے لیتے زندگی کے۔''

اندو کے کاکاجی واپس لوٹ آنے کے چند ہی روز بعد ایک سارٹر یہ خبر لاتا ہے کہ بابو دھنی رام کو پھر سے دورہ پڑا ہے۔ اس خبر سے مدن کو کافی ملال ہوتا ہے اور افسوس کرتا ہے کہ کاش! اس نے اندو اور اپنے بھائی بہنوں کو ابھی کچھ دن اور وہیں رہنے دیا ہوتا۔ لیکن اپنی ازدواجی زندگی کا وہ آزادی کی فضا میں سکھ اٹھانا چاہتا تھا۔ اور ایسا ہی ہوتا ہے۔ پھر وجے دشمی سے ایک رات قبل اس کے گھر میں لڑکا پیدا ہوتا ہے۔ اندو اور مدن کی زندگی میں نئی بہار آجاتی ہے۔ مدن کو اندو پہلے سے زیادہ خوبصورت نظر آنے لگتی ہے۔

جب بابو دھنی رام چھٹی پر گھر لوٹے تو وہ پہلے سے آدھے دکھائی پڑتے تھے۔ جب اندو ان کی گود میں پوتا دیتی ہے تو وہ کھل اٹھتے ہیں۔ لیکن ان کے پیٹ میں کوئی پھوڑا نکل آتا ہے جس کی تکلیف ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ لیکن وہ منا کو دیکھ کر سب غم بھول جاتے ہیں۔ ابھی انھیں پوتا کا منھ دیکھے ہوئے بیس پچیس ہی دن ہوئے تھے کہ اچانک انھیں خون کی قے ہوتی ہے اور وہ دنیا سے چل بستے ہیں۔

گھر بار کا سارا بوجھ مدن پر آجاتا ہے۔ ایسی مصیبت کی گھڑی میں اندو اپنے بکھرتے ہوئے مدن کو بانہوں میں سمیٹ لیتی ہے:

''اسے کوئی سہارا چاہیے تھا۔ کسی ایسے جذبے کا سہارا جو موت سے بھی بڑا ہو۔ اس وقت دھرتی ماں کی بیٹی، جنک دلاری اندو نے کسی گھڑے میں سے پیدا ہو کر اس رام کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔ اس رات اگر اندو اپنا آپا یوں مدن پر نہ وار دیتی تو اتنا بڑا دکھ مدن کو لے ڈوبتا۔''

بابو دھنی رات کی موت کے بعد اس کے یہاں دس ہی مہینے میں دوسرا بچہ آ گیا تھا اور مدن کا کاروبار بھی کسی قدر چل نکلا تھا لیکن جب کبھی بھائی بہنوں کی تعلیم اور ان کی شادی بیاہ کا مسئلہ آتا تو اندو ہی اس کی مدد کرتی تھی۔ مدن جب کبھی پیسوں کے بارے میں استفسار کرتا تو اندو اسے مذاق سے کہتی:

''میں چور لٹیرا ہوں---- تم نہیں جانتے؟---- سخی لٹیرا---- جو ایک ہاتھ سے لوٹتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے گریب گربا کو دے دیتا ہے۔'' اندو ہر پریشانی میں اپنی سگی ماں کی طرح کھڑی ہو جاتی ہے اور مسئلے کو حل کر دیتی ہے۔ یہ سب دیکھ کر دھنی رام اور ان کی اہلیہ ان پر پھول برسایا کرتے ہیں۔

''پھر ایسا ہوا، اوپر ماں جی اور بابوجی میں جھگڑا چل گیا۔ ماں نے بابوجی سے کہا۔ تم بہو کے ہاتھ کی پکی کھا آئے ہو، اس کا سکھ بھی دیکھا ہے پر میں نصیبوں جلی نے کچھ بھی نہیں دیکھا۔ اور یہ جھگڑا وشنو مہیش اور شو تک پہنچا انھوں نے ماں کے حق میں فیصلہ دیا۔ اور یوں ماں، مات لوک میں آ کر بہو کی کوکھ میں پڑی ------ اور اندو کے ہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی ------ ''

بچّی کی پیدائش کے بعد اندو کی صحت پہلے جیسی نہیں رہتی ہے۔ اس کی طرف سے کشش نہ پاکر وہ اپنے گندے بروزے کی کمائی بالا ہی بالا خرچ کرنے لگتا ہے۔ اب اس پر کوئی ذمہ داری (Liability) نہیں رہ گئی تھی۔ یہی سبب تھا کہ پڑوسی سبطے کی بھینس پھر مدن کے منھ کے پاس پھنکارنے لگی اور مدن ایسی جگہوں پر جانے لگا جہاں روشنی اور سائے عجیب بے قاعدہ سی شکلیں بناتے ہیں:

''نکڑ پر کبھی اندھیرے کی تکون بنتی ہے کہ اوپر کھٹ سے روشنی کی ایک چور آ کر اسے کاٹ دیتی ہے۔ کوئی تصویر پوری نہیں بنتی۔ معلوم ہوتا ہے بغل سے ایک پاجامہ نکلا اور آسمان کی طرف اڑ گیا یا کسی کوٹ نے دیکھنے والے کا منھ پوری طرح سے ڈھانپ لیا اور کوئی سانس کے لیے تڑپنے لگا۔ جبھی روشنی کی چوکور ایک چوکھٹا سی بن گئی اور اس میں ایک صورت آ کر کھڑی ہو گئی۔ دیکھنے والے نے ہاتھ بڑھایا تو وہ آر پار چلا گیا اور وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ پیچھے کوئی کتا رونے لگا۔ اوپر طبل نے اس کی آواز ڈبو دی——''

پروفیسر وہاب اشرفی نے لکھا ہے کہ: بیدی کا فن بت طناز کا فن ہے۔ وہ اشارے کنائے اور رمز وعلامت کے ذریعے اپنا مافی الضمیر ادا کرتے ہیں۔ یہ بات یہاں کلی طور پر صادق آتی ہے۔ اس افسانے میں طوائف خانے کی باتیں جب سبطے کی بیوی تک پہنچتی ہیں تو وہ مدن کو برا بھلا کہتی ہے اور پھر یہ خبر گشت کرتی ہوئی جب اندو تک پہنچتی ہے تو اندو کو بہت صدمہ پہنچتا ہے اور اسے احساس ہوتا ہے کہ مدن کی زندگی کا ازدواجی پہلو اس سے جانے انجانے میں نظر انداز ہوتا رہا ہے جبھی مدن نے بازاری عورتوں کی طرف رخ کیا ہے۔ لہٰذا وہ اپنے وعدے کے مطابق مدن کا یہ دکھ بھی اپنانے کی کوشش کرتی ہے اور اس کوشش میں ایک شام وہ چہرے پر پوڈر تھوپ کر گالوں پر روج لگا کر اور لپ اسٹک نہ ہونے کی وجہ سے ماتھے کی بندی سے ہونٹ رنگ کر اور اپنے بالوں کو اس طرح سے سجاتی سنوارتی ہے کہ مدن کی تشنہ نگاہیں ان میں الجھ کر قید ہو سکیں۔ مدن یہ سب کچھ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔

شادی کے 15 برس گزر جانے کے بعد اندو کو آج فرصت ملی تھی اور وہ بھی اس وقت جب چہرے پر جھائیاں چلی آئی تھیں۔ لیکن اندو ایسا بندوبست کرتی ہے کہ اس کے جسم میں کوئی نقص نظر نہیں آتا ہے۔ وہ بنی ٹھنی، کسی کسائی مدن کو بے حد حسین لگ رہی ہوتی ہے۔ وہاں گھوڑی اور لگام کو دیکھ کر مدن کو اس پر رحم آنے لگتا ہے اور ایک ذرا سا بھی محسوس ہوتا ہے کیونکہ اس کے گھر کی گنگا طغیانی پر تھی۔ مدن جانتا ہے کہ ہلکی بارش تیز بارش سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ مدن اس کی محبت میں مدہوش ہو کر اندو کی تھوڑی اوپر اٹھا کر دیکھتا ہے کہ اتنے برسوں میں اس نے کیا کھویا کیا پایا ہے:

اندو کہتی ہے۔ ''آج کی رات میری ہے۔'' وہ مدن سے چمٹ جاتی ہے:

''آج برسوں کے بعد میرے من کی مراد پوری ہوئی ہے، اندو! میں نے ہمیشہ چاہا تھا۔''

''لیکن تم نے کہا نہیں'' — اندو بولی — ''یاد ہے شادی کی رات میں نے تم سے کچھ مانگا تھا؟''

''ہاں!'' مدن بولا — ''اپنے دکھ مجھے دے دو۔''

''تم نے کچھ نہیں مانگا مجھ سے۔''

''میں نے؟'' مدن نے حیران ہوتے ہوئے کہا — ''میں کیا مانگتا؟ میں تو جو کچھ مانگ سکتا تھا وہ سب تم نے دے دیا۔ میرے عزیزوں سے پیار — ان کی تعلیم، بیاہ شادی۔ یہ پیارے پیارے بچے یہ سب کچھ تو تم نے دے دیا۔''

"میں بھی یہی سمجھتی تھی۔" اندو بولی۔ "لیکن اب جا کر پتہ چلا، ایسا نہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"کچھ نہیں۔" پھر اندو نے رک کر کہا۔ "میں نے بھی ایک چیز رکھ لی۔"

"کیا چیز رکھ لی؟"

"اندو کچھ دیر چپ رہی اور پھر اپنا منھ پرے کرتی ہوئی بولی۔ "اپنی لاج۔ اپنی خوشی۔ اس وقت تم بھی کہہ دیتے۔ اپنے سکھ مجھے دے دو۔ تو میں۔" اور اندو کا گلا رندھ گیا۔

اور کچھ دیر بعد وہ بولی۔ "اب تو میرے پاس کچھ نہیں رہا۔"

مدن کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ زمین میں گڑ گیا۔ یہ ان پڑھ عورت؟

۔ کوئی رٹا ہوا فقرہ۔؟

نہیں تو۔ یہ تو ابھی سامنے ہی زندگی کی بھٹی سے نکلا ہے۔ ابھی تو اس پر برابر ہتھوڑے پڑ رہے ہیں اور آتشیں برادہ چاروں طرف اڑ رہا ہے۔"

یہاں اندو اپنے مدن کے لیے وہ سب کچھ کرتی ہے جس سے اس کا شوہر اس کے اندر دلکشی محسوس کرے۔ اسے ایک بیوی کی بے اعتنائیوں سے جو دکھ پہنچا ہے اور جس کے مداوا کے لیے وہ گھر سے باہر کی طرف رخ کر رہا ہے۔ اندو چاہتی ہے کہ وہ سارا دکھ خود اپنا لے اور اس کے عوض میں اپنی ساری خوشیاں اور اپنا سارا سکھ اس پر نثار کردے۔ وہ اسے ایک ایسی دنیا میں لے جاتی ہے جہاں انسان مر کر ہی پہنچ سکتا ہے۔

اندو میں یہ سوج بوجھ اس چڑیل مُنیا کی وجہ سے آتی ہے جو دیولوک سے اندو کے بطن میں آ گئی تھی اور رو رو کر چیخ چیخ کر اندو کو اپنی طرف سے بددل کر دیتی ہے اور اندو اسے روتا بلکتا چھوڑ کر مدن سے چمٹ جاتی ہے۔ جب مدن اندو کے اندر دلچسپی لینے لگتا ہے اور اس کی طرف کلی طور سے متوجہ ہو جاتا ہے تو۔۔۔

"بچی اب تک خاموش ہو چکی تھی گویا دم سادھے دیکھ رہی تھی، اب کیا ہونے والا ہے؟"

یہاں آواگون کے سلسلے کی ایک کڑی پوری ہوتی ہے۔ دھنی رام کی طرح اب مدن کی ماں بھی بیٹے اور بہو کے گرہست جیون کا سکھ دیکھ کر طمانیت کی سانس لیتی ہے۔

اس کہانی میں تین اہم کردار ہیں اندو، مدن اور دھنی رام۔ اندو، بہو ہے اور مدن اس کا شوہر اور دھنی رام اندو کا سسر ہے۔ اس کہانی کے واقعات ان کرداروں سے بنی تثلیث میں گردش کرتے رہتے ہیں۔ اس کہانی کے کرداروں میں ہمیں پریم چند کی کہانی 'کفن' کے ان ہی رشتوں کے گرد گھومتی کہانی کے تین کرداروں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ جہاں باپ بیٹا اور بہو بالترتیب گھیسو، مادھو اور بودھیا ہیں۔ وہ سب بھی درج فہرست ذات کے افراد تھے اور ایک اہم واقعہ جس کا بیدی نے بھی قدرے تفصیل سے ذکر کیا ہے وہ دردِ زہ ہے۔ لیکن یہاں افلاس 'کفن' کے علی الرغم انتہا کو پہنچی ہوئی نہیں ہے اور نہ ہی زچہ بچہ کی طرف سے لاپرواہی ہے بلکہ اس کی دیکھ ریکھ میں باپ بیٹے یہاں ایک دوسرے سے سبقت لے جانا چاہتے ہیں۔

دھنی رام خوش ہیں کہ ان کے گھر میں بھی کوئی صحت والا جیو آیا ہے۔ ورنہ تمام عمر دوا کی شیشیاں ڈھوتے

اور اسپتال کی سیڑھیاں ناپتے گزری تھی۔ وہ بہو کو دیکھتے:

"تو انھیں موٹے موٹے گدرائے ہوئے جسم والے کئی بچے بغل میں، جانگھ پر، گردن پر چڑھتے اترتے ہوئے محسوس ہوتے اور ایسا معلوم ہوتا جیسے ابھی اور آرہے ہیں۔ پہلو پر لیٹی ہوئی بہو کی کمر زمین ساتھ کو لیے چھت کے ساتھ لگ رہے ہیں اور وہ دھڑا دھڑ بچے جنتی جارہی ہے اور ان بچوں کی عمر میں کوئی فرق نہیں۔ کوئی بڑا ہے نہ چھوٹا۔ بھی ایک سے جڑواں — توام — اوم نمو بھگوتے —"

دھنی رام بہو کا اس وجہ سے بھی خیال رکھتے ہیں کہ خود ان کی بیوی دق کے عارضے میں قبل از وقت چل بسی تھی جب بڑا بیٹا مدن ابھی صرف سات سال کا تھا اور اس سے چھوٹے کندن، دلاری منی اور پاشی ابھی بہت چھوٹے تھے۔ انھیں سنبھالنے والا گھر پر کوئی نہ تھا اور چھوٹا پاشی چینٹیوں کے بل پر سو جایا کرتا تھا۔ دھنی رام نہیں چاہتے تھے کہ ان کی بہو کا بھی وہی حشر ہو جو مدن کی ماں کا ہوا تھا۔ وہ بہو کو دودھ پلانے کے لیے اس کی کھٹیا کے پاس آجاتے:

اندو اپنے آپ کو سمیٹتے ہوئے اٹھتی اور کہتی — "نہیں بابو جی! مجھ سے نہیں پیا جاتا۔"

"تیرا تو سسر بھی پیے گا۔" وہ مذاق سے کہتے۔

"تو پھر آپ پی لیجئے نا۔" اندو ہنستی ہوئی جواب دیتی اور بابو جی ایک مصنوعی غصے سے برس پڑتے — "تو چاہتی ہے بعد میں تیری بھی وہی حالت ہو جو تیری ساس کی ہوئی؟"

"ہوں — ہوں —" اندو لاڈ سے روٹھنے لگتی۔ آخر کیوں نہ روٹھتی۔ وہ لوگ نہیں روٹھتے جنھیں منانے والا کوئی نہ ہو۔ لیکن یہاں تو منانے والے سب تھے، روٹھنے والا صرف ایک۔"

اندو کو جب کبھی پیٹ میں درد ہوتا اور کندن آکر کہتا کہ "بابو جی — بھابی رو رہی ہے۔" تو دھنی رام ایک دم بیتے دنوں کی یاد میں کھو جاتے تھے۔ انھیں اپنے جیون ساتھی کی یاد ستانے لگتی تھی۔ وہ آسمان کی طرف پر ماتما کے گلزار کو دیکھتے اور اپنے من کے بھگوان سے پوچھنے لگتے:

"چاندی کے ان کھلتے، بند ہوتے ہوئے پھولوں میں میرا پھول کہاں ہے؟" اور پھر پورا آسمان انھیں درد کا ایک دریا دکھائی دینے لگتا اور کانوں میں ایک مسلسل ہاؤ ہو کی آواز سنائی دیتی جسے سنتے ہوئے وہ کہتے — "جب سے دنیا بنی ہے انسان کتنا رویا ہے!" اور وہ روتے روتے سو جاتے۔"

اس مقام پر بیدی کا یہ افسانہ "اپنے دکھ مجھے دے دو" ان کی اپنی آپ بیتی معلوم ہونے لگتا ہے۔ کیونکہ بیدی کے والد ان کی ماں کو بہت جی جان سے چاہتے تھے اور اکثر انھیں رات رات بھر جاگ کر کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ ان کا جب انتقال ہوا تو اسی مہلک بیماری یعنی دق کے عارضے سے ہوا تھا۔ اس وقت بیدی کے دو چھوٹے بھائی اور ایک بہن اس وسیع دنیا میں بے یار و مددگار ہو کر رہ گئے تھے۔ اس کے بعد بیدی کی شادی 19 برس کی عمر میں کر دی گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس وقت ان کے والد بھی کچھ ایسی ہی کیفیت سے دوچار ہوئے ہوں گے۔ اس کیفیت کو بیدی نے اپنے تخیل کی آمیزش سے افسانے کا روپ دے دیا ہے۔

پروفیسر وہاب اشرفی کا خیال ہے کہ "اپنے دکھ مجھے دے دو" اپنے آپ میں ایک مکمل افسانہ ہے اور اسے دنیا کی کسی بھی زبان کے کسی عظیم افسانے کے ہم پلہ رکھا جاسکتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ "وہ (بیدی) باتوں کو صرف بیان نہیں کر دیتے بلکہ ان کے لیے ضروری

استعارے وضع کرتے ہیں لہٰذا اپنے اس قول کی صداقت کے لیے انہوں نے بیدی کا یہ اقتباس بجا طور پر نقل کیا ہے ملاحظہ کریں:

"ان عورتوں کے اپنے دن بیت چکے تھے۔ پہلی رات کے بارے میں ان کے شریر شوہروں نے جو کچھ کہا اور مانا تھا اس کی گونج تک ان کے کانوں میں باقی نہ رہی تھی۔ وہ خود رس بس چکی تھیں اور اب اپنی ایک اور بہن کو بسانے پر تلی ہوئی تھیں۔ دھرتی کی یہ بیٹیاں مرد کو یوں سمجھتی تھیں جیسے بادل کا ٹکڑا ہو جس کی طرف بارش کے لیے منہ اٹھا کر دیکھنا ہی پڑتا ہے۔"

بابو دھنی رام کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ پنڈت، کائستھ، ویش یا راجپوت نہیں ہے بلکہ نچلے طبقے کے اور درج فہرست ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ اس دلت پریوار میں سسر کی خدمت کے لیے وہ بہو جس کی حالیہ شادی ہوئی ہے کالکا جی سے سہارن پور چلی جاتی ہے۔ ہر چند کہ اس کے ساتھ اس کے چھوٹے چھوٹے دیور اور نند بھی ہیں لیکن وہ شوہر کو کالکا جی میں تنہا چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ وہاں بڑا سرکاری مکان ہے اور پردہ کا کوئی ایسا رواج نہیں ہے جو متوسط طبقے کے اونچی ذات کے ہندوؤں میں یا مسلمانوں کے یہاں روا رکھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سوئی ہوئی حالت میں اندو کو دیکھ کر دھنی رام اندازہ لگا لیتے ہیں کہ وہ پیٹ سے ہے۔ اس کے یہاں وہاں پڑے اتارے ہوئے کپڑے تہہ لگا کر ٹھیک سے رکھ دیتے ہیں۔ اسی طرح مدن اور اندو کے درمیان جو مکالمے پیش کیے گئے ہیں ان میں باپ بیٹے کا لحاظ اور کوئی پردہ حائل نہیں دکھائی دیتا جس سے کہ متوسط طبقہ اور خاندانوں کے اخلاق و آداب کی کوئی جھلک دیکھی جا سکے بلکہ یہ نچلی ذات کی طرز معاشرت کی نمائندگی کرتے ہیں:

"بابو جی تم سے بہت خوش تھے؟"

"ہاں!" اندو بولی — "ایک دن میں جاگی تو دیکھا سرہانے کھڑے مجھے دیکھ رہے ہیں۔"

"ہاں!" مدن نے سوچتے ہوئے کہا — "کتابوں میں اسے سیکس کہتے ہیں۔"

"سیکس؟" اندو نے پوچھا — "وہ کیا ہوتا ہے؟"

"وہی جو مرد اور عورت کے بیچ ہوتا ہے۔"

"ہائے رام!" اندو نے ایک دم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا — "گندے کہیں کے — شرم نہیں آئی بابو جی کے بارے میں ایسا سوچتے ہوئے؟"

"بابو جی کو شرم نہ آئی تجھے دیکھتے ہوئے؟"

"کیوں؟" اندو نے بابو جی کی طرف داری کرتے ہوئے کہا — "وہ اپنی بہو کو دیکھ کر خوش ہو رہے ہوں گے۔"

"کیوں نہیں، جب بہو تم ایسی ہو۔"

وارث علوی نے لکھا ہے، بیدی عورت کے ہمدرد ہیں۔ اس کی بپتا کو سمجھتے ہیں لیکن Feminist نہیں ہیں۔ اسی طرح میں سمجھتا ہوں کہ بیدی دلتوں کے ہمدرد ہیں۔ ان کی بپتا کو سمجھتے ہیں۔ لیکن وہ دلت اتیاچار کی کہانی نہیں لکھتے ہیں اور وہ دلت پرامرش کے کہانی کار نہیں ہیں۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے "اپنے دکھ مجھے دے دو" میں کچھ اساطیری نکات واشگاف

کرتے ہوئے ان پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے جس سے اس کہانی میں مضمر اسطوری سطح کی گہرائی اور گیرائی کی تفہیم میں مدد ملتی ہے اور ہندوستانی دیو مالا کی بظاہر پوشیدہ جہتیں روشن ہوجاتی ہیں۔ ہمارے پانچ ہزار سال سے بھی زیادہ قدیم ماضی کے قصوں کی کڑیوں سے کڑیاں ملنے لگتی ہیں:

"اپنے دکھ مجھے دے دو" میں بنیادی کردار کا نام اندو ہے اور اندو پورے چاند کو کہتے ہیں جو مرقع ہے حسن و محبوبیت کا، اور جو پھلوں کو رس اور پھولوں کو رنگ دیتا ہے جو خون کو ابھارتا ہے اور روح میں بالیدگی پیدا کرتا ہے۔ اندو کو سوم بھی کہتے ہیں۔ سوم اس کی رعایت سے آبِ حیات کا مظہر ہے۔ جس کے بغیر زندگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ کہانی میں اندو کا جوڑا مدن سے ہے۔ مدن لقب ہے عشق و محبت کے دیوتا کام دیو کا۔ اندو کو بیدی نے ایک جگہ رتی بھی کہا ہے جس سے ذہن پھر کام دیو کی طرف راجع ہوتا ہے۔ رگ وید (X-129) میں کام دیو کو وجود کا جوہر (Primal Gem of mind) کہا گیا ہے جس سے کائنات کی تخلیق ہوئی۔ یونانی ضمیات میں ایروز (Eros) یا کیوپڈ (Cupid) کا تصور بھی اسی حیثیت سے آیا ہے۔ گویا کرداروں کے ناموں ہی سے سرشتی کے مثبت اور منفی تتوں رعناصر (Elements) کے ملنے اور تخلیق کے لامتناہی عمل کے شروع ہونے کا آفاقی احساس پیدا ہونے لگتا ہے:

"کہانی کا بنیادی خیال عورت اور مرد کی کشش کا یہی پراسرار عمل ہے۔ بیدی کا ذہن چونکہ دیو سے زیادہ دیوی کی طرف یا تہذیب کے آبائی تصور سے زیادہ مادری تصور کی طرف راجع ہے۔ اس لیے تخلیق کے اس ازلی اور ابدی عمل میں بنیادی اہمیت مرد کو نہیں عورت کو حاصل ہے۔ مدن محض آلۂ کار ہے، تخلیقی عمل کی تکمیل کا، جنسی کشش کی تشخیص کا، یا اندو کو بتدریج ادھورے سے پورا بنانے کا، اندو موضوع ہے اور مدن اس کا معروض ہے۔"

(فکشن شعریات تشکیل و تنقید، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔6، ص:95-94)

اپنے دکھ مجھے دے دو بیدی کا ایک شاہکار افسانہ ہے۔ اس بات کی تائید کرتے ہوئے باقر مہدی نے اس افسانے کے موضوع اور فن کے محاسن بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"بیدی کے فن کی جلوہ گری اس کہانی میں نمایاں ہے۔ اس کی مانوس گھریلو فضا، اس کے معمولی لوگ، ان کے غم اور خوشی اور ایک ایسا ڈرامائی موڑ جب بیوی اپنے کو طوائف کی طرح سجاتی ہے تاکہ وہ پھر سے اپنے شوہر کو پالے اور اس کہانی کی سچائی افسانوی ہوتے ہوئے بھی حقیقت سے زیادہ سچی معلوم ہوتی ہے۔ یہی اس کہانی کے شدید تاثر کا راز ہے۔ اس میں بیدی کا فن اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ اس میں ایک عورت کا صرف غم ہی نہیں ہے بلکہ زندگی کی اس ابدی محرومی کا اظہار ہے جو جیتے جی آدمی کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ شاید زندگی اسی کا سہارا لے کر ہمیشہ سنبھالا لیتی ہے۔"

(بیدی کا فن، ادب اور تنقید، اسلوب احمد انصاری، سنگم پبلشرز، الہ آباد، 1968، ص:291)

بیدی کے اس افسانے میں انسانی زندگی کے بنیادی جذبوں اور قدروں کی آویزش نے اسے آفاقیت عطا کردی ہے۔ مرد اور عورت کا جنسی رشتہ ایک ایسی حقیقت ہے جو بنی نوع انسان کے کسی بھی سماج کے استقرار میں ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی رشتے کے سہارے زندگی آگے بڑھتی ہے۔ مرد اور عورت گرہستی کی گاڑی کے دو پہیے

ہیں جن کے حسن توازن سے حیات کا سفر سبک رو اور تیز گام رہتا ہے ان کا توازن بگڑ جائے تو ڈھلتی ہوئی عمر کی کسی اندو کو اپنے مدن سے متوازن اور مساوی رفتار حاصل کرنے کے لیے مصنوعی بناؤ سنگھار کی ضرورت درپیش آتی ہے۔

لیکن وارث علوی نے عورت کے اسطور کے اندر مضمر آرکی ٹائپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اندو اور مدن کے اس پراسرار رشتے کی تفصیل بیان کی ہے جس کی حفاظت خود فطرت کرتی ہے کیونکہ عورت اپنے آپ میں قدرت کی عظیم تخلیق بھی ہے اور عورت تخلیق کا سرچشمہ بھی ہوتی ہے۔ فطرت کی اس نمائندگی کرنے والی عورت کی حفاظت بھی فطرت ہی کرتی ہے اور اس کی عفت پر کوئی آنچ آنے نہیں دیتی ہے۔

''مدن کے لیے اندو روح ہی روح تھی۔ اندو کے جسم بھی تھا لیکن وہ ہمیشہ کسی نہ کسی وجہ سے مدن کی نظروں سے اوجھل ہی رہا۔ ایک پردہ تھا خواب کے تاروں سے بنا ہوا۔ آہوں کے دھوئیں سے رنگین، قہقہوں کی زرتاری سے چکا چوند جو ہر وقت اندو کو ڈھانپے رہتا تھا۔ مدن کی نگاہیں اور اس کے ہاتھوں کے دوشاسن صدیوں سے اس دروپدی کا چیر ہرن کرتے آئے تھے جو کہ عرف عام میں بیوی کہلاتی ہے۔ لیکن ہمیشہ اسے آسمانوں سے تھانوں کے تھان، گزوں کے گز کپڑا ننگا پن ڈھانپنے کے لیے ملتا آیا تھا۔ دوشاسن تھک ہار کے یہاں وہاں گر پڑے تھے۔ لیکن دروپدی وہیں کھڑی تھی۔ عزت اور پاکیزگی کی سفید ساڑی میں ملبوس وہ دیوی لگ رہی تھی۔''

عورت تو مرد کے لیے جسم ہی جسم ہے۔ وہ جسم جس کے وہ خواب دیکھتا ہے، آہیں بھرتا ہے اور جو اصل عورت کو اس کی روح کو اوجھل رکھتا ہے۔ اس کا بدن چاہے جتنا استعمال ہو۔ شوہر کے ہاتھوں اسے خریدا اور بیچا جائے۔ اس سے جنگ اور فسادات میں زنا بالجبر کیا جائے۔ لیکن جو اصل عورت ہے، اندو ہے، دروپدی ہے اسے یہ جسم اوجھل رکھتا ہے اور اصلی عورت کو فطرت ننگا ہونے نہیں دیتی۔ مرد کے سامنے آنے نہیں دیتی۔ وہ اس کے بدن کے پیچھے ہی چھپی رہتی ہے۔

ماں اور گرہستن کے روپ میں اندو مثالی عورت تھی جو غیر شعوری طور پر ہی سہی فطرت عورت کو مار کر پیدا ہوئی تھی۔ آج کی رات پھر فطری عورت جاگتی ہے اپنا گھر سنسار بچانے کے لیے، اپنا مرد، بچوں کا باپ اور گھر کے رکھوالے کو دوبارہ پانے کے لیے مثالی عورت فطری عورت کو مار کر گھر سنسار چلاتی ہے لیکن اسے بچانے کے لیے فطری عورت کو دوبارہ زندہ کرنا پڑتا ہے:

''اپنے دکھ مجھے دے دو'' وارث علوی کے خیال کے مطابق: ''ایک مثالی عورت کی نہیں بلکہ ایک بھری پُری فطرت کی کہانی ہے۔ وہ اپنی فطرت ہی میں ایروم کی سہانی وادی ہے جس سے اٹھتے ہوئے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے بچوں اور بوڑھوں کو سلاتے ہیں اور شوہر کو جگاتے ہیں۔''

اس طرح سے دیکھا جائے تو راجندر سنگھ بیدی کی یہ کہانی ایک ڈھلتی عمر کی گرہستن کے باطن میں گم گشتہ سچی عورت کی بازیافت کی کہانی ہے جو صحیح معنوں میں مادّے پر روحانیت کی، حیوان پر انسانیت کی اور ہوس پر محبت کی فتح کی ایک لازوال کہانی بن جاتی ہے۔

☆☆

منٹو تعبیر اور نام نہاد ترقی پسندی

● اکرم پرویز

منٹو کی تخلیقی روح کی دریافت ترقی پسند تحریک سے متعلقہ نام نہاد ترقی پسندی کی محتاج ہے؟ نام نہاد ترقی پسندی کی فکریات کے فریم ورک میں منٹو کے اجتہادی اسالیب کی تحدید ممکن ہے؟ یوں بھی جو تحریک اپنے اغراض ومقاصد کی تکمیل کے لیے تشکیل ہوئی ہو اسے کسی فن کار کے تخلیقی کرب سے کیا اُنس؟ جس تحریک کا منشور ہر نوع کے ادبی اقدار اور جمالیاتی معیار کی رَد پر تعمیر کیا گیا ہو، اسے ادبی معاملات سے کیا غرض؟ منٹو کا تخلیقی سفر ایک مضطرب روح کا سفر ہے جسے برصغیر کی ثقافتی اور اخلاقی تفہیم میں امتیازی نشان کی حیثیت حاصل ہے۔ منٹو اوڈیسی کو پارٹی لائن اور منشوراتی سیاق میں دریافت کرنا چہ معنی دارد؟

> The doctrine taugt that it was the writer's duty 'to provide a truthful, historico-concrete portrayal of reality in its revolutionary development', taking into account 'the problem of ideological transformation and the education of the workers in the spirit of socialism'.Literature must be tendentious, 'party-minded', optimistic and heroic; it should be infused with a 'revolutionary romanticism', portraying Soviet heroes and prefiguring the future.[1]

منٹو کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ بہ یک وقت اسے دو متضاد نظریات کا حامی قرار دیا گیا۔ اسے ترقی پسند سے ملقب اور رجعت پسندی سے متقرب قرار دینے کے پس پردہ سیاسی عوامل اور غیر ادبی رویے کارفرما تھے مگر ان سب کے مابین منٹو تعبیر کا حق ادا نہ ہو سکا۔ منٹو آج بھی اردو ناقدین کی گرفت سے باہر تنہا اپنی وجودی الجھنوں سے برسرِ پیکار ہے یا شاید اس نے خدا سے مباحثہ کا آغاز کر دیا ہے کہ دیکھتے ہیں فنِ افسانہ نگاری میں کون یکتا ہے؟ یوں

بھی اسے نام نہاد ترقی پسندوں کی کیا ضرورت کہ اُن کی ادبی بددیانتی جگ ظاہر ہے اور اس میں کسی نوع کا کوئی مبالغہ نہیں۔ اس حوالے سے دو باتوں کا ذکر کیا جا سکتا ہے: پہلی بات یہ ہے کہ 'زیوقن' کے شمارہ نمبر 40 میں احمد علی کا گوشہ شائع ہوا ہے۔ احمد علی وہی ہیں جنھوں نے انگارے مرتب کی تھی اور یہ ترقی پسندوں کا ابتدائی عملی کارنامہ تھا۔ اسی احمد علی نے ہماری گلی نام سے اردو کا ایک شاہکار افسانہ بھی تشکیل دیا ہے۔ لیکن بعد میں انھوں نے اردو پر انگریزی کو ترجیح دی اور یہی ان کا اوڑھنا بچھونا بنی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ ترقی پسندوں کی ادبی بددیانتی اور ادب کی سیاسی تبلیغ سے نالاں تھے۔ یہ نام نہاد ترقی پسندوں کی انتہا پسندی ہی تو ہے کہ انھوں نے احمد علی جیسے خلاق ذہن کو بھی نہ بخشا۔ احمد علی نے خود لکھا ہے کہ:

> 1937 کا واقعہ ہے۔ ترقی پسند تحریک پر سجاد ظہیر اور محمود الظفر حاوی ہو گئے تھے۔ ان میں ڈاکٹر عبدالعلیم بھی شامل تھے۔ ان لوگوں نے ترقی پسند تحریک کو روس کی کمیونسٹ پارٹی کے مینی فیسٹو پر چلانا شروع کر دیا تھا۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی کے طور پر انھوں نے اعلان کیا کہ ترقی پسند تحریریں ہمیشہ مزدور اور کسان کی زندگیوں کے بارے میں ہوتی ہیں لہٰذا مزدور اور کسان کے مسائل اور موضوع سے ہٹ کر جو کچھ بھی لکھا جائے گا اسے ترقی پسندی قرار نہیں دیا جائے گا۔ میں نے اس اعلان پر شدت سے احتجاج کیا۔ میرا موقف یہ تھا کہ زندگی کے ہر پہلو میں ترقی پسندی موجود ہے۔ خیر یہ تنازعہ سال بھر چلتا رہا۔ ہمارے درمیان تصفیہ کرانے کے لیے لندن سے ملک راج آنند کو بھیجا گیا لیکن تصفیہ نہ ہو سکا اور میں تحریک سے بالکل الگ ہو گیا اور تبھی سے میں نے اردو چھوڑ کر انگریزی زبان میں لکھنا شروع کر دیا۔[2]

Terry Eagleton کی کتاب سے مقتبس حصہ اور احمد علی کے بیانات کے مابین اشتراک کا پہلو، ملحوظ خاطر رہے۔ یوں احمد علی کے انکشاف سے ہندوستان میں ترقی پسندوں کی نام نہاد ترقی پسندی کا سیاسی اور خود غرضانہ کردار پوری طرح سے روشن ہو جاتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ترقی پسندوں کے ریاکارانہ رویّے کی ایک مثال آپ کو 'مقتل' میں ملے گی۔ یہ کتاب محض افسانوں پر ہی مشتمل نہیں ہے بلکہ اس میں اردو ادب کے نام نہاد ترقی پسندوں کے ریاکارانہ اور مکروہ رویّے کا 'جھٹکا' بھی بڑے سلیقے سے کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے سردار جعفری اور اشک کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ مین را کا 'دھڑن تختہ' نہ صرف ان ادیبوں کی مریضانہ ذہنیت کو اجاگر کرتا ہے بلکہ پوری اردو بستی کے دوہرے چرتر کو بھی منکشف کرتا ہے۔ آپ اس پورے واقعے کی تفصیل 'مقتل' میں مین را جرنل کے تحت پڑھ سکتے ہیں۔ اس حوالے سے سردار جعفری والے واقعے کو مختصراً بیان کیا جاتا ہے: 'ہوا یوں کہ مین را کرکٹ میچ دیکھنے کے لیے ممبئی گئے۔ ممبئی میں ہی سردار جعفری مقیم تھے اور اپنا رسالہ 'گفتگو' نکال رہے تھے۔ مین را سے حسن کمال نے کہا کہ 'گفتگو' کے لیے، افسانے کے نئے موڑ پر ایک مباحثہ ریکارڈ کیا جائے گا۔ جس میں بیدی (اتفاق سے، بیدی کی جگہ مہندر ناتھ اس مباحثہ کے لیے تشریف لائے)، انور عظیم کے ساتھ آپ بھی شامل ہیں'۔ اسی مباحثے کے دوران میں مین را نے کہا کہ:

میں کرشن چندر کو کمرشیل رائٹر سمجھتا ہوں بلکہ نان رائٹر اور ثابت کر سکتا ہوں۔ یوں میری جڑیں کہاں ہیں، یہ جاننا مشکل ہے۔ ابھی میں اتنا ہی کہہ پایا تھا (میں فرش پر نظریں گاڑے بول رہا تھا اور سب توجہ سے سن رہے تھے۔ میں یہ محسوس کر رہا تھا) کہ مہندر ناتھ اٹھ کھڑے ہوئے اور انھوں نے کہا: Bastard... I will slap you۔ سب چکرا گئے۔ سب سے زیادہ پریشانی سردار جعفری کو ہوئی کہ ہم ان کے ہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ 3

مہندر ناتھ کو سردار جعفری نے الگ کمرے میں لے جا کر سمجھایا اور انھوں نے مین را سے معافی مانگ لی۔ اس واقعے نے مین را جیسے حساس شخص کو ہلا کر رکھ دیا:

میں غیر متوقع طور پر خاموش رہا۔ مجھے اتنا افسوس نہیں تھا جتنا تعجب۔ میں کرشن چندر کے بارے میں کچھ کہہ رہا تھا۔ ایک افسانہ نگار کے بارے میں، کسی کے بھائی کے بارے میں نہیں۔ اور سنا ہے مہندر ناتھ بھی افسانہ نگار ہیں، اس لیے مجھے اور بھی تعجب ہوا۔ 4

ممبئی کے سفر کے دوران میں ہی، مین را نے اپنا افسانہ 'پورٹریٹ ان بلیک اینڈ بلڈ' تشکیل دیا اور اشاعت کی غرض سے سردار جعفری کو سونپا۔ انھوں نے اسے شائع کرنے کی یقین دہانی کی مگر 'گفتگو' میں اس کی اشاعت نہ ہو سکی۔ سردار جعفری نے اس کی وجہ بتائی کہ افسانہ مبہم ہے اور نہ صرف ان کے بلکہ کئی لوگوں کی فہم سے بھی بالا تر ہے لہٰذا وہ اسے شائع کرنے سے قاصر ہیں۔ مین را بھی فنکار تھے اور اپنے commited رویّے کے باعث سردار جعفری پر پل پڑے۔ ان کا افسانہ 'تحریک' (گوپال متل) میں شائع ہوا اور اردو دنیا اور نام نہاد ترقی پسندی کا مکروہ چہرا مشتر کہ طور پر سامنے آیا۔ یہ محض تمہید ہے۔ مکمل کہانی کی تفہیم کے لیے 'مقتل' کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ یہ محض سردار جعفری کی دوہرے مزاج کو ہی نہیں اجاگر کرتا بلکہ ان جیسے دوسرے تمام ترقی پسندوں کی نام نہاد ترقی پسندی کا بھی اظہاریہ ہے۔ 'مقتل' میں مذکور اس واقعہ میں اردو لابی، سیاست اور مفاد پرستی کی ایک 'جدید کہانی' "مستر" ہے جو وابستگی اور مکھوٹا دھاری وابستگی کا تیا پانچہ کرتی ہے۔ یوں اس 'جدید کہانی' سے نام نہاد ترقی پسند تجارتی اور سیاسی ذہنیت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ اسی سیاق میں منٹو کے تئیں سردار جعفری کا رویہ بھی ملاحظہ ہو، جسے خود مین را نے بھی کوٹ کیا ہے اور نام نہاد ترقی پسندوں کے ادبی Commitment کو بے نقاب کیا ہے:

سردار جعفری نے منٹو کو ایک خط میں لکھا تھا:

میں تمھاری افسانہ نگاری پر ایک طویل مضمون لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ تم کو اب تک دقیانوسی قسم کے لوگوں نے صرف گالیاں ہی دی ہیں ان سے کسی اور چیز کی توقع بیکار تھی۔ 5

اس خط کو نقل کرنے کے بعد مین را نے 'ترقی پسند ادب' کے کئی اقتباسات بھی نقل کیے ہیں۔ ایک اقتباس یہاں بھی نقل کیا جاتا ہے تا کہ سردار جعفری کا دوہرا چہرا اجاگر ہو سکے:

وہ مزدوروں کی ذہنی سطح کی پستی کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے اور فن کی بلندی کو ثابت

کرنے کی طرح طرح سے کوششیں کرتا ہے لیکن حقیقتاً وہ خود اس ذہنی سطح پر پہنچ گیا ہے
جس کی پستی گندے نالوں اور چہ بچوں تک کو شرما دیتی ہے۔[6]

یہ وہی سردار جعفری ہیں جو ترقی پسندوں کے Icon ہیں۔ امسال ان کی صدی منائی جارہی ہے۔ انھیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے 'آج کل' کے اداریہ میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ:

سردار جعفری ایک بڑے ادیب تو ہیں ہی لیکن اس سے زیادہ وہ ایک بڑے دانشور بھی ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ادیب تو کوئی بھی ہو سکتا ہے یا تھوڑی سی کوشش سے بن سکتا ہے لیکن دانشوری کسی کسی کے ہی حصے میں آتی ہے کہ دانشوری چیزے دیگر است۔[7]

اس اقتباس کو مندرجہ بالا سطروں کے سیاق میں پڑھا جائے تو سردار جعفری کی دانشوری کے تمام کوائف کھل جاتے ہیں۔ رہا منٹو کے افسانوں کا ترقی پسند کردار تو اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ منٹو ترقی پسند تھا مگر اس کی ترقی پسندی کھوٹا دھاری نہیں تھی اور نہ ہی عزیز احمد، سردار جعفری اور اشک کی طرح مصلحت پرتھی۔ منٹو کے تعلق سے ترقی پسندوں کے تھنک ٹینک کا بھی رویہ جگ ظاہر ہے۔ جس میں اشک اور عزیز احمد خصوصیت سے قابل ذکر ہیں نیز فیض ('ٹھنڈا گوشت' کے مقدمے کے حوالے سے فیض کا بیان) کا بھی ادبی Commitment مشتبہ ہے۔ لیکن نام نہاد ترقی پسندی کے حوالے سے عزیز احمد اور اشک کا رویہ زیادہ متعصّب ہے۔

منٹو نے 'ترقی پسند' کے عنوان سے ایک افسانہ تشکیل دیا ہے۔ اس افسانے میں جوگندر سنگھ (بیدی) اور ہرندر ناتھ ترپاٹھی (دیویندر ستیارتھی) کے احوال و معمولات کو طنزیہ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ اس افسانے میں نام نہاد ترقی پسندی کا مکھول اڑاتے ہوئے منٹو نے لکھا ہے کہ:

ایک دفعہ جوگندر سنگھ ایک بہت بڑے افسانہ نگار کو چائے پلا کر فارغ ہوا اور اندر رسوئی میں آ کر بیٹھا تو امرت کور [جوگندر سنگھ کی بیوی] نے پوچھا: "یہ موئی ترقی پسندی کیا ہے؟" جوگندر سنگھ نے پگڑی سمیت اپنے سر کو ایک خفیف سی جنبش دی اور کہا: "ترقی پسندی؟ اس کا مطلب تم فوراً ہی نہ سمجھ سکو گی۔ ترقی پسند اس کو کہتے ہیں جو ترقی پسند کرے۔ یہ لفظ فارسی کا ہے۔ انگریزی میں ترقی پسند کو ریڈیکل کہتے ہیں... وہ افسانہ نگار یعنی کہانیاں لکھنے والے جو افسانہ نگاری میں ترقی چاہتے ہیں، ان کو ترقی پسند افسانہ نگار کہتے ہیں۔[8]

یہاں محض نام نہاد ترقی پسندی کو ہی نشانہ نہیں بنایا گیا ہے بلکہ اس اقتباس کے تناظر میں احمد علی اور مین را والے واقعے سے سجاد ظہیر، سردار جعفری اور ان کے متبعین کی ترقی پسندی کے معانی و مطالب بھی واضح ہو جاتے ہیں۔ اس افسانے کی بھی ایک کہانی ہے۔ اس کہانی کی تفہیم کی رو سے مناسب ہے کہ 'مقتل' اور عبدالسمیع کا مضمون 'منٹو اور ستیارتھی' (مشمولہ دنیا زاد شمارہ 38 اور ایوان اردو فروری 2013) کا مطالعہ کیا جائے تاکہ اس کے مختلف ابعاد اپنے پورے سیاق و سباق میں پوری طرح سے روشن ہو سکیں۔ ترقی پسندی کے

جس رویے کو اس اقتباس میں منٹو اجاگر کرتا ہے اسے ہی سلیم احمد نے سطحیت سے تعبیر کیا ہے۔ یہاں منٹو کے طنزیہ رویے کا تعلق بیدی اور ستیارتھی کے کردار کو مسخ کرنے سے نہیں ہے بلکہ اس کا فکری موقف نام نہاد ترقی پسندی کی شرح سے مخصوص ہے۔ منٹو ایک Genuine فنکار تھا (مگر آج ہر کوئی Genuine فنکار ہے؟)۔ لہٰذا، یہ ممکن ہی نہیں کہ ترقی پسند تحریک سے منسلک نام نہاد ترقی پسندوں کے سیاسی اور ذاتی مفادات اس کی نظروں سے پوشیدہ ہوں۔ یوں اس نے ترقی پسندی کے منفی پہلو اور اس کی سطحیت کو اجاگر کرنے کی غرض سے 'ترقی پسند' تشکیل دیا۔ ممکن ہے کہ متن کو طنز سے چوکھا کرنے کے لیے اس نے اپنے ہمعصروں کو اس کا کردار بھی بنایا ہو۔ چونکہ بیدی ترقی پسندوں کے نزدیک افسانے کے سرخیل ہیں غالباً اسی باعث منٹو نے بیدی کو اس متن میں بطور کردار پیش کیا ہے تاکہ نام نہاد ترقی پسندی کا 'دھڑن تختہ' کیا جا سکے اور ترقی پسندوں کی انا کو بھی مجروح کیا جا سکے۔ بیدی کی ذاتی واردات کو نشانہ بنانے کے تعلق سے متن میں کہیں بھی کسی نوع کا اشارہ نہیں ہے اور نہ ہی منٹو کے رویے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بیدی اور ستیارتھی کے کردار کو مسخ کیا جا رہا ہے۔ یہ تمام کھڑاگ اشک اور ان جیسے دوسرے نام نہاد ترقی پسندوں کا پھیلایا ہوا ہے۔ اس کے علی الرغم 'نئے دیوتا' کا متعصب کردار متن میں پوری طرح سے تحلیل ہے۔ یوں بھی 'نئے دیوتا' کی قرأت ستیارتھی اور بیدی کی ملی بھگت کو ظاہر کر دیتی ہے۔ جو افسانے سے بڑھ کر منٹو پر ذاتی حملے کی نوعیت رکھتا ہے۔ اس حوالے سے مین را نے لکھا ہے:

> میں ان [ستیارتھی] کی بات مان لیتا ہوں کہ نئے دیوتا، ترقی پسندی کا ردعمل نہیں تھی۔ منٹو ہی کی طرح انھوں نے اپنے قریب سے خام مواد چنا تھا اور کہانی لکھی تھی۔ اب اس کا کیا کیا جائے کہ نئے دیوتا اور اپیندر ناتھ اشک کے ہنگامہ خیز مضمون منٹو میرا دشمن کی طرح ایک منصوبہ بند تحریر نظر آتی ہے۔[9]

ترقی پسند تحریک کا کردار 'زیوس' کے نیچر سے مشابہ ہے لیکن شاید ان نام نہاد ترقی پسندوں کو معلوم نہیں کہ ایتھنا، زیوس کے سر سے ہی برآمد ہوئی تھی جیسے منٹو نے ان نام نہاد ترقی پسندوں کا سر پھاڑ کر جنم لیا ہے۔ اصل میں اردو افسانے میں منٹو کی حیثیت ایک علامت کی سی ہے اور نام نہاد ترقی پسندوں کی تفہیم یوں بھی مبہم چیزوں کے تئیں مشکوک ہے مثلاً میراجی، لہٰذا منٹو ان کی گرفت سے باہر کی چیز ہے۔ یوں اگر متن آئیڈیولوجیکل تشکیل ہے تو بھی منٹو کے فن کی تعبیر کسی نام نہاد ترقی پسندی کا حوالہ نہیں مانگتی۔ منٹو کی تفہیم کے اصول اس کے اپنے متون میں مستتر ہیں اور اگر علمیات وفکریات کی اساس پر منٹو کے فن سے معاملہ کیا جائے تو کیا ضروری ہے کہ عمرانیات اور مارکسی فکریات کے ہی ٹولز کا سہارا لیا جائے؟ مناسب تو یہ ہے کہ نفسیات، اسطور اور نئی تاریخیت کے حوالے سے منٹو کو پڑھا جائے کہ اس سے اس کے فن کے مختلف کوائف بھی اجاگر ہوں گے اور معاصر عہد میں اس کی معنویت بھی روشن ہوگی۔

آج ترقی پسند، منٹو کو ترقی پسند تحریک کا Icon ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اردو کے قاری کو

اس پر کوئی اعتراض نہیں مگر ترقی پسندوں کو منٹو سے اتنی ہی محبت اور ذہنی رفاقت ہے تو وہ پہلے سردار جعفری ،عزیز احمد اور اشک کے رویوں کو پوری صداقت کے ساتھ منصۂ شہود پر لائیں اور ان کی نام نہاد ترقی پسندی کا دھڑن تختہ کریں اگر وہ یہ کام انجام دے سکتے ہیں تو پھر انھیں منٹو کے فن پر کلام کرنے کا حق ہے کہ ادب کی اخلاقیات اسی نوع کے رویے کی متقاضی ہے۔ آج تک ترقی پسندی کا دوہرا چرتر منٹو کے فن کا تو کچھ نہ بگاڑ سکا اور نہ ہی بگاڑ سکے گا الٹا انھیں ہی لے ڈوبے گا جو کل زیوس تھے اور آج پرومیتھیس بنے بیٹھے ہیں لیکن ملحوظ خاطر رہے کہ پرومیتھیس کے اوپر مسلط ہونے والا گدھ آج کے قاری کا سمبل ہے۔ منٹو نے جو پیشین گوئی کی تھی آج اس کی صداقت سے انکار ممکن ہے؟

اگر میری موت کے بعد میری تحریروں پر ریڈیو اور لائبریری کے دروازے کھول دیے گئے اور میرے افسانوں کو وہی رتبہ دیا گیا جو اقبال مرحوم کے شعروں کو دیا جارہا ہے۔ تو میری روح سخت بے چین ہوگی میں اس بے چینی کے پیش نظر اس سلوک سے بے حد مطمئن ہوں جو اب تک مجھ سے روا رکھا گیا ہے۔ خدا مجھے اس دیمک سے محفوظ رکھے جو قبر میں میری سوکھی ہڈیاں چاٹے گی۔ آمین! ثم آمین!!10

حواشی:

1-Eagleton,Terry: Marxism and Literary Criticism, Routledge Classics, Indian Edition 2012, P:36

2۔ مسعود، طاہر: انٹرویو: احمد علی، مشمولہ نیاورق، ممبئی: شمارہ نمبر 40، ص:49

3۔ مین را، بلراج: مقتل، نئی دہلی: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، 2007، ص:322

4۔ مین را، بلراج: مقتل، ص:322

5۔ بحوالہ مین را، بلراج: مقتل، ص:327

6۔ بحوالہ مین را، بلراج: مقتل، ص:327

7۔ رحمانی، ابرار: اداریہ مشمولہ آج کل، نئی دہلی: نومبر 2013، ص:2

8۔ منٹو، سعادت حسن: کلیات منٹو (جلد اول) تحقیق، تدوین، ترتیب: شمس الحق عثمانی، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، 2006، ص:470

9۔ مین را، بلراج: مقتل، ص:388

10۔ عثمانی، شمس الحق (مرتب): منٹو بقلم خود (ایک اسمبلاژ) مشمولہ فکر و تحقیق، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، 2012، ص:377

☆☆☆

(۱)

''میر کا آرٹ'' اور نثار احمد فاروقی

● ساجد ذکی فہمی

نثار احمد فاروقی کی شخصی ہمہ جہتی اور ان کی خدمات اس قدر گراں مایہ ہے کہ اس کا اعتراف علم و ادب کی دنیا سے تعلق رکھنے والے ہر فرد و بشر کے لیے ناگزیر ہے۔ ان کی بے شمار ادبی خدمات میں سے ایک میر کی از سرِ نو بازیافت بھی ہے۔ یعنی انھوں نے اپنی تحقیقی و تنقیدی بصیرت کا سہارا لیتے ہوئے میر کی زندگی اور ان کی تخلیقات پر پڑے ہوئے اس ریشمی پردے کو چاک کرنے کی کوشش کی ہے جس کے پیچھے حقائق کی ایک دنیا آباد تھی۔ ''میر کا آرٹ'' ان نو مضامین میں سے ایک ہے جو نثار احمد فاروقی نے اپنی کتاب ''تلاش میر'' میں شامل کی ہے۔ اس کتاب میں شامل شدہ تمام مضامین ایسے ہیں جس کو پڑھ کر قارئین میر کے تئیں اپنے علم میں اضافے کا احساس شدت سے محسوس کرتے ہیں۔

نثار احمد فاروقی نے ''میر کا آرٹ'' جو میرے بحث کا موضوع بھی ہے، پر گفتگو کرنے سے پہلے پس منظر کے طور پر ہندوستان کی تاریخی، سیاسی، معاشی، تہذیبی اور اقتصادی حالات کو بھی پیش کیا ہے۔ تاکہ میر کی شخصیت جو بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر ان حالات سے متاثر تھیں، کا جائزہ لیا جا سکے۔

مغلوں کے دخول ہند کے بعد فارسی زبان نے جس سرعت سے ترقی کی وہ تاریخ کے اوراق سے پوشیدہ نہیں۔ یوں تو ہندوستان میں اس وقت بھی کئی زبانیں بولی جا رہی تھیں لیکن سرکاری سرپرستی کی وجہ سے فارسی کو جو مراعت اور رتبہ حاصل تھا وہ کسی دوسری زبان کو نہ تھا۔ تصنیف و تالیف کا معاملہ ہو یا اصول و ضوابط بنانے کا ہر معاملے میں فارسی کی اولیت مسلم تھی۔ لیکن جوں جوں مغلیہ سلطنت مائل بہ زوال ہوتی گئی فارسی کا معیار اور اس کی اہمیت بھی گھٹتی چلی گئی۔ نتیجہ، وہ زبان جو اب تک شاہراہوں اور گلیوں کی ٹھوکریں کھا رہی تھی ادب کے مسند پر بیٹھنے کو مچلنے لگی۔

یہ تو ایک خوش آئند بات تھی کہ عوامی زبان نے ادبی زبان کا رتبہ اختیار کر لیا لیکن عام مزاج چونکہ فارسی کا تھا اور جن شعرا نے فارسی سے گریز کرتے ہوئے اردو میں شاعری شروع کی تھی وہ خود بھی فارسی اسالیب کے دلدادہ تھے۔ فارسی شاعری میں چونکہ ایہام گوئی کا رواج عام تھا لہٰذا نہ چاہتے ہوئے بھی یہ

خصوصیت ان شعرا کے کلام میں در آئیں۔ لیکن نئے لکھنے والے جنھوں نے شاعری کے لیے ریختہ کا انتخاب کیا تھا اس عیب کو پہچان گئے اور اس کے خلاف ایک تحریک چھیڑ دی۔ کئی ایہام گو شعرا کو خود بھی اس عیب کا اندازہ تھا یہی وجہ تھی کہ سید سعادت علی سعادت جو امروہہ کے رہنے والے تھے ایہام گو ہوتے ہوئے بھی میر کو فارسی شاعری اور ایہام گوئی سے بعض رہنے کی تلقین کی، جس کا اعتراف میر نے اپنی آپ بیتی میں بھی کیا ہے۔ چونکہ اس وقت تک فارسی چند مخصوص حلقوں میں معتکف ہو چکی تھی اور اس کی جگہ اردو نے اپنے بال و پر نکالنے شروع کر دیے تھے لہٰذا اس عہد کا ہر چھوٹا بڑا شاعر اردو میں شاعری کرنے کو باعث فخر سمجھنے لگا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اس زبان کا تعلق قلعۂ معلٰی سے جڑ چکا تھا اور قلعۂ معلٰی سے عوام کو کس درجہ انسیت و ارادت تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ قلعہ سے تعلق رکھنے والی ہر شئے ان کے لیے اسناد کا درجہ رکھتی تھی۔ یہاں اگر دوسرے پہلو سے دیکھا جائے تو یہ بات بھی ممکنات میں سے نظر آتی ہے کہ اگر اردو کو قلعۂ معلٰی کی سرپرستی حاصل نہ ہوئی ہوتی تو اس کی شاعری پر شرفا کی جانب سے سطحیت و ابتذال وغیرہ کے الزامات عائد کر کے اسے رد کیا جا چکا ہوتا۔ اس نکتے کی طرف نثار احمد فاروقی نے بھی اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ:

"...اگر ریختہ کو قلعۂ معلٰی کی سرپرستی حاصل نہ ہوتی تو عین ممکن تھا کہ اس زمانے کے طبقۂ اشراف کا ذہن اس شاعری پر سوقیانہ پن اور ابتذال کا الزام لگا کر اسے رد کر دیتا اور یہ پودا اُگتے ہی جل جاتا۔" [1]

بہرحال جہاں عوام نے اردو زبان و ادب کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا وہیں قلعہ کی سرپرستی نے اس کی ترقی میں چار چاند لگا دیے۔ قلعہ کی سرپرستی کا ہی نتیجہ تھا کہ اس زمانے کے تقریباً تمام شعرا نے اردو میں شاعری کو باعث افتخار جانا۔ مختصر یہ کہ اس مضمون کے ابتدا میں نثار صاحب نے جو تمہید باندھی ہے اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہم میر کی شاعری کو اسی عہد کے سیاق میں پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کریں۔

نثار صاحب نے میر کے آرٹ کو سمجھنے کے لیے ان کی شاعری کو بھی تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا وہ حصہ ہے جہاں تشبیہات و استعارات، مینا کاری، فصاحت و بلاغت اور انداز بیان اپنے عروج پر ہیں۔ دوسرا وہ جو دہلی کے اٹھارویں صدی کے ماحول سے متاثر ہو کر لکھا گیا اور تیسرا جس میں میر نے فنی کرتب دکھائے ہیں۔ میر کی شاعری کے ان تینوں حصوں کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے اس بات کا بھی تذکرہ کیا ہے کہ میر کے یہاں جو اعلٰی درجے کی شاعری ملتی ہے اس کا تعلق ابتدائی دور سے ہے بعد کے بیشتر اشعار میں وہ خصوصیات جو ان کی شاعری کا خاصہ تھیں نظر نہیں آتیں۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ بعد کے اشعار پہلے کی بہ نسبت معنی آفرینی یا معیار کے اعتبار سے بلند تر ہوتے لیکن جو مقبولیت دیوان اول کی غزلوں کو حاصل ہوئی وہ بعد کے دواوین میں شامل شدہ غزلوں کو نصیب نہ ہو سکی۔ اس ضمن میں نثار صاحب تحریر کرتے ہیں:

"اگر یہ صحیح ہے کہ فن کار کا ذہن برابر نشو و نما پاتا رہتا ہے اور اس کی فکر کا ہر قدم ترقی کی

طرف اٹھتا ہے تو ہونا یہ چاہیے تھا کہ میر کا چھٹا دیوان جوان کی آخری تصنیف ہے پچھلے پانچ دیوانوں پر بھاری ہوتا اور اس میں ان کی شخصیت کا اور ان کے افکار کا عطر سما گیا ہوتا۔ لیکن غور سے مطالعہ کرنے کے بعد سمجھ میں آئے گا کہ میر کا اسلوب ایک خاص حد تک پہنچ کر رہ گیا ہے۔ ان کے آرٹ کی نمائندگی کرنے والے بہترین اشعار دیوان اول میں بیشتر اور دیوان دوم میں کمتر ملیں گے۔'' ۲

یہ بات پُر از حقائق ہے کہ فن کار کا ذہن برابر نشو و نما پاتا رہتا ہے اس لحاظ سے میر کے چھٹے دیوان کو دوسرے تمام دیوانوں کے مقابلے یقیناً معیاری ہونا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہے؟ ان کی بیشتر غزلیں یا اشعار جس کی وجہ سے میر ''میر'' کے عہدے پر فائز ہوئے دیوان اول و دوم میں موجود ہیں۔ یہاں اگر ہم دوسرے زوایہ نگاہ سے ''دیوان میر'' کا مطالعہ کریں تو دیکھیں گے کہ دیوان اول و دوئم میں میر نے جتنی غزلیں شامل کی ہیں اس کی تعداد دوسرے دواوین کے مقابلے کہیں زیادہ ہیں۔ ایسے میں بہترین غزلوں یا اشعار کا برآمد کیا جانا برعکس دوسرے دواوین کے زیادہ آسان ہے۔ رہی بات میر کے آرٹ کی نمائندگی کرنے والے اشعار کی تو چوتھے، پانچویں یا چھٹے دیوان میں ایسے اشعار کی کمی نہیں جو فنی اعتبار سے اپنے عروج پر نظر آتی ہیں اور جس پر رائج الوقت کے معیار کا لیبل چسپاں نہیں کیا جاسکتا۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

آگے کسو کے کیا کریں دست طمع دراز
وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے
وصل میں رنگ اڑ گیا میرا
کیا جدائی کو منھ دکھاؤں گا
نکالی سرکش نے چال ایسی کہ دیکھ حیرت سے رہ گئے ہم
دلوں میں کیا کیا ہمارے آیا کریں سو کیا بس چلا نہ اپنا
(دیوان پنجم)

یہ اشعار ایسے ہیں جن میں میر کی میریت اور ان کی انفرادیت پوری طرح مسلم ہے۔ ایسا نہیں کہ ان خیالات کو میر نے پہلے نہیں برتا لیکن خیالات کو جس انداز سے ان اشعار میں سمونے کی کوشش کی ہے اس کی مثالیں خود میر کے کلام میں نایاب ہیں۔ اس لیے یہ کہنا کہ ''...میر کا اسلوب ایک خاص حد تک پہنچ کر رہ گیا ہے'' قابل اعتراض ہے۔

میر کے یہاں اٹھارویں صدی کے ماحول سے متاثر ہو کر کہے جانے والے اشعار یا ایسے اشعار جس میں ژولیدہ بیانی اور فنی کرتب دکھانے کی کوشش کی گئی ہے، پورے کلیات میں خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ ان اشعار کے بارے میں نثار صاحب کا یہ کہنا کہ ''اس میں نہ میر کا آرٹ ہے نہ عصری تقاضوں کی

''تکمیل'' درست معلوم ہوتا ہے۔ اس کی تائید میں انھوں نے جو اشعار پیش کیے ہیں ان میں سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

احتراق اپنے قلب کا رونے سے کب گیا
پانی کی چار بوندیں ہیں کیا احتراق میں
بھونکا کریں رقیب پڑے کوئے یار میں
کس کے تئیں دماغ عفف ہے سگات کا
ہم عاشقوں کو مرتے کیا دیر کچھ لگے ہے
چٹ جن نے دل پہ کھائی وہ ہوگیا ہے چٹ پٹ

یہ تمام اشعار ایسے ہیں جس کو پڑھ کر با آسانی کہا جا سکتا ہے کہ اس میں میر کا ''انداز'' ہے نہ ہی ''بیان''۔ میر کا ذہن اس طرح کے اشعار یا قوافی سے مطابقت نہ رکھتا تھا لیکن اس کے باوجود انھوں نے اس طرح کے اشعار کیوں کہے؟ اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ میر یہ ثابت کرنا چاہتے ہوں کہ مجھے اس طرح کے اشعار کہنے سے عاری نہ سمجھا میں ایک خاص انداز کا شاعر نہیں بلکہ گونا گوں صلاحیتوں کا مالک ہوں۔ یا پھر تبدیل ذائقہ کی خاطر انھوں نے رواج عام کی شاعری پر طبع آزمائی کی ہو۔ بہر حال معاملہ جو بھی رہا ہو ان چند اشعار کی بنا پر ہم میر کی اہمیت وانفرادیت سے انحراف نہیں کر سکتے۔

میر کے یہاں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ لفظوں کے ساتھ ساتھ، بحروں کا بھی خاص خیال رکھتے ہیں۔ ان کی بحریں اتنی مترنم اور موسیقیت سے پر ہوتی ہیں کہ قاری بغیر پڑھے اور سامع بغیر سنے رہ نہیں سکتا۔ ان کے اشعار کو پڑھنے میں نہ دقت محسوس ہوتی ہے نہ کسی قسم کی بے ربطی کا احساس ہوتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے
تب تھے سپاہی اب ہیں جوگی آہ جوانی یوں کاٹی
ایسے تھوڑے رات میں ہم نے کیا کیا سانگ بنائے ہیں
عشق نے خوار ذلیل کیا ہم سر کو بکھیرے پھرتے ہیں
سوز و درد و داغ و الم سب جی کو گھیرے پھرتے ہیں

میر کے اس طرح کے اشعار جس میں الفاظ کے زیر و بم اپنے عروج پر نظر آتے ہیں، کے تعلق سے نثار صاحب کا یہ جملہ قابل غور ہے:

''وہ الفاظ کو اتنا گتھم گتھا کر دیتا ہے کہ پڑھنے والا مصرعہ پورا پڑھنے سے پہلے اٹک ہی نہیں سکتا اور ٹھہرے گا تو مصرعے کا خون ہو جائے گا۔'' [۳]

گرچہ بعض اصحاب نے میر کے اس انداز بیان پر ناک بھوں چڑھاتے ہوئے اسے ''فشار الفاظ'' سے تشبیہ دی اور اس کے Rythm کو عیب گردانتے ہوئے یہ پھبتی کسی کہ ان کے اشعار کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ''لفظ کے اوپر لفظ سوار ہے'' لیکن وہ یہاں یہ بھول گئے کہ میر کے یہاں ایسے اشعار سینکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں جس میں ضغطے وغیرہ کے استعمال نے اس کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ مختصر یہ کہ میر کو اس کا بخوبی اندازہ تھا کہ کس خیال کو کس انداز سے پیش کرنا ہے۔ مثال کے طور پر ایک شعر ملاحظہ فرمائیں:

شیخ جو ہے مسجد میں ننگا رات کو تھا مے خانے میں
جبہ خرقہ کرتا ٹوپی مستی میں انعام کیا

اب اگر اس شعر کو روانی سے پڑھ جائیں یا ''ننگا'' کے بعد وقوف کریں تو معنی کچھ کا کچھ ہو جائے گا لیکن اگر وقوف ''میں'' کے بعد کریں تو مصرعہ کچھ اور کہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ تقریباً پندرہ ہزار اشعار میں ایسے اشعار گاہ گاہ ہی دکھائی دیتے ہیں جہاں میر اپنے موقف میں ناکام ہوئے ہوں۔ اسی نکتے کی مزید وضاحت کرتے ہوئے نثار فاروقی صاحب نے میر کا ایک شعر

غم محبت سے میر صاحب تنگ ہوں میں، فقیر ہو تم
جو وقت ہوگا کبھو مساعد تو میرے حق میں دعا کرو گے

پیش کرتے ہوئے لکھا:

''اس میں کسی ایک لفظ کو ذرا شد و مد سے پڑھیے، یعنی پڑھتے ہوئے لہجے پر زور ڈالیے یا کسی لفظ کو کھینچ کر پڑھیے شعر کا ستیاناس ہو کر رہ جائے گا۔ اس کا مفہوم اجازت ہی نہیں دیتا کہ ایک مخصوص لب و لہجے کے سوا، کسی اور انداز میں آپ یہ شعر پڑھ سکیں۔'' [۲۸]

نثار صاحب کی یہ بات کسی حد تک تو تسلیم کی جا سکتی ہے کہ اس شعر کو ایک مخصوص انداز میں پڑھنے سے اس کی مکمل تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتی ہے یعنی وہی عاجزی وہی انکساری کا منظر جو میر کا طرۂ امتیاز بھی ہے۔ لیکن یہاں نثار صاحب کا یہ جملہ ''کسی ایک لفظ کو ذرا شد و مد سے پڑھیے... یا کسی لفظ کو کھینچ کر پڑھیے۔ شعر کا ستیاناس ہو جائے گا'' بحث طلب ہے۔ کیوں کہ اگر ہم ایک مخصوص لب و لہجے سے اجتناب برتتے ہوئے دوسرے مصرعے کے ''دعا کرو گے'' کو کھینچ کر پڑھیں تو عاجزی و انکساری کے بجائے سوالیہ منظر نامہ جلوہ گر نظر آئے گا اور اگر ''دعا کرو گے'' پر زور ڈالیں تو تاکید کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ عظیم شاعر کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ معمولی انداز بیان یا عام فہم الفاظ کو اس طرح اپنے تصرف میں لاتا ہے کہ ہر شخص اپنے مطلب کے مطابق اس سے معنی برآمد کر سکتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ ''اس کا مفہوم اجازت ہی نہیں دیتا کہ ایک مخصوص لب و لہجے کے سوا کسی اور انداز میں آپ یہ شعر پڑھ سکیں'' درست نہیں۔

بہر حال ان مباحث کے بعد نثار احمد فاروقی نے میر کے آرٹ اور اس کے فنی محاسن کو مختلف

عنوانات کے تحت تقسیم کر کے علیحدہ علیحدہ پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے انھوں نے الفاظ کی اہمیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ بات تو بلا جھجک کہی جا سکتی ہے کہ الفاظ کا انتخاب شاعری میں بہ نسبت نثر کے زیادہ مشکل ہے۔ کیوں کہ دریا کو کوزے میں بند کرنے کا ہنر شاعری میں ہی پایا جاتا ہے۔ بعد ازیں قافیہ اور ردیف کی پابندی تو شاعری بالخصوص غزل کے لیے ابتدا سے ہی پاؤں کی زنجیر رہی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ شعرا نے اس سے فرار کی کوشش بھی کی، لیکن ناکام رہے۔ شاعری میں ردیف اور قافیہ کی پابندی اور اس کی پریشانی کے تعلق سے نثار صاحب لکھتے ہیں:

> ''نظم میں سب سے پہلے تو قافیہ ہی تنگ کرتا ہے یہ سارے مضمون کا محور ہے اور بار بار بدلتا ہے۔ شاعر کی فکر کو آکاش سے پاتال تک سینکڑوں چکر لگوا دیتا ہے، پھر اس سے عہدہ برآ ہو گئے تو ردیف کا بھاری پتھر سامنے آتا ہے۔ اگر اسے بھی چوم کر چھوڑ دیا تو گویا اپنی عاجزی کا اعتراف کر لیا۔'' ۵

بعد ازیں نثار صاحب نے ردیف اور قافیے کے تعلق سے ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے یہ شعر

ہے پستاں فارسی، ہندی لبھوڑا، سانپ کا
فارسی میں اسپ ہے، ہندی میں گھوڑا، سانپ کا

نقل کیا ہے۔ اس کے بعد لکھتے ہیں ''کسی نے معلوم کیا سارا شعر واضح ہے، مگر یہ ''سانپ کا'' کیا بلا ہے، فرمایا یہ تو ''ردیف ہے''...اسے بھلا آنے سے کون روک سکتا ہے۔'' ردیف قافیے کی اسی پابندی کی وجہ سے بعض شعرا کے اشعار عروج پر نظر آتے ہیں تو بعض کے تحت الثرا میں۔ میر اس فن سے پوری واقفیت رکھتے ہیں۔ وہ اپنے اشعار میں ردیف و قافیے کے لیے ایسے الفاظ کا استعمال کرتے ہیں جن کو دوسرے شعرا معمولی اور عام فہم سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں یا اس کے استعمال کو کسر شان خیال کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

یاقوت کا یہ رنگ ہے مرجاں کا ایسا ڈھنگ ہے
دیکھو تو جھمکے ہے پڑا وہ ہونٹھ لعل ناب سا

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

وصل اس کا خدا نصیب کرے
میر جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ

ان اشعار میں سا، ہی، کیا، کچھ وغیرہ الفاظ ایسے ہیں جس کی طرف عام طور پر نگاہ نہیں جاتی اور اگر گئی بھی تو شاعر کو اس کا کلی طور پر یقین ہوتا ہے کہ ان الفاظ سے اشعار کے حسن میں خواہ ظاہری ہو یا باطنی کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔ لیکن یہی معمولی الفاظ جب میر کے تصرف میں آتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ

پورے شعر کا دارومدار ان ہی الفاظ پر منحصر ہے۔ اگر ان الفاظ کو شعر سے خارج کر دیا جائے تو معنوی اعتبار سے اس شعر کا قلعہ ڈھتا ہوا نظر آئے گا۔ لفظوں کے تعلق سے میر کے اس آرٹ کی مزید وضاحت کرتے ہوئے نثار فاروقی صاحب نے میر کا ایک شعر:

کیا تن نازک ہے جاں کو بھی حسد جس تن پہ ہے
کیا بدن کا رنگ ہے، تہ جس کی پیراہن پہ ہے

پیش کیا ہے۔ اس شعر کے تعلق سے وہ کہتے ہیں:

''اس میں تن اور پیراہن قافیہ اور ''پہ'' ردیف ہے۔ شعر میں محبوب کی نزاکت اور اس کے حسن کی صباحت کا بیان ہوا ہے۔ پہلے مصرع کی معنوی بلاغت ملاحظہ فرمائیے کہ ''جاں کو بھی حسد جس تن پہ ہے۔'' کہہ کر بدن کی انتہائی لطافت اور نزاکت کا بیان مکمل کر دیا۔ بدن کثیف چیز ہے اور اس کی بہ نسبت جان لطیف شئے ہے، لیکن محبوب کے بدن کی لطافت کا یہ عالم ہے کہ جان جیسی لطیف چیز اپنے تئیں اس کے مقابلے میں کثیف سمجھتی ہے اور اس سے حسد کرتی ہے۔ دوسرے مصرع میں صباحت کا بیان ہے تو کہنا یہ چاہتا ہے کہ رنگ اتنا شہابی اور روشن ہے کہ اس کا عکس پیراہن سے چھن رہا ہے۔ مگر نہیں، یہاں مفہوم کو بالکل برعکس کر دیا۔ پہلے مصرع میں تو ایک کثیف کو غالب اور لطیف کو مغلوب بتایا تھا، یہاں لطیف غالب اور کثیف مغلوب ہے۔ پیراہن میں کثافت ہے اور رنگ میں لطافت۔ لیکن رنگ کی شوخی کا عالم یہ ہے کہ پیراہن سے نکل پڑا ہے اور دیکھنے میں ایسا لگتا ہے کہ رنگ بدن کی تہہ اوپر ہے اور پیراہن اس کے نیچے ہے۔ اس میں سارا کمال یہ ہے کہ ایک صرف ''پہ'' پر سارے شعر کی بنیاد قائم ہے، یہ اینٹ نکال لیجیے تو شعر میں کچھ نہیں رہتا۔ غور کیجیے تو دونوں مصرعوں میں تمام الفاظ اسی ''پہ'' کو Focus کیے ہوئے ہیں۔ اور مفہوم کا سارا بوجھ اس کی جان ناتواں پر پڑ رہا ہے۔'' [٦]

بالا اقتباس کو پڑھ کر جہاں میر کی استادی تسلیم کرنی پڑتی ہے وہیں نثار صاحب کی علمیت اور قابلیت کا بھی اعتراف کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ یہ تو ایک مثال ہے اسی طرح کئی مثالوں کے ذریعہ نثار فاروقی نے میر کی کاریگری اور فنکاری کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ میر نے اپنے اشعار میں لفظوں کو اس انداز سے استعمال کیا ہے کہ معنی کے اعتبار سے اس کی جتنی امکانی صورتیں ہو سکتی ہیں وہ سب اس میں موجود ہیں۔ خواہ اس میں غلو کا عنصر نمایاں ہوتا ہو یا حقیقت کا، حکمت و بصیرت کے پہلو ابھر کر سامنے آتے ہوں یا فکر و انبساط کے۔

''الفاظ کی اہمیت'' کے تذکرے کے بعد ''تکرار الفاظ'' کا ذکر کرتے ہوئے نثار صاحب میر کے

متعلق کہتے ہیں ''الفاظ کی تکرار سے مفہوم میں وسعت اور اثر پیدا کرنے کا یا تصویر کشی کا کام سب سے پہلے میر نے انجام دیا۔ لیکن اگر ہم میر سے پہلے کے شعرا کی طرف نگاہ کریں تو وہاں بھی ہمیں ایسے اشعار دیکھنے کو مل جاتے ہیں جس میں لفظوں کی تکرار موجود ہے مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

غفلت میں وقت اپنا نہ کھو ہشیار ہو ہشیار ہو
کب لگ رہے گا خواب میں بیدار ہو بیدار ہو
بڑے موذی مارا نفس امارہ کو گر مارا
نہنگ و اژدھا و شیر نر مارا تو کیا مارا

ان اشعار میں روانی تو ہے لیکن معنوی اعتبار سے یہ اشعار اس رتبے کو نہیں پہنچتے جہاں میر کے اشعار قیام کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ کئی شعرا خود میر کے ہمعصروں نے بھی اشعار میں تکرار الفاظ کا استعمال کیا ہے لیکن جس سلیقے اور خوبصورتی سے میر نے ان چیزوں کو اپنے یہاں برتا وہ دوسروں کو نصیب نہ ہو سکا۔ مثلاً میر کے ایسے اشعار ملاحظہ فرمائیں جن میں لفظوں کی تکرار نے جہاں موسیقیت پیدا کی وہیں معنوی اعتبار سے بھی وہ اپنے منتہا کو پہنچی ہوئی نظر آتی ہیں:

عالم عالم عشق جنوں ہے دنیا دنیا تہمت ہے
دریا دریا روتا ہوں میں صحرا صحرا وحشت ہے
دل تڑپے ہے جان گھلے ہے حال جگر کا کیا ہوگا
مجنوں مجنوں لوگ کہیں گے مجنوں کیا ہم سا ہوگا
کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

میر کے یہاں آپ بیتی کے بجائے جگ بیتی کا احساس اسی انداز بیان اور لفظوں کے اتار چڑھاؤ سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ اپنے اشعار میں کوئی ایسی بات نہیں کہتا جس کو سن کر ایسا معلوم ہو کہ یہ نئی ہے۔ ان کے کلام میں پائی جانے والی باتیں ایسی ہوتی ہیں جس سے ہر بنی نوع انسان کسی نہ کسی صورت سے جڑا ضرور ہوتا ہے لیکن الفاظ کی کمی کے باعث وہ اس کے اظہار سے قاصر ہوتا ہے لہٰذا جب شاعر ان کو لفظوں کا جامہ پہنا دیتا ہے تو وہ ساری چیزیں جو اب تک اس کی نگاہوں سے پوشیدہ تھیں سامنے آجاتی ہیں اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ ساری چیزیں میرے علم میں تو موجود تھیں لیکن آج تک ان پر غور کیوں نہیں کیا؟ بہر حال آپ بیتی کو جگ بیتی میں تبدیل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ شاعر کو لب و لہجے پر مکمل گرفت ہو۔ میر اس میدان کے شہسوار ہیں۔ اور اس کے ہر جزئیات سے کماحقہ واقفیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میر کے اشعار پڑھنے کے بعد ہر شخص کو اس کا گمان ہوتا ہے کہ ان واردات کا تعلق میر سے ہو یا نہ ہو اس کی زندگی سے براہ راست

ہے۔ میر کو ان باتوں کا اندازہ پہلے سے ہی تھا اسی لیے وہ کہتا ہے:

بعد ہمارے اس فن کا جو کوئی ماہر ہووے گا
درد انگیز انداز کی باتیں اکثر پڑھ پڑھ رووے گا
باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنیے گا
پڑھتے کسو کو سنیے گا تو دیر تلک سر دھنیے گا
پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ
مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

چاہے میر کی دردانگیز باتوں کو پڑھ کر رونے کا ذکر ہو یا دیر تلک سر دھنے کی بات اس سے میر کی مراد ہی یہ تھی کہ میرے اشعار میں قاری یا سامع کو اپنے ہی دل کی آواز سنائی دے گی۔ میر کی ان ہی خصوصیات کی بنا پر اپنے عہد کے نامور شعرا نے ان کی استادی تسلیم کرنے میں ذرا بھی عار محسوس نہیں کی۔ ملاحظہ فرمائیں:

ریختہ کے تم ہی استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا
شبہ ناسخؔ ہے کسے میر کی استادی میں
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں
میں میر کا دم بھرتا ہوں اثرؔ، میں اس کے کلام کا شیدا ہوں
ہاں، شعر تو تم کہہ لیتے ہو وہ بول بنانا مشکل ہے

یہاں غالبؔ اور ناسخؔ جیسے استاد شعرا کی رائے کے بعد مزید کچھ کہنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ غالبؔ اور ناسخؔ دونوں نے میر کی استادی کو کس حد تک تسلیم کیا ہے اس کا اندازہ ان کے اشعار سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ آخری الذکر شعر میں امداد امام اثرؔ نے شاعری کے تعلق سے دو باتیں کہی ہیں ایک تو ''شعر کہنا'' اور دوسرا ''بول بنانا''۔ جہاں تک شعر کہنے کی بات ہے اس میں اعلیٰ وادنی تمام شعرا شامل ہیں خواہ ان کے اشعار فنی اعتبار سے کسی بھی درجے کے ہوں لیکن جہاں بات ''بول بنانے'' کی آتی ہے یعنی ایسا شعر جس پر بول بنانے کا اطلاق ہوتا ہو، بہت کم شاعروں کو نصیب ہوتا ہے۔ اسی لیے نثار صاحب نے کہا تھا کہ ''بات کو سیدھی طرح کہہ دینا اور اسے دل میں اتار دینا دو مختلف باتیں ہیں۔'' یہ دونوں خوبیاں میر کے کلام میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ میر کے اشعار بالکل سیدھے سادے لیکن اتنے موثر ہوتے ہیں کہ اس کا اثر براہ راست ہمارے قلب وذہن پر پڑتا ہے اور ماضی کے وہ تمام لمحات جس کا تعلق اس شعر سے ہے آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتے ہیں۔ حالی نے مرثیۂ غالب میں ایک مصرعہ:

سو تکلف اور اس کی سیدھی بات

کہا تھا جو میر پر بھی حرف بہ حرف صادق آتا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ برعکس غالب کے اس مصرعے کا زیادہ حقدار میر ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ پچھلے صفحات میں اس کا تذکرہ کیا جا چکا ہے کہ میر کی زبان بہت ہی صاف، سادہ، سلیس اور رواں ہے لیکن وہ اسی لہجے میں اتنے دقیق مسائل اور پیچیدہ مضامین بیان کر دیتا ہے جو آج تک کسی اور کو نصیب نہ ہوسکا۔ اپنی اسی خصوصیت کی بنا پر میر نے کہا تھا:

شعر میرے ہیں سب خواص پسند
گو مجھے گفتگو عوام سے ہے

مطلب یہ کہ میرے اشعار ایسے ہیں جو مخصوص دلوں کی ترجمانی کرتے ہیں لیکن لب و لہجے کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا یہ کہ براہ راست عوام سے گفتگو کی جا رہی ہے۔ اس شعر کے تعلق سے نثار صاحب یوں گویا ہیں:

"...وہ کیفیات جنہیں خواص ہی سمجھ سکتے ہیں اور وہ لطیف احساسات جو عام دلوں پروارد نہیں ہوتے بلکہ دیدہ دروں اور بیدار دل خواص ہی کے حصے میں آتے ہیں، انھیں اتنی چابکدستی اور سہولت سے الفاظ میں قید کر دیتا ہوں کہ وہ "گفتگوے عوام" معلوم ہونے لگتے ہیں۔" ؎

میر کو اپنی زبان پر پورا عبور حاصل تھا۔ وہ جس طرح چاہتا اپنے خیالات و جذبات کو بیان کر سکتا تھا وہ بھی اس انداز سے کہ پڑھنے یا سننے والا اتنا ہی متاثر ہوتا جتنا کہ خود میر۔ لیکن نثار صاحب نے اس مضمون کے ذیلی عنوان "صداقت و واقعیت" میں جو شعر درج کیا ہے وہ درج بالا شعر کے بالکل برعکس معلوم ہوتا ہے:

سہل ہے میر کا سمجھنا کیا
ہر سخن اس کا اک مقام سے ہے

یعنی کوئی شخص اس وقت تک ان اشعار کو نہیں سمجھ سکتا جب تک کہ وہ ان تمام مقامات سے نہ گزرے جس سے میر گزر چکا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو میر کا یہ دعویٰ بے جا معلوم ہوتا ہے کیوں کہ تخئیل ایک ایسی شئے ہے جس کے ذریعہ انسان دنیا میں درپیش آنے والے حادثات، واقعات، واردات اور حالات وغیرہ کو براہ راست محسوس کر سکتا ہے حتیٰ کہ جو چیزیں اس عالم آب گل میں اب تک ظہور پذیر نہیں ہوئیں اس کو بھی اس انداز سے بیان کر دیتا ہے جیسے ان ساری چیزوں سے وہ خود نبرد آزما ہو چکا ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ میرے اشعار کو سمجھنے کے لیے ان مقامات سے گزرنا ضروری ہے جس سے میں گزرا ہوں درست نہیں۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ جن اشیاء سے متاثر ہو کر میر نے یہ اشعار کہے اس کا ادراک و احساس دوسروں کو صد فیصد نہ ہوا ہو پھر بھی میر کے انداز بیان اور اپنی تخئیل کی مدد سے وہ اس کی تہہ تک پہنچنے میں کسی حد تک کامیاب ہو جاتا ہے۔

شاعری کے تعلق سے یہ بات ہمیشہ کہی جاتی رہی ہے کہ زندگی اور اس کی تلخ حقیقتوں کا اندازہ جس شاعر کو جتنا زیادہ ہوگا اس کی شاعری معیار کے اعتبار سے اتنی ہی بڑھی ہوئی ہوگی۔ اور جہاں تک میرا

خیال ہے زندگی کے تلخ حقائق یا اس کی مصیبتوں اور پریشانیوں کا جس قدر اندازہ میر کو ہوا وہ بہت کم شاعروں کو نصیب ہوا ہے۔ اسی لیے میر کہتا ہے:

بے سوزِ دل کنھوں نے کہا ریختہ تو کیا

سوزِ دل کے بغیر اگر کوئی شاعری کرتا ہے تو اس کی شاعری اس درجے کی ہو ہی نہیں سکتی جو دوسروں کے دلوں میں آگ لگا دے۔ یعنی میر کے نزدیک سوزِ دل کا ہونا شاعری کے لیے پہلی شرط ہے۔ لیکن سوزِ دل ہے کیا؟ اس کے متعلق عام طور پر لوگ غلط فہمی کے شکار ہو جاتے ہیں۔ میر کے یہاں سوزِ دل سے کیا مراد ہے نثار احمد فاروقی کی زبانی ملاحظہ فرمائیں:

> "...محض رونا دھونا، ماتم کرنا، یا مایوسی اور دل شکستگی کا اظہار کرنا، مرثیہ لکھنا یا سوز خوانی پر اتر آنا، سوزِ دل نہیں ہو سکتا غم کی پرچھائیاں بڑی متنوع ہیں، اور کسی حد تک اضافی بھی۔ ایک غم وہ ہے جو ذاتی محرومی سے پیدا ہوتا ہے، دوسرا غم آگاہی سے حاصل ہوتا ہے، اسی میں ابدیت، آفاقیت اور دوسروں کو متاثر کرنے کی کیفیت ہوتی ہے۔ میر نے سوزِ دل سے 'سوزِ آگاہی' مراد لیا ہے فریاد و فغاں نہیں۔" [8]

بہر حال یہ میر کے کلام کے چند پہلو تھے جس کے زیرِ اثر اگر کلامِ میر کا مطالعہ کیا جائے تو میر کا مزاج یا ذہن کس قسم کا تھا اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن کلامِ میر سے کما حقہ واقفیت حاصل کرنے کے لیے ہمیں میر کے سماجی، معاشی، سیاسی، اقتصادی ماحول کے ساتھ ان کی زندگی میں پیش آنے والے اتار چڑھاؤ کو بھی نگاہ میں رکھنا پڑے گا۔ اس تعلق سے نثار صاحب نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اگر ایک ہی تصویر میں سارے رنگ دیکھنا ہوں تو میر کے صوفیانہ افکار کا گہرا مطالعہ کرنا چاہیے۔ میر کے بارے میں ایک بات ابتدا سے دہرائی جاتی ہے کہ وہ ایک صوفی، بزرگ اور فقیر تھے یہی نہیں بلکہ ان کے والد بھی جیسا کہ میر نے خود اپنی آپ بیتی میں ذکر کیا ہے ایک بڑے بزرگ تھے۔ لیکن نثار فاروقی نے میر کی فقیری اور والد کی بزرگی دونوں کو اعتراض کا نشانہ بنایا ہے بلکہ انھوں نے اپنی تحقیق کی بنا پر یہ کہنے سے بھی گریز نہیں کیا کہ:

> "...میر نہ صوفی تھے نہ فقیر تھے نہ تارکِ دنیا تھے، نہ انھیں محض قلقی یا دنیا بیزار کہا جا سکتا ہے۔ پھر ان کی عملی زندگی اور نظریات میں اس تضاد کا سبب کیا ہے؟ اصلاً انھیں تصوف کی عملی تعلیم نہیں ملی تھی۔ اور بظاہر انھوں نے مروجہ تصوف سے کتابوں کے ذریعے بھی زیادہ واقفیت بہم نہیں پہنچائی تھی... ان کے باپ ہرگز کوئی بڑے صوفی یا درویش نہ تھے۔ میر انھیں جا ہیں جو لکھیں لیکن کسی ہمعصر نے ان کی درویشی پر گواہی نہیں دی۔" [9]

بالا اقتباس میں نثار صاحب نے میر یا ان کے والد کے تعلق سے جو باتیں کہی ہیں وہ یقیناً اس قابل ہیں کہ ان پر غور کیا جائے۔ میر کے صوفی یا بزرگ نہ ہونے کی وجہ بتاتے ہوئے نثار صاحب اس بات کی

طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ان کے عملی زندگی میں نہ صوفیوں کا طرزِ عمل تھا نہ فقیروں کی شان اور اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ نہ انھوں نے صوفیوں کی صحبت میں رہ کر باقاعدگی کے ساتھ تصوف کی تعلیم حاصل کی اور نہ ہی تصوف کی کتابوں کا حتی الوسع مطالعہ کرکے اس کی مشق بہم پہنچانے کی کوشش کی۔ رہی بات ان کے والد کی تو اس ضمن میں نثار صاحب دلیل پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں اگر میر کے والد واقعی ایک بڑے بزرگ تھے تو پھر ان کے عہد کے دوسرے بزرگوں نے اپنے ملفوظات میں ان کا تذکرہ کیوں نہیں کیا؟ دراصل یہ سب میر کی ذہنی اپج کا نتیجہ ہے۔ ''ذکر میر'' کے حوالے سے ان کے والد ایک بڑے بزرگ کی شکل میں نمودار ہوئے اور بلا جھجک ناقدین اور محققین کے ایک گروہ نے اس کو من وعن قبول کرلیا۔ یہ نثار صاحب کی دیدہ ریزی اور محنت کشی کا ہی نتیجہ تھا کہ ''ذکر میر'' کا جب انھوں نے ''میر کی آپ بیتی'' کے نام سے اردو میں ترجمہ کرنا شروع کیا تو قابل اعتراض جگہوں پر حواشی بھی لگاتے چلے گئے۔ جس کی وجہ سے کئی الجھی ہوئی گتھیاں سلجھتی چلی گئیں۔ لیکن یہاں ایک سوال بدستور قائم رہتا ہے جس کی طرف نثار صاحب نے بھی اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اگر میر صوفی نہ تھے تو پھر انھوں نے تصوف کے دامن میں پناہ کیوں لی؟ جس زمانے میں میر شاعری کررہے تھے اگر ہم اس عہد کے گرد و پیش کے ماحول کا جائزہ لیں تو واضح ہو جائے گا کہ چاروں طرف افراتفری، لوٹ مار، قتل وغارت وغیرہ کا بازار گرم تھا۔ نہ کوئی کسی کا مددگار تھا نہ پرسان حال۔ ایسے میں تصوف کی طرف لوگوں کا مائل ہونا فطری تھا۔ بلکہ اس زمانے کے ماحول کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ لوگ نہ چاہتے ہوئے بھی تصوف کے دامن میں پناہ لے رہے تھے۔ میر بھی اس رنگ سے نہ بچ سکے۔ چونکہ میر نے باقاعدگی کے ساتھ تصوف کی تعلیم حاصل نہیں کی تھی اس لیے ان کے مذہبی خیالات یا معتقدات افراط وتفریط کا شکار ہوکر رہ گئے۔ میر کے ان ہی متناقض اور متضاد خیالات کی وضاحت کرتے ہوئے نثار فاروقی بیان کرتے ہیں:

''...مسئلہ رویت میں وہ معتزلہ کے ہم نوا ہیں اور جبر وقدر میں اس مسلک کے پیرو نظر آتے ہیں جس کی تبلیغ سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے بنوامیہ نے کی تھی، مسئلہ وحدت الوجود کے بھی قائل ہیں لیکن کہیں کہیں وہ اس مسلک سے ہٹ جاتے ہیں اور وحدت الوجود و وحدت الشہود کا فرق نہیں سمجھ پاتے۔ ایک طرف وہ انسان دوستی کا اظہار کرتے ہیں اور عظمت آدم کے معترف ہیں، مذہبی قیود کو بیکار محض جانتے ہیں...دوسری طرف غیر اثنا عشری اگر شریف مکہ بھی ہو تو اسے مسلمان ماننے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ اس کا یہی سبب ہے کہ میر کے فلسفیانہ افکار اور مذہبی معتقدات کا بیشتر حصہ روایتی ہے۔'' [10]

نثار صاحب کے ان جملوں سے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ میر کبھی ایک عقیدے پر قائم نہ رہ سکے۔ جو چیز ان کے مزاج کے خلاف گئی اس کو انھوں نے ترک کردیا گرچہ عقیدے کے اعتبار سے وہ اس کے

علمبردار رہے ہوں۔ اس لیے ان کی آپ بیتی یا ایسے اشعار جن میں صوفیانہ عنصر غالب ہے، کو پڑھ کر انھیں صوفی یا بزرگ تسلیم کرنا درست نہیں۔ ہاں جن اشعار میں میر نے اپنے تجربات و کیفیات کو سمویا ہے اس سے ان کی جو تصویر ابھر کر ہمارے سامنے آتی ہے اسے قابل اعتنا کہا جا سکتا ہے۔

مختصر یہ کہ نثار احمد فاروقی نے اس مضمون میں میر کی زندگی یا شاعری کے ان گوشوں کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے، جس کی طرف عام طور سے بے توجہی برتی گئی۔ ادب کے معماروں نے سنی سنائی یا رٹی رٹائی باتوں کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا ہی مناسب سمجھا بلکہ بڑے اعتماد کے ساتھ وہ اسے دہراتے بھی رہے، لیکن نثار صاحب کے اس مضمون نے ان تمام فرسودہ ذہنی خاکوں کو مسمار کر دیا جو میر کے تعلق سے مستند تسلیم کیے جا چکے تھے۔ لہٰذا نثار صاحب کے ان نکات کو مشعل راہ بنا کر اگر میر کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو اب بھی کئی دروازے وا ہو سکتے ہیں۔ ☆☆☆

حواشی:

۱: تلاش، نثار احمد فاروقی، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، ص۔ ۲۹، سنہ ۲۰۱۱

۲: تلاش میر، ص۔ ۳۶

۳: تلاش میر، ص۔ ۴۲۔ ۴۱

۴: تلاش میر، ص۔ ۴۳۔ ۴۲

۵: تلاش میر، ص۔ ۴۵۔ ۴۴

۶: تلاش میر، ص۔ ۴۷

۷: تلاش میر، ص۔ ۵۹۔ ۵۸

۸: تلاش میر، ص۔ ۶۳

۹: تلاش میر، ص۔ ۶۸۔ ۶۷

۱۰: تلاش میر، ص۔ ۶۹۔ ۶۸

☆☆☆

(۲)

شمس الرحمٰن فاروقی اور 'تفہیمِ غالب'

● ڈاکٹر زیبا محمود

بڑا فن کار زمان و مکاں کی حدود سے ماورا ہو کر اپنی عظمت کا لوہا منواتا ہے۔ آج غالب بھی انھی معنوں میں ایک بڑا فنکار ہے جس کا دامن شہرت وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ غالب کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جاتا رہے گا۔ ہر شارح نے شعریاتِ غالب کی تشریح و تعبیر مختلف انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ دراصل غالب کا فن ہمارے محققین کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ہماری تحقیق و تنقید کا سب سے بڑا موضوع غالب ہے۔ اس لئے قارئین کے جملہ طبقات کو شعری کیف مہیا کرانے میں کامیاب بھی ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے دانشوری کی بیشتر شاخوں میں کامرانی حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ غالب کے فکری رجحان کو از سر نو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بات مجھے کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کی ناقدین کی یلغار کے درمیان شمس الرحمٰن فاروقی نے غالب کے شعری مزاج کو دریافت کرنے میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی کی تصنیف ''تفہیمِ غالب'' بے مثل و بے مثال وقعت کی حامل ہے۔ اس کتاب میں شمس الرحمٰن فاروقی نے کلامِ غالب کو جن معیار و میزان پر پرکھا اس کا رقبہ وسعت آمیز ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا مشرقی شعریات کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ فارسی زبان و ادب سے واقفیت ان کی تحریر پڑھنے سے بہ آسانی معلوم ہو جاتی ہے۔ ان کی شعر فہمی کا ایک زمانہ قائل رہا۔ ''شعرِ شور انگیز'' ہو یا ''نقدِ غالب'' یا 'تفہیمِ غالب' ان کی شعر فہمی نے وہ کمالات دکھائے ہیں اور علم کے سمندر سے وہ جواہرات نکال کر لائے ہیں کہ بس! فاروقی صاحب نے شارحین کی تنقید سے اختلاف کرتے ہوئے وہ معنی بیان کیے ہیں جو ان کے خیال میں زیادہ قابلِ قبول ہیں۔ اس کتاب میں دقتِ نظر اور ژرف بینی سے انھوں نے کلامِ غالب کے محاسن اجاگر کیے ہیں۔ اس سے ایک طرف ان کی شعر فہمی اور نگاہ کی تہہ رسی کا اندازہ ہوتا ہے تو دوسری طرف غالب کی شاعری پر ان کی جچی تلی رائے بھی معلوم ہو جاتی ہے، اور تیسری اہمیت یہ ہے کہ بعض اشعار میں

انھوں نے واقعی ایسے پہلو تلاش کیے ہیں جن پر کسی شارح کی نظر نہیں پہنچی تھی۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے ایک چھوٹے سے جملے میں غالب کی شخصیت کو صحیح تاریخی تناظر میں سمیٹ لیا:

"غالب ہمارے آخری بڑے کلاسیکی شاعر اور پہلے بڑے جدید شاعر ہیں۔"

'تفہیم غالب' کو ۱۹۸۹ء میں غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی نے شائع کیا۔ ۴۷۸ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں اشعار کی کل تعداد ۱۴۸ ہے، شمس الرحمٰن فاروقی نے تمام اشعار غالب پر بحث نہ کرتے ہوئے صرف ان اشعار کو موضوع گفتگو بنایا ہے، جن پر مزید غور و فکر کی اشد ضرورت کو محسوس کیا۔ فاروقی صاحب لکھتے ہیں کہ:

"اظہار خیال کے لیے وہی اشعار منتخب ہوں جن میں کوئی ایسا نکتہ ہو جو عام شراح سے نظر انداز ہو گیا ہو یا جن کی شرح میں کوئی ایسی بات کہنا ممکن ہو جو متداول شروح سے ہٹ کر ہو۔" [دیباچہ تفہیم غالب ص ۱۴]

۱۹۶۹ء میں غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر تقریبات اور تصنیفات کی اشاعت کا سلسلہ جو شروع ہوا اس سے فاروقی صاحب بھی متاثر ہوئے اور انھوں نے غالب کے اشعار کی تشریح و تعبیر کا سلسلہ اپنے رسالہ 'شب خون' میں شروع کیا۔ وہ 'تفہیم غالب' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"چنانچہ 'شب خون' کے شمارہ نمبر ۲۳ بابت ماہ اپریل ۱۹۶۸ء سے تفہیم غالب کا سلسلہ شروع ہوا اور یہ کچھ اس قدر مقبول ہوا کہ غالب صدی تقریبات کے اختتام پذیر ہونے کے بعد قائم رہا۔ اس سلسلے کی آخری تفہیم شب خون شمارہ ۱۵۱ بابت ماہ ستمبر۔ نومبر ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی گویا 'تفہیم غالب' کے نام سے جو کتاب آپکے ہاتھوں میں ہے اس کی مدت تصنیف بیس سال سے کچھ اوپر ہے۔ شب خون میں شائع تشریحات میں کچھ ضروری ترمیم و اضافہ کے ساتھ تفہیم غالب میں شامل کی گئی ہے۔"

فاروقی صاحب نے مزید واضح کیا کہ:

"کتابی صورت میں پیش کرنے کی غرض سے میں نے تمام تشریحات کو دوبارہ لکھا ہے اس معنی میں کہ ان میں اضافہ کیا ہے۔ بعض باتیں حذف کر دی ہیں بعض باتوں کو زیادہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ بعض پہلو پر تاکید بڑھا دی ہے۔ بعض پر کم کر دی ہے۔ زبان کو بھی آسان بنانے کی کوشش کی ہے۔ یعنی اس وقت جو تحریریں آپ کے سامنے ہیں وہ شب خون میں شائع ہونے والی تحریروں سے جگہ جگہ لفظاً اور کئی جگہ معناً مختلف ہیں۔"

اس کتاب میں اشعار کے متن کے حوالے سے شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں کہ:

"اشعار کا متن عام طور پر نسخۂ عرشی (اشاعت اوّل) انجمن ترقی، اردو علی گڑھ ۱۹۵۸ء، اشاعت دوم انجمن ترقی اردو، دہلی ۱۹۸۲ء کے مطابق ہیں۔"

['تفہیم غالب' ص ۱۱]

اور اشعار کی ترتیب کے بارے میں کہتے ہیں:

''کتابی شکل میں جمع کرتے وقت میں اشعار کی ترتیب متداول دیوان کے مطابق کردی ہے۔ جناب

کالی داس گپتا رضا نے اپنی معرکہ آرا ایڈیشن دیوان غالب کامل ۱۹۸۸ء میں تمام اشعار زمانہ تصانیف کے اعتبار سے جمع کیے ہیں۔ میں نے انکی بیش قیمت تحقیق سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کتاب میں شرح کردہ ہر شعر کے سامنے اس کا زمانہ تصنیف لکھ دیا ہے۔'' ['تفہیم غالب': ص ۱۹]

شمس الرحمن فاروقی کے یہ جملے ان کی ناقدانہ بصیرت کے غماز ہیں، جہاں انھوں نے غالب کے فن پاروں کو استعارہ (METAPHOR) سے تعبیر کیا:

''ان کا کلام اس صدی کا استعارہ اور ان کے بیان کردہ مسائل اس صدی کے مسائل کا جوہر ہیں۔''

[ماہ نامہ شب خون ۲۰۰۱ء]

اس تصنیف میں شمس الرحمن فاروقی کے خیالات بہت پُر مغز ہیں جن کی روشنی میں مرزا غالب کے افکار و اظہار سے ان کے خیالات کی پاکیزگی ندرت اور اشعار میں نئے مسائل اور امکانات کی نشاندہی ممکن ہوسکی۔ غالب کے استفہامیہ ذہن پر فاروقی صاحب نے کافی غور و خوض کیا جو غالب فہمی کی جانب ان کے تنقیدی رویے کو مزید مربوط و مستحکم کرتے ہیں۔ غالب کی اس ذہنی فضا کو سمجھنا ذوق شناسانِ ادب کے لیے بہرحال ایک CHALLENGE ہے۔ اور اس سمت میں شمس الرحمن فاروقی نے اپنا لوہا منوایا۔

شمس الرحمن فاروقی کی شرحیں ان کے اپنے مطالعے اور ان کی علمی لیاقت کے لافانی جوہر ہیں جسے انھوں نے بطور TECHNIQUE استعمال کیا اور تفہیم غالب کے قفل کو کھولنے میں سرخ روئی حاصل کی جسے غالب فہمی پر مزید ایک ماخذ کا درجہ حاصل ہوا۔ وہ 'تفہیم غالب' کے دیباچہ میں اپنے موقف کا یوں اعلان کرتے ہیں:

''ہر وہ معنی جو شعر کے الفاظ سے برآمد ہوسکیں وہ فصیح ہیں۔ میں خود اس بات کا قائل ہوں کہ شعر کا ہم پہ یہ حق ہے کہ ہم اس کا ایک بہترین معنی تلاش کریں اور جتنے کثیر معنی شعر میں ممکن ہوسکیں دریافت کریں۔ بڑے شعر کی خوبی یہ ہے کہ وہ مختلف زمانوں اور مختلف تناظر میں بھی بامعنی رہتا ہے۔ ایسا اس وقت ہوسکتا ہے جب اس میں معنی کے امکانات کثیر ہوں۔'' ['تفہیم غالب': ص ۱۶]

متن کی تعبیر و توضیح میں شمس الرحمن فاروقی کو یدطولیٰ حاصل ہے جس سے ان کی تشریح کے واضح اور اساسی ثبوت فراہم ہوتے ہیں۔ تعبیر متن میں خلاق یا فنکار کی مرکزی حیثیت کو SCHLEER MACHER نے تسلیم کیا اس کے علاوہ HANS GEORGE GADAMER کو بھی ماہر شرحیات میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ اور اردو ادب میں یہ مقام شمس الرحمن فاروقی کو حاصل ہے۔ تفہیم غالب کی بیشتر شرحیں اس کی دلکش مثالیں ہیں۔ 'تفہیم غالب' کے دیباچے میں اس کی فلسفیانہ وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''مشرقی شعریات یعنی وہ شعریات جس کی ہمارے کلاسیکی شعراء نے شعوری یا غیر شعوری طور

پر پابندی کی ہے۔ وہ میری نظر میں بہت محترم و مستحسن ہیں... میں اس نظریہ کا شدت سے قائل ہوں کسی شاعری کی فہم اس وقت مکمل نہیں ہو سکتی ہے جب تک ہم اس شعریات سے واقف نہ ہوں جس کی روشنی میں وہ خلق کی گئی ہے اور جس کی رو سے وہ بامعنی ہوتی ہے۔"

شمس الرحمن فاروقی نے نہ صرف متن TEXT کی باریکیوں کو رواج دینے کا سہکا رنامہ انجام دیا بلکہ اس کے نشیب و فراز سے بھی آگاہ کیا۔ اس سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ فاروقی صاحب نے شیل ماخر اور ڈیلٹے DILTHEY کے تصورِ تعبیرِ متن سے خاصا اثر قبول کیا۔ ڈیلٹے اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

"شارح جو مصنف کے سلسلۂ خیال پر نہایت احتیاط کے ساتھ غور و خوض کرتا ہے اور شعور کے بہت سے ایسے اجزاء کی نشاندہی کرتا ہے جو شاید خود مصنف کے لاشعور میں دبے ہوئے ہوں.........اس طرح وہ مصنف کو خود مصنف سے بہتر طریقہ پر سمجھ سکتا ہے۔"

'تفہیم غالب' کا پہلا شعر جسے فاروقی صاحب نے تشریح کے قالب میں ڈھالا وہ دراصل 'دیوانِ غالب' کا پہلا شعر ہے جس کا زمانۂ تحریر ۱۸۱۶ء مندرج ہے:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

اس شعر میں فاروقی صاحب نے غالبیات کے مشہور شارح طباطبائی کے اس مشہور اور قبول عام و خاص خیال سے اختلاف کیا ہے کہ 'ایران میں رسم ہے کہ دادخواہ کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے پاس جاتا ہے' اور بڑے عالمانہ مگر دلچسپ طریقے سے مختلف معنی بیان کیے ہیں۔ طباطبائی سے اختلاف کے باوجود ان کی اہمیت کے وہ معترف بھی ہیں، فرماتے ہیں:

"اپنی تمام کمیوں کے باوجود طباطبائی کی شرح غیر معمولی کتاب ہے۔"
['تفہیم غالب': ص ۱۸]

انھوں نے پہلے مصرعے میں استعمال لفظ 'کس کی' کو استعجابیہ سے زیادہ استفہامیہ قرار دیا ہے اور لفظ شوخی کو کلیدی فقرہ قرار دیا اور میر کے اس شعر کو:

کوئی ہو محرمِ شوخی ترا تو میں پوچھوں
کہ بزمِ عیش جہاں کیا سمجھ کے برہم کی

یہاں تک کہہ دیا کہ غالب کے ذہن میں یہ شعر رہا ہوگا لیکن غالب پر چربہ وغیرہ کسی قسم کا الزام عائد نہیں کیا۔ فاروقی صاحب فرماتے ہیں:

"لیکن خالق کائنات کی شوخی کا مضمون اور اس پر طرہ یہ کہ اس شوخی کو موضوع سوال بنانا اور ایسے شعر کو سر دیوان رکھنا یہ شوخی غالب سے ہی ممکن تھی"
['تفہیم غالب': ص ۲۴]

شمس الرحمٰن فاروقی فکر ونظر اور معنی ومفہوم کی ایک ایسی کائنات کی تعمیر میں سرگرداں نظر آتے ہیں جو اہلِ ادب کو قابلِ قبول ہے۔ غالب کے اس مشہور شعر میں:

شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا کہ آج
گردِ ساحل ہے بہ زخمِ موجۂ دریا نمک

میں افسانوی واقعات کے ایک تسلسل کو بخوبی واضح کیا گیا ہے اور موضوعِ رفتار کا تجزیہ جس انداز میں پیش کیا اس کی نظیر نہیں ملتی اور غالب کی فکر میں حرکت کے پہلو تلاش کیے:

''غالب یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں''

فاروقی صاحب کی تمام تر توجہ کا مرکز لفظ غالب ہے جو براہِ راست غالب کا تخلص ہے تو دوسری طرف یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں۔ اس امر کی نشاندہی نے شعر کی دلآویزی اور معنی آفرینی میں اضافہ کیا ہے۔

اور غالب کا یہ شعر۔

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

طباطبائی اور بیخود موہانی نے اس شعر میں عارفانہ مفہوم کی نئی جہت کو دریافت کیا اور فاروقی صاحب نے لفظ محشر کے تین معنی متعین کیے: پہلا برانگیخت ہونا، دوسرا مردوں کا زندہ ہو کر جمع ہونا اور تیسرا لوگوں کا جمع ہونا۔

غالب نے اپنی طبیعت کے زور و جوش کو قابو میں رکھنے کی کوشش کی ہے وہ خود کہتے ہیں:

رکتی ہے میری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

اس قول سے جذبات اور تہذیب کی نشاندہی ہوتی ہے۔ غالب کے یہاں فنکارانہ تصور اور تخلیقی عمل کی کارفرمائی ان کے فکر کی بیداری اور ذہن وادراک کی تیزی کے ساتھ ان کی طبیعت کی سلامت روی کا پتہ دیتی ہے اور اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ غالب نے ادب وفن کی مسلمہ روایات واقدار اور شاعری کے بنیادی تقاضوں کو فراموش نہیں کیا بلکہ اقدار کو قبول کر کے پرانی روایات کی توسیع میں پیش پیش رہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے ہر شعر کا گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ کیا۔ ان کا خیال ہے کہ:

''جدید نقاد انہیں (غالب) ایک ایسے علامتی نظام کا خالق ٹھہراتا ہے جس میں انسان کی مرکزی حیثیت بھی ایک مبہم علامت کی سی ہے جو ہے بھی اور نہیں بھی لیکن ظاہر ہے کہ اس تشخیص تک پہنچنے کے لیے غالب کا کلام ایسے علامتی نظام کا حامل تھا جو تنقیدی فکر کے علاوہ اس بنیادی فکر کو کام میں لاتا ہے جو شاعر سے متاثر ہوئی ہے اور خود شاعری بھی جس سے متاثر ہوئی ہے...... جدید نقاد نے غالب میں جو نئی باتیں ڈھونڈی ہیں یا غالب کی جو معنویت اب ثابت کی ہے وہ جدید عہد کی

صورت حال کا ایک حصہ ہے اور اس کا وجود بھی جدید عہد میں ممکن تھا۔'' [غالب اور جدید فکر]

شمس الرحمٰن فاروقی غالب کی مشکل پسندی پر یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

''میں نے غالب کے کلام کے ساتھ مشکل کی صفت عام معنوں میں استعمال کی ہے ورنہ تو حقیقت یہ ہے کہ میں ان کے کلام کو مبہم سمجھتا ہوں اور ابہام کو اشکال سے کہیں زیادہ بلند منصب کی چیز سمجھتا ہوں۔ میری نظر میں اشکال عموماً شعر کا عیب ہے اور ابہام شعر کا حسن۔''

[غالب کی تفہیم و تعبیر کے امکانات: ص ۳۷۴]

الغرض حالی سے لیکر طباطبائی، آل احمد سرور، مالک رام، امتیاز علی عرشی، نثار احمد فاروقی، کالی داس گپتا رضا اور شمس الرحمٰن فاروقی تک جتنے شارحین گزرے سب نے شعریاتِ غالب پر غائر نظر ڈالی اور پھر اہل ادب تک اس کی پر مغز تفہیم کی رسائی کو اپنا نصب العین سمجھا اور اس جانب فاروقی صاحب کی کاوش ''تفہیم غالب'' کو غالب فہمی پر ایک معتبر اور جامع دستاویز تسلیم کیا جاتا ہے جو قاری کے ذہن و دل کے نئے دریچے کھولنے پر آمادہ کرتی ہے اور غالب کے کلام سے حظ اٹھانے میں معاون بھی ہے۔ یہ تفسیر و تشریح کا ایک ایسا مرغزار ہے جس کی وقعت ہشت پہلو نگینے کی ہے جس سے معنی و مفہوم کی شعاعیں پھوٹتی ہیں۔ مختلف دلیلوں سے فاروقی صاحب نے کلام غالب کی نازک آفرینی اور نازک خیالی کے بہترین نمونے تلاش کر کے اہل ادب کے سامنے لاکر رکھ دیئے۔ فاروقی صاحب نے غالب کی شخصی ذہانت اور فصاحت کو صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیا۔ تعصب سے بے نیاز شمس الرحمٰن کی شرحیں جامع ہیں اور معقول شرح شرح نگاری کے آپ میر کارواں ہیں۔ اس طرح تفہیم غالب کو فاروقی کی فکر رسا کا بہترین نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ادب کے سنجیدہ قاری کے لئے فاروقی کی تفہیم غالب کی شرحیں بیش بہا قیمتی سرمایہ ہیں جس سے تفسیر و تفہیم کے راستے مزید روشن ہوتے اور فاروقی صاحب اسے شرح اور بسط کے ساتھ منصۂ شہود پر لانے میں کامیاب بھی ہوئے۔ ان کی شرحیں غالب تنقید کے نئے جہات متعین کرتی ہیں۔ الغرض غالب کی تفہیم و تنقید، تعبیر و افہام کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ شمس الرحمٰن فاروقی کی 'تفہیم غالب' سے پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ فاروقی کی ناقدانہ بصیرت، علمی دیانت اور مرزا غالب کی شخصیت اور فن کو سمجھنے کی غیر معمولی صلاحیت نے انھیں شارحینِ غالب کی صف میں بڑا مقام و منصب عطا کیا ہے۔ اس لئے پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا یہ قول صادق ہے کہ:

ہم سے بے علموں کو غالب سے کیا نزدیک تر
سوچتا ہوں کام یہ کتنا بڑا تو نے کیا

☆☆☆

(۳)

حالؔی اور لفظ ''تنقید'' کی تحقیق

● آفتاب عالم آروی

ادب کے اصول ونظریات تقریباً ہمیشہ لسانی معاشرہ کی تہذیبی ترجیحات سے نمو کرتے ہیں۔ مزید یہ کہ کوئی اصول، نظریہ یا موقف ادب میں اچانک ظہور نہیں کرتا بلکہ ایک مکمل تصور کے مرتبہ کو پہنچنے سے پہلے وہ ارتقا اور تنقید کے کئی مراحل سے گزرتا ہے۔ اس لیے ادب میں کسی تصور کے متعلق یہ دعویٰ کہ یہ تصور پہلی مرتبہ کسی مخصوص ادیب کے یہاں یا کسی خاص متن میں نظر آتا ہے، بیشتر صحیح ثابت نہیں ہوتا۔ اول تو ممکن ہے کہ ٹھیک یہی لفظ یا تصور اس سے پہلے کے متون میں مل جائے یا اگر ایسا نہ ہو تو اس کا قوی امکان ہے کہ اس نئے تصور کی ابتدائی شکل اس سے پہلے کے ایک سے زیادہ متون میں موجود ہو۔

اس کی ایک مثال لفظ ''تنقید'' کا اُردو ادب میں استعمال ہے۔ لفظ ''تنقید'' کے وجود، تاریخ اور تحقیق کا سوال اتنا اہم نہیں جتنا کہ خود اس لفظ کے معنی ومطالب کا ہے۔ لیکن اس کی اہمیت اس وقت بڑھ جاتی ہے جب اس لفظ کے اُردو میں پہلی مرتبہ استعمال کے متعلق سوال کھڑا ہوتا ہے۔

''تنقید'' اُردو والوں کا ایجاد کردہ لفظ ہے۔ عربی وفارسی میں اس کے لیے نقد، انتقاد اور مناقدہ کے الفاظ مستعمل ہیں۔ عام طور پر ''تنقید'' کا لفظ نکتہ چینی اور کسی چیز یا شخص میں معائب کی تلاش کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن جب اس لفظ کا استعمال شعر وادب کے تعلق سے ہوتا ہے تو یہ صرف تنقید نہیں بلکہ ''ادبی تنقید'' کہلاتی ہے۔ ادبی تنقید کسی ادب پارے یا فن پارے میں محاسن ومعائب کی تلاش ونشاندہی کا فن ہے۔ یعنی اس میں نہ صرف خامیاں بلکہ خوبیوں کی بھی نشاندہی کی جاتی ہے۔ یہ تنقید یا ادبی تنقید کا عام مفہوم ہے۔ اس کے بعد نظری اور عملی تنقید کی بحث شروع ہوتی ہے۔

اب ایک مسئلہ اُردو میں لفظ ''تنقید'' کے رواج کا ہے یعنی یہ لفظ اُردو میں پہلی بار کب، کہاں اور کس نے

استعمال کیا؟ یہ بات ذہن نشیں رہے کہ لفظ ''تنقید'' کا استعمال ایک الگ چیز ہے اور اس کا اپنے ادبی مفہوم میں ہونا یا نہ ہونا ایک الگ مسئلہ ہے۔ اس سلسلے میں یہاں اُردو کے دو معروف نقادوں کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے، جنھوں نے اس مسئلے کی جانب ہماری توجہ مبذول کرائی۔ ان میں ایک کا تعلق ہندوستان اور دوسرے کا پاکستان سے ہے۔

اُردو ادب میں جناب شمس الرحمن فاروقی کی حیثیت بجا طور پر ایک دانشور اور بہت محترم نقاد کی ہے۔ انھوں نے نہ صرف اُردو تنقید بلکہ زبان و قواعد، عروض و بلاغت اور مطالعہ داستان میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ تفہیم غالب اور شرح میر کے سلسلے میں ان کے طریق کار کو کسی دور میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اُردو تنقید کی تاریخ میں شمس الرحمن فاروقی کی تحریروں سے ایک بالکل نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ فاروقی صاحب اپنی کتاب ''تنقیدی افکار'' میں لفظ ''تنقید'' کی تحقیق کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں:

''تنقید کا لفظ ہمارے یہاں سب سے پہلے مہدی افادی نے ۱۹۱۰ء میں استعمال کیا۔''

[تنقیدی افکار، ص 247، NCPUL، ۲۰۰۴ء]

فاروقی صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ مہدی افادی نے ''تنقید'' کا لفظ پہلی بار کہاں استعمال کیا؟ خیر یہ ہمارا مسئلہ بھی نہیں۔ ہمارا مسئلہ تو یہ ہے کہ لفظ ''تنقید'' اُردو میں پہلی مرتبہ کب استعمال ہوا جو فاروقی کے مطابق ۱۹۱۰ء میں ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُردو میں لفظ ''تنقید'' کا وجود ۱۹۱۰ء سے پہلے نہیں ملتا۔ اس بات کی تصدیق فاروقی صاحب کے اس جملے سے بھی ہو جاتی ہے:

''آزاد نے آب حیات (۱۸۸۰ء) کو جگہ جگہ ''تذکرہ'' کہا ہے۔۔۔۔ پوری کتاب میں تنقید یا انتقاد یا نقاد جیسا کوئی لفظ نہیں استعمال ہوا ہے۔'' (ایضاً ص 247)

یہ تو تھا آب حیات کا مسئلہ جس کی صنفی حیثیت تنقید کی نہیں تذکرے کی ہے، فاروقی صاحب نے اُردو کی پہلی با قاعدہ تنقیدی تصنیف ''مقدمہ شعر و شاعری'' (۱۸۹۳ء) میں بھی اس لفظ کے عدم وجود کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''مقدمہ شعر و شاعری میں بھی تنقید، انتقاد یا نقاد جیسا کوئی لفظ نہیں برتا گیا ہے۔ ''مقدمہ'' کے چار سال بعد حالی نے جب ''یادگار غالب'' لکھی (۱۸۹۷ء) تو اس میں غالب کی نظم و نثر کے تنقیدی محاکے پر انھوں نے ''ریویو'' (Review) اور ''ریمارک'' (Remark) جیسے عنوانات قایم کیے۔'' [ایضاً ص 247]

فاروقی کی اس تحقیق سے ظاہر ہے کہ لفظ ''تنقید'' کا وجود نہ آزاد کے یہاں ہے اور نہ ہی حالی اور امداد امام اثر کے یہاں۔ وہ مذکورہ ادیبوں کے یہاں اس لفظ کی عدم موجودگی کے سبب یہ نتیجہ بھی نکالتے ہیں کہ:

''ان (آزاد، حالی، اثر) کے یہاں 'نقد' اور اس سے مشتق اصطلاحات کا عدم استعمال اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ خود اپنی نظر میں نقاد نہ تھے، مورخ، مصلح، مبلغ، سوانح نگار کچھ بھی رہے ہوں۔'' (ایضاً ص 247)

اس سلسلے کی دوسری مثال اُردو کے مابعد جدید نقاد ڈاکٹر ناصر عباس نیر کی پی۔ ایچ۔ ڈی

تھیس بہ عنوان ''اردو تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ'' ہے جو بلا شبہ اردو کے چند بہترین مقالوں میں سے ایک ہے۔ عام طور پر پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے جو کتابی شکل میں نہ چھپے ہو ں، حوالے یا سند کی حیثیت نہیں رکھتے، لیکن جب ایک نقاد اپنی تحریروں کے سبب عام لوگوں کی توجہ اپنی طرف منعطف کر لیتا ہے تو اس کی ہر تحریر غور سے پڑھی جانے لگتی ہے۔ ناصر عباس نیر اپنے اس مقالے میں شبلی کی تنقید پر لکھتے ہوئے لفظ ''تنقید'' کا مسئلہ بھی اٹھاتے ہیں۔ حالانکہ وہ شمس الرحمن فاروقی کی طرح اس مسئلے پر تفصیل سے گریز کرتے ہیں، لیکن ان سے دو قدم آگے کی بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شبلی کے یہاں تنقید کا لفظ، سیرت النبی کے دیباچے میں ملتا ہے،
مگر تنقیص کے مفہوم میں۔'' (ص ۹۹)

ناصر عباس نیر کا یہ خیال شبلی کے بارے میں ہے، حالی کے متعلق ان کی کیا رائے ہے، اس کا ذکر نہیں کرتے۔ علامہ شبلی نے سیرت النبی کا دیباچہ غالباً ۱۹۱۲ء یا ۱۹۱۳ء میں لکھا۔ ا جو سیرت النبی، جلد اول کے ساتھ ۱۹۱۸ء میں نامی پریس کانپور سے چھپ کر اعظم گڑھ سے شائع ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ڈاکٹر ناصر عبا س کے نزدیک ۱۹۱۲ء سے قبل شبلی کے یہاں لفظ ''تنقید'' کا کوئی وجود نہیں ملتا اور جب ملا بھی تو اپنے قدیم لغوی معنی یعنی کمیاں یا خامیاں تلاش کرنے کے معنی میں۔ ناصر عباس نیر کا یہ خیال کسی حد تک درست قرار دیا جا سکتا ہے کہ:

''۔۔۔۔۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ تنقید نگاری اس زمانے میں اتنی
اہم سرگرمی نہیں تھی، جتنی تاریخ تھی۔ مثلاً یہی دیکھئے مقدمہ شعر و
شاعری، موازنہ انیس و دبیر، شعر العجم، کاشف الحقائق کے لیے تنقید
کا لفظ ہی استعمال نہیں کیا گیا۔'' [ایضاً ص ۹۹]

☆ ا تفصیل کے لیے دیکھیے ہفت روزہ، الہلال (کلکتہ) چہار شنبہ ۲۱ مئی ۱۹۱۳ء، جس میں شبلی کے اس دیبا چے کے بعض اجزا شائع ہوئے ہیں۔

ناصر عباس نیر سے بہت پہلے جناب شمس الرحمن فاروقی اپنا یہ خیال آزادؔ، حالیؔ، اثرؔ اور شبلیؔ کے متعلق ظاہر کر چکے ہیں:

''چونکہ ان کی تحریروں میں ادب کی تخلیق کے بارے میں نظری اور عملی
باتیں کثرت سے تھیں لہٰذا ہم نے ان کے پورے پیغام کو ادبی تنقید
قرار دیا۔۔۔۔۔ یعنی ہمارے یہاں تنقید اور نقاد کی باقاعدہ پیدائش
کے پہلے ہی تنقید اور تنقید نگار ادبی رہنما، ہدایت دہندہ اور اصلاح کوش
استاد کی حیثیت سے قائم ہو چکے تھے۔'' [تنقیدی افکار ص 248]

اردو میں لفظ ''تنقید'' کے وجود کے سلسلے میں جناب شمس الرحمن فاروقی اور ڈاکٹر ناصر عباس نیر کے ان مشا

ہدات کے بعد ''تنقید'' کی تحقیق ایک دلچسپ مرحلے میں داخل ہو جاتی ہے۔

لفظ ''تنقید'' کا استعمال اُردو کی پہلی با قاعدہ تنقیدی تصنیف حالی کی ''مقدمہء شعرو شاعری'' (۱۸۹۳ء) میں بھی ہے اور شبلی کی شہرۂ آفاق تصنیف ''شعرالعجم'' (جلد چہارم،۱۹۱۲ء) میں بھی اور ان دونوں کے درمیان لکھی جانے والی تاریخی تصنیف ''الفاروق'' (۱۸۹۸) میں بھی لفظ تنقید متعدد بار آیا ہے۔ اور دلچسپ بات تو یہ ہے کہ ''تنقید'' نہ صرف لفظی بلکہ اپنے اصطلاحی معنی و مفہوم میں ہے۔ سب سے پہلی مثال تنقید کی سب سے پہلی کتاب ''مقدمہء شعروشاعری'' سے سنیے:

''اگرچہ اُردو شاعری کی حقیقت ظاہر کرنے کے لیے اس بات کی نہایت ضرورت تھی کہ مشہور اور مسلم الثبوت شاعروں کے کلام پر صراحتہً نکتہ چینی کی جائے۔ کیونکہ عمارت کا بودا پن جیسا کہ بنیاد کی کمزوری سے ثابت ہوتا ہے ایسا اور کسی چیز سے ثابت نہیں ہوتا۔ مگر صرف اس خیال سے کہ ہمارے ہم وطن ابھی اعتراض سننے کے عادی نہیں ہیں۔ بلکہ تنقید کو تنقیص سمجھتے ہیں۔ جہاں تک ہو سکا ہے اس مضمون میں کسی خاص شاعر کے کلام پر کوئی گرفت یا اعتراض اس طرح نہیں کیا گیا جو خاص اس کے کلام سے خصوصیت رکھتا ہو۔''

[مقدمہ شعروشاعری از حالی،مرتبہ وحید قریشی،ص ۲۶،علی گڑھ،۲۰۰۲]

اس اقتباس میں نہ صرف لفظ ''تنقید'' کا استعمال ہوا ہے بلکہ تنقید اپنے پورے معنی و مفہوم کے ساتھ موجود ہے۔ بے شک لفظ ''تنقید'' سے پہلے ''نکتہ چینی'' کا بھی ذکر آیا ہے لیکن وہ اس مفہوم میں ہے کہ عوام کسی کے کلام کی خامیاں بیان کرنے کو نکتہ چینی تصور کرتے ہیں لیکن ان کا دوسرا جملہ کہ ''ہمارے ہم وطن تنقید کو تنقیص سمجھتے ہیں'' تنقید کے اصطلاحی مفہوم کو پوری طرح روشن کر دیتا ہے۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حالی کا ذہن تنقید کے معنی و مطالب کے متعلق بالکل صاف ہے۔ جب حالی اس سے اچھی طرح باخبر / واقف ہیں کہ تنقید وہ ہے جو تنقیص نہیں ہے، اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ شاعری کی ماہیت، خصوصیات اور اقسام کے متعلق لکھی گئی اپنی تحریر کو تنقید سمجھتے ہیں تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ خود اپنی نظر میں ''نقاد'' نہ تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ انھوں نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا۔

اس سلسلے کی دوسری مثال شبلی نعمانی کی تاریخی تصنیف ''الفاروق'' (۱۸۹۸ء) ہے جس کی تمہید میں شبلی نے روایت اور درایت کے بیان میں متعدد بار لفظ ''تنقید'' کا استعمال کیا ہے اور یہاں بھی تنقید سے ان کا مفہوم واضح ہے۔ مثلاً درایت کے سلسلے میں یہ مثالیں ملاحظہ ہوں:

''درایت سے یہ مراد ہے کہ اصول عقلی سے واقعہ کی تنقید کی جائے۔''

[الفاروق، حصہ اول، ص ۱۲، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ،۱۹۹۳]

''درایت کے اصول بھی اگرچہ موجود تھے، چنانچہ ابن حزم، ابن قیم، خطابی، ابن عبدالبر نے متعدد روایتوں کی تنقید میں ان اصولوں سے کام لیا ہے لیکن انصاف یہ ہے کہ اس فن کو جس قدر ترقی ہونی چاہئے تھی نہیں ہوئی۔'' [ایضاً ص ۱۲]

"واقعات کی تحقیق وتنقید کے لیے درایت کے اصول سے بہت بڑی مدد مل سکتی ہے۔" [ایضاً ص۱۴]

"روایتیں جو تاریخی ہونے کے ساتھ مذہبی حیثیت بھی رکھتی ہیں، ان میں یہ خصوصیت صاف محسوس ہوتی ہے کہ جس قدر ان میں تنقید ہوتی گئی، اسی قدر مشتبہ اور مشکوک باتیں کم ہوتی گئی ہیں۔" [ایضاً ص۱۶]

اصول عقلی سے واقعہ کی تنقید، روایتوں کی تنقید میں درایت کے اصولوں کی کارفرمائی، واقعات کی تحقیق وتنقید میں اصولِ درایت سے مدد لینا اور تنقید کی وجہ سے مشتبہ اور مشکوک باتوں میں کمی، واضح طور پر گواہی دیتے ہیں کہ شبلی کے ذہن میں تنقید کا مفہوم اور اس کے امتیازات بالکل روشن تھے۔

"شعر العجم" (چار جلد) کی تصنیف پانچ سال کے طویل عرصے پر محیط ہے۔ علامہ شبلی نے اسے ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۲ء کے درمیان مکمل کیا۔ شعر العجم کی پانچویں جلد، سیرت النبی، جلد اوّل کی پہلی اشاعت ۱۹۱۸ء کے بعد شائع ہوئی۔ اسے سید سلیمان ندوی نے شبلی کی وفات کے آٹھ سال بعد ۱۹۲۲ء میں شائع کیا۔ شبلی کے ایک خط سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے شعر العجم لکھنے کی ابتدا 'موازنہ انیس ودبیر' لکھنے کے دوران ہی کر دی تھی۔ شبلی نے موازنہ انیس ودبیر ۱۹۰۶ء میں مکمل کی۔

لفظ "تنقید" کی تیسری مثال شبلی کی شعر العجم، جلد چہارم میں ہے جو پہلی بار ۱۹۱۲ء (علی گڑھ اور آگرے سے) میں شائع ہوئی۔ اس کے پہلے ہی صفحے پر شبلی نے دو مرتبہ اور تخئیل کے بیان میں ایک جگہ لفظ "تنقید" کا استعمال کیا ہے۔ اور اسے محض اتفاق ہی کہیے کہ یہاں بھی "تنقید" تنقیص کے معنی میں نہیں ہے۔ شبلی لکھتے ہیں:

> "شعر العجم کا یہ چوتھا یعنی اخیر حصہ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اگلے تینوں حصے اس حصہ کے دیباچے اور تمہید تھے اس حصے میں ایران کی عام شاعری پر تنقید ہے، اس لیے جو بحثیں اگلے حصوں میں ناتمام رہ گئی تھیں ان کو اب تفصیل سے لکھتا ہوں۔" [شعر العجم، جلد چہارم، ص۳، دار المصنفین اعظم گڑھ ۲۰۱۲ء]

اس کے بعد شبلی اس حصّے کو (شاعری کی) تین فصلوں میں تقسیم کرتے ہیں اور تیسرے باب کا عنوان "تقریظ وتنقید" (ایضاً ص۳) تجویز کرتے ہیں۔ لیکن اس باب کے آغاز میں "فارسی شاعری پر اجمالی ریویو" کا عنوان قائم کرتے ہیں۔ شروع کی تحریر سے ہی یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ شبلی تنقید یا ریویو کو تنقیص کے معنی میں استعمال نہیں کرتے۔ لکھتے ہیں:

> "فارسی شاعری کے محاسن ومثالب سے بحث کرنے کے لیے عرب کی شاعری کو پیش نظر رکھنا اور اس سے موازنہ کرنا چاہیے، جس سے نہایت وضاحت کے ساتھ نظر آئے گا کہ فارسی شاعری میں کیا کیا نقص اور کیا کیا محاسن ہیں۔" [ایضاً ص۱۷۳]

شبلی کی شعر العجم میں لفظ "تنقید" کی تیسری مثال جو تخئیل کے بیان میں موجود ہے، ملاحظہ ہو:

"تخئیل مسلم اور طے شدہ باتوں کو سرسری نظر سے نہیں دیکھتی بلکہ دوبارہ ان پر تنقید کی نظر ڈالتی ہے

اور بات میں بات پیدا کرتی ہے۔'' [ایضاً ص ۲۹]

ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے بھی اس اقتباس کو اسی مضمون میں نقل کیا ہے جہاں وہ یہ کہتے ہیں کہ شبلی کے یہاں تنقید کا لفظ سیرت النبی کے دیباچے میں ملتا ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ وہ سیرت النبی سے پہلے لکھی گئی کتاب شعر العجم، جلد چہارم کا ذکر نہیں کرتے حالانکہ وہ اقتباس نقل کرتے ہیں جس میں تنقید کا لفظ موجود ہے اور تنقیص کے معنی میں بھی نہیں ہے۔

اس پورے محاکمے کے بعد یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ ان مذکورہ کتابوں میں لفظ ''تنقید'' نہ صرف اپنے لغوی بلکہ اصطلاحی معنی و مفہوم میں بھی کئی جگہ موجود ہے۔

لفظ ''تنقید'' کی یہ تحقیق صرف بیس سال کے عرصے پر محیط ہے۔ اگر ''آب حیات'' کو چھوڑ دیا جائے تو ''کاشف الحقائق'' (۱۸۹۷ء) اور ''موازنہ انیس و دبیر'' (۱۹۰۶ء) کے مباحث خالص تنقیدی ہیں۔ اس کے علاوہ حالی کی ''یادگار غالب'' (۱۸۹۷ء) بھی اُردو میں عملی تنقید کی پہلی عمدہ مثال ہے۔ لفظ ''تنقید'' کے تعلق سے ان تصانیف کا اگر بہ غور مطالعہ کیا جائے تو قوی امکان ہے کہ نقد، انتقاد یا تنقید جیسے الفاظ کی مزید مثالیں سامنے آجائیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس عہد کے دوسرے ریویو/ تبصرہ نگاروں یا ریمارکس لکھنے والوں کے یہاں لفظ ''تنقید'' اس مفہوم میں مل جائے، جس میں ہم اب اس لفظ کو استعمال کرتے ہیں۔ بہرحال اُردو کی پہلی تنقیدی کتاب حالی کی ''مقدمہ شعر و شاعری'' (۱۸۹۳ء) میں لفظ ''تنقید'' کی اس تحقیق سے اس لفظ کی تاریخ میں بیس سال کا اضافہ تو ہو ہی گیا۔

☆☆☆

(۴)

ٹیگور اور اقبال کی حب الوطنی

[قومی ترانوں کے پس منظر میں]

● حافظ محمد جہانگیر اکرم

روحانیت کے سالاروں کے یہاں راہِ معرفت طے کرتے وقت ایک منزل عشق کی بھی آتی ہے۔ صوفیائے کرام نے عشق کو نہایت وسیع تناظر میں پیش کیا ہے۔ اس کی دو بڑی اقسام مجازی عشق اور عشق حقیقی ہیں۔ مجازی عشق کا دائرہ خواہشات نفسانیہ سے لے کر فطرت کے قوانین کے ماتحت کیے جانے والے عشق کی مختلف صورتوں پر محیط ہے۔ اس مجازی عشق میں حب الوطنی کا بھی شمار ہوتا ہے۔ ایک قول مشہور ہے کہ ''حب الوطنی نصف الایمان ہے۔'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے موقع پر خود اس عشق کا اظہار کیا تھا۔ چنانچہ حدیث کے مفہوم میں یہ بات ملتی ہے کہ: ''مکہ سے جدا ہوتے وقت آپؐ بار بار اس کی طرف مڑ مڑ کر دیکھتے اور کہتے اے وطن عزیز، مجھے تجھ سے محبت ہے۔ میں تجھے ہرگز نہ چھوڑتا اگر تیرے لوگ مجھے اتنا نہ ستاتے۔'' ٹیگور اور اقبال جیسے روحانی سفیروں کے یہاں اسی حدیث کی روشنی میں حب الوطنی کا جائزہ اس مضمون میں لیا گیا ہے۔

حب الوطنی کا اظہار کرنے کے لیے ترانے اور منظومات لکھنے کی روایت قدیم زمانے سے رہی ہے۔ ایسی نظموں میں وطن کی توصیف و تعریف اور مدح وستائش نہایت والہانہ انداز میں کی جاتی ہے۔ مذہبی صحیفوں سے لے کر بھارتیندو ہرش چندر تک سنسکرت اور قدیم و جدید ہندی میں اس کے آثار ملتے ہیں لیکن انھیں مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ عہد وسطیٰ میں محمد بن قاسم کے سندھ پر حملے کے زمانے میں شیخ محمد ضلع سندھی نام کے عربی شاعر کا پتہ چلتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ فوجیوں کے غلاموں میں سے تھا۔ اس نے ہندوستان کی تعریف میں عربی میں ایک طویل قصیدہ لکھا تھا۔ اس میں یہاں کی تلواروں، نیزوں، نباتات، معدنیات، حیوانات، پھل، پھول اور سمندری اشیاء کا ذکر ان کے تمام تر اوصاف کے ساتھ کیا گیا ہے۔ شاعر کی حب الوطنی اتنی شدید ہے کہ ان

خصوصیات کا انکار کرنے والے اپنے دوستوں کو وہ ''الرجال الاخطل'' یعنی مختل دماغ کہتا ہے۔

ہندوستان میں جب سلاطین برسر اقتدار آئے تو اس زمانے میں طوطی ہند حضرت امیر خسرو (۱۳۲۵ء) نے اپنی مشہور مثنوی ''نہ سپہر'' میں ہندوستان کی تعریف میں سینکڑوں اشعار قلم بند کیے تھے۔ ان میں ہندوستان کی زرخیز زمین، باغات، جنگلات، دریا، جھیلیں، پہاڑ، میدان، میلے ٹھیلے، عورتوں کے سنگار و آرائش کے لوازمات اور طیور و وحوش کی تفصیل ملتی ہے۔ خسرو نے ہندوستان سے اپنی وابستگی کو بڑے والہانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ اسی زمانے میں میر سین کے بیٹے عبدالرحمٰن نے اپنی تصنیف ''سندیش رسک'' اپ بھرنش میں لکھی تھی لیکن شاعر اسے دیش بھاشا کہتا ہے۔ اس میں بھی ہندوستان کی بڑی تعریف کی گئی ہے۔ شاعر نے ہندستان کے موسموں، تیوہاروں، پھلوں، پھولوں کا ذکر نہایت خوبصورتی سے کیا ہے۔ انگریزوں کے تسلط کے دور میں بنکم چندر چٹرجی نے اپنے ناول ''آنند مٹھ'' کے لیے وندے ماترم نامی گیت ۱۸۷۱ء میں لکھا تھا۔ یہ گیت اس زمانے میں اتنا مقبول ہوا کہ مجاہدین آزادی کے لیے ایک نعرہ بن گیا تھا۔ چونکہ یہ درگا دیوی کی مدح میں لکھا گیا بھجن ہے۔ اس لیے علما نے اسے لازمی قرار دیے جانے کی تجویز کی مخالفت کی۔

قومی ترانوں کے اس تاریخی تناظر میں جب ہم ٹیگور اور اقبال کے ترانوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ان کی مقبولیت، شہرت اور ان کے مقام کو دیگر ترانوں کے مقابلے میں فزوں تر پاتے ہیں۔ دونوں کے ترانے ان کی حب الوطنی کے مظہر ہیں۔ انھوں نے وطن کو محبوب تو ضرور گردانا مگر وطن کو معبود کبھی بھی نہیں سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے قومی ترانوں میں حب الوطنی اور وطن پرستی باہم متفرق نظر آتے ہیں۔ یہ دونوں شعرا حب الوطنی میں متجاوزات اور مبالغہ کے قائل نہیں تھے۔ مذہبی معتقدات اور وطنی مدحیات میں امتیاز برتتے تھے۔ حب الوطنی اور تصورات قومیت میں دونوں کے یہاں پائی جانے والی مماثلت کی وجہ ہی سے دونوں کے قومی ترانوں میں باہم معاشرت کا احساس نہیں ہوتا اور اسی مماثلت نے ان دونوں ترانوں کو مذہبی تعصبات و متجاوزات سے دور رکھا۔

اقبال، جنھیں ''خاک وطن کے ہر ذرّے میں دیوتا نظر آتا تھا، وہ وطن کے مذہبی معتقدات اور سیاسی تصورات سے نالاں تھے۔ اپنی نظم 'وطنیت' میں انھوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ: ''گفتار سیاست اور ارشادِ نبوی میں وطن کا جو تصور ہے آج کے سیاسی تناظر میں وہ کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ آج کے خود ساختہ خداؤں میں وطن کو بالادستی حاصل ہے۔ رقابت و تجارت کا بازار وطن کے نام سے گرم ہے۔ اقوام میں مخلوق خدا اس کے نام سے بٹتی ہے اور مذہب کی جڑ اسی سے کٹتی ہے۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے

ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے
اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے تجارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

[علامہ اقبال: 'بانگِ درا'؛ 'وطنیت': کلیاتِ اقبال ص ۱۲۰]

رابندر ناتھ ٹیگور بھی وطن کے متعلق کچھ ایسے ہی خیالات رکھتے تھے۔ بنکم چندر چٹرجی کی طرح وہ وطن کے تئیں مذہبی معتقدات کے قائل نہیں تھے۔ اس ضمن میں پولین بہاری کے نام لکھا گیا ان کا خط ٹیگور کے وطنی رجحان پر روشنی ڈال سکتا ہے۔ انھوں نے لکھا تھا:

''ایک بار میں چندر کے ہمراہ ہیم چندر ملک میرے پاس آئے۔ انھوں نے مجھ سے گزارش کی کہ ایک گیت دیش بھگتی پر ایسا لکھیں جس میں ملک کا موازنہ دُرگا سے کیا جائے لیکن میں نے ایسا گیت لکھنے سے انکار کر دیا۔''

[بحوالہ: ف۔ س۔ اعجاز، 'رابندر ناتھ ٹیگور اور بھارت کا قومی ترانہ'، انشاء، جولائی، اگست ۲۰۱۲]

ٹیگور وندے ماترم کو اسی قبیل کا گیت سمجھتے تھے اور پارلیمنٹ میں اس کے قانونی طور پر گائے جانے کے قائل نہیں تھے۔ انھوں نے سبھاش چندر بوس کو خط بھی لکھا تھا:

''وندے ماترم اپنے مرکز میں درگا دیوی کے لیے لکھا گیا بھجن ہے...... کسی مسلمان سے امید نہیں جا سکتی کہ وہ حب وطن کی نسبت سے دس ہاتھوں والی اس دیوی کو سوادیس کے طور پر تسلیم کرے گا۔ ناول آنند مٹھ ایک ادبی کارنامہ ہے اور اس لیے یہ گانا اس میں موزوں ہے لیکن پارلیمنٹ تمام مذہبی طبقوں کے ملنے کی جگہ ہے، وہاں یہ بھجن مناسب نہیں ہو سکتا۔'' [ایضاً: ماہنامہ انشا، جولائی، اگست ۲۰۱۲ء]

ان دونوں خطوں کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ رابندر ناتھ ٹیگور کا نظریۂ قومیت اور حب الوطنی مذہبی عقیدے کے تابع نہیں تھا۔ انھوں نے کبھی بھی حب الوطنی کو انسانیت پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ ان کا قومی ترانہ ''جن گن من'' ہمارے اس خیال کی تصدیق کرتا ہے۔

ٹیگو کا یہ قومی ترانہ سب سے پہلے ۲۷ر دسمبر ۱۹۱۱ء کو نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاس کلکتہ میں گایا گیا تھا۔ اسی سال رابندر ناتھ ٹیگور نے اس کا انگریزی میں ترجمہ "Morning Song of

"India" کے عنوان سے کیا۔ نیتاجی سبھاش چندر بوس انگریزی حکومت سے روپوش ہوکر ۱۹۴۱ء میں جرمنی پہنچے تو ''فری انڈیا سینٹر'' نے ٹیگور کے اس گیت کو اپنا قومی ترانہ تسلیم کرلیا۔ وہیں ڈاکٹر آمیک مجمدار اور ڈاکٹر مکھرجی نے اس گیت کی دھن تیار کی جو آج بھی گائی جاتی ہے۔ یہ دھن حکومت کی تسلیم شدہ ہے۔ اسی دھن میں جن گن من پہلی بار ریڈیو جرمنی ہیمبرگ سے نشر ہوا۔ پھر بھی جب ہندوستان آزاد ہوا تو اس کا کوئی منظور شدہ قومی ترانہ نہیں تھا۔ اس لیے دستور ساز اسمبلی نے ۲۴ رجنوری ۱۹۵۰ء کو جن گن من کو ملک کی قومی ترانہ قرار دے دیا۔

جن گن من کے متبادل ترانوں میں علامہ اقبال کے ''ترانۂ ہندی'' کا بھی شمار ہوتا ہے۔ اقبال نے اسے ۱۹۰۴ء میں اس وقت لکھا تھا جب وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں لکچرر تھے۔ اقبال کے اولین مجموعۂ کلام ''بانگ درا'' میں چونکہ ''ترانۂ ہندی'' بچوں کی منظومات کے درمیان ہے اس لیے بعض ناقدین نے انھیں بچوں کے قومی گیت سے تعبیر کیا ہے۔ حالانکہ اقبال نے ''میرا وطن وہی ہے'' اس نظم کو 'ہندستانی بچوں کا قومی ترانہ' کہا ہے۔ بہرحال ترانۂ ہندی کی مقبولیت اگرچہ جن گن من سے کم نہیں ہے مگر وائے بدقسمتی اسے قومی ترانہ قرار نہیں دیا گیا۔ مگر غیر سرکاری قومی ترانوں میں ''ترانۂ ہندی'' سب سے زیادہ لوگوں کی زبانوں پر چڑھا ہوا ہے۔ مہاتما گاندھی ۱۹۳۵ء میں ایروڑہ جیل پونہ میں قید و بند کی صعوبتوں کے دن گزار رہے تھے تو اقبال کا یہی ''قومی ترانہ'' ان کی دلجوئی کرتا اور ان کی ڈھارس بندھاتا۔ ''سارے جہاں سے اچھا'' کی دھن موسیقی کار روی شنکر نے تیار کی تھی۔ یہ قومی ترانہ اگرچہ سرکاری نہیں ہے مگر ہندستانی فوج کے نوجوان مارچ پاسٹ کے وقت سینے تان کر آگے بڑھنے کا مظاہرہ اقبال کے ترانۂ ہندی کی دھن ہی پر کرتے ہیں شاید بہادری اور شجاعت کا اظہار کرنے کے لیے ان فوجیوں کو دوسری دھن راس نہ آتی ہو۔ یہ ہندستانی فوجیوں کے لیے منظور شدہ اس مثالی دھن نے اقبال کے ''سارے جہاں سے اچھا'' کو سرکاری درجہ پر پہنچا دیا ہے۔ اس کی ہردل عزیزی کا یہ عالم ہے کہ چاند پر پہنچنے والے خلاباز کی زبان پر بھی ترانۂ ہندی کا مصرع رواں تھا:

''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا''

ان دونوں قومی ترانوں کا تقابلی تجزیہ کیا جائے تو درج ذیل حقائق سامنے آتے ہیں:

(۱) اقبال نے اپنی شاعری میں جو زبان استعمال کی، اس سے آسان تر زبان کو ''ترانۂ ہندی'' میں استعمال کیا۔ اس کے برخلاف ٹیگور کے جن گن من کی زبان مشکل ہے۔ ٹیگور نے اپنی بنگالی تخلیقات کی زبان میں سنسکرت الفاظ بہت کم استعمال کیے ہیں مگر قومی ترانے میں سنسکرت لفظیات زیادہ ہیں۔

(۲) قومی ترانے کے لیے لازمی ہے کہ اس میں ملک اور اندرون ملک پائی جانے والی چیزوں کی تعریف و توصیف ہو۔ اس کی نسبت کے احساس سے افتخار کا جذبہ پیدا ہو۔ اس کے قدرتی مناظر اور وسائل کا تذکرہ ہو۔ اقبال کے ترانۂ ہندی میں یہ سارے عوامل مل جاتے ہیں مگر ٹیگور کے جن گن من میں ان

عناصر کی شدت سے کمی محسوس ہوتی ہے۔ ٹیگور بھارت بھاگیہ ودھاتا سے عرض معروض کرتے ہیں اوراسی کی ثناوتوصیف میں مگن دکھائی دیتے ہیں جن گن من میں وہ کہتے ہیں:

''اے سب لوگوں کے دلوں کے حکمراں، بھارت کا نصیب طے کرنے والے/ پنجاب، سندھ، گجرات، مراٹھا، داوڑ اتکل بنگا/ وندھیا ہماچل، جمنا گنگا، بل کھاتے پانی کی ترنگیں/ تیرا مقدس نام لے کر جاتے ہیں اور تیری رحمت کے امیدوار ہیں/ تیری ہی ثنا بیان کرتے ہیں/ اے بھارت کا نصیب طے کرنے والے تیری جئے ہو/ جئے ہو، جئے ہو، جئے ہو، جے جے جے جے ہو''۔

اس طرح یہ ترانہ قومی ترانے کی بہ نسبت حمد اور خدا کی تعریف سے قریب تر ہے۔ جبکہ اقبال کے ترانے میں حب الوطنی ہر شعر سے ٹپک پڑتی ہے:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم، رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی، دل ہو جہاں ہمارا
پربت وہ ہم سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جس کے دم سے رشکِ جناں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا
یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ جہاں ہمارا
اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ جہاں ہمارا

(۳) اقبال کے ترانہ، ہندی پر کبھی کوئی تنازعہ کھڑا نہیں ہوا البتہ جن گن من کی ترکیب ''بھارت بھاگیہ ودھاتا'' کے متعلق کافی اعتراضات اخبارات میں اٹھائے گئے اور خود ٹیگور کو وضاحت کرنی پڑی۔ بعض لوگوں نے بھارت بھاگیہ ودھاتا کو ترکیب میں جارج پنجم کو ممدوح قرار دیا تھا اس پر

ٹیگور کو کئی بار صفائی پیش کرنی پڑی۔ اس کے برعکس '' سارے جہاں سے اچھا'' پر کبھی کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ پھر بھی اسے سرکاری پذیرائی حاصل نہیں ہوئی۔ اس کے باوصف اس کے میٹھے بول آج بھی لوگوں کے دلوں پر حکمرانی کر رہے ہیں۔

(۴) ۱۹۰۴ء میں اقبال نے جب قومی ترانہ لکھا اس وقت ہندوستانی سیاست میں کوئی غیر معمولی واقعات رونما نہیں ہوئے تھے پھر بھی اقبال نے بانگ درا کی وطنی نظموں کے ساتھ اس ترانے کو شامل کیا۔ ان منظومات میں ہمالہ، نیا شوالہ، آفتاب، راوی شامل ہیں جن میں وطن کے کسی نہ کسی پہلو کا تردد ہے۔ اس کے علی الرغم جن گن من کی تخلیق کے وقت ہندوستان میں جارج پنجم کے استقبال کی تیاریاں زوروں پر تھیں دہلی دربار نے تقسیم بنگال کے فیصلہ کو کالعدم کر دیا تو اس کے شکرانے میں جشن کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ پولین بہاری کے نام ۲ر نومبر ۱۹۳۷ء کو لکھے گئے ٹیگور کے خط سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ سرکاری خدمت گار خود ٹیگور سے استقبالیہ گیت لکھنے کی درخواست کر رہے تھے، ان سیاسی حالات میں ٹیگور نے جن گن من لکھا تھا۔

(۵) ٹیگور خود موسیقی کے ماہر تھے۔ انھوں نے اپنی بھابھی مارگریٹ کی مدد سے اس ترانے کی دھن تیار کی تھی جو بحر مدار کی دھن سے ملتی جلتی ہے۔ اقبال کی موسیقی شناسی کا پتا نہیں چلتا۔ ان کے ترانے کی دھن روی شنکر کی تیار کردہ ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دونوں ترانے موسیقی کے سرتال پر پورے اترتے ہیں۔

(۶) دونوں ترانوں میں شاعر کی حب الوطنی نمایاں ہے۔ دونوں یہاں کی وحدت فی الکثرت کے قائل ہیں اور اس پر نازاں ہیں۔ ٹیگور اور اقبال دونوں ایسی قومیت کو پسند کرتے تھے جس میں جانب داری کا شائبہ تک نہ ہو۔ دونوں کو ہندستانی تہذیب اور اس کے ورثے پر فخر تھا اور اس کے قائم رکھنے کو وہ پسند کرتے تھے۔

اس طرح ٹیگور اور اقبال کے قومی ترانوں میں ان کی حب الوطنی کے مختلف ابعاد واضح ہوتے ہیں۔

ماخذ:

(۱) اقبال ''کلیات اقبال'' پرویز بک ڈپو، دہلی، بلا مورخہ ر (۲) سید ابوظفر ندوی ''تاریخ سندھ'' اعظم گڑھ، ۱۹۷۰ء

(۳) امیر خسرو ''نہہ سپہر'' دہلی، ۱۹۴۷ء ر (۴) رام چندر شکل ''ہندی ساہتیہ کا اتہاس'' وارانسی

(۵) ف۔ س۔ اعجاز ''ماہنامہ انشا'' جولائی اگست ۲۰۱۲ء ر (۶) رابندر ناتھ ٹیگور ''راشٹریہ چر ترمالا'' پونے ۱۹۷۶ء

(۷) میری دیوی ''رابندر ناتھ ٹیگور کی صحبت میں'' (مراٹھی) پونے ۱۹۷۱ء

☆☆☆

شہرِ تحقیق

(۱)

مولانا عبدالسلام نیازی۔ آفتابِ علم و عرفان

● راشد اشرف [پاکستان]

مولانا عبدالسلام نیازی، جنھیں زیادہ تر مولوی عبدالسلام نیازی ہی کہا جاتا ہے، ایک ایسی شخصیت تھی، جن کے تذکرے ان لوگوں کی تحریروں میں جابجا ملتے ہیں جو دلّی سے اٹھے تو کراچی، لاہور، بہاول پور، ملتان یا حیدرآباد سندھ آکر ہی دم لیا اور دیا بھی۔ مولانا پر شاہد دہلوی نے 'اجڑا دیار' میں لکھا تو اخلاق دہلوی نے اپنی خودنوشت 'یادوں کا سفر' میں ذکر کیا، جوش اور عشرت رحمانی نے اپنی اپنی خودنوشتوں بالترتیب 'یادوں کی برات' اور 'عشرت فانی' میں ان کے خاکے شامل کیے تو نصراللہ خاں 'کیا قافلہ جاتا ہے' میں ان کے تذکرے کے بنا آگے نہ بڑھ سکے تھے۔ ملّا واحدی اور حیرت شملوی نے مولانا کو یاد کیا ہے۔ مقبول جہانگیر نے شخصی خاکوں کی زندہ و جاوید کتاب 'یاران نجد' میں کس محبت و عقیدت سے مولانا کے ذکر کو محفوظ کیا ہے۔ ادھر دلّی میں ڈاکٹر خلیق انجم تو محمد آباد (تحصیل: صادق آباد، پنجاب) میں قیام پذیر بزرگ ادیب سید انیس شاہ جیلانی[a]، بھی ان کے مداحوں میں شمار ہوتے ہیں۔ مسعود حسن شہاب دہلوی مرحوم تو مولانا نیازی کے باقاعدہ شاگرد تھے۔ اسی طرح رزی جے پوری مرحوم کو مولوی صاحب سے ایک خاص تعلق خاطر تھا۔

کچھ عرصہ قبل پروفیسر رئیس فاطمہ اور قاضی اختر جوناگڑھی سے ایک ملاقات میں دوران گفتگو جب مولوی عبدالسلام نیازی کا تذکرہ چھڑا تو قاضی صاحب کہنے لگے: ''بھئی! یہ مولوی صاحب بھی ایک حیرت انگیز بزرگ ہیں۔ کچھ سال بعد ان کا ذکر کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی ضرور کرتا ہے۔ لیکن ان پر کوئی کام نہیں ہوا۔''

راقم الحروف چونکہ اوائل عمری میں اردو ادب کی طرف مائل ہو گیا تھا لہٰذا مختلف کتابوں، خودنوشتوں اور شخصی خاکوں کے مجموعوں میں مولانا عبدالسلام نیازی مرحوم و مغفور کا احوال پڑھنے کے بعد آپ

سے ایک لگاؤ اور انسیت رہی۔ اس بات پر طمانیت کا احساس ہوتا ہے کہ ''مولانا عبدالسلام نیازی: آفتاب علم وعرفاں'' کو اس حقیر نے مرتب کیا ہے۔ یقیناً اس کام میں پھیلاؤ کی گنجائش ہے۔ یہ آغاز ہے اور امید ہے کہ آنے والے وقت میں اس سلسلے میں بالخصوص ہند میں ضرور کام کیا جائے گا۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے فرزند جناب حیدر فاروق مودودی کے مطابق دہلی کے ترکمان گیٹ کے علاقے میں وہ جگہ ابھی تک سلامت ہے جہاں مولانا نیازی قیام پذیر تھے اور یقیناً دہلی میں ایسے عمر رسیدہ لوگ اب بھی موجود ہوں گے جن کو مولانا نیازی سے شرف ملاقات رہا تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ مولانا عبدالسلام نیازی پر پاک و ہند میں کوئی کتاب لکھی نہیں گئی، نہ ہی ان کی شخصیت پر کسی جامعہ سے کوئی تحقیق کی گئی۔ ان پر تحریر کردہ خاکوں مضامین اور تذکروں کو محفوظ کرنے کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ ایک اہم علمی شخصیت کے بارے میں معلومات یکجا ہو جائیں نیز ایک ایسی جید شخصیت کو نئی نسل سے متعارف کرایا جائے جو دلّی مرحوم کی تہذیب کا ایک اہم جز رہی ہے۔ واضح رہے کہ مولانا نیازی پر سب سے پہلا خاکہ شاہد احمد دہلوی نے تحریر کیا تھا۔ اسی خیال کے پیش نظر راقم الحروف نے مولانا نیازی پر شائع ہوئے مضامین کو جمع کرنے کی ٹھانی اور اسی اثناء میں میرے دیرینہ کرم فرما، معروف محقق، مدرس و ادیب ڈاکٹر معین الدین عقیل کا برقی مکتوب موصول ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے کیا خوب کہا کہ:

> ''عبدالسلام نیازی صاحب چوں کہ ایسے افراد میں تھے جو تھے تو متبحر عالم لیکن تصنیفی خدمات قابل ذکر نہیں۔ ہماری تاریخ کے ہر دور میں ایسے افراد کے نام یا اشارے ملتے ہیں کہ جنھوں نے علمی فضیلتوں کا اظہار تو کیا لیکن اپنے علم کو قرطاس وقلم سے دور رکھا، گویا ثبوت باقی نہ رکھا۔ ان کے شاگرد ہی ان کا تعارف بنتے رہے۔ اور اگر شاگردوں میں کوئی معروف گزرے تو استاد کا نام بھی باقی رہ گیا۔ ورنہ یوں ہی قدآور اساتذہ بھی ایک عرصے بعد تاریخ سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ عبدالسلام نیازی بھی ان ہی میں سے ایک ہیں۔ مالک رام نے بہت ضخیم تذکرہ چار جلدوں میں معاصرین کا لکھا، نیازی صاحب ان کے پڑوس میں تھے لیکن چوں کہ صاحبِ تصنیف نہ تھے اس لیے ان کا ذکر شامل نہ کیا۔ تہذیبی طور پر وہ قابل ذکر تھے اس لیے ان کا ذکر 'دلّی والے' میں آ گیا۔ شاید ان کے مزاج کی مبینہ ترشی ہی تھی کہ دلّی کے بعض نہایت اہم خاکہ نگاروں نے بھی ان کی طرف توجہ نہ دی۔''

لیکن کیا راقم ہی وہ پہلا شخص ہے جس کے سر میں یہ سودا سمایا؟ یقیناً ایسا نہیں ہے۔ کئی برس ہوئے جب شبیر احمد میواتی صاحب نے مولانا نیازی پر کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں مضامین اکٹھے کرنے شروع کیے تھے۔ اس بات کا تذکرہ ڈاکٹر انور سدید نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے۔ مذکورہ مضمون کے مطالعے

کے بعد راقم نے یکم اکتوبر ۲۰۱۳ کو ڈاکٹر صاحب سے بات کی۔ معلوم ہوا کہ میواتی صاحب سیلانی آدمی تھے، کبھی کبھی ڈاکٹر صاحب کے پاس آنکلتے تھے اور اب کوئی عرصہ چار برس سے ڈاکٹر انور سدید کو ان کی کوئی خبر نہیں ہے۔ کتاب یقیناً شائع نہیں ہوسکی بصورت دیگر ڈاکٹر سدید اس بارے میں ضرور واقف ہوتے۔ اسی طرح اب سے ڈیڑھ برس قبل میرے کرم فرما انیس شاہ جیلانی صاحب نے، کہ مولانا کے زبردست معتقد ہیں، ان پر ایک کتاب مرتب کرنے کی ٹھانی تھی۔ اور کتاب بھی کیسی ضخیم کہ انیس صاحب ۴۰۰ صفحات یکجا کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ یہ بات انھوں نے راقم کو حال ہی میں فون پر دوران گفتگو بتائی تھی۔ مذکورہ اوراق میں پشاور کے کسی صاحب کا ایک اہم اور غیر مطبوعہ مضمون بھی شامل تھا۔ اس کے بعد یوں ہوا کہ شاہ صاحب نے مسودہ حیدرآباد میں ایک صاحب کو بھیجا اور پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ دونوں حضرات راقم کے نزدیک از حد محترم ہیں اور ان دونوں سے گفتگو کے بعد یہی حقیقت سامنے آئی کہ اب وہ مسودہ نہ تو ان صاحب کے پاس ہے اور نہ ہی شاہ صاحب کی دسترس میں ہے۔ سو یہ گراں قدر کام بھی ضائع ہوا۔ واضح رہے کہ سید انیس شاہ جیلانی نے اپنے سفرنامہ مقبوضہ ہندوستان (اشاعت ۱۹۹۳) میں مولانا نیازی کا تذکرہ محبت و عقیدت سے کیا ہے۔

بات ہو رہی تھی مولانا عبدالسلام نیازی پر لکھی تحریروں کی۔ ہوتے ہوتے یہ ہوا کہ راقم کا رابطہ 'الزبیر' کے مدیر محترم ڈاکٹر شاہد رضوی سے ہوا بلکہ یوں کہیے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں ہماری مدد کے لیے بھیج دیا۔ ڈاکٹر صاحب کے خانوادے کو مولانا نیازی سے عقیدت بھی ہے اور نسبت بھی۔

آپ کے والد محترم مسعود حسن شہاب دہلوی نے نہ صرف اپنی خودنوشت میں مولانا کا تذکرہ کیا ہے بلکہ مولانا پر ایک عمدہ و جامع خاکہ بھی تحریر کیا تھا۔ 'الزبیر' میں ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا۔ رزی جے پوری کا ایک اہم مضمون بھی ڈاکٹر صاحب ہی نے کھوج نکالا۔ اردو شاعر، ماہر لسانیات محمد اسماعیل خان المعروف رزی جے پوری، ڈاکٹر الیاس عشقی کے والد تھے۔ وہ ۱۲/ اگست ۱۹۰۰ء کو جے پور میں پیدا ہوئے اور ۲۹ مارچ ۱۹۹۱ء کو حیدرآباد سندھ میں انتقال کیا۔

یوں یہ سلسلہ آگے بڑھا اور ڈاکٹر شاہد نے ان کو مواد کی فراہمی کی صورت کتاب کی اشاعت کا عندیہ دیا اور اب زیر نظر کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے اور آپ مولانا عبدالسلام نیازی پر لکھے مضامین کی مدد سے ان کی یاد اپنے ذہنوں میں ایک مرتبہ پھر تازہ کر رہے ہیں۔ کتنے ہی ایسے لوگ رہے ہوں گے جو مولانا نیازی کی شخصیت کو بھلانا نہیں چاہتے ہوں گے۔ نصیب کی بات ہے..... ایک 'نیازی' ہمارے یہاں بھی گزرے تھے جن کے اقربا بھی اب ان کا نام لینے سے گریزاں ہوں گے۔

راقم کے پاس مولانا عبدالسلام نیازی پر لکھے جو مضامین یا مختلف خودنوشتوں میں تذکرے موجود تھے اور جنھیں زیر نظر کتاب میں شامل کیا گیا ہے ان کی تفصیل کتاب میں زیر نظر مضمون کے آخر میں کتابیات

کے تحت درج کی گئی ہے۔

مولانا پر جو طویل خاکے سید مقصود زاہدی، رزی جے پوری، اور سید مسعود حسن شہاب دہلوی نے لکھے ہیں، ان کی حیثیت کئی اعتبار سے جداگانہ ہے۔ اس کا ذکر آگے چل کر۔

اسی دوران اسلام آباد سے میرے دیرینہ کرم فرما حسن نواز شاہ صاحب نے 'اسپوتنک' میں شائع ہوا خاکہ ارسال کرنے کے ساتھ ساتھ یہ اطلاع بھی دی کہ ان کے پاس مولانا نیازی کی لکھی سورہ فاتحہ کی تفسیر موجود تھی جو لگ بھگ اسّی صفحات پر مشتمل تھی جو کوئی صاحب ان سے مستعار لے گئے تھے اور پھر واپس نہ کیا۔ مذکورہ تفسیر میں مولانا نیازی نے مفاہیم و مطالب کو جس طرح پانی کیا ہے، وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ حسن صاحب، مولانا نیازی سے عقیدت رکھتے ہیں اور ان کی کوشش ہے کہ اس کتاب کی بازیابی ہو سکے۔ یہ حسن نواز صاحب ہی ہیں جن سے یہ علم ہوا کہ مولانا عبدالسلام نیازی کا مزار دہلی میں خواجہ حسن نظامی ثانی کی قیام گاہ کے قرب و جوار میں واقع ہے۔ نواز صاحب نے مولانا نیازی پر مواد کی فراہمی میں جس قدر تعاون کیا ہے اس کے شکریے کی ادائیگی کے لیے راقم کے پاس مناسب الفاظ نہیں ہیں۔ مزید برآں ''شرح وحدت الوجود والشہود'' نامی کتاب سے میاں علی محمد خاں چشتی اور مولانا عبدالسلام نیازی کے مابین ہوئی مراسلت بھی شاہ صاحب ہی کی فراہم کردہ ہے۔

زیرِ نظر کتاب اپنی تیاری کے آخری مراحل میں تھی جب شاہ صاحب نے راقم سے رابطہ کیا اور بتایا کہ ایک جگہ سے انھیں عزیز میاں قوال (پ: ۱۷/اپریل ۱۹۴۲ء، دہلی۔ م: ۶/دسمبر ۲۰۰۰ء، تہران) کی سوانح عمری ملی ہے جس میں مولانا نیازی کا بھرپور تذکرہ ہے۔ عزیز میاں قوال مولانا نیازی سے اکتسابِ علم کی غرض سے دلّی گئے تھے جہاں انھوں نے مولانا نیازی سے شیخ اکبر کی ''فتوحاتِ مکّیہ'' کی تعلیم حاصل کی، وہاں مشاہیرِ ایران کے علوم کے موضوع پر بھی مولانا نیازی سے استفادہ کیا۔ عزیز میاں نے اپنے مرشد میاں محمد یسین سے فتوحات مکیہ پڑھنے اور سمجھنے کی خواہش ظاہر کی تو میاں صاحب نے مولانا عبدالسلام نیازی کا تذکرہ کیا اور عزیز میاں کو مشورہ دیا کہ انھیں دہلی جانا چاہیے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ مولانا نیازی مزاج کے سخت ہیں اور اگر تم کسی سبب تعلیم حاصل کرنے میں ناکام رہے تو یاد رکھنا کہ راستے میں جمنا بھی پڑتا ہے۔

مذکورہ سوانح عمری سے مولانا نیازی سے متعلق ازحد دلچسپ اوراق بھی اس کتاب میں شامل کیے گئے ہیں جس کے لیے راقم الحروف حسن نواز شاہ صاحب کا خصوصی شکریہ ادا کرتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس کتاب میں شامل مضامین و دیگر مواد کے حصول کے مراحل کے دوران ایسی ایسی جگہوں سے حیرت انگیز طور پر مدد آئی کہ اس پر ایک علاحدہ مضمون باندھا جا سکتا ہے۔ راقم کو رہ رہ کر اس بات کا احساس ہوتا رہا کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ خاص لوگوں کو راقم کی مدد پر مامور کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام اشخاص کو سلامت رکھے اور اجر سے نوازے۔ ڈاکٹر شاہد رضوی کی استقامت کی داد دیتا ہوں کہ جو ایک وقت میں کتاب مکمل ہونے کے بعد

بھی وقتاً فوقتاً، راقم کی جانب سے بھیجے جانے والے مضامین و دیگر متفرقات کو خندہ پیشانی سے کتاب میں شامل کرتے چلے گئے اور اس سلسلے میں اپنے حسنِ انتظام کی رفعتوں پر نظر آئے۔

ذکر ہے مولانا نیازی کی تصنیفات کا۔ مقصود زاہدی کی نظر سے مولانا نیازی کی کئی مذہبی تصانیف گزری تھیں۔ ان میں ''مشکاۃ التوحید فی التجرید'' کا ذکر زاہدی مرحوم نے اپنے خاکے (زیرِ نظر کتاب میں شامل) میں کیا ہے۔ البتہ اس کی تفصیل بیان نہیں کی۔ یہ تفصیل مسعود حسن شہاب دہلوی نے اپنے خاکے (شامل کتاب ہے) میں لکھی ہے۔ شہاب مرحوم کے مطابق دلّی کے مشہور واعظ اور استعانت بالغیر کے قائل مولوی کرامت اللہ خاں، مولانا نیازی سے الجھ پڑے تھے۔ مولانا، استعانت باللہ کے قائل تھے۔ یوں اس بحث کے نتیجے میں مولانا نیازی نے جو رسالہ سپرد قلم کیا اس کا نام شہاب مرحوم نے، مقصود زاہدی کے برخلاف 'مصباح التجرید فی مشکوۃ التوحید'' لکھا ہے۔ مولانا نیازی نے اس رسالے میں مولوی کرامت اللہ خاں کے کس طرح لتے لیے تھے، یہ تمام دلچسپ احوال شہاب مرحوم نے اپنے خاکے میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ مسعود شہاب کے مطابق مولانا نیازی نے انھیں ایک مکمل رسالہ علم عروض پر لکھوایا تھا جو بدقسمتی سے تقسیم کے ہنگاموں کی نذر ہو گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا عبدالسلام نیازی کی پُرجلال شخصیت نے اکثر و بیشتر لکھنے والوں کو ان کے قریب نہ آنے دیا تھا۔ ان میں شاہد احمد دہلوی نے تو اس بات کا برملا اعتراف اپنے خاکے میں کیا ہے۔ کچھ ایسا ہی اخلاق احمد دہلوی کے ساتھ بھی ہوا۔ نوعمری کا زمانہ تھا، اخلاق احمد دہلوی اپنے والد کے ہمراہ مولانا کے پاس پڑھنے کی غرض سے تھر تھر کانپتے ہوئے پہنچے۔ لطف کی بات یہ تھی کہ ان کے والد بھی خوف سے کانپ رہے تھے۔ بقول اخلاق دہلوی یہ وہ بزرگ تھے جن کے سامنے مفتیِ اعظم ہند مولوی کفایت اللہ کا پتہ بھی پانی ہوتا تھا۔

مولانا عبدالسلام نیازی نے اخلاق دہلوی کے والد سے پوچھا: اچھا، خدا خوش رکھے، تو یہ وہی صاحبزادے ہیں آپ کے جو مفتی صاحب سے فقہ پڑھنے میں ان کا ناطقہ بند اور قافیہ تنگ کرتے رہے۔ یہ کہہ کر مولانا نے اخلاق دہلوی کی جانب دیکھا اور کہا: خدا آپ کو علم کا پہاڑ بنا دے، ماشاء اللہ، خدا خوش رکھے۔ بس جائیے اور اپنے والد کو بھی اپنے ساتھ لے جائیے۔

مولانا مودودی اور جوش ملیح آبادی ایسی شخصیات ہیں جن کی مولانا نیازی سے نہ صرف صحبتیں رہیں بلکہ مولانا مودودی تو مولانا نیازی کے باقاعدہ شاگرد بھی رہے تھے۔ اس ضمن میں مولانا مودودی کہتے ہیں کہ:

> ''مولانا عبدالسلام صاحب میرے والد ماجد کے بہت عقیدت مند تھے۔ والد صاحب مرحوم نے میرے بچپنے ہی میں ان سے کہہ دیا تھا کہ اسے عربی

پڑھانا۔ چنانچہ بچپن میں بھی میں نے ان سے پڑھا ہے۔ پھر 'الجمیعۃ' دہلی کی ارادت کے زمانے (۱۹۲۸۔۱۹۲۵) میں جب میں نے عرض کیا کہ کچھ کتابیں رہ گئی ہیں انھیں پڑھنا چاہتا ہوں تو فوراً مان گئے" [b]

جوش ملیح آبادی 'یادوں کی برات' میں مولانا عبدالسلام نیازی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وہ مشرقی علوم کے حرف آخر انسان اور شہنشاہ تھے۔ قران، حدیث، منطق، حکمت، تصوّف، عروض، معنی و بیان، علم الکلام، تاریخ، تفسیر، لغت، لسانی فوائد، ادب اور شاعری کے امام تھے۔ جید عالم ہونے کے باوجود علمائے سو کے تشابہ سے بچنے کے لیے انھوں نے داڑھی مونچھ کا صفایا کر دیا تھا۔ وہ تصوّف و حسن پرستی کے متوالے، اور اپنے عہد شباب میں تمام اولیائے ہند کے مزارات کے چکر لگاتے، اور اپنی محبوبہ کو ساتھ لے کر تمام عرسوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ لیکن زندگی کے آخری ایام میں وہ اس قدر سختی کے ساتھ خلوت پسند اور خودنشیں ہو گئے تھے کہ تقریباً بائیس برس کی مدّت میں، وہ اپنے دہلی کے ترکمان دروازے کی پتلی سی گلی کے بالا خانے سے کبھی ایک بار بھی نیچے نہیں اترے تھے۔"

اوپر سید مقصود زاہدی کے مولانا نیازی پر تحریر کردہ خاکے کا ذکر ہوا تھا جو ان کی کتاب "یادوں کے سائے" میں شامل ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مذکورہ کتاب کے تمام ہی خاکے اپنی مثال آپ ہیں لیکن مولانا پر لکھے خاکے نے تو تحریر کا حق ہی ادا کر دیا ہے۔ فارغ بخاری مرحوم نے 'یادوں کے سائے' کا ذکر کرتے ہوئے اپنے خاکے میں لکھا تھا:

"یوں یہ تمام خاکے بڑے منفرد اور فکر انگیز ہیں۔ لیکن ان میں ڈاکٹر عابد حسین، مولانا حسرت موہانی اور علامہ عبدالسلام نیازی کے تشخص میں تو اس کے قلم کی معجز نمائی اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ خصوصاً علامہ عبدالسلام نیازی کا خاکہ تو زاہدی کا ایسا شاہکار ہے جو ہمیشہ یاد رہے گا۔ اس میں اس نے کچھ ایسے زاویوں سے رنگ ابھارے ہیں اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر ایسی مہارت سے روشنی ڈالی ہے کہ ان کی علمی، ادبی اور مذہبی شخصیت اپنی پوری عظمت اور جلال و جمال کے ساتھ نکھر کر سامنے آئی ہے۔"

راقم نے مولانا نیازی پر لکھی تمام تحریروں کا بغور جائزہ لیا ہے اور یہ بات کہنے میں حق بجانب ہے کہ جس انداز میں سید مقصود زاہدی، رزمی جے پوری اور مسعود حسن شہاب دہلوی مرحوم نے ان پر قلم اٹھایا ہے وہ کسی اور کو نصیب نہ ہوا۔ دونوں شخصیات کو مولانا نیازی کی صحبت نصیب ہوئی تھی بلکہ مسعود شہاب تو مولانا کے باقاعدہ شاگرد رہے تھے۔ مولانا نیازی کے ایک شاگرد حکیم حبیب اشعر بھی تھے جن کا ذکر آگے

چل کر آئے گا۔ یہ بھی ایک یہ حقیقت ہے کہ سید مقصود زاہدی نے اپنے تحریر کردہ خاکے میں مولانا کی ذات سے وابستہ مافوق الفطرت داستانوں کی نفی کرتے ہوئے انھیں ایک عام انسان کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مقصود زاہدی نے اس بارے میں ایک عمومی تجزیہ، مولوی صاحب کے خاکے کے بجائے آغا طاہر نبیرۂ آزاد کے خاکے میں پیش کیا ہے، لکھتے ہیں:

> ''مولوی عبدالسلام ذہنی طور پر اپنے معاشرے میں ایک اجنبی کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کے مزاج کی وحشت اور برہمی نے انھیں ایک قلندر بنا دیا تھا اور قلندری انھیں ان راہوں پر پڑنے ہی نہ دیتی تھی جن پر چل کر کوئی فلسفی یا عالم فاضل اپنے افکار و خیالات کو عام کر سکتا ہے۔ مولوی صاحب کسی نوع کی پابندی گوارا ہی نہ کرتے تھے پھر یوں وہ تصنیف و تالیف اور اشاعت و تشہیر کے چکر میں کیسے پڑتے۔ دوسرے ان کی طبع رائج الوقت علم کی اقدار سے کوئی لگا نہ کھاتی تھی۔''

مولانا عبدالسلام پر لکھے خلیق انجم اور شاہد دہلوی کے خاکوں کو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ زاہدی مرحوم، رزمی بے پوری و شہاب مرحوم کی تحریروں کے بعد سب سے جاندار تحاریر ہیں۔ اسی طرح مقبول جہانگیر کے ایک خاکے میں مولانا کے بارے میں اہم باتیں بیان کی گئی ہیں۔ یہاں ایک دلچسپ بات کا ذکر کرتا چلوں۔ مقصود زاہدی نے اپنے خاکے میں ایک جگہ شاہد دہلوی کے بارے میں لکھا ہے:

> ''مولوی عبدالسلام سے میں نے اپنی پہلی ملاقات اور اس سے مرتب ہونے والے تاثرات کا ذکر بہت سے حضرات سے کیا تھا، جن میں شاہد احمد دہلوی مرحوم بھی تھے۔ شاہد صاحب ان کے بارے میں پہلے ہی بہت کچھ سنے بیٹھے تھے۔ لیکن وہ زندگی بھر مولوی صاحب سے نہیں ملے پھر بھی انھوں نے سنی سنائی باتوں سے ایک مضمون کو سنوارا جس کا نام تھا 'وے صورتیں الٰہی'۔ یہ مضمون ۱۹ر جنوری ۱۹۵۸ کو ہفت روزہ لیل و نہار میں شائع ہوا تھا۔ لیکن جہاں تک مولانا کی شخصیت کا تعلق ہے، میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ شاہد احمد دہلوی لیل و نہار والے مضمون میں اور آگے چل کر نقوش میں چھپنے والے مضمون میں بھی صحیح معنوں میں حق ادا نہ کر سکے۔''

شاہد احمد دہلوی نے اپنے مضمون ''مولانا عبدالسلام نیازی'' (۱۹۶۷۔ حوالہ: بزم خوش نفساں) میں مولانا کو پہلی مرتبہ دیکھنے کے بیان میں صاف صاف لکھا ہے کہ:

> ''اس واقعے کے بعد کوئی پچیس سال تک میں مولانا کو دیکھتا رہا اور کبھی کبھی ان کی مختصر گفتگو سننے کا مجھے اتفاق ہوا۔ مگر مجھے ان سے ڈر لگتا تھا۔ اس لیے میں نے کبھی ان سے قریب ہونے کی کوشش نہیں کی۔ وہ میرے لیے ہمیشہ دور کا جلوہ ہی

رہے۔''

سید مقصود زاہدی نے نہ صرف اپنے طویل خاکے میں مولانا عبدالسلام نیازی کے گرد موجود طلسماتی ہیولے کے تاثر کو زائل کیا ہے بلکہ ان کو ایک عام انسان ثابت کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ مقصود زاہدی باقاعدگی سے مولانا کے پاس حاضری دیا کرتے تھے، مشاہدے کے حد درجہ تیز تھے لہذا مذکورہ خاکے میں لگی لپٹی رکھے بنا مولانا کی زندگی اور ان کی شخصیت کا ٹھیک ٹھیک تجزیہ پیش کیا ہے۔

سید مقصود زاہدی کے مطابق جب خواجہ حسن نظامی نے مولانا سے تصوف پر کچھ لکھنے کی خواہش ظاہر کی اور مولانا نیازی کا قلم رواں ہوا، یوں ۵۰۰ صفحات کا ایک مسودہ تیار ہوگیا۔ حسن نظامی ملاقات کے لیے آئے اور مسودہ دیکھتے رہے، پھر بولے ''مولوی صاحب یہ تصنیف میں اپنے نام سے شائع کروں گا، مجھے اس کی اجازت مرحمت فرمائیں۔''

سید مقصود زاہدی لکھتے ہیں کہ یہ سن کر مولانا کا ناریل چٹخ گیا، انھوں نے وہ کیا جو دنیا میں بہت کم لوگ کر سکتے ہیں۔ مسودہ کو پھاڑ ڈالا اور ملازم کو آواز دے کر کہا کہ خواجہ صاحب کے لیے ان کاغذوں کو جلا کر چائے تیار کر لا۔

اہم بات یہ ہے کہ شاہد احمد دہلوی نے بھی اپنے خاکے میں اس واقعے کا ذکر کیا ہے لیکن ان کے مطابق حسن نظامی، مولانا نیازی کے یہاں نہیں آئے تھے بلکہ مولانا مسودہ لے کر حسن نظامی کے گھر گئے تھے۔ یہی بات عشرت رحمانی مرحوم نے اپنی خود نوشت ''عشرت فانی'' میں بھی لکھی ہے۔

بیان میں تضاد کی ایک اور مثال مولانا نیازی کی تاریخ وفات کے سلسلے میں بھی سامنے آتی ہے۔ عطاء الرحمٰن قاسمی کی 'الواح الصنادید' میں، جو لاہور سے ۲۰۰۲ میں ''دہلی میں مدفون خزینے'' کے عنوان کے تحت شائع ہوئی تھی، مولانا عبدالسلام نیازی کی تاریخ وفات ۳/جون ۱۹۶۶ درج ہے۔ درست تاریخ کا ذکر آگے چل کر مولانا کی قبر کے احوال میں آئے گا۔

اب کچھ مزید بات مسعود حسن شہاب دہلوی کے تحریر کردہ خاکے کی بابت جو بہاولپور کے تحقیقی مجلے 'الزبیر' میں ۱۹۷۲ میں ''مولانا عبدالسلام نیازی دہلوی'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اوپر سید مقصود زاہدی کے تعلق سے لکھا گیا تھا کہ فلاں بات سن کر مولانا نیازی کا ''ناریل'' چٹخ گیا۔ مولانا کے لیے یہ ترکیب شاہد دہلوی، اخلاق دہلوی اور دیگر کئی لکھنے والوں نے استعمال کی ہے لیکن اس کا پس منظر کسی نے بیان نہیں کیا ہے۔ اس جانب یا تو نصر اللہ خاں نے اپنے خاکے میں اشارہ کیا ہے یا پھر مسعود حسن شہاب دہلوی نے مذکورہ خاکے میں اس پر روشنی ڈالی ہے۔ شہاب صاحب کے مطابق یہ انوکھی ترکیب خود مولانا نیازی اپنے بارے استعمال کیا کرتے تھے۔ مسعود حسن شہاب دہلوی، مولانا عبدالسلام نیازی کے شاگرد تھے اور یہ شاگردی ایسی تھی جس کے لیے خود مولانا نے مسعود شہاب کے والد کو پیشکش کی تھی۔ مولانا نیازی کی شاگردی اختیار کرنے

کے لیے ایک خلقت تھی جو متمنی رہا کرتی تھی لیکن مولانا کسی کو گھاس نہ ڈالتے تھے۔ اخلاق احمد دہلوی کو تو انھوں نے مع ان کے والد، اپنے حجرے سے لوٹا دیا تھا۔ مسعود شہاب کی مولانا نیازی سے پہلی ملاقات ۱۹۳۷ میں ہوئی تھی۔ اس کا مفصل احوال زیرِ نظر کتاب میں مسعود شہاب مرحوم کے تفصیلی خاکے میں پڑھا جا سکتا ہے۔ مذکورہ خاکے میں جوش کی مولانا سے اس ملاقات کا احوال بھی شامل ہے جس میں مولانا نے ایک موقع پر جوش مرحوم کو یہ کہہ دیا تھا کہ: تمھارا دماغ تو شیطان کی کھڈی ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ مولانا نیازی نے مسعود حسن شہاب دہلوی کی شادی کا سہرا لکھا تھا۔ مولانا کی یہ منظوم تحریر خوش قسمتی سے شہاب مرحوم نے اپنے خاکے میں محفوظ کر دی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

جنبشِ عرضِ تمنا ہے سراسر سہرا   گلشنِ حسرتِ دارماں کا گلِ تر سہرا

دل کے گوشوں میں جگاتا ہے شبابی جادو   کس قیامت کا بنا ہے یہ فسوں گر سہرا

پھول سہرے کا ہے اک ایک شہابِ ثاقب   چترِ سیمابی سے کیونکر نہ ہو بڑھ کر سہرا

بہ قسم کہتا ہے دنیا میں نظیر اس کی نہیں   ہاتھ رنگے ہوئے نوشاہ کے سر پر سہرا

ذوقِ غالب کے تقاضے کا ظہورا ہے یہ   خوب ہی لکھا ہے آزادِ سخنور سہرا

بحیثیت شاگرد، مسعود حسن شہاب دہلوی نے مولانا نیازی کو نہایت قریب سے دیکھا اور ان کی عادات و اطوار اور ان کے لب و لہجے کا خوب مشاہدہ کیا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''عام گفتگو وہ ٹھیٹھ دلی والوں کی طرح کیا کرتے تھے اور اگر یہ کہنا ہو کہ یہ بات مجھے چلتے وقت یاد دلانا تو وہ کہتے کہ 'چلیجوں کو یہ بات یاد دلانا'۔ یا تم جیسے کی طرح 'تم سری کے'، پانچ سو کے بجائے 'پانسو' اور روپے پیسے کو 'ناواں' ہی کہتے تھے۔ بعض اصطلاحات اور الفاظ بھی ان کے لیے مخصوص ہو کر رہ گئے تھے۔ مثلاً 'جمتول' زبردست تھپڑ کے معنی میں، 'ناریل چٹخنا' غصہ آنے کے معنی میں۔ مولوی صاحب عربی کے تو خیر فاضل تھے، فارسی ادب پر بھی ان کی بڑی عمیق نظر تھی۔ اس کے علاوہ انگریزی بھی خاص [خاصی] لکھ پڑھ سکتے تھے اور جب کسی انگریزی خواں سے اردو میں باتیں کرتے کرتے ایک دم انگریزی کے فقرے ان کی زبان پر آجاتے تو ان کا مخاطب حیران ہو کر رہ جاتا تھا۔''

زیرِ نظر مقدمے کی ابتدا میں راقم الحروف نے حکیم حبیب اشعر کا ذکر کیا تھا۔ اسی بہانے دلی کے روڑے، ہر دلعزیز مصنف مقبول جہانگیر مرحوم کا تذکرہ بھی کرتا چلوں۔ اللہ اللہ... کیا انسان تھے۔ محنتی اور محنت بھی ایسی کہ ہڈیوں سے گودا نچوڑ لے۔ عمر کچھ ایسی زیادہ نہ تھی۔ لکھتے لکھتے ایک دن اچانک دنیا سے چلے گئے اور اپنے ان گنت پرستاروں کو سوگوار کر گئے۔ افسوس کہ ہم مردہ پرست قوم ہیں۔ گوہرِ نایاب کی قدر

کرنا تو جانتے ہی نہیں۔ لوگ مقبول جہانگیر کو بچوں کے ناولوں، شکاریات اور خوفناک کہانیوں کے حوالے ہی سے جانتے ہیں۔ مقبول جہانگیر کی ایک ایسی کتاب بھی ہے جو شخصی خاکوں پر مشتمل ہے۔ 'یارانِ نجد' کے عنوان سے مذکورہ کتاب ۱۹۷۶ میں شائع ہوئی تھی۔ دیوان سنگھ مفتوں کا عمدہ خاکہ پڑھنا ہو تو یاران نجد کا مطالعہ کیجیے۔ حکیم حبیب اشعر کے خاکے کی تو کیا ہی بات ہے۔ حکیم حبیب اشعر کے خاکے کے مطالعے سے علم ہوتا ہے کہ اشعر مرحوم کو بھی مسعود شہاب دہلوی کی طرح خود مولانا عبدالسلام نیازی نے اکتساب علم کی پیشکش کی تھی۔ یہ ۱۹۳۷ کی بات ہے جب حبیب اشعر، اپنے بھائی ہاشم جان کیف کے نقش قدم پر چلتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اپنی جوانی لٹانے کے درپے تھے لیکن بقول مقبول جہانگیر، اللہ میاں کو ان کی کوئی جمالی یا جلالی ادا پسند آ گئی کہ انھیں ایک ایسے شخص کے پاس بھیج دیا جو خود جلال و جمال اور فضل و کمال کی تصویر تھا۔ جی ہاں! یہ ذکر ہمارے مولانا عبدالسلام نیازی ہی کا تو ہے، جنھوں نے ایک گرم دوپہر کو حبیب اشعر کو روکا، ٹوکا اور ان پر ان کی حرکتوں اور دوستوں کی بے فیض محفلوں میں تضیع اوقات پر ان الفاظ میں برس پڑے تھے:

> ''برخوردار۔ سال ڈیڑھ سے میں دیکھ رہا ہوں دن دن بھر بلکہ رات گئے تک جامع مسجد کے ادنی اور بازاری ہوٹلوں میں بیٹھے اپنا وقت ضائع کرتے ہو۔ شہر کے جاہل اور کندہ ناتراش لوگ تمھیں گھیرے رہتے ہیں اور تم ان یتیم العقلوں کو اپنا کلام سنا سنا کر، ان کی لایعنی داد وصول کر کے پھولے نہیں سماتے۔ کبھی تم نے یہ سوچنے کی زحمت بھی گوارا کی ہے کہ تمھارا تعلق کس خاندان سے ہے اور اس خاندان کی روایات کیا رہی ہیں؟ آج تم اپنے بزرگوں کی دولت اور عظمت کے سہارے ان آوارہ مزاج خوشامدیوں کی آنکھ کا تارا بنے ہوئے ہو۔ جانتے ہو انھوں نے کسب کمال کے لیے کیسی کیسی کٹھنائیاں طے کی ہیں؟ انسانیت کی خدمت کے لیے کس کس طرح اپنی جان پیلی ہے؟ یہ انھی کے علم و ہنر، انھی کے اخلاق و کردار اور انھی کی محنت اور کوشش کا صدقہ ہے کہ تم اس بے علمی اور بے ہنری کے باوجود عیش و آرام اور عزت و آبرو کی زندگی بسر کر رہے ہو۔ تم اپنے بزرگوں کی درگاہِ عظمت کے مجاور ہو اور ان کے عقیدت مندوں کے متوسلین کے احترام و سپاس گزاری کی بنیادوں پر ہی اپنی شرافت و فراغت کا محل تعمیر کیے بیٹھے ہو۔ چاہیے تو یہ تھا کہ تم اپنے اسلاف کی میراث میں اضافہ کرتے، ان کے کام اور نام کو آگے بڑھاتے، لیکن یہ رتبہ بلند تو حضرت حق جلّ مجدہٗ کسی کسی کو عطا فرماتے ہیں۔ کم سے کم اتنا تو کرو کہ بزرگوں کی عزت کو بٹہ نہ لگے۔''

مولانا عبدالسلام نیازی نے حکیم حبیب اشعر کی ایسی طبیعت صاف کی، ان کے ضمیر کو ایسا

جھنجھوڑا کہ ان کے ہوش اڑ گئے، آنکھیں کھل گئیں اور وہ مولانا نیازی کے مرید ہو گئے اور مولانا کی شاگردی اختیار کر لی لیکن اسی شرط پر جو مولانا اپنے ہر شاگرد پر سختی سے لاگو کرتے تھے یعنی حصول علم کی تکمیل تک ہر قسم کی فضولیات سے کڑا پرہیز۔ جس نے سرِ تسلیم خم کیا وہ اس راہ سے سرخرو ہو کر گزر گیا، جس نے شرط کا پاس نہ رکھا، وہ راندۂ درگاہ کہلایا۔

حکیم حبیب اشعر کے متذکرہ خاکے سے مولانا نیازی کا دلچسپ احوال و بیان زیرِ نظر کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ مذکورہ تحریر سے یہ انکشاف بھی ہوتا ہے کہ مولانا نیازی نے علم طب، حبیب اشعر کے نانا سے پڑھی تھی۔ ملاحظہ ہوں مولانا نیازی کے یہ فقرے جو انھوں نے حبیب اشعر سے مخاطب ہو کر کہے تھے:

"شاید تمھیں نہیں معلوم کہ میں نے طب تمھارے نانا حکیم حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں مرحوم سے پڑھی ہے اور اس رشتے سے تم میرے مخدوم زادے ہو۔ اگر تم نے مجھ سے کچھ حاصل کر لیا تو بڑی خوشی کی بات ہوگی اور میں سمجھوں گا کہ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔"

مولانا عبدالسلام نیازی پر ڈاکٹر خلیق انجم کے تحریر کردہ خاکے میں بھی کئی دلچسپ باتیں ہیں۔ اوپر کسی جگہ لکھا گیا ہے کہ جوش ملیح آبادی کی 'یادوں کی برات' میں درج ہے:

"وہ تصوف و حسن پرستی کے متوالے، اور اپنے عہد شباب میں تمام اولیائے ہند کے مزارات کے چکر لگاتے، اور اپنی محبوبہ کو ساتھ لے کر تمام عرسوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔"

خلیق انجم کی تحریر سے اس پر مزید روشنی پڑتی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"جے پور کی دو گانے والیاں تھیں، ہبو اور گوہر۔ مولانا ان دونوں کے گانے کے مدّاح اور ان کے حسن کے شیدائی تھے۔ جے پور کی ایک اور گانے والی تھیں، اس کا نام بے نظیر تھا، مولانا کو ان سے عشق تھا۔ اکثر مزاروں پر اس محبوبہ کے ساتھ جاتے تھے، جوش نے 'یادوں کی برات' میں اسی کا ذکر کیا ہے۔" (صفحہ ۲۰۳)

مسعود شہاب دہلوی نے مولانا نیازی کی طبیعت میں پائی جانے والے انھی تضادات کی بابت یہ نتیجہ نکالا تھا کہ شاید ان کا تعلق صوفیا کے فرقہ ملامتیہ سے تھا جو اصلاحِ نفس کے لیے ظاہری طور پر خود کو ملامتی بنا لیتے ہیں۔

خلیق انجم لکھتے ہیں:

"ایک صاحب حج سے واپس آئے تو مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ کسی نے مولانا کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ ان صاحب کی دو غیر شادی شدہ لڑکیاں گھر بیٹھی ہیں، بہت کم آمدنی ہے پھر بھی قرض لے کر حج پر گئے ہیں۔ یہ سن کر مولانا بھڑک ہی تو گئے:

"آپ اتنے دن بعد حج سے واپس کیوں آئے ہیں؟"

مولانا نے ان صاحب سے دریافت کیا۔

وہ صاحب بولے: "حضرت، جب شمع جل رہی ہو تو پروانہ اندھیرے کی طرف کیسے جائے۔"
مولانا بپھر گئے، ضبط کھو بیٹھے، ڈپٹ کر کہا: "سالے! یوں توں کروں، اس کا مطلب ہے کہ ہم اندھیرے میں رہتے ہیں، تو قرض لے کر روشنی میں گیا تھا۔ نکل یہاں سے تیری۔۔۔۔۔۔"
وہ صاحب جوتیاں چھوڑ کر بھاگے۔"

بزرگ ادیب سید انیس شاہ جیلانی نے اپنے سفرنامے میں ایک ایسی شخصیت کا ذکر کیا ہے جو مولانا نیازی سے خاص ارادت رکھتی تھی۔ یہ بلّی ماراں کے احمد سعید صاحب تھے جنھوں نے انیس جیلانی کی فرمائش پر مولانا سے متعلق ایک مختصر تحریر لکھ بھیجی تھی جسے بعدازاں انیس جیلانی نے اپنے سفرنامے میں شامل کیا تھا۔ اس تحریر میں احمد سعید نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ وہ مولانا نیازی سے متعلق بیان میں مبالغہ اور استعارہ کے استعمال کو گناہ سمجھتے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں مذکورہ تحریر کو شامل کیا گیا ہے۔ ایک موقع پر احمد سعید نے مختصر الفاظ میں وہ واقعہ بیان کیا ہے جس میں مولانا نیازی نے انھیں [اور دیگر کئی لوگوں کو] بتایا تھا کہ وہ ہرِدوار میں چودہ برس رہے تھے اور پھر ایک روز ایک سادھو کے استفسار پر ہرِدوار چھوڑ کر چپ چاپ دلّی چلے آئے تھے۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے یہی واقعہ تفصیل سے اپنے خاکے میں زید ابوالحسن نامی صاحب کے حوالے سے لکھا ہے:

"مولانا عبدالسلام نیازی کو ایک مرتبہ ہندو مذہب کے مطالعے کا شوق ہوا۔ اس موضوع پر بہت سی کتابیں پڑھیں لیکن تسلی نہیں ہوئی۔ بالآخر ہندوؤں کا بھیس بدل ہری دُوار کی راہ لی، بارہ برس ہری دُوار، لکشمی جھولا اور رشی کیش میں رہے۔ ہندو سادھوؤں کی طرح سمادھی لگاتے تھے۔ ایک روز انھیں خیال آیا کہ مجھے اتنے برس ہو چکے ہیں ان لوگوں کے ساتھ رہتے رہتے، اب تک نہیں پہچان سکے کہ میں مسلمان ہوں، جب یہ لوگ مجھے نہیں پہچان سکے تو خدا کو کیا پہچانیں گے؟
اسی شام کو مولانا جنگل سے گزر رہے تھے۔ جھٹ پٹے کا وقت تھا۔ دیکھا کہ سادھو سامنے سے چلا آرہا ہے۔ اس جنگل میں سادھو کو دیکھ کر مولانا حیرت میں پڑ گئے اور ایک درخت کی آڑ میں چھپ گئے۔ جب وہ آگے نکل گیا تو مولانا اس کے پیچھے چلے، تھوڑی دور پر ایک جھونپڑی تھی۔ سادھو اس جھونپڑی میں چلا گیا۔ مولانا باہر چھپے کھڑے رہے۔ انھیں پھر یہ خیال آیا کہ جب یہ لوگ مجھے نہیں پہچانتے تو خدا کو کیا پہچانیں گے۔ اچانک جھونپڑی میں سے سادھو کی آواز آئی، عبدالسلام! چھپو

نہیں، آجاؤ۔ مولانا اپنا نام سن کر خائف ہوگئے اور بے اختیار ان کے قدم اس جانب اٹھ گئے۔ جھونپڑی میں داخل ہوئے تو سادھو نے کہا کہ تم بے وجہ پریشان ہو رہے ہو، ہم نے دس گیارہ سال پہلے جب تمھیں دیکھا تھا، اسی وقت پہچان گئے تھے۔ ہمارا مشورہ ہے کہ تم دہلی واپس چلے جاؤ، وہاں خلق خدا کی زیادہ خدمت کر سکو گے۔ مولانا چپ چاپ دہلی واپس لوٹ گئے!''

یہی واقعہ اخلاق دہلوی نے حکیم محمد علی کے تعلق سے ذرا مختلف انداز میں بیان کیا ہے، کہتے ہیں:

''ایک دن مولوی صاحب کے جی میں نہ جانے کیا آئی کہ ع

نہ سدھ بدھ کی لی اور نہ منگل کی لی۔ چار ابرو کا صفایا کرا۔ جوگیا چادر لپیٹ۔ سیدھے دلّی سے بنارس جا پہنچے اور وہاں پہنچ کر ایک مندر کی سیڑھیوں پر سادھو سنتوں کی طرح آسن جما کر بیٹھ گئے اور تین شبانہ روز ایک ہی آسن سے بیٹھے رہے۔ آنکھیں بند کر کے بہتر گھنٹے بعد آنکھیں کھول کر جب اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو کیا دیکھتے ہیں کہ ان سے اوپر کی سیڑھی پر ایک سادھو پیر آسمان کی طرف کیے چت پڑا ہے اور ایک راجہ اُس کے تلووں میں چندن مل مل کر اپنے ماتھے پر تلک لگا رہا ہے، یہ دیکھنا تھا کہ مولوی صاحب کی جلالی رگ پھڑک اٹھی، سر کا ناریل چٹخا، آسمان کی طرف رُخ کیا اور فرمایا واہ جناب واہ یہی دکھانے کے لیے ہمیں یہاں بلایا تھا۔

ع سخن فہمیٔ عالم بالا معلوم شد

حکیم صاحب کہتے ہیں: راجہ جب وہاں سے سَرکا تو اس سادھو نے اشارے سے مولوی صاحب کو اپنے پاس بلایا اور کہا: ''مولوی عبدالسلام تمھیں اپنے علم و دانش پر بہت ناز ہو گیا تھا اور تم اپنے علم و فضل کے نشے میں ضرورت سے زیادہ چور رہنے لگے تھے۔ کیا سمجھے؟ تجرِ علمی کے باعث تمھیں یہ تک خیال نہیں رہا تھا کہ علم تو صرف اس لیے حاصل کیا جاتا ہے کہ اپنی جہالت سے آگاہی ہو سکے۔ علم کے نشے میں تم ذرا بہک چلے تھے۔ مولوی صاحب جاؤ واپس دلّی جاؤ اور اپنے ترکمان دروازے والے محلّے کے اس چھوٹے سے کوٹھے پر جا کر براجمان ہو جس پر تم بڑے سے بڑے آدمی کو قدم نہیں رکھنے دیتے، سیتا رام، سیتا رام۔''!

مولانا عبدالسلام نیازی کہاں کے رہنے والے تھے، اس بارے میں بھی مختلف لکھنے والوں نے متضاد باتیں لکھی ہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم لکھتے ہیں:

''کوئی نہیں جانتا مولانا کہاں کے رہنے والے تھے۔ اس سلسلے میں بھی ان کے

قریبی دوستوں کے مختلف بیانات ہیں۔ایک صاحب نے مجھے بتایا کہ مرحوم دہلی کے رہنے والے تھے۔ایک اور صاحب نے اطلاع دی کہ وہ بجنور کے تھے۔لیکن ان کے قریبی لوگوں میں محمد مرزا صاحب اور حکیم عبدالسلام کا بیان ہے کہ مولانا میرٹھ کے رہنے والے تھے۔میرے کرم فرما زید ابوالحسن کا بھی یہی خیال ہے کہ مولانا کا وطن میرٹھ تھا اور وہ جوانی میں دلّی آگئے تھے۔''

جب کہ مسعود حسن شہاب دہلوی کے مطابق:

''مولانا عبدالسلام اپنے نسب کا راز اپنے ساتھ ہی قبر میں لے گئے تھے۔والد اور دوسرے اعزا کا حال کسی کو نہیں معلوم۔ان کی ابتدائی تعلیم اور کسب کمال کی تفصیلات بھی پردۂ اخفاء میں ہیں۔صرف اتنا معلوم ہے کہ علمائے فرنگی محل کے سلسلۂ درس سے ان کا تعلق تھا۔اور مولانا فضل امام خیرآبادی کے خانوادے کے کوئی بزرگ بھی ان کے شفیق استاد تھے۔''

اس سلسلے میں انیس شاہ جیلانی والے احمد سعید کی مختصر تحریر میں موجود کوائف نامہ بھی اہمیت رکھتا ہے:

نام: مولوی عبدالسلام نیازی

جائے پیدائش: میرٹھ

جائے تعلیم: بریلی سہارنپور

سلسلۂ بیعت: حضرت نظام الدین نیازی پانی پتی

برصغیر کے معروف ادیب و کالم نگار نصر اللہ خاں مرحوم کی بھی مولانا نیازی سے ملاقاتیں رہی تھیں۔ان کی تحریر سے بھی مولانا نیازی کے سلسلۂ بیعت کی تصدیق ہوتی ہے۔نصراللہ خاں لکھتے ہیں:

''عبدالسلام نیازی، شاہ نظام الدین حسن نیازی بریلوی کے جو شاہ نیاز احمد بریلوی کے فرزند اور خلیفہ تھے، مرید تھے۔''

اسی سلسلے میں رزی جے پوری نے بھی اپنے مضمون میں نہایت تفصیل سے لکھا ہے۔

اس ضمن میں ایک اہم ترین بیان مولانا مودودی کا ہے جو اپنے انٹرویو (۱۹۷۵) میں کہتے ہیں:

''مرحوم [مولانا نیازی] سلسلۂ چشتیہ سے تعلق رکھتے تھے۔نیازی کی نسبت بھی ایک بزرگ نیاز احمد بریلوی سے عقیدت کی بنا پر تھی۔وہ بزرگ چشتی تھے۔ہمارا خاندان ہندوستان میں سلسلۂ چشتیہ کا پیش رَو ہے۔اس بنا پر وہ سن رسیدگی اور استاد ہونے کے باوجود میری بہت عزت کرتے اور اس بنا پر مجھے سید بادشاہ کہہ کر پکارتے۔''

مسعود حسن شہاب دہلوی نے بھی مولانا عبدالسلام نیازی کے نام کے لاحقے کا سبب بیان کیا ہے۔ شہاب مرحوم کے مطابق، ''ان کا سلسلہ ارادت شاہ نیاز احمد بریلوی سے تھا، جن کی رعایت سے وہ اپنے نام کے ساتھ نیازی لکھا کرتے تھے۔''

مولانا نیازی کی اپنی اہلیہ کو دی جانے والی طلاق کے بیان میں بھی متضاد آراء دیکھی گئیں۔ مسعود شہاب دہلوی کے مطابق ''ایک بار بیوی چوبارہ میں سے باہر کسی کو دیکھ رہی تھیں کہ آپ نے یہ کہہ کر فوراً طلاق دے دی کہ اب وہ بڑے شوق سے اسی کی ہو جائے۔'' جب کہ انیس شاہ جیلانی سفر نامہ ہند میں احمد سعید کے تعلق سے لکھتے ہیں کہ مولانا نیازی، درگاہ صابری دریا گنج دہلی کے سالانہ عرس میں شریک تھے۔ بخشا قوال نے فارسی کلام پیش کیا اور ایک شعر پر مولانا پر کیفیت طاری ہوگئی اور اسی کیفیت میں انھوں نے بخشا قوال کو اپنے پاس موجود تمام رقم دے ڈالی، جب رقم ختم ہوگئی تو سر کی ٹوپی، واسکٹ اور پھر کرتا بھی اتار کر دے دیا۔ بنیان اور پاجامے میں گھر پہنچے تو بیوی نے استفسار کیا۔ مولانا نے جواب دیا کہ کپڑے قوال کو دے دیے ہیں۔ اس پر بیوی نے جل کر کہا کہ: پاجامہ بھی دے دیتے۔ بقول احمد سعید، مولانا اپنی بیوی کا یہ بیباکانہ فقرہ سن کر خاموش ہو گئے اور کچھ عرصے بعد اسے طلاق دے دی۔

ذکر بخشا قوال کا آیا ہے تو صاحب طرز صحافی و ادیب نصر اللہ خاں مرحوم کے ایک خاکے سے موصوف کے بارے میں کچھ تفصیل نقل کرتا چلوں۔ خاں صاحب لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان میں بخشا قوال کا طوطی بول رہا تھا۔ بخشا کی طرز میں نور تھا، اس کی مرکیاں گھائل کر دیتی تھیں۔ جو شعر وہ گاتا اس کی تفسیر بن جاتا۔ وہ شعر اور موسیقی کے امتزاج سے تصویر کھینچتا۔ بخشا کا رنگ سانولا تھا لیکن اس کے نقش بڑے تیکھے تھے۔ جب بخشا بیدم وارثی کی یہ غزل:
>
> 'وہ چلے جھٹک کے دامن مرے دست ناتواں سے'
>
> گاتا، تو شاید ہی کوئی ایسا پتھر دل ہوگا جس پر بے خودی نہ چھا جاتی ہو۔ اشعار میں جو چنگاری ہوتی اس کی آواز اور اس کی ادائیگی اسے شعلہ بنا دیتی۔ مخصوص محفلوں میں بخشا ساری باندھ کر ناچتا اور بھگت کبیر اور میرا کے گیت گاتا اور ایک قیامت برپا کر دیتا۔ یہ نہیں تھا کہ بخشا گاتا اور دوسرے روتے۔ میں نے تو بخشا کو اپنے گانے پہ روتے دیکھا ہے۔ وہ صاحب حال تھا۔ وہ دق کا مریض تھا۔ میرٹھ سے یہ خبر آئی کہ بخشا مر گیا ہے۔ بخشا کے مرنے پر ریاست [جاورہ] میں تعطیل ہوئی۔ اعلیٰ حضرت کو بے پناہ صدمہ ہوا۔ اور خواجہ صاحب کی محفل کا یہ چہکتا ہوا بلبل ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔'' (کیا قافلہ جاتا ہے۔ نصر اللہ خاں)

ڈاکٹر انور سدید کی تحریر بعنوان 'عبدالسلام نیازی دہلوی' کا ذکر اہم ہے جو جریدہ 'اسپوتنک' مئی ؍ فروری ۲۰۱۱ میں شائع ہوئی تھی۔ اہم بات یہ ہے کہ مذکورہ تحریر میں ڈاکٹر سدید نے مولانا عبدالسلام نیازی کے سن پیدائش کا ذکر کیا ہے جو ان کو دستیاب معلومات کے مطابق ۱۸۶۴ء ہے۔ مذکورہ تحریر میں ڈاکٹر صاحب نے حیدرآباد سندھ سے تعلق رکھنے والے محقق و ادیب ڈاکٹر الیاس عشقی مرحوم کے اس مقالے کا ذکر کیا جو مولانا نیازی کے علمی تبحر، شاعری اور موسیقی کے تذکروں سے پُر ہے۔ افسوس کہ یہ مقالہ شائع نہ ہوسکا۔ راقم الحروف نے اس سلسلے میں مسرور احمد زئی صاحب سے رابطہ کیا تو یہ بات سامنے آئی کہ چونکہ مذکورہ مقالے کو سپردِ قلم کیے جانے کے دوران ڈاکٹر عشقی کے ہاتھوں میں رعشہ آچکا تھا لہٰذا مسرور صاحب نے مقالے کو 'صاف' کرنے کے لیے کسی صاحب کے حوالے کیا لیکن اشاعت کی نوبت پھر بھی نہ آسکی۔ بعد ازاں ڈاکٹر عشقی اللہ کو پیارے ہوگئے اور بعد از وفات، ان کا کتب خانہ ایک ٹرک پر لاد کر پنجاب کے شہر میں واقع ایک لائبریری میں پہنچا دیا گیا۔

اوپر ایک جگہ دلّی سے شائع ہوئی کتاب 'الواح الصنادید' کا ذکر ہوا تھا۔ مذکورہ کتاب کے مولف عطاء الرحمٰن قاسمی نے صفحہ ۳۹۳ (لاہور ایڈیشن) پر مولانا نیازی کا مختصر احوال لکھا ہے۔ مولانا کی رحلت اور قبر کا احوال پڑھ کر بقیہ کتاب کے متن کی صحت کے بارے میں اندازہ ہوتا ہے۔ قاسمی صاحب لکھتے ہیں:

> ''مولانا عبدالسلام نیازی ۳ جون ۱۹۶۶ میں جاں بحق ہوگئے اور بستی نظام الدین میں دفن ہوئے۔ آپ کی قبر بستی حضرت نظام الدین میں ہے لیکن صحیح مقام کی نشان دہی مشکل ہے''۔

اوّل تو رحلت یا انتقال کو جاں بحق لکھنا کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے، دوسرے یہ کہ دلّی میں کسی بھی ذریعے سے مولانا نیازی جیسی نامور شخصیت کی قبر کو تلاش کر لینے میں بظاہر کوئی دِقت نہیں ہونی چاہیے تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ الواحِ قبور کے مطالعے اور ان کی انتہائی جدوجہد کے بعد کھوج کرنے کے سلسلے میں اپنا وقت صرف کرنے والا پروفیسر محمد اسلم مرحوم جیسا کھرا محقق کم کم ہی دیکھا گیا ہے۔ دوسری مثال راولپنڈی کے ڈاکٹر منیر احمد سلیچ کی دی جاسکتی ہے۔ باقی رہے نام اللہ کا۔

مولانا کے کتبے پر ان کے انتقال کی تاریخ ۳۰؍ جون ۱۹۶۶ کندہ ہے۔

راقم الحروف کی درخواست پر مولانا کی قبر کی تلاش کا 'ناممکن' کام ہمارے دوست اور دلّی میں لیکچرار کی حیثیت سے فرائض انجام دینے والے فرحان بیگ صاحب نے چند گھنٹوں کی محنت کے بعد کر دکھایا۔ مکرمی حسن نواز شاہ نے ماہنامہ 'الاشرف' کراچی کے دسمبر ۲۰۰۴ میں شائع ہونے والے پرچے کا ایک مضمون ارسال کیا۔ مضمون نگار مخدوم زادہ سید محمد اشرف جیلانی تھے جنھوں نے دہلی کے سفر کی روداد لکھی ہے جس کی مدد سے راقم نے فرحان بیگ کو مولانا نیازی کی قبر کے محلِ وقوع کے بارے میں آگاہ کیا۔ اشرف

جیلانی، سید شاہ عاشر اشرف چشتی کی قبر کو تلاش کرتے وہاں پہنچے تھے۔ فرحان بیگ کو راقم نے محض یہ بتاتا تھا کہ مولانا کی قبر خواجہ حسن نظامی ثانی (ان دنوں شدید علیل ہیں) کی قیام گاہ کے قریب واقع ہے۔ فرحان بیگ نے ۱۱/ اکتوبر ۲۰۱۳ کی ایک چمکیلی صبح کیمرہ کاندھے پر ڈالے بستی نظام الدین کا رخ کیا اور اپنے ایک دیرینہ دوست ارشد کی مدد سے ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ فرحان بیگ کے مطابق:

> "مرکزی درگاہ سے کچھ فاصلے پر ایک گلی ہے جو عرف عام میں 'لنگر والی گلی' کہلاتی ہے۔ اس گلی میں ایک اور پتلی سی ذیلی گلی ہے جس میں ایک چھوٹا سا احاطہ ہے۔ اسی احاطے میں مولانا عبدالسلام نیازی کی قبر واقع ہے۔ احاطے میں داخلے سے قبل ایک دروازہ ہے جس کے اوپر ایک تختی نصب ہے جس پر لکھی تحریر وقت گزرنے کے ساتھ سیاہ پڑ چکی ہے اور پڑھنے میں نہیں آتی۔ احاطے میں داخلہ آسان نہیں تھا لیکن فرحان کے دوست ارشد کی احاطے کے خادم سید عدنان نظامی فریدی سے جان پہچان کام آئی اور یوں ہم اندر جا پہنچے۔ احاطے میں کل چھ قبریں ہیں جبکہ دو قبروں کی جگہ باقی ہے۔ پہلی قبر مولانا سید شاہ کریم رضا چشتی نظامی کی ہے۔ جبکہ دوسری قبر سید شاہ عاشر اشرف چشتی کی ہے جو درگاہ کے خادم تھے۔"

فرحان بیگ نے مولانا نیازی کی قبر کی کئی تصاویر عمدہ حالت میں ارسال کیں جن میں چند اس کتاب میں ان کے شکریے کے ساتھ شامل کی جارہی ہیں۔ ہمارے کرم فرما جناب حسن نواز شاہ نے بھی اپنے ایک واقف کار کے توسط سے مولانا کی قبر کی چند تصاویر ارسال کیں۔ ان کا شکریہ بھی لازم ہے۔ مولانا کی قبر کے کتبے پر یہ عبارت کندہ ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مرقد مطہر

> قدوۃ العلماء وافضل الفضلاء عالم علوم وفنون واقف حقائق شیون علام الدھر مقبول درگاہ خیر الانام قادر الکلام مرجع ہر خاص و عام حضرت جناب مولانا عبدالسلام چشتی نظامی فخری نیازی، اسکنہ اللہ تعالیٰ فی ریاض الجنان بتاریخ دہم ربیع الاول ۱۳۸۶ھ روز پنجشنبہ بوقت صبح صادق مطابق سیم (۳۰) جون ۱۹۶۶ از عالم فانی بعالم جاودانی رحلت نمود۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

مادۂ تاریخ فارسی شمسی

قطب الاقطاب یعنی عبدالسلام	ہستیش روشن از قمر گم شد
ہم نیازی و نور چشم نظام	بحرِ عرفان و حق نگر گم شد

گفت سالِ وصال ابو طاہر — قیصرِ دلّی از نظر گم شد

فارسی ۱۹۶۶ء

غم شناس و غمگسارِ خاص و عام — صوفیِ ذی رتبہ و عالی مقام

شمعِ راہِ معرفت ہادیِ دیں — مظہرِ شانِ قلندر نیک نام

فردِ افرادِ گلستانِ نیاز — جاں نثارِ پنجتن، جانِ نظام

وارثِ الفقر فقری جعفری — کاشفِ اسرارِ حق عبدالسلام

(خادم) سید محمد عاشر اشرف اشرفی کریمی، دہلوی

ڈاکٹر انور سدید نے محمد شفیع عارف دہلوی کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''مولانا عبدالسلام نیازی کے جنازے میں آل انڈیا ریڈیو کے مطابق تیرہ لاکھ افراد نے شرکت کی تھی۔ وہ بیسویں صدی کے سب سے بڑے عالم دین اور صوفی تھے جن کے ہاتھوں ۳۶ ہزار افراد نے اسلام قبول کیا''۔

یہ حیرت کی بات ہے کہ اتنی بڑی ہستی کے دنیا سے اٹھ جانے اور جنازے میں اس کثیر تعداد میں لوگوں کی شرکت کے باوجود مولانا عبدالسلام نیازی کا ذکر معارف اعظم گڑھ کی وفیات میں نہیں کیا گیا تھا۔ ۲۰۱۳ میں کراچی سے ڈاکٹر سہیل شفیق نے وفیاتِ معارف کے ۹۶ سالہ ریکارڈ کو مرتب کر کے ایک ضخیم کتاب کی شکل میں شائع کیا تھا۔ باوجود تلاش بسیار، راقم کو مولانا کا تذکرہ اس میں نہیں مل سکا۔ چھیانوے سالہ ریکارڈ کے بعد حال ہی میں معارف کا سو سالہ ریکارڈ بھی دارالمصنفین کی جانب سے مرتب کیا گیا ہے اور اطلاع یہی ہے کہ اس میں بھی مولانا نیازی کا تذکرہ موجود نہیں ہے۔ متعلقہ اشخاص سے رابطے کے بعد یہی بات سامنے آئی ہے کہ معارف کے جولائی یا اگست ۱۹۶۶ کے شماروں میں مولانا نیازی کی رحلت کی خبر شائع کی ہی نہیں گئی تھی۔

پیشِ نظر مضمون مکمل ہو چکا تھا کہ اسی اثناء میں کراچی سے شائع ہونے والے ایک اخبار سے منسلک عزیز دوست محمد احمد انصاری، راقم کا انٹرویو کرنے آپہنچے۔ باتیں چل نکلیں اور وقت گزرنے کا احساس ہی نہ رہا۔ ایک موقع پر مولانا نیازی کا تذکرہ نکلا تو انصاری صاحب نے اس بات کا انکشاف کیا کہ سکھر کے معروف سیاست دان اسلام الدین شیخ نواتیلی کے خانوادے سے ہیں۔ اسی خاندان کے ایک اور فرد جناب ناصر بدر سے انصاری صاحب نے اسی دوران ہمارے سامنے فون پر گفتگو کی۔ معلوم ہوا کہ سندھ کے شہر سکھر میں ان کی دکان ''عطر محل'' کے نام سے مشہور ہے اور حال ہی میں اس کی ایک شاخ لاہور میں بھی کھل چکی ہے۔ یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ مولانا عبدالسلام نیازی نے عطر کا جو نسخہ نواتیلی کے خاندان کو عطا کیا تھا، اس کی برکت آج بھی جاری و ساری ہے۔ یاد رہے کہ نواتیلی کی وہ صاحبزادی جنھیں مولانا نیازی نے اپنی منہ بولی بیٹی بنایا تھا، تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلی آئی تھیں۔ بقول ڈاکٹر انور سدید:

''۳۹ برس بعد ان کے تذکرے کی تجدید ہو رہی ہے تو یہ اس کا ثبوت ہے کہ حقیقی درویش اور

مجذوب زندہ رہتے ہیں اور انھیں زمانہ یاد کرتا رہتا ہے۔''

راقم الحروف آخر میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے فرزند جناب حیدر فاروق مودودی اور ان کے رفیق جناب جہانزیب سعید کا شکر گزار ہے۔ حیدر صاحب نے زیر نظر کتاب کی اشاعت کی خبر سن کر از حد مسرت کا اظہار کیا اور دعاؤں سے نوازا۔ اس کتاب کا عنوان بھی حیدر صاحب ہی کا تجویز کردہ ہے۔ اس کے علاوہ کتاب میں شامل مولوی عبدالسلام نیازی کے لڑکپن و سن رسیدگی کی تصاویر بھی جناب حیدر فاروق ہی کی فراہم کردہ ہیں۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل کا خصوصی شکریہ کہ انھوں نے پروفیسر سفیر اختر کی ایک اہم تحریر عنایت کی جسے کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔

نوٹ: زیر نظر مضمون راقم الحروف کی مرتب کردہ کتاب ''مولانا عبدالسلام نیازی، آفتاب علم و عرفان'' کا دیباچہ ہے۔ مذکورہ کتاب ماہ اپریل ۲۰۱۴ کے اواخر میں بہاول پور کے موقر جریدے سہ ماہی 'الزبیر' کے مدیر ڈاکٹر شاہد رضوی (پسر سید مسعود شہاب دہلوی مرحوم) کے مکتبہ اردو اکیڈمی سے شائع ہوئی ہے۔ زیر نظر تحریر کے آخر میں درج کتابیات کی فہرست میں تمام نام ان کتابوں کے ہیں جن سے مولانا نیازی پر لکھے گئے مضامین، خاکے اور تذکروں کو راقم نے کتاب میں شامل کیا ہے۔ یہ کتاب کھام گاؤں، مہاراشٹر میں قیام پذیر راقم کے عزیز دوست محمد انیس الدین صاحب سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ انیس صاحب کا برقی پتہ ہے: anis_riz@yahoo.com / جبکہ رابطہ نمبر یہ ہے: 9422884848

حواشی:

[a]۔ سید انیس شاہ جیلانی کے والد مرحوم سید مبارک شاہ جیلانی نے پنجاب کے ایک دور افتادہ قصبے محمد آباد میں ۱۹۲۶ء میں 'مبارک اردو لائبریری' قائم کی تھی جو آج بھی وہاں موجود ہے۔ انیس شاہ جیلانی اس کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔

[b] یادگار لمحات۔ ادارہ معارف اسلامی لاہور۔ ۳ اپریل، ۱۹۷۵

کتابیات:

[۱] آغا طاہر نبیرۂ آزاد، 'یادوں کے سائے'۔ شخصی خاکے۔ سید مقصود زاہدی۔ کاروانِ ادب، ملتان۔ اشاعت: ۱۹۷۶

[۲] مولوی عبدالسلام نیازی۔ اجڑا یار۔ شخصی خاکے۔ شاہد احمد دہلوی۔ مکتبہ دانیال، کراچی۔ نومبر ۱۹۶۷

[۳] مولانا عبدالسلام نیازی دہلوی از مسعود حسن شہاب دہلوی۔ الزبیر، بہاولپور۔ ۱۹۷۲ (مذکورہ خاکہ ۱۹۶۸ میں لکھا گیا تھا)

[۴] سفر نامہ مقبوضہ ہندوستان۔ سید انیس شاہ جیلانی۔ کتاب پر بطور ناشر فکشن ہاؤس لاہور کا نام درج ہے جبکہ اسے مصنف نے خود شائع کیا تھا۔ اشاعت: ۱۹۹۳

[۵] مولوی عبدالسلام۔ 'کیا قافلہ جاتا ہے'۔ شخصی خاکے۔ نصر اللہ خاں۔ مکتبہ تہذیب و فن، کراچی۔ اشاعت: ۱۹۸۴

[۶] 'مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا' شخصی خاکے۔ ڈاکٹر خلیق انجم۔ انجمن ترقی اردو، ہند۔ اشاعت: ۲۰۰۸
[۷] 'یادوں کا سفر' خودنوشت۔ اخلاق احمد دہلوی۔ مکتبہ عالیہ، لاہور۔ اشاعت: ۱۹۹۹
[۸] 'یادوں کی برات' خودنوشت۔ جوش ملیح آبادی۔ مکتبہ شعروادب، لاہور۔ اشاعت: ۱۹۷۵
[۹] مولانا عبدالسلام نیازی۔ بزم خوش نفساں۔ شاہد احمد دہلوی۔ شخصی خاکے۔ اشاعت: یہ خاکہ ۱۹۶۷ میں شائع ہوا تھا۔
[۱۰] وادیِ جمنا سے وادی ہاکڑہ تک۔ خودنوشت۔ مسعود حسن شہاب دہلوی۔ مکتبہ الہام۔ بہاولپور۔ ۱۹۸۷
[۱۱] 'یارانِ نجد' شخصی خاکے۔ مقبول جہانگیر۔ نسیم بک ڈپو، لاہور۔ ۱۹۸۶
[۱۲]۔ دِلّی کے ایک پڑھے لکھے شخص از: رزی جے پوری۔ الزبیر، بہاولپور۔ ۱۹۷۲
[۱۳]۔ 'دِلّی کی چند یادگار زمانہ ہستیاں' عشرت فانی۔ خودنوشت۔ عشرت رحمانی۔ لاہور، ۱۹۸۵
[۱۴]۔ 'گلہائے خنداں' ۔ خاکے و تذکرے۔ محمد ذکی الدہلوی۔ ایوان علم وادب، کراچی۔ اشاعت: ۱۹۹۳
[۱۵]۔ 'عزیز میاں' ۔ سوانح عمری۔ طارق مسعود۔ ٹیکنو انٹرنیشنل، راولپنڈی۔ ۱۹۹۵

(۲)

اشعار اور مصرعے جو گئے بدل، بنے ضرب المثل

● کرشن بھاؤک

فرہنگِ آصفیہ (جلد دوم) میں 'ضرب المثل' لفظ کے معنی اس طرح دیے گئے ہیں : (ع) اسم مؤنث۔ کہاوت، مثل بیان کرنا۔ وہ جو مثال کے طور پر بیان کیا جائے۔ [1]

.1 مولفہ خاں صاحب مولوی سیدؔ احمد دہلوی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، دوسرا ایڈیشن جنوری۔ مارچ سنہ 1987، ص 1322۔

سنسکرت، ہندی اور اردو زبانوں کے قدیم شعرا کی سب سے بڑی خوبی و خصوصیت یہ رہی تھی کہ نہ تو ان میں آجکل کے شعرا کی مانند اپنی شاعری کی بدولت نام اور انعام و اکرام پانے کی بے پناہ خواہش ہوا کرتی تھی اور نہ ہی وہ کہیں بھی اپنے نسب و شجرہ کا مفصل تعارف یا بیان ہی آیندہ نسلوں کے ادراک و واقفیت کے لیے درج کیا یا کروایا کرتے تھے۔ وہ تو ہم عصری شعرا کی مانند جلد مشہور و معروف ہونے کی تمنا بھی نہیں کیا کرتے تھے۔ اس ایک امر سے انکی فطری انکساری و بے نیازی دونوں ہی ادب میں پے در پے منعکس و عیاں ہوا کرتی ہے۔ ہندی کے کوی اور سنت تلسی داس جی نے 'شری رام چرت مانس' جیسا شہرۂ آفاق صحیفہ لکھنے کے باوصف اس مذہبی کتاب میں بڑی ہی حلیمی سے کہا ہے کہ: "کبت وِویک ایک نہیں مورے ستیہ کہوں لکھی کاگد کورے۔" یعنی مجھے شاعری کا ادراک ذرا بھی نہیں ہے اور میں تو فقط کاغذ ہی خالی بھرتا رہتا ہوں۔" [2]

.2 تلسی داس، شری رام چرت مانس، 6-9-1

شکیل بدایونی نے آج کی نوجوان نسل کے شعرا وغیرہ کی نام و اکرام پسندی پر طنز کرتے ہوئے

یہ شعر کہا تھا: ''پہنچے ہیں اپنی منزل پر، ان کو تو نہیں کچھ ناز سفر/ چلنے کا جنہیں مقدور نہیں، رفتار کی باتیں کرتے ہیں۔''3

.3 مجموعہ 'شبستان'، پبلشر: نیا ادارہ لاہور، اول: 593

دورِ حاضر میں قدیم شعرا کی بابت کسی ڈگری یا آزاد تنقیدی و تحقیقی کام کرنے والے محقق طلبا و تحقیق کرانے والے مدرسین کو بسا اوقات قدیم شعرا کے متعلق مناسب نسبی شجرہ پیش کرنے میں متعدد صعوبتوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا رہا ہے۔ اسکے علاوہ کبھی ایک ہی شعر دو شعرا کے ناموں سے منسوب مل جاتا ہے اور کبھی اس میں عوام نے اپنے پسندیدہ الفاظ کی ایسی آمیزش کر دی ہوتی ہے کہ اصل متن کو بخوبی جان اور پہچان پانا تقریباً ناممکن ہی ہو جایا کرتا ہے۔ قدیم شاعروں کی فقیرانہ درویشی فطرت کے موجب بھی تحقیق و تجزیہ کرنے میں الجھن در پیش آنا لازمی عمل قرار دیا جا سکتا ہے۔ تحقیق کرتے وقت اردو زبان کے متعدد اشعار اور ان کے مصرعے نہ جانے کب سے عوام الناس کے روزمرہ کا حصہ بن چکے ہیں اور کئی بار تو حتیٰ الا مکان یہ بھی محسوس ہوتا رہتا ہے کہ روزمرہ کی زبان میں پوری طرح سے مروجہ مصرعے ہی شاعروں نے اپنے کسی شعر میں ایک یا دونوں مصرعوں میں ہی ڈھال کر رکھ دیے ہیں۔ اس کے عین برعکس کسی شاعر کا کوئی شعر اس قدر زبان زد ہو جایا کرتا ہے، کہ وہی ضرب المثل کی صورت اختیار کر کے اسی میں ڈھل جایا کرتا ہے اور اشعار اور انکے مصرعوں کے ساتھ عوام میں مروجہ مثلوں کی یہ آنکھ مچونی نہ جانے کب سے چلی آ رہی ہے۔ یہ موضوع اتنا دلچسپ ہے کہ چند منتخب اشعار اور انکے موضوع فکر و تحقیق پر غور کرنے کے مقصد سے ہی اس مختصر سے مقالے میں تجزیہ کرنے کی مطلق سعی کی جا رہی ہے۔ آگے مقبولِ عام اور غیر مقبول چند شعرا کے ناموں کے عنوانات کے تحت چند ضرب الامثال پر غور کیا جا رہا ہے۔ امید ہے اس سے اردو کے قارئین و مدرسین کو تحقیقی کاموں میں کچھ استفادہ ہو سکے گا:

.1 میر تقی میر : (سنہ 1722-1810) اردو ادب کے چند ناقدوں نے تا عمر اپنی حیات مفلسی میں ہی گزارنے والے اس شاعر کو مرزا غالب کے مساوی مرتبہ کا شاعر ٹھہرایا ہے۔

عوام میں ایک مثل چلی آ رہی ہے کہ ''جوگی بھلا کس کے میت ہوا کرتے ہیں؟''

.1 اب میر کے اس شعر کے مفہوم سے موازنہ کیجیے: ''عجب نہیں ہے نہ جانے جو میر چاہ کی ریت/ رسنا نہیں ہے، مگر یہ ہے کہ جوگی کس کے میت۔''

.2 اجداد نہ جانے کب سے جو جوانوں کو یہ نصیحت دیتے آ رہے ہیں کہ ''جان ہے تو جہان ہے۔'' یہ مصرع بھی میر صاحب کے اس شعر کی ہی چغلی کھاتا محسوس ہوتا ہے: ''میر عمداً کبھی کوئی مرتا ہے/ **جان ہے تو جہان ہے پیارے**۔'' یہاں 'عمداً' لفظ کا مطلب ہے کہ دانستا، یعنی جان بوجھ کر۔ دوسرے مصرعے میں 'پیارے' لفظ کو بڑے ہی پیار سے درکنار کر کے، یا کہیں ٹھکانے لگا کر عوام نے مصرعے کے ایک حصے بھر کو ضرب المثل

بنا کر مروّج کر دیا ہے۔ یہی فطرت اگلے دو اشعار کے بارے میں بھی صادق آتی ہے:

.1 ''ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا/ آگے آگے دیکھئے ، ہوتا ہے کیا،'' بابو رام کشور نے اپنی کتاب 'مہا کوی میر تقی میر' میں اوّل مصرعے کا ایک دیگر متن یہ پیش کیا ہے: ''راہ دور عشق سے روتا ہے کیا۔'' لیکن اس میں اوّل دیا گیا متن ہی معتبر و مستند جان پڑتا ہے۔

.3 ایک اور شعر ہے۔ ''مریضِ عشق پر رحمت خدا کی / مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔'' 4 بعض اوقات یہ پورا شعر ہی ضرب المثل کی صورت میں استعمال کیا جاتا رہا ہے۔

.4 'مہا کوی میر تقی میر : ودیا کنتھو اے وم کا ویہ کلا، شری نارائن پرکاشن، ستیہ سدن، غازی آباد، اول ایڈیشن سنہ 1980

اسی طرح ایک شعر عام بول چال کی بھاشا میں یوں سنا جاتا ہے: ''کیا کہیں کچھ کہا نہیں جاتا/ اب تو چپ بھی رہا نہیں جاتا۔''

.5 عام گفتگو میں ابھی ''دلّی دور ہے۔'' یہ فقرہ ، محاورہ استعمال میں ہوتا رہا ہے، جسے میرؔ کے ہی اس شعر سے ماخوذ کیا گیا جان پڑتا ہے: ''شکوۂ آبلہ ابھی سے میر/ ہے پیارے ،ہنوز دلّی دور۔'' 2

کہتے ہیں ایک بار بادشاہ محمد تغلق نے دہلی سے فوجوں کو دہلی سے دور دراز دکنی ہند میں دولت آباد کو دارالحکومت بنا کر وہیں پہنچنے کا حکم نشر کر ڈالا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اپنے اس ارادے کو سرعت سے بدل کر جب دہلی ہی واپس جانے کا حکم جاری کیا، تب کسی عقلمند وزیر نے بہت ہمت کر کے بادشاہ سے یہ مثل بن جانے والا تاریخی فقرہ کہا تھا: ''ہنوز دلّی دوراست۔'' یعنی ابھی دلّی دور ہے۔ آگے مستقبل میں کسی بھی کام میں غیر ضروری لگنے والی دیری کے معنیٰ میں یہ ایک ضرب المثل کی ہی صورت اختیار کر جانے والا محاورہ بن گیا تھا۔

.4 ایک اور شعر قابلِ مدح یہ ہے۔: ''**اب تو جاتے ہیں بتکدے سے میرؔ/ پھر ملیں گے اگر خدا لایا**'' اس ایک شعر کی ہمہ گیر مقبولیت رکشاؤں، تانگے والوں کے تانگوں کے پیچھے نقش کیے گئے بالخصوص دوسرے مصرعے کے الفاظ سے ثابت ہوتی رہی ہے۔ اس طرح میر تقی میرؔ کا نام ضرب الامثال بننے والے شعروں میں سر فہرست رکھا جا سکتا ہے۔

.2 شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ :(سنہ 1779-1854) .1 کسی حسینہ کی صورت کو دیکھ کر لوگوں کے منہ سے آج بھی بے ساختہ نکل جایا کرتا ہے کہ: ''اچھی صورت بھی کیا بری شے ہے/ جس نے ڈالی بری نظر ڈالی۔'' اس شعر میں دوسرے مصرعے کو حسن کے علاوہ بھی دوسری خوبصورت اشیا کے بارے میں مستعمل کیا جا سکتا ہے۔ .2 ایک اور شعر بھی اسی نوعیت کا ہے۔'' اے ذوقؔ دخترِ رز کو نہ منہ لگا/ چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ اگر چہ اوّل مصرعے میں لفظ 'دخترِ رز' کا معنی ہے انگور کی بیٹی، یعنی شراب۔ تاہم شراب کے علاوہ بھی دیگر کسی چیز کی لت لگ جانے اور نہ چھوٹ سکنے پر اسی ایک مصرعے کا استعمال عام عوام کرتے

رہے ہیں۔ 3. اسی طرح بلند پایہ شاعر ذوق کا ایک اور شعر قابلِ غور ہے: ''رند خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو/ تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو۔'' اس میں بھی دوسرا مصرع تب بھی کہا جاتا ہے جب کسی کو یہ نصیحت کرنی ہو کہ وہ کسی دیگر شخص کے کام میں غیر ضروری طور سے اپنی ٹانگ اڑانے کی بجائے صرف اپنے کام سے ہی کام رکھے یا اسے رکھنا چاہیے۔

3.مرزا اسداللہ خاں غالب: (سنہ 1797-1896) انکے کلام کو از حد عمیق و دقیق ہونے کے باوصف عوام میں شہرۂ آفاق مقبولیت تو ملتی ہی رہی ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ انکے بیشتر اشعار ضرب المثل بننے کی صلاحیت سے مزین ملتے ہیں اور دیگر ہم عصر و متاخرین شعراء سے اس ضمن و نظریے سے بھی ان کی نادر تفریق و امتیازی حیثیت ہمیشہ قابلِ تائید مانی جاتی رہے گی۔ اب اس امر کی توثیق کے لیے انکے چند قابلِ غور اشعار پیش کیے جا رہا ہیں:

.1'' ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا/ کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا۔'' (مدیر وشوناتھ، 'دیوانِ غالب'، ص 25)

.2''تم سلامت رہو ہزار برس/ ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار۔'' (دیوانِ غالب، ص 635)

.3''قطع کیجیے نہ تعلق ہم سے/ کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی۔'' (دیوانِ غالب، ص 380)

.4''ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق/ وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے۔'' (مدیر وشوناتھ، 'دیوانِ غالب'، ص 25)(دیوانِ غالب، ص 441)

.5''نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن/ بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے۔'' (دیوانِ غالب، ص 532). اس میں دوسرے مصرعے کا استعمال مختلف ضمن یا کوائف میں بھی ہوتا رہا ہے اور ہو سکتا ہے۔

.6''وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے/ کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں۔'' (دیوانِ غالب، ص 558)

.7''ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے/ بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے۔''

.8 نئی نسلوں کے نوجوان اپنے اجداد سے اکثر سنتے آئے ہیں کہ: ''تندرستی ہزار نعمت ہے''۔ اب غالب کے مطلوب شعر کا اول مصرع دیکھیں۔ ''تنگ دستی اگر نہ ہو غالب''

.9اسی طرح ایک اور شعر کا دوسرا مصرع ضرب المثل بن کر عام عوام کے دلوں پر آج تک حکومت کرتا آ رہا ہے۔ ''غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج/ شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک۔''

اس شعر کا دوسرا مصرع تو اخبارات کی سرخیوں کے علاوہ کئی کتابوں کے نام کے بطور بھی نظر آتا رہا ہے۔ چند اور اشعار روزمرہ کا حصہ بنتے رہے ہیں، مثلاً یہ اشعار روزمرہ میں مروّج دیکھے جا سکتے ہیں:۔

10. ''صادق ہوں اپنے قول میں غالبؔ خدا گواہ رکھتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے۔''

11. ''ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے رکھتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے انداز بیاں اور۔''

4. میاں داد خاں سیاح : بتایا جاتا ہے کہ یہ شاعر غالب کے ہی شاگرد تھے۔ آج بھی جب کبھی دو آدمی ہم ذوق و ہم شوق ایک جا حاضر ہوتے ہیں، تب دیکھنے والے شخص کے منہ سے بیساختہ غالب کے اس اگلے شعر کا دوسرا مصرع نکل جایا کرتا ہے۔ **''قیس جنگل میں اکیلا ہے مجھے جانے دو خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔''**

5. نواب واجد علی شاہ اختر: (سنہ 1881-1827) ان کی ایک غیر مطبوعہ نظم زیر عنوان **''رخصت اے اہلِ وطن، ہم تو سفر کرتے ہیں''** ان کی ایک بیگم نواب زہرہ بیگم مرحومہ کے ملفوظات اور مخطوطاتِ شاہی سے نواب زکی علی خاں ہاتف مرحوم کو دستیاب ہوئی، جو اب ممتاز حسین خاں جونپور کے پاس محفوظ ہے۔ مرتبہ علی جواد زیدی نے اپنی کتاب ''اردو شاعری کے سو سال' میں یہ الکھا ہے کہ ''ممتاز صاحب کی عنایت سے یہ غیر مطبوعہ نظم ناظرین کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ ص **75-74** پر یہ نظم شائع کرتے ہوئے انھوں نے صفحہ کے ذیل میں یہ اعتراف بھی درج کیا ہے کہ: ''واجد علی شاہ نے لکھنؤ چھوڑتے وقت یہ پُر درد شعر' در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں' اہلِ وطن کو مخاطب کر کے کہا تھا، جو بچہ بچہ کی زبان پر جاری ہوا اور اب بھی لوگ بھولے نہیں ہیں، اسی شعر میں انھوں نے مصرعے لگائے اور یہ مخمس یہاں پیش کیا جا رہا ہے:

شکوہ کس سے کروں، ہاں دوست نے مارا مجھ کو/ جز خدا کے نہیں اب کوئی سہارا مجھ کو۔

نظر آتا نہیں بن جائے گزارا مجھ کو/ در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں،

رخصت اے اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں۔ **30**

مرتبہ علی جواد زیدی ا ''اردو میں قومی شاعری کے سو سال' اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، دوسرا ایڈیشن سنہ **1982،** ص 74

اسی صورت میں یہ مصرعے دوسری کُتب میں جو دستیاب ہوتے ہیں، ان کی تفصیل اس طرح آگے پیش ہے:

1. 'مقدمہ شعری'، ضرب المثل''، ص 27

2. مرتبہ'' گلستانِ ہزار رنگ''، ص 84

3. ''تاریخ اردو ادب''، ص 188

دوسرے مصرعے میں ''رخصت اے اہلِ وطن'' کی بجائے ''خوش رہو اے اہلِ وطن'' متن ملتا ہے۔ محمد شمس الحق اپنے مضمون'' آوارا گرد اشعار: تحقیق کی روشنی میں کے آغاز میں ہی از خود کہتے ہیں کہ: ''اس شعر کو واجد علی شاہ اختر نے اول الذکر متن کی صورت میں ہی لکھا ہوگا۔ بعد میں یہ دوسرا مصرع ''خوش رہو اے اہلِ وطن'' بہت مروّج ہو گیا ہوگا''**30**۔

.0اردو مجلّہ ''شاعر'' شمارہ سنہ 2009، ص 28)
بعد ازاں کہیں یہی ''رخصت اے اہلِ وطن'' متن ہو گیا ہوگا۔ 30
.0 کتاب ''جانِ عالم: مٹیا برج کے حالات'، مرتبہ عبدل حلیم شرر، ادارہ فروغِ اردو، لاہور، سنہ 1951، ص 73)

اردو کے ایک بلند پایہ ناقد جناب خلیق الزماں نصرت نے اپنی اول تحقیقی کتاب کی اول کاپی مجھے نذر کی تھی۔ اس میں بھی ایک جگہ یہ واضع کیا ہے کہ ''(واجد علی شاہ اختر کے) تقریباً پچہتر سال بعد لاہور کی جیل میں پھانسی کے سایے تلے بھگت سنگھ اپنے برادر کے نام خط لکھ رہا ہے اور واجد علی شاہ کا یہ مصرع (بطور حوالہ) دیتا ہے۔ ''خوش رہو اہلِ وطن، ہم تو سفر کرتے ہیں۔'' اسی سے اس بدل گئے مصرعے کے مقبولِ عام ہونے کی نشان زدگی پر مہر لگتی ہے 0۔
.0 ''بر محل اشعار اور انکے ماخذ''، خلیق الزماں نصرت، سنہ طباعت دوم، مارچ سنہ 2011، ص 75
.6داغ دہلوی: (سنہ 1831-1905) علامہ اقبال تک نے داغ سے شرفِ تلمذ حاصل کیا تھا۔ ایسا بتایا جاتا ہے۔ ان ہی کا ایک شعر یہ بھی ہے: 'اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں۔'' 0
.0 ''داغ دہلوی۔ دیوانِ داغ''، ص 00
اسی طرح ان کا مزاحیہ شعر بھی ملحوظ ہے: ''خط ان کا بہت خوب عبارت بہت اچھی اللہ کرے حسنِ رقم اور زیادہ۔'' اس شعر میں بھی اس دوم مصرعے کو بھی بدل کر 'اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ'' ( )0۔
.0مرزا داغ ''گلزارِ داغ'' نیر پریس، لکھنؤ، ہجری سنہ 1296، ص 186)
مندرجہ بالا مثال سے ہی مصرع کہیں زیادہ مقبولِ عام ہو چکا ہے۔ ایک اور شعر ملاحظہ کریں: ''بتوں کے کوچے سے ہم دل فگار ہو کے چلے، شکار کرنے کو آئے شکار ہو کے چلے۔'' 0
.1مرزا داغ ''گلزارِ داغ''، ص 24 .2 ''بر محل اشعار اور انکے ماخذ''، ص 91
اس شعر کے دوم مصرعے سے ایک پرانی ہندی فلم میں استفادہ کر کے ایک مکھڑا یا بول بھی بنایا گیا تھا۔
.7جگر مرادآبادی: (سنہ 1890-1961) راہِ عشق کی صعوبتوں کی بابت ان کا یہ شعر شہرۂ آفاق ثابت ہو چکا ہے۔ ''یہ عشق نہیں آساں، اتنا ہی سمجھ لیجے، اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کر جانا ہے۔'' 0
.0 ''جگر مرادآبادی: محبتوں کا شاعر''، مرتب ندا فاضلی، وانی پرکاشن، نئی دہلی، دوم ایڈیشن سنہ 2004، ص 37)
اس شعر کے دوئم مصرعے کے اولیں حصے 'آگ کا دریا' پر مبنی مشہور ناول نگارہ قرۃ العین حیدر نے ہندو پاک کے بٹوارے کی بابت اپنا شہرۂ آفاق ناول تخلیق کیا تھا۔ ناشر تھے مکتبۂ جدید، لاہور، اول ایڈیشن سنہ

(1959

اسی طرح یہ مکمل شعر ہی فلموں ڈراماؤں وغیرہ کے مکالموں میں بار بار سنا جاتا رہا ہے۔ان ہی کی کسی غزل کے مطلع کا یہ ایک اور شعر بھی عام روزمرہ کے علاوہ ہندوستانی فلموں کے مکالموں میں اپنی حیثیت کی خط کشی کرنے کے مقصد سے اکثر مکمل ہی مستعمل ہوتا رہا ہے:۔''ہم کو مٹا سکے یہ زمانے میں دم نہیں رہم سے زمانہ خود ہے، زمانے سے ہم نہیں۔''

.8مست کلکتوی: انکے متعدد اشعار عام عوام کے بیچ زبان زد ہو چکے ہیں اور روزمرہ کا ہی ایک حصہ بن چکے ہیں۔لوگ تو انکے خالقوں کے نام تک فراموش کر چکے ہیں. بالخصوص ان کے اس شعر میں تو دنیا سے استعارہ لے کر حقیقت 4 سے عملی مفاد کی جاندار وشاندار عکاسی کی گئی ہے۔جوانوں اور بزرگوں میں یہ شعر خاصا مقبول رہا ہے۔''حقیقت چھپ نہیں سک بناوٹ کے اصولوں سے رکہ خوشبو آ نہیں سکتی کبھی کاغذ کے پھولوں سے۔'' اسی طرح مردانگی پر نصیب کو فوقیت دینے والا یہ شعر بھی عوام الناس کے 0 ضمن میں نہایت زبان زد رہا ہے۔''مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے رو ہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔''اسی طرح کا مزید یہ شعر بھی ملحوظ ہے:'سرخرو ہوتا ہے انسان ٹھوکریں کھانے کے بعد رر رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ پس جانے کے بعد۔''

.0''شعرائے بنگالہ''ص **518**

.9لالہ مادھورام جوہر (فرخ آبادی) : یہ شاعر اگرچہ بہ نسبت کم مقبول رہے ہیں، تاہم اس سے ان کے اشعار کی ہر دلعزیزی ہر چند کم نہیں ہو پائی ہے۔ان کا ہی ایک شعر لائق داد و دید ہی مانا جاتا رہا ہے:''نالۂ بلبل شید ا تو سنا ہنس ہنس کر راب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی۔''اس شعر کا دوسرا مصرعہ لوگ اپنی یا کسی خصوصی مہمان وغیرہ کی تعریف میں اس کی خاص آمد سے قبل اسٹیج پر بطور استقبال تحت اللفظ سنا کر مکھن لگانے کی سعی کی جایا کرتی ہے۔اسی شاعر کا ایک اور شعر مقبولِ عام رہا ہے، جو کہ کسی شخص کی دوربینی کی تعریف کے ہی مقصد سے ہی بولا جاتا رہا ہے:۔''بھانپ ہی لینگے اشارہ سرِ محفل جو کیا رتاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔''0

.0''انتخابِ کلامِ جوہرؔ''، ص 31 .2 ''برمحل اشعار اوران کے ماخذ''،ص 143

.10مہتاب رائے تاباں : اپنے ہی کسی نزدیکی شخص کی وجہ سے جب بہت نقصان اٹھانا پڑتا ہے، تب ایسے یا اسی سے مشابہہ حالات میں انکے اگلے شعر کا دوسرا مصرع بار ہا بولا جاتا ہے۔''شعلہ بھڑک اٹھا مرے اس دل کے داغ سے رآخر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔''0

.0 کالی داس گپتا رضا، کتاب ''سہو و سراغ''، مدیر صابر دت، ''ادارہ فن اور شخصیت''، ممبئی، جنوری سنہ **1980** ص **130-131**

اس اصلی متن کو اگر چھوڑ دیں تو اسی شعر کا ایک اور متن عوام الناس میں زبان زد رہا ہے۔ ''دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے/اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔'' اس سے بھی تصدیق ہوتا ہے کہ عام عوام کس طرح سے اشعار کی اصل صورت سے مداخلت یا چھیڑ خانی کیا کرتے ہیں یا ماضی میں کرتے رہے ہیں۔

11. ظہیر الدین ظہیر : عشق کے معاملے میں ان ہی کا یہ شعر اکثر محبوب علی آصف یا اسماعیل میرٹھی کے نام سے منسوب کر دیا جاتا رہا ہے۔ ''چاہت کا جب مزا ہے کہ وہ بھی ہوں بیقرار/دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی۔'' عوام میں اس کی بھی ایک دیگر صورت مقبول رہی ہے:۔'' الفت کا جب مزا ہے کہ دونوں ہوں بے قرار/دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی۔'' 0.

.0 ''دیوانِ ظہیر''، ص 31 ، محول 'گلستانِ سخن' مفید عام پریس، آگرا، ص 235 .2 اردو مجلّہ 'شاعر'، شمارہ دسمبر سنہ 2006، مضمون ''آوارہ گرد اشعار: تحقیق کی روشنی میں''، ص 26

12. مظہر علی امیر : امیر لکھنوی کے نام سے غلطی سے منسوب ایک یہ شعر بھی بہت مشہور رہا ہے: '' خدا جانے یہ دنیا جلوہ گاہ ناز ہے کس کی/ہزاروں اٹھ گئے/لیکن وہی رونق ہے محفل کی۔'' دیگر متنوں میں اسی شعر کی مزید صورت یوں ملتی ہے:۔ '' خدا جانے یہ کس کی جلوہ گاہ ہے ناز ہے دنیا/ہزاروں اٹھ گئے، لیکن وہی رونق ہے مجلس کی۔'' سفرناموں کی کتابوں میں 'دنیا' لفظ کی جگہ 'دہلی' یا 'دلّی' لفظ بھی مستعمل/دستیاب ہو جاتا ہے۔

13. بزمِ اکبرآبادی : ان کے ایک شعر کا اصل متن یہ رہا ہے: 'ایک تصویر کسی شوخ کی اور نامے چند/گھر سے عاشق کے پسِ مرگ یہ ساماں نکلا' ان ہی کا مزید یہ شعر بھی بدلی ہوئی صورت میں اس طرح مروجہ رہا ہے۔ ''چند تصویرِ بتاں، چند حسینوں کے خطوط/بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا۔'' بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں بطور ریڈر رفائز جناب حنیف نقوی نے اپنی کتاب میں اس شعر کی بابت یہ کہا ہے کہ کسی باذوق شخص نے بنا کسی ارادے کے اس شعر کو غالب کے شعری مزاج سے ہم آہنگ کر کے اس شعر کے خالق کو مقبولیت دینی چاہی ہے 0

.0 ''غالب: احوال و آثار''، نصرت پبلی شرز، سنہ 1990

لہٰذا جب تک کسی دیگر شاعر کا کلام مستند ثبوت کے ساتھ دستیاب نہ ہو جائے، تب تک شعر کی مذکورہ بالا صورت کو بزمِ اکبرآبادی کے اصل کی ہی صورت تسلیم کر لیا جائے اور دوسری بار دیے گئے حوالے کے متن کو اسی شعر کی بدلی ہوئی صورت کا درجہ عطا کیا جائے۔

14. شیخ طراب علی قلندر کاکوروی : ان کے شعر کا بھی دوئم مصرع قدرے زیادہ مقبولِ عام رہا ہے :۔ ''ہندی فلم 'لیلیٰ مجنوں'' میں ایکٹر رشی کپور اور رنجیتا کے رول مقبول ہوئے تھے۔ ان دونوں پر ہی فلمائے گئے ایک نغمے کا یہ دوسرا مصرع اس اصل شعر کا ہے: ''شہر میں اپنے یہ لیلیٰ نے منادی کر دی/کوئی پتھر سے نہ مارے میرے دیوانے کو۔'' 5

15. نواب محمد مصطفیٰ شیفتہ : ان کے بھی اس شعر کا دوسرا مصرعہ نہ جانے کب سے ہندوستانی معاشرے میں روز مرہ کا ایک حصہ بنا ہوا ہے: "ہم طالب شہرت ہیں ہمیں ننگ سے کیا کام / بدنام اگر ہونگے تو کیا نام نہ ہوگا۔" یہ شاعر پہلے مومن کے شاگرد تھے اور بعد ازاں یہ غالب سے شرفِ تلمذ حاصل کر گئے تھے۔

16. شہیر مچھلی شہری : انکا یہ شعر عظیم اختر کے مطابق "غیر معمولی طور پر مشہور ہے اور عام طور پر اسلامی کیلنڈروں کی زینت بڑھاتا ہے:۔" فانوس بن کے جس کی حفاظت ہوا کرے / وہ شمع کیا بجھے گی جسے روشن خدا کرے۔" اپنے مضمون زیرِ عنوان "یہ آوارہ گرد شعر..." میں موصوف نے شعر کے دوسرے مصرعے میں 'گی' لفظ زیادہ لکھا تھا۔ اس سے قبل انہوں نے صحیح تحقیق کر کے بتایا تھا کہ۔" جناب شہیت مچھلی شہری حضرت منیر شکوہ آبادی شاگرد رشید تھے اور اپنے وقت کے ایک کہنہ مشق استاد اور قادر الکلام شاعر تھے۔ 0

0. رسالہ 'ایوانِ اردو'، شمارہ نومبر سنہ 2013، ص 16

17. سروش مچھلی شہری : انکا یہ شعر رسائل میں موضوعِ بحث رہا ہے۔" برباد گلستاں کرنے کو بس ایک ہی الو کافی تھا / ہر شاخ پہ الو بیٹھے ہیں، انجامِ گلستاں کیا ہوگا۔"

اس متنازع شعر والے معزز شاعر کی بابت مذکورہ بالا شمارے سے ہی جناب عظیم اختر صاحب کی یہ تفصیل تشفی کرنے والی یہاں محول کی جارہی ہے۔" (سروش) مشرقی یو۔پی۔ کے مشاعروں میں طنز و مزاح کے ایک اچھے شاعر کی حیثیت سے اپنی پہچان قایم کرانے میں کامیاب رہے۔" آگے ان ہی کے ایک معزز شاگرد جناب ڈاکٹر رحمت قریشی کے اپنے ان استاد کے بارے میں تحریر کردہ مقالے کے بارے میں واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔" اس تحقیقی مقالے میں صفحات 206 سے 209 تک 'انجامِ گلستاں' کے ایک مخمس شامل ہے، جس کے دوسرے بند کے چوتھے اور پانچویں مصرعے شعر کی شکل اختیار کر کے مشہور ہوگئے۔ اس مخمس میں طنز و مزاح کی پُٹ شامل ہے، جس کی وجہ سے یہ شعر طنز و مزاح کے مختلف شاعروں کے نام سے منسوب کر دیا گیا ہے 0

0. ایضاً ص 16

ایوانِ سیاست میں چلتا کرسی کا ہی جادو کافی تھا / جی جان نچھاور کرنے کو دو بوند ہی آنسو کافی تھا / عنوانِ تباہی کی خاطر اظہارِ من و تو کافی تھا

اس کے بعد مذکورہ بالا دو متنازع مصرعے درج ہیں۔

18. قایم چاندپوری : خدا پرستی میں کاملاً یقین رکھنے والے لوگ زمین پر رہنے بسنے والے افراد کی بہ نسبت اس جہان کے اصلی خالق کے رحم و کرم پر ہی منحصر رہنے میں ہی اپنی بہتری تصور کرنے میں ہی یقین رکھا کرتے ہیں۔ اسی مفہوم کا انکا یہ شعر ملاحظہ کریں:۔" مرا کوئی حال کیا جانتا ہے / جو گزرے ہے مجھ پر خدا جانتا ہے۔" 0

.0 خلیق الزمان نصرت، کتاب ''برمحل اشعاراوران کے ماخذ''ص 27

انہی کا ایک اور شعر قابلِ غور ہے۔ ''ایک جا گہ پہ نہیں ہے مجھے آرام کہیں رہے عجب حال مرا، صبح کہیں شام کہیں۔'' عام لوگ ایک نہ ایک دن وقت ہاتھ سے نکل جانے کے بعد یہ شعر کہہ کر گویا اپنے دل کو تسلی دے کر گویا اکتفا کرلیا کرتے ہیں۔

.19 خواجہ میر درد فلمی موسیقار نوشاد، جو خود بھی ایک بلند پایہ و مایہ ناز شاعر تھے، زندگی کی بے ثباتی کے بارے میں ان کا یہ زبان زد عام شعر بہت پسند کیا کرتے تھے۔ ''وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوار خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا۔''0

.0 خواجہ میر درد،

.20 فانی بدایونی : ان کے اس شعر سے بھی عوام الناس اپنی روز مرہ کی بول چال میں اکثر اس حیات کی پیچیدگی اور نافہمی ہیئت کو آشکار کرتے رہے ہیں۔ ''ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا رزندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا۔'' ہندی فلم 'دیوداس' کے ایک نغمے میں ہندی فلموں کے ٹریجڈی کنگ تصور کیے جانے والے ایکٹر دلیپ کمار صاحب شراب کے نشے میں شرابور ہوکر ایک آدھ مصرعے گنگناتے نظر آتے ہیں۔6

.20 منیر شکوہ آبادی: یہ عین ممکن ہے کہ ان کا یہ شعر پہلے سے ہی معاشرے میں مروجہ بات یا مصرعوں پر مبنی رہا ہو، کیونکہ دیگر اشعار کی بابت بھی یہی ممکن ہوسکتا ہے۔ شعر ہے۔ ''چار دن کی چاندنی ہے رپھر اندھیری رات ہے۔''0

.0 خلیق الزماں نصرت، 'برمحل اشعار اور انکے ماخذ'، ص238

.21 مرزا محمد علی ندوی : ان کا یہ شعر مکمل یا پھر فقط اسکا دوئم مصرع ہی شعر کا حصہ بنایا جاتا رہا ہے۔ ''چل ساتھ کہ حسرت دلِ مرحوم سے نکلے رعاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے۔''0

.0 مرزا محمد علی ندوی، 'گلشیئے خار'، ص 275

.22 عبدالحمید عدم :انکے اس شعر کو بھی عوام الناس اپنے جیبوں کی اپنے تئیں دکھائی جانے والی بے وفائی کے بدلے میں مکمل طور پر یا پھر اسکے دوسرے نصف حصے کو ہی اپنے روز مرہ کا حصہ بناتے چلے آ رہے ہیں:۔''دل ابھی پوری طرح ٹوٹا نہیں ردوستوں کی مہربانی چاہیے''0

.o 'عمر بھر سفر میں'، دیوداس بسمل، ص 183

.23 نواب علی :انکے بھی اس شعر میں خدا کی ہی رضا مین ہمیشہ رہنے اور اسی کے رحم و کرم پر باور رکھنے کے ساتھ ساتھ اس شعر کا تصرف اپنی محبوبہ وغیرہ کے ضمن میں بھی استفادہ کرنے کے لاتعداد مواقع فراہم ہوتے رہتے ہیں:۔''اگر بخشے زہے قسمت، نہ بخشے تو کیا رسر تسلیم خم جو مزاج یار میں آئے۔''

24 گھنٹشام لعل آتی : اپنی کسی محبوبہ یا کسی نزدیکی شخص کی دیری سے چلی آرہی ناراضی کے کسی بھی وجہ سے دور ہو جانے پر اس اگلے شعر کا دوسرا مصرعہ عباد یبوں وغیرہ نے آج تک بیشتر استعمال کیا ہے:۔" لائے اس بت کو التجا کر کے ر کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے۔
O،
.0 جریدہ 'اسباق'، شمارہ جولائی ستمبر سنہ 2007 ص 60

مزید تحقیقات کرنے پر اسی موضوع سے متعلق متعدد اشعار منظر عام پر لائے جاسکتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک ضخیم کتاب بھی پایۂ تکمیل تک پہنچائی جاسکتی ہے۔ امید ہے کہ اردو اور ہندی زبانوں کی شاعری کے دلدادہ اور شوقین اس وسیع اور وقیع موضوع سے متعلق تحقیق وتنقید کرنے اور کرانے میں سنجیدگی سے غور و فکر کر کے دنیا کی مقبول ترین زبان اردو کی خدمت کرنے میں مطلق احتراز نہیں کریں گے۔

☆☆☆

شہرِ غزل

پیش رَو غزلیں

ندا فاضلی / سلطان اختر / عبدالرحیم نشتر / ڈاکٹر صفدر / مدحت الاختر

دس خاص غزلیں

محمد عابد علی عابد / محمد حنیف کاتب

ہم عصر غزلیں

جمال اویسی / شکیل اعظمی / مدن موہن دانش / شکیل احمد شکیل / ڈاکٹر افضال عاقل /
کے۔ ایم۔ اشفاق الرحمان مظہر طارق متین / اشرف عادل / اصغر شمیم / کلیم اختر /
نثار احمد نثار / حفیظ انجم کریم نگری / نواب آرزو

سوغات غزلیں

احمد صغیر صدیقی [پاکستان] / افروز عالم [کویت]

پیش رَو غزلیں

● ندافاضلی

اک پرندہ ہَوا میں اُڑا اور ڈالی لچکتی رہی
کوئی بھولی ہوئی آنکھ سی مجھ میں بن کر چھلکتی رہی

جانے کس کی سواری تھی وہ یوں تو کچھ بھی نہ آیا نظر
ایک خوشبو تھی محوِ سفر جو ہَوا میں مہکتی رہی

فاتحہ پڑھ کے لوٹا تھا میں، یوں ہی خاموش لیٹا تھا میں
آسماں دور تک صاف تھا پھر بھی بجلی چمکتی رہی

ایک انگور کی بیل تھی، دور جاتی ہوئی ریل تھی
اور پھر زینہ چڑھتی ہوئی ایک پایل کھنکتی رہی

ہنس رہا تھا کسی بات پر، ایک پتا گرا ہاتھ پر
جانے کب کی دبی چوٹ تھی دیر تک جو کسکتی رہی

شام کی جگمگاتی اذاں لے گئی مجھ کو جانے کہاں
بھیگی آنکھوں سے مجھ کو جہاں ایک تسبیح تکتی رہی

جو بھی ہنستا یا روتا ملا، تھا سبھی کے لبوں پر گلہ
زندگی کی طلب میں سدا کچھ کمی سی کھٹکتی رہی

کل جسے بھلا کہا آج اُسے بُرا لکھا
مجھ کو اپنی آنکھ سے جیسا جو دِکھا لکھا

سوتے سوتے رات کل آنکھ میری کھُل گئی
لَو بڑھا کے شمع کی میں نے پھر خدا لکھا

خون سے رنگے ہوئے ہاتھ پاک صاف تھے
منصفی کی آنکھ نے سب کو پارسا لکھا

رونے والا ایک میں، مرنے والے سینکڑوں
میں نے جب بھی جو لکھا اپنا مرثیہ لکھا

راستہ کٹھن بھی تھا اور گرم دن بھی تھا
دوپہر کی دھوپ پر پیاس نے گھٹا لکھا

لفظ گر نہ کھُل سکے راز پڑھ کے دیکھیے
مجھ کو خود خبر نہیں میں نے جانے کیا لکھا

● ندا فاضلی

تو قریب آئے تو قربت کا یوں اظہار کروں
آئینہ سامنے رکھ کر ترا دیدار کروں
سامنے تیرے کروں ہار کا اپنی اعلان
اور اکیلے میں تری جیت سے انکار کروں
پہلے سوچوں اسے پھر اس کی بناؤں تصویر
اور پھر اس میں ہی پیدا در و دیوار کروں
میرے قبضے میں نہ مٹی ہے، نہ بادل، نہ ہوا
پھر بھی خواہش ہے کہ ہر شاخ ثمر بار کروں
صبح ہوتے ہی ابھر آتی ہے سالم ہو کر
وہی دیوار جسے روز میں مسمار کروں

بظاہر تو کوئی تنہا نہ تھا جس کو جدھر دیکھا
حقیقت میں مگر سب کو خود اپنا ہم سفر دیکھا
کبھی اس کے تعاقب میں تھا اپنی ذات سے باہر
جسے دیکھا اسے دشمن سے اپنے بے خبر دیکھا
ترقی کر رہا تھا ملک اس کی خوش بیانی میں
ہُوا جب ختم جلسہ میں نے اُٹھ کر اپنا گھر دیکھا
ہُوا معلوم لکڑی کے بدن والے بھی روتے ہیں
کسی کونپل کو اس کی شاخ سے جب توڑ کر دیکھا
کسی کی آنکھ کے آنسو سے وہ جھانکا تو یاد آیا
وہ کوئی اور تھا شاید جسے سب نے جدھر دیکھا

• سلطان اختر

میری آنکھوں کو پریشان بہت کرتا ہے
آئینہ اب مجھے حیران بہت کرتا ہے
میری سنتا ہی نہیں ہے دلِ آشفتہ مزاج
اپنی بربادی کا سامان بہت کرتا ہے
جلنے دیتا نہیں ہونٹوں پہ تبسّم کے چراغ
یہ تماشا بھی وہ ہر آن بہت کرتا ہے
وہ بیابان کو بناتا ہے کبھی باغِ بہشت
اور کبھی شہر کو ویران بہت کرتا ہے
میں گنہگارِ زمانہ ہوں مگر میرا خدا
مشکلوں کو میری آسان بہت کرتا ہے
چین لینے نہیں دیتا دلِ ہنگامہ طلب
میری تنہائی کا نقصان بہت کرتا ہے
گھٹ کے رہ جاتا ہے بازارِ جہاں میں اختر
اپنی خواہش کو وہ قربان بہت کرتا ہے

برائے تجربہ اپنی روش بدل رہے ہیں
رئیس زادے زمانے کے ساتھ چل رہے ہیں
تمام خلق ہراساں ہے تیرگی سے یہاں
طلوعِ شام سے پہلے چراغ جل رہے ہیں
شہید ہوتے رہے پھر بھی سرنگوں نہ ہوئے
ہر ایک عہد میں ہم لوگ بے بدل رہے ہیں
میں بجھ چکا ہوں سرِ راہِ انتظار مگر
مری نگاہوں میں اب تک چراغ جل رہے ہیں
کسی کو تیر وسناں سے کوئی غرض ہی نہیں
کہ شاہزادے کھلونوں سے اب بہل رہے ہیں
ہمارے سر پہ قناعت کی چھاؤں تھی دائم
حریص لوگوں میں ہم بھی تو بے خلل رہے ہیں
عروج ہے کہ یہ تہذیب کا زوال اختر
مرے بزرگ بھی اب برف پر پھسل رہے ہیں

● عبدالرحیم نشتر

کود پڑے تھے جو اپنی من مانی میں
ڈوب گئے وہ، نادیدہ طغیانی میں
خوش فہمی کے باغ تھے، سیر سپاٹا تھا
خاک بسر ہیں اب دشتِ حیرانی میں
اب سنگِ تعبیر سے سر پھوڑیں اپنا
کیا کیا خواب نہ دیکھے خوش امکانی میں
لاش کو، کوئی لاش نکالے گی کیسے
سب کے سب غرقاب ہیں گہرے پانی میں
تخت نشینی کا چسکا تھا، مست رہے
خواجہ سراؤں جیسے بھی سلطانی میں
آپ کہاں ہیں، آپ کا کوئی ذکر نہیں
لوگ بھرے بیٹھے ہیں نوحہ خوانی میں

ہاتھ پیروں میں دم نہیں باقی
بجھتی آنکھوں میں رم نہیں باقی
کس پہ روؤں، کسے کسے روؤں
اب کسی کا الم نہیں باقی
لوگ روتے ہوئے سے لگتے ہیں
میری آنکھوں میں نم نہیں باقی
بیش از بیش ہے نشاطِ ہوس
جو بھی باقی ہے، کم نہیں باقی
دیکھتے ہو کہ بس ہمی ہم ہیں
دیکھ لو گے کہ ہم نہیں باقی
وقت ہی سب کو سیدھا کرتا ہے
شکر ہے، رہ گیا بھرم باقی

● عبدالرحیم نشتر

کون سنتا ہے صدا دیکھتے ہیں
ایک آواز لگا دیکھتے ہیں
سرکشی میں تو میاں عمر کٹی
اب ذرا سر کو جھکا دیکھتے ہیں
پھر ہُوا پاؤں اٹھانا مشکل
پھر وہی دشتِ بلا دیکھتے ہیں
بے مزہ شہر کی بے کیفی میں
اک انوکھا ہی مزا دیکھتے ہیں
سامنے آ گئی چٹان کوئی
حضرتِ موسیٰ عصا دیکھتے ہیں
مدّتوں خود کو بھلا رکھا تھا
کچھ دنوں اس کو بھلا دیکھتے ہیں

خوب لیتے ہیں مزا، پوچھتے ہیں
مجھ سے سب حال ترا پوچھتے ہیں
پھر دھماکوں سے فضا گونج اٹھی
پھر وہ احوال مرا پوچھتے ہیں
اب مری آنکھوں میں آنسو بھی نہیں
دردِ دل آپ بھلا پوچھتے ہیں
کون سے دیس گئے ہیں بادل
کہیں لہرائے گھٹا پوچھتے ہیں
اپنی تقدیر وہی دھوپ کا کھیت
ہے کہاں ظلِّ ہُما پوچھتے ہیں
یہ زمیں سرخ ہوئی جاتی ہے
اور کیا رنگِ فضا پوچھتے ہیں
ہر طرف اتنی تمازت کیوں ہے
کوئی خورشید بجھا؟ پوچھتے ہیں

ڈاکٹر صفدر

جھومتا ہے کون اے فصلِ بہاراں باغ و بن میں
اے سمندر کون لہراتا ہے آبی پیرہن میں
کیسی آہٹ ہے لیے پھرتی ہے مجھ کو شہر در شہر
کون ہے آواز دیتا ہے مجھے اپنے وطن میں
رات بن کر پھیلتا تیرا سراپا اور میں ہوں
اک درندے کی صدا پر کانپتا جنگل بدن میں
چاند کے درپن میں دیکھوں شکل میرا مسئلہ ہے
چاند کا پرتو دکھاتا ہے وہ پانی کے لگن میں
میری آنکھوں کا اجالا لمس ہے تیرے بدن کا
تھا مگر میں دیکھتا کچھ بھی نہ تھا باغِ عدن میں

میرے موتی ہیں خذف خاک ہے میرا سونا
میری تحریر کو آیا نہ قصیدہ ہونا
کب تلک سانپ کے پہرے کا تماشا اے دل
میرا گھر ہے مرے اجداد کا چاندی سونا
آخری داؤ لگانے کی گھڑی آ پہنچی
بس بہت کھیل چکے کھیل یہ پانا کھونا
میں خداؤں کی صفوں کے ہوں مقابل تنہا
دیکھ لے میرے خدا میرا یہ بندہ ہونا
ایسی اک چیخ جو زندہ ہیں کھڑے ہو جائیں
سونے والوں کو تو ہے حشر کے دن تک سونا

● ڈاکٹر صفدر

الفاظ استعارے اشارے ہمارے اپنے ہیں
انداز شعر گوئی کے پیارے ہمارے اپنے ہیں
تنہائیوں میں رات بھی کیا کیا فریب دیتی ہے
معشوق غیر اور ستارے ہمارے اپنے ہیں
اس فہم پر تھا ہم کو بھروسہ چلے تھے جب گھر سے
گرداب دشمنوں کے کنارے ہمارے اپنے ہیں
ہمسائیگی بھی آئے میسّر ہمارے اپنے کی
مہر و مہ و نجوم تو سارے ہمارے اپنے ہیں

افق سے دور بہت دور دیکھ سکتا ہوں
تری زمیں سے بڑی اک زمیں پہ تنہا ہوں
وہ خوش ہوا ہے نہ غمگین اس خبر سے مگر
ضرور تھا کہ کہوں خیریت ہے اچھا ہوں
ذرا قریب سے پوچھو کرے گا سرگوشی
میں آدمی تو نہیں آدمی کا دھوکہ ہوں
اگر ہو تیشۂ اندیشہ ہاتھ میں میرے
یقین ہوتا ہے میں پربتوں سے اونچا ہوں
نہ اس میں رنگ ہے کوئی نہ کوئی چہرہ ہے
میں آئینے کو مگر دور سے پرکھتا ہوں
وہ مہربان مربی تو ہوگئے رخصت
اب اپنی ذات سے بے سود کیوں الجھتا ہوں

● ڈاکٹر صفدر

سر سے اک دن گزر گیا پانی
پھر تو چہرے کا مرگیا پانی
خوب مستی میں جھومتا گاتا
پستیوں میں اتر گیا پانی
آخری خطبہ پڑھ رہا تھا وہ
اس کی کشتی میں بھر گیا پانی
آج پھر اپنا احتساب کیا
ایک اک لفظ کرگیا پانی
اب نہ اس کی ہتھیلیاں رگڑو
اس کی رگ رگ میں بھر گیا پانی

مٹیوں میں ہوگئی ہیں جذب اُڑتی بدلیاں
جی اٹھی ہیں نرم پتلی سبز کومل پتیاں
دسترس میں ہیں مگر میں جان کر چھوتا نہیں
رنگ بھرتی ہیں فضا میں خواہشوں کی تتلیاں
رات وہ سمجھی تھکی ہاری ہوا بھی سو گئی
اور جب انگڑائی ٹوٹی بج اٹھی ہیں چوڑیاں
سطح پر پڑتے پھسل جاتی ہیں نظریں ان دنوں
روشنی سے کھیلتی ہیں چمچماتی کرسیاں
یوں سمجھ لو جیسے رستہ دیں ہوائیں تیر کو
مشکلوں میں ہٹ گئے احباب جو تھے درمیاں
کون کہہ سکتا ہے کب کالا، گھنا بادل پھٹے
کس گھڑی یہ خوف کا مطلع اچھالے بجلیاں

● مدحت الاختر

ایک جیسی ہے زندگی سب کی
کٹ رہی ہے بُری بھلی سب کی
میں اکیلا نہیں سمندر میں
میرے اندر ہے تشنگی سب کی
اپنا قصہ ابھی کہا بھی نہیں
سن رہا ہوں بُری بھلی سب کی
کوئی کوئی درخت ہوتا ہے
چھاؤں ہوتی نہیں گھنی سب کی
ایک دو لفظ کیا بدل ڈالے
شاعری ہو گئی نئی سب کی
روشنی لے کے میں اٹھا جس دم
وہیں پرچھائیں گر پڑی سب کی
موت اب کیا کسی کو مارے گی
جان لیتی ہے زندگی سب کی
خود پہ ہنستے ہوئے بھی ڈرتے ہیں
کتنی مجبور ہے ہنسی سب کی

کوئی اپنا نظر نہیں آتا
شکل تکتا ہے اجنبی سب کی
کیا ستم ہے کہیں نہیں جاتی
ہے یہی ایک راہ بھی سب کی
لمحہ لمحہ بدلتے رہتے ہیں
ذات ہے ہر نفس نئی سب کی
موسمِ گل صدائیں دیتا ہے
پھول سب کے کلی کلی سب کی
سب کریں گے قیاس اپنے پر
کس نے سمجھی ہے زندگی سب کی
صرف میرے ریال کھوٹے ہیں
ورنہ کوڑی بھی ہے کھری سب کی
جسم روٹی مکان کپڑا روح
فکر کرتا ہے آدمی سب کی
شاعر اچھا ہے مدحت الاختر
ہے یہی رائے واقعی سب کی

● مدحت الاختر

ہزاروں آئینہ عالم ملیں گے
ہمارے جیسے لیکن کم ملیں گے

دکانوں میں سجے ہیں جتنے رومال
ہمارے آنسوؤں سے نم ملیں گے

رہیں گے بے نشاں ہم خار و خس میں
گلوں میں صورتِ شبنم ملیں گے

طبیعت میں کسی کی کج ادائی
کسی کے گیسوؤں میں خم ملیں گے

پرانے موسموں کی خیر یارب
سفر میں کچھ نئے موسم ملیں گے

یہاں کے روپیوں کا مول ہی کیا
وہاں دینار اور درہم ملیں گے

چلو، تم پوری دنیا چھان مارو
یہی حالات بیش و کم ملیں گے

ہمارے دل کی ہے ہر بات مبہم
ہمیں الفاظ بھی مبہم ملیں گے

کہاں جائیں کہ دل کو چین آئے
اسی عالم میں ہم ہر دم ملیں گے

نئی صورت بنا لیتے ہیں دم میں
یہاں سب موم کی مریم ملیں گے

ق

نہ آئے گا جیالا کوئی رَن میں
ستونوں سے بندھے پرچم ملیں گے

تمیزِ حق و باطل کیا رہے گی
نقوشِ خیر و شر باہم ملیں گے

یہ بستی دیو زادوں کی ہے مدحت
یہاں دو چار ہی آدم ملیں گے

● پی پی سری واستو رند

جب کوئی درد آشنا باقی نہیں گھر بار میں
اب گھنے جنگل میں بھٹکوں یا بھرے بازار میں

سانکلیں سوکھے کواڑوں کی لگا لو دوستو
ایک سودائی ابھی مشغول ہے تکرار میں

میرے گھر والوں نے دیواروں کو اونچا کرلیا
سارے رشتے چن دیئے ہیں مستقل دیوار میں

آسمانوں پر لہو بکھرا، نہ ہنگامہ ہوا
اب ابابیلوں کی چیخیں ہیں خلا کے غار میں

ہر طرف بے آسمانی، ہر طرف بے منظری
وقت کے طوفان نے چھوڑا مجھے منجدھار میں

چند یادیں، چند لمحے، چند چہرے، چند لوگ
کونپلیں کچھ پھوٹ آئی ہیں کٹے اشجار میں

ہم مسافر ریت کی سمتوں میں چلتے ہی رہے
سبز موسم کے تمنائی بنے بیکار میں

رند اب لائیں کہاں سے ہم غزل میں تازگی
استعارے بھی تو ضم ہوتے نہیں اشعار میں

خرابے جب پریشانی میں آئے
خزاں لمحے بھی حیرانی میں آئے

حصارِ ظلمتِ شب سے نکل کر
اُجالے بزمِ امکانی میں آئے

تپش موسم کے تھے اپنے مسائل
کئی سورج بھی حیرانی میں آئے

سمندر سے کہو، خود میں سمٹ کر
کبھی سیلاب کے پانی میں آئے

کبھی ایسا نہ ہو دیوانگی میں
سلگتی دھوپ نادانی میں آئے

خلاؤں میں بغاوت ہو رہی ہے
زمیں والے پریشانی میں آئے

جہاں پر دفن تھے ماضی کے لمحے
ہماری اپنی نگرانی میں آئے

اُنھی میں رند ہے طرزِ بغاوت
اچانک جو پریشانی میں آئے

سردار آصف

ہوتا ہوں میں تھوڑا تھوڑا سب کے ساتھ
آدھا ادھورا ہی رہتا ہوں اپنے ساتھ

ہے مجھ کو معلوم یہ عادت آندھی کی
لے کر آتی ہے اکثر سناٹے ساتھ

دنیا میں کیسے پکڑوں تیری رفتار
اک دیوار رہا کرتی ہے میرے ساتھ

تو ہی منزل تو ہی رستہ، تو ہی چراغ
ترے علاوہ جا سکتا ہوں کس کے ساتھ

کیا رونا، وہ بُرے وقت میں چھوڑ گیا
عام روش ہے، یہ ہوتا ہے سب کے ساتھ

نمبر ہی کالونی کے گھر کی پہچان
اک کھڑکی، اک دروازہ ہے سب کے ساتھ

دل جڑتا ہے کہیں کسی سے برسوں میں
بیٹھنا اٹھنا تو ہوتا ہے سب کے ساتھ

ہماری کاوشِ شعر و سُخن بے کار جاتی ہے
غزل کیسی بھی ہو، اُس کے بدن سے ہار جاتی ہے

یہ کیسے مرحلے میں پھنس گیا ہے میرا گھر مالک
اگر چھت کو بچاتا ہوں تو پھر دیوار جاتی ہے

مرے خوابوں کا اُس کی آنکھ سے رشتہ نہیں ٹوٹا
مری پرچھائیں اکثر جھیل کے اس پار جاتی ہے

جلا کر ٹھیک سے طاقوں میں ان کو رکھ دیا جائے
تو پھر ایسے چراغوں سے ہُوا بھی ہار جاتی ہے

ہمارے روٹھ جانے سے تجھے اب خوف لگتا ہے
ہمارے روٹھ جانے سے تری سرکار جاتی ہے

اگر سر کو اٹھاتا ہوں تو سر کٹنے کا خدشہ ہے
اگر سر کو جھکاتا ہوں تو پھر دستار جاتی ہے

نہ جانے کیوں وہ میری راہ کا کانٹا نہیں بنتی
محبت میں وہ پاگل عادتاً بھی ہار جاتی ہے

● محمد عابد علی عابد

دس خاص غزلیں

آگ میں جل کر پتھر میرا کندن میں تبدیل ہوا
آتشِ غم سے سینہ میرا لوہے سے قندیل ہوا

قدرت کے ہاتھوں میں انساں تو بس ایک کھلونا ہے
پہلے ٹوٹا پھر بکھرا پھر مٹی میں تحلیل ہوا

عالم کی ہر چیز میں تیرے غیب وظہور کا جلوہ ہے
غیب وظہور سے تیرے سارا ارض وسما تشکیل ہوا

تیری سوچ ہے میری سوچ اب تیری مرضی میری مرضی
ذہن تری تحویل میں آیا دل تیری تحصیل ہوا

وحشت میری موسم گل میں اتنی سوا تھی اب کے برس
دشت ہوا زنداں کے برابر اور سمندر جھیل ہوا

ٹھکانے پر نہ پڑا نشہء شراب میں پاؤں
زمیں کے بدلے رکھا میں نے جوئے آب میں پاؤں

ہر ایک بات میں قدرت کی دخل دے انساں
مجال ہے کوئی رکھے جو آفتاب میں پاؤں

کمر پہ ختم نزاکت کا ہو گیا معیار
وگرنہ آ نہ گئے ہوتے انتخاب میں پاؤں

وہ اپنی ذات میں پھولا نہیں سماتا ہے
ہو آب آب جو مارے ہوا حباب میں پاؤں

نظر کے حادثے گو فی زمانہ عام سہی
رہے خیال نہ گمراہ ہوں شباب میں پاؤں

نکل کے گل سے کیا اس نے کوئے یار کا رخ
"شمیم یوں بھی جماتی نہیں گلاب میں پاؤں"

وہ دور ہی سے نظر آیا جب کہیں دیکھا
قریب جا کے میں رکھتا کبھی سراب میں پاؤں

اجل کے گھوڑے پہ عابد سوار رہتا ہوں
ہمیشہ رہتے ہیں گویا مرے رکاب میں پاؤں

• محمد عابد علی عابد

چیخا کیے بس اہلِ خرد آگ آگ آگ
اہلِ جنوں بجھایا کیے بھاگ بھاگ آگ

زلفِ سیاہ روئے منور پہ اس کے دیکھ
ہوتا ہے یہ گمان کہ اُگلے ہے ناگ آگ

غصہ پہ اپنے کیجئے قابو خدا گواہ
نکلے ہے جب دہان سے لگتا ہے جھاگ آگ

جب کشت زار میں ہوئی تیار اس کی فصل
اہلِ نظارہ کو ہُوا سرسوں کا ساگ آگ

دہشت سی دل میں بیٹھ گئی حادثہ کے بعد
کانوں میں گونجتی تھی صدا جاگ جاگ آگ

دونوں کے جسم جلتے تھے گویا شبِ وصال
دلہن تھی آگ قرب سے اس کا سہاگ آگ

محنت سے فن میں آئی ہے فنکار میں جلا
مشق و ریاض سے ہوا مطرب کا راگ آگ

بازارِ حسن دیکھ کے عابد پکار اٹھا
افراطِ نور سے ہوا "ساڑی سہاگ" آگ

اشکوں سے ہوگیا ہے جل تھل ہمارے گھر میں
مشکل ہے چلنا پھرنا پیدل ہمارے گھر میں

ہو شام یا سحر ہو شب ہو کہ دوپہر ہو
رہتی ہے رفتگاں سے ہلچل ہمارے گھر میں

غالب کی طرح جاناں! کنگال ہم نہیں ہیں
ہے بوریا، رضائی، کمبل ہمارے گھر میں

لوگوں کی سازشوں کا مرکز بنا ہوا ہے
برس سے ایستادہ پیپل ہمارے گھر میں

رہتے ہیں آسماں پر مصروفِ جہدِ پیہم
عابد نہیں برستے بادل ہمارے گھر میں

• محمد عابد علی عابد

جس طرح آنکھوں کو منظر ہے ضروری
گردشِ تلوار کو سر ہے ضروری
کہہ سکیں جس کو حریفِ قامتِ یار
باغ میں ایسا صنوبر ہے ضروری
ہم محبت کی نہیں کرتے نمائش
مادّی اشیا کو پیکر ہے ضروری
آسماں ہونے سے بھی کیا فائدہ ہے
سائباں پھر بھی تو سر ہے ضروری
مطمحِ ہر قطرہ ہے آغوشِ دریا
واصلِ دریا سمندر ہے ضروری
درد کا درماں نہیں عابد جہاں میں
آدمی ہو جائے خوگر ہے ضروری

اسکا چہرہ نظر سے جب اوجھل ہوا اشک آنکھوں سے میری ٹپکنے لگے
ڈوب جانے پہ سورج کے رات آگئی آسماں پر ستارے چمکنے لگے
دور ہونے کی ساعت بھی نزدیک تھی پائمالی لکھی ان کی قسمت میں تھی
تیز رفتار آندھی سے لرزیدہ تھے شاخ پر زرد پتے کھڑکنے لگے
اُف اوہ رعب جمالِ رخِ دلبراں اچھے اچھوں کے اڑ جائیں ہوش وحواس
عرضِ مطلب کی ہمت کسے ہے یہاں دیکھ انھیں دل ہمارا دھڑکنے لگے
فصلِ گل بھی بھلا کوئی موسم ہوا آگ باہر بھی ہے آگ اندر بھی ہے
آتشِ گل چمن میں بھڑکنے لگے سینہ میں آتشِ دل دہکنے لگے
آنکھ سورج کی بھی کھل گئی، دعوتِ رقص بادِ سحر کو ملی اور یوں
کاروانِ سحر چل پڑا جب لیا بوسہ شبنم نے غنچے چٹکنے لگے
عابد اپنا ٹھیا آپ لیجے بدل آگے حالات کا کچھ بھروسہ نہیں
کب مصیبت کوئی آ کھڑی ہوئی آنکھ ہم سایہ کی کب پھڑکنے لگے

• محمد عابد علی عابد

ہے نکلنا گھر سے آفت دھوپ میں
مستزاد اس پر مسافت دھوپ میں
مل کر اس سے کی حماقت دھوپ میں
قرب اس کا تھا قیامت دھوپ میں
شمع کیا پگھلے گی جل کر رات بھر
جوں پگھلتی ہے یہ قامت دھوپ میں
آج دن میں آگیا وہ بام پر
اس کو سوجھی ہے شرارت دھوپ میں
دھوپ سے ہوتا ہے روشن گُل جہاں
روشنی کی ہے بشارت دھوپ میں
اُف سوا نیزے پر ہوگا آفتاب
آئے گی یعنی قیامت دھوپ میں
یاد کر اس شخص کو جس شخص نے
تھا پیا جامِ شہادت دھوپ میں
ساتھ سب کے ایک سا اس کا سلوک
کب کسے ملتی ہے راحت دھوپ میں
رات بھر کرتا رہا اختر شمار
دن ہوا عابد کا غارت دھوپ میں

صلیب و دار کی مشکل ترین ہے بھلے راہ
زمانے کے لیے ثابت ہوئی ہے مشعلِ راہ
یہ وہ جگہ ہے ہمیشہ جو رہتی ہے آباد
رکے بغیر لگاتار روز و شب چلے راہ
خوش آمدید کہے کارواں کے آنے پر
گزرنے پر کفِ افسوس کم نہیں ملے راہ
ہے آدمی کی بدولت چہل پہل ساری
ہوئی بغیر مسافر اداس شب ڈھلے راہ
چمک دمک کسی شے کی فریب ہے گویا
سراب کچھ نہیں عابد سوائے صیقل راہ

• محمد عابد علی عابد

ہرا بھرا قد و قامت درخت ایسا تھا
وہ عنفوان جوانی میں مست ایسا تھا
بشر تو تھا وہ مگر حق پرست ایسا تھا
فرازِ دار اسے تاج و تخت ایسا تھا
قدم قدم پہ نیا معرکہ تھا پیشِ نظر
تمام مرحلۂ بود و ہست ایسا تھا
ترس نہ اس کو مرے حالِ زار پر آیا
گلاب چہرہ مگر دل کا سخت ایسا تھا
کسی کو کیا پڑی تھی میرے واسطے روتا
فسانۂ شبِ غم سرگذشت ایسا تھا

بیٹھا رہتا ہے تو غمگیں گھر کے اندر کیا
دیکھے تو نے چلتے پھرتے لعل و جواہر کیا
روئے منور کے آگے ہے شفق کا منظر کیا
ماہ تاباں، لعلِ بدخشاں، انجم و اختر کیا
کام ترے آ جائے گا یہ لا و لشکر کیا
دولت، ثروت، عزت و ذلت، نوکر چاکر کیا
دین و متاع و مال کیے قربان فرازِ عشق
قرض چکائیں ہم تیرا اب جان گنوا کر کیا
رہتا ہے ماحول یہاں کا بھی ہنگامہ خیز
جلوہ گاہِ دل کے مقابل جنتر منتر کیا
ہو جاتے ہیں سارے مناظر دنیا کے مستور
آنکھ کی گیرائی کے مقابل جھیل سمندر کیا

جنوبی ہند سے دس خاص غزلیں ● محمد حنیف کاتب

مہک اٹھیں گے جنوب سارے، شمل سارے
فوصال موسم میں اب کے ہونگے نہال سارے
ہمارے حصے یہ جہد ساری، ملال سارے
تمھیں مبارک بشارتیں سب، مآل سارے
نواحِ جاں میں گلاب موسم اتر رہے ہیں
خوشا، کہ خوشبو سے ربط ہونگے بحال سارے
پڑاؤ اگلا کہاں پہ ہوگا، قیام کب تک؟
سفر سے لوٹا تو پھر سے ہونگے سوال سارے
میں آرہا ہوں، خراج لینے میں آرہا ہوں
سمندر! اپنی تہوں سے موتی نکال سارے
سر بیلاں فراق دیدوں کا جشن ہوگا
تو شامِ وحشت ملیں گے رقصاں غزال سارے
نئی رتوں کا نقیب ہوگا گلاب منظر
کہ زرد موسم پہ پھینک دینا گلال سارے

ترے نشاں تک پہنچ رہا ہوں
میں لا مکاں تک پہنچ رہا ہوں
مجھے فرشتے بلا رہے ہیں
میں آسماں تک پہنچ رہا ہوں
یہاں سے آگے تمھاری مرضی
حدودِ جاں تک پہنچ رہا ہوں
مری شکایت وہ جان لے گا
دبی زباں تک پہنچ رہا ہوں
میں ہر طرف سے سنائی دوں گا
ابھی زباں تک پہنچ رہا ہوں
جہاں تہاں سے نکل کے آؤ
میں درمیاں تک پہنچ رہا ہوں
خوشی کے نغمے سنائی دیں گے
کہ نوحہ خواں تک پہنچ رہا ہوں

● محمد حنیف کاتب

ازل ابد کے کناروں میں رنگ بھرتے ہوئے
یہ نقش نقش سنورتے ہوئے نکھرتے ہوئے
نظر اٹھاتا تو شاید میں راکھ ہو جاتا
میں سر جھکائے رہا اس سے بات کرتے ہوئے
تو اک ندی کی طرح دشت میں سنورتی ہوئی
میں ابر پارہ صفت ٹوٹے بکھرتے ہوئے
بہت رسان سے اس نے ہمیں جواب دیا
سوال ویسے تو پوچھا تھا ہم نے ڈرتے ہوئے
وہاں تو کچھ بھی نہیں خاکِ نقشِ پا کے سوا
کسی کو دیکھا تھا ہم نے وہاں اترتے ہوئے
میں ڈرتا رہتا ہوں پتھرا کے رہ نہ جاؤں کہیں
طلسم خانۂ حیرت سے یوں گزرتے ہوئے
میں درمیان میں مصلوب کر دیا گیا تھا
کئی زمانے تھے ٹھہرے ہوئے، گزرتے ہوئے
کہ کس کے ہاتھ مجھے تھامنے کو بڑھتے ہیں
مجھے یہ دیکھنا تھا ڈوبتے ابھرتے ہوئے

کسی رازداں کی معیت طلب تھے
اشارے کسی کے وضاحت طلب تھے
مریدی صفوں میں بڑی عافیت تھی
ولایت کے رتبے مشقت طلب تھے
ہمیں راس آئی نہ خلوت نشینی
ازل سے ہی ہم جیسے صحبت طلب تھے
کہاں تک کسی کی نگہداشت کرتے
کبھی گلعذاراں حفاظت طلب تھے
ادھر آن پہنچے تھے دشمن گھروں تک
ادھر یہ محافظ کہ رخصت طلب تھے
تعلق کو درکار تھی گرم جوشی
رفاقت کے لہجے، تمازت طلب تھے
پھر اپنی زمینوں کو لوٹ آنے والے
مہاجر تھے ہم، اور نصرت طلب تھے
بجز جنسِ جاں اور کیا نذر کرتے
وفا کے تقاضے سخاوت طلب تھے

● محمد حنیف کاتب

خزاں جا رہی ہے اُداسی سمیٹے
بہار آئے گی زندگانی سمیٹے
فرشتے مرے سامنے جھک گئے تھے
میں پہنچا تھا جب خاکساری سمیٹے
مرے پیچھے رہ جائے گا نور سارا
چلا جاؤں گا میں سیاہی سمیٹے
مجھے دیکھنا ، اب بھی محوِ سفر ہوں
کئی منزلوں کی اُداسی سمیٹے
پسِ پردہ کیا کیا ہوا تھا ، سنو تو
میں آیا ہوں ساری کہانی سمیٹے
ہمیں اس کنارے بلایا گیا ہے
سمندر سے کہہ دو پانی سمیٹے
میں کاتب ہوں، دیکھو اسی خانداں کی
میں لایا ہوں برکت پرانی سمیٹے

شکست خوردہ قبیلے کا ترجمان ہوں میں
گذشتہ جنگ سے اب تک لہولہان ہوں میں
میں کب سے بول رہا ہوں بھٹکتی روحوں سے
یہاں قیام کرو ، آخری مکان ہوں میں
اُبل اُبل کے میں ہر سمت پھیل جاؤں گا
بہت دنوں سے کناروں کے درمیان ہوں میں
ریاستیں تو کبھی کی خیال وخواب ہوئیں
نمائشی ہی سہی ، اب بھی حکمران ہوں میں
اُبھرتی ڈوبتی لہروں میں ڈھونڈنا مجھ کو
جہاں سے پار ہے کرنا، وہی نشان ہوں میں
خدا کرے کہ تمھارا یقین بن جاؤں
ابھی ہوں وہم کی صورت، ابھی گمان ہوں میں
نہ عطر بیز ہوائیں نہ آگ کے شعلے
ابھی تو مجھ کو لگے ہے کہ درمیان ہوں میں
اگر زبان میں کھولوں تو سب کی پول کھل جائے
مغالطے میں نہ رہنا کہ بے زبان ہوں میں

● محمد حنیف کاتب

ہماری بے گناہی پر بھلا کیا خاک لکھا ہے
ہماری سنگساری کو اذیت ناک لکھا ہے
جو تھا انمول گہرے پانیوں میں سب سلامت ہے
کنارے تک فقط پہنچا خس و خاشاک لکھا ہے
اسے تم گنگنانا شہر کی آباد گلیوں میں
ترانہ اک سرِ صحرائے وحشت ناک لکھا ہے
متن کی تو بہت محتاط اسلوبِ نگارش تھی
حواشی میں جو لکھا ہے بہت بیباک لکھا ہے
رتوں کی پیشگوئی اب کے دیواروں پہ ہے تحریر
جو آنے والے موسم ہیں انھیں سفاک لکھا ہے
کیا کیا نہ ہمیں بخشا اس دستِ ستمگر نے
ہم دیدۂ گریاں کی دولت بھی اٹھالائے

ہم دشت نوردی کی برکت بھی اٹھالائے
گھر لوٹے تو صحرا کی وسعت بھی اٹھالائے
ہم طور سے لوٹے تو تا حشر جھلنے کو
انکار کے شعلوں کی حدت بھی اٹھالائے
سنتے ہیں وہاں اب تو بس خاک ہی اڑتی ہے
دیوانے تو صحرا سے وحشت بھی اٹھالائے
! نیرِ شرکتِ غیرے کبھی سب کچھ ہمارا تھا
کہ رفتہ رفتہ گروی ہو گئے املاک لکھا ہے
بازارِ تمنا میں ، کیا خوب کیا سودا
بیچا بھی نہیں خود کو، قیمت بھی اٹھالائے
اس شہرِ ملامت سے ، نصرت نہ ملی ہم کو
اس بار جو لوٹے تو ، ہجرت بھی اٹھالائے
پھولوں کی زیارت سے جب جی نہ بھرا کاتب
رنگت بھی چرا لائے ، نکہت بھی اٹھالائے

● محمد حنیف کاتب

نا دیدہ آہٹوں کا جہاں بولتا رہا
مردہ سماعتوں میں لہو ڈولتا رہا
اک جان کہ جانکنی کی سزا جھیلتی رہی
اک درد زندگی کا بھرم کھولتا رہا
کیا کیا جتن سے خود کو سمیٹا، ہوا طلوع
کوئی پرت پرت مجھے شب کھولتا رہا
پرچھائیں تھی کہ چشم زدن میں گزر گئی
اک عکس آئینے میں سدا ڈولتا رہا
عہد وفا کے باب میں حجت تمام کی
بہروں کی انجمن تھی مگر بولتا رہا

یہ معجزہ ہی سہی ، اب کی بار ہو جائے
غریب شہر کوئی شہریار ہو جائے
مری زمین پہ اتریں گلوں کے پیغمبر
یہ ریگ زار مرا لالہ زار ہو جائے
تمام عمر کی آشفتگی کو چین ملے
وہ بے نیاز اگر بے قرار ہو جائے
دھنک کے ساتھ سروں پر میں رقص کرتا رہوں
وہ رنگ مجھ پہ اگر آشکار ہو جائے
یہ دل علاقہ اسے گھیر گھار کر رکھو
کوئی عدو نہ کہیں دعویدار ہو جائے
ہمارے بیچ نیا کوئی رابطہ نہ سہی
پرانا ربط کہیں استوار ہو جائے

● جمال اُویسی

تار و پودِ زندگی میں کھو گیا ہوں
تیرگی میں روشنی میں کھو گیا ہوں
ڈھونڈنے نکلا تھا سورج کا ٹھکانہ
میں ستاروں کی گلی میں کھو گیا ہوں
اک خدا کی جستجو کرنے چلا تھا
جلوہ ہائے بندگی میں کھو گیا ہوں
میں غبارِ روز و شب کا استعارہ
زیست کی لا حاصلی میں کھو گیا ہوں
احمد الاحمد کہیں گم ہو گیا ہے
میں ہجومِ آدمی میں کھو گیا ہوں

کیسا محشر سرِ انساں میں ہے
ہر طرف شور شبستاں میں ہے
کوئی سمجھے بھی تو کیسے سمجھے
میں ہوں چُپ نالہ گریباں میں ہے
کیوں نظر آتے ہیں منظر ویراں
عیب کچھ دیدۂ انساں میں ہے
عاجلہ کہتی ہے دُنیا خود کو
عافیت کلبۂ احزاں میں ہے
کیسے ممکن ہو علاجِ بیمار
چارہ گر عالمِ نسیاں میں ہے

شکیل اعظمی

مرے گلبدن کسی شام آ مجھے نیند دے مجھے خواب دے
بڑی خاردار مری رات ہے مرے بستروں کو گلاب دے
ترے درد و غم کا اسیر میں تری چاہتوں کا فقیر میں
مجھے ہجر بھی بے شمار دے مجھے وصل بھی بے حساب دے
مرے پاس ہیں جو سیاہیاں تری روشنی میں انڈیل دوں
کروں آج ایسا گناہ میں کہ خدا بھی مجھ کو ثواب دے
تجھے کھول دوں میں ورق ورق کروں یاد تجھ کو سبق سبق
لکھوں عشق میں پڑھوں عشق میں مجھے عاشقی کی کتاب دے
کسی روز مجھ کو پکار کے ذرا توڑ دے یہ خموشیاں
مری آنکھ میں جو سوال ہیں کبھی آ کے ان کا جواب دے
میں نظر نظر ترا منتظر میں نفس نفس ترا منتشر
مرے ساتھ تو کوئی صبح کر مرے رتجگوں کا حساب دے
میں تری تڑپ کی پیاس میں ترے پاس ہی کہیں دفن ہوں
کبھی حور بن کے اٹھا مجھے مری تشنگی کو شراب دے

وہ چاہتوں کے سمندر وہ پیاس پیاس بدن
ملے تو آج بہت خوش تھے وہ اُداس بدن
فضا میں چاروں طرف اک نشہ سا پھیلا تھا
زمانے بعد ملے تھے بدن شناس بدن
پگھل کے سونے کی اک تہہ جمی تھی کمرے میں
چمک رہا تھا اندھیرے میں بے لباس بدن
ہوا میں گھل کے مہکنے لگا تھا سانسوں میں
سحر کی اوس میں بھیگا ہوا وہ گھاس بدن
کہیں جو بانہوں میں آئے تو آگ لگ جائے
وہ انگلیوں میں پھسلتا ہوا کپاس بدن
وہ چار پیگ کی مستی وہ خواہشوں کا خمار
وہ رقص کرتے ہوئے میرے آس پاس بدن
ہمارے ہونٹ بھی سیراب ہو گئے اک دن
چھلک رہا تھا بہت بھر کے وہ گلاس بدن
زبان پھیروں تو اب بھی لہو مچلتا ہے
لبوں پہ چھوڑ گیا تھا کبھی مٹھاس بدن
نشے میں ایک ہی حمام کے ہوئے سارے
نگاہِ عام سے کھلنے لگے تھے خاص بدن

• شکیل اعظمی

گلوں سے عشق پرندوں سے دوستانہ کیا
لگاؤ جس سے کیا ہم نے والہانہ کیا
شجر سے گر کے شجر کے تلے پڑے تھے ہم
اُڑا کے ہم کو ہواؤں نے بے ٹھکانہ کیا
یہ کیا سفر ہے گزرتے ہی جا رہے ہیں ہم
ترے خیال نے ہم کو کہاں روانہ کیا
سفر میں رختِ سفر باندھ کر نہیں نکلے
جہاں پہ ٹھہرے وہیں ہم نے آب ودانہ کیا
کھڑے تھے جس کیلئے دیر سے قطار میں ہم
کلام اس نے کیا بھی تو بے رُخانہ کیا
ہمارے نام سے منسوب ہوگئی وہ گلی
کہ جس گلی میں بہت ہم نے آنا جانا کیا
اس انتظار کی مدّت تو چند روزہ تھی
بڑھا کے ہم نے مگر اس کو اک زمانہ کیا

کئی آنکھوں میں رہتی ہے کئی بانہیں بدلتی ہے
محبت بھی سیاست کی طرح راہیں بدلتی ہے
عبادت میں نہ ہو گر فائدہ تو یوں بھی ہوتا ہے
عقیدت ہر نئی منت پہ درگاہیں بدلتی ہے
نہ اک سا آب ودانہ ہے نہ کوئی اک ٹھکانہ ہے
مسافر کی تھکن ہر شب پنہ گاہیں بدلتی ہے
ہزاروں منزلیں آئیں، مگر ٹھہرا نہیں ہوں میں
عجب اک جستجو ہے جو گزرگاہیں بدلتی ہے
اُگے ہیں بستیوں میں جو وہ سب جنگل ہمارے ہیں
ہوائے شہر بھی، جس وقت ہم چاہیں، بدلتی ہیں

● مدن موہن دانش

کوئی سمجھوتہ اب کے ہوگیا کیا
اکیلا پڑ گیا ہے مدعا کیا
ہوا پازیب پہنے آرہی ہے
کہیں بارش کا موسم آگیا کیا
نئے منظر ابھرتے جارہے ہیں
کسی نے رنگ پہنا ہے نیا کیا
فلک سے روٹھ کر دیکھیں کسی دن
اترتا ہے کوئی پھر معجزہ کیا
وہ جس نے ڈھائی اکھر پڑھ لیے ہیں
اسے پھر ابتدا کیا، انتہا کیا
اسی جنگل کے باشندے ہو دانش
یہاں سے بند ہے ہر راستہ کیا

جب بھی کوئی چہرہ چہرہ ہو جاتا ہے
منظر منظر آئینہ ہو جاتا ہے
رات کہانی میں مرنے والا کردار
دن ہوتے ہی کیوں زندہ ہو جاتا ہے
اپنے اندر بستی بھی ہے جنگل بھی
اسی لیے گم ہر رستہ ہو جاتا ہے
مالی چاہے کتنا بھی چوکنا ہو
پھول اور تتلی میں رشتہ ہو جاتا ہے
گلشن گلشن بن جانے کی خواہش میں
دھیرے دھیرے کب صحرا ہو جاتا ہے
دنیا اک جادوگرنی ہے دانش جی
جھوٹا پل بھر میں سچا ہو جاتا ہے

● مدن موہن دانش

میں خود سے کس قدر گھبرا رہا ہوں
تمھارا نام لیتا جا رہا ہوں
گزرتا ہی نہیں ہے ایک لمحہ
ادھر میں ہوں کہ بیتا جا رہا ہوں
زمانے! اور کچھ دن صبر کر لے
ابھی تو خود سے دھوکے کھا رہا ہوں
بڑھا دے لَو ذرا تنہائیوں کی
شبِ فرقت میں بجھتا جا رہا ہوں
اسی دنیا میں جی لگتا تھا میرا
اسی دنیا سے اب گھبرا رہا ہوں
یہ نادانی نہیں تو کیا ہے دانشؔ
سمجھتا تھا جسے سمجھا رہا ہوں

ہم اپنے دکھ کو گانے لگ گئے ہیں
مگر اس میں زمانے لگ گئے ہیں
کسی کی تربیت کا ہے کرشمہ
یہ آنسو مسکرانے لگ گئے ہیں
کہانی رخ بدلنا چاہتی ہے
نئے کردار آنے لگ گئے ہیں
یہ حاصل ہے مری خاموشیوں کا
کہ پتھر آزمانے لگ گئے ہیں
یہ ممکن ہے کسی دن تم بھی آؤ
پرندے آنے جانے لگ گئے ہیں
مرا بچپن یہاں تک آ گیا ہے
مرے شانوں سے شانے لگ گئے ہیں
جنھیں ہم منزلوں تک لے کے آئے
وہی رستہ بتانے لگ گئے ہیں
شرافت رنگ دکھلاتی ہے دانشؔ
کئی دشمن ٹھکانے لگ گئے ہیں

• شکیل احمد شکیل

ہوا غبار نکالے گی سو بہانے سے
ہماری خاک لگا دی گئی ٹھکانے سے
غزل کی آگ اٹھا لائے میرؔ خانے سے
نیا چراغ جلاتے رہے پرانے سے
چہار سمت سے پرچھائیوں نے گھیر لیا
بڑا خسارہ ہوا روشنی میں آنے سے
میں اس کے خواب ابھی دیکھ بھی نہ پایا تھا
وہ میری نیند اُڑا لے گیا سرہانے سے
بہت دنوں سے میں اپنے ہی ساتھ رہتا ہوں
زمانہ ہو گیا بچھڑے ہوئے زمانے سے
بڑے ہنر سے بُنی ہے غزل جُلاہے نے
نکل نہ پاؤ گے لفظوں کے تانے بانے سے
جو شعر دل میں اترتا ہے پیش کرتے ہیں
شکیلؔ ہم کو غرض کیا نئے پرانے سے

آنکھوں سے جب اُتار دی عینک غرور کی
ہر چیز ہم نے دیکھ لی نزدیک و دور کی
وحشت کدوں پہ عقل نے قبضہ جما لیا
دیوانگی نے اوڑھ لی چادر شعور کی
مایوسیوں کو پاس پھٹکنے نہیں دیا
اتنی تو زندگی نے رعایت ضرور کی
کس نے کہاں سے کیسے فسانہ بنا دیا
ہم نے تو جو بھی بات کی تیرے حضور کی
چلیے کسی درخت کے سائے میں بیٹھ کر
زنجیر کھولتے ہیں درِ لا شعور کی
ساری تکان اوڑھ کے سو جایئے شکیلؔ
اک روز تو جگائے گی آواز طور کی

● شکیل احمد شکیل

غم کی تلخی چشمِ تر تک آ گئی
یہ ندی ختمِ سفر تک آ گئی
ایک شب گزری تھی کم ظرفوں کے ساتھ
اگلے دن رسوائی گھر تک آ گئی
زندگی کی شام بھی ہو جائے گی
عمر یوں بھی دو پہر تک آ گئی
ہم سے بدظن تھیں ہوائیں اس لیے
ٹھوکروں کی خاک سر تک آ گئی
بحث اپنی آخری منزل میں ہے
گفتگو لیکن نگر تک آ گئی
اک غزل ہم نے بھی کہہ ڈالی شکیلؔ
بات جب اپنے ہنر تک آ گئی

دل کے پُرزے آسمانوں میں اُڑانے کے لیے
پھر ہوا پاگل ہوئی پاگل بنانے کے لیے
دیکھیے ہونٹوں سے میرے قہقہہ مت چھینئے
اک یہی پردہ بچا ہے غم چھپانے کے لیے
ہم نے پھر بے خوف ہو اعلان حجت کر دیا
ہم نے پھر مشکل کھڑی کر دی زمانے کے لیے
جل رہی ہے رات اب تو خواب کا در کھولیے
کتنے چہرے منتظر ہیں آنے جانے کے لیے
جانے کتنے سورجوں سے جنگ کرنی ہو مجھے
ایک تیری مانگ میں تارے سجانے کے لیے
شہر والو! تم نے ہم کو اپنے جیسا کر دیا
گاؤں سے آئے تھے دو روٹی کمانے کے لیے

• ڈاکٹر افضال عاقل

عکسِ اُمّید نگاہوں میں اتر تو آیا
صحنِ ظلمات میں اک چاند نظر تو آیا
فکر کی چھاؤں میں رہرؔ و کو ٹھہرنے کے لیے
خیر سے راہ میں اک ایسا شجر تو آیا
بہہ گیا سیلِ حوادث میں وجود اپنا مگر
بعد سیلاب ستاروں کا نگر تو آیا
دشمنوں کو بھی گلے ہنس کے لگا لیتا ہے
لے کے پیغامِ وفا ایسا بشر تو آیا
آخری وقت میں بیمار کی پرسش کے لیے
ایک پل کو ہی سہی وہ مرے گھر تو آیا
سنگ ساروں میں وہ آئینہ بنا بیٹھا ہے
آئینہ داری کا بے باک ہنر تو آیا
حوصلہ ہنس کے بڑھاتا ہے جہادِ غم میں
ایسا اک شخص مقدر سے نظر تو آیا
سُن کے حالاتِ زبوں وہ بھی تڑپ اٹھتے ہیں
دلِ ناداں کو تڑپنے کا ہنر تو آیا
مقتلِ عشق سے ناکام نہ لوٹا عاقلؔ
زندگانی میں میری، کام یہ سر تو آیا

کبھی صورت کبھی چاہت نظر میں بیٹھ جاتی ہے
ہمیشہ دلبری میرے ہی گھر میں بیٹھ جاتی ہے
کبھی تتلی کبھی بھونرے شرر سے خوف کھاتے ہیں
مگر یہ روشنی جگنو کے پَر میں بیٹھ جاتی ہے
خود اپنی ہی نظر میں ایک دن ہوتا ہے وہ رُسوا
ہَوس جب بھی بہ نامِ شوق سر میں بیٹھ جاتی ہے
سجا کر یاد کے زیور جو تجھ پر ''شعر کہتا ہوں''
تو مجبوری مری آنکھوں کے دَر میں بیٹھ جاتی ہے
نہ وہ گھر ہے، نہ وہ دَر ہے نہ شام و سحر لیکن
تمھاری یاد رہ رہ کر کھنڈر میں بیٹھ جاتی ہے
ہے کوئی بات تو عاقلؔ ضرور ایسی کہ محفل میں
''مظفر کی غزل چشمِ ہنر میں بیٹھ جاتی ہے''

● کے۔ایم۔اشفاق الرحمٰن مظہر

کچھ تجرباتِ زیست کو مرقوم بھی کیا
جو روبرو نہ کہہ سکے منظوم بھی کیا

رشتوں کے درمیان دراڑیں سی ڈال کر
دنیا نے ہم کو پیار سے محروم بھی کیا

تقدیر کا لکھا ہی سمجھ کر اُٹھائے غم
اک غم تمھارے نام سے موسوم بھی کیا

کچھ پل ہنسی خوشی کے بھی لائی تھی زندگی
لیکن کبھی کبھی ہمیں مغموم بھی کیا

گھر کے معاملات سے انجان بھی رہے
کیا ہو رہا ہے شہر میں معلوم بھی کیا

ترجیح اپنی بات پہ اَوروں کو دی سدا
کتنی ہی خواہشات کو معدوم بھی کیا

منوائی اپنی بات بھی مظہؔر نے اس طرح
ہر دل کو میٹھے بول سے محکوم بھی کیا

ان کے تحفظات ذرا مختلف بھی تھے
اربابِ فکر کچھ تو مرے معترف بھی تھے

اب دیکھنا ہے کس کی دعا رنگ لائے گی
صف میں گنہگار بھی کچھ معتکف بھی تھے

کوئی نہ بھید پا سکا حق کے کلام کا
حرفِ مقطعات کہاں منکشف بھی تھے

تقلید کے سوا مری، کچھ راستہ نہ تھا
کچھ متفق تھے مجھ سے تو کچھ منحرف بھی تھے

ویسے بھی ہم کہاں ہیں توجہ کے مستحق
لیکن جو بے نیاز تھے اب منعطف بھی تھے

اک عام شخص کی طرح مظہؔر تھے ہم وہاں
پھر بھی ہر ایک فرد سے کچھ مختلف بھی تھے

● طارق متین

وہ دن بھی خوب تھے جاناں تجھے نہارتے تھے
ہم اپنا وقت لبِ آبجو گزارتے تھے
ہمارا حوصلہ دیکھا ہے ساری دنیا نے
ہم اپنی کشتیاں گرداب میں اتارتے تھے
ہماری ساری دعائیں قبول ہوتی تھیں
خدائے پاک کو جب دل سے ہم پکارتے تھے
پرانے لوگوں کی عظمت کا ماجرا ہے یہی
وہ اپنے آپ کو کردار سے سنوارتے تھے
کہ بے سبب تو نہیں تھی سکون کی دولت
ہم اپنی خواہشِ بیجا کو پہلے مارتے تھے
خدا کے فضل سے اتنا یقین تھا خود پر
کہ جنگ لڑتے تھے لیکن کبھی نہ ہارتے تھے
یہ سب تو عہدِ گذشتہ کی بات ہے طارقؔ
غزل کے شعر کو استاد جی نکھارتے تھے

مانا کہ مصیبت کی گھڑی کم تو نہیں ہے
دنیا مری آتش کدۂ غم تو نہیں ہے
ٹوٹا ہوں مگر ٹوٹ کے بکھرا تو نہیں ہوں
اندھیر ہے اندھیر کا ماتم تو نہیں ہے
اک لمحۂ عشرت ہی سہی ہے تو میسّر
یہ درد جو سینے میں ہے پیہم تو نہیں ہے
گھر کے در و دیوار پہ رونق نہیں لیکن
یہ شمعِ قناعت مری مدھم تو نہیں ہے
اس دل میں دہکتے ہوئے زخموں کا مداوا
آنکھوں سے ٹپکتی ہوئی شبنم تو نہیں ہے
یہ عیش کی دنیا ہو مبارک تمھیں طارقؔ
ہر چیز ہے آسودگیِ غم تو نہیں ہے

● اشرف عادل

پیار کو تقسیم کرنا چاہتا ہوں
کچھ نئے رشتوں میں بٹنا چاہتا ہوں
دوستی سانپوں سے کرنا چاہتا ہوں
میں چھپے مخزن کو پانا چاہتا ہوں
بدمزاجی کی مری یہ انتہا ہے
جھیل خشکی میں بدلنا چاہتا ہوں
کانچ کے انسان کا ممنون ہوں میں!
ہو بہو پتھر میں ڈھلنا چاہتا ہوں
دُور تک پھیلے ہوئے ہیں میرے سائے
ذات میں اپنی سمٹنا چاہتا ہوں
خودنمائی سے مری ہے تنگ دل بھی
راستے سے من کے ہٹنا چاہتا ہوں
اک جہاں آباد ہے انساں کے اندر
ذات میں میں اپنی بھٹکنا چاہتا ہوں

سمندر کی پناہوں میں فقط پانی ہے اور کیا ہے؟
چھلکتی پیاس کی ساحل پہ دَربانی ہے اور کیا ہے
میسّر گُل کو کانٹوں کی نگہبانی ہے اور کیا ہے
جوانی طائرِ بسمل کی دیوانی ہے اور کیا ہے
ہمارا میزباں رشتے میں لاثانی ہے اور کیا ہے
کہیں گُل کی کہیں کانٹے کی مہمانی ہے اور کیا ہے
ترانے خوف کے گاتا رہا صیاد بھی گُل بھی
چمن میں باغباں بھی ایک زندانی ہے اور کیا ہے
ہرے پتوں کی قسمت میں ہے گرجانا بکھر جانا
ہمارے موسموں کی تنگ دامانی ہے اور کیا ہے
ہمارے سلسلے ملتے رہے یہ کس قلندر سے
ہماری مشکلوں میں ایک آسانی ہے اور کیا ہے
ہمارے قول میں سیلاب ہے عادلؔ صداقت کا
ہماری بات میں خوشبو کی طغیانی ہے اور کیا ہے

اصغر شمیم

مجھ سے وہ روٹھا ہوا ہے کچھ نہ کچھ تو بات ہے
دل میں اس کے کیا چھپا ہے کچھ نہ کچھ تو بات ہے
جس کو دیکھو جا رہے ہیں سب پہاڑوں کی طرف
پتھروں میں کیا دبا ہے کچھ نہ کچھ تو بات ہے
دھول اُڑتی جا رہی ہے اک مسافر بھی نہیں
قافلہ آیا گیا ہے، کچھ نہ کچھ تو بات ہے
کل رئیسِ وقت تھا جو آج وہ کنگال ہے
خود ہی وہ ایسا ہوا ہے کچھ نہ کچھ تو بات ہے
جو مکیں تھے شہر کے سب اپنے گھر میں چھپ گئے
کیا کوئی فتنہ جگا ہے کچھ نہ کچھ تو بات ہے

کیا کوئی جھونکا چلا ہے سن ذرا
پتا پتا جھومتا ہے سن ذرا
ہر گلی نکڑ پہ ہے کیسی صدا
کیا وہ کوئی سر پھرا ہے سن ذرا
میں اگر خاموش بیٹھا ہوں یہاں
خامشی بھی اک صدا ہے سن ذرا
آپ کا آنا بڑی مدّت کے بعد
خواب سا لگنے لگا ہے سن ذرا
تو بھٹک جائے گا اصغرؔ دیکھنا
شہر یہ بالکل نیا ہے سن ذرا

● کلیم اختر

معجزہ دل کا ہے یارب یا خیال آباد کا
یوں ہی غم آباد ہے ہر شیریں وفرہاد کا

یہ برستی آگ، یہ شعلہ سرِ بازار کا
کاش ہوتا خیمۂ دل آہن و فولاد کا

تیشۂ تدبیر سے کب سر ہوا ہے جوئے شیر
حوصلہ پیدا کرو اے عاشقو! فرہاد کا

ہر طرف سے آگ اُگلتا ہے یہاں "سنگِ زغال"
کیا سناؤں حالِ غم جھریا سے اب دھنباد کا

دونوں نے مل کر کیا شعر وادب میں شوروغل
ایک دلّی کا ادیب اور ایک الٰہ آباد کا

اک وہابِ اشرفی تھا صاحبِ نقد ونظر
دیکھتے ہیں کون ہے اب سَرِعظیم آباد کا

کھیلو گے موجِ غم سے تو گرداب آئے گا
دشوار شاعری میں "خیال آب" آئے گا

اس ساغرِ سفال سے اب دل اُچٹ گیا
کب شیشۂ نفیس میں "تلخاب" آئے گا

وہ کشتیِ عظیم نہیں، نوح بھی نہیں
اور جان کو ہے خوف کہ سیلاب آئے گا

آنکھوں کی رہ سے قلب وجگر تک اُتر گئے
شہرِ سکوں میں پھر کوئی سیلاب آئے گا

آنکھوں کو یوں ہی گریۂ شبنم سے فائدہ؟
نیند آئے گی، تم آؤ گے، شب خواب آئے گا

سخنوری گو، مذاقِ سخن میں کی جائے
بدن کی بات بہ طرزِ ثمن میں کی جائے
نظر بھی آئے کہ مثلِ مہ و نجوم کبھی
یوں، زرنگاری ترے پیرہن میں کی جائے
خطا کہ جرم میں تبدیل ہو بھی سکتی ہے
وہی، جو بارہا دیوانے پن میں کی جائے
روایتوں کو نبھانا بھی تو ضروری ہے
کبھی تو گفتگو طرزِ کہن میں کی جائے
کوئی بھی بات ہو دل میں، بیاں نہ کرنا ہے
ہو جستجو جو کوئی من ہی من میں کی جائے

● نثار احمد نثار

بھائیوں کے لیے

نہ اپنے قابو میں ہی ہیں تو کس کے بس میں ہوئے
اسیرِ شاہ، پس و پیش، پیش و پس میں ہوئے
بہت دنوں پہ ہی دریافت ہو گئے خود کو
بڑے جتن پہ تو ہم اپنی دسترس میں ہوئے
ہم آخرش تو کمندِ نکہہ کی زد میں ہیں
کہ صید ہم بھی پسِ پردۂ قفس میں ہوئے
موافقت نہ ہوئی تو یہ جاں رہے گی نہیں
تنازعے جو رگ و ریشہ و نفس میں ہوئے
کہ جس کی آرزو کی تھی کئی برس پہلے
ہوئے حصول وہ لمحے پہ اس برس میں ہوئے
کجا، نہیں نہ ضرورت ہے نکہۂ باصر
کہ منہمک ہم اگر نکتۂ نسب میں ہوئے

● نثار احمد نثار

جس کو دیکھا نہ کبھی ہے، اسے دیکھا جائے
جو کہ سوچا نہیں، پہلے وہی سوچا جائے
میری چاہت پہ کوئی شبہہ اگر ہے تو سنو
تیرے انداز سے ہی اب تمھیں چاہا جائے
اس جگہ کوچہ، مرے دشمنِ جانی کا بھی ہے
جتنی جلدی ہو یہاں سے کہیں نکلا جائے
سلسلہ جانے کا آغاز نہ ہو پایا ابھی
آنے والا ہے کہ آتا ہے تو آتا جائے
کچھ بھی ہو جائے پہ افسوس نہ کرنا ہے مجھے
جو بھی ہونا، نہیں ہونا ہے وہ ہوتا جائے
میرا ہونا یہاں کس کس کو گراں لگتا ہے
ایک اِک شخص سے اس بارے میں پوچھا جائے
رات بھی بیت چکی آدھی، کہ سونے دیجیے
میری درخواست ہے اب اور نہ چھیڑا جائے

•

جزا کسی کو نہیں تو سزا کسی کو نہیں
دعا کسی کو نہیں بد دعا کسی کو نہیں
خیال چھوڑ دو صحرا میں گُل کھلانے کا
یہ اختیار خدا کے سوا کسی کو نہیں
ہم اک مقام پہ بے رابطہ رہے یوں بھی
سنا کسی کی نہیں، کچھ کہا کسی کو نہیں
نوائے خود تو مقید ہے دل کے اندر ہی
سنائی دے گی یہ صوت و صدا کسی کو نہیں
ہیں اس زمانے میں تو خود پسند ایسے بھی
لیا کسی سے نہیں کچھ دیا کسی کو نہیں
ابھی نظامِ زمیں سے میں روشناس نہیں
ابھی میں جانتا، پہچانتا کسی کو نہیں
نثارؔ، دل کے دَروں خوئے منصفی بھی ہے
نظر تو آئے مرا خوں بہا کسی کو نہیں

● حفیظ انجم کریم نگری

اس نے میرا ساتھ دیا حیرانی تک
یعنی میرے ساتھ رہا طغیانی تک
روکا ٹوکا کچھ بھی نہیں اندھا سورج
ساتھ رہا وہ ساری کارستانی تک
پیاس بجھانا تیری، میرا کام نہیں
میرا کام تھا لے آنا بس پانی تک
حسن کی سرمستی نہ رہے گی دیوانے!
سیل رہے گا عمر کا یہ بھی جوانی تک
دل سے دل کے رشتے ناطے ٹوٹ گئے
نوبت آپہنچی ہے کھینچا تانی تک
بچ کر رہنا تیر نظر سے سیکھ ذرا!
جیتے جی نہ مانگے گا تو پانی تک
انجم وہ بھی کرنے لگا ہے سب کا علاج
جسمانی روحانی اور شیطانی تک

آندھیوں کا زور ہے، اب مت سفر کی سوچنا
پھول پھل جس پر لگے ہیں اس شجر کی سوچنا
ہم فنا ہو جائیں گے پھر لوٹ کر کب آؤ گے!
ہجر میں بیتاب ہیں دیوار و در کی سوچنا!
کیوں سلگتی زندگی ہے وقت کی دہلیز پر!!
کیوں سسکتی روشنی ہے اپنے گھر کی سوچنا
ناخدا ہے، بادباں ہے، ہاتھ میں پتوار ہے
ناؤ اور ساحل کی سوچو، پھر بھنور کی سوچنا
اک دہکتا ہے شرارہ، ایک ٹھنڈی روشنی!
کیوں فلک پر ہیں جڑے شمس و قمر کی سوچنا

● نواب آرزو

بظاہر جو نظر آتے ہیں سچ اکثر نہیں ہوتے
سُراب، ہوتے ہیں صحرا میں مگر ساگر نہیں ہوتے
بناتے ہیں ہمارا آشیانہ کتنی محنت سے
خدا جانے اُنھی مزدوروں کے کیوں گھر نہیں ہوتے
یہ اَن سلجھی پہیلی ہے عجب ہے کھیل قدرت کا
کبھی آنکھیں نہیں ہوتیں، کبھی منظر نہیں ہوتے
وہ اکثر جاگتے رہتے ہیں اپنے شیش محلوں میں
جنھیں نیند آتی ہے اُن کے لیے بستر نہیں ہوتے
نوابؔ ہے، جس میں جتنا ظرف وہ خاموش رہتا ہے
یہاں اُڑتے ہیں وہ پنچھی کہ جن کے پَر نہیں ہوتے

تھی خیالوں میں روانی دور تک
بہہ گیا آنکھوں سے پانی دور تک
میں کہاں تنہا تھا میرے ساتھ ساتھ
چل رہی تھی اک کہانی دور تک
وہ مری آنکھوں میں گھلتا ہی رہا
رُخ پہ تھی اُس کی نشانی دور تک
کارخانوں سے اٹھا کالا دھواں
کھل اٹھی راتوں کی رانی دور تک
شہر خاموشاں کسے آواز دیں
جاگتی ہے بے زبانی دور تک
بھیگی پلکوں میں چھپا لایا نوابؔ
گاؤں کی وہ رُت سہانی دور تک

● نواب آرزو

نیند پوری ہو گئی ہے کیا کریں
دن کٹے گا کس طرح سوچا کریں
چائے کی پیالی بھی ہے اخبار بھی
ہر خبر کے ساتھ کچھ چرچا کریں
کپکپاتی سردیوں کی دھوپ میں
جی یہ چاہے دیر تک بیٹھا کریں
وقت بدلا ہے تو بدلی سوچ بھی
ہم بھی بدلیں اور کچھ اچھا کریں
عمر کا اک دن چُرا کر لے گیا
ڈوبتے سورج کو کیوں دیکھا کریں

سیدھی سچّی بات کہوں گا سیدھی سادی بولی میں
تن جھومیں گے من بھیگیں گے لفظوں کی اس ہولی میں
ٹی وی ویڈیو گیم نے دادی ماں کے قصّے چھین لیے
آج کے بچّے کیا جانیں کیا مزہ تھا آنکھ مچولی میں
دولت شہرت رُتبہ حاصل کرتے کرتے بکھر گئے
بڑے محل میں نیند نہیں ہے کتنا سکوں تھا کھولی میں
اِس درگاہ سے اُس مندر تک ٹیک رہے ہو تم ماتھا
کاش پلٹ کر دیکھا ہوتا اپنی ماں کی جھولی میں
سچ کہتا ہوں بندۂ من کے کام بھی کُھل جاتے ہیں نواب
قلم میں جو آواز ہے وہ آواز نہیں ہے گولی میں

● احمد صغیر صدیقی [پاکستان]

آہستہ ، باخرام میرا
تھا دور بہت مقام میرا
بدلا نہ فریبِ آگہی سے
پختہ تھا خیالِ خام میرا
جاتے ہو جو باغ میں تو لے جاؤ
پھولوں کے لیے سلام میرا
دنیا اِسے گھر سمجھ رہی ہے
اک دشتِ میل ہے قیام میرا
ہیں عشق کے جو یہ رنگ اتنے
اس مَد میں بہت ہے کام میرا
ہوتا ہوں شروع میں وہیں سے
ممکن نہیں اختتام میرا

● افروز عالم [کویت]

حواس باختہ پھولوں کی انجمن ہوکر
بہار آئی ہے اب کے برس چبھن ہوکر
امیدِ صبح کے سائے میں سانس بھاری ہے
حیات موت سے ملتی ہے طعنہ زن ہوکر
نہ خواہشوں پہ بھروسہ، نہ حوصلے پہ یقیں
کھڑا ہوں آج یہاں ریت کا بدن ہوکر
اصول زیست کے خود ہی کبھی بنا نہ سکے
اُداس رات میں رہتے ہیں خستہ تن ہوکر
ترے خیال کے جگنو مرے خضر ٹھہرے
لپٹ گئے ہیں مرے تن سے پیرہن ہوکر
انھی سے ہوش کے عالم میں جان باقی ہے
جو دائیں بائیں کھڑے ہیں یہ پُرفتن ہوکر

● افروز عالم [کویت]

حصارِ دید میں روئیدگی معلوم ہوتی ہے
تو کیوں اندیشۂ تشنہ لبی معلوم ہوتی ہے
ستارے مثلِ جگنوزاسیے میں رقص کرتے ہیں
ذرا سی دیر میں کچھ روشنی معلوم ہوتی ہے
جہاں پر ایک جوگن مست ہوکر گنگناتی ہے
اسی ساحل پہ اک گرتی ندی معلوم ہوتی ہے
ستاتی ہے تمھاری یاد جب مجھ کو شبِ ہجراں
مجھے خود اپنی ہستی اجنبی معلوم ہوتی ہے
تمھارے لمس کو میں جب کبھی محسوس کرتا ہوں
بہت ہلکی سہی اک روشنی معلوم ہوتی ہے
فنا ہونا اندھیری رات کی تقدیر ہے عالمؔ
مجھے یہ بے بسی بھی زندگی معلوم ہوتی ہے

جگا جنوں کو ذرا نقشۂ مقدر کھینچ
نئی صدی کوئی کربلا سے باہر کھینچ
میں ذہنی طور پہ آوارہ ہوتا جاتا ہوں
مرے شعور مجھے اپنی حد کے اندر کھینچ
نئی زمین لہو کا خراج لیتی ہے
دیارِ غیر میں بھی خوشنما سا منظر کھینچ
اُداس رات میں تارے گواہ بنتے ہیں
رگِ حباب سے تو قاتلانہ خنجر کھینچ
ابھی ستاروں میں باقی ہے زندگی کی رمق
کچھ اور دیر ذرا نرم گرم چادر کھینچ
وجودِ شہر تو جنگل میں ڈھل چکا عالمؔ
اب اس جگہ سے مجھے جانبِ سمندر کھینچ

● افروز عالم [کویت]

جگر کو خون کیے، دل کو بے قرار ابھی
بھٹک رہے ہیں ترے عشق میں ہزار ابھی
اسی لیے تو یہ دنیا ڈھلی ڈھلی سی لگے
ترے فراق میں روئے ہیں زارزار ابھی
ادائے خار سے گلشن کی بڑھ گئی زینت
اگرچہ پھولوں کے دامن ہیں تارتار ابھی
سیاہ بخت فضاؤں میں دل ہوا بدظن
تری زبان کے تیور ہیں آب دار ابھی
ابھی نہ نکلے گا حاصل ہماری باتوں کا
تمھارے سر پہ ہے سایہ کوئی سوار ابھی
یہ دیکھتے ہیں کہ کل رنگِ صبح کیا ہوگا
کہ آفتاب کا عالَم ہے انتظار ابھی

تو میری نیندیں تلاشتا ہے یہی بہت ہے
تو مرے خوابوں میں جاگتا ہے یہی بہت ہے
زمانہ تجھ کو حریف کہہ لے اُسے یہ حق ہے
مری نظر میں تو دیوتا ہے یہی بہت ہے
بہار میں تو نہ جانے کیسے کہاں پہ گم تھا
خزاں میں مجھ کو پکارتا ہے یہی بہت ہے
جہاں چراغوں کی لَو خموشی سے چپ ہوئی تھی
وہاں پہ آخر تو بولتا ہے یہی بہت ہے
خیالوں کے یہ سراب تجھ کو ڈبو ہی دیں گے
جسے تو کہتا ہے راستہ ہے یہی بہت ہے
گئے دنوں کی عجیب یادوں کو بھول جاؤ
تجھے اک عالَم جو چاہتا ہے یہی بہت ہے

شہرِ آہنگ

پیش رَو نظمیں

شاہد عزیز

بیس نظمیں

خورشید اکبر

ہم عصر نظمیں

جمال اویسی/ راشد انور راشد/ کہکشاں تبسم/ نواب آرزو

سوغات نظمیں

احمد صغیر صدیقی/ صبا اکرام/ ایوب خاور/ اقتدار جاوید [پاکستان]

پروین شیر [کینیڈا]

دوہے

سردار آصف/ لکشمن

رباعیات

ڈاکٹر مسعود جعفری

پیش رَو نظمیں

• شاہد عزیز

(۱)

جلاوطن

میں شہرِ بے نوا کی
آخری سرحد پہ بیٹھا ہوں
خود اپنے آپ میں
سمٹا ہوا اک اجنبی سایہ
مگر وہ کیوں نہیں آیا
سحر ہوتے ہی جب
سورج نکلتا تو
شہر کے سب مکانوں میں
صدائیں پھیل جاتی تھیں
مجھے ہنس کر بلاتی تھیں
مگر یہ آج کا سورج
ہوائیں زخم آلودہ
بہت نزدیک سے ہو کر گزرتی ہیں
مرے چھونے سے ڈرتی ہیں
میں شہرِ بے نوا کی
آخری سرحد پہ بیٹھا ہوں
خود اپنے آپ میں سمٹا ہوا
اک اجنبی سایہ
مگر وہ کیوں نہیں آیا
کہ جس کا منتظر ہوں میں

(۲)

تمہارے ساتھ

ابھی میں سو نہیں سکتا
ابھی تو ان کی آنکھوں میں
مسلسل جاگتے رہنے کی
خواہش جگمگاتی ہے
ابھی وہ درد باقی ہے
جو میرے جسم کے اندر
نسوں میں بہتا رہتا ہے
جسے میں بھول جاؤں تو
ذرا کچھ چین مل جائے
ابھی تو وقت کے تاریک
جنگل سے کوئی آواز دیتا ہے
اجالوں کی تمنا میں
کوئی سایہ پھسلتا ہے
مگر سورج کبھی ان
گھنی تاریک راہوں میں
نہیں آتا
ابھی یہ اجنبی تارہ
کسی بے نام دنیا سے نکلتا ہے
مجھے اس اجنبی دنیا میں جانا ہے
تمہارے واسطے وہ چاند لانا ہے
اندھیروں کو مٹانا ہے
تمہارے ساتھ جینا ہے
تمہارے ساتھ مرنا ہے

• شاہد عزیز

(۳)

گمشدہ

کبھی شب کی
تاریکیوں میں
اُتر کر
بھٹکتا ہوا
چاند دیکھا ہے تم نے
کبھی تم صداؤں کی
انگلی پکڑ کر
گھنے جنگلوں کی
گھنی وادیوں سے
نکلنے کی کوشش میں
ان سے ملے ہو
جنھیں علم تھا روشنی کا
جو یہ جانتے تھے
کہ سورج کہاں ہے

(۴)

تاریکیاں

چلو ڈھونڈیں
کہ سورج کھو گیا ہے
کن خلاؤں میں
زمیں کیوں سو گئی ہے
وقت کی تاریک راہوں میں
ہمیں آواز دے کر
کیوں بلاتا ہے
وہ غاروں میں
وہی میں ہوں
وہی تم ہو
وہی ہیں خواب
آنکھوں میں
وہی اک چاند ہے
جو جاگتا ہے
آسمانوں میں
مگر بھٹکی ہوئی ہے زندگی
ان کالی راتوں میں
چلو ڈھونڈیں
کہ سورج کھو گیا ہے
کن خلاؤں میں

• شاہد عزیز

(۵)

ایسا بھی ہوتا ہے

کبھی تنہائیوں کے
سرد جنگل میں
ہوائیں تیز چلتی ہیں
کوئی بھولا ہوا لمحہ
کوئی بچھڑی ہوئی ساعت
کوئی پرچھائیں
میرے پاس سے
ہو کر گزرتی ہے
کبھی ایسا بھی ہوتا ہے
کہ برسوں تک
کوئی موسم نہیں آتا
وہی اک خشک دریا
جسم کے اندر اترتا ہے

(٦)

زندگی نہیں رکتی

جس طرح ہوا پیہم
یوں ہی چلتی رہتی ہے
جس طرح سمندر میں
لہر اٹھتی رہتی ہے
جس طرح سے یہ سورج
ڈوبتا نکلتا ہے
جس طرح سے ہم یوں ہی
سانس لیتے رہتے ہیں
جیسے وقت چلتا رہتا ہے
ہم بھی چلتے رہتے ہیں
چاہے کچھ بھی ہو جائے
یہ زمین پھٹ جائے
آسمان گر جائے
حادثوں کی دنیا میں
زندگی مسلسل ہے
زندگی نہیں رکتی

بیس نظمیں

• خورشید اکبر

جاناں!

روٹھنا تھا کسے منانا تھا
وقت کے ساتھ گنگنانا تھا

لہر دریا کے ساتھ رہتی ہے
بجلی بادل میں ہے عجب رشتہ
سانس کی ڈور بن کے جسم کے ساتھ
روح ہر لمحہ ہے روانی میں
کھیلتی ہے وہ آگ پانی میں

وقت کی بات ہے الگ جاناں!
حُسن سوغات ہے الگ جاناں!

پھول سے روٹھتی نہیں خوشبو
رات سے روٹھتا نہیں جگنو
نین سے دور کب رہا جادو
ہنستے ہنستے نکل گئے آنسو!!

یوں تو ہر شے کو ہے فنا یعنی
رہ گیا اپنا مدعا یعنی
اس طرح سے کوئی نہیں جاتا
جس طرح روٹھ کر گئے جاناں!

عشق ماہی بغیر آب

جاگتے سوتے یہ خیال آیا
تجھ کو سوچا تو یہ سوال آیا
تم کہاں اور میں کہاں جاناں!
فاصلے کیوں ہیں درمیاں جاناں؟
یوں ملے ہم کہ مل نہیں پائے
پھول حسرت کے کھل نہیں پائے
برق پر نامہ بر سوار ہوا
دھوپ میں ابر سایہ دار ہوا
پھر تعلق کے تار ٹوٹ گئے
مجھ پہ صدمے ہزار ٹوٹ گئے
بے بسی کی عجیب شام آئی
زندگی مثلِ انتقام آئی
پھر ترے دید کی سعادت ہو
وقت کو عید کی بشارت ہو
غیر ممکن ہے اس طرح ہونا
غم نہانا ہے داغ ہے دھونا
مسئلہ آگیا ہے پانی کا
یعنی دریا کی بے زبانی کا
قربتِ جاں کے مشک ہوتے ہی
اک سمندر کے خشک ہوتے ہی
درد صحرا نصیب ہے اپنا
ایک وحشت رقیب ہے اپنا
سلسلہ دور تک سراب کا ہے
عشق ماہی بغیر آب کا ہے!

• خورشید اکبر

آتش پارہ

تم اگر مجھ سے مل نہیں سکتے
تم اگر فون کر نہیں سکتے
تم اگر بات کر نہیں سکتے
تم اگر میل کر نہیں سکتے
تم اگر برق پر سوار نہیں
تم اگر ابرِ سایہ دار نہیں

تو ملو مجھ سے اس طرح جاناں!
دھوپ وحشت کے رہگزاروں میں
منتظر ہے ہمارا نخلستاں!

تم سے یہ کام بھی نہیں ہوگا
تم تو فطرت سے ہو آتش پارہ
خود جلو گے، مجھے جلاؤ گے
راکھ سے کیمیا بناؤ گے!

عشق تمام/ ناتمام

کون کہتا ہے ہے،ہم تم جدا ہو گئے
دفعتاً زندگی سے خفا ہو گئے
ہجر عالم پہ چھایا تھا کچھ اس طرح
وصل کے خواب نذرِ ہوا ہو گئے
جانے کیا بات تھی وقت میزان میں
تیر جو بے خطا تھے، خطا ہو گئے
ہم نے سمجھا تھا جس بُت کو نا معتبر
وہ زمانے میں پھر دیوتا ہو گئے
ایک دن یوں ہوا حُسن سرکار میں
مدّعی جو نہ تھے مدّعا ہو گئے
کچھ ارادے بھی تھے، کچھ تماشے بھی تھے
رقص کرتے ہوئے ماورا ہو گئے
دیکھتے دیکھتے ہم فنا تھے مگر
دیکھتے دیکھتے تم خدا ہو گئے

• خورشید اکبر

اجنبی فرمائش!

اجنبی!
تجھ سے تعلق کا صلہ خوب ہے یہ
تیری خواہش ہے:
کہ ہر روز نئی نظم
لکھوں تیرے نام!
میری کوشش بھی عجب ہے
لیکن:

روز تازہ
نئے جذبات کہاں سے لاؤں
کورے الفاظ کی سوغات
کہاں سے لاؤں
خشک آنکھوں کے کٹوروں سے
میں برسات
کہاں سے لاؤں؟؟؟
اجنبی! تو ہی بتا نسخۂ نایاب کوئی
اجنبی! مجھ کو دکھا خطۂ شاداب کوئی
برگِ آوارہ کی صورت ہوں ہوا کی زد پر
میں کہ رقصاں ہوں ابھی گرم بگولوں کے ساتھ!!

اجنبی!
تو بھی مرے رقصِ فلک رنگ
میں شامل ہو جا
شاعری کیا ہے
مری جان کا حاصل ہو جا!
تو مرا جسم قبا
تو مری روح کی
پُر نور غذا
شہد سے میٹھی
مرے لب کی دعا!!
اجنبی کون ہے تو
میرے سوا
مجھ سے جدا........!

• خورشید اکبر

نامۂ عشق ہے خدا کے نام!

میں بھی انجان تھا
تم بھی انجان تھے
لوگ حیران تھے!
عشق آسان تھا

عشق آسان تھا
اس کی افتاد مشکل
نہ تھی اس قدر
ابر کی چھاؤں میں
یوں چلے جا رہے
تھے ـــ نئے ہم سفر

اس کے آگے مگر
تھے عجب سلسلے
پھر کڑے کوس تھے
پھر کٹھن تھی ڈگر

دور تک بے کراں
ریگِ صحرا تھی پھیلی ہوئی
ایسی آندھی چلی:

میں بھی تھا بے اماں
تم بھی تھے دَر بہ دَر
لوگ تھے بے خبر
عشق حیران تھا!

میں کہیں کھو گیا
تم کہیں جا بسے
پھول کھلتے رہے
لوگ ملتے رہے
پر، نہ مل پائے ہم

اے مرے ہم سفر!
پھر نہ کہنا کبھی
عشق آسان تھا
عشق آسان ہے
وقت اپنے کیے پر پشیمان تھا
کب پشیمان ہے؟
ہاں وہ اپنا خدا!
جو نگہبان تھا
وہ نگہبان ہے!

• خورشید اکبر

من تو شدم، تو من شدی!

میں اگر خاک
تو ہے آب مری
تو ہے تعبیر
میں ہوں خواب ترا
تو اگر آگ
میں ہَوا کا شور
تو زمیں میری
میں ترا آکاش
میں ترا جسم
تو ہے روح مری
عشق میرا ہے ریگ زاروں سا
حُسن تیرا ہے آبشاروں سا
تو ہمالہ کی پُر فضا وادی
میں سمندر کی طرح آزادی!
اور کس کس طرح مثالیں دوں
اور قدرت کا راز کیا کھولوں ؟

یہ من و تو کا فرق ہی شاید
بن گیا وجہِ امتحاں جاناں!
گر من و تو کا فرق مٹ جائے
پھر تو ہے وصلِ جاوداں جاناں!

حسن ہر طور ہے جواں جاناں!
عشق ہر شے میں ہے رواں جاناں!

ہے فنا اپنی ابتدا جاناں!
ہے فنا اپنی انتہا جاناں!!

• خورشید اکبر

ایک نظم غزل نما

پھر تری بزم سے مجنوں کو اُٹھایا گیا ہے
کیسی وحشت ہے کہ لیلیٰ کو سجایا گیا ہے

یوں کسی جھوٹ کی تخلیق نہیں ہو سکتی
جانِ من! کچھ تو سلیقے سے چھپایا گیا ہے

شکریہ تیرا کہ پھر تو نے کیا میرا خیال
پھر مجھے بھولا سبق یاد دلایا گیا ہے

ایک کٹھ پتلی میں انسان کے جیسا احساس
کیسی حکمت سے کھلونے کو بنایا گیا ہے

اور کیا چاہتا ہے تجھ سے ترا عاشق دید
کیا گھنے کہرے سے آئینہ بنایا گیا ہے

اس طرح خواب سے ملتی نہیں کوئی تعبیر
جیسے صحرا سے سمندر کو ملایا گیا ہے

اے مری جانِ غزل! تو ہے مری زہرۂ شام
تیرے خورشید کو ظلمت سے دبایا گیا ہے

اعتراف

اس طرح سے خفا ہوئے جاناں!
جیسے میں نے بڑا گناہ کیا
جیسے مندر کو ڈھا دیا میں نے
جیسے مسجد کوئی گرائی ہو
جیسے اک شہرِ جاں تباہ کیا

ہاں تری بات اک نہیں مانی
تیرے بہروپ سے رہا شکوہ
ہاں ترا دل فقط نہیں رکھا
ہاں یہی اک خطا ہوئی مجھ سے
تیری جنّت سے ہو گیا محروم!

ورنہ کیا کیا نہیں کیا میں نے
تجھ کو ہر سانس میں جیا میں نے
کاٹ لی زندگی سزا کی طرح
ہاں یہی اک گناہ ہے جاناں!
جس کا میں اعتراف کرتا ہوں!

اجنبی ویلنٹائن: تین منظر

• خورشید اکبر

پہلا منظر

سردیخ بستہ موسموں کی نوید
جانے کس کس کے نام آئی تھی
کہر آلود تھی فضا ایسی
صبح کچھ اونگھتی ہوئی جاگی
اس کی آغوش سے ہمکتا ہوا
ایک سورج قلانچیں بھرتا ہوا
آسمانِ فسوں کے میداں میں
شوخ کرنوں کو چھیڑتا نکلا
ہو گیا خطۂ افق گل رنگ

میں تھا محبوس اپنے کمرے میں
دفعتاً دیکھتا ہوں نورِ کریم
ہے کھڑا یاد کے دریچے پر!
چند معصوم سا سوال لیے
جھانکتا ہے ادھر اُدھر ششدر!!!!!!!!!

دوسرا منظر

یاد ہے فروری مہینہ تھا
نو شگفتہ نئی بہار کے دن
فیس بک پر ملے تھے ہم دونوں
اس نے کی التجا رفاقت کی
میں نے ہنس کر اسے قبول کیا
گرم شعلہ تھا، اس کو پھول کیا
اس نے دل کا سلام بھیجا تھا
میں نے جاں کا پیام بھیجا تھا
پھر تو روٹھے منے تھے ہم دونوں
موسموں سے تنے تھے ہم دونوں
کس طرح سے بنے تھے ہم دونوں
یہ کوئی جان بھی نہیں سکتا!
وقت پہچان بھی نہیں سکتا!!!

تیسرا منظر

چودھویں فروری کا دن ہے آج
اور ہم دونوں مل نہیں سکتے
دور تک پتھروں کی بارش ہے
پھول ایسے میں کھل نہیں سکتے

وقت کے اس اتھاہ ساگر میں
جسم کے دو الگ جزیروں پر
ہم ہوئے ہیں قیام آمادہ!!

میرے کمرے میں ہجر کی قندیل
جل رہی ہے، پگھل رہی ہے، بہت

وہ مجھے یاد کر رہی ہوگی
اور تنہائیوں کے مخبس میں
جشن ایجاد کر رہی ہوگی
شام تنہائی!
میری ویلنٹائن!!

• خورشید اکبر

خود فریبی

تم مجھے امتحان میں ڈالو!
میں تمھیں امتحان میں ڈالوں
پھر نتیجہ ہو جس کا رسوائی
اور حاصل ہو شامِ تنہائی
اس تعلق کا فائدہ کیا ہے
اس سے بچنے کا راستہ کیا ہے؟
میں نے پہلے بھی تم کو دیکھا ہے
اور ہر بار دیکھنا ہے کیا؟

جاؤ تم کو نئی حیات ملے
خود فریبی سے اب نجات ملے
میں کوئی یاد ہوں، نہ کوئی خیال
تو مرا عشق ہے، نہ شہرِ جمال
اپنی دنیا میں خوش رہو جاناں!
قصۂ درد مت کہو جاناں!

روشنی سے گزر گئے سائے
تیرگی میں اتر گئے سائے
پھر کہیں نام ہے، نہ کوئی پتا
زندگی! تیرا گھر کہاں ہے؟ بتا!

• خورشید اکبر

وہی بوئے گل ہے!

کوئی جذبہ ہے نہ کوئی احساس
اب تو وہ ہے بھی نہیں میرے پاس

جیسے وہ تھا ہی نہیں میرے پاس
جیسے وہ تھا ہی نہیں کوئی سوال
جیسے وہ تھا ہی نہیں میرا خیال

جیسے وہ تھا ہی نہیں رات کی نیند
جیسے وہ تھا ہی نہیں میرا خواب
جیسے وہ تھا ہی نہیں میرا نشہ
جیسے وہ تھا ہی نہیں میری شراب

جیسے وہ تھا ہی نہیں میرا خمار
جیسے وہ تھا ہی نہیں صبح کا نور
جیسے وہ تھا ہی نہیں دن کا غبار
جیسے وہ تھا ہی نہیں شامِ سرور

جیسے وہ تھا ہی نہیں میری مراد
جیسے وہ تھا ہی نہیں لمسِ حیات
جیسے وہ تھا ہی نہیں عشق مرا
جیسے وہ تھا ہی نہیں شہرِ نجات!

جیسے وہ تھا ہی نہیں! پھر بھی اُسے
وقت کیوں یاد کیا کرتا ہے
شغل ایجاد کیا کرتا ہے
درد کو شاد کیا کرتا ہے
خود کو آباد کیا کرتا ہے؟؟؟؟

جسم کے پھول میں احساس کو خوشبو ہے یاد!
ہجر کی رات میں امیّد کا جگنو ہے یاد!
مَد بھرے نین میں ڈوبا ہوا جادو ہے یاد!
خود کو میں بھول گیا، صرف مجھے تو ہے یاد!
جیسے میں تھا ہی نہیں/ جیسے میں ہوں بھی نہیں

عشق آباد فنائے گُل ہے!
گُل کا حاصل وہی بوئے گل ہے!

• خورشید اکبر

صرف شبنم سے نہیں بجھتی پیاس!

پھول نے عشق کیا تتلی سے
اور تتلی تھی کہ منڈراتی رہی
جانے کیا سوچ کے گھبراتی رہی
سوچتے سوچتے، رفتہ رفتہ
زانوے گل پہ مگر بیٹھی گئی
جینے مرنے کی بھی کھائی قسمیں
پھر اُڑی لوٹ کے آئی نہ کبھی

ایک دن یوں بھی ہُوا :
دستِ گلچیں میں وہی قید ہوئی
ایک صیّاد کی وہ صید ہوئی
کتنی منّت و سماجت کے بعد
پھڑ پھڑاتی رہی، آزاد ہوئی

اب تو وہ باغ میں
جانے سے بہت ڈرتی ہے
گل پہ مرتی تھی
اب بھی مرتی ہے

اک طرف پھول ہے پژمردہ، اداس
صرف شبنم سے نہیں بجھتی پیاس!

• خورشید اکبر

میں وہ پتھر!

اس سے رشتہ رہا عجب میرا
آ گیا نام بے سبب میرا
اس سے آگے کے مرحلے پہ مگر
نارسائی کے سلسلے پہ مگر
میں تو کچھ بول بھی نہیں سکتا
راز یہ کھول بھی نہیں سکتا
سلسلہ دور تک اُداسی کا
ایک منظر ہے ناسپاسی کا

جھوٹ ہو/ وقت ہو/ کہ عشقِ مُدام
یاد ہو/ خواب ہو/ کہ ہجرِ دوام
ان کے تو پاؤں بھی نہیں ہوتے
اور وہ چل کر آئے میرے پاس
بارِ احساں بھی مجھ پہ ڈال گئے
لے اُڑے چھین کر وہ ہوش و حواس

جانے سب ہو گئے کہاں روپوش
ہاں وہی جانِ آسماں بردوش
شور ہے خطۂ شرافت میں
میں ہوں پھر حجرۂ ندامت میں

کھو گیا شوقِ انتظار مرا
چھن گیا مجھ سے میرا شہرِ نجات
کس بیاباں میں اس نے ڈال دیا
ہو گئی دور شاہراہِ حیات
یوں مرا اعتبار بھی ٹوٹا
خود سے اب اختیار بھی ٹوٹا

عشق جب امتحان لیتا ہے
شہرِ محبوب چھوٹ جاتا ہے
میں وہ پتھر کہ ٹوٹتا بھی نہیں
صبرِ ایّوب ٹوٹ جاتا ہے!

دشت بے اماں

• خورشید اکبر

تجھے یاد کرتے کرتے
تری راہ تکتے تکتے
مرے اجنبی مسافر!
کئی دن گزر گئے ہیں

کوئی شام آرہی ہے:
کوئی خوشنما ستارہ/جو فلک پہ ہنس رہا ہے
کسی مہہ جبیں کی صورت
جو نظر کو ڈس رہا ہے
وہی ایک استعارہ!
تری یاد رہ گزر پر مرا ہمسفر بنا ہے
وہی اک ضیا سلامت
سرِ شام تیرگی میں
مرے کام آرہی ہے
مرے راستے کے آگے
کسی رات کا گزر ہے
کہیں وہم سر بہ سر ہے
کہیں خوف کا اثر ہے
کہیں سرسراہٹیں ہیں
کہیں جھنجھناہٹیں ہیں
نہیں دشتِ ہو میں آہو
نہیں جنگلوں میں جگنو

تری یاد وہ کھلونا جسے توڑ بھی نہ پاؤں
کہیں چھوڑ بھی نہ پاؤں

ابھی نصف شب ہے گزری:
تجھے یاد کر رہا ہوں، ترے خواب دیکھتا ہوں
یہی جسم ہے بچھونا/یہی جان اوڑھنا ہے!

ہوئی صبح در پہ دستک.......
ترے خواب جا چکے ہیں
تری یاد بھی ہے رخصت
نئی آرزو کھڑی ہے!

نئے لوگ مل گئے ہیں
مرے سامنے ہزاروں
نئے کام آپڑے ہیں

اسی درمیاں ___ تصوّر ترا بار بار آیا ___
اسی راستے پہ جاناں!
کوئی شام پھر ہے آئی:
تری یاد نور پیکر
تری قربتوں کا سایہ
کہیں تیرگی میں گم ہے
میں اذان دے رہا ہوں
کسی دشتِ بے اماں میں!

• خورشید اکبر

خلش

زعفرانی شبیہ تھی اس کی
میں بھی تھا سبزۂ بہار کا رنگ
یوں ہوئی تیز قربتوں کی دھوپ
روپ بہروپ اعتبار کا رنگ

بیچ میں آگئی خزاں ایسی
برگِ جذبات پڑگئے پیلے
پڑ گئی عشق پر عجب اُفتاد
پھر نیا موسمِ سیاست تھا
کھنچ گئی پھر فصلِ تفریقات
دوٗر کا ڈھول جشنِ تقریبات
قرض کی طرح حُسن کی خیرات
رہ گئے ہاتھ کا سئہ شبہات!

ایک نقشہ ہے بے پناہی کا
اور اس پر عنایتوں کی پناہ
عشق تھا پیشۂ جنوں پہلے
تیز تھا تیشۂ فسوں پہلے
اب تو یہ مانگتا ہے خوں پہلے

بدلے بدلے ہیں وقت اور حالات
حکمراں ہر طرف ہوئے صدمات
شغلِ دوراں ہے صرف شبہ اور مات
ڈھونڈتا پھر رہا ہوں راہِ نجات!

خواب پر یوں زوال آیا ہے
قربتوں پر سوال آیا ہے
کیا ہوا ہم بھی چل نہ پائے ساتھ
اک خلش رہ گئی مگر جاناں!

• خورشید اکبر

نوحہء جاں

میں تھا آوارہ و برجستہ خرام
اور اک بند گلی اس کی پناہ
نامۂ عشق تھا رشتوں کا جواز
برق رَو میں بھی رہا وہ بھی رہے
عشق احساس جنوں کے آثار
کچھ عجب طرح بنے نقش ونگار
فرطِ جذبات سے
اس درجہ رہے ہم لرزاں
تیسری قوّت وسواس
کہاں سے آئی؟
اور
پھر ٹوٹ گیا
لرزہ براندام تعلّق کا پُل!
سبزہ زار مانوں پہ
وہ اوس پڑی مت پوچھو
اب تو وہ
صحنِ تخیّل بھی ہے مدّت سے اُداس

گاہے گاہے
کسی پہلوئے فلک میں جاناں!
کچھ چمن زار مہک اٹھتے ہیں
اور
آتی ہے صدائے بلبل:
عشق وہ اوس کا قطرہ ہے
جس کے پڑتے ہی
ٹوٹ جاتی ہے صراحی گل کی!

• خورشید اکبر

فیس بُک

ایک دنیا بڑے کمال کی ہے
لمحہ لمحہ نئے سوال کی ہے
مہہ وشوں کے جمال کی دنیا
جذبۂ اتصال کی دنیا
جھوٹ اور سچ کا بے سُرا سنگم
ایک دنیا خیال پر قائم
جس کو میں چھوڑنا اگر چاہوں
اس سے منہ موڑنا اگر چاہوں
حسرتوں پر زوال آئے گا

اب تو چہرے یقیں سے آگے ہیں
ہاں مگر اعتبار کس کا ہے
سامنے میرے فیس بک رکھ دو
جی میں آتا ہے توڑ دوں درپن
روشنی ساتھ جب نہیں دیتی
کون پرچھائیوں سے بات کرے!

لاجونتی

جس کے پہلو میں باغ جنت ہے
اس کے پہلو سے اٹھ کے آیا ہوں
جس کے پہلو میں آگ جلتی ہے
اس کے پہلو میں جل کے دیکھا ہے
جس کے پہلو میں برف جمتی ہے
اس کو اپنی حرارتیں دے کر
میں نے پانی بنا دیا
لیکن
زندگی! تم کو شرم آتی ہے!
میرے محبوب ہو گئے کب سے
مجھ سے منسوب ہو گئے کب سے
تم نے کاٹی فسادیوں کے ساتھ
کب قیامت کے جیسی بھاری رات

راحتوں کا بھی کیمپ ہوتا ہے!
تم کو معلوم ہی نہیں شاید!
میرے پہلو میں آ کے لیٹی ہو
تم مری خواب گاہ میں ہو مگر
تم کو چھونے سے ڈر رہا ہوں میں
سچ کہوں؟
تم تو لاجونتی ہو!

• خورشید اکبر

بھیگا موسم

اس نے کہا تھا: چھوٹی سی فرمائش ہے!
میں نے کہا تھا: بھولی بھالی خواہش ہے!
اس نے کہا تھا: روح میں خارش ہوتی ہے
میں نے کہا تھا: جسموں کی سازش ہوتی ہے
اس نے کہا تھا: بادل کالے ہوتے ہیں
میں نے کہا تھا: بجلی گوری ہوتی ہے!
اس نے کہا تھا: بجلی اور بادل اکثر ٹکراتے ہیں!!
میں نے کہا تھا: پھر تو بارش ہوتی ہے!!!!
اس نے کہا تھا: بارش میں چھینٹے پڑتے ہیں
میں نے کہا تھا: کپڑے بھی گیلے ہوتے ہیں
اس نے کہا تھا: بھیگنے والا ہے موسم
میں نے کہا تھا: بھاگ نہیں پائیں گے ہم!!

سارا عالم بھیگ رہا تھا بارش میں
اپنے اپنے ظرف میں، اپنی خواہش میں
شرابور تھے ہم دونوں رفتہ رفتہ
اندر باہر بھیگ گئے جستہ جستہ
جذبوں کا صابن، احساس کا پانی تھا

بارش کے دو بھیگے تن پر
دھوپ اترنے والی تھی
دُھلا دُھلا فطرت کا سارا منظر تھا

پر پھیلائے —
دو پنچھی بے سُدھ تھے
غیب کی مستی میں!!

سنتے ہیں:
پھر آگ لگی تھی بستی میں!!!!!

هم عصر نظمیں

● جمال اُویسی

(۱)

میں سرد رات کو بانہوں میں لے کے سویا تھا
اچانک ایک دھماکے سے نیند ٹوٹ گئی
نظر کے سامنے سیلاب کہکشاؤں کا تھا
عظیم گونج تھی پھلجھڑیوں کے چٹخنے کی
نگاہ دیر تلک سیر یاب ہوتی رہی
پھر اس کے بعد اندھیروں نے یک بیک مجھ کو
دبوچ کر پس پردہ کیا تھا منظر سے
ستارے پھوٹ چکے تھے خلاؤں میں بکھرے
سیاہ ملبوں سے میلوں گزر رہا ہوں
مجھے ہے آج بھی اُمید برگِ تازہ کی

(۲)

دست بردار ہوا چاہتا ہوں
اپنی عادت سے جئے جانے کی
کب سے چٹان پہ بیٹھا ہوا میں
خود کو چٹان بنانے کے سوا
اور کچھ بھی نہ کیا!

(۳)

گھر میں دیواریں ہیں
دیواروں میں کمرے ہیں نہاں
لوگ سمٹے ہیں بنائی ہوئی تہذیبوں میں
منفرد رنگوں میں پنہاں
بشریت کے رموز!
کتنے سفاک اور انساں کش ہیں!

• جمال اُویسی

(۴)

خودکشی کرنے گیا اور نہیں کر پایا
اجنبی لوگ تھے
بازار تھا، ہنگامے تھے
ریل کی پٹری بہت گندی تھی
گھر سے نکلا تھا کہ مر جاؤں گا
کٹ جاؤں گا
بھیڑ کو دیکھ کے وحشت ہی ہوئی!

(۵)

جینس کی پینٹ پہن کر اک شام
سیر کے واسطے باہر نکلا
میں نے دیکھا کہ مجھے دیکھتی ہے اک دنیا
'لکچرر ہے یہ پڑھاتا ہے کسی کالج میں'
ایک آواز مرے کانوں سے ٹکراتی ہے
شوق ہے اس کو جواں رہنے کا'
طنز سن کر مجھے محسوس ہوا
لکچرر میں نہیں ہوتا تو کوئی بات نہ تھی
جینس وہ پہنے جسے کام پڑھائی کا نہ ہو!

● راشد انور راشدؔ

دھوپ ایسی تو نہیں تھی پہلے

دھوپ ایسی تو نہیں تھی پہلے
یہ ہر اک چہرے کو دمکاتی تھی
اپنی کاوش پہ یہ مسکاتی تھی، اتراتی تھی
کیا ہوا، کیسے ہوا، کون سی آفت آئی
دھوپ نے اپنی تباہی کے نشاں ثبت کیے
سوچتے سوچتے اب ذہن بھی تھک جاتا ہے
دل افسردہ پھر آرام کہاں پاتا ہے
پہلے جب ذہن میں
کچھ برف سی جم جاتی تھی
اپنے آنچل میں سمیٹے ہوئے ننھی کرنیں
دھوپ آنکھوں کے دریچے سے اتر آتی تھی
من کے آنگن میں بڑی روشنی ہو جاتی تھی
پھر ہر اک چہرے پہ چھاتا تھا محبت کا سرور
اپنی تابانی پہ ہوتی تھی ہر اک شئے مسرور
اب وہی دھوپ
ہر اک چہرے کو جھلساتی ہے
ذہن کی بھٹی میں اب برف کے بدلے لاوا
تپتا رہتا ہے، یہی دھوپ اسے
اپنے اندر کی تمازت سے یوں پگھلاتی ہے
اصل پہچان ہر اک چہرے کی چھن جاتی ہے
دھوپ ایسی تو نہیں تھی پہلے

☆☆☆

رات کی دستک

رات کی دستک سنتے ہی اک خوف و ہراس
گھر کے در و دیوار سے ظاہر ہوتا ہے
جب سے اس کوٹھی میں
خوابوں کی نیلامی جاری ہے
گہرے سناٹے
سرگوشی کرتے ہیں
اب آنکھوں میں
خوابوں کے اندیشے پلتے ہیں

☆☆☆

• راشد انور راشد

چاند خفا سا لگتا ہے

آسمان پر جگ مگ کرتے
تاروں کا اک جال بچھا ہے
نور کی چادر
تنی ہوئی ہے امبر پر
کائنات کا ذرہ ذرہ
نور کی ہم آغوشی سے سرشار ہوا
لیکن اس منظر سے شاید
چاند بجھا سا لگتا ہے
لگتا ہے کچھ ہوئی ہے ان بن تاروں سے
اسی بنا پر
چاند نے کالے بادل سے رشتہ جوڑا ہے
کالے بادل خاموشی سے آتے ہیں
پلک جھپکتے آسمان پر چھاتے ہیں
جگ مگ کرتے تارے
آنکھ سے اوجھل ہیں
چاند ذرا سی دیر کو باہر آتا ہے
آسمان پر جھلک دکھا کر
پھر سے غائب ہو جاتا ہے
چاند خفا سا لگتا ہے

☆☆☆

ندی کو دیکھ کر

ندی کے حال کو اب دیکھ کر اب افسوس ہوتا ہے
ندی کا ایک ماضی تھا
نجانے کتنی تاریخی کتابوں میں
ندی کی اہمیت کے ان گنت ابواب روشن ہیں
ندی تہذیب کا مسکن رہی ہے
اسی کی موج نے
آغاز میں انسان کو
واقف کرایا ارتقائی مرحلوں سے
اسی کے صاف اور شفاف پانی نے یگوں تک
مختلف نسلوں کی دل سے آبیاری کی
اسی کی چیختی چنگھاڑتی لہروں پہ
غلبہ پا کے انساں نے ترقی کی
مگر اندھی ترقی نے ندی کی شکل
اتنی مسخ کر ڈالی
کہ آنکھوں کو کسی صورت یقیں آتا نہیں
جو کچھ نظر کے سامنے ہے
وہ حقیقت ہے

گندے، بدبودار نالے کی طرح جو بہہ رہی

ہے

یہی تو وہ ندی

تذکرے جس کے کتابوں میں بھرے ہیں

کتنی تہذیبوں کا جو مسکن رہی ہے

ندی کے حال کا جب جائزہ لیتی ہیں نظریں

تو بہت افسوس ہوتا ہے

☆☆☆

شام کی اڑان

شام کے سرمئی اندھیرے میں

اک پرندہ اڑان بھرتا ہے

چاہتا ہے کسی کا ساتھ ملے

رات کی بے قراریوں کا عذاب

یاد کر کے وہ کانپ اٹھتا ہے

اس لیے شام کے دھندلکے میں

گھونسلے کو وہ چھوڑ دیتا ہے

اور مسلسل سفر میں رہتا ہے

لیکن اس کا سفر سدا کی طرح

تشنگی کا عذاب سہتا ہے

☆☆☆

• راشد انور راشد

ہوا بے چین ہے

ہوا کچھ ان دنوں بے چین سی لگتی ہے

یہ جب بھی، جہاں سے بھی گزرتی ہے

عجب سی بوکھلاہٹ کا گماں

ہوتا ہے ہر پل

یوں لگتا ہے کسی شئے کی طلب نے

اس کو پاگل کر دیا ہے

پرندے التجا کرتے ہیں

سارے پیڑ اس کی منتیں کرنے میں

ہر لمحہ یہاں مصروف رہتے ہیں

مگر پھر بھی

ہوا کی بوکھلاہٹ میں

کبھی کوئی کمی آتی نہیں ہے

ہوا کی اضطراری کیفیت شاید نہیں بدلے

حقیقت تلخ ہوتی ہے

یہی شاید حقیقت ہے

ہوا اب بھی

پرانے موسموں کے عشق میں بے حال پھرتی ہے

نہیں جو لوٹ کر آئیں گے ان لمحوں کو روتی ہے

☆☆☆

• راشد انور راشد

سمندر چیختا رہتا ہے

سمندر چیختا رہتا ہے رات اور دن
ہمیں آگاہ کرتا ہے: جو برفیلے علاقے تھے
جہاں ہر چیز جامد اور ساکت تھی
وہاں ہر شئے پگھلتی جارہی ہے
توازن میں کمی آنے لگی ہے
سمندر کی قیامت خیز لہریں ساحلوں کو چھوڑ
شہروں کی طرف بڑھنے لگی ہیں
شہر اک لمحے ذرا سا چونکتا ہے
بے حسی کے خواب سے بیدار ہوتا ہے
مگر پھر سے
مشینی زندگی کی تیز رفتاری
توجہ کھینچ لیتی ہے
سمندر چیختا رہتا ہے
پھر کوئی نہیں سنتا
فنا کی موج
خاموشی سے اپنا کام کرتی ہے
دلوں میں زندگی سے پیار کی
معصوم سی خواہش
بڑی سہمی سی رہتی ہے

☆☆☆

مٹی کی خوشبو

ابھی سب کچھ نہیں بدلا
ابھی تک ذہن میں تازہ تخیل کی سحر کاری
ہمیں شاداب رکھتی ہے
ابھی تک گل مہر کے پھول
ویسے ہی تر و تازہ ہیں
ان میں ایک انجانی کشش
اب بھی سلامت ہے
ابھی تک نیم کی شاخوں میں
ہریالی دمکتی ہے
ابھی تک باجرے کی فصل
کھلیانوں میں میلوں لہلہاتی ہے
ابھی تک مٹیوں کی
سوندھی سوندھی خوشبوؤں سے
ذہن کی وادی معطر ہے
ابھی تک شہر کے ایندھن میں
جل کر بھی ہمارے جسم میں
دیہات زندہ ہے
ابھی سب کچھ نہیں بدلا

☆☆☆

• کہکشاں تبسم

نابینا اجالے

گھر کے درک جانے کی آہٹ سن لینی تھی
رات گئے چوکھٹ پہ ہوتی اک شرمندہ دستک
جیسے منھ پھیلائے بچوں کا تھا ضدی رونا
آسمان سی آنکھوں میں تھے ڈیرا ڈالے
سرمئی سرمئی گہرے بادل
ہر کونے میں پسری بکھری
پت جھڑ کی سی بے کیفی
کھٹ پٹ، کھن کھن ایک مشینی چال کے جیسی
کرسی کے ہتھے سے لپٹا آنکھیں میچے بھیگا تاول
دور دور سی اپنے ہی فیتوں میں الجھی
پڑی ہوئی جوتوں کی جوڑی
اور تکیے سے ٹیک لگائے
تھکے تھکے السائے خواب
آنکھ چرائے اک دوجے سے ڈولتے سائے
ناخن قرض ادا کرتے تو
ننھی گرہیں کھل سکتی تھیں
منظر بدلے جا سکتے تھے
لیکن......شاید
رنگوں کی پہچان نہیں تھی
اور اجالے نابینا تھے..........!!

☆☆☆

دکھ مٹھی میں بھر لائے ہیں

کوڑی کوڑی سکھ چننے کی خواہش میں ہم
کنکر پتھر دکھ
مٹھی میں بھر لائے ہیں
ایک گھروندا سجا بنا کے رکھنے بھر کا
خواب بھی کتنا کڑوا نکلا
گھستے ہوئے ناخون کی بولی گونگی ہے
مہندی جیسے رچے ہوئے تلووں کے
چھالے
نس نس میں بھی ہانپ رہی ہے کڑی
مسافت
اور زباں پر ہریالے ہیں پیاس کے کانٹے
کیا کھویا، کیا پایا سوچوں
وقت کہاں تک مہلت دے گا......؟؟

☆☆☆

• کہکشاں تبسم

دادی

دھنکی ہوئی روئی کے جیسے
ماتھے پر اٹھکھیلیاں کرتے
اجلے' نٹ کھٹ' الھڑ سے بالوں کے گچھے
پلو کے نیلے کور سے تھے اٹھکھیلیاں کرتے
پچکے ہوئے گالوں میں دابے
پان کا چورا
پوپلے منھ کی حرکت سے ہی ذائقے لیتی
دادی شاید
کھویا ہوا کچھ ڈھونڈ رہی ہے
لرزیدہ ہاتھوں سے' گم سم
اپنی گٹھری کھول رہی ہے
کیچ بھری آنکھوں سے اس کا
رہ رہ کے بکسے کے اندر
جھانکتے رہنا
اپنے خالی پن کو شاید بھر لینے کی ننھی کوشش
عمر گنوا کے فرصت پائی
فرصت سے اکتائی ہوئی ہے
جانے کب کے
کن لمحوں میں سینت کے رکھے
بوسیدہ کاغذ کے ٹکڑے
دھندلی دھندلی مٹیالی سی کچھ تصویریں
منی کی ادھڑی سی گڑیا
ایک پرانی ننھی چمچی اور کٹوری
کیڑا کھایا ایک گدیلا
تیل سے چکٹ سرخ دولائی
جانے کتنی چھیدوں والا ہرا دوپٹا
اک پڑیا میں کھوئی ہوئی پائل سے بچھڑے
ننھے گھنگھرو
ٹوٹی پنسل
تڑے مڑے کاپی کے پنے
کالی' پیلی' سبز' گلابی
جانے کن کن رنگوں کی الجھی ریشم لچھی
اک چھوٹے سے کپڑے میں تھی
کھونسی سوئی زنگ آلودہ
ساری چیزیں چھو چھو کر وہ
پچھلی یادیں زندہ کرتی
ان لمحوں سے مٹھی بھرتی
جیسے بچہ
شام ہوئی اور جگنو پکڑے
جیسے دھوپ سے بے پرواہ ہو
اور تتلی کے پیچھے دوڑے
دادی کے اندر بھی شاید
اک بچے نے جنم لیا ہے......!!

☆☆☆

• نواب آرزو

چائے کی پیالی

دوست لگتا ہے کہ تم بھول گئے
کس طرح ہوٹلوں کی میزوں پر
ڈوب کر چائے کی پیالی میں
خواب ہم تم نئے سجاتے تھے
اور سگریٹ کی ہر کش کے ساتھ
غم فضا میں بکھیر دیتے تھے
گردشوں میں بھی مسکراتے تھے
مرے اُداس لبوں پر ترے تبسم تھے
تری بجھی ہوئی آنکھوں میں روشنی تھی مری
کچھ نہ میرا نہ کچھ تمہارا تھا
جو بھی جیسا تھا سب ہمارا تھا
آج بھی تم وہی، وہی میں ہوں
فرق اتنا ہے میز پر میری
صرف اک چائے کی پیالی ہے
اور کرسی تمہاری خالی ہے....

انتظار

سوکھے کھیت، سوکھے ہونٹ
سوکھی آنکھیں......
سب مل کر منا رہے ہیں
روٹھی ہوئی برکھا رانی کو
دُعائیں ہو رہی ہیں.... آجا ایک بار
سوکھے موسم کو ہے.... تیرا انتظار

• احمد صغیر صدیقی [پاکستان]

چلے تھے اُس کی جانب جب ہم
خوشی بھی تھی اک خوشبو جیسی
دل میں کچھ کچھ خوف بھی تھا
پھیلے تھے کچھ رنگ بھی ہر سو
اور کہیں تھا شور بپا
ایسی تھی مدہوشی طاری
اگلے پل کا پتہ نہ تھا
لمحوں میں ..... بہت رہے تھے
بھید کسی پر کھلا نہ تھا
ٹھہر گئے تھے دونوں عالم
چلے تھے اُس کی جانب جب ہم

• صبا اکرام

صبح دَم فصل افواہوں کی
لہلہاتی ہوئی دیکھ کر
خوش ہوئے ہیں
کہ بہتی ہوئی شب کا
پورا برس
سردی، برسات، گرمی میں
سینچا ہے
بدبو بسے شہر کے گندے نالوں
کے پانی سے
کھیتوں کو زہریلے سوچوں کے
اور بغض کے بیج ڈالے ہیں
کچھ کھاد بھی نفرتوں کی
ملاتی ہے مٹی میں
تب یہ ہوا ہے
کہ دہشت کی یہ بالیاں
لہلہانے لگی ہیں
یہ لگتا ہے، اب
سال بھر خوف ستا رہے گا!

● ایوب خاور [پاکستان]

بہت کچھ کھو گیا ہے
اے شجر زادو!
مری نس نس سے لپٹی دھند میں
آخر بہت کچھ کھو گیا ہے، میرا اک اک خواب
پلکوں کی
سلاخوں سے الجھ کر جانے کس صحرا کا پانی ہو گیا ہے
اے شجر زادو!
جسے کردار جنگل کے کسی گم نام رستے میں
اچانک چھوڑ جائے وہ کہانی ہو گیا ہے،
اے زمین زادو
مرے کچھ لفظ تھے، لفظوں کی گرہوں میں بندھے
کچھ پل تھے، ہر پل میں کئی صدیاں، کئی صدیوں
کے ماہ و سال، دن، راتیں، دوپہریں، صبحیں، شامیں
اور ان شاموں کے ماتھے پر سجے کچھ چاند، تارے
رتجگے اور رتجگوں کے نیلمیں چھرنوں کی جھر جھر میں
کسی پائل کی چھن چھن اور اس چھن چھن کی جھلمل
میں کسی بے ساختہ، بے خود ہنسی کی نقرئی سرگم
کوئی سنتا ہے!
کوئی ہے!!
زمیں زادو!!

بہت کچھ کھو گیا ہے، میری آنکھیں
میرا چہرا اور مرے ہونٹوں کی شبنم اور ہتھیلی کی لکیروں
میں مچلتے خشک دریا، انگلیوں کی گرم پوروں میں
سلگتے لمس اور پیروں کے تلوؤں سے لپٹتے
راستوں کے خم

بہت کچھ کھو گیا ہے.....
کیا بچا ہے! ایک مقتل! خامشی کے سرمئی جنگل کی
چپ میں ایک مقتل جسکے بیچوں بیچ اک بے نام لاش
لاش کے چاروں طرف اک گہری شام
شام بھی بدنام/خوں آشام
لاش کے کپڑوں کی ساری جیبیں خالی ہیں
ہوا کے ہاتھ میں اب تک
کوئی ایسی نشانی بھی نہیں آئی
کہ وہ جس کی مدد سے میرے جیسی اس بریدہ لاش
کے وارث تلک پہنچے
ازل زادو
بہت کچھ کھو گیا ہے/ اے ابد زادو!!
کوئی سنتا ہے!/کوئی ہے!!!

● اقتدار جاوید [پاکستان]

(۱)

مہاتما

مہاتما کے ساتھ
رات کا قدیمی حُسن جاگتا
ہر ایک اُس کے سانس سے بندھا ہوا
اُسی کی دُھن میں جاگتا
درخت، پنچھیوں کی ٹکڑیاں
وُحوش، آدمی، قدیم رات
دیکھتا تھا میں
اُفق کو پھٹتے درمیان سے
میں بطنِ کائنات سے
سفید دن نکلتے دیکھتا
میں دیکھتا
مہاتما کو
دن کو اپنے اپنے ہاتھ پر دھرے ہوئے
دنوں کو
اُس کی انگلیوں پہ گھومتے میں دیکھتا
مہاتما کے آس پاس
ہر کوئی تھا
اپنے آپ سے کٹا ہوا
بطون سے پھٹا ہوا
مقام سے ہٹا ہوا
پرندے انہماک سے
وُجود اس کا دیکھتے تھے
گوشت پوست سے الگ
جہان میں کھبے ہوئے
عزیز، رشتہ دار، دوست سے الگ تھلگ
نگاہ میں
پرندے، تنکا تنکا جوڑتے
کہ گھونسلے بنا سکیں
فلک کو اور دیکھ لیں
زمین کو بسا سکیں
وُحوش، آدمی
مہاتما کے ساتھ رات رات جاگتے
وہ پنچھیوں کی طرح اونچا اُڑتے
اور ہزار خم بنا کے مُڑتے
جُوتے اپنے آپ سے
مہاتما کے جسم میں اُترتے
پھر بیاضِ کائنات پر
کبھی نہ لفظوں کی طرح اُبھرتے
میں نے اِک مکان بنایا
اپنے آپ میں

میں ریزہ ریزہ ہو کے
اُڑ گیا تھا بھاپ میں
مہاتما کو ڈھو کے میں نے
تازہ آنسوؤں کی دھار سے
نگاہ میں بٹھا لیا
مہاتما کو
میں نے اپنے آپ کو
ہر ایک شے سے خالی کر کے
پیٹ میں چھپا لیا!

(۲)

سبز برگ، سبز پھول

مرے قریب
اور بھی درخت ہیں
ہرے بھرے
مگر میں اپنے خاندان سے کٹا ہوا
کسی کے ساتھ کھُل کے
بات بھی نہ کر سکا
سکون سے نہ جی سکا
نہ میں نشیب مرگ میں اُتر سکا
ہزار سال سے
خود اپنی کھال میں چھپا ہوا
میں برزخِ حیات میں پڑا ہوا
میں راستے سے اِک طرف کھڑا ہوا
نہ لوگ آنکھ بھر کے مجھ کو دیکھتے
نہ پنچھیوں کی ٹولیاں مری طرف پلٹتیں، بولتیں
نہ موسموں کے بھید مجھ پہ کھولتیں
ہری ردائیں پھیلتیں
درخت
اپنی اپنی لمبی شاخچوں کو دیکھ کر
ہوا کے ساتھ جھولتے
مگر جو گھاؤ
عین بیچ تھا مرے وُجود کے
نہ بھر سکا
جلے ہوئے وُجود پر
وہ سبز برگ
سبز پھول کی طرح چٹک اُٹھا
جہان میں اُترتے
پہلا سانس کھینچتے
میں ننھے بچّے کی طرح
نگاہیں کھولنے لگا
نگاہیں کھول کر
میں بولنے لگا!

(۳)

غار

ہے ممکنات میں کہ دونوں
ایک شہر میں مقیم ہوں

فلک کے لاجوردی تھال کو
سیاہ دن کی دُھول نے
ذرا سی شام کی غریب روشنی نے
شب کی نرم راکھ نے چھپا لیا ہو
لاجوردی تھال کو ستاروں کے سمیت
کھا لیا ہو
اور اسیر ایک ہی
فلک کے نیچے چل رہے ہوں
اپنی اپنی زندگی کی آگ کی
انگیٹھیوں میں جل رہے ہوں
گاڑیوں کے اِزدحام میں
رُکے ہوئے ہوں اِک جگہ پہ
اِنتظار میں
کہ سبز روشنی ہو
چل پڑیں، نکل پڑیں
سڑک کی بھیڑ میں
رواں دواں ہوں
ساتھ ساتھ جا رہے ہوں
ایک شاہراہ پر
سفید بدلیوں کی چھاؤں
ساتھ ساتھ پڑ رہی ہو
آئینے میں دفعتہً تری جھلک پڑے
نگاہ یک بیک چھلک پڑے

● اقتدار جاوید [پاکستان]

ہم ایک پیڑ کا لذیذ پھل
خریدتے ہوں ایک ہی دُکان سے
وہ پھل کسی کے واسطے تو قاش قاش
جاں فروز ہو
کسی کے واسطے
وہ قاش قاش زہر ہو!
سیاہ شب میں
دونوں نیند کے جہاں میں
دونوں عین مین
اِک سفید شکل دیکھتے ہوں
موتیے کے پھول کھل اُٹھے ہوں
دو گھروں کے سامنے
ہے ممکنات میں
کہ دونوں ایک شہر میں مقیم ہوں
ہم ایک راستے سے
شہر کی حدود چھوڑتے ہوں
سات دِن کہیں گزارتے ہوئے
بہم ہوں خود کو جوڑتے ہوں
یا دوبارہ ایک راستے سے دونوں
شہر کے مہیب غار میں اُتر رہے ہوں!!

☆☆☆

• پروین شیر [کنیڈا]

وزنی بقچہ

صبح کی صیقل کرنوں نے
میری بقچی میں
خوابوں کے غنچے، خوشبو کے
بھینے قطرے، ننھی کونپل
اک ڈوری سے باندھ دیا تھا
ہلکی پھلکی بقچی سر پر
رکھ کر گھر سے نکلی تھی میں
بڑھتے بڑھتے ایسی پھیلی
اب تو اک پشتارہ ہے یہ
جسم و جاں لرزاں ہیں،
راہیں اتنی لمبی
دھوپ میں تپتی، تند ہوائیں
شکر ہے.....لیکن
شام کے سائے
دور سے چلتے چلتے آ کر
اس ڈوری کو کاٹ رہے ہیں!!

☆☆☆

آزادی

قلم کے زنداں سے
اُڑ کر اب
لاکھوں تتلی
کاغذ کی ننگی شاخوں پر
آ بیٹھی ہے!
سرخ، بسنتی، نیلے، پیلے
رنگوں کے ابریشم اوڑھے
ڈالی ڈالی جھوم رہی ہے!!!!

☆☆☆

دوہے

• سردار آصف

ہم بھی اپنے گاؤں میں ہوئے، بہت بدنام
چھپ چھپ کر کھاتے رہے کچے پکے آم

پھیکا پھیکا چاند ہے سورج ہے نس تیج
گوری کچھ امداد کر، اپنا چہرہ بھیج

گھر کے باہر بچیاں، ڈرے ہوئے ماں باپ
کچھ مولانا سنت بھی کرتے ہیں اب پاپ

بدرا برسے، لے گیا فصلوں کو سیلاب
ٹوٹے پھوٹے گھر بچے، گا نو گیا پنجاب

چڑیا سے ملنے گئے ناگراج بھگوان
سارے انڈے ہو گئے کل ان کا جل پان

ہے اتنا پانی کہاں جس میں کھیلیں سروج
دیہاتوں کی خوشبوئیں مت شہروں میں کھوج

ہٹا بٹا سیٹھ جی تنا کھڑا مزدور
ماں کی گالی کا بدل اک تھپڑ بھرپور

مجنوں کی لیلیٰ نہیں، نہیں رانجھ کی ہیر
مجھ کو بھی شاید ملی ایسی ہی تقدیر

دوہے

• لکشمن

(۱)

رہنے دو ہر راکھ میں چنگاری کا راز
میں بھی تجھ سے ہوسکوں، کبھی کبھی ناراض

(۲)

سورج کے سر پر چڑھی، جب پر کالی رات
جتلانے میں جُٹ گئے، جگنو تک اوقات

(۳)

میں شیشہ تھا ٹوٹنا، معمولی دستور
تو پتھر تھا ہوگیا، کیسے چکنا چور

(۴)

پائل ہیں یا بیڑیاں، مت پوچھو سرکار
کتنے دن سے قید ہوں، کہہ دے گی جھنکار

(۵)

بار بار یوں آنکھ کا، بن جانا اک شیز
دور اداسی ہو سکے، ہے کوئی تجوید

(۶)

تجھ سے مل کر ہوگئی، پوری ہر اک چاہ
پھر دنیا کی راہ پر، لوٹی نہیں نگاہ

(۷)

ہر جذبہ اے کاش ہو، بھیتر سے منسوب
چٹانوں کو چھیر کر، نکلے گی یہ دوب

(۸)

اتنی میری حیثیت ، اتنا میرا دام
جتنا گھر میں لوٹ کر، آؤں میں ہر شام

(۹)

نا امیدی کا رہا، اتنا بھاری شور
پلٹ گئی در سے مرے، دستک دے کر بھور

(۱۰)

نا امیدی کا رہا، اتنا بھاری شور
پلٹ گئی در سے مرے، دستک دے کر بھور

رباعیات

• ڈاکٹر مسعود جعفری

آیا ہے مرے سامنے زلفیں کھولے
لگتا ہے مرے من کا پپیہا ڈولے
یوں ذرا آنکھ اٹھا کر مجھے دیکھا جب بھی
دل مرا جوش میں آیا کہ ذرا کچھ بولے

فریاد کی لے اور بڑھا دی جائے
اشکوں کی ردا آج بچھا دی جائے
یہ موت کا پروردہ نظامِ باطل
پتھر سے بڑی قبر بنا دی جائے

لا ریب مظالم کی سزا پاؤ گے
مظلوم کی گلیوں سے کہاں جاؤ گے
جب لعل و جواہر کا پڑے گا سوکھا
حشرات کو ڈھونڈو گے انہیں کھاؤ گے

رنجور نہیں دل مرا دلگیر نہیں
مطلوب مجھے زلف گرہ گیر نہیں
انکار مجھے آپ کی باتوں سے کہاں
منظور مجھے کوئی بھی زنجیر نہیں

خوشبو بھرے اوراق ادب تھے کل تک
اشعار بھی ہنگام طرب تھے کل تک
ہر گام پہ اک حوصلہ ملتا تھا ہمیں
جینے کا مصیبت میں سبب تھے کل تک

شہر افسانہ

پہلے سے لکھی روداد

● اقبال مجید

یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جو ابھی ڈائس پر دوسروں کے ساتھ بیٹھا اسٹیج کی روشنی اور سامعین کی نگاہوں سے خود کو بچا بچا کر اونگھ رہا تھا۔ وہ سوٹ اور ٹائی میں تھا، گوری چمڑی کے ساتھ قدرے فربہ شخصیت کا مالک تھا۔ اسے ایک اصلاحی اور امدادی غیر سرکاری ادارے نے جس کا دائرہ کار مسلمانوں کی تعلیمی امداد سے متعلق تھا، خاص طور پر اپنی مالی مدد کے لیے اور ادارے کے سالانہ جلسے کو خطاب کرنے کے لیے بلایا تھا۔

اسے یہ دیکھنے کا خاصا وقت مل چکا تھا کہ ہال میں مرجھائے چہرے والے مڈل کلاس کے ادھیڑ عمر لوگ بیٹھے ہیں جو کلین شیو ہیں، یا پھر تومند حضرات لمبی داڑھیوں اور کرسیوں میں جگہ کی تنگی کی شکایت کے ساتھ کسمساتے ہوئے بیٹھے ہیں۔

اُس نے تقریر میں اس بات کا اعتراف کیا کہ اس کو اب ٹھیک سے نہ دکھائی دیتا ہے اور نہ سنائی۔ ایک زمانے میں اس کے وہ دن بھی تھے کہ زمین پر جہاں ٹھوکر مار دیتا وہاں سے دودھ کا فوارہ اُبل پڑتا اور اب تو خدا کے فضل سے اتنے فوارے اس کے اردگرد ابل چکے ہیں اور اتنی بلندی تک ابل رہے ہیں کہ اُسے مزید ٹھوکر مارنے کی ضرورت نہیں، ویسے بھی اب اس کی ٹھوکر میں نہ تو وہ دھار رہ گئی ہے اور نہ وہ زور۔ اس نے صاف صاف کہا:

"میرے پاس پیسہ خوب ہے مگر مجھے اب اپنی دولت کی حفاظت کی بھی وہ جستجو اور فکر نہیں رہ گئی ہے جیسی کہ پہلے رہا کرتی تھی۔ پہلے میں پُرکشش عورتوں کو دور سے دیکھ کر ہی چوکنا اور ہوشیار ہو جایا کرتا تھا کہ ہو نہ ہو یہ میری دولت کی گھات میں ہے اور مجھے اپنے دام میں پھنسانا چاہتی ہیں۔ (ہال سے قہقہے بلند ہوئے، خاص طور پر داڑھی والے زور سے ہنس رہے تھے) اب تو مضمحل ہو گئے قویٰ غالب۔ حالت یہ ہے

کہ خود میری بیوی میرے ساتھ سفر کر کے یہاں تک میری دیکھ ریکھ کے لیے آئی ہے اور اس وقت ہال میں اگلی کرسیوں پر بٹھا دی گئی ہے، یہ سماج کی بہت سی فلاحی اسکیموں کو چلانے والی بہت سی سرگرمیوں کے بوجھ کے نیچے دبی اپنے بے حد مصروف شب و روز گزار رہی ہے اور میرے بستر کو تو چھوڑیئے میری خواب گاہ میں بھی جھانکنے کا موقع تک نہیں نکال پاتی (ہال میں لوگوں کے گدگدی ہوتی ہے اور سر پر جالی دار ٹوپیوں والے نوجوان قدرے زور سے ہنستے ہیں)۔

یہ درست ہے کہ میرے پاس بہت پیسہ ہے، بے حد و حساب کتابیں ہیں۔ موٹی، پتلی، اعلیٰ درجے کی چاکلیٹوں کی طرح رنگین اور مرعوب کن، مختلف زبانوں کی سنہرے حرفوں میں اپنے نام سجائے ہوئے کتابیں ہیں۔ یہ کتابیں انتہائی قرینے سے آبنوسی الماریوں میں سجائی گئی ہیں مگر تب، جب میں نے ان کو گرمی سردی اور برساتوں میں کھانے پینے کی سدھ بدھ کھو کر انتہائی عرق ریزی کے ساتھ ایک نہیں بلکہ بعضوں کو کئی کئی بار پڑھ لیا ہے کہ آج آپ میری شخصیت کو دیکھیں یا میرے گھر کو دونوں ہی جگہ آپ کو جو خوبیاں ملیں گی وہ عصری تعلیم کی ہی سوغات ہوں گی۔ میرے گھر کا قیمتی ساز و سامان اور نوادرات بیشک دولت کی ریل پیل کی دین ہیں لیکن اعلیٰ درجے کے ذوق کے تقاضوں کے ساتھ کی گئی آرائش اور زیبائش تعلیم کی دین ہے جو باذوق حضرات کو اپنی طرف کھینچے گی۔ (یکا یک مقرر اپنے میزبان کی جانب مڑا اور مخاطب ہوا) آپ میری بیوی کو بولنے کے لئے مدعو کریں تو اس کے تجربات سے بھی استفادہ کر سکیں گے (سامعین سے) وہ مجھ سے بارہ سال چھوٹی ہے۔ ۳۲ سال کے دولھا کو ۲۰ سال کی کمسن دلھن جب ملی تو اس کی باچھیں کھل گئیں (یہ سن کر ہال کی کرسیوں میں دھنسے موٹے موٹے ڈاڑھی والے کھل کھلا پڑے) باچھیں تو کھل گئیں لیکن دولھا میاں یہ بھول گئے کہ جب ان پر بڑھاپے کی مرجھاہٹ رینگنا شروع کرے گی اور وہ بیٹھے بیٹھے اونگھنا شروع کر دیں گے تو اُس وقت ان کی ۱۲ سال چھوٹی بیوی جوانی کی سرحدوں سے رخصتگی کے ہنگام میں عمر کی پختگی کی چمک اور وقار کو اس طرح دہکا رہی ہوگی کہ خلقت اس کی تابنا کی کو پلٹ پلٹ کر گھور رہی ہوگی۔ پھر قدرت کا یہ انتقام دیکھ کر دولھا میاں انگاروں پر لوٹ رہے ہوں گے (ہال میں تالیاں بجتی ہیں، لوگ پہلو بدلتے ہیں)۔

میرے پاس پیسہ ہے لیکن قدرت کے اس انتقام سے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے میں پیسے کی مدد سے کچھ نہیں کر سکتا، بیس برس کی وہ لڑکی جس سے میں جن شرطوں کے ساتھ کھیلتا وہ راضی بہ رضا رہتی لیکن آج اُس کے اس قدر علم اور دبدبہ کے چلتے دل ہی دل میں کئی بار ایسے منصوبے بناتا رہتا ہوں کہ شرم آتی ہے مجھے۔

آپ نے بتایا کہ آپ کی تنظیم اب تک دس سال کے عرصے میں سوا کروڑ روپیہ طلباء کی تعلیمی ترقی اور فلاحی اسکیموں پر خرچ کر چکی ہے۔ جب سے میں یہاں پہنچا ہوں آپ کے والینٹیر خدام کی طرح ہر وقت میرے آگے پیچھے گھوم رہے ہیں اور میری ضرورتوں کا خیال رکھ رہے ہیں، بے شک دوسروں کی جیب سے

پیسہ نکالنا ذرا دشوار کام ہے لیکن میں آپ کو بھی کچھ نہ کچھ دوں گا کیونکہ جس طرح لیتے رہنے کے بعد بھی آپ ضرورت مند ہی رہتے ہیں اسی طرح دیتے رہنے کے بعد بھی میں پیسے والا ہی رہتا ہوں (ہال میں ہنسی گونجتی ہے) آپ یہ سن کر ہنس تو رہے ہیں لیکن یہ صورت حال میرے لیے بڑی پریشان کن ہے۔ آخر میرے قویٰ کی طرح میری آمدنی کیوں نہیں مضمحل ہو رہی۔ جس طرح اپنے مقابل اپنی بیوی کو چاق و چوبند اور طرح دار بنا دیکھ کر کچھ پژمردہ سا ہو جاتا ہوں ویسے ہی پیسے کی بڑھتی ہوئی ریل پیل بھی میرے لیے ایک کوفت کا باعث بن جاتی ہے۔ دل پوچھتا ہے: کہو کیسے خرچ کرو گے یہ پیسہ، یوروپ کی کسی پُر فضا بیچ پر چڈھی پہن کر دھوپ میں لیٹنے اور مشروبات پینے کے لائق بھی اب تم نہیں رہ گئے ہو کہ ذیابیطس کے مریض ہو اور ہوائی سفر کرتے ہوئے اب اختلاج بھی بہت ہوتا ہے۔ رہ گئیں تمھاری اولادیں تو ایک بیٹا ہے اور ایک بیٹی، دونوں بیرونی ممالک میں ہیں اور دونوں کے آسمان ڈالروں سے پٹے پڑے ہیں اور دن رات ان کے کشادہ اور سرسبز لان پر ایسا برستے ہیں کہ ان کے سروں کے بالوں نے جھڑ کر انھیں گنجا کر دیا ہے۔ دراصل جو بات میں آپ حضرات سے کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ میری زندگی یا میری بیوی کی زندگی خدا جانے کیا ہوتی اگر ہمارے پاس صرف پیسہ ہوتا اور تعلیم نہ ہوتی۔ کیونکہ ہمارے پاس عمدہ تعلیم ہے اس لیے پیسہ ہمارا کچھ بگاڑ نہیں پا رہا۔ حضرات میں اس بات پر بار بار زور دینا چاہتا ہوں کہ تعلیم کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ وہ آپ کی سوچ بدلتی ہے، جب سوچ بدلتی ہے تو زندگی کے ساتھ آپ کا رویہ بھی بدلتا ہے۔

بعض مندروں کے پاس یا ان کے باہری حصوں میں ایسی ادھیڑ عمر موٹی اور بے ڈول عورتیں سر پر ساری کا پلّو ڈالے اور ہوائی چپلیں پہنے ٹھوکروں سے زخم خوردہ انگوٹھوں کے ساتھ ممکن ہے کبھی آپ نے دیکھی ہوں، جن کے چہروں سے وحشت اور آنکھوں سے بے نوری برس رہی ہو مگر وہ اپنے بدن پر تین کلو ٹھوس سونا پہنے سرگشتی کر رہی تھیں۔ انھیں بس اتنا ہی معلوم تھا کہ وہ زندہ رہنے کے لیے زندہ ہیں۔ آپ تین کلو سونا پہنے ہوں اور آپ کو یہ نہ معلوم ہو کہ آپ کیوں زندہ ہیں تو وہ سونا جہالت کے وزنی طوق میں بدل جاتا ہے۔

حضرات! یہاں مجھے آپ کو یہ بتانے میں عار نہیں کہ جب میں اس تیزی سے ڈھلتی عمر میں جہاں ہر دم سہاروں کی ضرورت بڑھتی جا رہی ہے اپنی چاق و چوبند بیوی کو غیر مردوں کے ساتھ فلاحی اسکیموں کے تحت دور دراز کا سفر کرتے دیکھتا ہوں اور ایسے پُر فضا اور مسرور کن مقامات پر جہاں ہواؤں میں نشہ گھلا ہو کیمپ کرنے، شفاف سوئمنگ پول میں نہانے اپنی ٹولی کے ساتھ باغوں میں سیر و تفریح کرنے کے چٹپٹے قصے سنتا ہوں اور ان پُر فضا جگہوں پر کھینچی گئی وہ تصویریں دیکھتا ہوں جن میں سے بعض تصویروں میں 'نجات' کی ایک بے پناہ مسرت کے نتیجے میں اپنی بیوی کی نیم وا آنکھوں کی تہہ میں جھانکتی سرشاریت کی تلاش اور جستجو کی تڑپ کو یکا یک غیر حاضر پاتا ہوں اور اس کی جگہ صاف دکھائی دینے والی ہمیشگی میں لپٹی ہوئی آسودگی اور طمانیت میں بدلی ہوئی سیری اور سرشاری کی رقص کرتی اور جھومتی گاتی روشنی دیکھتا ہوں تو میری آنکھیں حیران رہ جاتی

ہیں اور تب میں بھاری دل سے اپنی خواب گاہ کے دروازے بند کر کے بستر پر لیٹ جاتا ہوں اور روح کی تنہائیوں سے اُٹھتی ہوئی ہلکی ہلکی بے آواز سسکیوں کو دبا کر اور تکیے میں منہ دے کر اپنی ناطاقتی کو جو ہر بات کو مصلحتاً درگزر کر دینے کی عادی ہوتی جا رہی ہے چپکے چپکے کوستا ہوں جبکہ اسی کمرے میں میرے بستر کی سائیڈ ٹیبل میں آدھے ہاتھ کے فاصلے پر میرا قیمتی ریوالور بھی رکھا ہے اور اس کی گولیاں بھی لیکن میں ہمیشہ کی طرح صبح منہ اندھیرے اپنے کمرے سے معمول کی طرح زندہ باہر نکلتا ہوں اور کاموں میں پھر اس طرح مصروف ہو جاتا ہوں کہ نہ دن کی خبر رہتی ہے اور نہ شام کی (منتظمین سے مخاطب ہو کر) حلق سوکھ رہا ہے تھوڑا پانی دیجئے۔ (مقرر پانی پینے کے لیے توقف کرتا ہے پھر بولتا ہے):

میں اپنے دل کی ایک بات بہت ایمانداری سے قبول کرنا چاہتا ہوں اور وہ بھی اپنی بیوی کے سامنے جو فی الحال ہال میں موجود ہے۔ اور وہ بات یہ ہے کہ یہ تعلیم کا ہی فیض ہے کہ مجھ سے زیادہ آج اخباروں کی سرخیوں میں میری بیوی رہنے لگی ہے۔ مجھ سے زیادہ ڈاک اس کے پاس آتی ہے۔ کبھی کبھی نہیں بلکہ اکثر اس کے پاس ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ مجھے اب ڈر لگنے لگا ہے کہ کہیں وہ اتنی شہرت نہ حاصل کر لے کہ میری شہرت کو گھن لگ جائے۔ یہ بات میں سچے دل سے کہہ رہا ہوں ہوں کہ میں کبھی نہیں چاہوں گا کہ اس کے پتے سے خلق کو میرا پتہ ملے۔ میرا باپ میری والدہ سے کہا کرتا تھا: ''میں شوہر ہوں اور ہمیشہ شوہر ہی رہوں گا تمھارا 'چھلگو' نہیں''۔ (ہال میں ایک بار پھر داڑھی والوں کی طرف سے تالیوں کی آواز آتی ہے)۔

اس موقعے پر میں یہ بھی آپ کو بتا دوں کہ تعلیم عورت کو آگاہ اور خود آرا بھی بنا دیتی ہے۔ میری شریک حیات مجھ سے ۱۲ رسال چھوٹی ہی نہیں بلکہ اس نے اپنے بدن کو لبھاونا اور پُرکشش بنائے رکھنے کے لیے برسوں سے روزانہ ایک گھنٹے کی ورزش کا معمول بنایا ہوا ہے، اور روزمرّہ کی غذا کے استعمال میں سخت احتیاط اور پرہیز کا بھی دخل ہے۔ اس عمل سے اس کے بدن کی خوبصورتی برقرار ہے اور جسم کے اعضاء کا توازن اُن کے حسن کے معیار کے مطابق ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ وہ گھر کے علاوہ باہر سوسائٹی میں بھی اپنے وجود کی قبولیت کی طالب ہے۔ تعلیم نے اس کے ہوش و حواس روشن کر دیئے ہیں تاکہ ان کے ذریعہ وہ اپنی ایک الگ پہچان اور دستخط بنا سکے۔ یہ کہنے میں مجھے عار نہیں کہ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو تسخیر کرنے کی خواہش مند ہے۔ میں اس بات کا گواہ ہوں کہ رات وہ تھک کر بستر پر ڈھیر ہو جاتی ہے شاید نیند میں اپنی دن بھر کی فتوحات کا شمار کرتی ہے۔ اس کی جانب نئے ملتفت ہونے والوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اس کے لیے سب سے بڑی مسرّت کا باعث بنتی ہوگی کیونکہ اسے معلوم ہے اس میدان میں مقابلہ آرائی جاری ہے۔ کبھی کبھی میں اسے اس لگاتار جاری رہنے والے مقابلے میں تھکا تھکا سا محسوس کرتا ہوں تو پوچھتا ہوں: ''کیا تھک گئیں''۔ جواب میں وہ مسکرا کر پھر جلدی سے تازہ دم ہو کر مقابلے میں کود پڑتی ہے۔ اس کے پاس تعلیم ہے اور پیسہ بھی

ہے خوبصورت اور متناسب بدن بھی ہے پھر وہ کونسی ایسی ضرورت ہے جو چین سے اسے بیٹھنے نہیں دیتی اور اسے یہ کہہ کر بھٹکاتی رہتی ہے: ''اور لاؤ۔ اور لاؤ''۔ (ہال کی نشستوں سے تالیوں کی گڑگڑاہٹ صاف سنائی دیتی ہے)۔

آپ کا ادارہ بڑا نیک کام کر رہا ہے۔ دس سال میں آپ لاکھوں روپیہ طلباء کے اسکالرشپ اور دیگر تعلیمی مالی امداد پر خرچ کر چکے ہیں۔ میرے والد بھی ان کاموں کے لیے بہت مدد کرتے تھے۔ میں بھی آپ کی مدد کروں گا کیونکہ تعلیم ہوش مندی پیدا کرنے کا عمل ہے۔ لیکن ہوش مندی ہلکان بھی کرتی کیونکہ ہوش مندی جہاں ایک نعمت ہے، وہیں ایک عذاب بھی ہے۔

حضرات! میں نے اپنی جوانی کے زمانے میں جب خون بے حد گرم تھا ملک کے اس وقت کے وزیراعظم سے جو بین الاقوامی شہرت کے مدبر بھی تھے ایک جنگلی منہ پھٹ کی طرح یہ کیوں کہہ دیا تھا کہ: آپ کی پالیسیوں نے مسلمانوں کو برباد کر دیا۔ کیا اس بات کا علم وزیراعظم کو مجھ سے زیادہ نہ تھا۔ کیا وزیراعظم کو یہ نہیں معلوم تھا کہ ملک میں سالہا سال سے ہونے والے دنگوں پر خرچ ہونے والی کثیر رقم کا پاسنگ بھی مسلمانوں کے قومی کردار پر دھار رکھنے کے لیے نہ خرچ ہوا اور وہ ہمیشہ ملک پر ایک Liability بنے رہے۔

وزیراعظم کو تو یہ سہولت حاصل تھی کہ وہ ہر موضوع کے ماہرین کو جب چاہتا مشورے کے لیے طلب کر سکتا تھا لیکن اس کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ اگر آپ سب کچھ جانتے ہیں تو اس کی اہمیت نہیں ہے۔ سوال یہ اُٹھتا ہے کہ آپ کس لیے جاننا چاہتے ہیں اور جس مقدار میں جاننا چاہتے ہیں اس کی مصلحت کیا ہے۔ آپ جتنے زیادہ ہوش مند، حساس، روشن خیال اور روشن ضمیر ہوں گے شب خوابی کے لیے اتنی ہی زیادہ نیند کی گولیاں کبھی کبھی آپ کو کھانا پڑیں گی۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ کچھ دیر پہلے ہی میری بیوی باہر کوئی کام انجام دے کر ہال میں داخل ہوئی ہے۔ امید ہے کہ ادارے کے صدر محترم اسے بھی ذرا دیر کو مخاطب ہونے کا موقع دیں گے۔ میں نے اس کا زادِ راہ خود ادا کیا ہے۔ آپ کا مہمان ہو کر میں ایک نیک کام کے لیے یہاں آ کر اپنے خرچ پر ٹھہرا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میری قوم کے لوگ سربلندی کے ساتھ درازی عمر کے ساتھ اور امن و آشتی کے ساتھ سرخرو ہو کر زندگی گزاریں۔

ایک بار ایسا ہوا کہ جب میں نے بورڈ کے امتحانوں سے متعلق ایک مسلم کالج میں سائنس کا نتیجہ صرف ۲۰ فیصدی دیکھا تو میں تڑپ گیا۔ رات بھر بستر پر کروٹیں بدلتا رہا جب صبح کے چار بجے تو میں نے اپنے ڈرائیور کو جگایا، ضروریات سے فارغ ہو کر تیار ہوا تو ڈرائیور بھی وردی میں تیار ہو چکا تھا۔ میں نے چھوٹی گاڑی نکلوائی کیونکہ جس گلی میں اس کالج کے سائنس ڈیپارٹمنٹ کا انچارج رہتا تھا اور جسے میں جانتا بھی تھا وہ گلی اتنی کشادہ نہ تھی کہ وہاں بڑی گاڑی گھوم سکتی۔ جب میں نے اس کے گھر کی گھنٹی کئی بار بجوائی تو صبح کے

سوا پانچ بجے تھے اور میرے کمرے میں ملازم کا بیڈٹی لانے کا وقت تھا۔ آنکھ ملتے ہوئے ایک بڑے میاں نے دروازہ کھولا اور بولے:

''کون آئے؟'' میں نے اپنا نام بتایا تو ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا، تھوڑی دیر بعد بدحواس اور حیران پریشان ماسٹر صاحب کمرے میں تولیے سے منہ پونچھتے وارد ہوئے۔ تو میں نے ذرا دیر میں ان کی ایسی کی تیسی کر کے رکھ دی۔ اتنا ذلیل کیا کہ روہانسے ہوگئے۔ ہر دوسرے روز ان کے کالج پہنچ جاتا، اسٹاف روم میں گھس جاتا، پتہ لگتا کہ اسٹاف کا ایک کلب ہے جسے کا پیُو کلب کہتے تھے۔ جس میں کالج کا ایک چوکیدار جو اچھا باورچی بھی تھا ہر پندرھویں دن اسٹاف کے لیے چندے کی بریانی پکانے پر معمور تھا۔ اس وقت اسٹاف کے لوگ بریانی کھا کر قیلولے میں مصروف تھے، یہ دیکھ کر تو میں ان کے سر پر سوار ہوگیا، آئے دن ان کو یاد دلاتا کہ وہ قوم کو اپاہج بنانے کے منصوبوں کو انجام دینے میں دیر کیوں لگا رہے ہیں، کالج بند کر کے مونگ پھلی کیوں نہیں بیچتے، تین سال تک تو تواتر سے میں ان کے سروں پر سوار رہا۔

جیسے ہی میں کالج کے کیمپس میں گھستا میری بھوک پیاس سب مرجاتی، کھانے پینے کا ہوش نہ رہتا۔ یہ ذیابیطیز (Diabetese) مجھے اسی زمانے میں ہوئی تھی۔ سائنٹفک کلچر اور اُس کلچر سے تعاون کرنے والی فضا کلاس اور کلاس کے باہر قائم کرنے میں آندھی روگ آگیا۔ طالب علموں کے پرانے رویے بدلنے کے لیے ان کی سوچ بدلی کہ یہی بچی تعلیم کا سب سے بڑا مقصد ہے، (تالیاں بجتی ہیں، جنھیں سن کر مقرر خوش ہوتا ہے) درجوں میں سائنٹفک ٹمپرامنٹ کو Disciplined کرنے کے لیے طلباء کے گھر والوں کے مسلسل تعاون کی ضرورت تھی اس لیے پرنسپل کو ساتھ لے کر مہینے میں ایک بار طلباء کے گھروں پر جانا اور ان گھروں کے الگ الگ ذوق کے مطابق اچھی بری، کالی سفید چائے، کبھی صاف اور کبھی گندی پیالیوں میں پینے کی سزا بھگتنا، گھر والوں کو مختلف پروگراموں پر عمل کرنے کی ترغیب دینا۔ یہاں تک کہ کمزور طلباء کے لیے کالج کے ہی ایک حصے میں Subject کے ماہرین کا تقرر کر کے طلباء کی تقریباً مفت کوچنگ کا انتظام کرنا کافی تھکا دینے والا کام تھا۔ پھر تو اسی کالج میں سائنس کے 80% فیصدی طلباء اعلیٰ نمبرات سے پاس ہونے لگے اور کوئی فیل نہیں ہوا۔

مجھے ایسا لگتا ہے کہ ضعیفی میں بھی مجھے بہت کچھ کرنا ہے۔ میرے پاس پیسہ تو ہے لیکن اعضاء مضمحل ہوگئے ہیں، اس کمزوری کو ہی اب اپنی طاقت بنانا ہوگا۔ آپ اگر مضبوط ارادوں کے ساتھ اپنی بوٹی بوٹی میں زندگی کی پھڑک دھڑکا کر کام میں لگ جائیں تو میں بھی آپ کے ساتھ لگ جاؤں گا۔ اس ادارے کو میں کیا مالی امداد دے رہا ہوں وہ اس کا دفتر آپ کو بتا دے گا مجھے اپنے منہ سے اعلان کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ شکریہ۔ بہت بہت شکریہ۔

اتنا بول کر اس دن کے خصوصی مقرر نے مائک چھوڑ دیا اور قدرے کانپتے قدموں کے ساتھ اپنی

جگہ پر بیٹھ گیا۔ اس کی خواہش کے مطابق اس کی بیگم کو تقریر کی دعوت دی گئی۔ جس کو خاصے اصرار کے بعد قبول کیا گیا وہ بھی جب صدر کی بیگم خاص طور پر انھیں ڈائس پر اپنے ساتھ لے کر آئیں۔ ہال میں زوردار تالیاں بجیں جب انھوں نے مسکرا کر آداب کیا۔ خاموشی ہوئی تو مائک پر کھڑی خاتون کی آواز گونجی:

منتظمین حضرات سے درخواست ہے کہ میرے شوہر کے لنچ کا وقت ہو گیا ہے، انھیں ہال کے مہمان خانے میں لے جائیں، وہاں ان کا پرہیزی کھانا میں نے لگا دیا ہے اور انسولین کا انجکشن بھی تیار کر کے رکھ دیا ہے۔ یہ سن کر ان کے شوہر کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور دو والنٹیر انھیں سہارا دے کر ڈائس کی سیڑھیوں سے اتار کر باہر لے گئے تو مائک پر کھڑی خاتون سامعین سے یوں مخاطب ہوئی:

حضرات! میں نے اپنے شوہر کی تقریر جتنے غور سے سنی ہے اس سے زیادہ توجہ سے اُن تالیوں کو بھی سنا جن کا شور تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہال سے اُٹھ رہا تھا۔ اُن سامعین کو بھی نظروں میں بھر کر دیکھا جو تالیاں بجا رہے تھے یا خوش ہو کر پہلو بدل رہے تھے۔ حضرات! زندگی میں دو تین موقعے ایسے آئے ہیں جب سامعین نے ہم میاں بیوی کی تقریروں کی ایک ساتھ ساجھے داری کی ہے۔ وہ بھی ابھی دو سال کے اندر جب سے میں سفر میں ان کے ساتھ چلنے لگی ہوں۔ دراصل انھیں مجھے ساتھ لے کر چلنے کی عادت ہی نہ تھی اس لیے وہ بہت الجھتے ہیں۔ کچھ اس لیے بھی کہ ان معاملات میں زندگی بھر تو انھوں نے منمانی کی اور میں نے بھی عادتاً ان منمانیوں کو مسکراتے ہوئے لبیک کہا۔ وہ فلاحی کاموں کے جنون میں کیسی کیسی اجاڑ اور خراب کر دینے والی بستیوں میں قیام کر کے اور خود کو مچھروں سے کٹوا کر اور وہاں کے لوگوں کی نامرادیوں کے خلاف دن رات سر مغزی کر کے ملیریا کے تیز بخار میں بے ہوش جب گھر واپس آتے تو کرائے کی نرس سے خدمت لینے کے بجائے خود میں اپنے ہاتھوں سے رات رات بھر ان کے ماتھے پر برف کے پانی کے ٹھنڈے پھائے رکھتی۔ برسوں ایسا ہوا ہے کہ آئے دن میں نے ان کے سفر کے کپڑوں اور دیگر ضروری سامان سفر پر جانے سے پہلے ان کے سوٹ کیس میں بھرا ہے اور واپسی پر خالی کیا ہے۔ جس میں عام طور پر وہ بنیان وہیں چھوڑ آتے تھے جہاں ٹھہرتے تھے۔ اُن کی ذاتی سکریٹری بن کر ان کی مسلسل مصروفیات کے گوشوارے، ملاقاتوں کے اوقات، ٹیلی فون پر ضروری رابطے، اداروں، انجمنوں اور افراد سے ہونے والی ضروری مذاکرات کی فائلیں میں نے سنبھالی ہیں۔

حضرات! مجھے لے کر آج میرے شوہر نے اپنے دل میں جس جلن اور حسد کا ذکر کیا۔ اس سے میری دل آزاری نہیں ہوئی ہے کیونکہ میرا یہ ماننا ہے کہ نہ انسان عورت ہوتا ہے اور نہ مرد، وہ اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ صرف انسان ہوتا ہے۔

آپ نہیں جان سکتے کہ حاجت مندوں کو پھلتے پھولتے اور کامیاب ہوتے دیکھنے کے جنون اور شوق نے کتنا خود سے بے خبر کر دیا ہے میرے شوہر کو، میرا بیٹا سرجن (Surgeon) ہے۔ وہ کہتا ہے: میرا

باپ آخری درجے پر پہنچ جانے والے کینسر کا مریض ہے اور کینسر بہت طرح کے ہوتے ہیں۔ دوسروں کو خوشیاں بانٹنے اور ان کی ناؤ پار کرانے کے لیے شب و روز کی ادھیڑبُن جو تیزی سے بوڑھا کر دے اور جس کی شرابیوں جیسی لت پڑ جائے ایک کینسر سے زیادہ خطرناک ہے۔ شوہر کی اس لت سے میرے اوپر کیا گزرتی ہے کسی بیوی سے پوچھیے بتادے گی کیونکہ کوئی بھی بیوی یہ نہیں چاہتی کہ اپنی لت میں مرجانے والے اس کے مرحوم شوہر کے نام منسوب کسی کلب یا اسکول کی عمارت کی افتتاحی تقریب کے موقعے پر سفید ساری میں ملبوس بھیگی آنکھوں سے دو جملوں کی تقریر کرنے کے لیے اُسے موقع پر بلایا جائے۔

سچ پوچھیے تو میرے شوہر کی تقریر کی بعض باتوں کو سراہنے کے لیے تالیوں کا جو شور اُٹھا تھا دراصل ان تالیوں نے مجھے زخمی کیا ہے۔ یہ تالیاں بجانے والے کون ہیں، میں نہیں جانتی لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں اپنے انداز سے جینا چاہتی ہوں۔ سفید ساری میں لوگوں کی مترحّم نگاہوں کی آنچ کے درمیان ہرگز نہیں۔ میری معلومات تو یہ ہے کہ تعلیم آدمی میں دوسروں کے لیے خیر خواہی اور ہمدردی کا جذبہ بڑھاتی ہے، ان باتوں کو برداشت کرنے کی صلاحیت اور قابلیت کو پختہ کرتی ہے جو باتیں کسی سبب سے اسے عادتاً ناقابلِ قبول ہیں۔ آخر میرے شوہر کے اندر ابھی تک وہ کمپیشن (Compassion) اور ٹالرنس (Tolerance) کیوں نہیں پیدا ہوا۔ وہ ہمیشہ اپنی تقریروں میں کہتے ہیں کہ تعلیم سوچ بدلتی ہے تاکہ پڑھا لکھا انسان نئے رویے اختیار کر سکے۔ یہ بات سامعین کو اچھی لگتی ہے۔ وہ تالی بجاتے ہیں لیکن میرے شوہر یہ بھی کہتے ہیں کہ: بیوی کو اتنی شہرت نہیں کمانا چاہیے کہ اس کے شوہر کی شہرت کو گہن لگنے لگے۔ ایک طرف نئے رویے اختیار کرکے نئی کامیابیاں حاصل کرنے کی تلقین ہے تو دوسری طرف بیوی پر شوہر کی شہرت سے آگے نہ نکلنے کی پابندی۔ حیرت یہ ہے کہ دونوں ہی متضاد باتوں پر تالیاں بجتی ہیں۔ میں ہال میں بیٹھی برقعہ پوش لڑکیوں سے جنھیں یہاں مجمع بڑھانے کے لیے لایا گیا ہے، پوچھنا چاہتی ہوں کہ اگر مجھے زندگی کی جدوجہد میں اپنے شوہر سے زیادہ مرتبہ اور شہرت ملتی ہے تو کیا اس دھڑکے اور خوف میں اس کو میں قبول نہ کروں کہ ایسی شہرت میرے لیے ممنوع ہے، ان برقعہ پوشوں میں لگتا ہے ایک بھی لڑکی ایسی نہیں جو میرے شوہر سے پوچھ سکے کہ اگر اُس کے پتے سے خلق کو اس کے شوہر کا پتہ ملتا ہے تو شوہر کی ذات پر کون سا بٹا لگ جائے گا (پھر شدّتِ جذبات سے خاتون کا سفید چہرہ یکا یک سرخ بلکہ توتلی رنگ کا ہو گیا، آواز میں کپکپاہٹ دَر آئی) وہ اپنے پر قابو پاتے ہوئے آگے صرف اتنا کہہ پائی:

''پوچھیے میرے شوہر کو بلا کر سب کی گواہی میں کہ تعلیم نے ان کی کتنی سوچ بدلی ہے''؟ یہ کہہ کر وہ تیزی سے مائک چھوڑ کر ونگ میں غائب ہو گئی۔ کچھ دیر ہال میں سناٹا رہا جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔

چند رسمی باتوں اور شکریہ کے اظہار کے ساتھ جلسے کے اختتام کا اعلان ہوا، سامعین ہال سے باہر نکلنے لگے۔

ایک درخت کے سائے میں پانچ سات برقعہ پوش لڑکیوں کا ایک غول سے باہر آنے والوں پر

نظریں جمائے کھڑا تھا۔ جب اس گروہ نے مہمان خصوصی کی بیگم کو باہر نکل کر ان کی جانب بڑھتے ہوئے دیکھا تو پورا گروہ ان کی جانب دوڑ پڑا۔ ایک لڑکی نے بڑھ کر اپنی آٹوگراف بک اُن کی جانب بڑھادی اور باقی نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ خاتون نے آٹوگراف بک کو نظر انداز کرتے ہوئے اس لڑکی سے پوچھا:

''تم ہی لوگ تھے نا جو ایک کونے میں سب سے زیادہ خاموش اور دُبکے ہوئے بیٹھے تھے''۔

جواب میں دھیرے سے لڑکی بولی: ''جی ہاں''۔ پھر فوراً ہی دوسری لڑکی چہک کر بول اُٹھی:

''ہم آپ کی باتوں سے بہت خوش ہوئے''۔ تیسری لڑکی جس کی آنکھوں میں چمک تھی اور آواز میں بے قراری، نے بات کاٹی:

''ہم تو یہی سوچتے رہ گئے کہ کیا کریں؟ آپ اپنا آٹوگراف دے دیجیے'' یہ کہہ کر اس نے اپنی بک بھی خاتون کی طرف بڑھادی۔

''نہیں۔'' خاتون نے بک کو ایک ہاتھ سے الگ ہٹادیا اور یہ کہہ کر آگے بڑھ گئی:

''جب تم لوگ غلط باتوں پر اپنے احتجاج کا بے جھجک مظاہرہ کرنا سیکھ جاؤ گی تب میں خود تمھارے پیچھے تمھارا آٹوگراف لینے دوڑوں گی''۔

دوسرے دن کے اخباروں میں اس جلسے کی روداد پہلے سے لکھے ہوئے بعض حصوں کے ساتھ شاندار رپورٹ کی شکل میں شائع ہوئی، پتہ لگا مہمان خصوصی ایک لاکھ کا چیک دے کر گئے ہیں لیکن ان کی تقریر کے بعض حصے حذف کر دیئے گئے تھے اور بیگم صاحب کی تقریر میں اُٹھائے گئے اعتراضات بھی غائب تھے۔

بعد میں پریس والوں نے جب ادارے کے بڑی داڑھی والے صدر سے مہمان کی بیگم کی تقریر پہ ان کی رائے جاننا چاہی تو صدرِ محترم نے جواب دیا: ''ہمارا کام طلباء کو تعلیم کے بہتر مواقع فراہم کرانا ہے، تانیثیت وغیرہ کی بحثوں میں الجھنا نہیں''۔

☆☆☆

ڈھونڈھ پھری چاروں دھام

● زاہدہ حنا [پاکستان]

تقریب ختم ہوئی تو سجاتا اتنی تھک چکی تھی کہ اس نے اپنی پبلشر سے ایک پینٹنگ اگزبیشن میں جانے اوراس کے بعد ڈنر پر چلنے سے معذرت کرلی۔ اسے قدرے حیرت ہوئی کہ اس نے بھی اصرار نہیں کیا، جس پر اس نے سکھ کا سانس لیا، پبلشر نے اس سے رخصت ہوتے ہوئے یہ ضرور کہا تھا کہ: یہاں اکیلے کہیں نکل جانے کا ایڈونچر نہ کرنا اور سجاتا نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ شاپنگ آرکیڈ میں بھی جھانک کرنہیں دیکھے گی۔ اب وہ اس سے کیسے کہتی کہ میں تنہائی میں اپنی کامیابی سے لطف اٹھانا چاہتی ہوں اور آرام کا بھی جی چاہ رہا تھا۔ کل بوٹ کلب میں لنچ، شام کو ساؤتھ ایشیا کے انگلش لٹریچر پر ایک لیکچر اور پھر ایک ڈنر جو اس کی پبلشر نے دیا تھا اور جس میں شہر کے لٹریری اور آرٹ کریٹکس سے ملاقات ہونے والی تھی۔ اسے یقین تھا کہ لیکچر اور ڈنر دونوں میں سوالوں کا ہجوم ہوگا اور ان سوالوں کے سامنے وہ تنہا ہوگی۔ دوسرے دن اسے موئنجوڈرو جانا تھا جس کا ویزا اسے مشکل سے ملا تھا۔ اسی لیے آج کی رات وہ چین سے سونا چاہتی تھی۔

وہ سب سے رخصت ہو کر لفٹ کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ لفٹ ابھی گراؤنڈ فلور پر نہیں آئی تھی کہ ایک لڑکی نے ''ایکسکیوزمی'' کہہ کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ سجاتا کو فوراً یاد آ گیا۔ یہ لڑکی تقریب میں سب سے پہلی قطار میں تھی، بہت توجہ سے اسے سن رہی تھی اور لگاوٹ بھرے انداز میں دیکھ رہی تھی۔

''میرا نام سیما ہے۔ یہاں کے ایک انگریزی اخبار کی رپورٹر ہوں اور آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہ رہی ہوں۔'' وہ خوش دلی سے مسکرائی۔

سجاتا کا جی چاہا کہہ دے اس وقت میں بہت تھکی ہوئی ہوں۔ لیکن اس لڑکی میں کچھ ایسی کشش تھی کہ وہ اس سے کچھ بھی نہ کہہ سکی، وہ بھی شاید اس کا ذہن پڑھ رہی تھی اس لیے سجاتا کے کچھ کہنے سے پہلے بول

پڑی: ''ایسی تقریبات واقعی تھکا دیتی ہیں۔ آپ آرام کیجیے گا۔ میں آپ سے چند باتیں کر کے چلی جاؤں گی۔'' سیما اس طرح بات کر رہی تھی جیسے اس سے برسوں کی جان پہچان ہو۔

چند منٹ بعد وہ دونوں ساتویں منزل کے اس کمرے میں تھیں جو ٹھنڈا تھا اور پھولوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ رائٹنگ ٹیبل پر درجن سے کچھ زیادہ ہی گلدستے ڈھیر تھے جو اس کی پبلشر کی ہدایت پر بیل بوائے نے اس کے پہنچنے سے پہلے ہی کمرے میں لا کر رکھ دیے تھے۔ سیما ان گلدستوں کو دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ سرخ اور زرد گلاب، سفید کنول، سرخ اور نارنجی گل لالہ، کارنیشن۔ اپنی سبز ٹہنیوں سمیت سلوفین میں لپٹے ہوئے اور کئی رنگ کے نازک ریشمی فیتوں سے بندھے ہوئے۔ ان فیتوں میں گلدستہ دینے والوں کا وزٹنگ کارڈ بھی پرویا ہوا تھا۔

سیما ان پر لکھے ہوئے نام پڑھنے لگی: ''واہ! آپ نے تو یہاں کے بڑے لوگوں کے دل جیت لیے۔''

سجاتا نے دیکھا تھا کہ ان پھولوں کو دینے والوں کی آنکھوں میں اپنائیت کے گہرے رنگ تھے۔ ان لوگوں کو عموماً دشمن فرض کیا جاتا تھا۔ اگر دشمن ایسے ہوتے ہیں تو دوست کیسے ہوتے ہوں گے۔

وہ سیما کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ اس نے جب ''آنند بازار پتریکا'' میں کام شروع کیا تھا تو وہ بھی ایسی ہی تھی۔ بے دھڑک لوگوں کے پاس پہنچ جانے والی۔ کسی کامیاب صحافی کی سب سے بڑی خصوصیت۔

سجاتا ساڑی کا پلّو ایک طرف کو ڈالتی ہوئی صوفے پر نیم دراز ہو گئی۔ کتاب کا ایک باب سنانے اور بعض سوالوں کے جواب دینے کے بعد تقریب جب ختم ہوئی تو درجنوں لوگوں نے اس کی کتاب خریدی تھی اور اس پر دستخط لیے تھے۔ کچھ نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا تھا کہ وہ ہندو ہے، بنگالی ہے، تو پھر اس نے ایک مسلمان لڑکی کی زندگی کو جاننے اور اس کے بارے میں لکھنے پر کئی برس کیوں لگا دیے۔

سجاتا حیرت اور داد و تحسین کے جملے سن کر مسکراتی رہی تھی۔ اسے یہ کہنا اچھا نہیں لگا تھا کہ تاریخ کپڑے کا تھان نہیں ہوتی جسے پھاڑ کر آدھا آدھا کر لیا جائے۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے میزبان ان باتوں کے بارے میں بہت حساس ہیں۔ 1971ء سے پہلے ان کی تاریخ میں بنگال کے تیتو میر، قاضی نذر الاسلام، لالن فقیر اور زین العابدین شامل تھے۔ ڈھاکا جو مسجدوں کا شہر تھا یہ لوگ اس پر اتراتے تھے اور اس بات کا ذکر بھی کرتے تھے کہ مسلم لیگ کا پہلا جلسہ 1906ء میں نواب صاحب ڈھاکا کے گھر پر ہوا تھا۔ لیکن اب ڈھاکا اور نواب صاحب ڈھاکا، نئی نسل کے لیے کتابوں میں لکھے ہوئے نام تھے۔ جہاں تاریخ کا دائرہ مسلسل تنگ ہو رہا ہو اور جغرافیہ سکڑ رہا ہو وہاں جملے احتیاط سے بولنے چاہئیں۔ پھر وہ اپنے اندر شرمندہ سی ہو گئی۔

احتیاط سے جملے بولنے، لکھنے اور تصویریں یا مجسمے بنانے کا معاملہ تو اب ہندوستان میں بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ تسلیمہ نسرین کو ہندوستان کی شہریت نہیں مل سکی تھی اس لیے کہ ہندوستانی مسلمان اس کے خلاف تھے۔ ایم ایف حسین نے جلاوطنی اختیار کی تھی، کیسے نہ کرتے کہ ہندو انتہا پسند ان کی مصوری کے شاہکار جلاتے تھے، آرٹ گیلریوں پر حملے کرتے تھے۔ ارون دھتی ہندوستان کے ایٹمی دھماکوں کے خلاف لکھتی تھی، اس لیے

بی جے پی اور جن سنگھ اس سے نفرت کرتی تھی۔ اور خود سجا تا کی اس کتاب کے خلاف رائٹ ونگ نے کتنا ہنگامہ کیا تھا۔ ان پارٹیوں کے لیڈروں کے اخباروں میں بیان چھپتے رہے تھے، اسے اور دوسری لکھنے والیوں کو چنوتی دی گئی تھی کہ یورپ اور امریکا سے پڑھ کر آنے والی مہیلائیں اپنے لبرل ازم اور سیکولرازم سے اور مسلموں کی حمایت سے ہاتھ اٹھالیں، وہ ہماری پرم پرا کو، ہماری سنسکرتی کو ناش کررہی ہیں۔ اخباروں میں مضمون چھپے تھے مُسلموں کو جی جان سے چاہنے والی سجا تا جی کو ہمارے چتوڑ کی شہید رانی پدمنی یاد نہ آئی جس نے اپنی عزت بچانے کے لیے ہزاروں مہیلاؤں کے ساتھ 'جوہر' کیا تھا۔ آگ میں کود کر امر ہوگئی تھی اور ترکوں کو قریب نہیں آنے دیا تھا۔ ہمیں ٹیپو کی پوتی پروتی سے کیا لینا، اسی ٹیپو نے ہمارے مندر توڑے تھے۔ ہماری رانی لکشمی بائی اس لیے شہید ہوئی تھی کہ اس کے مسلمان سپاہیوں نے اس سے غداری کی تھی، انگریزوں سے جا ملے تھے۔

یہ جھوٹ سجا تا کو یاد آیا تو اس وقت بھی اسے جھرجھری سی آگئی۔ ہر طرف جھوٹ کی دکان سجی تھی۔ یہ مسلمان سپاہی تھے جو لڑتے کٹتے ہوئے شہید رانی کی لاش کو انگریز فوج کے بیچ سے نکال لے گئے تھے اور میدان جنگ میں اس کی چتا تیار کر کے اسے آگ دی تھی۔ رانی ان کی عزت تھی، اس عزت پر آنچ نہ آئے۔ یہ کون لوگ تھے جو اتہاس پر کالک پھیر رہے تھے۔؟ یہاں اور وہاں ہر جگہ گوئبلز کی اولادیں پھل پھول رہی تھیں۔ جھوٹ بولو، جھوٹ کے اتنے اونچے پہاڑ اٹھاؤ کہ سچ اس کے نیچے دفن ہو جائے۔ گہرا دفن۔

اس کی کتاب جب چھپی اور اس کے خلاف مظاہرے ہوئے، اخباروں میں مضمون چھپے، اس کا ای میل اکاؤنٹ گالیوں اور دھمکیوں سے بھر گیا، تب اسے اندازہ ہوا تھا کہ اس کا ہندوستان کتنا بدل گیا ہے، نفرت کی کالی آندھی تھی جو مہاتما بدھ سے مہاتما گاندھی تک سب ہی کو اڑا کر لے جانے پر تلی ہوئی تھی۔ یہ وہ آزادی تو نہیں تھی جس کا خواب سب ہندوستانیوں نے دیکھا تھا۔ آزادی کی اپسرا کو نفرت کا راکھشس لے اڑا تھا اور وہ سب بے بسی سے دیکھتے رہ گئے تھے۔

شاید یہی وجہ تھی کی جب اس کی کتاب پاکستان میں شائع ہوئی اور اس کی پبلشر نے اسے لاہور، اسلام آباد اور کراچی آ کر اپنی کتاب لانچ کرنے کی دعوت دی تو وہ خوش ہوگئی۔ اسے یقین تھا کہ پاکستان میں ٹیپو کے بہت چاہنے والے ہوں گے اور وہاں اس کی کتاب کو بہت داد ملے گی۔

سجا تا نے دلّی اور ممبئی میں لوگوں کو جب بتایا تھا کہ اپنی کتاب کے پبلسٹی ٹور پر اسے پاکستان بلایا جارہا ہے تو اکثر لوگوں نے اسے ڈرایا تھا۔ ممبئی کے تاج محل ہوٹل میں خون کی ہولی کھیلی جاچکی تھی۔ روایت کے عین مطابق دونوں ملکوں کے تعلقات خراب تھے۔ لوگوں نے کہا تھا کہ وہاں ہندوستانیوں کے ساتھ خراب سلوک ہوتا ہے۔ ہر طرف آتنک وادی گھومتے ہیں اور ہر دوسرے تیسرے سوسائیڈ بامبنگ ہوتی ہے جس میں سینکڑوں مارے جاتے ہیں۔

اس نے فون پر یہ باتیں اپنی پبلشر سے کہہ دی تھیں تو وہ بہت ہنسی تھی۔

''تم ایک بار آ کر تو دیکھو۔ تمھیں افسوس ہوگا کہ اس سے پہلے کیوں نہیں آئیں۔''

وہ دلّی سے لاہور پہنچی تھی، یہ وہ شہر تھا جس کی یاد میں لاکھوں ہندوستانی آج بھی تڑپتے تھے۔ کسی نے کہا تھا کہ: وہاں جا رہی ہو تو سنت نگر ضرور جانا، کوئی اسے کنیرڈ کالج جانے کی تاکید کر رہی تھی۔ لاہور میں اس کی ملاقات کتنے ہی لوگوں سے ہوئی تھی جنھیں اس کی کتاب سے زیادہ ان شہروں سے دلچسپی تھی جنھیں وہ یا ان کے ماں باپ چھوڑ آئے تھے۔ بوڑھی عورتیں کوئین میری اسکول اور ازابلا تھوبرن کالج کو یاد کرتی ہوئی، اجیت کور اور خوشونت سنگھ کی خیریت پوچھتی ہوئی۔ امرتا پریتم کو یاد کرتی ہوئی۔ امرتا پریتم پنجابی ادب کا قطب ستارہ جو کچھ دنوں پہلے ڈوب گیا تھا۔

اسلام آباد میں اسے مزہ نہیں آیا تھا، لیکن اس کی کتابیں سب سے زیادہ اسلام آباد میں بکی تھیں۔

وہ کراچی پہنچی تو اس کی پبلشر اسے سیدھے ہوٹل لے گئی۔ گاڑی جب میریٹ پہنچی اور میٹل ڈیٹکٹر سے اسکیننگ کے بعد پولیس کے کتوں نے گاڑی کو سونگھنا شروع کیا تو اسے جھرجھری آ گئی تھی۔

دو گھنٹے بعد جب وہ ہال میں داخل ہوئی تو ہر طرف اس کے اور نور کے بڑے بڑے رنگین پینا فلیکس پوسٹر تھے اور کتاب کی جلدیں سلیقے سے سجی ہوئی تھیں۔ سجاتا کو یہ دیکھ کر اچنبھا ہوا تھا کہ ہال بھرا ہوا تھا اور سننے والوں میں بہت سی لڑکیاں اور عورتیں تھیں۔ زیادہ تر لڑکیاں جینز اور کرتی میں اور کئی عورتیں دلکش ساڑیوں میں نظر آ رہی تھیں۔ ان سب نے کھڑے ہو کر اس کا سواگت کیا تھا۔ اور انگریزی محاورے کے مطابق اس کی راہ میں سرخ قالین بچھا دیا تھا۔ اسے کراچی والوں سے اتنی گرم جوشی کی امید نہ تھی۔

حیرت اسے صرف اس بات پر ہوئی تھی کہ یہاں کے لوگ بھی اس لڑکی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے جو ان کی ہم مذہب تھی؛ جس کی رگوں میں انگریزوں سے آزادی کے لیے لڑنے والے شہید کا خون دوڑتا تھا۔

''آپ کہیں کھو گئیں۔''

سیما کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

''آئی ایم سوری۔ سب سے پہلے تم یہ بتاؤ کہ تم کافی کے ساتھ کیا لوگی۔ مجھے تو اب بھوک لگ رہی ہے''
اس نے انٹرکام کا ریسیور اٹھا کر چیز سینڈوچ' فرائیڈ فش اور کافی کا آرڈر دیا۔ سیما اسے منع کرتی رہ گئی تھی۔

''تم میرے کہیں کھو جانے کی بات کر رہی تھیں۔ میں دراصل یہ سوچ رہی تھی کہ جب میں اپنی کتاب کا ایک باب پڑھ رہی تھی تو سب لوگوں کی آنکھوں میں حیرت کیوں تھی۔ یہاں کے لوگ اسے کیوں نہیں جانتے؟''

''کمال ہے کہ آپ یہ سوال کر رہی ہیں۔ آپ ہندوستان کی ہیں۔ انگلینڈ میں خاصا وقت ساؤتھ ایشین مسلمانوں کے ساتھ گزارتی ہیں۔ پھر بھی یہ بات آپ کی سمجھ میں نہیں آئی؟'' سیما مسکرا رہی تھی۔

''میرے خیال میں تم مجھے سمجھا دو تو اچھا ہو۔''

''میڈم۔ ہم اپنی عورتوں اور لڑکیوں کو انسان نہیں سمجھتے۔ مغل بادشاہ اپنی بیٹیوں اور بہنوں کی شادی کو اپنی توہین سمجھتے تھے۔ ہمارے یہاں ایسے کچھ گھرانے بھی تھے جو اپنی لڑکیوں کی شادی قرآن سے کر دیا کرتے تھے۔''

''قرآن سے؟'' اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''جی ہاں۔ اس طرح جائیداد تقسیم نہیں ہوتی' اور گھر میں پیری مریدی بھی شروع ہو جاتی ہے۔ اورنگ زیب نے اپنی بیٹی شہزادی زیب النساء کی شادی نہیں کی اور اس کی عشقیہ شاعری بھی اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ اس کے درباری مورخوں نے لکھا کہ ایران کا کوئی شاعر ہندوستان آیا تھا جس کا تخلص ''مخفی'' تھا۔ قرآن لکھ کر اور ٹوپیاں سی کر زندگی گزارنے والے ہمارے حضرت اورنگ زیب عالمگیر کو بدنام کرنے کے لیے اس کا دیوان شہزادی زیب النساء کے نام سے منسوب کر دیا گیا۔ ورنہ عشقیہ شاعری اور ہماری محترم شہزادی توبہ توبہ۔'' سیما نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگایا اور سجاتا کو ہنسی آ گئی۔

''یقین کریں میڈم اگر مکھن لال اور ویسٹ بروک نہ ہوتے اور ان سے پہلے شہزادی کی جان نثار کنیزیں نہ ہوتیں جنھوں نے اس کے لکھے ہوئے ورق محفوظ کر لیے تھے تو ہماری اس شاعرہ کا نام بھی گم نامی کے قبرستان میں دفن ہو جاتا۔'' سیما بولتی چلی گئی۔ سجاتا کو ممبئی، کولکتہ، دلّی کی لڑکیاں یاد آئیں۔ اسی طرح زور زور سے بولتی ہوئی، بحث کرتی ہوئی۔ کروڑی مل کالج کے لڑکے ایسی ہی لڑکیوں کے لیے گاتے تھے۔ لڑکی ہے کہ پھلجھڑی ہے۔ پٹاخے کی لڑی ہے۔ پاکستان میں ایسی لڑکیاں بھی ہوتی ہیں؟ یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ سچ ہے کسی سماج کی کتنی ہی پرتیں ہوتی ہیں اور ہم کسی ایک پرت کو ہی سارا سچ جان لیتے ہیں۔

''لیکن میری ہیروئن سے تم لوگوں کو کیا اختلاف ہو سکتا تھا۔ وہ بیچاری تو عشقیہ شاعری بھی نہیں کر رہی تھی۔''

''آپ کا بھی جواب نہیں۔ آپ نے اپنی کتاب میں خود لکھا ہے کہ پہلے ان کے والد وینا اور ستار لے کر ٹُن ٹُن کرتے ہوئے یورپ میں گھومنے لگے۔ سوچیں تو سہی کہ شہید کا خون اور گانے بجانے میں پڑ جائے۔ شادی فرنگن سے کر لی۔ صاحبزادی ہوئیں تو وہ سایہ پہن کر فرنچ اور انگلش بولتی رہیں۔ دوسری جنگِ عظیم میں فرانس پر نازیوں کا قبضہ ہوا تو پیرس کو آزاد کرانے کے لیے میدان میں کود پڑیں۔ سگڑ دادا انگریزوں کے خلاف لڑتا ہوا شہید ہوا۔ یہ انگریزوں کی خفیہ ایجنٹ بن گئیں' نام نورا بیکر رکھا۔ گستاپو کے ہاتھ لگیں۔ نازیوں نے ان کا جو حشر کیا ہوگا وہ کوئی ڈھکی چھپی بات تو نہیں۔ آپ ہی بتائیے کہ مسلمان ایک ایسی لڑکی کو کیوں اپناتے جسے اپنی عزت کا ذرا سا بھی خیال نہیں تھا؟'' سیما نے بھنویں اٹھا کر پوچھا۔

''تمھیں شاید یہ معلوم نہ ہو کہ پیر و مرشد عنایت خان کی یورپ کے سفر میں ماتا ہری سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔'' سجاتا نے سیما کو اطلاع دی۔

''لیجیے یہ تو زبردست کنکشن ہوا۔ ابا ماتا ہری سے مل لیے تھے۔ بیٹی خود ماتا ہری ہوئی۔''

''جی نہیں۔ وہ قطعاً کسی یورپی ملک کی ایجنٹ نہیں تھی۔ وہ فرنچ انڈر گراؤنڈ ریزسٹنس کے لیے کام کر رہی تھی۔

قومیں اور انسان اپنی آزادی کے لیے اسی طرح کام کرتے ہیں۔ اس کا ماتا ہری سے کیا مقابلہ" سجاتا برامان گئی۔
سیما جو اسے غور سے دیکھ رہی تھی' بے اختیار مسکرائی۔ "آپ ہیں زبردست...... بنگالی ہیں...... ہندو ہیں اور ایک مسلمان لڑکی کو ماتا ہری کہنے پر برامان رہی ہیں۔"
"اور مجھے اس بات پر حیرت ہے کہ میری اس کتاب سے پہلے تم لوگوں کو اس کے بارے میں کچھ کیوں نہیں معلوم تھا۔"
"ڈیئر میڈم ہم لوگوں کو ہر پچیس برس بعد اپنی تاریخ نئے سرے سے لکھنی پڑتی ہے۔ تب ہی اب ہمارے یہاں اکثر کالجوں میں تاریخ نہیں پڑھائی جاتی۔ ہماری تاریخ اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب پہلے مسلمان نے ہندوستان میں قدم رکھا تھا۔ یہ مسئلہ ابھی حل نہیں ہوا ہے کہ وہ پہلا مسلمان کون تھا۔ ہم سب اسے ڈھونڈ رہے ہیں جب وہ ہمیں مل جائے گا، تو ہم آپ کو تار دے دیں گے۔" سیما نے لاپروائی سے کہا۔
"تمھارے لیے تاریخ کیا ہے اور کیا نہیں ہے یہ تم جانو' لیکن ہم بنگالیوں کے لیے تاریخ بدن میں دوڑتا ہوا خون ہے۔ اس کے بغیر ہم زندہ نہیں رہ سکتے۔ مجھے دیکھو بنگلہ میری مادری زبان ہے۔ انگریزی میں لکھتی ہوں۔ ہندی اور پنجابی بول لیتی ہوں۔ لتاجی کے گانے شوق سے سنتی ہوں۔ اقبال بانو اور فریدہ خانم پر فدا ہوں۔ ہولی' دیوالی کے ساتھ عید بھی مناتی ہوں اور اس مرشد زادی پر تو ہزار جان سے عاشق ہوں۔"
"لیکن کیوں۔ آپ نے جھانسی کی رانی کے بارے میں کیوں نہیں لکھا؟" سیما نے تیکھے لہجے میں سوال کیا۔
بالکل یہی سوال اس سے ممبئی اور احمد آباد کے ایک فنکشن میں بھی کیا گیا تھا۔ سوال کرنے والوں کی پیشانیوں پر بھبھوت اور کیسر ملا ہوا تھا اور آنکھوں میں نفرت کا زہر۔ سجاتا نے جھرجھری لی۔ یہ ممبئی اور احمد آباد نہیں کراچی تھا۔ مسلمانوں کا سب سے بڑا شہر۔ اسے یہاں اس سوال کی توقع نہ تھی۔
"بھئی تم تو ہندو مسلم فساد پر تل گئیں۔ یہ کیوں نہیں سمجھتیں کہ جھانسی کی رانی کے بارے میں بہت سی کتابیں لکھی گئیں اور وہ سبھدرا کماری چوہان کی نظم "خوب لڑی مردانی' وہ تو جھانسی والی رانی تھی" سارے ہندوستان میں مشہور ہے...... لیکن یہ تو گمنام تھی۔ اور پھر اس کا قصہ بھی بہت انوکھا اور پُر اسرار ہے۔ میں نے اپنی اس ہیروئن کی زندگی کے ٹکڑے چننے میں کئی برس گزارے ہیں اور انھیں جوڑ کر اس کی تصویر بنائی ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں دو انگریز فوجی افسر عورتوں کو جارج کراس ملا تھا۔ ان کی تصویریں لندن کے امپیریل وار میوزیم میں موجود ہیں' نور کو بھی جارج کراس ملا تھا لیکن اس کی تصویر میوزیم میں نہیں۔ میرا میوزیم والوں سے جھگڑا چل رہا ہے۔ میرا کہنا ہے کہ وہ انڈین ہے اس لیے تم لوگوں نے یہ کیا ہے۔"
"لیکن وہ انڈین کیسے ہوئی۔ ماسکو میں پیدا ہوئی۔ شہریت اس کی فرانس کی تھی۔" سیما نے جرح کی۔
"تم نہیں سمجھوگی۔ وہ انڈین تھی۔ اس کے لیے میں اسی طرح لڑوں گی جس طرح ہم سراج الدولہ بہادر کے لیے لڑے تھے" سجاتا کا لہجہ جوشیلا تھا۔

''میں آپ کی بات نہیں سمجھی۔ سراج الدولہ کے لیے کیا کیا تھا آپ لوگوں نے؟'' ۔ سیما سنبھل کر بیٹھ گئی۔

''جب انگریزوں نے نواب بہادر پر بلیک ہول والا الزام لگایا تو اس بات کو بنگال کے پروفیسروں نے غلط ثابت کیا تھا۔ اکاشی کمار مترا نے اس کے خلاف اس وقت لکھا تھا جب ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت تھی۔''

''زبردست ۔ یہ بات تو مجھے معلوم ہی نہیں تھی۔'' سیما کی آنکھیں چمکیں اور اس نے جلدی سے اپنی نوٹ بک میں کچھ لکھا۔

''ہمارے ڈاکٹر بھولا ناتھ چندر نے وہ کوٹھری جسے انگریزوں نے ''بلیک ہول'' کا نام دیا تھا' اتنے رقبے پر بانس کا جنگلا بنوا کر اس میں 146 آدمی ٹھونسنے کی کوشش کی لیکن ظاہر ہے یہ ممکن نہ ہوسکا تو انھوں نے کئی رسالوں اور اخباروں میں مضمون لکھا کہ انگریز جھوٹے ہیں۔ ہمارے نواب بہادر کو بلاوجہ بدنام کرتے ہیں۔''

''واہ۔ لیکن میں نے یہ باتیں کبھی کسی سے نہیں سنیں۔'' سیما کے لہجے میں حیرت تھی۔

''اس کے لیے تاریخ پڑھنی پڑتی ہے جو تمھارے کہنے کے مطابق یہاں پڑھائی نہیں جاتی'' وہ مسکرائی۔

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور روم سروس کی آواز آئی۔

''کم ان'' اس نے بلند آواز میں کہا۔ دروازہ آہستہ سے کھلا۔ بیرر نے ان دونوں کے سامنے پنیر کے سینڈوچ' تلی ہوئی مچھلی اور کافی کا پاٹ رکھ دیا اور جس آہستگی سے آیا تھا اسی طرح چلا گیا۔

اس نے سیما کی پلیٹ میں سینڈوچ اور مچھلی کا ایک ٹکڑا رکھا جو پیالیوں میں کافی انڈیل رہی تھی۔ مچھلی کے قتلے کو کانٹے میں پروتے ہوئے اچانک اسے خیال آیا۔ ''یہ بتاؤ تمھارا نام سیما کیسے ہے؟''

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔''

''یہ تو ہمارے یہاں رکھا جاتا ہے۔ یہ ہندی لفظ ہے۔ سیما، سرحد کو کہتے ہیں۔'' سجاتا نے سینڈوچ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''لیکن میرا نام میرے دادا نے رکھا تھا اور وہ کوئی ہندوانہ نام کیسے رکھ سکتے تھے۔ اس کے معنی ''پیشانی'' اور ''نشان'' کے ہیں'' ۔ سیما نے اسے بتایا۔

''زبانوں کے بھی ایک دوسرے سے خوب رشتے ناتے ہیں۔ یوں بھی اردو میں تو ہندوستان کی بہت سی زبانوں کا گھال میل ہے۔'' اس نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

''اردو پر فارسی اور عربی کا اثر زیادہ ہے۔'' سیما نے اصرار کیا۔

سجاتا کو خیال آیا کہ اگر یہ لوگ ایسٹ بنگال کے لوگوں پر اردو ٹھونسنے کی کوشش نہ کرتے تو شاید بنگلہ دیش نہ بنتا۔ لیکن سیما سے یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔

سیما اس سے باتیں کرتی رہی اور اپنی نوٹ بک میں لکھتی رہی۔ پھر اچانک اس نے اپنی گھڑی دیکھی اور ہڑبڑا کر کھڑی ہوگئی۔ ''نو بج گئے۔ مجھے اب چلنا چاہیے۔ ویسے بھی میں نے آپ کو بہت تنگ کرلیا۔ اب

اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں۔ لیکن آپ سے باتیں کر کے مجھے بہت لطف آیا۔ شاندار پروفائل بنے گا۔ جانے بارش ابھی بھی ہو رہی ہے یا تھم گئی ہے۔'' وہ جلدی جلدی بول رہی تھی۔

''اچھا مجھے تو معلوم ہی نہیں ہوا کہ مینہ برس رہا ہے''۔

''آپ کو تو ابھی اور بھی کچھ نہیں معلوم''۔ سیما پُراسرار انداز میں مسکرائی۔ سجاتا نے اس کے جملے پر دھیان نہیں دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے آگے بڑھ کر کھڑکیوں پر کھنچا ہوا دبیز پردہ ہٹایا۔ بارش تھم گئی تھی اور سڑک سیاہ شیشہ بن گئی تھی' گزرتی ہوئی گاڑیاں اس پر روشنی کا تھان بچھا رہی تھیں۔ اس کی نظر سڑک کے اس پار دور تک پھیلے ہوئے سبزے سے پرے اونچے اونچے پیڑوں پر پڑی اور اس عمارت پر جو روشنیوں میں نہائی ہوئی تھی۔

''کیا یہ کوئی چرچ ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں یہ فریئر ہال ہے۔ 1850ء کے بعد سر فریئر بارٹل یہاں کا گورنر رہا تھا۔ اس کے جانے کے بعد شہر والوں نے اس کی یاد میں یہ ہال بنایا تھا۔'' سیما نے ڈھلواں چھتوں اور کلس والی اس دو منزلہ عمارت کو دیکھا جو وینیشن گوتھک اسٹائل میں زرد رنگ کے لائم اسٹون سے تعمیر ہوئی تھی۔ کولونیل دور کی ایک پُرکشش اور پُراسرار عمارت۔

''اپنے واپس جانے سے پہلے میں اسے دیکھنا چاہوں گی۔'' سجاتا نے فریئر ہال کو پُرستائش انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔ اسے ضرور دیکھیے گا۔ میں کل آ جاؤں گی۔ آپ کو گائڈڈ ٹور کرانے کے لیے'' وہ مسکرائی۔

''آزادی سے پہلے اس باغ میں ملکہ وکٹوریہ اور ایڈورڈ ہفتم کے مجسمے لگے ہوئے تھے لیکن پاکستان بنا تو ہٹا دیے گئے۔ آپ جانیں ہم بت پرست نہیں' بت شکن ہیں۔'' سیما شرارت سے مسکرائی۔ ''آپ کو شاید دونوں کا فرق بھی معلوم نہ ہو۔''

''مجھے یہ فرق اچھی طرح معلوم ہے اور مجھے بت پرست اور بت شکن دونوں پسند ہیں'' سجاتا نے ہنس کر کہا۔

''اس کی اوپری منزل میں ہال ہے اور آرکسٹرل گیلری جہاں کنسرٹ اور تھیٹر ہوتا تھا۔ اب بھی کبھی کبھار کوئی کلچرل پروگرام ہو جاتا ہے۔'' سیما نے اسے بتایا۔

''پھر تو بڑی زبردست جگہ ہوئی۔'' سجاتا نے کہا۔

''جی ہاں۔ بہت شاندار اور تھوڑی سی پُراسرار بھی۔''

''تم اسے پُراسرار کیوں کہہ رہی ہو؟'' سجاتا نے سیما کو سوالیہ انداز میں دیکھا۔

''سنا ہے یہاں' کبھی کبھی رات میں کوئی حسین عورت ہال کی سیڑھیاں اترتی نظر آتی ہے''۔ سیما نے کہا۔

''یقیناً کسی ناکام عشق کی ہیروئن ہوگی۔ عشق میں ناکام ہونے والی روحیں عالم بالا سے واپس آتی ہیں۔'' سجاتا مسکرائی۔ ''تم نے کپلنگ کی 'فینٹم رکشا' پڑھی ہے۔ جس میں بے وفا جیک کو چھوٹا شملہ روڈ پر وہ بھوت رکشا نظر آتا تھا جس سے ایگنس کا چہرہ جھانک کر اسے دیکھتا تھا۔ ایگنس اس کی بے وفائی کے غم میں ختم ہوگئی تھی۔''

''جی نہیں۔ میں نے کپلنگ کی یہ کہانی نہیں پڑھی۔ ویسے روحوں کی کہانیاں مجھے بہت پسند ہیں''۔

''کپلنگ کی یہ کہانی ہمارے کورس میں تھی۔ میں تمھیں بتاؤں کہ میں ساری دنیا گھوم آئی لیکن مجھے کبھی کہیں کوئی روح نظر نہ آئی۔ میں ان متروک گرجا گھروں میں گئی جہاں کوئی سروس نہیں ہوتی۔ قبرستانوں میں پھری' مجال ہے کہ روح کے نام پر کسی چوہیا کا بچہ بھی نظر آیا ہو۔''

سیما اس کی مثال پر زور سے ہنسی پھر گڈ نائٹ کہہ کر رخصت ہوئی اور سجاتا نے سکھ کا سانس لیا۔

تھکن اور نیند سے اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ لباس بدلنے اور دانت برش کرنے کی بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ بے اختیار بستر پر لیٹ گئی۔ سائیڈ ٹیبل پر وہ کتاب رکھی ہوئی تھی جس کے دامن سے بندھی ہوئی وہ پاکستان چلی آئی تھی۔ وہ اس کے ٹائٹل کو دیکھتی رہی۔ اس لڑکی کے چہرے پر کیسی نرمی اور حیا تھی۔ فوجی وردی اور پی کیپ اس پر کچھ زیادہ ہی سج رہی تھی۔ ایسے حسن اور جوانی کو یوں خاک میں تو نہیں مل جانا چاہیے تھا۔ وہ نیند سے بوجھل آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔ اس کے ساتھ اس نے کئی برس گزارے تھے اور اب اس کی زندگی پر کتاب لکھ دینے کے بعد یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی عزیز دوست سے بچھڑ گئی ہے۔

اس لڑکی کا قصہ بھی کیسا عجیب تھا۔ امریکی ماں اور ہندوستان کے اس صوفی گائیک مرشد عنایت خان کی بیٹی جسے دکن کے نظام نے 'تان سین ثانی' کا خطاب دیا تھا۔ ماسکو میں زار اور زارینہ جس کا دم بھرتے تھے' جنھوں نے اسے مہمان رکھا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے زخموں سے نڈھال یورپ کے زخموں پر جو اپنے صوفیانہ کلام اور ہندوستانی موسیقی کا مرہم رکھتا تھا۔

وہ اس کی تلاش میں کہاں کہاں نہیں پھری تھی۔ لندن' پیرس' دخاؤ۔ جنگ کے شعلوں سے جل جانے والے شہروں کی راکھ سے نئے شہر پیدا ہوئے تھے۔ جیتے جاگتے' جگمگاتے شہر۔ لیکن کروڑوں چلے گئے تھے' پھر کبھی نہ آنے کے لیے' سجاتا کے اندر درد کی لہر اٹھی۔ نور نے فرانس سے عشق کیا تھا اور اس عشق کا حق فرانس نے ادا کردیا۔ اسے طلائی ستارہ دیا گیا اور Croix de Guerre ملا۔ ہر سال پیرس میں بیسٹائل ڈے پر اس گھر کے سامنے براس بینڈ بجتا ہے جہاں وہ رہتی تھی۔ یورپ والے آزادی کو گھونٹ گھونٹ کر پیتے تھے جیسے وہ سرخ شراب ہو اور ہم آزادی کے نام پر انسانوں کا خون پیتے ہیں، ہمارے کروڑوں لوگوں نے آزادی سے عشق کیا تھا۔ جانے کتنوں نے جان دے دی تھی لیکن جب آزادی ملی تو معلوم ہوا کہ ہم نفرت کے غلام ہوگئے ہیں۔

عشق کرنے والے شاید ستارہ زہرہ سے آتے ہیں لیکن نور کو کسی سے عشق کی ابھی مہلت ہی نہیں ملی تھی کہ آزادی سے عشق کا مرحلہ آن پہنچا۔ دوسری جنگ عظیم چھڑی' پیرس پر نازیوں کا قبضہ ہوا تو نور چھوٹے بھائی ولایت کے ساتھ لندن فرار ہوگئی۔ شاید اس کے اندر یہ احساس شدت سے تھا کہ اس کی رگوں میں جس ٹیپو سلطان کا خون دوڑ رہا ہے، فرانسیسیوں نے آخری لمحے تک اس ٹیپو کا ساتھ دیا تھا۔ اس کی طرف سے انگریزوں سے لڑے تھے اور مارے گئے تھے۔ شاید اس نے یہی قرض اتارنا چاہا تھا۔ تب ہی وہ انڈر گراؤنڈ

فرنچ ریزیسٹنس کا حصہ بنی لندن پہنچی اور برٹش سیکرٹ سروس میں شامل ہوگئی۔ اس وقت بھی جب اسے ویمن آکزیلری فورس میں کمیشن ملا تھا اور برٹش ایجنٹ اسے وائرلیس پر سگنلز بھیجنے، وصول کرنے کی تربیت دے رہے تھے تو اس نے ان سے کہا تھا کہ جب پیرس آزاد ہوجائے گا پھر میں ہندوستان چلی جاؤں گی اور وہاں کی فریڈم موومنٹ سے جڑ جاؤں گی۔ لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ سجاتا نے ایک گہرا سانس لیا، حلق خشک ہورہا تھا، اس نے اٹھ کر پانی پیا اور بستر پر گر گئی۔

برٹش وار ریکارڈ اور خفیہ فائلوں میں نور کا کہا ہوا، لکھا ہوا ہر جملہ محفوظ تھا۔ اس نے ہفتوں اور مہینے لگائے تھے کاغذوں کے انبار سے اس کی زندگی کو دریافت کرنے کے لیے۔ یوں جیسے آرکیالوجسٹ کسی شہر کو دریافت کرتے ہیں۔ اینٹیں، ٹوٹے ہوئے برتن، بچوں کے کھلونے، عورتوں کے زیور۔ جیسے سرمورٹیمر وہیلر نے موئنجوڈرو کھود نکالا تھا۔ یہ کیسی زبردست بات تھی کہ وہ ایک دن بعد اس شہر کی گلیوں میں پھرنے والی تھی۔

اس نے بھی ٹیپو کی اس سگڑ پوتی کی زندگی کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے کسی آرکیالوجسٹ کی طرح ڈھونڈے تھے۔ اکٹھے کیے تھے۔ اور پھر ان بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑ کر ایک مکمل تصویر بنائی تھی۔ وہ لندن میں اس کی دوست جین سے ملی تھی، جس سے ملاقات کو اس نے اپنی خوش نصیبی سمجھا تھا۔ نوے بانوے برس کون جیتا ہے، وہ بھی مکمل ہوش وحواس کے ساتھ۔ جینکس وارفتگی سے اس کا ذکر کرتی رہی تھی۔ یہ جینکس تھی جس نے نور کے مارے جانے کے فوراً بعد اس کی زندگی کے بارے میں لکھا تھا لیکن کسی نے اس کی لکھی ہوئی کتاب کو اہمیت ہی نہیں دی۔ اس پر وقت کی گرد جمتی رہی تھی۔ جین نے سجاتا کو اپنی ماں کی بنائی ہوئی پورٹریٹ بھی دکھائی تھی۔ نور کی یہ پینٹنگ دوسری جنگ عظیم کی بمباری جھیل گئی تھی۔

یادوں سے سجاتا کا سر بوجھل ہونے لگا۔ نازیوں نے نور کو جب پیرس میں گرفتار کیا تو وہ ان کی قید سے دو مرتبہ بھاگی اور دونوں مرتبہ وہ اسے پکڑ لائے، پھر انھوں نے اس کا نام خطرناک قیدیوں میں لکھا اور فرانس سے جرمنی بھیج دیا تھا۔ دخاؤ کنسنٹریشن کیمپ، گستاپو کی خاص اذیت گاہوں میں سے ایک۔ جہاں یہودی گیس چیمبر میں ہلاک کیے جاتے اور سیاسی مخالفین اور جنگی قیدیوں کی کھال اتاری جاتی تھی۔

سجاتا کو لندن کی وہ شام یاد آئی جب وہ پچاس برس پرانے کاغذات کو کھنگال کر وار میوزیم سے باہر نکلی تھی۔ وہ چلتی رہی اور گزرے ہوئے وقت کے قدموں کی چاپ اس کے کانوں میں گونجتی رہی۔ اپنے ٹھکانے پر جانے کا جی نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ ٹیوب پکڑ کر کوونٹ گارڈن جا پہنچی جہاں سبزیوں، پھلوں، پھولوں کی دکانوں کی، تھیٹر اور ریستورانوں کی سمائی تھی۔ اوپن ائیر ریسٹورنٹ بھانت بھانت کے لوگوں کا ٹھکانہ، کھلی ہوئی جگہ پر اپنی اپنی زبانوں میں گاتے ہوئے، اپنے ڈھب سے ناچتے ہوئے۔ اپنی دھرتی سے بچھڑے ہوئے، اپنے موسموں کو ترسے ہوئے لوگ۔ وہ اوپن ائیر ریستوران میں کونے کی ایک میز پر جا بیٹھی اور اپنے لیے ریڈ وائن منگوالی۔ وہ اسے گھونٹ گھونٹ پی رہی تھی کہ اس کی نظر کھلے صحن پر کھڑی

ایک ہندوستانی لڑکی پر پڑی۔ سرخ کناری کی کیسری ساڑی، کمر میں چاندی کی زنجیر۔ اس کے ساتھ ایک گورا بھی تھا۔ لڑکی نے کھڑے ہوکر بھاؤ بتانا شروع کیا، اس کی ساڑی میں چھپے ہوئے گھنگھرو بولنے لگے۔ گورے نے اپنا ہیٹ اتار کر فرش پر پیالے کی طرح رکھا اور کھڑتال بجانے لگا۔ جو دے اس کا بھلا اور جو نہ دے اس کا بھی۔ اسے اپنی طرف کے جوگی اور سادھو یاد آئے۔ ہاتھ میں تومڑی یا کمنڈل لیے اور کھڑتال بجاتے ہوئے، باؤل فقیر اکتارے کا تار چھیڑتے ہوئے، تان اڑاتے ہوئے۔ لڑکی کی آواز نے اس کی توجہ کھینچ لی۔ کیا آگ تھی آواز میں اور چہرے پر جذبوں کی کیا تمتماہٹ تھی۔ اس نے تان اڑائی اور وہاں گانے والے، شور مچانے والے آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے خاموش ہوتے گئے۔ گیت کی زبان نہ جاننے والے اس کی پرسوز آواز کی دھارا میں بہنے لگے۔

بتادے سکھی، کونو گلی گیو شیام...... گوکل ڈھونڈی، برندابن ڈھونڈی...... ڈھونڈھ پھری چاروں دھام......

رین دیوا سا تڑپت بیتی...... بسرا گئے سب کام...... ڈھونڈھ پھری چاروں دھام......

لندن اور پیرس...... گوکل اور برندابن تھے۔ جرمنی کے کنسنٹریشن کیمپ چاروں دھام تھے اور وہ دیے کی لو کی طرح تڑپتی ہوئی آزادی کو ڈھونڈتی رہی تھی۔ تلاش کا اپنا رنگ، اپنا نام...... سے چاروں دھام تھا، تلاش چاروں کھونٹ تھی۔ سجاتا کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ آزادی نور کو نہیں ملی تھی اور وہ جو سجاتا تھی اسے اور اسی جیسے کروڑوں لوگوں کو آزادی نہیں مل سکی تھی۔ اس نے اٹھ کر فرش پر رکھے ہوئے ہیٹ میں دو پونڈ کا سکہ ڈالا اور اپنی میز پر جا بیٹھی۔ ہندوستانی لڑکی کے گورے دوست نے اسے چونک کر دیکھا۔ سرخ شراب کا دوسرا اور پھر تیسرا پیالہ۔ وہ پیتی رہی اور لڑکی مست ہوکر گاتی رہی، گوکل ڈھونڈی...... برندابن ڈھونڈی...... ڈھونڈھ پھری چاروں دھام...... اس لڑکی کو سننے والوں میں کالے بھی تھے گورے بھی۔ اجنبی لفظوں میں بہتی ہوئی درد کی دھارا کے ساتھ سفر کرتے ہوئے۔

اسے یاد نہ تھا کہ اس رات جب وہ میز سے اٹھی تو اس کا پرس کتنا ہلکا ہوگیا تھا۔ بس اتنا یاد تھا کہ چلتے چلتے اس نے ریڈ وائن کی ایک بوتل ان دونوں کو دان کی تھی، لڑکی کے دونوں گالوں کو بوسہ دیا تھا اور اپنے آنسو ساری کے پلو میں جذب کرتے ہوئے وہاں سے اپنے ٹھکانے کی طرف چلتی چلی گئی تھی۔

کنگ فشر، رام چڑیا، دل دریا میں اپنی لمبی چونچ ڈبونے لگی، یاد کی چھپاتی مچھلیوں کو شکار کرنے لگی۔ ستارہ اور ثریا کی اماں روزہ رکھ رہی ہیں، اس کی اور منیشا کی ماتا جی برت۔ وہ ان کے گھر عید کی سوئیاں کھا رہی ہے اور وہ اس کے آنگن میں ہولی کھیل رہی ہیں۔ رنگ سے بھری ہوئی پچکاریوں سے ایک دوسرے کو شرابور کر رہی ہیں، ایک کے ہاتھ میں آرتی کی تھالی ہے، دوسری شام ڈھلے طاق میں خواجہ خضر کے نام کا دیا جلا رہی ہے۔ اندھیری رات میں مسافر راستہ نہ بھول جائیں۔ خواجہ خضر کون تھے؟ وہ ستارہ کی اماں سے پوچھ رہی ہے۔ اماں اسے خواجہ خضر کی کہانی سناتی ہیں، کیسی دھانسو کہانی ہے "میں راستہ بھول جاؤں تو وہ مجھے بھی راستہ دکھائیں گے؟" وہ بہت للک سے پوچھتی ہے اور اس سے پہلے کہ اماں کچھ کہیں، ستارہ بول اٹھتی ہے۔ "ارے

چھوڑ و بھی۔ یہ جواماں کے خضر پیر ہیں یہ بیچ دریا میں نیا ڈبو بھی دیتے ہیں"

ستارہ اب بوسٹن میں رہتی تھی۔ سجا تا کا کئی بار جی چاہا تھا کہ وہ ستارہ کو جا کر بتائے کہ سکھی میں اور تم جس آزادی کے خواب دیکھتے تھے۔ جس کے لیے لڑتے تھے وہ ہمارے دیس کا راستہ بھول گئی اور خضر پیر بھی اسے راستہ دکھانے نہیں آئے۔ راستہ باؤل فقیروں نے بھی نہیں دکھایا۔ ندی کے کنارے سفر کرتے ہوئے باؤل فقیر۔ اک تارا بجاتے اور گاتے ہوئے۔ لالن فقیر، رنجیت گوسائیں، چندرا بتی برمن، کوئی مرشد آباد میں پیدا ہوا، کوئی سلہٹ اور کشتیا سے آیا۔ آج فریدہ پروین اور انوپ داس اٹھارہویں صدی کے لالن فقیر کے گیت گاتے ہوئے دیس دیس گھومتے ہیں۔ باؤل فقیر سچ کو ڈھونڈنے نگر نگر گھومتے تھے، وہ بھی دیس دیس پھر رہی ہے، وقت کی مٹی میں مل جانے والوں کو ڈھونڈتی ہوئی۔ سچ کہاں تھا؟ جھوٹ سے، نفرت سے آزادی کہاں تھی؟

اس رات وہ ٹیوب اسٹیشن کی سیڑھیاں نہیں اتری، مینہ کے جھالے سے بھیگی ہوئی لندن کی سڑکوں پر چلتی رہی۔ وہ اور نور شاید دو گوریاں تھیں، پنکھ سے پنکھ ملا کر اڑتی ہوئی۔ پھر نور کہیں دور نکل جاتی اور وہ تنہا نیلے امبر میں تیرتی چلی جاتی، یہ کھوج کیا تھی؟ شاید پیدائش کا چکر۔ وہ سو مرتبہ پیدا ہوئی تھی اور سو مرتبہ مر گئی تھی۔ ہر مرتبہ اس نے نیا پریم نیا عشق کیا۔ کبھی وہ عورت تھی، کبھی مرد۔ کبھی پریمی کو ڈھونڈتی ہوئی، کبھی پریمکا کی تلاش میں۔ تلاش اس کے بدن میں لہو کی طرح گردش کرتی تھی اور اسی تلاش نے اسے نور کے عشق میں گرفتار کیا تھا۔ نور نازیوں سے آزاد ہونا چاہتی تھی اور وہ نور کی کہانی لکھ کر اپنے یہاں کے راکھشسوں سے نجات چاہتی تھی۔ اتہاس پکشی پکھیرو تھا جس کے پروں پر بیٹھ کر وہ سمے کے گگن پر اڑتی چلی جاتی۔ ختم نہ ہونے والا سفر۔ ایک زندگی سے دوسری زندگی میں منتقل ہو جانے والا عشق۔ لیکن اسے زندہ انسانوں کے بجائے ان لوگوں سے عشق کیوں تھا جو گزر گئے تھے؟ گزر جانے والے اس کے بدن میں زندہ ہو جاتے، اس کے ساتھ سانس لینے لگتے۔

ہوا کی لہر پر بہتے ہوئے لفظ اس تک آئے۔ گکل ڈھونڈی، برانداین ڈھونڈی...... ڈھونڈھ پھری چاروں دھام...... اور پھر بہت سے پرندوں کی آوازیں گیت کے لفظوں میں رل مل گئیں اور اس کی بند ہوتی ہوئی آنکھیں کھل گئیں۔ ہوٹل کی ساتویں منزل پر یہ آوازیں کہاں سے آ رہی تھیں؟ اس نے اٹھ کر کھڑکی پر پڑے ہوئے پردے ہٹا دیے۔

سڑک کے پار روشنی میں نہائے ہوئے سبزے پر پانی کی جھلک تھی۔ بہت سی مرغابیاں ہنس اور بطخیں تھیں، شور مچاتی ہوئی اپنے پروں سے پانی کے قطرے جھٹکتی ہوئی اور ان کے درمیان وہ کھڑی تھی۔ سرخ کناری کی سفید ساڑی، پلو سر سے کچھ ڈھلک گیا تھا۔ اس چہرے کو وہ کیسے بھول سکتی تھی۔ وہ شاید تصویر میں سے نکل آئی تھی۔ سجا تا کا دل اس طرح دھڑکا جیسے پسلیوں کی قید سے آزاد ہو جائے گا۔ وہ یک لخت پلٹی اور دوڑتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ لفٹ کا دروازہ کھلا ہوا تھا جیسے اسی کا منتظر ہو۔ آن کی آن میں وہ لابی سے گزر کر تیز قدموں سے باہر پہنچ گئی۔

چند لوگوں نے اسے غور سے دیکھا لیکن سجا تا نے کسی کی طرف دھیان نہیں دیا۔ وہ سڑک پر آئی تو مینہ، پھولوں اور پیڑوں کی سگندھ سے بوجھل ہوا میں نشے کا عالم تھا۔ اس نے سڑک پار کرنی چاہی، گئی

گاڑیاں زناٹے سے گزر گئیں۔ سجاتا نے بے قرار ہو کر سامنے دیکھا۔ کہیں وہ چلی نہ گئی ہو۔ لیکن وہ وہاں موجود تھی۔ آنکھوں میں شناسائی کی شبنم اور چہرے پر چاندنی کھلی ہوئی۔

سجاتا نے بھاگ کر سڑک پار کی اور اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

''تم؟؟'' سجاتا اسے یوں دیکھ رہی تھی جیسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ ہو۔

''تم نے مجھے اس قدر شدت سے یاد کیا۔'' اس کے لہجے میں لگاوٹ تھی۔

''ہاں۔ یاد تو میں نے تمھیں بہت کیا۔ لیکن تم اتنی رات کو یہاں کیوں کھڑی ہو؟ میرے پاس کیوں نہ چلی آئیں۔''

''کیسے آتی' دیکھو تو سہی کیسے خوفناک کتے ہیں۔'' اس نے کہا۔ سجاتا کی نظر بیریر کی طرف اٹھی جہاں گارڈ کتوں کی زنجیریں پکڑے کھڑے تھے۔ ان کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں اور زبانیں جبڑوں سے باہر تھیں۔

ایک لحظے کے لیے سجاتا کو پھریری سی آئی پھر وہ اس کی طرف مڑی ''ارے تم کتوں سے ڈرتی ہو؟''

وہ ہنسی ''نہیں میں ڈرتی نہیں۔ میرے اپنے گھر میں گرے ہاؤنڈ پلا ہوا تھا۔ لیکن......'' اس نے اپنا جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔ شاید اس کے اردگرد پھرنے والی بطخیں' مرغابیاں اور ہنس ان کتوں سے ڈر رہے تھے۔

''آؤ میرے ساتھ چلو'' سجاتا نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''میں بس چند لمحوں کے لیے ہوں۔ تمھیں دیکھنا چاہتی تھی' ملنا چاہتی تھی تم سے۔ وقت کی سرنگ سے گزر کر کوئی آپ تک پہنچنے کی کوشش کرے تو جی چاہتا ہے اس سے ملنے کو۔''

''پہلے کیوں نہ ملنے آئیں؟''

وہ زور سے ہنسی ''ہم اب اتنے آزاد بھی نہیں......''

''اور یہ سب کیا ہے؟'' سجاتا نے اس کے گرد پھرتی ہوئی مرغابیوں اور بطخوں کی طرف اشارہ کیا۔

''دخاؤ کے کنسنٹریشن کیمپ میں ٹھنڈی کھردری دیواروں کے بیچ زندہ رہنا اور سچ نہ بولنا کتنا مشکل تھا۔ میری آنکھوں میں پیرس کی ''فضل منزل'' گھومتی رہتی جس کے ڈرائنگ روم میں آتش دان تھا۔ میں اس آتش دان میں جلتی ہوئی لکڑیوں کا چٹخنا سنتی اور شعلوں کی گرمی مجھ تک آتی۔ اس آتش دان پر ہمارے خاندان کا ایک گروپ فوٹو تھا۔ میں اسے یاد کرتی لیکن اس فریم میں سے ایک ایک کر کے سب نکل گئے' سب چلے گئے۔''

''فوٹو فریم میں کوئی ایک رہتا ہو یا کئی رہتے ہوں سب پیڑ پر بیٹھے ہوئے پرندوں کی طرح آہستہ آہستہ اڑ جاتے ہیں۔'' سجاتا کو کلکتہ میں اپنے گھر کی دیواروں پر لگی ہوئی سو سوا سو برس پرانی تصویریں یاد آئیں۔ اپنے موجود ہونے پر خوش ہونے والوں کو فنا کا بگولہ ایک ایک کر کے اڑا لے گیا تھا۔

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا: ''دخاؤ میں اپنی قید تنہائی میں نے ان کے ساتھ گزاری۔ میں فرانسیسی مادری زبان کی طرح بولتی تھی۔ میں نے بچوں کے لیے ہندوستان کی کہانیاں فرانسیسی میں لکھیں۔ کتاب بھی چھپی۔ میں پیرس ریڈیو سے بچوں کو جاتک کہانیاں سناتی تھی۔ مہاتما بدھ کی ان گنت زندگیوں کی

کہانیاں۔ یہ پرندے ان کہانیوں میں سانس لیتے تھے۔ دخاؤ میں گیس چیمبر تھے جن میں یہودی بچے' بوڑھے' عورتیں اور مرد زندہ جلائے جاتے تھے۔ انسانی گوشت کے جلنے کا دھواں اور اس کی چراند مجھے پاگل کر دیتی' پھر وہ مجھے ٹارچر سیل میں لے جاتے۔ میرے ساتھ وہ ہوتا میں جس کے بارے میں کچھ سوچنا بھی نہیں چاہتی۔ میں جو مرشد زادی تھی' پیرزادی تھی' بے ہوش ہو جاتی تو اپنی کوٹھری میں پھینک دی جاتی۔ تب یہ شور مچاتی' میرا غم بٹانے میرے پاس چلی آتیں۔ اپنے بھیگے ہوئے پروں سے میرے جلتے ہوئے زخموں کو ہوا دیتیں' میری کوٹھری میں بلب جلتا تھا لیکن میری آنکھوں میں اندھیرا رہتا۔ ایسے میں ہزاروں برس پرانے جنگلوں سے چلتا ہوا کچھوا اپنی پیٹھ پر جلتا ہوا چراغ اٹھائے میرے پاس چلا آتا اور ہر طرف اجالا پھیل جاتا۔'' وہ بولتی چلی گئی۔

''تم نہ جانے کس دنیا کی باتیں کر رہی ہو۔''

''وہ دنیا جس میں درد تھا' اذیت تھی۔ مجھے کچھ یاد نہیں رات کب آتی تھی' دن کب ہوتا تھا۔ دخاؤ کی بس اتنی سی یاد ہے کہ لوہے کے بڑے دروازے پر سواستیکا بنا ہوا تھا۔ میرے پیروں میں بیڑیاں تھیں۔ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔ جب انھوں نے مجھے ٹرک سے گھسیٹ کر اتارا تو میرے پیروں میں پڑی ہوئی زنجیریں چھنک اٹھیں۔ سلطان بابا انگریزوں سے لڑتے رہے تھے لیکن تاریخ کبھی سر کے بل کھڑی ہو جاتی ہے۔ میں ان کی سگڑ پوتی انگریزوں کے ساتھ مل کر جرمنوں سے لڑ رہی تھی آزادی کے لیے...... میں ماسکو میں پیدا ہوئی لیکن فرانسیسی شہری تھی۔ پیرس میں ''فضل منزل'' تھی اور سارے یورپ سے لوگ مرشد بابا کے پاس آتے تھے' ان سے تصوف کا تبرک لے کر اپنے اپنے شہروں کو جاتے تھے۔ اگر سلطان بابا انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتے اور میرے مرشد بابا اپنا وطن نہ چھوڑتے، پھر میں ماسکو میں نہیں ہندوستان میں پیدا ہوتی۔ یہ تمھارا کرم ہے کہ تم نے مجھے زندہ کر دیا ورنہ میں تو کاغذوں کے انبار میں دفن ہو چکی تھی''۔

سجاتا کی آنکھیں جھلملائیں ''تمھاری زندگی اتنی شاندار تھی کہ میں نہیں تو کوئی اور تمھیں کھوج لیتا''

مرغابیوں اور بطخوں کے شور سے فضا بھر گئی۔ ''یہ بہت شور مچا رہی ہیں۔'' سجاتا نے بے ساختہ کہا۔

''آخری صبح جب وہ مجھے منہ اندھیرے لے کر چلے تو یہی میرے ساتھ تھیں۔ کچھوا تھا جو اپنی پیٹھ پر جلتا ہوا چراغ لے کر چل رہا تھا۔ راستے میں اس چراغ کی روشنی تھی۔ رخصت کے وقت جا تک کہانیوں کی یہ دوسراہت میرے ساتھ تھی۔ میں کہانی تھی میرے ساتھ کہانیاں تھیں' تب ہی تو میں پیشانی پر گولی کھانے کے لیے سر اٹھا کر اپنے قدموں پر کھڑی رہ سکی۔'' اس کی آنکھیں لبریز تھیں۔

وہ سبزے پر اور پانی میں تیرتی ہوئی چلی۔ سجاتا نے اس کا ہاتھ' اس کی ساری کا آنچل تھامنا چاہا۔ وہاں ہوا کے ساتھ اڑتا ہوا ایک زرد پتا تھا۔ اس نے زرد پتے کے تعاقب میں جانا چاہا لیکن وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا' ہوا سب کچھ اڑا لے گئی تھی' وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کے چاروں طرف دیواریں تھیں اور ان دیواروں کے بیچ پھولوں کی سگندھ تھی۔ کتاب اس کے ہاتھ سے پھسل کر قالین پر جا گری تھی۔ کمرے میں ائیر کنڈیشنر کی آواز تھی اور

ٹھنڈک بہت بڑھ گئی تھی۔ اسے کپکپی سی محسوس ہوئی..... اس نے جھک کر کتاب اٹھائی اور سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی۔
وہ اٹھی اور کھڑکی تک گئی۔ شیشے سے پرے کچھ فاصلے پر انیسویں صدی کی گوتھک عمارت نے صبح کا ملگجا دوشالہ اوڑھ رکھا تھا۔ وہ پلٹ کر آئی اور بستر پر گر گئی۔ ابھی آنکھوں میں خوابوں کی بہت سی کرچیاں تھیں، بہت سی نیند تھی۔

☆☆☆.................☆☆☆.................☆☆☆.................☆☆☆

اس کی آنکھ فون کی گھنٹی سے کھلی۔ دوسری طرف روم سروس سے کوئی بول رہا تھا" میڈم۔ ہم ابھی پندرہ منٹ میں بریک فاسٹ کمرے میں پہنچا دیں گے، یہ بتائیں آپ امریکن بریک فاسٹ لیں گی یا کانٹی نینٹل۔؟ انڈا ہاف فرائیڈ یا چیز اینڈ مشروم آملیٹ؟"
وہ حیران ہوئی۔ کمپلیمنٹری بریک فاسٹ تو اسے نیچے جا کر ریسٹوران میں کرنا تھا" میں تیار ہو کر نیچے چلی جاؤں گی" اس نے اپنی گھڑی اٹھا کر وقت دیکھا۔ ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔
"نہیں میڈم۔ ہم سے کہا گیا ہے کہ آپ کا ناشتا آپ کے کمرے میں پہنچایا جائے" دوسری طرف سے اصرار ہوا۔
سجاتا نے ایک گہری سانس لی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا" آپ کانٹی نینٹل بھجوا دیں۔ چیز اور مشروم آملیٹ۔ کافی بہت گرم ہو" وہ ریسور رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ دروازے کے نیچے سے اخبار ڈال دیا گیا تھا۔ اس نے جھک کر اخبار اٹھایا اور رائٹنگ ٹیبل پر رکھ دیا
نہانے کا اب وقت نہیں رہا تھا، جانے کب روم سروس کی ہانک لگاتا ہوا ویٹر آ جائے۔ وہ دانت برش کر کے اور منہ پر پانی کا چھپکا مار کر باہر نکلی اور چاہا کہ اخبار اٹھا کر دیکھے، اسی وقت دستک ہوئی۔ اس نے دروازہ کھولا، ویٹر بھاری سلور ٹرے اٹھائے اندر آ گیا۔
اس نے ہر چیز قرینے سے کافی ٹیبل پر سجائی اور دبے قدموں باہر چلا گیا۔ سجاتا کو جوس کا گلاس اور نیلے رنگ کے چارخانے والے نیپکن میں لپٹے ہوئے ٹوسٹ کی خوشبو نے اپنی طرف بلایا۔ اخبار پڑھنے کا پروگرام ملتوی کر کے وہ ناشتے سے انصاف کرنے لگی۔ کافی انڈیلتے ہی اس نے اخبار اٹھایا، گرم کافی کی خوشبو کے ساتھ اخبار کے صفحوں پر نظر ڈالنا صبح کی سب سے بڑی عیاشی تھی۔ اس نے میٹرو اٹھایا، پہلے ہی صفحے پر اس کی تین کالمی رنگین تصویر تھی۔ وہ روسٹرم پر کھڑی بول رہی ہے اور اس کے پیچھے سے نور جھانک رہی ہے۔ خبر پڑھنے کے لیے اس نے تہہ کیے ہوئے اخبار کو پورا کھولا اور نچلے حصے پر چھپی ہوئی ایک دو کالمی بلیک اینڈ وائٹ تصویر اور خبر نے اسے اپنی جگہ منجمد کر دیا۔
تصویر میں کچھ مرد تھے اور کچھ عورتیں۔ ایک عورت اس کی کتاب کو ماچس دکھا رہی تھی۔ نور کا چہرہ جل رہا تھا۔ سب کے ہاتھوں میں پلے کارڈ تھے کچھ اردو میں جنھیں وہ پڑھ نہیں سکتی تھی، کچھ انگریزی میں۔ اس نے جلدی سے پوری خبر پڑھ ڈالی۔ جس وقت ہوٹل میں اس کی کتاب لانچ کی جا رہی تھی عین اسی وقت ایک مذہبی جماعت کے لوگ سجاتا کی کتاب اور نور کے خلاف مظاہرہ کر رہے تھے۔ یہ لوگ جلوس لے کر ہوٹل تک آنا چاہتے تھے لیکن پولیس نے انھیں خاصے فاصلے پر روک دیا تھا۔ ہوٹل ہائی سکیورٹی زون میں تھا۔ برابر میں

امریکی کونسلیٹ تھا۔ اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس، اس سے آگے چیف منسٹر ہاؤس، رپورٹر نے ہر بات تفصیل سے لکھی تھی اور یہ بھی کہ نعرے لگانے والے اسے انڈین کانسپر یسی کہہ رہے تھے، مسلمانوں کو بدنام کرنے کی سازش۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ ٹیپو شہید کے مقدس نام پر دھبا برداشت نہیں کیا جائے گا۔

سجاتا بنرجی گم صم بیٹھی رہی اور پیالی میں کافی ٹھنڈی ہوتی رہی۔ اس نے ایسے ہی مظاہرے اور جلوس ہندوستان میں دیکھے تھے، اسلام کے نام پر، ہندوتوا کے نام پر۔ نعرے لگانے والوں کے نام الگ تھے لیکن نعرے ایک جیسے تھے۔ نفرت کے زہر میں بجھے ہوئے۔ اب اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ ناشتا اس کے کمرے میں کیوں آیا ہے۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ اس کی پبلشر نے اب تک اسے فون کیوں نہیں کیا ہے؟

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔

''مائی ڈیئر۔ آج کے سارے پروگرام کینسل ہو گئے ہیں۔ آئی ایم اکسٹریملی سوری، میں کچھ دیر بعد تمھارے پاس آؤں گی۔ کل جن لوگوں نے ڈیمانسٹریشن کیا تھا، کچھ دیر بعد مجھ سے ملنے آ رہے ہیں۔'' اس کی پبلشر ٹھنڈے لہجے میں جلدی جلدی بول رہی تھی۔

سجاتا کے اندر اداسی کی ایک لہر اٹھی انتہا پسندی کا سونامی ان سب کو نگل رہا تھا اور سب دہشت گردی کے گرداب میں تھے۔ ''میں سمجھ رہی ہوں، میں نے اخبار پڑھ لیا ہے۔'' اس کی پبلشر پریشان تھی، اس نے سجاتا سے ڈھنگ سے بات بھی نہیں کی تھی۔ ہر طرف چھل پائیاں اور اگیا بیتال گھومتے تھے۔ آفت کی اس گھڑی میں سب ہی تنہا تھے۔ کون کس سے بات کرتا۔ کون کسے تسلی دیتا۔

اب اس کی سمجھ میں سیما کا وہ جملہ آ گیا کہ ابھی تو آپ کو اور کچھ نہیں معلوم۔ یہ کہہ کر وہ پراسرار انداز میں مسکرائی تھی اور چلی گئی تھی۔

کافی کی پیالی اس نے اٹھائی اور رکھ دی۔ ٹھنڈی کافی سے زیادہ بدمزہ شاید ہی دنیا میں کوئی چیز ہوتی ہو۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ لاہور کے لیے اس کی فلائٹ تیسرے دن تھی۔ انٹرویو، ڈنر سب بھاڑ میں جائیں۔ اصل کھنڈت تو موہنجوڈرو کے سفر میں پڑ گئی تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اس کی پبلشر اب اسے موہنجوڈرو لے کر نہیں جائے گی۔ اس سے پہلے وہ سکھر سے موہنجوڈرو کا پروگرام کیسے زور شور سے بنا رہی تھی۔ ہندوستان اور پاکستان کی عورتیں بھی مردوں کی طرح کاروباری ہو گئی ہیں۔ کیسی دوستیاں بگھاریں گی لیکن جیسے ہی کوئی مشکل سامنے آئے، یوں بن جائیں گی جیسے کل ہی ملاقات ہوئی ہو۔

وہ بے دلی سے اخبار کے صفحے الٹ پلٹ رہی تھی۔ جب دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ شاید ویٹر ٹرے واپس لینے آیا تھا۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے سیما کھڑی تھی، اسے دیکھ کر سجاتا کو یوں محسوس ہوا جیسے کوئی پرانا دوست آ گیا ہو۔

''ارے تم؟'' سجاتا کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''میں نے سوچا کہ آپ تنہا ہوں گی تو کیوں نہ آپ کے ساتھ کچھ وقت گزارا جائے۔ یوں بھی کل میں

نے کنڈ کنڈٹو رکی بات کی تھی"

"لیکن تم نے یہ کیوں سمجھا کہ میں تنہا ہوں گی۔ میرے تو آج کئی پروگرام تھے۔" سجاتا نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔ وہ صوفے پر یوں بیٹھ گئی تھی جیسے یہ کمرہ اسی کا ہو۔

"کل رات ہی مجھے انداز ہو گیا تھا کہ آج آپ کے پروگرام گڑبڑ ہو جائیں گے۔ پھر صبح کے اخبار دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ آپ کی پبلشر سارے پروگرام کینسل کر دیں گی" اس نے کئی دوسرے اخبار سجاتا کے سامنے پھیلا دیے ان میں اردو اخبار بھی تھے جنہیں وہ پڑھ نہیں سکتی تھی لیکن تصویریں دیکھ سکتی تھی۔

"کل مجھے اس پروٹسٹ ریلی کی خبر بھی نہیں ہوئی۔"

"آپ کو اس لیے کچھ معلوم نہیں ہوا کہ پولیس نے ان کو ہوٹل سے کافی دور روک لیا تھا۔ مجھے میری ایک دوست نے ایس ایم ایس کر دیا تھا" سیما نے اسے بتایا "اور آپ کی پبلشر کو بھی یقیناً خبر مل گئی ہوگی۔"

"مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ یہاں اس کتاب کے ساتھ یہ سلوک ہوگا کہ وہ چوراہے پر جلائی جائے گی" سجاتا کے لہجے میں اداسی تھی۔

"شکر ادا کیجیے کہ انھوں نے کتاب جلائی" سیما شرارت سے مسکرائی۔

"اچھا اب فضول باتیں مت کرو، دونوں ملکوں میں یہ لوگ بہت تھوڑے ہیں لیکن انہوں نے بہت زیادہ جگہ گھیر لی ہے" سجاتا نے کہا۔

"اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے انھیں یہ جگہ گھیرنے دی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ بہت بہادر ہیں، بات دراصل یہ کہ ہم بہت بزدل ہیں، بہت پہلے جانے کس نے کہا تھا کہ دنیا اس لیے بری جگہ ہو گئی ہے کہ اچھے لوگوں کی اکثریت خاموش رہتی ہے" سیما کا لہجہ سنجیدہ تھا۔

"ٹھیک کہہ رہی ہو تم، غلطی ہماری ہے۔" سجاتا کچھ سوچنے لگی اور پھر اٹھ کھڑی ہوئی "اب تم اخبار پڑھو، ٹیلی وژن دیکھو۔ روم سروس کو فون کر کے جو جی چاہے کھانے پینے کے لیے منگواؤ۔ میں اتنی دیر میں نہالوں" سجاتا سوٹ کیس کھول کر کپڑے نکالنے لگی۔

"آپ کے لیے کیا منگواؤں۔؟"

"ناشتا میں کر چکی ہوں میرے لیے بس کافی منگوالو" سجاتا نے کہا اور نہانے چلی گئی۔

وہ نہا کر بال ڈرائیر سے خشک کر کے باہر نکلی تو تازہ دم تھی۔ ساری کوفت اور جھنجھلاہٹ ٹھنڈا شفاف پانی بہا کر لے گیا تھا۔ اتنی دیر میں کافی بھی آ پہنچی تھی۔ سیما نے اپنے لیے کلب سینڈوچ اور کولڈ کافی منگوالی تھی "میں نے سوچا کہ آپ کی پبلشر کو کچھ نقصان تو پہنچایا جائے" سیما نے کھانے پینے کے سامان کی طرف اشارہ کیا، اس کے لہجے میں شرارت تھی سجاتا کو ہنسی آ گئی۔

"اچھا اب تم میرے لیے کافی بنا دو۔ صبح کی پیالی تو اس خبر کی وجہ سے غارت ہو گئی۔"

باتوں میں دوپہر گزرتی رہی، پھر اس کی پبلشر کا فون آیا۔ موٹی آواز اور لہجے میں بناوٹ ''ڈارلنگ آئی ایم سوری میں لنچ پر بھی نہ آسکوں گی۔ میرے شوہر کو انجائنا کا مائیلڈ اٹیک ہوا ہے۔ میں ان کے ساتھ اسپتال میں ہوں اور وہ جو تمھارا موہنجوڈرو والا پروگرام تھا............''

سجاتا نے اس موٹی آواز کا جملہ کاٹ دیا ''یہ سن کر بہت افسوس ہوا، میری طرف سے انھیں پوچھنا۔ اور اب سارے پروگرام بھول جاؤ میں نے تو انھیں صبح ہی بھلا دیا تھا۔''

یہ سن کر دوسری طرف سے اطمینان کی سانس سنائی دی۔ ''تمھارا ریٹرن ٹکٹ تمھارے پاس ہے، چیک آؤٹ کرتے ہوئے پیمنٹ کی فکر نہ کرنا۔ تم کہو تو اپنی کسی دوست کو تمھارے پاس بھیج دوں۔ بہت بور ہو رہی ہو گی تم۔''

''تم میری ذرا سی بھی فکر نہ کرو۔ یہاں میری ایک دوست ہے۔ وہ صبح سے آگئی ہے۔ اس سے خوب گپ شپ ہو رہی ہے'' سجاتا نے مسکراتے ہوئے سیما کی طرف دیکھا۔

''اچھا؟'' مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہاں تمھاری کوئی دوست بھی رہتی ہے؟'' پبلشر کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ہم لکھنے والوں کے دوست اور دشمن دونوں ہی ہر ملک ہر شہر میں ہوتے ہیں'' سجاتا ہنسی پھر اس نے ''بائی'' کہہ کر ریسور رکھ دیا۔

☆☆☆

شام کا نارنجی رنگ لاہور شہر کی گلیوں اور گھروں، درگاہوں اور دکانوں کے بوسے لے رہا تھا۔ سجاتا نے اس لاہور کو دیکھا جو دلّی کا جڑواں شہر کہلاتا تھا، جسے مغلوں نے بڑی چاہت سے بنایا اور سنوارا تھا۔ سرخ رنگ کی وہی چھوٹی اینٹیں، باغوں کا ویسا ہی پھیلاؤ اور پھر انگریزوں نے ان دونوں شہروں پر اپنے نقشِ قدم چھوڑے تھے۔ کاش نور نے کولکتہ، دلّی اور لاہور کو دیکھا ہوتا۔ یہ وہ شہر تھے جنھیں برٹش راج سے آزاد کرانے کے لیے وہ جان دینے کی باتیں کرتی تھی، اور وہی شہران جیسوں کی جان کے درپے تھے۔ برٹش راج سے آزادی مل گئی تھی لیکن اب ہر طرف نفرت کرنے والوں کا راج تھا۔ یہاں بھی، وہاں بھی۔ نور نے اور ہزاروں لاکھوں نے اس آزادی کو چاروں دھام ڈھونڈا تھا اور جان دے دی تھی۔ وہ آزادی کل بھی نہیں تھی، آج بھی نہیں ہے۔ آزادی سچ ہے تو پھر وہ سچ کہاں ہے؟

☆☆☆

شکستہ پر

● پروفیسر بیگ احساس

دس برس بعد سمیر اور سشما کی ملاقات ہوئی تو دونوں نے شادی کا فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگائی اور ایک روز چپکے سے شادی بھی کر لی۔ ان برسوں میں دور رہ کر دونوں کافی کچھ کھو چکے تھے۔ سشما نے جب اپنی ممی کو شادی کی بات بتائی تو اُنھوں نے صرف اتنا ہی کہا کہ وہ فوراً گھر چھوڑ کر سمیر کے پاس چلی جائے۔ ساتھ ہی سمن کو بھی لے جائے۔ جس کی اولاد اسی کے ساتھ رہے تو بہتر ہے۔ سشما کے پاپا نے ہمیشہ کی طرح خاموش تماشائی کا رول ادا کیا۔ اور سشما سمیر کے گھر آ گئی۔ لیکن سمن نے آنے سے صاف انکار کر دیا۔ ”میں سمجھاؤں گا اسے“۔ پاپا نے کہا۔ سمیر کے گھر آ کر سشما کو ایک کھلی فضاء کا احساس ہوا۔ کتنے دنوں سے وہ گھٹ رہی تھی۔ زندگی اسے اس طرح واپس ملے گی، اس نے سوچا ہی نہ تھا۔ نہ یہ کہ وہ خود اپنی زندگی جیے گی۔ خواہشوں کے پرندوں نے ایک ساتھ زور لگایا اور جال سمیت اُڑنے لگے۔ خوابوں کی گڑیاں جنھیں اس نے دل کے کسی کونے میں پھینک دیا تھا۔ ایک ایک کر کے نکالیں۔ ان کی گرد صاف کر کے بڑے چاؤ سے سجانے لگی۔ کھانے کی میز پر پہلا نوالہ اپنے ہاتھ سے سمیر کو کھلانا اور اس کے ہاتھ سے خود پہلا لقمہ لینا...... آفس جاتے وقت گال یا ہونٹ آگے بڑھا دینا...... آفس پر دو تین فون...... لنچ کیا کہ نہیں؟ جلد گھر آ جایئے۔ آتے ہوئے پزاہٹ پر آرڈر دیتے آیئے۔ خوبصورت بیڈ۔ بے داغ چادر پر گلاب کی پتیاں بکھیر دینا۔ سوتے میں کوئی پتی گال یا جسم کے کسی حصے پر چپک جائے تو اسے ہونٹوں سے نکالنا۔ دونوں کا ایک سفید چادر اوڑھے برہنہ سونا۔ رات دیر گئے تک فیشن چینل اور گندی گندی فلمیں دیکھنا۔ صبح انگریزی فلموں کی ہیروئین کی طرح چادر میں جسم لپیٹے باتھ روم کے دروازے تک جانا اور ایک دم چادر چھوڑ کر باتھ روم میں گھس جانا۔ شاور کے نیچے اکٹھے نہانا۔ گریٹنگ کارڈ پر دستخط کی جگہ لپ اسٹک سے رنگے ہونٹوں کے نشان ثبت

کرنا۔ ویک اینڈ پر لمبی ڈرائیو پر جانا۔ موٹر سائیکل پر سمیر کے ساتھ اس طرح چمٹ کر بیٹھنا کے درمیان سے ہوا بھی نہ گزر سکے۔ جسم کے سارے نشیب و فراز سمیر کی پشت میں مدغم کر دینا۔ کسی ریسورٹ میں جا کر واٹر گیمس کھیلنا، خوب بھیگنا اور ٹرانسپرنٹ ہو جانا۔ گھر میں جینز، شارٹس اور لنگریز پہن کر گھومنا، پابندی سے بیوٹی پارلر جانا، فیشل، پیڈی کیور، مینی کیور...... اسٹیپ کٹنگ۔ ہفتہ بھر میں اس کی تازگی لوٹ آئی۔ وہ جل تھل ہو گئی۔

(۲)

ایک روز دروازے پر سشما کے پاپا کے ساتھ سمن کھڑی تھی۔

''اب یہ یہیں رہے گی''۔ پاپا نے کہا۔

سشما نے مارے خوشی کے اسے لپٹا لیا۔

''پاپا سمن مان گئی؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''تم اپنی ممی کو جانتی ہو نا...... وہی کرتی ہیں جو چاہتی ہیں، سمن کے ماننے نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے''۔

اب جو بھی ہو، سشما نے سوچا، وہ ممی سے جیت گئی۔ سمیر کمرے سے باہر آیا۔

''اب یہ تمہارا گھر ہے''۔ پاپا سمن سے کہہ رہے تھے۔ ''یہ تمہارے ڈیڈی ہیں''۔

انھوں نے سمیر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ سمیر حیرت زدہ رہ گیا۔ یہ وہی لڑکی ہے جو برسوں پہلے سشما کی انگلی تھامے اس سے ملی تھی۔

''یہ میری بیٹی سمن ہے...... بیٹے وِش کرو''۔

''یہ سمن ہے''۔ پاپا کہہ رہے تھے۔

''ہیلو بیٹا''۔ سمیر نے کہا۔

''ہیلو انک......'' سمن کی زبان لڑکھڑا گئی۔

''آؤ...... ہمارے پاس بیٹھو''۔ سمیر نے محبت سے کہا۔

تھوڑی دیر بعد جب پاپا لوٹ رہے تھے تو سمن انھیں چھوڑنے دروازے تک آئی۔

''پاپا'' اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔

''میں آتا رہوں گا بیٹا۔ تم بھی جب جی چاہے آسکتی ہو۔ کیوں سشما؟''

''ہاں۔ ہاں۔ کیوں نہیں''۔ اس طرح سمن گھر آگئی۔

سمن چپ چاپ سی رہتی۔ اکثر کالج کی کتابیں یا میگزین لے بیٹھتی۔ شام کے کھانے کے بعد اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ اکثر کالج سے لوٹتے ہوئے بڑی ممی اور پاپا سے ملنے چلی جاتی۔ رات زیادہ ہو جاتی تو پاپا چھوڑ جاتے۔ سشما کو بہت بُرا لگتا۔ جب ممی پاپا نے تعلقات ختم کر دیے تو یہ کیوں ان کے پاس جاتی ہے؟

وہ اکثر سمیر سے اس کا ذکر کرتی اور بے بسی سے رونے لگتی۔ممی نے مجھے ماں بننے بھی نہیں دیا۔سمیر اسے دلاسہ دیتا کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

چھٹی کا دن تھا۔سب دیر سے جاگے۔اطمینان سے ناشتہ کرنے لگے۔سشما سمیر کو بتانے لگی کہ اس کی ممی نے کس طرح اس کی زندگی کو عذاب بنا دیا تھا۔کم سنی میں شادی بھی انھیں کا فیصلہ تھا۔علیحدگی اور طلاق کا فیصلہ بھی اُنھوں نے ہی کیا تھا۔اور جب وہ گھر آگئی تو ملازمہ بنا کر رکھ دیا تھا۔

''ممی پلیز''۔سمن نے ٹوکا۔

''کیا ہے؟''

''پلیز بڑی ممی اور پاپا کے بارے میں کچھ نہ کہیے، مجھے بُرا لگتا ہے''۔

''اور اُنھوں نے جو میری زندگی کو جہنم بنا کر رکھ دیا تھا۔اس کا کیا ہے؟''

''پتہ نہیں ممی کس نے کس کی زندگی کو جہنم بنایا ہے''۔وہ کھانا چھوڑ کر اُٹھ گئی۔

''سمن!''سشما نے تیز لہجے میں کہا۔

سمیر نے اسے منع کیا اور خود اس کے کمرے میں گیا۔سمن غصے سے لیٹی ہوئی تھی۔

''بہت چاہتی ہو بڑی ممی کو......''

''ہاں پاپا کو بھی''۔

''اور اپنی ممی کو......؟''

وہ خاموش رہی۔

''تم نے جواب نہیں دیا؟''

''وہ مجھے ممی جیسی لگتی ہی نہیں''۔

''اچھا میں تو ڈیڈی جیسا ہوں نا؟''

''نہیں۔ڈیڈی جیسے تو پاپا ہیں''۔

''اور میں......؟''

''آپ اچھے ہیں، بہت اچھے''۔وہ سمیر سے لپٹ گئی۔

دھیرے دھیرے وہ کھلنے لگی۔وہ سمیر کو بے تکلفی سے ڈیڈی پکارنے لگی۔سمیر اس کی پڑھائی میں مدد کرتا۔آفس سے لوٹتے وقت بڑا سا چاکلیٹ یا برگر لے آتا۔کبھی اس کے ساتھ بیٹھ کر سیریل دیکھتا۔سمن بھی کئی باتیں سمیر سے شیئر کرنے لگی تھی۔کبھی اس کے بازو پر، کبھی گود میں سر رکھ کر لیٹ جاتی اور کالج کے قصے سناتی۔کبھی دونوں مل کر اونچی آواز میں کوئی نیا گیت گانے کی کوشش کرتے اور جب بول یاد نہ آتے تو گانا چھوڑ کر ہنسنے لگتے۔سشما چائے اور پکوڑے تیار کرتی۔بہت دنوں سے وہ بڑی ممی اور پاپا کے پاس بھی نہیں گئی تھی۔

اس صورت حال سے سشما بے حد خوش تھی۔ سشما کو خوف تھا کہ پتہ نہیں سمیر سمن کو قبول کرے گا بھی یا نہیں۔ لیکن اب سمن سشما سے زیادہ سمیر کی دوست تھی۔ دونوں نے ہر طرح سے اس کی دل جوئی کی۔ چند دنوں میں ہی سمن کے اندر کی ہنس مکھ، بے تکلف بے باک لڑکی باہر نکل آئی۔

(۳)

سمن سے مطمئن ہو کر سشما پھر سے اپنی دنیا میں لوٹ آئی۔

ناشتے کی میز پر سشما نے پہلا نوالہ سمیر کی طرف بڑھایا۔ سمن نے بھی بڑی پھرتی سے سمیر کو نوالہ پیش کیا۔

''ڈیڈی پہلے میرا نوالہ''۔

سمیر نے سمن کا نوالہ لے لیا۔ سشما نے شکایتی نظروں سے سمیر کی طرف دیکھا اور وہ نوالہ پلیٹ میں واپس رکھ دیا۔

''ممی کو بھی کھلاؤ''۔

''نہیں......'' سمن نے ہنس کر انکار کر دیا۔

''ممی کو ہم کھلائیں گے''۔ سمیر نے سشما کے چہرے کا رنگ بدلتا دیکھ کر کہا۔

''رہنے دیجئے''۔ سشما نے کہا اور چپ چاپ سر جھکائے کھانے لگی۔

''ارے بھئی بچی''۔ سمیر نے سشما کو سمجھایا۔

''بچی ہے تو بچی کی طرح رہے''۔ سشما نے کہا۔

اس دن کے بعد وہ سب اپنا اپنا کھانا کھانے لگے۔ ایک دوسرے کو کھلانے کی بات ہی ختم ہوگئی۔

''اڑتے ہوتے جال میں ایک پرندہ پھڑ پھڑا کر مر گیا......

سمن اب ہر معاملے میں دخل دینے لگی تھی۔ انداز یہ ہوتا کہ اس کی معلومات سشما سے زیادہ ہیں۔ رات دیر گئے، سشما اور سمیر کوئی سیریل دیکھ رہے تھے۔ وہ اچانک آگئی۔ سمیر کا بازو پکڑ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ دوسری جانب سشما تھی۔ اچانک Bay Watch کا اشتہار آیا۔ سشما نے آنکھوں سے سمیر کو اشارہ کیا کہ ذرا نیم عریاں پامیلا اینڈرسن کو دیکھئے۔

''وہ پامیلا اینڈرسن ہے۔ اس نے امپلانٹیشن کروایا ہے ممی۔ ہمارے ہاں سشمتا سین نے انڈین اسٹینڈرڈ کے مطابق امپلانٹیشن کروالیا۔ لیکن دیر از نو یوز ان انڈیا (There is no use in India)''۔

''سمن......'' سشما نے ڈانٹا۔ ''جاؤ اپنے کمرے میں......'' وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ سشما اس کے پیچھے تیز قدموں سے گئی۔

''تمہیں شرم نہیں آتی اس طرح کی باتیں کرتے ہوئے۔ ڈیڈی بیٹھے ہیں''۔

''اس میں شرم کی کیا بات ہے؟ کیا ڈیڈی نہیں جانتے۔ روز تو بڑے بڑے اشتہارات چھپتے ہیں تصویروں

کے ساتھ۔ امپلانٹیشن، ریڈکشن، لفٹنگ، سلمنگ..... ٹی وی پر ایک مستقل چینل ہے ان چیزوں کا۔!'' سمن نے کہا۔

''تو کیا تم ہم سے ایسی باتیں کرو گی؟''

''پھر کس سے کروں؟ کیا ممی آپ بھی اتنی موڈ ہو کر.....''

سشما خاموش ہوگئی۔ چار پانچ برس میں کتنا کچھ بدل گیا۔ میوزک چینلس کی اینکرس، ایئر گرلس، ری مکسنگ گرلس، جیسے ساری جوان لڑکیاں ننگی ہونے کو اتاؤلی ہو رہی ہیں۔ شہرت پانے کا یہی شارٹ کٹ ہے۔ ٹی وی اور انگریزی میگزینوں اور اخباروں نے وقت سے پہلے ہی بچوں کو ذہنی طور پر بالغ کر دیا ہے۔ سمن تو ابھی بچی ہے، جب عقل آئے گی تو خود ہی سیکھ جائے گی کہ کہاں کس موقع پر کیا بات کرنا چاہیے۔

''بچی ہے.....!'' سشما نے سوچا۔

(۴)

چھٹی کسی ریسورٹ پر گزارنے کا پروگرام بنا۔

سشما اور سمیر کئی بار جا چکے تھے۔ اب سمن کا اضافہ ہوا تھا۔ سمیر اور سشما کے درمیان سمن بیٹھ گئی۔ سمیر نے بھی ٹی شرٹ اور جینز پہنی تھی اور اپنی عمر سے کم لگ رہا تھا۔ ریسورٹ میں اور بھی فیملیز تھیں۔ ایک طرف سوئمنگ پول اور واٹر گیمس تھے، مصنوعی آبشار بنے تھے۔ سشما اور سمیر پانی میں اُتر گئے۔

''ممی میں بھی آجاؤں؟'' سمن نے پوچھا۔

''ہاں.....ہاں.....آجاؤ.....''

سمن شلوار سنبھالے پانی میں اُتر گئی۔ اچانک سشما کو شرارت سوجھی۔ اس نے سمیر پر پانی اُڑانا شروع کر دیا۔ سمیر کو سنبھلنے میں کچھ دیر لگی۔ پھر اس نے شدت سے جوابی حملہ کرنا شروع کیا تو سشما سنبھل نہ سکا۔ سشما کی تائید میں سمن نے سمیر پر پشت سے حملہ کر دیا۔ سمیر نے اب سمن کو نشانہ بنایا۔ تینوں سر سے پیر تک بھیگ گئے۔ سمیر اور سشما تو جینز پہنے ہوئے تھے۔ لیکن ٹی شرٹ اور شارٹ بھیگ کر جسم سے چمٹ گئے تھے۔ سشما کی سرخ برا اور سینے کا وہ حصہ جو برا کی قید سے آزاد تھا صاف جھل رہا تھا۔

سشما تھک گئی۔ ''سمیر اب بس.....بس کرو پلیز''۔

سمن تازہ دم تھی اور مسلسل سمیر پر حملہ کر رہی تھی۔ سمیر نے سشما پر پانی اُڑانا بند کیا تو اس کی نظر سمن پر پڑی۔ وہ بُری طرح چونکی۔ اُف وہ بدن ایک مکمل جوان عورت کا تھا۔ سمن کے اندر اتنی خوب صورت عورت چھپی ہے، اسے پتہ ہی نہ تھا۔ سمن کے کپڑوں سے بدن کی تیز کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ سشما کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اسے صرف دو چمکتے سورج ہی طرف دکھائی دینے لگے۔ اسے شدید احساس کمتری ہونے لگا۔ اس کا بدن تو مکمل ہو گیا تھا۔ لیکن تکمیل کے مراحل طے کرنے والا بدن کتنا خطرناک ہوتا ہے، اسے پہلی بار احساس

ہوا۔ اس نے سچے دل سے دعا کی کہ سمیر کی نظر ثمن پر نہ پڑے۔ وہ سمیر کی نظر کو جانتی تھی۔

''ثمن...... چلو باہر نکلو...... اب بس بھی کرو''۔

''کیا ممی ابھی تو اُتری ہوں پانی میں......''

''اسی لیے کہہ رہی ہوں باہر آجاؤ۔ سردی لگ جائے گی''۔

ثمن کے باہر آتے ہی اس نے اس کا بدن تولیے میں لپیٹ دیا۔

''جاؤ فوراً کپڑے تبدیل کرو''۔ ثمن ڈریسنگ روم گئی تو سمیر نے پوچھا ''کیوں تمہارا موڈ ایک دم سے کیوں بدل گیا؟''

''اسے بہت جلد سردی لگ جاتی ہے۔ ہاتھ پھر ٹھنڈے ہو جاتے ہیں''۔ سشما نے جھوٹ کہا۔

''ہاتھ تو تمہارے بھی ٹھنڈے ہیں'' سمیر نے سشما کا ہاتھ دبا کر کہا اور چپکے سے اسے چوم لیا۔ سشما کو اس کا یوں بوسہ چرانا اچھا لگتا تھا۔ وہ اس سے لپٹ گئی۔

''چلو کپڑے بدل لیں''۔

گیلے کپڑے دھوپ میں پھیلا دیئے گئے۔ ثمن نے ریکٹ نکالے۔

''چلو کھیلتے ہیں''۔ سمیر نے کہا۔

سشما کھیل نہیں پائی۔

''ممی میں کھیلوں؟''

''ہاں...... ہاں'' سشما نے ریکٹ ثمن کو تھما دیا۔

دونوں بہت اچھا کھیل رہے تھے۔ ثمن تو تھی ہی بچی لیکن سمیر بھی ساتھ دے رہا تھا۔ سشما نے دیکھا ثمن کے بدن کے فتنے پھر جاگ رہے ہیں۔ جسم کی بوٹی بوٹی تھرک رہی تھی۔ سشما کی آنکھوں میں سورج اُبھرنے لگے۔

سشما کو اب سمجھ میں آیا کہ لوگ ویمنس ٹینس اتنی دلچسپی سے کیوں دیکھتے ہیں۔

''اب بس''۔ سشما نے اعلان کیا۔

''بس دو منٹ۔ بہت مزا آرہا ہے''۔ سمیر نے کہا۔

''کیا ممی آپ انجوائے کرنے ہی نہیں دیتیں۔ آپ کو ہمیشہ بھوک لگی رہتی ہے۔ کتنا ویٹ گین (Weight Gain) کر رہی ہیں''۔

سمیر نے کھیل روک دیا۔ ''چلو ممی ناراض ہو جائے گی۔ پھر سارا مزا کرکرا کر دے گی''۔ سمیر نے آہستہ سے کہا۔

کھانے کے بعد سشما لیٹ گئی۔ ثمن سمیر کا ہاتھ تھامے بوٹنگ کرنے چلی گئی۔ دونوں بڑے مزے سے

پیڈلنگ کرر ہے تھے۔ سشما کے اندر کہیں سے خوف اُتر آیا کہ وہ سمیر کا ساتھ نہیں دے پارہی ہے۔ کئی بار وہ یہاں آچکے ہیں لیکن سمیر کو اتنا خوش اس نے نہیں دیکھا تھا۔

نہیں، وہ سمن کی دل جوئی کررہا ہے، پہلی بار ساتھ آئی ہے! بچی ہے!...... نہیں وہ بچی نہیں ہے، اس کی آنکھوں میں سورج چمکے......

سشما خود کو تنہا محسوس کرنے لگی، وہ بھی سمن کی عمر کی تھی۔ اس کی شادی کردی گئی۔ پھر سال بھر میں وہ ڈرائیوری کہلانے لگی۔ جوانی تو آئی ہی نہیں۔ دس برس سے وہ ماں باپ کی خدمت میں لگی ہے...... اب شاید بھگوان کو اس پر رحم آیا ہے...... اس کے اندر کی لڑکی جا گی ہے تو مقابل میں اس سے خوبصورت جوان لڑکی کھڑی ہے...... کیا وہ پھر ہار جائے گی؟ نہیں!! دونوں اسی کی طرف آرہے تھے۔ ''چلو تم بھی چلو۔ بہت مزا آرہا ہے۔ پیڈل میں مارلوں گا''۔ سمیر نے کہا۔ ''نہیں۔ کچھ دیر آرام کرلو...... چائے پی کر واپس چلیں گے'' شام جب وہ واپس ہورہے تھے تو سشما نے کہا کہ وہ سمیر اور سمن کے درمیان بیٹھے گی...... اور پھر وہ اس طرح سمیر سے چپٹ کر بیٹھ گئی جیسے گرفت ڈھیلی ہوتے ہی سمیر اُڑ جائے گا۔ لیکن جال لے کر اُڑنے والے پرندوں میں سے ایک اور نے دم توڑ دیا تھا۔

(۵)

ممی، میں ساری باندھ کر جاؤں گی آج......''

''کیوں؟''

''کالج ڈے ہے۔ ساری لڑکیاں ساری پہن کر آرہی ہیں''۔

''ٹھیک ہے کوئی ساری سلیکیٹ کرلو۔ بلاؤز کہاں سے لاؤ گی؟''

''آپ کا ٹرائی کرتے ہیں''۔

''میں تو موٹی بھدی عورت ہوں نا؟'' اس نے طنز کیا۔

''مما پلیز۔ دیکھنے میں کیا ہرج ہے''۔

''دیکھ لو''۔ سشما نے بے دلی سے کہا اور کام میں مصروف ہوگئی۔

''دیکھو مما......'' سمن بلاؤز پہن کر آگئی۔ تقریباً برابر تھا۔ سشما حیرت زدہ رہ گئی۔ سمن بظاہر تو ایسی نہیں لگتی۔

''میں جہاں جہاں ضرورت ہے اندر سے اسٹچنگ کرلوں گی۔ اب لائیے تیسری چیز''۔

''کیا مطلب؟''

''یہ اندر کی بات ہے''۔

''میں سمجھی نہیں''۔

''ممی۔ تھری لیٹر ورڈ۔ ویری سمپل''۔ سمن خوشگوار موڈ میں تھی۔ ''بی۔ آر۔ اے۔ بی فار بیوٹی فل، آر فار راؤنڈ

اینڈاے فار ایپل"۔ وہ کسی اسکول ٹیچر کی طرح بولنے لگی۔
"تمہارے پاس نہیں ہے؟ اس روز بھی پکنک پر ویسے ہی آگئیں"۔
"کہاں سے لاؤں گی مائی ڈیرممی"۔
"اچھا اچھا چلو ٹھیک ہے"۔ سشما نے کھسیا کر کہا۔ "تم نے کبھی کہا بھی تو نہیں اور مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم ......"
"تو پھر ٹرائی کر لیتے ہیں"۔
"کیا فائدہ۔ تم بچی ہو ابھی"۔
سمن نے ٹرائیل کیا۔ "ممی دیکھیے، ایک دم فٹ، آپ ہمیشہ انڈر اسٹیمیٹ کرتی ہیں"۔
سشما کے سارے حواس آنکھوں میں مجتمع ہو گئے تھے۔ وہ دیکھتی رہ گئی۔ کیا خوبصورت بدن تھا۔ وہ دونوں سورج جنھوں نے اس کی آنکھوں کو چندھیا دیا تھا، اب پوری طرح روشن تھے۔ وہ وہم یا گمان نہیں تھا۔ حقیقت سامنے کھڑی تھی۔
"دیکھا مما" سمن نے فخر سے کہا۔
سشما سمن کے بدن کے سحر سے نکلی تو اسے ایسا لگا جیسے اسی لمحہ بوڑھی ہو گئی ہے۔ لیکن وہ اتنی حیران کیوں ہے۔ اس عمر میں تو اس کی شادی ہو گئی تھی، بلکہ وہ تو سمن کی ماں بھی بن گئی تھی۔ لیکن اس نے کبھی اپنے جسم پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ شاید اس کا جسم ایسا تھا بھی نہیں۔ اسے ایک بھرے بھرے جسم کی عورت نے شکست دی تھی۔ اس کا شوہر اپنے بھائی کی بیوی کا دیوانہ تھا۔ اسے اس لیے ہی اس گھر میں دلہن بنا کر لایا گیا تھا کہ اس کا شوہر اسے پا کر اپنی بھابھی میں دلچسپی لینا چھوڑ دے۔ لیکن اپنی کم سنی کی وجہ سے وہ کچھ بھی نہیں سمجھ پائی اور اس عورت سے ہار کر گھر آبیٹھی۔ اب جسم کے خالی حصے بھر گئے ہیں تو ایک کمسن لڑکی مقابل کھڑی ہے۔ اس کی اپنی بیٹی۔!

(۲)

سمیر آفس سے لوٹا تو اس کی پسندیدہ ساڑھی باندھے سشما بالکونی میں کھڑی کچھ دیکھ رہی تھی۔ بہت ہی سلم اور خوبصورت لگ رہی تھی۔ اسے دس برس پہلے کی سشما یاد آگئی۔ وہ دبے پاؤں آگے بڑھا اور ایک دم سے اسے گود میں اُٹھا لیا، کتنی ہلکی پھلکی لگ رہی تھا سشما۔!
چیخ سن کر سشما کچن سے باہر آئی۔ سشما کو دیکھ کر سمیر کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ سمن کے پیر فرش سے لگے۔ سمن زور زور سے ہنسنے لگی۔ سمیر جھینپ کر کمرے میں چلا گیا۔ سشما اس کے پیچھے پیچھے آئی۔
تم اپنے کپڑے اسے کیوں پہننے دیتی ہو!" سمیر نے غصہ سے کہا۔
"آج اس کا کالج ڈے تھا"۔

سمیر کا موڈ خراب ہی رہا، کھانے کی میز پر بھی وہ سر جھکائے کھاتا رہا۔
آپ اتنا مائنڈ کیوں کر رہے ہیں؟ مجھے تو بُرا نہیں لگا''۔ سمن نے کہا اور سمیر کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔
اچھا چلو ٹھیک ہے۔ تم آ دَ یہاں تمیز سے بیٹھو''۔ سشما نے تلملا کر کہا۔
جب تک سمن گھر میں رہتی خود ہی بولتی رہی۔ سمیر کے پیچھے پیچھے گھومتی رہتی۔ وہ سمیر سے باپ جیسا سلوک کیوں نہیں کرتی۔ یہ رشتہ تو احترام کا مطالبہ کرتا ہے۔ کیا یہ بات سمن کی سمجھ میں نہیں آتی؟
''وہ تمہارے ساتھ باپ کی طرح Behave کیوں نہیں کرتی؟''
''شاید میں ہی رشتے کا وہ احترام باقی نہیں رکھ پایا۔ ایک دم سے اتنی بڑی پلی پلائی لڑکی کا باپ بن کر بوکھلا گیا''۔
''طنز کر رہے ہو مجھ پر''۔
''ارے نہیں۔ تم فکر نہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ابھی بچّی ہے''۔
مصیبت یہی ہے کہ وہ بچّی نہیں ہے۔ سشما سمیر سے کہہ نہ سکی۔ سشما اپنی زندگی میں رنگ بھرنے کی بجائے سمن کے بارے میں تشویش میں مبتلا ہو گئی تھی۔ وہ سمن کو ممی کے پاس واپس جانے کے لیے بھی نہیں کہہ سکتی۔ وقار کا مسئلہ تھا۔ پھر وہ ضدی عورت مانے گی بھی نہیں۔
اسے اپنی ماں سے سخت نفرت تھی۔ ممی نے ہی اس کی شادی کم عمری میں کر دی تھی۔ علیحدگی کا فیصلہ بھی انھیں کا تھا۔ سمن کو اس کے باپ کو نہ دینے کا فیصلہ بھی اُنھوں نے ہی کیا تھا۔ جب اس کی ملاقات سمیر سے ہوئی تھی تو شادی کی سخت مخالفت بھی ممی نے ہی کی تھی۔ پھر سمن پر اس کا کوئی اختیار بھی نہیں تھا۔ ممی نے اسے کبھی ماں بننے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ سمن نے کبھی اسے ماں سمجھا ہی نہیں۔ اور اب اچانک ممی نے سمن کو اس کے حوالے کر دیا۔ سمن کو ممی ہی نے بگاڑا ہے۔ لیکن اب کیا ہو سکتا ہے؟
ممکن ہے سمن کو اس کا اس عمر میں شادی کرنا اچھا نہ لگا ہو۔ ممکن ہے سمن سمیر کو باپ کا درجہ دینا ہی نہ چاہتی ہو۔ سمیر اس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد ہو......
جیسے جیسے سشما نے سمن پر نگرانی سخت کر دی، سمن نے اسے زیادہ ہی تنگ کرنا شروع کر دیا۔ جب وہ رات کوئی سیریئل دیکھ رہے ہوتے تو سمن آ جاتی، ''نیند نہیں آ رہی ہے''
کبھی وہ انتہائی نازک مراحل طے کر رہے ہوتے تو سمن زور زور سے دروازہ پیٹنے لگتی، ''ممی مجھے اکیلے میں ڈر لگ رہا ہے، میں آپ لوگوں کے ساتھ سوؤں گی''۔ اور وہ سشما کے برابر لیٹ جاتی۔ سشما کی پوری رات آنکھوں میں کٹ جاتی۔ کیا سمن یہ سب کچھ جان بوجھ کر کر رہی ہے؟
اس کشمکش میں پتہ چلا کہ سشما ماں بننے والی ہے۔ سشما اور سمیر بے حد خوش تھے۔ جب سمن نے سنا تو بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

''ممی کیا ضرورت تھا...... سارا فیگر تباہ ہو جائے گا''۔
''مجھے سمیر کے پیار کی ایک نشانی چاہیے''۔
''کیا نشانیاں ہی جمع کرتی رہیں گی؟'' سمن نے کہا۔
''ہاں، کچھ اچھی نشانیاں بھی چاہئیں''۔ سشما نے جل کر کہا۔
سشما کو ماں بننے کی خوشی تو تھی لیکن ایک خوف بھی تھا۔ اس کا جسم بے ڈول ہوتا جا رہا ہے اور سمن بے باک ہوتی جا رہی ہے۔ وہ دن بھر کام کرتے کرتے تھک جاتی لیکن سمن اس کی ذرا بھی مدد نہیں کرتی۔ سمیر اس کا ہاتھ بٹانے لگا۔ سمیر کو سمن کا اس طرح بیٹھے بیٹھے حکم چلانا سخت ناگوار گزر رہا تھا۔ اس نے دبی زبان میں سمن سے کہا بھی...... سمن نے باتوں باتوں میں صاف سمجھا دیا کہ وہ یہ سب نہیں کر سکتی۔ اتنے وقفے کے بعد سشما نے کیری کیا تھا۔ ڈاکٹر نے احتیاط کے لیے کہا تھا لیکن سمن کا یہ انداز ناقابل فہم تھا۔ کالج سے آتے ہی ایک طرف سینڈل اچھال دیتی۔ بیگ ایک طرف پھینک دیتی۔ منہ ہاتھ دھوئے بغیر کپڑے تبدیل کئے بنا ریموٹ کنٹرول ہاتھ میں لے کر ٹی وی کے سامنے بیٹھ جاتی۔ سمیر کے گھر لوٹنے کا وقت ہوتا تو فریش ہو کر کپڑے تبدیل کر کے انتظار کرنے لگتی۔ کیا ہے اس لڑکی کے دل میں......؟

(۷)

اس شام سمیر جلد گھر آ گیا۔ سمن جلدی سے باتھ روم میں گھس گئی۔ منہ دھو کر سشما کا ایک شرٹ شلوار پہن لیا۔ سمیر نے سشما کی طرف گھور کے دیکھا۔
''تم نے میرے کپڑے کیوں پہن لیے۔ میں نے منع کیا تھا نا......'' سشما نے کہا۔
اونہہ۔ اب یہ آپ کے استعمال کے قابل تو رہے نہیں۔ آپ کو استعمال کرنے میں ابھی کافی دن ہیں۔ میں نے پہن لیا تو کیا ہوا؟''
سمن نے دوپٹہ بھی نہیں اوڑھا تھا۔ شرٹ کے گریبان سے موجوں کا مد و جزر صاف دکھائی دے رہا تھا۔
سشما کچن میں چلی گئی۔ اس نے سمن کو پکارا۔ وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ سمیر کو یہ بالکل پسند نہیں کہ وہ سشما کے کپڑے استعمال کرے اور گریبان......؟
سمن نہیں آئی۔
''ممی آپ ہی لائیے نا...... پکوڑے......''
''تم آؤ''۔ سشما نے کہا۔
''نہیں ممی''۔
''میں آ رہا ہوں''۔ سمیر نے کہا۔
''ارے نہیں۔ آپ بیٹھئے''۔ پسینے میں تر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے سشما پکوڑے لے آئی۔

سمن ہنسنے لگی۔ ''ڈیڈی ذرا دیکھیے ......'' پھر زور زور سے ہنسنے لگی۔

''شٹ اَپ۔ پاگل ہوگئی ہو؟'' سمیر چلایا، ''اُف!''

سمن ایک دم خاموش ہوگئی۔ ایک جھٹکے سے اُٹھی۔ میز پر رکھی پلیٹ کو دھکا دیا۔ سارے پکوڑے فرش پر بکھر گئے۔ وہ پیر پٹکتے ہوئے کمرے میں چلی گئی۔

سشما نے اس کے پیچھے جانے کی کوشش کی۔

''نہیں، اس کی ضرورت نہیں''۔ سمیر نے کہا۔

سشما نے عجیب سا اطمینان محسوس کیا۔

رات میں بھی کوئی اسے منانے نہیں گیا۔ صبح سمیر کے دفتر جانے تک وہ باہر نہیں آئی۔ سشما نے جھانک کر دیکھا۔ وہ سو رہی تھی۔

شام سمیر دفتر سے آیا تو سمن کہیں نظر نہیں آئی۔

''صبح گھر سے گئی تو اب تک واپس نہیں آئی''۔ سشما نے بتایا۔

''کہاں جا سکتی ہے! کسی سہیلی کے پاس؟''

''میں نہیں سمجھتی کہ اس کی کوئی ایسی سہیلی ہے''۔

''ممی پاپا کو فون کیا؟''

''نہیں''۔

''میں کروں؟''

''نہیں'' سشما نے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''غصے میں کوئی انتہائی اقدام نہ کرلے''۔

''وہ ایسا نہیں کرسکتی۔ میں جانتی ہوں اسے''۔

''پھر؟''

''ایک آدھ دن میں خود ہی پتہ چل جائے گا۔ ہم ڈھونڈیں گے نہیں''۔ سشما نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

سشما کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے لیکن چہرے پر اطمینان تھا۔

پرندے ایک ایک کر کے پھر سے جاگ گئے اور جال سمیت اونچائی پر پرواز کرنے لگے۔

☆☆☆

''یہ کہانی تو نہیں''

● سائرہ غلام نبی [پاکستان]

تخیل کو تراش کر کہانیاں بنانا پہلے تو میرا مشغلہ تھا۔ پھر یہی روزگار ٹھہرا کہ انٹرٹینمنٹ انڈسٹری میں کہانی کی بڑی اہمیت ہے۔ ایسی کہانی جو کسی نے سوچی نہ ہو۔ کسی نے برتی نہ ہو۔ بالکل ان چھوئی۔ عین میں وہی توقعات جو عاشق اپنی محبوبہ سے رکھتا ہے۔ اسی لیے Work Station پر میرا کمرہ ہمہ وقت ''قصہ خوانی بازار'' بنا رہتا ہے۔

گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والے۔۔۔

بھانت بھانت کی کہانیاں سنانے والے۔۔۔

دور، دور سے چلے آتے ہیں۔

پہلی کہانی میں دو عورتوں کے درمیان ایک مرد آجاتا ہے۔ اس سے اگلی میں دو مردوں کے درمیان ایک عورت آجاتی ہے۔

دو عورتوں کے درمیان ایک عورت۔۔۔

اور دو مردوں کے درمیان ایک مرد۔۔۔

ایسی روایات عام زندگی میں تو ملتی ہیں۔ مگر کہانیوں میں خال خال لطافت، چاشنی، تضادات سے ابھرتی ہے اور تضادات و تصادم نہ ہو تو کہانی نہیں بنتی۔۔ سپاٹ۔۔۔ بے رنگ واقعہ رہ جاتی ہے۔۔۔ شوبی کی طرح۔

دھیان اس کی طرف کیا گیا کہ وہ لمحہ بعد سامنے موجود تھی۔

''ڈارلنگ تم کو پتہ ہے آج کل میری زندگی میں کیا ہے؟''

وہ آتے ہی شور مچانے لگی۔

''اتنا پتا ہے کہ تمھاری زندگی میں رومانس دور دور تک نہیں ہے۔۔۔''

شوبی نے میری توقع کے مطابق منہ بنایا، شدید بے زار کن شخصیت ہے یہ شوبی۔۔۔ مجھے اس کی بے رنگی سے وحشت ہوتی ہے، چڑ ہوتی ہے کہ انسان، اشیا، رویے اپنے اصل رنگ میں نہ ہوں تو بڑے اوپرائے اور نحوست زدہ لگتے ہیں۔

دھوپ نہ چھاؤں۔۔۔ جیسے بدلی چھائی ہوئی ہو۔۔۔ جیسے تصویر پر دھول پڑی ہو۔

اس کو دیکھ کر، کسی کی بھی تخلیقی صلاحیت بانجھ ہو سکتی ہے۔ یہ میرا تجربہ ہے۔

سو اسے دیکھ کر میں شدت سے اکتا جاتی ہوں۔ میری بے زاری سے بے نیاز وہ ہے کہ سماج کو ہلا دینے والی کہانی کا مطالبہ لیے ہر وقت سر پہ سوار رہتی ہے۔ اب میں اسے کیسے بتاؤں کہ کون دیکھنا چاہتا ہے، ٹی وی، فلم کے تفریحی موڈ میں رونے والی، نحوست زدہ گندی سندی حقیقت پسندی۔۔۔

اس نے میری بور شکل دیکھ کر بات بدلی۔۔۔

''اوکے، اوکے تمھیں ڈسٹرب کیا۔''

فٹافٹ وہ کام کی بات پر آ گئی۔

''تم نے مجھے جو اسکرپٹ دیا ہے نا اس میں ہیرو کیا سگریٹ پینے والا انسان ہے یا سگار۔۔''

''وہ گھاس کھانے والا انسان ہے''

میں نے چڑ کر جملہ پورا کیا۔۔۔

جواباً اسے مجھ سے زیادہ غصہ آ گیا۔ میری میز۔۔۔ جس پر کاغذوں کا جمعہ بازار لگا رہتا ہے۔ یہ سگریٹ پھینک کر بولی۔

''یار ایک تو تم بھی نا، عجیب عجیب انسان مجھے پکڑا دیتی ہو۔ اللہ معافی۔۔۔ شعر بولنے والا، مشکل مشکل باتیں کرنے والا، فضول الفاظ منہ سے نکالنے والا، توبہ۔۔۔''

اس کا اپنا ذاتی ڈکشن ہے۔ لفظیات، روز مرّہ محاورے کے چکر سے آزاد۔۔۔

مجھے اس پر غصہ آ جائے تو میں اس کی صنف اسے یاد دلاتی ہوں۔ سو یہی کیا۔

''اے لڑکی۔۔۔! تم کیسی انسان ہو۔۔۔ ہائے داوے۔۔''

سنتے ہی دانت کچکچا کر بولی۔۔۔

''سائرہ جی!۔۔۔ آئندہ مجھے یہ گالی نہ دینا۔۔۔!''

میں نے بھی اپنے شاعروں، ادیبوں کی بے عزتی کرنے کا بدلہ لے لیا تو ہی سکون ملا۔ اس کا دل جلانے والی مسکراہٹ سجا کر میں اپنی کہانیوں کی سستی رومانی دنیا میں گم ہونے لگی کہ اس نے اسکرپٹ میرے

ہاتھ سے چھینا: ''کیا میں شکل سے ''بچ'' لگتی ہوں؟'' چشمہ اتار کر اطمینان سے کہا۔

''لگتی کیا ہنڈرڈ پرسنٹ ہو۔'' میں نے نظریں جما کر زور دے کر کہا۔

چونکہ وہ ضرورت سے زیادہ سمجھ دار ہے، سمجھ گئی مگر میرے الفاظ آگ لگا چکے تھے اور جیسے اس کا سارا وجود جھلسنے لگا۔۔ اتنا کہ اس کے منہ سے شعلے نکلنے لگے اور مجھے لگا کہ میرے کمرے میں شاعری، ناول افسانے کی کتابوں کے جنگل میں آگ لگ جائے گی اور کئی دن تک نہیں بجھے گی۔

''آج سے سات سال پہلے یہ سالی شلوار اتار پھینکی تھی۔۔''

''اف بس کر دو'' میں ویسے ہی کھلی زبان سن کر لرزسی جاتی ہوں۔ خوامخواہ اسے طیش دلایا مگر اب وہ رکنے والی نہیں تھی۔ جملہ مکمل کیا: ''اور فیصلہ کیا تھا کہ زندگی جینز میں بسر کروں گی۔''

اس نے چٹکی سے جینز کا موٹا کپڑا پکڑ کر دکھاتے ہوئے کہا۔

''توبہ! سوچ سمجھ کر بولا کرو، کوئی مرد بھی سن سکتا ہے''

''کیوں میں کوئی لڑکی ہوں۔۔۔ عورت ہوں۔۔ کمزور ہوں۔۔ میں کیوں زبان روکوں؟''

''پیدا تو تم لڑکی ہوئی تھیں۔۔ نام بھی زنانہ رکھا گیا تھا۔ پھر کیا ہو؟'' مجھے چھیڑ سوجھی۔ گویا اسے اوقات یاد دلائی۔

اس کا بس نہ چل رہا تھا کہ میری گردن دبا دے۔ میں اس کے کمزور پہلو پر مسلسل چٹکی لے رہی تھی۔ وہ چاہنے کے باوجود میرا کچھ نہ بگاڑ سکی کہ اپنے کیریئر کو جیک لگانے کے لیے اس کو مجھ سے کہانی درکار تھی۔ جس کو ڈائریکٹ کر کے وہ شوبز مارکیٹ میں اِن ہو سکے۔ ان سب معاملات کے پیش نظر وہ کچھ دھیمی ہوئی:

''دیکھو دادا! وہ ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی نا۔۔ اس کو ایک دن میں نے اپنے ہاتھوں قتل کر دیا۔۔۔''

اس نے اپنے نرم و نازک ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے کہا جو کسی طرح کسی قاتل کے ہاتھ نہ دکھتے تھے۔

''نہیں! اتنے پیارے ہاتھ کسی کا خون نہیں کر سکتے۔۔''

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔۔ جو اس نے جھٹکے سے کھینچ لیا۔

''یہی بات بری لگتی ہے''

''کیا؟'' میرا حیران ہونا بجا تھا۔۔

''اپنے رنگ روغن کا قصیدہ سننا''

''یار! عورت کی فطرت ہے''

''یقیناً تمھارے شاعروں نے بتایا ہوگا۔ سوری! میں نہیں مانتی ان مردوں کو جو عورت کے سامنے شاعر ہو جاتے ہیں۔''

''اے احمق! کبھی ان کے آگے بے وقوف بن کر دیکھ۔۔''

میں نے شرارت سے اسے گھیرا، وہ ایک لمحے کو بے وقوفی کی زد میں آ گئی اور اس کا اعترافی موڈ بن گیا۔
"یہ جو میں دکھتی ہوں نا۔۔ ہمیشہ ایسی نہیں تھی۔ اچھی خاصی نیک پروین تھی۔ لپٹی لپٹائی۔۔ چھپی چھپائی۔۔"
"یہ کون سی صدی کا قصہ ہے؟"
میں حیران ہو کر انکشاف کی زد میں آ کر بولی۔
وہ جھینپ کر رہ گئی۔
"جب میں نئی نئی کام کرنے نکلی تھی۔ غلطی سے صحافت کا پیشہ اختیار کیا کہ پڑھے لکھوں کی فیلڈ ہے۔ قلم سے جہاد کروں گی۔ جرائم کو بے نقاب کروں گی۔ اصلاح معاشرہ کروں گی۔ کام سیکھوں گی۔ یوں سمجھ، جانی! خوابوں کی دنیا میں کھوگئی۔" پھر وہ خاموش ہوگئی۔ کچھ دیر بعد بولی:
"ہوش میں آئی تو پتہ چلا کہ سکھانے والا استاد مجھے محبت سکھانے پر تلا ہوا ہے۔ رومانس میں ماہر کرنے پر اتر آیا ہے۔"
میں ہنسنے لگی کہ اس کی پھیکی زندگی میں زنانہ ملائمیت کے آثار دریافت ہو رہے تھے۔ میں خوش ہونے میں حق بجانب تھی۔
"مرد عشق ہوتا ہے، عورت حسن ہوتی ہے۔ دونوں کے سمبندھ سے کائنات چل رہی ہے۔ سیکھ لینا تھا، آگے کام آتا، بہت ترقی ملتی"۔۔
"کیوں مجھ میں صلاحیت کی کمی تھی۔ میں چل سکتی تھی، پھر سکتی تھی، کام سیکھ سکتی تھی۔ جس پہ دل آتا، اس پر مر بھی سکتی تھی۔ پر یوں نہیں۔۔ نیوز روم کے ڈیسک پر کیا بیٹھی۔۔ چیف ایڈیٹر سے لے کر پیون تک کی محبوبہ بن چکی تھی۔ دو دن گزرے، دو ہفتے گزرے، دو مہینے گزر گئے۔ کوری کی کوری۔۔ ویسے سب او کے ٹھیک تھا۔ مگر جانی! مجھے کام کی پیاس تھی۔۔ اور پھر۔۔" وہ رک گئی۔۔ ٹھہر گئی۔ پھر اپنے مطالبہ پر آ گئی۔ جس سے میں بد مزہ ہوتی ہوں: "یار جانی! مجھے آگے جانا ہے۔ بہت آگے۔ سماج کو بے نقاب کر دینے والی، بلاسٹ کرنے والی کہانی۔۔ ایک عدد کہانی۔۔ یار، جو قلم سے نہ کر سکی۔ وہ کیمرے سے کروں گی۔ گندگی کو گندا دکھاؤں گی۔"
"شوبی! وہ محبوبہ۔۔ اس کا کیا ہوا؟"
کہانی اور کمزوری سننے کی انسانی فطرت مجھ میں جاگ گئی میں نے پچھلی بات کا سرا تھمایا۔۔۔
کاغذوں کے جمعہ بازار میں چٹخارا چاہیے تھا۔
"کھاتی اپنی مرضی کا ہوں۔۔ پہنتی اپنی مرضی کا ہوں۔۔ جاگتی اپنی مرضی کا ہوں۔" پھر قطعی لہجے میں بولتے ہوئے۔ ایک بار پھر رکی:
"تو پھر سوؤں گی بھی اپنی مرضی کا۔۔"
"اوہ۔۔!"

''پھر میں نے شلوار۔۔''

''اے رک رک۔۔'' میں بوکھلائی۔

''مطلب میں نے دوپٹہ پھینکا۔۔چوڑیاں دست بن میں ڈال دیں۔سینڈلیں ماسی کو دے دیں۔لپ اسٹک، نیل پالش کو آگ لگادی اور ایسی بن گئی'' اس نے اپنے مردانہ حلیے والے وجود پر حقارت بھری نظر ڈالی۔۔

''کسی نے ہاتھ بڑھایا۔میں نے اسے گلے سے لگایا۔کسی نے چائے کی آفر دی۔ڈھابے پر بیٹھ گئی۔کسی نے سستا جملہ پھینکا۔میں نے کرارا جوک سنایا۔سب ٹھنڈے پڑ گئے۔نہ چھپن چھپائی۔نہ لگائی بجھائی۔نہ چٹخارہ۔نہ مزہ۔میں بدمزہ ہوگئی۔'' وہ چہک کر بولی:

''دیکھو جانی! یہ کانا پھوسی بیکار ہے۔سارے پتے کھول کر رکھ دو تو کوئی نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔۔۔''

''جب میدان میں اترے ہیں تو کھیلے بغیر، یا ہارے، جیتے بغیر گھر جانے کا فائدہ۔'' میرا اپنا فلسفہ ہے۔

''جانی! فائدہ یہ ہوا کہ 'عزت' بچ گئی۔'' وہ آنکھ دبا کر بولی۔

مجھے اس فلمی ڈائیلاگ پر ہنسی آ گئی۔

وہ بھی ہنستے ہنستے دیرینہ مطالبہ دوہراتے نکل گئی:

''اگلی باری۔تم مجھے دے ہی دو۔ایک کہانی۔سماج کا بھرم کھولنے والی۔ٹھیک۔۔''

اور میں رومانی مکالمے لکھتے ہوئے سوچنے لگی۔حقیقت اور فرض میں کتنا فرق ہوتا ہے۔حقائق کھردرے ہوتے ہیں۔خیال کتنا رومانی ہوتا ہے۔انٹرٹینمنٹ انڈسٹری کے لئے کہانی وہی اچھی ہے جو تخیل سے پھوٹتی ہے۔جہاں سب اچھا اچھا ہے، یا ہو جاتا ہے۔مگر ایسی کہانی شوبی کو نہیں چاہیے۔۔

کافی دن گزر گئے۔

بغیر انتظار کرائے ایک بار پھر وہ میرے سامنے آ گئی اور خاموشی سے بیٹھ گئی۔شور شرابا آج اس کے مزاج میں نہیں تھا۔میں نے محسوس کیا۔وہ کچھ سمٹائی سی ہے۔جسم کو چرائے ہوئے، مجھے عجیب سا محسوس ہوا مگر میں نظر انداز کر کے اپنے کام میں گم رہی۔تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ کہنے لگی:

''سائرہ جی! جینز پہنو یا شلوار۔۔سالی فلمی عزت کہیں محفوظ نہیں''۔۔

میں دوہرائی ہوئی کہانی سننے کے موڈ میں ہرگز نہیں تھی کہ زندگی کی سب سے خوبصورت کہانی میں سے ''عاشق'' کا کردار منہا کر کے ہر قصے کو سپاٹ کر دیا جائے۔وہ میرا موڈ دیکھ کر اپنے مطالبے پر آئی۔

وہ اسی سوال کو دوہرا رہی تھی:

''سماج کو ہلا دینے والی''۔۔۔

''نہیں ملی'' اس کا سوال پورا نہ ہوا تھا کہ میں نے ٹکا سا جواب دے دیا۔

اس نے بھی زیادہ اصرار نہ کیا۔پست لہجے میں بولی:

''سائرہ جی! تم کو پتہ ہے اب میری زندگی میں کیا ہے؟''

''مار کٹائی، گالم گلوچ۔۔۔اور کیا ہے یار! فلرٹ کرنا مردوں کی فطرت ہے، اس سے سمجھوتہ کر۔''

''مطلب''۔۔۔وہ تیکھی ہو کر سیدھی ہوئی۔اس کی تقریر کے پیش نظر میں نے پہلے بولنا شروع کر دیا:

''جاؤ۔۔۔منہ توڑ دو۔۔۔فلرٹ کرنے والوں کا۔''

میں نے اس کی تھکی طبیعت کو جوش دلایا۔

''نہیں!''

''تم نے چوڑیاں پہن رکھی ہیں کیا؟۔۔۔جبڑا کیوں نہ چیرا؟''

وہ بے دم ہو کر گری۔۔:

''سائرہ جی! کیسے منہ توڑ دوں؟ چوڑیاں اگرچہ میں نے نہیں پہن رکھیں''۔۔۔اس نے ڈنڈا سی کلائیوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کا لہجہ مزید پست ہوا۔وہ رکی۔پھر بے چارگی سے بولی:

''اس بار بھی مرد ہوتا تو میں اس کا منہ ضرور توڑتی۔پھر تمھارے پاس آتی''۔۔۔

چند لمحے خلا میں گھورتی رہی۔پھر جھرجھری لے کر بولی:

''مگر چوڑیاں اس نے پہن رکھی تھیں۔۔۔اور میں کچھ بھی نہ کر سکی۔۔۔''

سماج کو ہلا دینے والی لائن خود اسی نے مجھے دے دی تھی اور میں سوچ رہی تھی کہ اس پر کہانی لکھ کر اسے دوں یا اب تک محفوظ رہ جانے والی عزت پر مبارک باد دے کر اسے رخصت کروں۔۔۔!

☆☆☆

ایک اور بُو

[سعادت حسن منٹو کی کہانی 'بُو' سے متاثر ہو کر]

● قمر جہاں

رندھیر کی عمر اب پورے نوے سال ہونے کو جارہی تھی، وقت کس قدر تیزی سے پلٹا کھاتا ہے۔ نرم گدّے دار اسپرنگ چیئر پر دراز ہو کر ریٹائرڈ فوجی افسر رندھیر موسم برسات کی بوندا باندی کا لطف لے رہا تھا۔ اب برسات ہوتی بھی کہاں ہے بھلا۔ اب تو کسی موسم کا کوئی اعتبار ہی نہیں، جب جی چاہا جھما جھم برس گئے، جب جی چاہا دعاؤں اور پرارتھنا کے باوجود موسم کا مزاج روٹھے صنم سا بنا ہوا ہے، جسے مناتے مناتے فصل برباد ہو جاتی ہے، وہ تو بھلا ہو ان نئی ایجادات کا کہ بن موسم کے برسات، جاڑا یا گرمی کا لطف لیا جارہا ہے۔ بس پرکرتی (فطرت) کے روٹھنے پر پیسہ ذرا زیادہ خرچ ہو جاتا ہے، سو پیسے کا بھی کیا دُکھ...... اب تو اور بھی غم ہیں زمانے میں...... پیسہ ہی ایک دُکھ نہیں رہا۔ یہ تو سُکھ بن کر تقریباً ہر گھر میں اندھے دروازے سے داخل ہو رہا ہے۔ رندھیر نے ایک ذرا سوچا پھر اپنے بیٹے کو آواز دینے لگا۔

''ابھی آیا ڈیڈ! بس دو منٹ میں......'' مگر یہ دو منٹ جب دس منٹ میں بدل گئے تو رندھیر کا غصہ بڑھنے لگا:

''یہ بھی کوئی بات ہوئی..... ہم اپنے کام کے لیے تھوڑے بلا رہے ہیں،...... دیوار گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے جس کا ہندسہ تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا، انھوں نے جھنجھلاتے ہوئے سوچا:

''...........ہم تو اُسی کی خواہش جاننا چاہتے ہیں..... شادی بیاہ کے معاملے میں اب نظریات بہت بدل چکے ہیں........ بچوں کی پسند.........''

''کیا کہا ڈیڈ آپ نے.........؟'' وہ سامنے کھڑا تھا۔

"..........بیٹا! آپ کے .I.A.S ہونے کے بعد سے رشتے کا ایک سیلاب اُمڈ آیا ہے۔ تصاویر اور Bio-data سے میری بریف کیس بھرگئی ہے مانو جوہری کی دوکان میں جہاں ہر قیمت کے زیورات سجے ہوئے ہیں۔ بس تمھاری ایک پسند پر سب کچھ قربان کرنے کو لڑکی والے قطار میں کھڑے ہوئے ہیں۔

"مگر ڈیڈ! میں ابھی.........."

"کب تک اپنا بھاؤ بڑھاؤ گے اور ہمارا بوجھ.........جلدی سے کسی کو پسند کرلو............جو بھی تمھیں اچھی لگے۔"

"بس.........بس" ان کے چہرے پر اکتاہٹ کے آثار تھے............

"دیکھو! وہاں ہماری بریف کیس رکھی ہوئی ہے۔ اس میں تصویروں کا البم اور Bio-data"

"ڈیڈ! ابھی میں جلدی میں ہوں.........شام کو آتا ہوں تو اطمینان سے.........."

گڈ مارننگ ڈیڈ! کہتا ہوا وہ تیزی سے باہر نکل جاتا ہے.........

کار میں اسٹرنگ پر ہاتھ رکھے اُس کے آفس کی ایک ساتھی سراپا منتظر ہے.........وہ کار کے ......کھول کر اُس کی بغل میں بیٹھ جاتا ہے۔

"تم چلا لوگی! یا میں آجاؤں تمھاری جگہ پر..............؟"

!No, Thanks Sir..........فارمیلٹی کی ضرورت نہیں.........

آج آپ نے بہت دیر کردی باہر نکلنے میں..............؟

ڈیڈ! نے اپنے پاس بلا لیا تھا............ ماں ابھی تک گاؤں سے نہیں لوٹی ہیں..........اکیلے میں ڈیڈ بور ہوتے ہیں اور تصویروں کے البم کو دیکھتے دیکھتے اپنی جوانی میں پہنچ جاتے ہیں............"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں.........؟"

"مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے کہ شادی مجھے نہیں ڈیڈ کو کرنی ہے............جبھی تو........."

لڑکی مسکرانے لگی: "آپ بھی عجیب باتیں کرتے ہیں باس!......" لڑکی دیکھنے میں اُس وقت بیحد جاذب نظر لگ رہی تھی، گھنے ترشے ہوئے بال کاندھے پر ہوا میں جھول رہے تھے......باہر کی ہوا کی نرمی نے اُس کی جلد کے سنہرے پن کو کچھ اور نم بنادیا تھا۔ ہونٹوں پر لگی لپ اسٹک انار کے تازہ دانوں کی طرح چمک دکھا رہی تھی۔

اس نے ایک گہری نظر اپنے کلیگ پر ڈالی اور دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولی:

"......ابھی بھاؤ بڑھنے دیجئے! جلدی کیا ہے، پہلے زمانے میں شادی زندگی بھر کا فیصلہ ہوا کرتا تھا مگر آج تو قمیض کی طرح بڑے افسران.........!"

"ہاں یہ تو تم پتے کی بات بتا رہی ہو.......اسی لیے تو آج عام طور سے لوگ دیر سے شادی رچاتے ہیں............جب زندگی کا سارا رس.........."

"لڑکے ہی کیوں، لڑکیاں بھی تو اپنی ملازمت کے بعد فوراً شادی کے بندھن میں بندھنے کو تیار

نہیں ہیں۔ کھلی ہوا، کھلا ماحول........ کھلا ذہن...... اور آگے بڑھ جائیے............"

دونوں کی مسکراہٹ قہقہہ بن جاتی ہے۔ اچانک گاڑی نے ایک تیز جھٹکے سے بریک لیا۔ سامنے سے کوئی آدمی روڈ کراس کرتے ہوئے بالکل سامنے آ گیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے ٹکرائے اور پھر سنبھل کر اپنی جگہ پر بیٹھ گئے........ ایسی قربت جو جسم کو چھو دے اب کوئی معنی کہاں رکھتی ہے.......... یہ تو اگلے زمانے کی بات تھی کہ بنگلہ کے نیچے کام کرتی ہوہوئی گھاٹن لڑکی کو بارش میں بھیگتے دیکھ کر رندھیر نے اشارے سے اُسے اور بلا لیا تھا اور بھیگی ہوئی جواں سال صحتمند لڑکی کے لباس بدلنے کے درمیان رندھیر جی کہیں سے کہیں پہنچ گئے تھے اور آسانی ہمدردی نے ان پر وہ تمام نعمتیں کھول دیں جو اب تک ڈھکی چھپی ہوئی تھیں۔

لمحہ بھر کے لیے رندھیر نے سوچا کہ اس کے ہاتھ نے اس گھاٹن لڑکی کے سینہ پر نرم نرم گندھی ہوئی مٹی کو چابکدست کمہار کی طرح دو پیالیوں کی شکل دے دی ہے، اس کی صحت مند چھاتیوں میں وہی گدگداہٹ، وہی جاذبیت ،وہی دھڑکن، وہی گرم گرم ٹھنڈک تھی جو کمہار کے ہاتھوں سے کھلے ہوئے تازہ کچے برتنوں میں ہوتی ہے.......

اس عہد کے ذہن کے اسکرین پر تصویریں بدل رہی تھیں اور نوجوان ، منٹو کی گھاٹن لڑکی کو یاد کرتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اس عہد میں تو گھاٹن لڑکی بھی ایسے لباس میں سامنے آتی ہے، ایسا پرفیوم استعمال کرتی ہے کہ ارے توبہ........! دور سے ہی خوشبو......... ہر فرق کو مٹا دیتی ہے۔

رندھیر اگر عمرِ شعور کو نہیں پہنچے ہوتے تو......... تو گھاٹن لڑکی اور محلوں میں پرورش پائی ہوئی لڑکیوں کے فرق...... کو محسوس کرنے سے قاصر رہتے.........

ریٹائرڈ فوجی افسر رندھیر کا نوجوان بیٹا! جسموں کی گدگداہٹ یا چہرے کی جاذبیت سے دور اب کسی اور ہی خیال میں گم تھا:

"اب تم ہٹو! میں گاڑی ڈرائیو کرتا ہوں...... تم آج تھکی نظر آ رہی ہو.........؟" وہ کار کے پٹ کھول کر نیچے اُتر آیا تھا اور جگہ بدل کر پوچھ رہا تھا:

کیا تم رات سوئی نہیں تھیں........؟ تمھاری آنکھیں بتا رہی ہیں کہ تم رات کسی کے خیال میں گم تھیں........."

ہاں باس! آپ ہی کا خیال تھا..........

"میرا خیال.......؟" وہ گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے مسکرانے لگا۔

"ہاں........ اب پتا نہیں آپ کا تبادلہ کہاں ہوگا..........؟" ذرا رُک کر

"کل کے اخبار میں آپ نے پڑھا، الکشن نزدیک ہے کئی D.M اور S.P کے تبادلے مختلف ضلعوں میں ہو رہے ہیں......... آپ پر بھی پرساشن کی نظر ہے........."

"نہیں، کیسے معلوم.........؟

"........." آفس میں ہر طرح کی باتیں ہوتی ہیں باس!"

''اور تم اپنا Work چھوڑ کر Table talk میں دلچسپی لینے لگتی ہو........؟ یہ تو اچھی بات نہیں ہوئی
........''اُس نے اُسے چھیڑتے ہوئے کہا........وہ مُسکرانے لگی'' آج کے دور میں کیا بات اچھی ہے اور کیا
نہیں..........؟ یہ تو مجھے آج تک سمجھ میں ہی نہیں آیا باس.........!''

''یہ آج تم مجھے بار بار باس کہہ کر کیوں کھینچائی کر رہی ہو.....؟ میں تو تمھارا بچپن کا دوست ہوں.....ایک
ساتھ تعلیم سے لے کر ٹریننگ.....پھر سروس بھی ایک ہی جگہ، یہ سب اتفاق نہیں.....یہ سب اوپر والے کا..........''

''.....اوپر والے کا اشارہ ہے، یہی نا کہنا چاہتے ہیں؟ مگر.......نیچے والے کا تو کچھ اور ارادہ
ہے.........آپ اپنے ڈیڈ کو بالکل بھول گئے...........؟''

''..........شادی مجھے کرنی ہے.......ڈیڈ کو نہیں..........ڈیڈ کے عہد میں۔ گھاٹن والی سے سب
کچھ ہو سکتا تھا صرف شادی نہیں.........مگر ہم اُس دور میں آ گئے ہیں جہاں ایک I.A.S. آفیسر اگر گھاٹن لڑکی کو
واقعی پسند کرنے لگتا ہے تو اُسے محض اپنے بستر کی رانی ہی نہیں، گھر والی بنانے کی جرأت بھی رکھتا ہے...''

واقعی، تو آپ نے بھی کسی............؟

''نہیں میڈم! میرا آدرش تو میری بغل میں ہے...........

میں جب چاہوں اُسے حاصل کر سکتا ہوں.......اتنا تو مجھے یقین ہے......!''

یہ جملہ کو سُن کر لڑکی کا چہرا بیحد سنجیدہ ہو گیا تھا اور اُس نے ہمت جٹا کر آخر کہہ ہی دیا.........''اگر
ں یہ کہوں تو آپ کو دُکھ نہیں ہونا چاہیے''..........شادی بیاہ کا معاملہ صرف دو جسموں کا ملاپ نہیں ہے
.......یہ آج کے سماج میں دو ذہنوں کا دو مزاج کا بھی ملاپ ہے..........''

''میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں.........ہم دونوں ذہنی اعتبار سے ایک نہیں ہیں کیا.........؟

''شاید نہیں..........''

''تم مذاق تو نہیں کر رہی ہو..........؟''

کبھی نہیں.......پورے یقین سے کہہ رہی ہوں کہ.........آپ بہت جلد بہت خوش فہمی میں آ جاتے ہیں باس!''

کار آفس کے پورٹیکو میں داخل ہو رہی تھی اور رندھیر کا جواں سال ہونہار بیٹا جس کو پسند کرنے والوں کی
ایک لمبی قطار تھی.........ایک لمبے عرصے سے اُسے اپنے ایکدم قریب دیکھنے والی لڑکی کا یہ اعتراف سُن کر پہلی بار
یہ احساس ہوا کہ عورت کا ذہن اور دل کیا ہوتا ہے......آج کے زمانے میں جسم اور جنس کی اہمیت محض پل دو پل کے
لیے محسوس کی جاتی ہے........ہمیشہ ساتھ رہنے کے لیے اور بھی بہت کچھ چاہیے........اور بھی بہت کچھ.......اور
اس بہت کچھ میں اتنی لچک ہے کہ ذرا سا بھی مضبوط رشتہ کچا دھاگا بن جاتی ہے........

مرد ہی نہیں عورت بھی اب اپنی ہستی منوا چکی ہے!

☆☆☆

ہاں، میں یہاں ہوں!

● علی امام

جیرائن ندی کی چھاتی پر ریت کا فرش۔ ہوا نے فراش کا ایسا کام کیا ہے کہ کہیں پر شکن ذرہ برابر بھی نہیں ہے۔ کنارے کی نچلی گہرائی پر سبک رَو لہریں ہلکی ہلکی موسیقی کے ساتھ بہہ رہی ہیں۔ دوپہر کا سورج فرش پر آگ اُگل رہا ہے۔ مگر بادل نے اسے اپنی سیاہ چادر میں ڈھک لیا ہے۔ میں آگے آگے ریت کے فرش پر چل رہا ہوں۔ تم پیچھے پیچھے... میرے قدموں کے نشان پر اپنے پاؤں رکھتی ہوئی میری جانب بڑھ رہی ہو۔ میرے پاؤں کے نشان پر تمھارے پاؤں کے نشان — مسخ ہوتے نشان یا گہرے ہوتے نشان — میں ہر چار پانچ قدموں کے بعد مڑ کر دیکھتا ہوں۔ تم کھلکھلا کر ہنس دیتی ہو۔ گویا میرا مذاق اُڑاتی ہو یا پھر اپنی خوشی کا اظہار کرتی ہو۔ وہ نشان آج بھی ویسا ہی ہے۔ حالانکہ ہواؤں کے جھونکوں نے اُسے ہر بار مٹانا چاہا۔ لیکن وہ نشان پہلے بھی قائم تھا اور آج بھی قائم ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس کا مجھ سے اور میرا اُسے سے براہِ راست رشتہ ہے۔ کسی آندھی اور کسی طوفان میں اس نشان کو ضائع کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ بلکہ روز بروز وہ نشان اور بھی روشن ہوتا جاتا ہے۔ اس کی چمک اس کی آمد سے پہلے ہی سے موجود ہے۔

آج بھی وہی دوپہر کا سورج، گھنگھور بادل اور ریت کا فرش ہے۔

آگے آگے میں ہوں... اور پیچھے پیچھے تم ہو

یا پھر آگے آگے تم ہو... پیچھے پیچھے میں۔

میرے قدموں کے نشان پر اپنے قدم رکھتے ہوئے میرے ساتھ ساتھ چل رہی ہو۔

یا پھر تمھارے قدموں کے نشان پر اپنے قدم رکھتے ہوئے میں تمھارے ساتھ ساتھ چل رہا ہوں۔

کہیں چھپ جانے کی تمنا میں

کہیں کھو جانے کی آرزو میں

سلسلہ قائم ہے... سلسلہ دائم ہے۔

مگر نا اُمیدی تو چلتی رہے گی وہی تو 'ہونا' ہے۔ میں باغ کی چہار دیواری پر کھڑا ہوں۔ تم حویلی کی بالائی منزل کے فنس کے شگاف کے پیچھے کھڑی ہو۔ تمھاری انگلیاں کبھی کبھی فنس کے مضراب پر رینگتی ہیں۔ میں چہار دیواری سے لگے آم کے درخت پر چڑھ جاتا ہوں۔ شاخوں پر لٹکتا ہوں، جھولتا ہوں، ڈولتا ہوں، طرح طرح کی کرتب بازی کرتا ہوں... اور پھر اوپر بہت اوپر پھنگی پر چڑھ جاتا ہوں۔ تم مجھ پر بندش لگانے کے لیے چیخنے والی ہی تھی کہ شگاف سے سامنے دادا ابا دکھائی پڑ جاتے ہیں۔

تمھاری زبان گنگ ہو جاتی ہے مگر فوراً ہی تم بیتابی کے عالم میں اپنی چھپٹاتی ہوئی انگلیوں کو فنس پر کھڑی کر دیتی ہو۔ انگلیوں کو دیکھ کر میں ڈر جاتا ہوں۔ کہیں تم ناراض نہ ہو جاؤ میں دھیرے دھیرے اُتر کر نیچے آجاتا ہوں۔ اور تم ہانپتی ہوئی چھت کی سیڑھیاں اُتر جاتی ہو:

لال سرخ چہرہ اور غصّے سے کھولتی ہوئی آنکھیں ——

پھر ایک دن کسی تمنا کی چاہت میں

میں امرود توڑتے ہوئے پیڑ سے نیچے گر آتا ہوں۔ پیر پھسل جاتا ہے۔ خون رسنے لگتا ہے۔ خون کو ہتھیلیوں پر لگا کر اپنے چہرے پر ملتا ہوں۔ خوب ہنستا ہوں۔ ناچتا گاتا ہوں۔ تم بدحواس سی ہو جاتی ہو اور جھلملاتی پلکوں کے ساتھ 'لکرَ وندا' کی پتیوں کو نچوڑ کر زخم پر لگانے کے لیے دوڑتی ہو۔ میں تھم جاتا ہوں۔ میں ہارا ہوا محسوس کرتا ہوں اور تم اپنے حکم صادر کرنے پر بہت نادم سی دکھائی پڑتی ہو۔

آدمی کو انتخاب کی پوری آزادی ہے مگر جو کچھ بھی میں نے انتخاب کیا ہے اس کے لیے میں خود ذمہ دار ہوں۔ میری بات سن کر تم تالی بجانے لگتی ہو۔ چند لمحے بعد تم صحن میں آکر ''لکا چھپی'' کھیلنے کے لیے مجھے بلاتی ہو۔ میں اَڑ جاتا ہوں۔ تم آرزو منت کرتی ہو۔ میں دم بھر کے لیے چہک اٹھتا ہوں، چلو کھیلتے ہیں:

میں چور بنتا ہوں تو تم چھپتی نہیں ہو۔ مجھے عجیب سا لگتا ہے۔

اور پھر تم چور بنتی ہو تو میں چھپتا نہیں ہوں۔ تمھیں بھی خراب لگتا ہے مگر وہ دن یاد کرو جب میں آواز لگاتا —— ''ہاں، میں یہاں ہوں!'' تو تم سنتی نہیں تھی اور پھر جب تم آواز لگاتی ''ہاں، میں یہاں ہوں!'' تو ردِ عمل کے طور پر میں سنتا نہیں تھا۔

تب ہی کھٹ پٹ شروع ہو جاتی ہے۔

نوک جھونک کی تلوار چلتی ہے۔

تم آنکھ دِکھاتی ہو —— منہ چڑاتی ہو۔

اور اندر حویلی کی جانب لوٹ جاتی ہو۔

سامنے دروازے پر کھڑا میں دیکھتا رہتا ہوں۔
تم مٹکے سے پانی ''پن پیا'' میں اُنڈیلتی ہو اور ایک ہی سانس میں پی جاتی ہو۔ اس طرح تم کٹورے پر کٹورے خالی کرتی جا رہی ہو۔ وہ تو اچھا ہوا کہ پانی تمھارے ہونٹ سے پھسل کر تمھارے گرتے پر آ گرا۔ تب تم چونک اٹھی — پن پیا کو طاق پر رکھ کر گرتے کو جھاڑ جھاڑ کر خشک کرنے میں مشغول ہو جاتی ہو، ورنہ قطرہ قطرہ مٹکا سوکھ لیتی۔
گرتا ابھی سوکھا بھی نہیں تھا کہ لپک کر میرے پاس آتی ہو۔
میں نے کہا: ''میرے چھپنے پر تم آسمان اٹھانے لگتی ہو''۔
اور جب میں آواز لگاتا ہوں کہ: ''ہاں، میں یہاں ہوں!'' تو اَن سُنی کرتی ہو۔
مگر تم ہی بتاؤ — تم کیوں نہیں چھپتی ہو؟
پھر اٹھلا کر بولتی — ''میری مرضی'' — ''میری مرضی''، ''میری آزادی'' — ''میری آزادی''۔ جو ہونا ہے وہ ہونے کے لیے آزاد ہوں۔
میں حرفِ آخر پر چپ ہو جاتا ہوں اور منہ پھیر کر پنجڑے میں بند ''مٹھو'' کو دیکھنے لگتا ہوں:
''انسان اکیلا ہے اور اکیلا ہی اُسے رہنا ہے''۔
مٹھو مجھے دیکھ کر پھڑ پھڑانے لگا، وہ ابھی کچھ بولنا ہی چاہتا تھا کہ ذمی پیر پٹخ کر چلّانے لگی:
پھر بولی: ''ہوں'' —
کوئی ایسی جگہ ہے، جو تم نہیں جانتے ہو اور میں چھپ جاؤں تو پھر پکڑی نہ جاؤں۔ ہر جگہ تو تمھاری ہے۔
لیکن تم بتاؤ کہ تم کیوں نہیں چھپتے ہو۔
''میں!''
''ہاں، ہاں تم!''
سب ساتھی چھپ جاتے ہیں تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ چور مجھے ہی بن جانا چاہیے۔ اس لیے کھڑا رہتا ہوں کہ تم آنکھ کھولتے ہی مجھے دیکھ لو۔ اور مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہ پڑے کہ ''میں یہاں ہوں''۔
جھوٹ بالکل جھوٹ ''جو باہر ہے وہ جھوٹ ہے جو اندر ہے وہ سچ ہے''۔ میں نہیں کھیلوں گی، جا رہی ہوں۔ تم جھوٹے ہو۔ تم جھوٹے ہو۔
''کٹس — کٹس'' (ہم لوگ اپنے اندر کو ایمانداری سے باہر نہیں نکال پاتے ہیں)۔
لیکن تم گئی نہیں اور جا بھی نہیں سکتی ہو۔ کیوں کہ تمھارے گڈّے میاں کی شادی ہے۔ یعنی زندگی اپنے آپ میں — زندگی اپنے آپ کے لیے۔ ہم اپنے آپ سے اوپر اٹھ جاتے ہیں۔ کٹس ختم۔
اور پھر گڈّے کی شادی کی دھوم ہے۔

ہلدی لگائی ہوئی ---- منڈوا تانا گیا ---- رت جگا منایا گیا، مہندی ہوئی۔ اور پھر بارات سجائی گئی۔
تم نے مجھے بجنیا بنا دیا۔ میں کنستر اپنے گلے میں ٹانگ لیتا ہوں۔ ناچ ناچ کر کنستر پیٹتا ہوں۔ اچھل اچھل کر کرتب دکھاتا ہوں۔ تم لہک لہک کر بے سُرے ڈھولک کے تال پر گا رہی ہو۔
دل ہے۔ دھڑکن ہے۔ موج ہے۔ مستی ہے۔ شوخی ہے:

شگونی رے۔
سہرا باندھے گا بنا۔
میں تو واری شگنی
ہزریا ---۳

چھوٹے بابو کو کوئی مت دیکھو
نظریا لگ جائے گی ---۵

انار کے دانے میں سہرا سجایا
باندھ رہا میرا بابو چمن میں
کھل رہا میرا بابو چمن میں ---۴

بنے کو کوئی دیکھے ہو
سہرا بھی لال تیرا
لڑیاں بھی لال تیری
جوڑا بھی لال تیرا
عبا بھی لال تیرا
بنے کو کوئی دیکھے ہو ---۳

ہاتھ انار کلی لیے۔ گلاب چھڑی لیے۔ بنا میرا ایسا بن جائے گا ---۳
میاں بندرا اُڑاوے پتنگ جی باغوں میں ---۳
رچن واری مہندی گورے گورے ہاتھوں میں رچن واری مہندی ---۳

جھاڑی پہنو دلہا بابو ٹمر ے دادا گھر کا ہے مانجھا ــــ ۲
ندیا اُس پار مت جیو، میرے رجنا
ندیا اُس پار مالی کا ڈیرا وہ تو سہرا سجائے سہرالریاں لگائے منوا موہے میرے رجنا ــــ ۲
نوشے تیرے سہرے کی نو لاکھ لڑی ہوگی ــــ ۳
ایسے ویسے دیس میں لو بھایا میاں بندرا ــــ ۳
کیا خوب گھڑی ہوگی جب گھر میں دلہن ہوگی ــــ ۳
بنو تیرا ٹیکہ لاکھوں کا۔ بنو تیرا کنگن لاکھوں کا رے۔
بنو تیری چوڑی ہے ہزاری۔ بنو تیرا گھونگھٹ
لاکھوں کا رے۔ بنو تیری صورت ہے ہزاری ــــ ۲
ٹونا کیسے ہوکے لاگا۔ بیلا، چمیلی ہوکے لاگا۔
میں کیا جانوں ٹونا کیسے ہوکے لاگا ــ ۳

دو کڑی شاہانہ کا، تو دو کڑی شگن کا۔ پھر ایک کڑی سہرا تو دو کڑی مانجھا۔ کبھی ہلدی میں منڈ وامل رہا ہے تو کبھی ٹونے میں رخصتی کچھ ساتھی کھیل ہی کھیل میں بات نکالتے ہیں: ''پونیا'' کو نیگ ملنا چاہیے۔ تم لہک کر میرے پاس آتی ہو اور ایک لیمون چوس میری طرف بڑھا دیتی ہو۔ اور میں گلے میں کنستر ٹانگے کرتب بازی میں مشغول ہو جاتا ہوں۔ کبھی اِدھر تھرک کر جاتا ہوں کبھی اُدھر تھرک کر جاتا ہوں۔ کبھی مینڈک کی طرح پھدکتا ہوں تو کبھی شیر کی طرح چھلانگ لگاتا ہوں تو کبھی گدھے کی طرح زمین میں لوٹ پوٹ کرتا ہوں۔

میرے ساتھی میری حرکت پر ہنس رہے ہیں، تم بھی گیت گاتے گاتے ہنسنے لگتی ہو۔

اچانک قہقہے کے شور میں کسی طرف آواز آتی:

''مُوگا ہے'' ــــ بالکل مُوگا ہے۔

تبھی تمھاری آنکھیں اس پر برس پڑتی ہیں۔ اور تم میرے گلے کے کنستر کو نکال کر پھینک دیتی ہو۔ معاملہ بہت خراب ہونے کو تھا کہ میں نے بہانا بنا کر اسے ٹال دیا۔ وہ آنکھیں جو ظلم ڈھانے کو اٹھی تھیں رحمت برسانے لگیں۔

صبح ہوتے ہی مدرسہ کے فرش پر سر دھن دھن کر معمول کے مطابق پڑھائی شروع ہو جاتی۔ رحل کے اوپر قرآن شریف کھلا ہے۔ تنکھیوں پر تنکھیاں چل رہی ہیں۔ آموختہ ختم ہوتے ہی سبق کی باری آجاتی ہے۔ پھر مشقوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ قرآن کے بعد اردو۔ اُردو کے بعد فارسی۔ فارسی کے بعد حساب یعنی چکروتی کا سلسلہ جاری ہے۔ ہر بچوں کی اپنی عمر کے مطابق الگ الگ صلاحیتیں ہیں۔ اُن کی صلاحیتوں کے مطابق درس کا معاملہ طے ہوتا ہے۔ اکیلے مولوی صاحب اور ۳۰۔۴۰ بچے بچیاں۔

مولوی صاحب کی شپ شپاتی ہوئی چھڑی برستی ہے۔

ہتھیلی پر ''بم'' پھوٹ جاتا ہے۔

آنکھ بچا کر تم اپنی شہادت کی انگلی کو منہ میں لے کر چوستی ہو اور پھر اُسے وار کر کے میرے اُبھرے زخم پر رکھتی ہو۔

سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ زخم اُبھرتا ہے۔ واری ہوئی انگلیاں رکھی جاتی ہیں۔ سب کچھ ویسا ہی ہے۔

ریت کا فرش ہے۔ اس پر گھروندہ بناتی ہوئی تم ہو۔ سجا سجایا ہوا گھروندا۔ خوبصورت گھروندا۔ مگر بات بات پر تم میرا منہ چڑا دیتی ہو اور میں اس گھروندے کو اپنے پیروں تلے دھانگ دیتا ہوں۔ مگر جب تمھاری آنکھیں ڈبڈبا اٹھتی ہیں۔ تو میں سر کے بل ریت پر اُلٹا ٹنگ جاتا ہوں۔ کچھ دیر تک تم دھیان نہیں دیتی ہو۔ مگر جب میں ہانپنے لگتا ہوں تو تم میرے پیروں کو کھینچ کر مجھے سیدھا کر دیتی ہو۔ اور پھر اپنی بھیگی آنکھوں کو پوچھ کر میرے بالوں میں لگے ریت کو جھاڑنے لگتی ہو۔

پھر کھیل کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جگمگ، جگمگ، بوجھو تو جانیں!

پٹ لال لال، پٹ گول گول۔ پٹ ہاہا، پٹ ہُوہُو۔ مچل کر بولتی ہو ''لونگیہ مرچ''۔

گھگھورانی گھگھورانی۔ ندی کنارے کتنا پانی۔ پازیب کو دکھاتی ہوئی بولتی ہو۔ اتنا پانی۔ اتنا پانی۔

پھر

تار کا ٹوتر بن کاٹو

کاٹورے بن کھاجہ

ہاتھی پر کے گھنگھرو

چمک چلے راجہ۔ چمک چلے راجہ۔

پھر

اکن مکن۔ دہی چٹا کن۔ بڑ پھولے بریل پھولے۔

ساون ماہ کریلا پھولے۔ اے سکھی تو پار جا۔ پار سے کیلی لا۔

پکے پکے ہم سب کھائیں۔ کچے کچے نیولا کو دیں

بگلا!! بگلا دھان دے

چنیا بادام دے

برسو رام دھڑا کے سے

بڑھیا مرگئی فاقے سے

تب ہی میری بکری۔ بڑے بڑے کان والی۔ بڑی بڑی تھن والی۔ چلتی ہے تو باغ میں لگے جھولوں کی مانند اس کے تھن ڈولتے ہیں۔

آج وہ بیانی ہے، گھر میں شور ہے۔
تم بھی بھاگی بھاگی اس منظر کو دیکھنے آ گئی ہو:

چار بجے اہوئے ہیں۔ منگرو بچیوں کے اوپر لگے جھلیوں کی پرت کو نکال رہا ہے۔ ہم لوگ گرد، ہلدی، کھلی، بھوسی تیار کرنے میں لگے ہیں۔ تم کٹھوت اٹھا کر بکری کے پاس لے جاتی ہو۔ بکری تمھیں سونگھتی ہے۔ تم بکری کو چمکارتی ہو۔ جب میں چمکارنے لگتا ہوں تو تم کہہ اٹھتی ہو: اس کو تکلیف ہوگی، تم چھوڑ دو۔ یہاں سے ہٹ جاؤ۔ اور پھر میرے اصرار کرنے پر تم میری انگلیوں کو کس کر مروڑ دیتی ہو۔

یہ سب کچھ جاگ رہا ہے کچھ سویا نہیں ہے:

ریت کے فرش پر آگے آگے میں ہوں۔ پیچھے پیچھے تم میرے قدموں کے نشان پر تمھارے قدموں کے نشان ——

پھر جگمگ جگمگ۔

سلو باجی کے سسرال ناشتہ جانا ہے۔ نوشے بھائی علی گڑھ سے آئے ہوئے ہیں۔ سلو باجی کے یہاں زوروں شوروں سے تیاریاں چل رہی ہیں۔ عورتیں طرح طرح کے ناشتے بنانے میں لگی ہوئی ہیں۔ بڑا بڑا "دلگن" لکڑی کے دہکتے ہوئے کوئلے پر رکھا ہے۔ اس پر پتنی دھرا ہے۔ لگن کے اوپر کوئلہ لگن کے نیچے کوئلہ کہیں پر قلچہ بن رہا ہے۔ کہیں شیر مال۔ کہیں باقر خوانی۔ کہیں محبوبی اور پھر گاجر کا حلوہ، ہرے چنے کا حلوہ، خرمے کا حلوہ، جبشی حلوہ، بیسن کا لڈو، پاپڑی منگوچھی، —— انڈے کو دودھ سے مکس کیا جا رہا ہے۔

تبھی پھوپھی جان چلائیں دل گھوٹنی کہاں ہے؟ تم نے بدحواسی کے عالم میں کر چھل بڑھا دیا۔ میں نے پھوپھی جان کی تیوری کو چڑھتے ہوئے دیکھ لیا۔ اور دوڑ کر دل گھوٹنی ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔

—— "شکریہ بیٹا خوش رہو"۔

پھوپھی جان کے کلمات زبان سے ادا ہوتے ہیں۔ تم چاول کی "دنی" پھانکنے لگتی ہو۔ اور اپنی زلف جھٹک دیتی ہو۔ بوریت کے خلاف تمھارا انگلی اٹھانا لازم ہے۔ جب کبھی تم آنکھیں مٹمٹاتی ہو —— تو نیم تلے سے گزرنا پڑتا ہے۔ آنکھیں برساتی ہو —— تو پیپل کے بوڑھے درخت پر گلہری دیکھنے کو جانا پڑتا ہے۔ زبان لپلپاتی ہو تو املی کے پیڑ پر پتھر مارنے کا حکم صادر ہوتا ہے۔ انگلیاں کبھی چپ رہنے کی تلقین دیتی ہیں۔ اور کبھی راستہ بھٹکنے کا اشارہ بن جاتی ہیں۔ چہرے پھیکے پڑ جاتے ہیں تو کسی خطرے کا احساس ہوتا ہے۔ زبان دانت تلے آتا تو معاملہ کے گڑبڑ ہونے کا پتا چلتا۔

اشارے اور علامتوں کی ڈولی میں سفر کرتی ہوئی تم!

یہ سب کچھ جاگ رہا ہے۔ کچھ سویا نہیں ہے۔ ہر جا تم ہی تم ہو۔
ریت کے فرش پر آگے آگے میں ہوں۔ پیچھے پیچھے تم ہو۔ خوشبو اپنے وجود کا احساس دلاتی ہے۔

میرے قدموں کے نشان پر تمھارے قدموں کے نشان۔

باغ کی چہار دیواری۔ امرود سے لدا ہوا پیڑ۔ آم کی ٹہنیوں پر گاتی ہوئی کوئل۔ اُڑتے ہوئے طوطے۔ تاڑ کے پیڑ سے گرتا ہوا لبھیدا —— مسجد کا مینارہ۔ لائبریری کا صحن۔ قبرستان کا احاطہ۔ سنگھاڑے کے لتوں سے ڈھکے ہوئے تالاب، ندی اُس پار کی بانسواڑی۔ ساون کا مہینہ۔ باغ میں لگے جھولے۔

سب کچھ ویسے ہی ہیں کہیں کچھ نہیں ہوا۔

پال پر رکھے گئے آم۔ کھلیان کے مُنج پر اُچھلتا کودتا ہوا میں۔ میلاد کی مجلسیں۔ بیت بازی کا مقابلہ۔ رنگارنگ پروگرام۔ ڈرامہ کا اسٹیج۔ ولیج اُولمپک کی ہماہمی۔ ڈول پتا، کبڈی، گلی ڈنڈا۔

دوپہر کی دھوپ میں چکر کاٹتا ہوا میں۔ حویلی کی دیوار سے جھانکتی ہوئی تم۔

میری بنسی میں پھنسی ہوئی مچھلی۔ کیچڑ میں کمل کا پھول اور گھاس پر چھپاتی ہوئی مچھلیوں کو پکڑتی ہوئی تم۔ رمضان کا چاند، عید کا چاند، سحری کا قافلہ، افطاری کا موسم، محرم کا اکھاڑہ: یاعلی یاحسین۔

تعزیہ، سپر، ڈنکا —— مقبروں کی دیواروں پر پی پی کرتا ہوا میں اور مسجد کے اوٹ سے کھلکھلاتی ہوئی تم۔ بستی پھاٹک کے باہر میں، پھاٹک کے اندر تم۔

ہر چیز میرے اندر جاگ رہی ہے۔

میں ہی سب کچھ ہوں۔ (ہاں، ہاں، میں یہاں ہوں!)۔

مجھ پر یہ بات ثابت ہے کہ میں دنیا میں ہوں۔

لیکن پتا نہیں ہے کہ میں کیوں دنیا میں ہوں اور نہ کوئی طریقہ ہے کہ میں پتا لگا سکوں کہ میں کیوں دنیا میں ہوں۔

میں اکیلا ہوں اور اکیلا ہی مجھے رہنا ہے اس حالت سے مجھے کوئی نہیں بچا سکتا۔ مجھے آزاد رہنے کی سزا ملی ہے۔

جگمگ، جگمگ ہو وت ہے۔

ہر کھیل کھلاڑی کھیلت ہے۔

رات کی سہ پہری میں کتے کے رونے، بھونکنے اور غرّانے کی آواز —— سمٹ کوٹھے کے ڈھہنے کی آواز —— جانوروں کے کھونٹا توڑ کر بھاگنے کا دھماکہ —— گھونسلے سے نکل کر پرندوں کے پھڑ پھڑانے کا شور —— چین سے جاگنے والوں کی نیند حرام کر دیتا ہے۔

کب کس گھر میں سیندھ پڑا۔ کب مسجد میں اذان ہوئی۔ کب نماز پڑھی گئی۔ کب کھیت کھلیہان میں تلوار چمکے۔ کب جمال چاچا کے گھوڑے کے ٹاپ سے لوگ باگ بھاگے۔

اس شور شرابے میں کچھ پتا نہیں چلا۔ خنجر چیخا تھا مگر کسی نے نہیں سنا۔ گولی چلی تھی مگر کوئی زخمی نہیں ہوا تھا۔ ہوائیں کچھ کہنے کو بار بار دروازے پر دستک دیتی رہیں مگر کسی نے دروازہ کھولا ہی نہیں۔ رات بھر کسی کی کھوج میں تڑپنے کے بعد آخر بستر سے اٹھ بیٹھا۔

اور پھر اماں سے پوچھا: ''اماں رات کچھ ہوا تھا''۔
بھیا کو ٹٹولا۔ بھیا کچھ... ابا سے جانا رات میں '' کچھ ہوا تھا''۔
طارق، محفوظ، بدرو، شمع، شیریں، چمپا، عقیل... غرض سب سے یہی جانکاری ہوئی کہ کچھ نہیں ہوا تھا۔
تمھاری حویلی کی طرف لپکا۔ کچھ اٹ پٹا سا لگا۔
جگمگ جگمگ، ہاں میں یہاں ہوں۔ کہیں سے آواز ہے۔
پھروہی ریت کا فرش ہے۔ آگے آگے تم ہو، پیچھے پیچھے میں ہوں۔
تمھارے قدموں کے نشان پر میں قدم رکھ کر چل رہا ہوں۔
بارش کی ہلکی ہلکی بوندیں ہم دونوں کو چوم رہی ہے۔ ندی کی سبک رَو لہریں اپنی طرف بلا رہی ہیں۔ میں بھاگا بھاگا باغ کی طرف گیا۔ پودوں سے باتیں کیں۔ ہواؤں کی سرگوشی میں گم رہا۔ چڑیوں کی چہک میں کھویا رہا۔ پھولوں کی مہک میں محو رہا۔ ہر جگہ سے بس ایک ہی آواز ہمادم آرہی ہے۔
''کچھ نہیں! کچھ نہیں!''
کچھ دیر کے بعد جب سانس کی لَو تیز ہوئی تو تمھاری مہکتی ہوئی آواز گونجی: ''کھوج لو تو جانیں''۔ کبھی ادھر دیکھا، کبھی اُدھر دیکھا۔ اندر دیکھا، باہر دیکھا۔ چاروں طرف دیکھا۔ کہیں نہیں تھی۔ صرف آواز تھی ''ہاں، میں یہاں ہوں!'' دن بھر کچھ اسی طرح کا تانا بانا بنتا رہا۔
کھیتوں کی پگڈنڈی سے جب گزر رہا تھا تو دیکھا:
وہ تتلی جو میرے شانے پر رہتی تھی، میری انگلیوں میں جھولتی تھی اور میری پیشانی کو چومتی تھی۔ آج دور کٹیلی جھاڑیوں کی ایک شاخ پر بیٹھی ہوئی ہے۔ میں سُدھ بُدھ کھو بیٹھا ہوں اور کٹیلی جھاڑیوں کی طرف لپک پڑتا ہوں۔ جھاڑیوں کو گلے سے لگائے آگے بڑھتا جاتا ہوں۔ پورے جسم میں کانٹے چُبھ گئے ہیں۔ زخموں کا شمار مشکل ہے۔ میرے جسم پر کانٹوں نے بھرپور زخم دیے ہیں۔ مگر نہ کہیں شدید درد ہے اور نہ کہیں خون رِس رہا ہے۔ اندر ہی اندر جینے کے مزے سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔ کیوں کہ نا اُمیدی ہی ہمارے ہونے کی بشارت ہے:
میں تنہا دل کے دروازے پر کھڑا ہوں۔
اور دل کی بانسری کی آواز پر لہک رہا ہوں۔
جگمگ جگمگ ہُوت ہے۔ خاموشی اندر سُوت ہے۔
وہی ندی ہے۔ وہی ریت کا فرش ہے۔ وہی آگے آگے چلتی ہوئی تم ہو۔ تمھارے قدموں کے نشان ہیں۔ وہی میں ہوں۔ تمھارے قدموں کے نشان پر اپنے قدم رکھتے ہوئے چل رہا ہوں۔ اور ایک آواز ہے ''ہاں، میں یہاں ہوں!''۔ سلسلہ قائم ہے سلسلہ دائم ہے۔

☆☆☆

لمحوں کی خطا

● یٰسین احمد

''اُٹھ جایئے....''

دیر تک اُس کے جسم کا معائنہ کرنے کے بعد ڈاکٹر زبیدہ کمال نے کہا۔ وہ آہستگی سے اُٹھ بیٹھی اور اپنا لباس درست کرنے لگی۔ اُس وقت تک زبیدہ کمال واش بیسن میں اپنے ہاتھ دھو کر کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔ اُس نے واش بیشن کے اوپر لگے ہوئے آئینہ میں اپنا چہرا دیکھا۔ چہرے پر پژمردگی کی لکیریں نمایاں تھیں۔ ڈاکٹر کی خاموشی اُس کو یاس کے گہرے اندھیرے میں ڈھکیل چکی تھی۔

وہ کمرے سے باہر نکل آئی۔

زبیدہ کمال کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی اور ہاتھ میں قلم لیے کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ ڈاکٹر کے مدمقابل بیٹھ گئی اور بولی:

''آپ نے کچھ نہیں کہا....؟''

''کیا کہوں؟'' ڈاکٹر نے تلخ لہجے میں جواب دیا: ''آپ لوگ قدرت کے قانون کے خلاف عمل کرنے کے عادی ہیں۔ موسم میں ہی درختوں پر پھل لگتے ہیں۔ جس عمر میں، ماں بننا ہوتا ہے اُس عمر میں ماں بننے سے کتراتی ہیں۔ مختلف طریقوں سے حمل کو روکتی ہیں۔ مانع حمل کی گولیاں کھاتی ہیں۔ کنڈوم کا استعمال کراتی ہیں۔ صرف یہی نہیں اسقاط حمل سے باز نہیں آتیں۔ جب عمر بڑھنے لگتی ہے، جسم پر چربی چڑھنے لگتی ہے، منسیس بند ہونے کے ایام قریب آتے ہیں۔ تب ماں بننے کی فکر ہوتی ہے۔''

وہ ایک مجرم کی طرح سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔

ڈاکٹر زبیدہ کمال شہر کی مقبول ترین گیانولجسٹ تھیں۔ وہ ایک عرصے سے اپنے اور اپنے

خاندان کی عورتوں کے نسوانی مسائل کے سلسلے میں ان کے پاس آیا کرتی تھی۔ آج بھی وہ بہت سی اُمیدیں لے کر آئی تھی۔ ڈاکٹر نے دوائیں تجویز کر کے (Presecription) اُس کے حوالے کر دیا۔ ڈاکٹر کا شکریہ ادا کر کے وہ جانے والی تھی، ڈاکٹر نے کہا:

"سنیئے! میں نے اچھی سے اچھی دوائیں لکھنے کی کوشش کی ہے۔ آگے اللہ کی مرضی۔ اگر ان دوؤاں سے آپ کو فائدہ نہ ہو تو براہ مہربانی دوبارہ یہاں تشریف نہ لائیں۔ شہر میں اور بھی ڈاکٹرس ہیں۔"

زبیدہ کمال کا لہجہ تلخی اور غصے سے بھرا ہوا تھا۔ اس کو اس پر حیرت ہوئی اور نہ ملال۔ کیونکہ اُس کو احساس تھا کہ ڈاکٹر زبیدہ کمال نے ایسا لہجہ کیوں اختیار کیا ہے، ورنہ ڈاکٹر تو اپنے شائستہ رویے اور خوش اخلاقی کی وجہ سے بے حد مقبول تھیں۔ وہ کچھ نہیں بولی اور چپ چاپ باہر نکل آئی۔

پژمردہ چہرہ اور مضمحل قدموں سے چلتے ہوئے وہ کار تک آئی تھی اور پچھلی نشست پر دراز ہو کر اپنی آنکھیں موند لیں۔ ڈرائیور نے پلٹ کر اس کو دیکھا اور اس کی ہمت نہ ہوئی تھی کہ یہ پوچھے کہ اب کہاں جانا ہے۔ ڈرائیور نے کار اسٹارٹ کر دی۔ اب اُس کا رُخ گھر کی جانب تھا۔

پچھلے کئی ماہ سے وہ ایک اذیت ناک کیفیت سے دوچار تھی۔ یہ احساس نوکیلے کانٹوں کی طرح چبھنے لگا تھا کہ اس کی گود خالی ہے۔ عمر کا آسیب لمبی لمبی چھلانگیں لگا رہا تھا اور اس کے ساتھ اس کے جسم میں ایسی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں جو آگے چل کر اس کی ماں بننے کی صلاحیتوں میں رکاوٹ ثابت ہو سکتی تھیں۔ وہ ۳۸ رسال کی ہو چکی تھی۔ شادی ہوئے ۲۰ سال ہو چکے تھے۔ ان بیس برسوں میں جو کچھ ہوا اس کے بارے میں وہ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ پلٹ کر دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ فکر مند تھی تو آنے والے ماہ و سال کے بارے میں کہ کہیں یہ بھی بے برگ و ثمر گزر نہ جائیں۔

جب تک ساس سسر زندہ رہے' ان کی خواہش رہی بلکہ کوشش رہی کہ بیٹا صاحبِ اولاد ہو جائے۔ اُس کے لیے ان لوگوں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ علاج معالجہ، دُعائیں، تعویذیں، گنڈے سب کچھ آزما لیے لیکن لاحاصل اس کی گود خالی کی خالی رہی۔ کون مرد نہیں چاہتا کہ باپ بنے؟ اس کا نام روشن کرنے والا پیدا ہو! اس کا نام لیوا ہو!! کہ یہی وہ فطری خواہش ہے جس سے نسلوں کا سلسلہ جاری و ساری رہتا ہے۔ دُنیا آباد ہے لیکن جمیل نے کبھی بھی اس محرومی پر تشویش کا اظہار نہیں کیا تھا، یہ اس کا صبر تھا۔ یا پھر کوئی بات تھی وہ اندازہ نہیں لگا سکی تھی۔ خاندان کا کوئی فرد اگر جمیل سے اس محرومی کا ذکر کرتا تو وہ بڑی خوبصورتی سے موضوع بدل دیتا یا پھر کہتا:

"میں ہر قسم کی جھنجھٹ سے محفوظ ہوں اور پھر آج کل ایسی اولاد کہاں پیدا ہو رہی ہے جو اولادِ صالح کہلا سکے۔ ایسی اولاد اب کہاں جو رات کے وقت ماں پانی مانگے اور سو جائے تو بیٹا پانی کا گلاس لیے ساری رات کھڑا رہے کہ کب ماں جاگے اور پانی پلاؤں۔ ایسی اولاد بھی اب پیدا نہیں ہوتی جس

کو اللہ کی راہ میں باپ قربان کرنا چاہے تو کہہ سکے کہ: ابا آپ اپنی آنکھوں پر کپڑا باندھ لیں، کہیں آپ کے ارادے متزلزل نہ ہو جائیں۔ آج کل تو اولڈ ایج ہوم اولاد والوں سے ہی آباد ہیں۔''

وہ خوش نصیب تھی کہ اس کو جمیل جیسا شوہر ملا' ورنہ کوئی اور مرد ہوتا تو اسی محرومی کو بنیاد بنا کر طوفان مچا دیتا۔ گھر کا شیرازہ بکھیر دیتا۔ مرد تو اپنی ہوس مٹانے کے لئے مختلف بہانے ڈھونڈتا ہے۔ جمیل نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا۔ وہ فرشتہ تھا، حقیقی معنوں میں مجازی خدا تھا۔ کبھی کبھی اس کا جی چاہتا شرک کی سرحدوں کو پار کر جائے اور جمیل کی عبادت کرنے لگے۔

جمیل کو وہ ہر حالت میں عزیز تھی۔ جمیل نے کبھی کوئی ایسی حرکت' ایسا عمل یا ایسی گفتگو نہیں کی تھی جس سے اُس کے جذبات پر ضرب لگتی۔ لیکن جب اُس کی پریشانی، اُس کی فکر مندی حد سے بڑھنے لگی تو وہ سمجھانے پر تل گیا:

''تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو۔'' جمیل اُس سے کہتا: ''خدا نے ہر کام کا وقت مقرر کر دیا ہے، جب وقت آئے گا تمہاری گود بھر جائے گی۔''

''لیکن وہ وقت کب آئے گا؟'' وہ زچ ہو کر بولی: 'کیا آپ کو اس کا احساس نہیں کہ ہم لوگ بڑھاپے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔''

جمیل ہنسنے لگا۔ ''ڈرالنگ! بڑھاپا ابھی ہم سے کوسوں دور ہے۔ لیکن تم نہیں جانتی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ نے کس عمر میں اولاد دی تھی!''

''مت بات کرواُن کی۔ وہ پیغمبر تھے۔'' وہ حلق کے بل چلّائی: ''ہم گناہ گار بندے ہیں۔ بدکار، سیاہ کار..........!''

جمیل کے پاس اب خاموشی کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ یہ گفتگو اُن دونوں کے درمیان تین چار دن پہلے ہوئی تھی اور پھر اس کے بعد وہ زبیدہ کمال کے پاس گئی تھی۔ جمیل نے اس کو روکا نہیں۔ علاج کے لئے منع نہیں کیا۔ اولاد کی خواہش میں وہ جتنی دوڑ دھوپ کر سکتی تھی کر رہی تھی۔

ایک شام کو جمیل آفس سے لوٹا تو وہ اداس سی بیٹھی ہوئی نظر آئی۔ جمیل نے اس کی اداسی کا سبب نہیں پوچھا۔ اس کے مقابل بیٹھ گیا اور کہنے لگا:

''تم مسعود صاحب کو جانتی ہونا؟ ڈپٹی کمشنر ہیں، ریٹائرڈ ہونے کے بعد وہ حج کی سعادت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ حج پر جانے سے پہلے انھوں نے اپنی ساری جائیداد اپنے دونوں بیٹوں میں تقسیم کر دی تھی اور جب حج سے واپس ہوئے تو معلوم ہوا کہ بیٹوں نے ساری جائیداد بیچ دی ہے۔ رہنے کے لیے ان کا ٹھکانہ بھی نہ رہا۔ اب وہ ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہیں۔''

وہ اپنے شوہر کا منھ تکنے لگی۔ وہ اس واقعہ سے واقف تھی پھر کیوں جمیل اس کا تذکرہ کر رہا تھا؟ وہ سوچنے لگی۔ جمیل بولا:

''تم چارّی صاحب سے واقف ہونا جو ہمارے محلے میں رہتے ہیں۔ چارّی صاحب اوران کے بیٹے کے درمیان جو جھگڑا چل رہا ہے اس سے سارا محلہ واقف ہے۔ اب معاملہ عدالت تک پہنچ گیا ہے۔ بیٹا چارّی صاحب کو ذہنی طور پر معذور قرار دے رہا ہے۔''

اس کی نگاہیں شوہر کے چہرے سے نہیں ہٹیں۔ جمیل نے کہا: ''ایسے واقعات سن کر جی نہیں چاہتا کہ اولاد کی تمنا کریں۔ خدا کا شکر ہے کہ ہماری کوئی اولاد نہیں اگر ایسی اولاد پیدا ہوتی تو........''

وہ گھورنے لگی تو جمیل نے اپنی بات نامکمل چھوڑ دی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ جمیل ایسا کیوں سب کچھ کہہ رہا ہے وہ نافرمان اولاد کے منفی پہلوؤں کو اُس کے سامنے رکھ کر اُس کا غم غلط کرنا چاہتا تھا۔ وہ کچھ نہیں بولی تو جمیل نے خاموشی اختیار کرلی تھی۔

ڈاکٹر زبیدہ کمال نے اُس کو جو مشورے دیے تھے اُس پر اُس نے عمل کیا۔ جو دوائیں تجویز کی تھی ں اُس کا استعمال کیا۔ تین چار مہینے گزر گئے اور 'پیریڈ' کا عمل نہیں بند ہوا تو اُس کا دل مایوسی کے غبار میں ڈوب گیا۔ ڈاکٹر زبیدہ کمال کا دیا ہوا کورس مکمل ہو چکا تھا۔ زبیدہ کمال نے علاج شروع کرتے وقت ہی اس کو دوبارہ آنے سے منع کر دیا تھا۔ وہ زبیدہ کمال کے پاس نہیں گئی اور نہ کسی ڈاکٹر سے رجوع ہونے پر طبیعت آمادہ ہوئی۔ یہ اس کی لاپرواہی نہیں مایوسی کی انتہا تھی۔ شاید قدرت سے اولاد کا سکھ اس کی قسمت میں نہیں لکھا تھا۔ آہستہ آہستہ یہی بات اُس کے دل میں گھر کرتی جارہی تھی۔

اتوار کی صبح جمیل عموماً اخبارات تفصیل سے پڑھنے اور خبریں دیکھنے میں گزارا کرتا تھا۔ لیکن اس اتوار کو اس نے نہ اخبار اٹھایا اور ٹی وی کھولا۔ کرسی پر بیٹھے آنکھیں بند کیے نہ جانے کیا سوچتا رہا۔ اس نے پوچھا تو جمیل نے اس کا ہاتھ پکڑ کر قریب بٹھالیا اور مسکراتے ہوئے بولا:

''میں دراصل پروگرام بنا رہا تھا۔''

''کیسا پروگرام........؟'' وہ پوچھ بیٹھی۔

''چھ ماہ بعد میں ریٹائر ہو جاوں گا۔ سوچ رہا تھا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد ہمارا کیا پروگرام ہونا چاہیے؟ وظیفہ پر خاصی رقم ہاتھ لگے گی۔ میرا ارادہ ہے دنیا گھومنے نکل جائیں۔ ملیشیا، سنگاپور، نیویارک، پیرس اور پھر مصر۔ مصر کی پراسرار ممیوں کی داستان تم بہت شوق سے پڑھتی آئی ہو۔ اب ان ممیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا۔''

''پھر اُس کے بعد........؟'' اس نے سوال کیا:

''اس کے بعد........'' جمیل کہنے لگا: ''ہم دونوں حج کی سعادت حاصل کریں گے۔ حج کے بعد میں اپنی داڑھی بڑھالوں گا۔ میری دوڑ گھر سے مسجد تک اور مسجد سے گھر تک محدود ہو کر رہ جائے گی اور تم بھی حجاب باندھ کر مصلے پر بیٹھ جانا..... کیونکہ ہم دونوں کا یہی مقدر ہے۔...''

جمیل نے اپنی بات شوخ انداز میں شروع کی تھی۔ پھر اُس کا لہجہ سنجیدگی میں تبدیل ہوگیا۔ اُس کے بعد اُس کی آواز رندھ گئی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ جمیل کی آنکھوں میں نمی اور لہجہ المناک ہے۔ وہ دیوانہ وار اپنی جگہ سے اٹھی اور جمیل سے لپٹ گئی۔ جمیل اس کو اپنے سینے سے لپٹا کر رونے لگا تھا۔ پتہ نہیں کتنے صدیوں سے ایک لاوااس کے سینہ میں کھول رہا تھا جو آج اچانک آنسو بن کر بہنے لگا تھا۔

چھ مہینے کے بعد جمیل ریٹائر ہوگیا۔

ریٹائرمنٹ کے دن دفتر والوں نے جمیل کو ایک شاندار وداعی پارٹی دی۔ پھول پہنائے ،شال اوڑھائی۔ بہت سے تحائف دیے۔ وہ ان تمام چیزوں کو سنبھال کر گھر لوٹا تو گھر قریبی رشتے داروں سے بھرا ہوا تھا۔ ان مہمانوں میں جمیل کی چھوٹی بہن بھی شامل تھی۔ ہاجرہ اپنے دونوں جوان بیٹوں ،اکرم ،وسیم کے ساتھ آئی ہوئی تھی۔ ہاجرہ اور جمیل کی شادی صرف ایک دن کے فرق سے ہوئی تھی۔

ہاجرہ ہنستے ہوئے بولی:''بھیا آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں۔؟

''بہت ہی ہلکا پھلکا'' جمیل ہنسے ہوئے بولا:''آج میں بہت سی ذمہ داریوں سے آزاد ہوگیا ہوں۔ سرکاری ملازمت غلامی سے کم نہیں ہوتی۔''

جمیل کی نگاہیں اپنے بڑے بھانجے اکرم پر جمی ہوئی تھی جو بے حد وجیہہ تھا۔ وہ جمیل کے قریب چلی آئی اور آہستگی سے بولی:''بے حد اسمارٹ ہے نا؟''

جمیل نے نگاہیں پھیر کر اس کو دیکھا اور بے ساختہ کہا:''ہمارا بیٹا بھی آج اتنا ہی ہوتا اگر تم شادی کے بعد اپنا پہلا ابارشن نہ کراتیں۔''

وہ سکتے میں آگئی۔ وہ تو آج تک یہ سمجھتی آئی تھی کہ جمیل اس کی اس خطا سے ناواقف ہے۔ جس کو اُس نے اس کے علم اور اجازت کے بغیر انجام دیا تھا۔ جس کی سزا وہ آج تک بھگت رہی تھی!

☆☆☆

اپنے آپ کا قیدی

● نور شاہ

میں اب جہاں رہتا ہوں وہ دراصل میرا گھر نہیں سرکاری ریسٹ ہاؤس ہے اور اسی ریسٹ ہاؤس کا ایک کمرہ اب میرا گھر ہے۔ یہاں تنہائی ہے، ویرانی ہے اور ازل ازل کی تاریکی ہے، اس تاریکی میں میری تلخ ہنسی کی کڑوی کسیلی آواز ابھر رہی ہے اور آدھ کھلی کھڑکی سے روشنی کی ایک مدھم مدھم سی کرن پھوٹ رہی ہے جو آہستہ آہستہ ایک روپ ایک بدن میں ڈھل رہی ہے لیکن خوبصورتی کو پرکھنے والی میری آنکھیں بند ہیں۔ محبت کی دھیمی دھیمی سی آنچ محسوس کرنے والی میرے دل کی دھڑکنیں خاموش ہیں۔ دل کی جن دھڑکنوں پر زندگی کی اُمیدیں قائم تھیں، وہ روگ بن چکی ہیں، روح کا تعلق دل سے ہے، روح مر گئی دھڑکنیں رُک گئیں، دل بجھ گیا اور وہ بدن تو تشنگی کا ساگر ہے، شبنم کی چند تھرکتی لرزتی بوندوں کا تمنائی.... اور میں اپنے کھردرے ہاتھوں کی مخروطی انگلیاں اس بدن پر پھیر پھیر کر ساگر کی گہرائیاں ناپ چکا ہوں، بہت دن بیتے، تب میں تنہا نہ تھا۔ میری ہنسی تلخ نہ تھی اور نہ میری آواز کڑوی کسیلی۔ میری ہنسی پونم کے چاندنی جیسی تھی جو جھیل میں کھلے کنول کے گلابی پتوں پر بکھر کر ناچتی ہے۔ تب وہ بھی روشنی کی ایک مدھم مدھم سی کرن تھی۔ وہ بدن گلابی تھا۔ نرم و نازک۔ اس قدر نازک جیسے منہدی کی شاخ، اتنا کومل جیسے جوہی کی کلی، پھر میں نے منہدی کی شاخ کو چھوا، جوہی کی کلی کا لمس پایا اور ساگر میں ایک ڈبکی لگائی۔ نیچے بہت نیچے، اترتا گیا.... اور پہلی بار فرشتوں کے شہر جل گئے۔ میں نے اپنے کمرے کی ننگی اونچی دیواروں سے چھوٹے چھوٹے ان تراشے پتھر لیے اور چنار کے سائے میں اپنے لیے قبر بنائی۔

میں قبر میں اتر چکا ہوں اور میرے سامنے بے شمار، ان گنت لوگ کھڑے ہیں۔ ان کے ہاتھ اور دامن پھیلے ہوئے ہیں وہ مجھ سے کچھ مانگ رہے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ زندہ قبر میں اُترنے کی وجہ سے مجھے نروان مل گیا ہے۔ مجھے مکتی مل گئی ہے.... نا سمجھ ہیں یہ لوگ!!

''میں گوتم نہیں ہوں لوگو!!''

میں قبر سے باہر نکل آیا ہوں۔ لوگ التجا بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہے ہیں اور میں خاموش ہوں۔ دبے دبے قدموں سے اپنے کمرے میں لوٹ آیا ہوں.... میں سونا چاہتا ہوں، اپنے ماضی کی یادوں کو ایک خواب کی صورت میں دیکھنا چاہتا ہوں مگر نیند کس کے بس میں ہے۔ یادوں کے تیز جھکڑ میں یوں بھی سونا ناممکن ہے۔ خیال کے دریچوں پر پڑے ہوئے نیند کے پردے کسی زخمی پرندے کی طرح پھڑ پھڑانے لگے ہیں.... میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ سامنے ڈوبتی سسکتی رات کے سیاہ دبیز پردوں پر ایک منحنی سی راہ نظر آ رہی ہے اور اس کے آخری موڑ پر شبنمی اور نرگسی اجالوں میں زلیخا اپنی مرمریں بانہیں کھولے میری منتظر ہے۔

میں جب پہلی بار زلیخا سے ملا وہ گل مرگ میں اپنی ہٹ کے لان میں ڈوبتے سورج کا منظر دیکھ رہی تھی۔ فاختائی رنگ کی ساڑی میں اس کا لپٹا ہوا سپید سپید، نرم نرم، اجلا اجلا اور بھیگا بھیگا سا بدن مجھے بے حد پسند آیا۔ میں نے چاہا آہستہ آہستہ چپ چاپ آگے بڑھ کر اپنے جلتے ہوئے شریر کو آسودگی اور اطمینان بخشوں! مجھے لگا جیسے میں جاگتے میں خواب دیکھ رہا ہوں اور جب میرا خواب ٹوٹا، زلیخا میری خواب گاہ میں تھی۔ میرے قریب، اس کا بدن ساگر کی طرح عریاں میری نظروں کے سامنے تھا۔ میں نے ایک ڈبکی لگائی۔ تہہ در تہہ نیچے اترتا گیا اور میں نے زلیخا کے گالوں کا رس نچوڑ لیا۔ اس کے ہونٹوں کی پنکھڑیوں کی خوشبو چُرا لی۔ اس کی آنکھوں کے خمار آلود جام خالی کیے.... اور لمحے سرکتے رہے!

اب زلیخا کوئی اجنبی نہ تھی میرے لیے وہ میری بیوی تھی، میری زندگی کے انجانے راستوں کی ہم سفر!!

اور ایک دن میں نے پلٹ کر دیکھا: نہ کہیں شبنمی اور نرگسی اجالے تھے اور نہ زلیخا کی مرمریں بانہیں۔ ان راہوں پر میرے قدموں کے نشان بھی مٹ چکے تھے۔ بس اس راہ کے آخری موڑ پر ایک خلا تھا۔ ایک وسیع خلا اور بن سہارے کی صلیب پر میری لاش لٹکی ہوئی تھی اور اس کے دامن میں آگ جل رہی تھی۔ آگ کے ان لپکتے شعلوں پر میری لاش بھی جل چکی تھی۔ جل جل کر سڑ چکی تھی اور جلے ہوئے گوشت کی بدبو چاروں اور پھیل چکی تھی۔ میں نے چنار کے سائے میں اپنے ہاتھوں سے اپنے لیے جو قبر بنائی تھی وہ اب خالی نہ تھی۔ وہاں زلیخا سو رہی تھی۔ ہمیشہ ہمیشہ

کے لیے۔۔۔۔!

کہتے ہیں کہ زلیخا کی موت پر میں کئی دن بے ہوش رہا لیکن میرے جلے ہوئے گوشت کی بدبو محسوس کرنے والے لوگ میرے قریب ہی کھڑے رہے میرا طواف کرتے رہے اور جب میں ہوش میں آیا تو سارے لوگ بھاگ گئے میں نے چلا چلا کر کہا... ''لوگو، میں منصور نہیں ہوں اور نہ ہی سورداس۔ میں صرف ایک انسان ہوں۔''

لوگ بھاگتے رہے۔ بھاگتے قدموں کے شور میں ایک ننھی منی پیاری سی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ساگر کی گہرائیوں سے ایک سیپ نکل آیا تھا۔ میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ میں نے دیکھا زلیخا نہ تھی لیکن زلیخا کے مستقبل کی محرابوں پر آرزؤں اور تمناؤں کے دیے روشن کرنے والی ایک لڑکی میری گود میں ہے، میری اپنی بیٹی.... زلیخا اور میری بیٹی!

میری سوچوں میں کوئی تسلسل نہیں۔ کوئی ہم آہنگی نہیں لیکن ان بے سوچ کی سوچوں کی بھی تو ایک سوچ ہے اور یہ سوچیں پھر مجھے ان ہی راہوں کی جانب لے جا رہی ہیں... میں اپنی بیٹی ناز کی پرورش اپنی نوکرانی طاہرہ کے سپرد کرتا ہوں۔ طاہرہ کی گود میں دو مہینے کی اپنی بیٹی ہے۔ لمحے سرکتے ہیں اور ایک افسانوی رات کو ایک عجیب سی حقیقت جنم لیتی ہے۔ طاہرہ کے خاوند کی لاش باغ کے کنویں میں پائی جاتی ہے۔ پولیس آتی ہے، ہنگامہ ہوتا ہے اور پھر یہ ہنگامے خود بخود ختم ہو جاتے ہیں۔ رمضانی کی خودکشی سے کوئی واقف نہیں لیکن میں جانتا ہوں، طاہرہ بھی جانتی ہے کہ اس نے کیوں خودکشی کر لی تھی... انسان کتنا کم ظرف ہے۔ جب سارے ہنگامے سو گئے، طاہرہ نوکروں کے کوارٹر سے کوٹھی میں آ گئی اور میں نے اپنے ذہن کی راہوں میں بے پناہ شراب انڈیل دی اور اپنے ماضی سے فرار حاصل کیا۔!!!

میں اپنے سرکاری ریسٹ ہاؤس کے کمرے کی ہر وہ شئے بھی بند کر لوں جہاں سے روشنی کا گزر ہوتا ہے۔ روشن دان، کھڑکیاں، دروازے بے چھت کی دیواروں پر لٹکے ہوئے فانوس قمقمے.... یہ اندھیرے مجھے پسند ہیں!

اور ان اندھیروں میں دو کم سن بچیاں ایک ساتھ روشنی کی تلاش میں نکلتی ہیں۔ ایک ساتھ کھیلتی ہیں، ایک ساتھ پڑھتی ہیں، ایک ساتھ اٹھتی بیٹھتی اور سوتی ہیں۔ ان کا ایک ایک لمحہ ایک ساتھ بسر ہوتا ہے۔ اندھیرے آہستہ آہستہ چھٹ جاتے ہیں۔ مدھم مدھم سی روشنی بکھرتی ہے۔ ناز اور نغمہ.... زلیخا اور طاہرہ کی بیٹیاں اپنے شہر سے دور ایک ساتھ کالج میں پڑھتی ہیں۔ ایک ساتھ ہوسٹل میں رہتی ہیں اور اک دن لوٹ آتی ہیں۔ طاہرہ کو بھی مرے ہوئے کئی سال ہو چکے ہوتے ہیں اور ناز مجھ سے کہتی ہے:

''ڈیڈی، آپ کے سر کے بال سپید ہو گئے ہیں''

تنہائی ہے، ویرانی ہے اور ازل ازل کی تاریکی ہے۔ میرے کمرے میں..... میرے دل کے آنگن میں؟

ناز کی شادی ہو گئی!!

اور ایک بار پھر مجھے تنہائیوں کا احساس ہوا۔ مجھے بے ساختہ زلیخا یاد آئی۔ طاہرہ کی صورت نظروں کے سامنے پھر گئی اور میرے دل کے بوڑھے آنگن میں ایک پھول کھلنے کی تڑپ جاگ پڑی۔ میں اس پھول کی تلاش میں شہر شہر، نگر نگر، بستی بستی گھومتا رہا لیکن وہ کھل نہ سکا۔ صرف اس کی خوشبو محسوس ہوئی۔ خوشبو محسوس کی تو یہ میرے دل کے ویران تنہا گوشوں میں بکھر گئی اور میں ایک احساس لیے گھر لوٹ آیا۔ میرے قدم میرے چپ چاپ قدم آگے بڑھے اور میں نے دیکھا کہ زلیخا کی گلابی رنگ کی خواب گاہ میں سنگ مرمر جیسے سپید بستر پر نغمہ کے روپ میں ایک سراپا سمٹا ہوا ہے۔ میں نے دبے قدموں سے خواب گاہ میں قدم رکھا۔ ایک ذرا سی آہٹ ہوئی۔ سراپا پھیل گیا اور مجھے محسوس ہوا جیسے سنگ مرمر سے ترشی ہوئی وینس کی مورتی گلاب کی بیلوں کا سہارا لیے مجھے نفرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی ہے۔ لیکن ... لیکن رنگ دار لباس میں اس کا وہ بھیگا بھیگا، سمٹا سمٹا، پھیلا پھیلا سا بدن دیکھ کر مجھے لگا جیسے وہ ابھی ابھی زعفرانی پانی میں نہا کر آئی ہو۔ اس کی سانسوں میں مجھے عمر خیام کی رُباعیوں کی سی مہک پھوٹتی نظر آئی.... ایک بار اندھیرے پھیل گئے اور اندھیرے میں ایک دبی سی چیخ اُبھری۔

میں نے اپنی ساری جائیداد نغمہ کے نام لکھ دی اور اپنی کوٹھی سے یہاں آ گیا ہوں۔ یہ میرا گھر نہیں ہے۔ سرکاری ریسٹ ہاؤس کا کمرہ ہے۔ اور میں یہاں صرف ایک قیدی ہوں اپنے آپ کا قیدی!!

☆☆
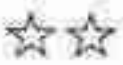
زیارت

• کمال احمد

تو میرے مؤت کے برابر ہے!

جلالی بابا کو غصہ آ گیا۔

میری نظر سرخ چبوترے کی طرف گئی، اوہ یہ ڈھونگی ہے" موں پر اسی طرح کے ڈھونس جماتا ہے۔ جمعرات کے دن اس طرح کے ڈھونگی اور نقلی پیر آپ کو بہت نظر آئیں گے۔ چلیے دو دوست کے مزار کی طرف چلتے ہیں:

وہ۔۔۔۔؟

کون؟

اس نے میری نگاہوں کا تعاقب کیا۔ ایک شکستہ قبر پر ایک اجاڑ صورت عورت عجیب طرح سے کپڑے پہنے کھڑی تھی، کپڑے پہنے کیا تھی کپڑے نے اسے لپیٹ رکھا تھا، البتہ سر اور کان ردا میں لپٹے ہوئے تھے متوحش نگاہوں سے آنے جانے والوں کو گھورتی۔ "یہ منجو بی بی ہے۔۔ وہ قبر اس کے شوہر کی ہے جو شادی کے دوسرے دن مارا گیا۔"

میرے استفسار پر اس نے بتایا الیکشن کا وقت تھا۔۔ سیاسی تصادم میں مارا گیا۔۔۔۔۔ یہاں Political clash میں مرنے اور مارنے والے دونوں ہی بیشتر مسلمان ہوتے ہیں۔ ایسی قبریں آپکو بہت ملیں گی یہاں چلیے "دو دوست" کے مزار پر۔۔ وہی دو دوست نا، جو لاہور سے چل کر آئے تھے اہانتِ رسول کا بدلہ لینے۔

ہاں! وہی جناب۔ کیا پختگی تھی ایمان کی، موت کے گھاٹ اتار کر ہی دم لیا، اب کہاں ایسے ایمان والے۔ میرے جی میں آیا اسے یاد دلا دوں کہ ہمارے پڑوسی ملک نے اہانت دین Blasphemy Law کا قانون بنالیا ہے جس کے تحت ملزم کو پھانسی دینا، گردن اڑا دینا اشد ضروری ہے۔

آپ تو جانتے ہیں مرد اگر شادی نہ کرے اور اکیلا رہ جائے تو وہ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں خود کو بھوت سمجھنے لگتا

ہے۔ لیکن اگر عورت اکیلی رہ جائے تو وہ خود کو دیوی سمجھتی ہے۔ اس عورت کو دیکھ رہے ہیں آپ۔۔؟

کون۔۔ میں چونکا۔

وہ سفید ساڑی میں۔ وضو خانے کے پاس!

اوہ، وہ۔۔ سلیقہ مند لگتی ہے۔ یار عورتوں کو تو قبرستان جانے کی اجازت نہیں۔ پھر اتنی عورتیں؟
جمعرات کو کوئی بندش نہیں۔ ہر جمعرات کو کسی نہ کسی پیر بابا کا عرس ہوتا رہتا ہے۔ لہٰذا عورتیں زیادہ نظر آتی ہیں۔ منتیں مانگنے یا پھر پورے ہونے پر نذرانہ چڑھانے۔

یہ میرا گائیڈ جو مجھے قبرستان دکھا رہا ہے، سیف الاسلام عرف سیفل ہے۔ اسے میں نے بستی میں بار ہا مختلف مساجد کے خالی تابوت لوٹاتے دیکھا ہے۔ سائیکل وین پر تابوت لادے جب وہ جامن تالاب کی مسجد کے قریب رکا اور تابوت اتارنا چاہا تو ایک نمازی نے اسے بتایا یہ تابوت اس مسجد کا نہیں ہے اس مسجد کے بھی تابوت اسٹیل فریم کے ہیں جبکہ یہ لکڑی کا ہے وہ حیران ہوا کہ ایسی غلطی اس سے کس طرح ہوگئی۔ مسجد سے مجھے نکلتا دیکھ کر اس نے مجھے روکا۔ صاحب یہ کہہ رہے ہیں یہ اس مسجد کا نہیں ہے، دیکھیے تو اردو میں کس مسجد کا نام لکھا ہے۔ میں نے پڑھ کر بتایا جامن تالاب۔ اس نے فخر یہ اس نمازی کو دیکھا وہ شرمندہ ہوا۔ دو دنوں بعد ایک جنازے میں شریک قبرستان پہنچا تو اس سے ملاقات ہوئی، اس نے اپنا نام سیفل بتایا اور یہ بھی بتایا کہ وہ قبرستان میں ہی رہتا ہے۔

تم قبرستان میں رہتے ہو؟

ہاں اور بھی کئی فیملی رہتی ہے۔ آپ کسی جمعرات کو آیئے تو یہاں کی دنیا دیکھئے۔

اور آج میں یہاں تھا۔

سیفل نے مجھے بتایا اس کی پیدائش ہی قبرستان میں ہوئی تھی۔ ماں بھکارن تھی۔ ریلوے ٹریک کی زمین پر بنی جھگی میں رہتی تھی، شرابی شوہر سے جھگڑا کر کے نکل آئی۔ سمجھ نہ پائی کہاں جائے تو ایک جنازہ کے پیچھے چلتی چلتی یہاں آ گئی۔ مانو جنازہ اس کا تھا اور وہ خود کو دفنانے آئی تھی۔ یہاں کے بھکاریوں نے اسے اپنا لیا اور وہ یہیں کی ہو کر رہ گئی۔ چند ماہ بعد اس کی پیدائش ہوئی۔ جب وہ چار سال کا ہوا تو ماں نے ٹین کا چھوٹا کنستر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ کوئی جنازہ آتا تو مٹی دینے کے بعد لوگ ہاتھوں کو دھونے تالاب جایا کرتے تھے۔ ننھا سیفل کنستر میں تالاب سے پانی بھر کر لوگوں کے ہاتھ کنستر میں دھلانے لگا۔ کئی اس کی ہتھیلی پر سکے رکھ جاتے کئی یوں ہی کنی کتنا جاتے۔

اس طرح نہایت کم عمری میں وہ ماں کا سہارا بن گیا۔ فقیروں کی قطار میں کھڑے سکوں کے علاوہ اسے نان اور کھجور ملنے لگے۔ ماں خوش تھی کہ اس کی آمدنی ڈبل ہوگئی تھی۔

انھی فقیروں میں مسٹنڈا اجبار بھی تھا۔ اس سے رجو کی ترقی دیکھی نہ گئی۔ اس نے پہلے بھی کئی بار دست درازی کی کوشش کی تھی جس پر فقیروں کی برادری نے اس کی سرزنش کی تھی اور دھمکی دی کہ اگر اس نے

دوبارہ رجو پر اپنی نیت خراب کی تو اسے فقیروں کی برادری سے نکال دیا جائے گا، اگر یہی سب کرنا ہے تو باہر کی دنیا میں جاؤ قبرستان کی حرمت خراب نہ کرو۔ جبار رسٹپٹایا تو بہت پھر اس نے رجو کو اپنے نکاح میں لینے کی بات کی جسے رجو نے فوراً مسترد کر دیا۔

ایک دن رجو نے دیکھا سیفول روتا کراہتا بمشکل تمام چلتا ہوا اس کے پاس پہنچا تو اس کے پتلون سے خون ٹپک رہا تھا۔ رجو نے اسے گھمایا تو دیکھا پیچھے سے پتلون خون سے چپک گیا تھا اور خون کی لکیریں پاؤں تک پہنچ گئی تھیں۔

کیا ہوا یہ۔ کہاں گرا تو؟

وہ جبار چاچا۔

کیا! رجو سمجھ گئی اس نے فوراً سیفول کو اٹھایا اور چیخ چیخ کر سب کو جمع کر لیا اور جبار کے کرتوت بتائے۔ ابھی اسے فوراً چتر نجن لے کر جا امام الدین بولا۔ رجو سیفول کو لیے اسپتال دوڑی سیفول تین دن اسپتال میں رہا۔ پولس کیس ہوا۔ جبار پکڑا گیا، فاسٹ ٹیک کورٹ میں مقدمہ چلا اور جبار کو سات سال کی سزا ہو گئی۔

جبار تو اب رہا ہو گیا ہوگا؟ میں نے پوچھا۔

ہوا تھا۔

تو اب کہاں ہے؟

اوپر! مجھے حیرت میں دیکھ کر بولا۔ وہ میرا مجرم تھا اسے تو سزا قانون نے دی تھی۔ وہ سزا تو میری نہیں تھی۔ رک کر بولا میں نے اسے سزائے موت دی۔

تم نے اسے مار دیا؟

ہاں، ورنہ میں خود جی نہیں پاتا۔

تم کس طرح بچ گئے؟

پندرہ سال کا تھا اس لیے Juvenile court نے Correction Home میں پانچ سال کے لئے ڈال دیا اور یہ اچھا ہوا میرے لیے، وہاں میں نے پڑھائی لکھائی کی انھوں نے مجھے انسان بنایا، جینا سکھایا۔

پھر واپس قبرستان کیوں آئے؟

یہ میری جائے پیدائش ہے اور پھر ماں زندہ تھی اسے بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ باہر کی دنیا میں چلے۔ نئی زندگی شروع کرے مگر اسے تو جیسے مُردوں سے پیار تھا۔

باتوں میں ہم راستہ بھول گئے، واپس اسی جگہ وضو خانے کے پاس پہنچے، وہ سلیقہ مند عورت اب کئی عورتوں میں گھری اس سائبان میں بیٹھی ہے جہاں جنازہ لاکر رکھا جاتا ہے۔ اب اس کے سر دکان ردا سے لپٹے ہوئے تھے، مریدوں سے نذرانہ قبول کرتی جا رہی تھی۔

سیفل ہم تو وہیں پہنچ گئے۔

باس باتوں میں اندازہ نہ ہوا۔ دو دوست کا مزار تو پیچھے چھوٹ گیا۔

اب اس عورت کے گرد اتنی بھیڑ؟

وہ اب تعویذ گنڈے کا کام کرتی ہے پیرنی بن گئی ہے وہ کیا کہہ رہے ہو تم؟

دراصل اس کی بھی عجیب کہانی ہے: نام اس کا منورہ ہے۔ مدنا پور کے گاؤں چاند پور کی رہنے والی ہے۔ گاؤں میں ہر جمعرات کے دن پیر ولی شاہ وارد ہوتے تھے جھاڑ پھونک دعا تعویذ کے لیے۔ پورا گاؤں امڈ آتا، ولی شاہ پرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے مریدوں میں عورتوں کی تعداد زیادہ تھی۔ عورتوں کی جھرمٹ میں ان کی نظر منورہ پر پڑی۔ اپنے مریدوں کی مدد سے اسے حجرے میں بلانے کا جتن کیا۔ پیر بابا عموماً ایک ہفتہ ہی رہتے تھے پھر دوسرے گاؤں کوچ کرتے تھے مگر اس بار منورہ کے چکر میں دو ہفتہ رُک گئے۔ منورہ کی ماں کسی طرح نہ مانی تو پیر بابا نے نکاح کی تجویز رکھی، منورہ کی ماں جانتی تھی ولی شاہ کی زوجیت میں پہلے ہی چار بیویاں ہیں وہ اس حرام کاری پر راضی نہ ہوئی۔ اسی رات مریدوں نے منورہ کو اغوا کر کے بابا کے حجرے میں ڈال دیا۔

منورہ کے غصے کی تاب نہ پوچھو، وہ اتنی غضبناک ہوئی کہ بابا کا منہ نوچ ڈالا، اس کے سیاہ کرتے کے گریبان کو اس مضبوطی سے پکڑا کہ پیر بابا کا جلال بھی کام نہ آیا۔ گریبان تار تار ہوئے، پیر چلایا، مرید دوڑے، منورہ کے چہرے سے جلال ٹپک رہا تھا۔ آنکھیں الٹ آئی تھیں، منہ سے جھاگ نکل رہا تھا، پیر کی گردن اس نے اپنے بازو میں دبوچ رکھا تھا، اس کی چیخ سن کر پورا گاؤں امڈ آیا۔ منورہ کا یہ جلال دیکھ کر عورتیں بولیں منورہ پر کالے جن کا سایہ آ گیا ہے۔ عورتوں نے بھی پیر بابا کو اس کی گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کی سب بے سود۔۔۔ منورہ اب زوروں سے اپنے سر کو گردش دینے لگی ساتھ ہی منہ سے عجیب عجیب آوازیں نکال رہی تھی۔ اچانک اس نے اپنے بازو کی گرفت ڈھیلی کر دی۔ پیر بابا جو گرتے پڑتے بھاگے پھر کبھی اس گاؤں کا رخ نہ کیا۔

پیر ولی شاہ کا بھرم ٹوٹ گیا۔۔۔ عورتیں منورہ کے آگے سجدے میں گر گئیں۔۔۔ اب گاؤں والوں کے لیے وہ پیرنی تھی۔ اب دعا تعویذ جھاڑ پھونک منورہ کرنے لگی، شاید اس نے جان بوجھ کر ایسا کیا تھا کہ گاؤں کی عورتوں کو پیر ولی شاہ کی ہوس سے بچا سکے۔

تو اب یہ یہاں؟ میرے پوچھنے پر وہ بولا۔ پچھلے سال میں اسے یہاں لے آیا۔

کیوں؟

کیونکہ اس کی مریدوں میں بھی عورتیں تھیں مرد کوئی نہ تھا۔

میں خاموش ہو گیا ٹھیک اسی وقت ایک جنازہ داخل ہوا۔ کافی بھیڑ تھی۔ اس سے اجازت لے کر میں بستی لوٹ آیا گھر پہنچ کر مجھے یاد آیا کہ دو دوست کے مزار کی زیارت تو رہ گئی۔

☆☆☆☆
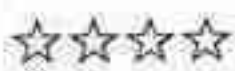
جو رہی سو بے خبری رہی

● رئیس فاطمہ [پاکستان]

میں نے اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا...... میرے خدا......!! کیا آنکھیں اتنی خوبصورت بھی ہوسکتی ہیں......؟...... جیسے مدہوشی کا ساغر پلانے والے دو پیالے، جیسے درد کے سمندر میں ڈولتی ناؤ......!! ...... بس کیا کہوں......؟ میں تو اسے دیکھتا ہی رہ گیا...... اس کا حسین چہرہ آدھا نقاب میں چھپا ہوا تھا، صرف آنکھیں بول رہی تھیں، پیشانی اور بقیہ چہرہ پردے میں تھا۔ اچانک مجھے طاہر نے ٹہوکا دیا۔ میں جیسے کسی دوسری ہی دنیا میں تھا۔ وہ آہستہ سے بولا: ''نئی ہے آج ہی سے ڈیوٹی جوائن کی ہے۔ اب یہیں رہے گی۔ جی بھر کے دیکھ لینا''۔ میں کھسیانا سا ہوکر اپنے کام میں مگن ہوگیا لیکن انجانے میں بار بار اس کی جانب آنکھیں اٹھ جاتی تھیں۔ اس کی خوبصورت اور لانبی انگلیاں کمپیوٹر کی بورڈ پہ کھٹا کھٹ چل رہی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ آس پاس بیٹھے ہوئے لوگ چوری چوری اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

اس کا نام ثریا تھا، اکنامکس میں ماسٹرز کر کے ہمارے بینک میں آئی تھی، لنچ ٹائم میں چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں کہ اتنی خاموشی سے یہ کس کی سفارش پہ آئی ہے۔ طاہر نے کہا: ''اسے کسی سفارش کی کیا ضرورت ہے، یہ خود اپنی سفارش ہے!''

''سچ ہے، عورت کے لیے صرف خوبصورت ہونا ہی کافی ہے۔ کم رو اور معمولی شکل کی عورت خواہ کتنی ہی قابل کیوں نہ ہو اس کے لیے میرٹ پہ کوئی دروازہ نہیں کھلتا جبکہ خوبصورت چہرے والیوں کے لیے ہر شخص دیدہ و دل فرشِ راہ کیے رہتا ہے۔ چاہے وہ جی بھر کے احمق ہو'' مسز احمد نے آہستہ سے کہا۔ مسز فریدہ احمد خواتین کے حقوق پہ بولنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھیں، وہ ایک سلجھی ہوئی اور ہمدرد خاتون تھیں۔ ان کی بات سن کر میں نے ہنس کر کہا:

''آپ خوبصورت عورتوں کی اتنی مخالف کیوں ہیں، یہ حسن بھی اللہ تعالیٰ کے جمال کا مظہر ہے۔''

وہ مسکرا کے بولیں: ''نہیں منصور، ایسا نہیں ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مرد کے

معاملے میں ہمیشہ اس کی ذہانت، صلاحیت اور قابلیت کو اولیت دی جاتی ہے اور یہی درست بھی ہے لیکن جب عورت کا معاملہ آتا ہے تو معیار صرف خوبصورتی اور کم عمری ہوتا ہے، خواہ کسی ٹیلی ویژن چینل کی میزبان ہو، کسی کی پرائیویٹ سیکرٹری یا کوئی اور جاب...... پڑھی لکھی، ذہین اور قابل عورت اگر بدقسمتی سے خوبصورت نہیں ہے تو وہ کہیں کامیاب نہیں ہوسکتی۔ یہ ہمارے وطن کا المیہ ہے۔'' سامنے سے حمیرہ کے ساتھ ثریا کو آتا دیکھ کر سب چپ ہوگئے۔

☆......☆......☆

شاعرانہ ذوق مجھے ورثے میں ملا تھا، میرے دادا غیر منقسم ہندوستان کے ایک معروف شاعر تھے اور میرے والد بھی صاحب دیوان شاعر ہیں۔ ثریا کو دیکھنے کے بعد پہلی نظر کی محبت کا قائل ہوگیا تھا، حالانکہ اس نے تو ابھی تک میری جانب دیکھا تک نہیں تھا......لیکن میرے وجود میں ایک برچھی سی اتر گئی تھی۔ میں ایسے شعر تلاش کرنے لگا تھا جن میں آنکھوں کی تعریف کی گئی ہو، فیض صاحب کا یہ شعر میں گنگنانے لگتا تھا اسے دیکھ کر، لیکن اسے احساس تک نہ تھا، میں جب یہ شعر آہستہ سے پڑھتا:

تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے

میرے قریب بیٹھی ہوئی مسز فریدہ احمد خشمگیں نظروں سے مجھے دیکھنے لگتیں۔ ثریا کا رویہ عام لڑکیوں سے بہت مختلف تھا۔ وہ سوائے حمیرہ کے کسی سے زیادہ بات نہ کرتی، نقاب ہمیشہ چہرے پہ رہتا، لنچ ٹائم میں وہ گھر سے لایا ہوا لنچ کھاتی۔ اکثر حمیرہ بھی اس کے ساتھ ہی اپنا کھانا کینٹین سے منگوالیتی۔ وہ بہت کم گو تھی۔ صرف جی ہاں، جی اچھا کے علاوہ وہ کچھ نہ بولتی۔ خاموشی سے کام کرتی، وقت پر آتی اور وقت ختم ہونے کے بعد خاموشی سے اٹھ کر چلی جاتی۔ مجھے کوشش کے باوجود اس سے اپنا حالِ دل کہنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ میں چھتیس سال کا ہوچکا تھا، اماں اور بڑے بھیا مسلسل شادی کے لیے زور ڈال رہے تھے لیکن مجھے کوئی چہرہ پسند ہی نہیں آتا تھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ کوئی ایسا چہرہ میری زندگی میں آئے جسے لوگ دیکھتے ہی رہ جائیں...... اور اب وہ چہرہ مجھے نظر آگیا تھا......لیکن بات ہوتو کیونکر ہو...... بات صرف ہیلو ہائے تک محدود تھی۔ عام طور پہ خوبصورت لڑکیاں اپنے حسن کا خراج ناز نخروں سے وصول کرتی ہیں لیکن ثریا کو شاید اپنے حسن اور اپنی آنکھوں کی غیر معمولی خوبصورتی اور دلکشی کا اندازہ نہیں تھا یا شاید اس کے گھر میں آئینہ نہیں تھا۔

ایک دن قدرت نے خود ہی موقع فراہم کردیا: میں چھٹی کے بعد گھر جانے کے لیے نکلا تو ہلکی ہلکی بارش نے خیر مقدم کیا۔ میں آہستہ آہستہ گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا ماڈل ٹاؤن کی طرف چلا تو دیکھا ثریا بس اسٹاپ پر کھڑی بھیگ رہی ہے بس کے انتظار میں۔ لیکن بس کا دور دور پتہ نہ تھا۔ اچانک بارش تیز

ہوگئی۔ میں نے لاشعوری طور پر گاڑی روک کے ثریا کو آواز دی اور سیٹ سے اتر کر دوسری طرف کا دروازہ کھول دیا۔ میری توقع کے برعکس وہ فوراً اگلی سیٹ پہ میرے ساتھ بیٹھ گئی۔

''کہاں جائیں گی؟''میں نے پوچھا۔

''لکشمی چوک۔''اس نے مختصر سا جواب دیا...... پھر آہستہ سے بولی:

''پرانا علاقہ ہے، پارکنگ کی مشکل ہوگی۔ آپ مجھے روڈ پہ ہی اتار دیجیے گا۔''

''کیوں......؟ مجھے اپنے گھر پر ایک کپ چائے پلانا پسند نہیں کریں گی؟''میں نے شوخی سے کہا۔

''نہیں سر...... یہ بات نہیں...... اوّل تو یہ کہ میرے گھر کا ماحول اتنا ایڈوانس نہیں...... دوم یہ کہ میرا گھر ایک پتلی سی گلی میں ہے جہاں آپ کی گاڑی اندر نہ جا سکے گی۔''

اس نے نپے تلے الفاظ میں کہا۔

☆......☆......☆

ایک دن طاہر سے میں نے اپنے ارادے کا ذکر کیا تو وہ بولا:

''سوچتا کیا ہے بھائی......؟ جھٹ پٹ اپنی والدہ کو رشتے کے لیے بھیج دے۔''

''بغیر ثریا کی مرضی جانے؟ پاگل ہوگیا ہے کیا؟''میں نے سرزنش کی۔

''یار تیرے جیسے رشتے کے لیے تو وہ دل سے راضی ہوگی۔ پھر، تو راجہ وہ بے چاری ایک معمولی سے گھر میں رہنے والی۔ اس کی تو لاٹری نکل آئے گی۔''

''نہیں یار...... کچھ اور سوچ۔''میں نے کہا۔

''تو پھر یوں کر کہ مسز احمد سے بات کر کے دیکھ، وہ فوراً کوئی راستہ نکال لیں گی۔''

''ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔''میں نے کہا۔

اگلے دن مسز احمد کو میں نے جا لیا اور لنچ ٹائم میں علیٰحدہ لے جا کر ان سے دل کی بات کہہ دی۔ میری بات سن کر وہ بولیں:

''تم مرد بھی کتنے سطحی ہوتے ہو۔ بس چہرہ دیکھا اور لٹو ہو گئے۔ نہ خاندان کا پتہ، نہ عادات و اطوار کا...... فرض کرو جن آنکھوں پہ اور جس چہرے پہ تم فریفتہ ہوئے ہو وہ بگڑ جائے، چیچک نکل آئے یا کچھ اور ہو جائے۔ کیا جب بھی تم اس سے شادی کرنا چاہو گے؟''

''اُفوہ......!! مسز احمد میں آپ سے مدد مانگ رہا ہوں اور آپ مجھے ڈرا رہی ہیں۔''

''میں ڈرا نہیں رہی۔ صرف سمجھا رہی ہوں کہ شادی بیاہ کے معاملات میں صرف چہرہ ہی اہمیت نہیں رکھتا۔''انھوں نے آہستہ سے کہا۔

''تو پھر کب کریں گی میرا کام۔''میں نے جلدی سے پوچھا۔

''دو تین دن دے دو۔'' وہ بولیں۔

☆......☆......☆

تین دن بعد انھوں نے مجھ سے کہا کہ آفس ٹائم کے بعد نزدیکی ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر ان کا انتظار کروں۔ وہ ثریا کو لے کر وہاں آئیں گی۔

میں خوشی سے پاگل ہو گیا اور ساڑھے پانچ بجے شام قریبی ریسٹورنٹ میں پہنچ کر کونے کی ایک میز منتخب کر لی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ثریا کے ہمراہ آتی دکھائی دیں۔ وہ مجھے دیکھ کر چونک گئی۔ اس نے سوالیہ نظروں سے مسز احمد کو دیکھا۔ انھوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بیٹھنے کو کہا۔ وہ بیٹھ تو گئی لیکن پریشانی اس کی آنکھوں سے ہویدا تھی۔ چائے آگئی لیکن اس نے پینے سے انکار کر دیا۔ مسز احمد نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا:

''تمہاری بات میں نے ثریا کے کان میں ڈال دی ہے اور آج بہانے سے اسے یہاں لے کر آئی ہوں کیونکہ دفتر میں بات کرنا ممکن نہ تھا۔ اب تم خود بات کرو اور جلدی بات ختم کر کے آؤ میں باہر گاڑی میں بیٹھی ہوں۔ یہ خیال رہے کہ ثریا کو مجھے گھر بھی ڈراپ کرنا ہے۔''

''انھیں میں گھر چھوڑ دوں گا'' میں نے جلدی سے کہا۔

''جی نہیں منصور صاحب، میں مسز احمد کے ساتھ ہی جاؤں گی'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ اس دوران مسز احمد باہر جا چکی تھیں، اس کی نشیلی آنکھیں مجھے مسحور کر رہی تھیں۔

''جی فرمائیے آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے اپنے چہرے پہ حجاب کو درست کیا اور نظریں میرے چہرے پہ جما دیں۔

''دیکھیے مس ثریا میں کوئی ایسا ویسا آدمی نہیں ہوں نہ ہی میری کسی سے فلرٹ کرنے کی عادت ہے۔ آپ میرے کردار کے بارے میں کسی سے بھی تصدیق کر سکتی ہیں۔ میں اس برانچ میں گزشتہ پانچ برس سے ہوں۔''

''آگے کہیے۔ میرے پاس وقت کم ہے۔'' اس نے جلدی سے کہا۔

''میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے ساری طاقت جمع کر کے کہا۔

''بس...... یا اور کچھ'' اس نے بے نیازی سے پوچھا۔

''نہیں...... بس اتنا ہی...... البتہ اتنا بتا دوں کہ میں تین بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہوں...... ماڈل ٹاؤن میں رہتا ہوں...... اور میری والدہ جلد از جلد میرے سر پہ سہرا دیکھنا چاہتی ہیں۔ گھر ہمارا ذاتی ہے۔''

''معاف کیجیے گا مسٹر منصور۔ یہ شادی ممکن نہیں کیونکہ میں ایک ایسے غریب گھر کی لڑکی ہوں جہاں کمانے والا کوئی مرد نہیں ہے۔ ہم تین بہنیں اور ایک بھائی ہے جو ابھی بی کام کر رہا ہے اور ہم ایک معمولی سے کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔''

یہ کہہ کر وہ کھڑی ہوگئی اور چند لمحوں میں باہر نکل گئی۔
''شاید اسے بہت ناز ہے اپنے حسن پہ...... اور ہونا بھی چاہیے۔'' میں دل ہی دل میں سوچ کر مسکرا دیا۔

☆......☆......☆

اگلے دن جب میں نے طاہر سے ذکر کیا تو وہ ہنس کر بولا:
''اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں۔''
اسی وقت مسز احمد نے مجھے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ مہینے کی آخری تاریخیں تھیں، بینک میں برائے نام لوگ تھے۔ میں خاموشی سے اٹھ کر ان کے پاس گیا تو انھوں نے اپنی قریبی کرسی پہ بٹھا لیا وہ میری سینئر تھیں۔
''بھئی تمھاری وجہ سے میں بُری بن گئی...... اس نے اس حرکت کو پسند نہیں کیا اور وہ کسی بھی طرح شادی کے لیے رضا مند نہیں ہے۔''
''مگر کیوں؟ آخر مجھ میں برائی کیا ہے'' میں نے روہانسا ہو کر کہا۔
''یہ تم خود پوچھ لو۔ میں نے اس کا موبائل نمبر لے لیا ہے تمھیں دینے کے لیے...... تم رات نو بجے کے بعد اس سے بات کر سکتے ہو۔''
میں نے جلدی سے فون نمبر نوٹ کیا اور اپنی سیٹ پر آ گیا۔
گھر پہنچ کر رات کے نو بجنے کا انتظار کرنے لگا۔ ٹھیک نو بجے میں نے اس کا نمبر ملایا اس نے فوراً ہی اٹھا لیا۔
''کیسی ہیں آپ؟''
''اچھی ہوں...... فرمائیے کیسے زحمت کی؟''
''بس یہ پوچھنے کے لیے کہ آپ کو شادی پر کیوں اعتراض ہے؟''
''اس لیے کہ میں فی الحال گھر کی واحد کفیل ہوں۔''
''میں انتظار کر سکتا ہوں۔''
''کب تک؟''
''ایک سال تک، فی الحال منگنی ہو جائے...... اس عرصہ میں آپ کے بھائی کی جاب کے لیے کوشش کروں گا اور شادی کے بعد بھی آپ جاب جاری رکھ سکتی ہیں اور اپنی فیملی کی کفالت کر سکتی ہیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''
اس نے میری بات خاموشی سے سنی اور بولی: ''یہ بتائیے آپ مجھ سے شادی کیوں کرنا چاہتے ہیں؟''
''اس لیے کہ آپ کی حسین آنکھوں نے میری نیندیں چھین لی ہیں، آپ کا چہرہ ہی میرا آئیڈیل ہے۔ میں نے ہمیشہ ایسی ہی ہم سفر کی تمنا کی ہے جو حسن کے معاملے میں قدرت کا انمول تحفہ

ہو اور آپ وہی ہیں۔''

''تو آپ صرف میرے چہرے پر مرمٹے ہیں جو حجاب میں رہتا ہے۔''

اس نے ہنس کر کہا۔

''بالکل...... جب چہرے پر سے یہ نقاب ہٹے گا تو ماہ کامل میرے سامنے ہوگا۔'' میں نے شاعرانہ انداز میں کہا۔

''لیکن حسن کو بھی ایک دن زوال آجاتا ہے۔ اگر کسی حادثے نے مجھے بدصورت کردیا یا میری بصارت چھین لی تو آپ کا عشق تو اُسی وقت دم توڑ دے گا کیونکہ آپ مجھے اچھی طرح جانتے بھی نہیں ہیں۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''نہیں...... ہرگز نہیں...... ایسا کبھی نہیں ہوسکتا مس ثریا...... آپ کو معلوم نہیں کہ میں آپ کو کتنا چاہنے لگا ہوں۔ میں نے آج تک کبھی کسی لڑکی کے لیے وہ جذبات محسوس نہیں کیے جو آپ کے لیے کیے ہیں...... کسی نے سچ کہا ہے کہ...... جوڑے آسمانوں پہ بنتے اور زمین پہ ملتے ہیں''...... میں نے جذبات سے مغلوب ہوکر کہا۔

وہ کچھ دیر چپ رہی پھر بولی...... ''منصور صاحب مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت دیجیے۔''

''کتنا؟'' میں نے پوچھا۔

''کم از کم ایک ماہ۔'' اس نے ایک ایک لفظ پہ زور دیتے ہوئے کہا۔

''بسروچشم'' میں نے خوش دلی سے کہا۔

''لیکن اس عرصہ میں آپ مجھ سے بالکل رابطہ نہیں رکھیں گے۔'' وہ بولی۔

''ٹھیک ہے...... میں آپ کو بالکل بھی ڈسٹرب نہیں کروں گا، لیکن آج سے ٹھیک ایک ماہ بعد پندرہ نومبر کو میں صرف اور صرف ہاں سننا چاہتا ہوں...... بس تاکہ سولہ نومبر کو میں اپنی والدہ کو لے کر آپ کے گھر آجاؤں۔'' اس نے میری طرف بغور دیکھا اور بولی:

دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

☆......☆......☆

طاہر کا خیال تھا کہ وہ ایک ماہ کی مہلت مانگ کر اپنی ویلیو بڑھا رہی ہے جبکہ مسز احمد کا خیال تھا کہ وہ حالات کا جائزہ لے کر فیصلہ کرے گی۔ تقریباً ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ گزر گیا میں روز کیلنڈر پر دنوں کو قلم زد کرتا جارہا تھا۔ اچانک دسویں دن بینک پہنچا تو ادھیڑ عمر شریف النفس مینجر حامد نے مجھے بلاکر مبارک باد دی اور فوراً ہی ایک لفافہ میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے بے چینی سے لفافہ کھولا: میرا پروموشن ہوگیا تھا لیکن ساتھ ہی گلبرگ میں کھلنے والی نئی برانچ میں میرا ٹرانسفر ہوگیا تھا۔ مجھے اس برانچ کا مینجر

مقرر کیا گیا تھا۔ میرے ساتھ ہی حیدر اور عابدہ کا ٹرانسفر بھی اسی برانچ میں ہوا تھا۔ پروموشن پر بھلا کون خوش نہ ہوتا......!! لیکن ٹرانسفر کا مطلب ثریا سے جدائی تھی۔ لیکن ایک تسلی یہ بھی تھی کہ ایک ماہ ختم ہونے میں صرف بیس دن باقی ہیں۔

مجھے دو دن بعد ہی چارج لینا تھا۔ یہ برانچ چونکہ نئی تھی اس لیے کھاتے داروں کو اس طرف لانے کے لیے مجھے کافی محنت کرنا تھی۔ لیکن اپنی ملنسار طبیعت اور انتھک محنت کرنے کی عادت نے مجھے یہاں بھی کامیاب کیا۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ اس برانچ کے لیے بحیثیت مینیجر میرا نام حامد حسین صاحب نے تجویز کیا تھا۔ میں بہت خوش تھا، امّی اور ابو بھی خوش تھے، امی جلد از جلد مجھ سے شادی کے لیے ہاں سننا چاہتی تھیں۔ لہٰذا میں نے الف سے لے کر ی تک ہر بات بتادی۔ انھیں اور تو کوئی اعتراض نہ تھا۔ بس یہ سوچ کر پریشان ہوگئیں کہ رشتہ داروں کو کس طرح وہاں لے کر جائیں گی جہاں ہر طرف گندگی کے ڈھیر تھے لیکن میری نظر میں یہ کوئی مسئلہ نہ تھا کیونکہ شادیاں تو آج کل ہال میں ہوتی ہیں۔ بہر حال نئی ذمہ داریوں میں ایسا الجھا کہ کیلنڈر پر دن کاٹنا بھول گیا۔ جب یاد آیا تو صرف ایک دن مہینہ ختم ہونے میں باقی تھا۔ ایک دن بعد پندرہ نومبر تھی۔ میں خوشی سے پاگل ہوگیا......!!

اگلے دن میں نے صبح ہی صبح اُسے فون کیا تو ادھر سے جواب ملا...... ''ابھی پورا دن باقی ہے'' اور فون بند ہوگیا...... رات دس بجے میں نے دوبارہ فون کیا تو اس نے دوسری بیل پر ہی اٹھالیا اور بولی:

''مجھے لگتا ہے آپ واقعی سنجیدہ ہیں'' مجھے ایک دم غصہ آگیا: ''تو کیا میں اب تک مذاق کر رہا تھا؟''

''نہیں، بالکل نہیں۔ میں جانتی ہوں آپ مذاق نہیں کر رہے۔'' وہ ہنسی، اس کی شراب انڈیلتی آنکھیں جتنی خوبصورت اور طلسماتی تھیں اس کی آواز بھی اتنی ہی کھنکتی ہوئی تھی۔ وہ جب ہنستی تو لگتا جلترنگ بج اٹھے ہوں۔

''تو پھر محترمہ آپ کا کیا جواب ہے۔'' میں نے شوخی سے کہا۔

''جواب تو ظاہر ہے کہ 'ہاں' میں ہے لیکن میں اس معاملے پر تفصیلی بات کرنا چاہوں گی۔ کل شام وہیں ملیے جہاں ہماری ملاقات مسز احمد نے کروائی تھی۔''

''او کے باس۔'' میں خوشی سے پھولا نہ سمایا تھا۔

☆......☆......☆

اگلے دن شام پونے چھ بجے میں نے کونے میں ایک ٹیبل ریزرو کروالی اور پہلے سے وہاں پہنچ گیا، وہ ٹھیک چھ بجے آگئی، کچھ دیر دونوں خاموش بیٹھے رہے اور وہ ٹیبل کو دیکھتی رہی، بیرا چائے لاکر رکھ گیا صرف ایک کپ، کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ نہ یہاں چائے پیے گی نہ کچھ کھائے گی۔ اس نے اپنے خوبصورت ہاتھوں سے مجھے چائے بنا کر دی اور پھر کچھ سوچنے لگی۔

''کچھ بولو گی نہیں؟''میں نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے پوچھا۔
''آپ کے گھر میں تو کسی کو اعتراض نہیں ہوگا۔''اس نے آہستہ سے پوچھا۔
''نہیں، بالکل نہیں، میری والدہ تمھیں بہت پسند کریں گی۔''میں نے خوش ہو کر کہا۔
''لیکن انھوں نے تو مجھے دیکھا تک نہیں''وہ بولی۔
''میں نے ذکر کیا تھا ایک دفعہ، اب تم نے ہاں کر دی ہے اس لیے جلد ہی وہ تمھارے گھر رشتہ لے کر آئیں گی...... بولو ہم کب آئیں۔''
''کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ پہلے وہ مجھے دیکھ لیں، میرا گھر دیکھ لیں، تب رشتہ لے کر آئیں۔''
''ٹھیک ہے میں امّی سے بات کروں گا، دیکھو ان کی کیا مرضی ہے اور ابو کیا کہتے ہیں، شاید وہ لوگ بھی یہی چاہتے ہوں۔''میں نے رسان سے کہا۔
''اچھا اب میں چلتی ہوں۔''وہ بولی اور جانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔
''اب تو تم نے ہاں کر دی ہے، اب تو نقاب ہٹا دو۔''میں نے بے تابی سے کہا۔
وہ مسکرائی: ''یہاں ہوٹل میں لوگوں اور بیروں کی موجودگی میں اچھا لگے گا نقاب اتارنا۔''
میں لاجواب ہو گیا۔

☆......☆......☆

گھر جا کر میں نے امّی اور دادی سے تفصیلی بات کی۔ امّی بولیں: ''کم از کم اپنے کیمرے سے اس کی ایک تصویر اتار لاتے۔ میں بھی تو دیکھوں وہ کون خوش قسمت ہے جس نے میرے بیٹے کے دل میں گھنٹیاں بجا دیں۔''
''واقعی اس کا تو مجھے خیال ہی نہ آیا ویسے بھی میں اس سے باہر صرف دو بار ملا ہوں امّی اس لیے ایسا ہوا۔''میں نے بتایا۔
پھر دادی امّاں نے مشورہ دیا: کہ ثریا اور اس کی فیملی کو گھر پر بلا لو کیونکہ میں ٹانگوں میں درد کی وجہ سے وہاں جا نہیں سکتی۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ تم لوگ جاؤ گے تو وہ لوگ زیر بار ہوں گے، چاہے تم ایک ایک نوالہ کھاؤ، لیکن انتظام تو وہ بے چارے کم از کم چار لوگوں کا کریں گے۔ اس لیے تم خود اس کے گھر جا کر والدین سے ملو اور اپنے گھر آنے کی دعوت میری طرف سے دو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اسے انا کا مسئلہ نہ بنائیں گے۔''
دادی جان کی بات کی امّی نے بھی تائید کی۔ اگلے دن میں نے فون پر اسے بتایا کہ دادی جان کیا چاہتی ہیں، اس نے کچھ دیر توقف کیا پھر بولی: کہ وہ تھوڑی دیر بعد فون کرے گی۔ تقریباً دو گھنٹے بعد اس نے رضامندی ظاہر کر دی اور یہ کہا کہ وہ صرف اپنی بہن سلمٰی کے ساتھ آئے گی، اگر امّی اور دادی نے اسے پسند کیا تو پھر بعد میں دوسرے گھر والے بھی آجائیں گے۔ دو دن بعد ہفتے کا دن طے ہوا۔ کیونکہ بینک کا ہاف ڈے تھا۔ شام چار بجے وہ اپنی بہن کے ساتھ مقررہ مقام پر کھڑی تھی، سلمٰی بھی ایک خوش شکل لڑکی تھی، وہ بھی نقاب میں تھی لیکن اس کی آنکھیں اتنی خوبصورت نہ تھیں جتنی ثریا کی۔

راستے بھر دونوں خاموش رہیں۔ تھوڑی دیر میں گھر آ گیا۔ والدہ گیٹ کے پاس ہی گلاب کے پودوں کے پاس کھڑی تھیں۔ دونوں لڑکیوں نے انھیں آداب کیا اور ہمارے ساتھ چلتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آ گئیں۔ امّی کی آنکھوں میں ستائش تھی، انھوں نے ثریا کی طرف اشارہ کر کے میری طرف دیکھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ دونوں جا کر خاموش بیٹھ گئیں۔ اتنی دیر میں دادی جان وہیل چیئر پر آ گئیں، ان کے ہاتھ میں کنگن کا سرخ ڈبہ تھا جو وہ آج ثریا کو یعنی اس گھر کی ہونے والی بہو کو دینے والی تھیں۔ کمرے میں ہم چار لوگ تھے، امی ثریا کے بالکل سامنے تھیں برابر میں دادی جان اور ثریا کے بائیں جانب میں۔

''بیٹا برقعہ تو اتارو...... ہمیں اپنا چاند جیسا چہرہ تو دکھاؤ۔'' دادی اماں نے کہا۔ پہلے سلمیٰ نے نقاب اتار کر گود میں رکھ لیا۔ وہ بھی بہت دلکش تھی، ثریا اب بھی زمین کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

''شرما رہی ہے...... دلہن تم خود اپنے ہاتھوں سے اپنی ہونے والی بہو کا چہرہ دیکھو...... تمھیں یاد ہے جب ہم تمھیں پہلی بار دیکھنے آئے تھے تو تم کتنا شرما رہی تھیں۔ صرف زمین کو تکے جا رہی تھیں۔'' دادی جان نے امّی سے مخاطب ہو کر کہا۔ امی ہنس پڑیں: ''مگر وہ تو پرانی بات ہے اب لڑکیاں کہاں شرماتی ہیں۔''

''نہیں بھئی...... ایسا بھی نہیں ہے۔ شریف گھرانوں کی باکردار لڑکیاں اب بھی شرماتی ہیں۔ کیونکہ حیا عورت کی فطرت میں ہی شامل نہیں بلکہ اس کا زیور بھی ہے۔'' دادی جان بولیں۔ میں نے امّی کو اشارہ کیا۔ امّی جیسے ہی اٹھیں، ثریا نے انہیں روک دیا۔

''آپ زحمت نہ کیجیے۔'' وہ بولی۔ پھر ایک نظر اس نے دادی جان اور امّی کو دیکھا پھر میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''آپ بھی جی بھر کے دیکھ لیجیے، پھر شاید ایسا حسین چہرہ آپ کو زندگی بھر دیکھنے کو نہ ملے۔''

یہ کہہ کر اس نے پھر میری جانب دیکھا۔ مجھے اس کی حسین اور دلکش شراب انڈیلتی آنکھیں کچھ بھیگی بھیگی سی لگیں۔ اس نے ایک ہاتھ سے نقاب کا بند کھولا اور چہرہ میری طرف کر دیا:

''اوہ تو......!!!'' میں حواس باختہ ہو گیا۔ دادی جان کرسی پر سے گرتے گرتے بچیں اور امّی کے ہاتھوں سے کنگن کا سرخ ڈبہ قالین پر گر گیا۔ ثریا کا جھلسا ہوا چہرہ ہم سب کے سامنے تھا۔ دائیں کان سے لے کر گردن تک گوشت ادھڑا ہوا تھا۔ اندر سے گلابی گلابی رنگ جھلک رہا تھا۔ جیسے کسی خونخوار جانور نے پنجے مارے ہوں۔ وہ روئے جا رہی تھی۔ سلمیٰ بھی رو رہی تھی اور میں اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپائے یوں بیٹھا تھا جیسے میرے جسم میں جان ہی نہ ہو۔ ایک بے حد اداس خاموشی کمرے میں تھی جس میں صرف ثریا کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔

''اب بتائیے منصور صاحب، اب آپ کیا کہتے ہیں؟ کیا اب بھی مجھ سے شادی کریں گے؟ بقول آپ کے آپ نے میری جیسی حسین آنکھیں نہیں دیکھیں!! تو میری آنکھوں کو تو کچھ نہیں ہوا، وہ تو پہلے جیسی ہی خوبصورت ہیں۔'' اس نے براہ راست مجھے مخاطب کر کے کہا۔ میرا تو سارا عشق رفو چکر

ہو گیا تھا دل ہی دل میں خود پر لاحول پڑھ رہا تھا کہ کیا مت ماری گئی تھی جو اس کی آنکھوں میں ڈوب گیا...... لاحول ولا قوۃ...... توبہ کہیں ایسے جلے چہرے والیوں سے بھی شادی کی جا سکتی ہے۔

''یہ سب ہوا کیسے؟ اور تم نے یہ بات منصور سے چھپائی کیوں۔'' امّی نے پوچھا۔

''آنٹی، چار سال پہلے ہم گڑھی شاہو میں رہتے تھے، ہمارا اینٹ کا پرانے وقتوں کا گھر تھا۔ کمرے کی کھڑکیاں گلی میں کھلتی تھیں، میں اس وقت تھرڈ ایئر میں پڑھتی تھی ہم تینوں بہنیں صبح ایک ساتھ گھر سے نکلتیں، سلمٰی اور ناصرہ اسکول چلی جاتیں اور میں کالج۔ اسی دوران محلّے کا ایک لڑکا زاہد مجھے آتے جاتے راستے میں نظر آنے لگا۔ وہ مجھے دیکھ کر کبھی فلمی گیت گنگنانے لگتا، کبھی سیٹیاں بجانے لگتا۔ مجھے اس سے ڈر لگنے لگا۔ ایک دن سلمٰی نے امی اور ابو کو بتا دیا کہ معاملہ کیا ہے۔ ابو بولے کہ محلے میں رہ کر دشمنی کیونکر پالی جا سکتی ہے اس لیے مجھے چاہیے کہ خاموش رہوں اور جواب نہ دوں، خود ہی ایک دن پیچھا چھوڑ دے گا۔ ہم نے یہی کیا۔ لیکن ہماری خاموشی نے اس کی ہمّت اور بڑھا دی۔ تب ایک دن ابو اور امی نے پڑوس میں رہنے والے مرزا حمید الدین اور چوہدری الیاس سے بات کی، وہ دونوں اسی وقت ابو اور امی کو لے کر زاہد کے گھر پہنچے اور اس کے والدین کو صورتحال سے آگاہ کیا۔ زاہد کی ماں یہ سن کر رو پڑیں۔ انھوں نے امی سے معافی مانگی اور یہ بھی بتایا کہ وہ آوارہ ہو گیا ہے، غلط صحبت میں پڑ گیا ہے اور کسی کی نہیں سنتا۔ اس کے والد نے بھی ابو سے معافی مانگی لیکن یہ بھی کہا کہ زاہد ان کے ہاتھوں سے نکل گیا ہے۔ گھر کے سب لوگ اس سے عاجز تھے۔ اسی رات کو پتہ چلا کہ زاہد کے والد اور اس کے بڑے بھائی نے اسے چار چوٹ کی مار ماری ہے، وہ کئی دن گھر سے نہ نکلا۔ ہم سمجھے وہ سدھر گیا لیکن یہ ہمارا خیال تھا۔ ایک ہفتے بعد میں کمرے میں کھڑی بھائی اور ابو کے کپڑے استری کر رہی تھی، گرمی کی وجہ سے کھڑکی کھلی تھی، پردہ ہٹا ہوا تھا کہ اچانک کسی نے مجھے نام لے کر آواز دی۔ میں نے غیر اختیاری طور پر کھڑکی کی طرف دیکھا جہاں سے آواز آئی تھی، کھڑکی سے لگا زاہد کھڑا تھا۔ میں ڈر گئی، تو اس نے مجھے آواز دی کہ میں ڈروں نہیں، وہ مجھ سے معافی مانگنا چاہتا ہے۔ میں ٹھٹھک گئی......''

اتنا کہہ کر ثریا بری طرح رونے لگی۔ میرے پاؤں تو جیسے زمین نے پکڑ لیے تھے۔

''باجی...... بس چلو یہاں سے'' سلمٰی نے بہن سے کہا۔

''نہیں بیٹا...... بات تو پوری ہونے دو'' دادی جان نے کہا۔

''بس وہی لمحہ میری زندگی بدل گیا۔ اس نے پھر کہا کہ میں کھڑکی کے قریب آ جاؤں، وہ مجھ سے معافی مانگنا چاہتا ہے۔ میں خوش ہو کر جیسے ہی کھڑکی کے قریب پہنچی۔ اس نے تیزاب سے بھری بوتل میرے منہ پر پھینک دی اور خود یہ کہتا ہوا بھاگ گیا کہ:

''بہت غرور تھا اپنے حسن پر اب ساری زندگی رو کہ تجھ سے اب کوئی شادی نہ کرے گا۔ میں

تجھ سے پیار کرتا تھا تو نے میری شکایت لگائی۔ مجھے پٹوایا۔‘‘

’’مجھے ہوش نہ رہا...... چیختی چلاتی باہر بھاگی اور گر کر بیہوش ہوگئی۔ اماں، ابا، بھیا اور محلے کے لوگ چیخ پکار سن کر جمع ہو گئے۔ جب میری آنکھ کھلی تو میرا پورا چہرہ پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا۔ میرا بیان لیا گیا اور زاہد کو گرفتار کرلیا گیا۔ زاہد کے والدین میرے کمرے میں موجود تھے۔ وہ لوگ رو رو کر معافی مانگ رہے تھے۔ لیکن انھوں نے زاہد کو چھڑانے کی کوئی کوشش نہ کی، وہ بہت اچھے لوگ تھے۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ اگر میں منہ دوسری طرف اچانک پھیرتی تو میری آنکھیں بھی جھلس سکتی تھیں...... لیکن آنکھیں باقی رہ گئیں...... تاکہ میں پل پل مرسکوں...... میری آنکھوں کی خوبصورتی سے متاثر ہوکر لوگ میرے طلبگار ہوئے اور جب حقیقت کھلی تو شاید خود پر نفرین کرنے لگتے ہوں گے۔‘‘

اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’تمھارے والدین نے پلاسٹک سرجری کیوں نہ کروالی۔‘‘ امی نے اس سے پوچھا۔

’’آنٹی جہاں کمانے والا ایک اور کھانے والے سات ہوں وہ بھی اس طرح کہ گوشت مہینے میں صرف ایک بار پکتا ہو وہاں پلاسٹک سرجری کے متعلق کون سوچ سکتا تھا۔‘‘

’’آگے کہو...... پھر کیا ہوا‘‘ دادی جان نے ہمدردی سے پوچھا۔

’’چند ماہ تو میں بستر پر ہی رہی...... میں سمجھتی تھی کہ زندگی میرے لیے ختم ہوگئی۔ اماں، ابا الگ میری طرف سے فکرمند رہنے لگے۔ ڈر یہ تھا کہ زاہد جب چھوٹ کر آئے گا تو کہیں مزید نقصان نہ پہنچائے۔ محلے والوں نے ابا کو مشورہ دیا کہ وہ یہاں سے کہیں اور چلے جائیں۔ پہلی فرصت میں اماں نے مجھے خالہ کے گھر بھجوادیا اور دونوں چھوٹی بہنوں کا اسکول جانا بند کرادیا۔ خالہ پیسہ اخبار گلی انارکلی میں رہتی تھیں۔ جب میں وہاں گئی تو ایک دن ایک عیسائی عورت ملنے آئی جو خالہ کی ہمسائی تھی اور ان کی سہیلی بھی۔ وہ بے حد کالی تھی، ہنستی تھی تو سفید سفید دانت چمکتے ہوئے عجیب سے لگتے تھے۔ سیاہ طباق جیسا چہرہ جس پر آنکھوں کے سفید ڈھیلے ایسے لگتے تھے جیسے کوئلوں کی بوری پر کبوتر کے دو انڈے رکھ دیئے ہوں۔ لیکن وہ بڑی زندہ دل تھی، ایک سرکاری اسپتال میں نرس تھی، اکیلی رہتی تھی ایک لڑکی کو اڈاپٹ کیا ہوا تھا البتہ خود شادی نہیں کی تھی۔‘‘

اتنی دیر میں ملازم چائے اور دیگر لوازمات کی ٹرالی دھکیلتا ہوا آگیا۔ لیکن جیسے ہی ثریا کے چہرے پر نظر پڑی اس کی آنکھیں ایک دم پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ امی نے اسے واپس بھیج دیا اور خود چائے بنانے لگیں۔

’’آج تو چائے پیو گی۔‘‘ میں نے جیسے طنزاً کہا وہ سمجھ گئی، بولی۔

’’جی ہاں...... ضرور...... کیونکہ آج آپ کو وجہ پتہ چل گئی میرے چائے نہ پینے کی۔‘‘

’’پھر کیا ہوا......‘‘ امی جان نے یوں دلچسپی دکھائی جیسے طلسم ہوشربا سن رہی ہوں۔

’’کوئی خاص نہیں، کوئی معجزہ نہیں ہوا۔ وہ عورت جس کا نام مریم تھا روز میرے پاس آکر بیٹھتی اور باتیں کر کے میرا جی بہلاتی۔ ایک دن اس نے مجھ سے کہا کہ جو ہونا تھا ہو چکا اب مجھے دنیا کا سامنا کرنا چاہیے اور اپنی تعلیم مکمل کر کے اپنے والدین کا سہارا بننا چاہیے۔ اس نے مجھے اپنی زندگی میں شریک کر لیا اور بتایا کہ وہ جب پیدا ہوئی تو اتنی کالی تھی کہ اماں ہنس کر کہتی کہ رات کو بغیر روشنی کے یہ مجھے نظر ہی نہیں آتی۔ مریم کے دوسرے بہن بھائی اتنے سیاہ نہ تھے۔ کسی حد تک وہ سب خوش شکل بھی تھے۔ لیکن وہ اپنے بھدّے نقوش اور سیاہ رنگت کی وجہ سے الگ تھلگ رہتی تھی۔ تب اسے ایک نن نے زندگی کا مقصد سمجھایا اور کہا کہ بجائے شادی کا انتظار کرنے کے وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرے، ملازمت کرے اور زندگی کو دکھی انسانیت کے لیے وقف کر دے۔ کیونکہ اس روئے زمین پر ایک موٹی، بھدّی اور بدشکل لڑکی کی شادی اسی وقت ہو سکتی ہے جب وہ کسی بیوروکریٹ، سیاستدان یا سرمایہ دار کی بیٹی ہو، نیز یہ کہ شادی زندگی کی معراج نہیں ہے۔ زندگی کی معراج یہ ہے کہ دوسروں کے لیے زندہ رہو۔ بس پھر مریم کی زندگی کا ڈھرّا بدل گیا، اس نے گریجویشن کیا، نرسنگ کا کورس کیا اور ملازمت ملتے ہی ایک ایسی بچی کو اڈاپٹ کر لیا جس کی ماں اس کی پیدائش کے فوراً بعد مر گئی تھی۔‘‘

میں مبہوت ہو کر اس کی کہانی سن رہا تھا۔ دادی جان اور امی بھی ایسی خاموشی سے اس کی باتیں سن رہی تھیں جیسے ذرا بھی بولیں تو جانے کیا ہو جائے۔ اس نے چائے کا خالی کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور امی کی طرف دیکھ کر اس نے اپنا دوپٹہ چہرے کے اس حصے پر ڈال لیا جو جھلسا ہوا تھا، پھر بولی۔

’’بس آنٹی، مریم نے میری زندگی بدل دی۔ میں نے گریجویشن کیا اور پھر پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے اکنامکس میں ماسٹرز کیا۔ اس عرصہ میں ابا نے وہ مکان بیچ دیا اور مریم کی مدد سے خالہ کے گھر کے قریب ہی ایک پرانا سا مکان دلوا دیا۔ میں جس بینک میں ملازم ہوں وہاں کے مینیجر صاحب کو میرا سارا حال معلوم ہے۔ مجھے ان کے پاس حمیرہ لے کر گئی تھی کیونکہ صرف حمیرہ ہی جانتی ہے کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔‘‘

’’تم نے یہ نہیں بتایا کہ منصور کو دھوکے میں کیوں رکھا؟‘‘ امی نے پوچھا۔

’’معاف کیجیے گا لیکن میں نے ایسا اس لیے کیا کہ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ جو شخص صرف میری آنکھیں دیکھ کر میرا دیوانہ ہو رہا ہے کیا وہ بھی حقیقت کھلنے پر ایک عام سا مرد ثابت ہوتا ہے یا وہ دوسروں سے مختلف ہے۔ میں آپ کے بیٹے کو آئینہ دکھانا چاہتی تھی۔ دنیا کا ہر مرد صرف خوبصورت چہرے کا پجاری ہوتا ہے۔ خواہ قالب میں کتنی ہی بدصورت روح موجود کیوں نہ ہو۔ حسن ہی حقیقت ہے اور کچھ نہیں۔ یہ صرف کتابی باتیں ہیں کہ حسن کھال کے نیچے ہوتا ہے۔ قلب میں ہوتا ہے۔ دل میں ہوتا ہے۔ سب ڈھکوسلا ہے۔ آج تک کسی فلم کی، ناول کی یا داستان کی ہیروئن کوئی بدصورت لڑکی ہوئی ہے؟ البتہ میں کسی مالدار گھرانے میں جنم لیتی تو آپ کے بیٹے جیسے دس نوجوان قطار میں لگ کر شادی کی درخواست پیش کرتے۔‘‘

''ایک بات میں بھی کہنا چاہتی ہوں۔''سلمٰی نے امی اور دادی جان کی طرف دیکھ کر کہا۔

''ہاں...... ہاں بولو بیٹی'' دادی جان نے شفقت سے کہا۔

''باجی نے شروع ہی سے ہر بات مجھے بتادی تھی لیکن امی کو یا کسی اور کو اس بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ کیونکہ وہ لوگ یہ سب جان کر بہت دکھی ہو جائیں گے۔ اسی لیے ہم دونوں نے یہاں اکیلے آنے کا فیصلہ کیا تھا...... ورنہ ہمارا وہ ماحول نہیں ہے کہ لڑکیاں خود ہی اپنی سسرال بردکھوے کے لیے چلی جائیں۔''

''اور اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں اپنا چہرہ دکھا کر منصور صاحب کے چہرے کے بدلے رنگ بھی اپنی ان خوبصورت آنکھوں سے دیکھنا چاہتی تھی جن کے عاشق منصور صاحب تھے جنھیں میری آنکھوں کے علاوہ دنیا میں کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔''

اس نے کٹیلے لہجے میں کہا اور اپنی نقاب دوبارہ چہرے پر لگالی۔اب پھر وہی دو قاتل آنکھیں، شراب انڈیلتی آنکھیں میرے سامنے تھیں۔جن کے سحر میں ڈوب کر میں خود کو فراموش کر بیٹھا تھا۔

☆......☆......☆

دوسرے دن دوپہر ایک بجے میرے پاس ثریا کا فون آیا...... وہی کھنکتی آواز جلترنگ بجاتی ہوئی، لیکن آج اس آواز نے میرے جذبات کو بالکل بھی نہ چھیڑا۔

''منصور صاحب، ایک آخری بات کہنے کی اجازت چاہتی ہوں پھر کبھی آپ میری آواز نہ سن سکیں گے۔''

''کہیے۔''میں نے بے دلی سے کہا۔

''پہلی بات تو یہ کہ میرے جلے ہوئے چہرے کی کہانی اپنے دوست احباب اور میرے بینک میں بیان نہ کیجیے گا کہ میں گھر کی واحد کفیل ہوں۔ یہ سب مجھ سے سہا نہیں جائے گا اور دوسری بات یہ کہ آپ کی شکر گزار ہوں کہ آپ کی وجہ سے میں نے محبت کی خوشبو کو محسوس کیا۔منصور صاحب، میں بھی آپ کو چاہنے لگی تھی اس لیے میں جواب نہیں دیتی تھی کہ جس دن آپ کو حقیقت کا پتہ چلے گا اس دن سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ کیکٹس میں ایک بار پھول کھلتا ہے، میرے کانٹوں بھرے وجود میں بھی محبت کے پھولوں نے جنم لیا تھا۔کم از کم آپ کی وجہ سے مجھے یہ تو پتہ چلا کہ پیار کسے کہتے ہیں۔لوگ کہتے ہیں کہ محبت غیر مشروط ہوتی ہے! شاید صحیح کہتے ہیں کہ میں نے اپنی چاہت کے بدلے آپ کو صرف سچ بتایا۔آپ سے مانگا کچھ نہیں! کیونکہ آپ کی نام نہاد محبت میرے دلکش چہرے سے مشروط تھی نہ کہ تیزاب سے جھلسے ہوئے چہرے سے۔اگر آپ کی محبت سچی ہوتی تو آپ میرا علاج کرواسکتے تھے پلاسٹک سرجری کے ذریعے لیکن......''

''اوہ Rubbish میں نے جھنجھلا کر فون بند کر دیا...... ایک لمحہ کو اس کا جھلسا ہوا چہرہ میرے سامنے آگیا۔کتنا پاگل تھا میں بھی......؟؟؟

☆☆☆

توشہ دان

• منیرہ سورتی

حسنی کے چہرے پر شب بیداری کی تھکن کا تو کوئی نشان نہیں تھا، لیکن بے چینی اور بے صبری صاف عیاں تھی، وہ اپنے کمرے کی کھڑکی پر جھکی دھیرے دھیرے طلوع ہوتی صبح کو یوں تک رہی تھی جیسے امید کرتی ہو کہ اسکے انتظار کی شدت اس ملگجی سی صبح کو دفعتا ایک چمکدار روشن دن میں بدل دیگی، دیکھتے دیکھتے نیچے سڑک پر صبح کی مخصوص چہل پہل بڑھنے لگی اور ساتھ ہی اجالا بھی پھیلنے لگا حسنی نے بے چینی سے پہلو بدلا، کھڑکی سے ہٹ کر کمرے میں آئی، الگنی پر ٹنگا برقع اٹھایا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

دن اب بھی پوری طرح روشن نہیں ہوا تھا۔

زینہ اترتے اترتے اس نے برقع پہنا اور تیز قدموں سے مارکیٹ جانے والی سڑک کی طرف مڑ گئی، نئی نویلی صبح کی فرحت بخش تازگی ہوا میں گھل رہی تھی، چہکتی ہوئی چڑیوں کی ڈار فضا میں موسیقی بکھیر رہی تھی، نکڑ والے پارک میں موگرا مہک رہا تھا اور دور کہیں لوگ ہنس رہے تھے، حسنی نے آہستہ سے نقاب الٹ دیا اور ایک گہرا سانس بھرا مانو زندگی سے معمور ان لمحوں کو اپنے اندر اتار لینا چاہتی ہو۔

مارکیٹ بس چند قدم دور تھی۔

مارکیٹ میں داخل ہوتے ہی اس نے دیکھا کہ ساری دکانیں انتہائی سست رفتاری سے بیدار ہو رہی ہیں، کچھ لوگ چائے پی رہے ہیں، کچھ دکاندار کے سامنے چھڑکاؤ کر رہے ہیں اور کچھ تازہ سبزیاں ٹرک سے اتار رہے ہیں، حسنی نے اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالی اور فکر مندی سے سوچنے لگی کہ وہ سارا کام وقت پر کیسے نمٹا پائیگی کہ اچانک اسکے پاس سے ایک آٹو رکشا گزرا اور حسنی نے ایک نظر میں دیکھ لیا کہ رکشا کے اندر دو

تازہ کٹے ہوئے بکرے رکھے ہیں جن کی کھالیں اتری ہوئی ہیں، رکشا تیزی سے آگے بڑھ گیا اور حسنی تیز قدموں سے اسکے پیچھے پیچھے چل پڑی۔
قصائی کی دوکان تک پہونچتے پہونچتے اسکی سانسیں بے ترتیب ہوگئیں لیکن اسکے چہرے پر اطمینان بھری خوشی چھلک رہی تھی، وہ ابھی اپنی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی کہ قصائی نے ایک سالم بکرا اٹھا کر اسکی گردن چھت سے لٹکتے کھونٹے میں بے دردی سے پیوست کر دی، حسنی کے منہ سے بے اختیار سسکی نکل گئی، قصائی نے پلٹ کر اسکی طرف دیکھا اور بے نیازی سے مسکرا دیا۔
چھت سے لٹکتے سالم بکروں کی رنگت ہلکی نیلگوں مائل تھی اور انمیں سے ہلکا ہلکا دھواں سا اٹھ رہا تھا، جیسے آگ کے سلگنے سے پہلے اٹھتا ہے، حسنی کو جھرجھری سی محسوس ہوئی، اس نے نظریں ہٹالیں اور دیکھا کہ نیچے بچھے ہوئے ایک تختے پر گوشت کے پارچے قرینے سے سجے ہوئے ہیں، حسنی کی نظریں ان پر ٹک گئیں، سینے میں پیوستہ نفیس پسلیاں، سیدھی سپاٹ ہڈیاں، ٹانگوں کی مچھلیوں کا ابھرا ہوا سرخ گوشت، انکا جاذب کٹاؤ اور گھماؤ، ان میں سے اٹھتی اور ہوا میں گھلتی، تازگی کی ہلکی سی کسیلی بو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔حسنی نے بے اختیار ان پر اپنی انگلیاں رکھ دیں، گوشت گرم تھا اچانک وہ پھڑکا، حسنی نے فوراً اپنا ہاتھ کھینچ لیا، وہ گرم پھڑکتا ہوا لمس اسکی انگلیوں میں گھلنے لگا، اس نے فوراً اپنی مٹھی بھینچ لی۔
ایکدم تازہ ہے، بہن جی،، قصائی نے مسکرا کر کہا، حسنی جھینپ گئی۔
دوبارہ سبزی مارکیٹ سے گزرتے ہوئے اسکی چال مطمئن تھی گوشت کے گرم پارچوں سے بھرا تھیلا اس نے اپنے کندھے سے لٹکا رکھا تھا، سبزی منڈی اب سج چکی تھی، دوکانوں پر سجی سبزیوں کو غور سے دیکھتے ہوئے اس نے ایک چکر کاٹا اور ایک دوکان پر رک کر سبزیاں چھننے لگی، سبزیوں کے رنگ، خوشبو، اور خاص طور سے انکی شکل یا وضع قطع دیکھ کر انکا انتخاب کرتے ہوئے اسے اپنی پھوپھی یاد آگئیں جو کہا کرتی تھیں کہ ""جسکی جیسی شکل ہوتی ہے وہ ویسی ہی سبزی پسند کرتا ہے"" حسنی کے ہونٹوں پر دبی دبی سی مسکراہٹ آگئی، کیا ہو اگر وہ یہ بات سبزی والے کو بتا دے؟
خریداری ختم کر کے وہ گھر پہونچی تو دیکھا کہ اسکی اکلوتی بیٹی آمنہ اسکول جانے کے لئے تیار ہو رہی ہے حسنی نے اس پر اچٹتی سی نظر ڈالی اور برقع ایک طرف ڈال کر فوراً باورچی خانے میں گھس گئی، آمنہ نے غور سے ماں کو دیکھا اور منہ ہی منہ میں بدبدائی،
""آج پھر وہی دن ہے""
چند پل کے توقف کے بعد اس نے اونچی آواز میں ماں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا
""امی میرا لنچ باکس۔۔۔""
حسنی نے سبزیاں ایک پرات میں نکالتے ہوئے جواب دیا،

"آج کینٹین میں کھالینا بنو، امی کو بہت کام ہے، ناشتہ تو کرلیانا"
آمنہ نے خاموشی سے اسکول بیگ اٹھایا اور باہر نکل گئی۔
بیٹی کے جاتے ہی حسنی نے دروازہ بند کیا، دوپٹہ اتار کر پھینکا، سیلینگ فین تیز کیا اور گوشت کے پارچوں کو ایک تھال میں سجا کر ان پر مصالح لگانے بیٹھ گئی، پارچوں کو چھوتے ہی پھر وہی سنسنی اسکی انگلیوں میں دوڑنے لگی، اس نے ایک پارچہ احتیاط سے اٹھایا اور بے اختیار اسے سونگھنے لگی، تازگی کی مہک کے ساتھ خون کی کسیلی بو جونہی اسکی ناک میں گھلی اسے محسوس ہوا جیسے وہی نیلگوں دھواں اسکے اندر بھر رہا ہے، اس نے پارچہ فورا پرات میں رکھ دیا اور کچھ دیر ساکت بیٹھی رہی۔
گوشت پر پورے اہتمام سے مصالح لگا کر فرج میں رکھ دینے کے بعد حسنی نے ترکاریاں چھیلنی شروع کیں، ان کے تازہ کھلے ہوئے چمکدار رنگ، انکی بجی ڈھلی شکلیں اور ان سے اٹھتی ہلکی ہری بھری خوشبو اسے اسقدر خوشگوار محسوس ہوئی کہ ان پر چھری چلاتے ہوئے وہ کئی کئی بار رک گئی، سبزیوں کی جلد بے حد احتیاط اور مہارت سے اتارتے ہوئے وہ بار بار یہ سوچ کر مسکرائی کہ سارے پڑوس میں اتنی نفاست سے جلد اتارنے کے باعث وہ خاصی مقبول ہے۔
مقبولیت کا یہ سلسلہ دراصل ایک شرط جیتنے کے بعد شروع ہوا تھا جو اس کی سہیلی بلقیس اور اس کے درمیان لگی تھی، ہوا یوں کہ اس رات بلقیس کے شوہر احمد حسب معمول ایک سال بعد دبئی سے لوٹ رہے تھے، بلقیس انکے استقبال کی تیاری کر رہی تھی اور یہ محض اتفاق تھا کہ حسنی وہاں موجود تھی اور بلقیس کی جھنجھلاہٹ سے محظوظ ہو رہی تھی، جو لاکھ کوشش کے باوجود سموسے کے پاپڑ اتنے مہین نہیں بیل پا رہی تھی جیسے اسکے شوہر کو پسند تھے، حسنی اسے چھیڑنے لگی تو بلقیس نے غصے میں اسے چیلینج کر دیا، حسنی نے شرط منظور کی اور نہ صرف یہ کہ شرط جیت گئی بلکہ احمد بھائی کا دل بھی، اب وہ جب بھی چھٹیوں میں گھر آتے، سموسوں کی فرمائش کرتے، حسنی ان کے لئے سموسے بنا کر بھیجتی، حالانکہ بلقیس اب مہین پاپڑ بیلنا سیکھ گئی تھی لیکن حسنی اسکی ایک نہ سنتی یہ اور بات ہے کہ احمد بھائی کو ہرگز پتہ نہ چلتا کہ منہ میں گڑ کی ڈلی کی طرح گھل جانے والے سموسے حسنی بناتی ہے وہ بلقیس کے ہاتھ چومتے نہ تھکتے، جس کا حال حسنی کو سنانا بلقیس ہرگز نہ بھولتی۔

جلد اتارنے کے بعد اس نے ترکاریوں کے بلکل ہموار اور یکساں ٹکڑے کرنے شروع کیے اور خصوصی خیال رکھا کہ انکی شکلیں تھوڑی بیضوی اور نوکیلی ہوں، نوکیلی شکلیں اور کڑوی کسیلی خوشبوئیں اسے کیوں اتنی پسند تھیں یہ خود حسنی نہیں جانتی تھی، وہ صرف اتنا جانتی تھی کہ اسے یہ سب بے حد دلچسپ اور پراسرار محسوس ہوتا ہے، ایک عجیب سی دردبھری لذت لئے ہوئے جو حیرت انگیز طور پر راحت بخش بھی ہے۔
یہ انہونی راحت اس نے دریافت نہیں کی تھی بلکہ وہ خود بخود اسکی زندگی میں در آئی تھی، جیسے تپتی ہوئی

دوپہر کے سنسان سناٹے میں ہوا کا خوشگوار جھونکا ہولے سے در آتا ہے اور ساری فضا خواب آگیں ہو جاتی ہے۔

گوشت چولہے پر چڑھانے سے پہلے وہ سوچنے لگی کہ کیوں نہ وہ تھوڑے سے گوشت کے کباب بھی بنالے، اس نے فوراً گھڑی پر نظر ڈالی ظہر کا وقت ہو چلا تھا اور ابھی کافی کام باقی تھا، اس نے تیزی سے قیمہ تیار کرنا شروع کیا، پھر کوئلے کی انگیٹھی سلگانے صحن میں پہونچی ہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی حسنی کو کوئی ہوش نہیں تھا کہ اس کا فون صبح سے کہاں ہے، فون بازار کے تھیلے میں تھا، جب تک وہ اسے ڈھونڈھ نکالتی وہ بند ہو گیا، مس کال اسکی عزیز ترین سہیلی شہناز کی طرف سے تھی، حسنی نے پل بھر تک کچھ سوچا پھر فون رکھ کر انگیٹھی سلگانے لگی، پھر سرعت سے باورچی خانے میں آئی اور ترکاریوں کو یکے بعد دیگرے چولہوں پر چڑھانے کے اہتمام میں لگنے لگی کہ دفعتاً اسے یاد آیا کہ پیاز تو اس نے کاٹا ہی نہیں۔

کچھ دیر بعد ہی آمنہ اسکول سے واپس لوٹ آئی، اسے دیکھتے ہی حسنی کو دھیان آیا کہ آمنہ کے کھانے کا کوئی انتظام نہیں ہوا ہے اس نے جلدی سے فرج کھولا اور ڈبل روٹی نکالتے ہوئے بیٹی سے کہا،

''تم منہ ہاتھ دھولو میں جلدی سے ڈبل روٹی پر مکھن لگا دیتی ہوں''

آمنہ نے ماں کی طرف پل بھر تک دیکھا پھر تنک کر بولی،

''میں بڑی امی کے پاس جا رہی ہوں'' اور باہر نکل گئی

آمنہ ساتویں جماعت میں پڑھتی تھی، اور اپنی نانی کی بے حد لاڈلی تھی، جنکا گھر پڑوس کے محلے میں ہی تھا، نانی کے گھر میں داخل ہوتے ہی آمنہ نے اپنا اسکول بیگ ایک طرف ڈالا اور خود دروازے کے پاس بچھے پلنگ پر دھم سے گر پڑی، نانی نے چونک کر اسے دیکھا اور اپنا کام چھوڑ کر اس کے پاس آگئیں،

''کیا ہوا رانی بٹیا، کیا امی گھر پر نہیں ہیں''

''ہیں'' آمنہ نے جواب دیا

''کیا ہوا، امی نے ڈانٹ بتادی''

''انہیں ڈانٹنے کی بھی فرصت نہیں ہے آج''

''ہیں۔۔۔! اچھا۔۔۔۔تو آج پھر وہی دن ہے''

''ہاں بڑی امی،۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اور یہ دن اب آئے دن آتا رہتا ہے''

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد آمنہ نے پھر کہا،

''امی کو یہ کیا ہو جاتا ہے بڑی امی''

''کچھ نہیں ہوتا بٹیا، بس اسے کھانا پکانے کا کچھ زیادہ شوق ہے اور کیا''

''جی نہیں، انہیں کچھ ہو جاتا ہے، وہ جیسے اس دنیا سے غایب ہو جاتی ہیں کسی اور دنیا میں پہونچ جاتی ہیں''

نانی کے ماتھے کی لکیریں گہری ہو گئیں وہ کچھ دیر تک خاموش رہیں پھر دھیمے لہجے میں بولیں،
"تمہارے ابا کی جوان موت کے بعد بہت اکیلی ہو گئی تمہاری امی، بس کسی نہ کسی مشغلے میں مشغول رہتی ہے تا کہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔"
نانی نے بمشکل اپنے آنسوؤں کو روکا۔
"لیکن یہ کوئی مشغلہ ہے بڑی امی، مانا کہ شہناز آنٹی اور دوسری سب آنٹیاں امی کی بیسٹ فرینڈز ہیں لیکن اسکا یہ مطلب..........اور وہ سب خود کیوں نہیں ۔۔۔۔۔شوہر تو وہ انکے ہیں نا"
آمنہ کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں، نانی نے بڑی شفقت سے اسے گلے لگایا اور اسکے سر پر ہاتھ پھیرتی رہیں۔

حسنی کی نفیس انگلیوں کا جادو محض دستر خوان تک محدود نہیں تھا بلکہ انکی کاریگری سنگھار میز پر سر چڑھ کر بولتی تھی، ہجر کی میلی اداس اور گدلی دھول سے اٹے جسموں کو ابٹن، دودھ اور مختلف تیلوں سے اجال کر، مہندی اور عطر کی خوشبوؤں اور جنگلی بوٹیوں کے دھوئیں میں بسا کر انہیں وصل کے پر شوق انتظار اور امید کے گہنوں سے سجانے کا فن جیسا حسنی کے ہاتھوں میں تھا کسی اور ہاتھ میں نہیں تھا۔

ترکاریوں سے نمٹ کر حسنی آٹا گوندھنے بیٹھ گئی، ابھی قورمہ، پسندے اور دو پیازہ کی تیاری بھی کرنی تھی، اس کے ہاتھ تیز چلنے لگے مگر جیسے جیسے آٹا گندھتا گیا، حسنی سب کچھ بھول کر اسمیں محو ہونے لگی، وہ گندھے ہوئے آٹے کو دونوں ہتھیلیوں کے بیچ بار بار دباتی، اسکے لمس کے دلپزیر گداز کو محسوس کرتی یہاں تک کہ اسکی آنکھیں نم ہو گئیں۔
سارے کام ختم ہوتے ہوتے شام ڈھلنے لگی، تب حسنی نے شہناز کو فون کرنے کی سوچی اور نمبر ڈائل کیا،
" ہلو شہناز، تم نے فون کیا تھا"
"ہاں حسنی، میں کہہ رہی تھی تمہیں مدد کی ضرورت ہو تو میں آجاؤں تم تھک گئی ہو نگیں"
"میں نہیں تھکتی ہوں، تم بتاؤ تم نے تیاری کر لی یا نہیں"
"ہاں کر لی"
"کب تک آجائینگے تمہارے سلیم بھائی"
شہناز ہنس پڑی......"بھائی تو وہ تمہارے ہیں بھنو، وہ اسی فلائٹ سے آرہے ہیں ہمیشہ کی طرح، رات نو ساڑھے نو بجے تک گھر پر ہو نگے"
"مگر تم نے تیاری اتنی جلدی۔۔۔۔۔ذرا بتاؤ تو کیا کیا"
"وہ جو نیا جوڑا ماسٹر کو دیا تھا وہ لے آئی ہوں اور دوپٹے پر بیل بھی ٹانک دی ہے"

''مگر ہم نے طے کیا تھا کہ تم ساری پہنو گی، ہے نا''

''حسنی، ساری میں جھنجھٹ ہے کوئی کام ہی نہیں کر پاتے، بس پہن لو اور بیٹھ جاؤ''

''تو تمہیں اور کرنا کیا ہے تم بیٹھ جانا یا پھر لیٹ جانا'' یہ کہتے ہی حسنی کو بے ساختہ ہنسی آگئی اور اگلے ہی پل جھینپ گئی،

''اچھا، مہندی لگوا لی''

''ارے نہیں حسنی، مجھ سے گھنٹوں مہندی کے لئے بیٹھا نہیں جائیگا، مہندی رہنے دیتے ہیں''

''مہندی ضرور لگیگی، یاد نہیں مہندی کی خوشبو سلیم بھائی کو کتنی پسند ہے، تم ایسا کرو پنکی بیوٹی پارلر سے رضیہ کو بلوا لو اسکے ہاتھ تیز چلتے ہیں آدھے گھنٹے میں دونوں ہاتھ نمٹا دیگی''

''ٹھیک ہے، تمہاری بات کیسے ٹال سکتی ہوں''

''اور بلاؤز''

''وہی جو تم نے پسند کیا ہے، راجستھانی چولی۔۔۔''

''شاباش۔۔۔اچھا، مجھے ابھی بہت کام ہیں''

حسنی نے فون ڈسکنکٹ کر دیا۔

اسکے باوجود کہ بہت سی عورتیں اسکی مہارت سے فیض یاب ہونا چاہتی تھیں، ہر کسی کی رسائی حسنی تک نہیں تھی، دلہنوں اور کنواری لڑکیوں کو وہ یکسر نظر انداز کر دیا کرتی تھی، صرف وہ عورتیں جن کی جوانیاں اپنے پردیسی شوہروں کے انتظار میں کمھلا رہی تھیں، اسکی نظر عنایت کی مستحق تھیں۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ حسن اور سنگھار کے آزمودہ نسخے جو حسنی پر نہ جانے کہاں سے منکشف ہوا کرتے، خود اسکے لئے بے معنی تھے، اسے اپنے سنگھار سے قطعی دلچسپی نہیں تھی، اسکی خوبصورتی خیرہ کن تو نہیں تھی مگر اسکے چہرے کی سادہ شفاف معصومیت پہلی نظر میں دل میں ایک گداز پیدا کر دیتی تھی اور اسکی روشن کشادہ بولتی ہوئی آنکھیں بولتی کم اور سنتی زیادہ تھیں۔

ساری ڈشیں تقریباً تیار تھیں، میٹھے کے لئے کسٹرڈ تو اس نے کل رات ہی جما کر فرج میں رکھ دیا تھا، حسنی نے اطمینان بھری نظر ساری دیگچیوں پر ڈالی اور تولیہ لیکر غسل خانے کی طرف بڑھ گئی۔

مغرب کی نماز کے بعد آمنہ گھر لوٹ آئی اور یونیفارم بدل کر فوراً ہی رضائی لپیٹ کر بستر میں جا لیٹی، حسنی نے اس کی طرف دیکھ کر آواز دی،

''کھانا تیار ہے بٹو، کھا لو''

''میں بڑی امی کے یہاں کھا آئی ہوں'' آمنہ نے اپنا سر رضائی میں لپیٹتے ہوئے کہا،

حسنی نے گیلے بال جھٹک کر ڈھیلی سی چوٹی گوندھی اور صحن میں رکھے گملے سے ایک موگرے کی کلی توڑ کر بالوں

میں سجانے لگی تھی کہ اسکی نظر دیوار پر ٹنگے آئینے پر پڑی، وہ رک گئی، موگرے کی کلی کو اپنی ہتھیلی پر رکھ کر دیکھتی رہی پھر اسے سونگھنے لگی، پھر لاپرواہی سے اسے ایکطرف اچھال کر کھانا اتارنے بیٹھ گئی، مختلف ڈشز کو الگ الگ ڈبوں میں رکھتے ہوئے اس نے ترتیب کا خاص دھیان رکھا، سب سے پہلے آلو ٹماٹر کی چٹ پٹی سبزی، پھر کریلہ اور قیمہ، پھر میٹھا کسٹرڈ، پھر پنیر پالک مٹر، پھر دوسرا میٹھا، بس پھر شامی کباب، دو پیازہ اور روٹی اور آخر میں سیخ کباب، نہیں آخر میں سلاد رکھنا اسے صحیح لگا، اس نے اس ترتیب پر ایکبار اور نظر ڈالی اور پھر مطمئین ہو کر پڑوس کے لڑکے راجو کو آواز دینے کے لئے باہر نکل گئی۔

راجو کو توشہ دان کے ساتھ روانہ کرنے کے بعد وہ یونہی کمرے میں ٹہلنے لگی، پھر ایک دھن گنگنانے لگی، پھر کمرے کی دیوار پر نمودار ہونے والے اپنے سایے کو تکنے لگی، پھر ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑنے کی کوشش کرنے لگی اور پھر ایکدم جھینپ کر ہنسنے لگی۔

کچھ دیر بعد اسنے شہناز کو فون لگایا،

''توشہ دان پہونچ گیا''

''ہاں''

'' وہ آگئے''

''ہاں''

''کیسے ہیں''

شہناز کی ہنسی شرمیلی سی تھی وہ کچھ نہیں بول پائی،

حسنی بھی خاموش رہی پھر بولی

''اچھا چل کل بات کرتے ہیں''

فون ڈسکنکٹ کر کے حسنی نے ایک نظر آمنہ کی طرف دیکھا وہ سو رہی تھی، اس نے کمرے کی بتی بجھا دی اور تیزی سے باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی، مگر اندر پہونچتے ہی اسکے قدم یکبارگی جم گئے، باورچی خانہ ایکدم سنسان پڑا تھا، چولہے ٹھنڈے ہو چکے تھے، خالی دیگچیاں منہ کھولے اسے تک رہی تھیں، ہوا میں بسی ہوئی مسالوں کی ملی جلی خوشبو باسی ہو چلی تھی، یکلخت ساری دنیا پر خاموشی چھا گئی۔

پھر اسکی نظر انگیٹھی کی طرف گئی جسمیں سے دھیما دھیما دھواں اٹھ رہا تھا، وہ اس دھویں کو دیکھتی رہی، پھر آگے بڑھ کر انگیٹھی کے پاس بیٹھ گئی، اور چمٹے سے کوئلوں کو ہلکے ہلکے کریدنے لگی، وہ ایکدم دہک اٹھے، حسنی نظریں جمائے انہیں دیکھتی رہی پھر انگیٹھی کی تہہ میں جمی راکھ چمٹے سے اٹھا اٹھا کر ان کوئلوں پر بچھانے لگی۔

☆☆☆

اگلے جنم مجھے بٹیا نہ کی جو......

• نصرت شمسی

عمر کے تیس پڑاؤ میں نے اس دہلیز پر گزارے ہیں۔ عمر کی تیس بہاریں میں نے اس چوکھٹ پر بیٹھ کر دیکھی ہیں، اور پچھلے پانچ سالوں سے مجھے اس شہزادے کا انتظار ہے جو میری آنکھوں میں سمایا ہوا ہے۔ جب میں آنکھیں بند کرتی ہوں تو وہ اپنا طلسماتی وجود لیے آن کی آن میں میرے تخیلات کے کینوس پر چھا جاتا ہے اور مند مند مسکراہٹوں سے مجھے الگ الگ زاویوں سے دیکھتا رہتا ہے۔ جیسے ہی میں اس کو پکڑنے کے لیے آنکھیں کھولتی ہوں، جھٹ سے نہ جانے کہاں غائب ہو جاتا ہے اور پھر میں اس بھیڑ میں اسے تلاش کرتے کرتے تھک جاتی ہوں۔ عجیب طلسماتی وجود ہے اس کا، جب بھی آتا ہے مجھے اس طرح اپنے سحر میں گرفتار کر لیتا ہے کہ پھر میں خود سے ہی بیگانہ ہو جاتی ہوں۔ ابتدا میں تو وہ مجھے اجنبی اجنبی لگا بھی کرتا تھا مگر اب تو اس کی شبیہہ میرے تخیلات میں اتنی پختہ ہوگئی ہے کہ اس کا ہر ہر نقش مجھے ازبر ہوگیا ہے اور اب مجھے ذرا بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا بلکہ اب تو میں اس کے ساتھ گھنٹوں باتیں کرتی ہوں اپنا سکھ دکھ اسے بتاتی ہوں، اس کے ساتھ ہنستی بولتی ہوں، روتی ہوں، روٹھتی ہوں اور کبھی کبھی مناتی ہوں۔ یہ رشتہ روز بروز مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جارہا تھا اور اب تو مجھے یقین ہو چلا تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ ضرور مجھ سے ملنے آئے گا۔ میں نے آخر اسے پوجا ہے، راتوں کو جاگ جاگ کر اسے مانگا ہے، ہر رات میں اس کے ساتھ ایک لمبا سفر طے کرتی ہوں جس میں چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہوتی ہیں، دکھ سکھ سانجھا ہوتے ہیں اور کچھ گلے شکوے بھی مگر وہ ہے کہاں؟ اب یہ سوال سورج کی روشنی میں مجھے ستائے رکھتا تھا اور نگاہ جیسے ہر شخص کی پہرے دار بن گئی تھی۔ جب بھی نظر اٹھتی تھی ایک نئی نئی امید کے ساتھ اور جب بھی جھکتی تھی ناامیدی کے ساتھ، مگر پھر بھی یقین تھا دل کو ایک نہ ایک دن وہ مجھے ملے گا ضرور۔

پھر ایک دن اچانک ہی وہ مجھے مل گیا۔ بالکل وہی......ہاں وہی نقوش...... وہی چال

ڈھال، وہی خدوخال...... ایک نظر دیکھ کر ہی میں پہچان گئی کہ اسے تو میں جانتی ہوں...... یہ تو وہی ہے جس کو میں پچھلے پانچ سالوں سے تلاش کر رہی ہوں، جو پچھلے پانچ سالوں سے میرے پاس ہوتے ہوئے بھی نہیں ہے، رشتہ مضبوط تو ہے مگر...... اتنا ہی اجنبی بھی کہ میں تو اس کا نام تک نہیں جانتی...... میں برابر اسے دیکھے جا رہی تھی...... اور وہ مجھے...... اس کی آنکھوں میں بھی اجنبیت پر اپنا پن کہاں تھا۔ وہ ویسے بھی مسکرا رہا تھا جیسے روز میرے خیالات میں کھڑا مسکراتا ہے۔

''ہیلو! آئی ایم بابر، بابر...... نام ہے میرا...... بابر...... اور یہ میرا کارڈ ہے......''

اس نے مجھے اس طرح تکتے ہوئے بے ساختہ کہا اور اپنا کارڈ میرے ہاتھ پر رکھ کر چلا گیا۔ اور میں دور تک اس کے نقش پا دیکھتی رہی...... ہوش آیا تو تب...... جب میری شاپنگ کا بل میرے ہاتھ میں دے کر کوئی مجھے بلا رہا تھا۔

''میڈم آپ کا بل......''

''اوہ...... ہاں...... وہ کتنے ہوئے؟''

میں نے جلدی سے پرس کی زپ کھولی اور پانچ سو کا نوٹ دیا...... میرے ہاتھ میں ابھی تک اس کا کارڈ تھا۔ جسے میں نے اپنے پرس میں ڈال لیا...... اگرچہ اس سانحے کو ابھی تک کسی نے بھی محسوس نہیں کیا تھا، مگر پھر بھی مجھے لگ رہا تھا کہ سارا مال (Mall) مجھے دیکھ رہا ہے اور ایک ساتھ کئی لوگوں نے میری چوری پکڑ لی ہو...... پھر میں سامان لے کر باہر آئی اور ٹیکسی کے ذریعہ گھر آ گئی...... مگر میری حالت ابھی تک ٹھیک نہیں تھی۔ جو دیکھا تھا اسے دل قبول نہیں کر رہا تھا اور آنکھیں اپنے صادق ہونے کا یقین بار بار کرا رہی تھیں...... سارا وقت مجھ پر عجیب سی وحشت سوار رہی، دل چاہ رہا تھا کہ جلدی سے اپنے بستر پر پہنچ جاؤں اور اپنے تخیلاتی ساتھی کے ساتھ چند ساعتیں جی لوں...... اس سے پوچھوں کہ وہ اچانک یوں کہاں سے آ گیا؟ اور اب تک کہاں تھا......؟ اور یہ کیسا تعلق اس نے مجھ سے جوڑ رکھا ہے ''صاف چھپتے بھی نہیں اور سامنے آتے بھی نہیں'' کے مصداق......

پھر میں نے گھنٹوں اس سے باتیں کیں...... مگر وہ تو خاموش تھا بس مسکرائے جا رہا تھا۔ کبھی میرے بہت زیادہ روٹھ جانے پر میری کالی ریشمی زلفوں کو اپنی شہادت کی انگلی پر لپیٹتا اور پھر ایک جھٹکے سے چھوڑ دیتا۔ ''کیوں چھیڑ رہے ہو مجھے؟''

''یوں...... ہی...... بس میرا دل...... کیونکہ تم صرف میری ہو......''

''اچھا......!'' میں ہنسی۔

''مگر کیسے؟''

''وہ ایسے کہ پچھلے پانچ سالوں سے میں تمھیں تلاش کر رہا ہوں اور...... تم بھی تو اتنے برسوں سے میری پرستش کر رہی ہو...... کیا تمھیں میرا انتظار نہیں......''

''ہاں......'' میں نے نگاہیں جھکا لیں۔

''دیکھو...... میری محبت، بغیر ملے ہی میں پانچ سالوں سے تمھارے ساتھ ہوں اور اس غائبانہ ملاقات نے ہمارا رشتہ کتنا مضبوط کر دیا ہے......''

''مگر......!'' میں کچھ کہنا چاہتی تھی۔

''بس...... اگر مگر کچھ نہیں...... میرا انتظار کرنا۔ میں اب بہت قریب ہوں تمھارے۔'' اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی وہ نہ جانے کس طاقت کے ساتھ تھا کہ پلک جھپکتے ہی پھر ہو گیا......

اس کو دیکھنے کے بعد میری بے چینیاں اور بڑھ گئی تھیں۔ اب دل ہر وقت اسے ہی ایک نظر دیکھ لینے کا تمنائی رہنے لگا تھا اور گھر سے نکلنے کے بہانے تلاش کرتا رہتا تھا۔ جہاں کسی نے بازار جانے کی بات کہی اور میں جھٹ سے تیار ہو جاتی...... بازار جانے کا تو ایک بہانہ تھا۔ اصل مقصد تو اس کی تلاش تھی...... مگر پھر وہ مجھے نہ ملا...... اور پھر میں تھک کر ایک دن شب تنہائی میں اس سے شکوہ کر بیٹھی......

''کہاں چلے گئے ہو تم......؟'' جیسے ہی وہ میرے سامنے آیا میں نے اس سے شکوہ کر دیا۔

تب وہ کتنی زور سے ہنسا تھا...... ''کبھی اپنے دل کے آئینے میں جھانک کر تمہیں دیکھا میں تو وہیں ہوں......''

''مگر وہ......'' میں کچھ کہتی اس سے قبل وہ اوجھل ہو گیا اور میرا سوال میرے ہونٹوں پر ہی دم توڑ گیا...... اور پھر چند لمحوں بعد میں اس کے ساتھ خوش آئند تصور سجانے لگتی...... پھر ایک دن میں کتابیں لینے گھر سے نکلی اور اتفاق سے اسی مال میں پہنچ گئی جہاں وہ پہلی بار مجھ سے ملا تھا۔ میں اپنی پسندیدہ کتابیں تلاش کر رہی تھی کہ وہاں ایک کتاب لیے چلا آیا۔

''ہیلو...... آئی ایم بابر......'' اس نے اپنی گہری براؤن آنکھوں سے میری آنکھوں میں جھانکا......

میں تو اسے دیکھ کر حیران ہی رہ گئی......

''آپ......'' بس اتنا ہی نکلا تھا میرے منھ سے۔

''جی...... میڈم...... میں...... کیا آپ مجھے تلاش کر رہی تھیں۔'' اس نے پھر میری آنکھوں کے ذریعہ میرے دل کا بھید جاننا چاہا......

''مگر...... میں نے تو اپنا کارڈ آپ کو دیا تھا...... اس پر میرا نمبر بھی ہے......''

''جی...... میں۔'' میں اتنی حیران تھی کہ کچھ کہہ ہی نہیں پا رہی تھی اور ادھر دل تھا کہ سینے سے نکلنے کو بے تاب و بے قرار ہوا جا رہا تھا...... سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کروں تو کیا کروں......

''بہت مس کیا مجھے......'' اس نے یقیناً میرے دل کا حال میرے چہرے سے پڑھ لیا ہوگا۔

''میں نے بھی آپ کو بہت مس کیا۔''

''آپ کا نام کیا ہے؟''

''جی...... وہ...... میرا نام......''

''چل زیب بہت دیر ہوگئی۔'' اس سے پہلے کہ میں اسے اپنا نام بتانے کے بارے میں سوچتی، میری چچازاد بہن نے میرا نام لے کر میرا ہاتھ گھسیٹ لیا اور میں حیران حیران نظروں سے اسے تکتی رہی اور طلعت مجھے گھسیٹتی ہوئی آگے بڑھتی چلی گئی۔

''زیب......'' اس نے میرا نام اتنی زور سے دہرایا تھا کہ میں نے خود اپنے کانوں سے سنا تھا۔

''اچھا اور بہت پیارا نام ہے۔''

اس کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی اور میں آگے بڑھ گئی۔اس ملاقات نے اسے مجھ سے اور قریب کر دیا تھا اور پھر اس رات شب تنہائی میں میری اس سے نہ جانے کتنی باتیں ہوئیں: وہی پہلے جیسی کیفیات دوبارہ مجھے پریشان کرنے لگیں۔دل تھا کہ بس ہر وقت نہ جانے کہاں رہتا تھا اور دماغ......؟ دماغ تو سارے شہر کی خاک چھانتا پھر رہا تھا۔بس ایک میرا جسم تھا جو گھر میں قید تھا اور خود کو چھپائے ہوئے تھا۔

یہ عجیب سلسلہ تھا ملاقاتوں کا، یہ عجیب رشتہ تھا جو اس کے ملنے سے پہلے ہی میری روح اس سے جوڑ چکی تھی اور اب اس کی تلاش کے بعد جیسے خود میری ذات نے میری سوچوں پر مہر لگا دی تھی کہ بس اب تیری تلاش پوری ہوئی اب تجھے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں وہ ایک دن آئے گا اور تجھے اپنے ساتھ اپنی دنیا میں لے جائے گا جہاں اس کی چاہت کے دیئے ہوں گے اور تیری محبت کی خوشبو، مہک اٹھے گی یہ سرزمین، جھوم اٹھے گا یہ آسمان، ہر طرف خوشحالی اور شادابی رقص کرے گی، بس تھوڑا صبر رکھ......

ایک دن اچانک ہی میرے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی......

''ہیلو......'' میں نے فون اٹینڈ کیا......

''ہیلو...... آئی ایم بابر خان...... زیب کیا آپ نے مجھے یاد کیا تھا......''

میں نے اچھل کر فون کو بستر پر پھینک دیا اور حیرانی سے اس سے آتی آواز کو سننے لگی۔میں نے پھر فون کان پر لگایا، میں تو اس وقت تھر تھر کانپ رہی تھی۔ڈر تھا کسی نے دیکھ لیا تو کیا ہوگا......؟ چند لمحوں بعد آواز آنا ختم ہوگئی۔میں نے فون بند کر کے الماری میں رکھ دیا۔دوسرے دن جب فون آن کیا تو پتہ چلا کہ بابر کے چھ sms اور چار مس کال تھیں۔ابھی میں دیکھ ہی رہی تھی کہ پھر فون بج اٹھا۔میں نے ڈرتے ڈرتے اسے ریسو کیا اور کواڑ کی آڑ میں کھڑے ہو کر اپنے کان پر لگایا......

''زیب، میں بابر۔'' آواز میں اتنا اپنا پن تھا کہ میں چاہ کر بھی فون کان سے نہ ہٹا سکی مگر کچھ بولنے کی ہمت اب بھی مجھ میں نہیں تھی......

''زیب! میرا مقصد آپ کو پریشان کرنا بالکل نہیں ہے بلکہ میں تو آپ کو حاصل کرنا چاہتا ہوں

اور یہ...... اور یہ فیصلہ کوئی چھ مہینے پرانا نہیں ہے بلکہ پچھلے پانچ سال پرانا ہے۔ پچھلے پانچ سالوں سے میں آپ کو تلاش کر رہا ہوں کیسے؟ یہ مجھے نہیں پتہ، مگر اچانک ہی ایک تصور میرے ذہن میں بیٹھ گیا اور پھر وہ رفتہ رفتہ روز روز کی تخیلاتی ملاقاتوں سے مجھے اپنا اپنا سا لگنے لگا۔ مگر مجھے لگتا تھا کہ یہ سب میرا وہم ہے صرف میرا وہم اس دنیا میں اس شکل کی کوئی لڑکی نہیں ہوگی مگر اس دن آپ کو مول میں دیکھ کر میں حیران رہ گیا کہ میرے ذہن کے کینوس پر جو تصویر ابھری تھی وہ اس طرح چلتی پھرتی میرے سامنے کیسے آ گئی اور پھر اس دن مجھے یقین ہو گیا کہ ہم دونوں کو خدا نے ایک دوسرے کے لیے بنایا ہے۔ میرا یقین ہے کہ جب خدا نے آپ کو بغیر دیکھے مجھ سے ملا دیا تھا تو یقیناً آپ بھی مجھ سے مل چکی ہوں گی اور اس کا جواب آپ کی فیس ریڈنگ نے مجھے اس دن مول میں دے دیا تھا۔ پتہ ہے زیب، جب آپ نے میرے تصور میں ڈیرا جمایا تھا تب میں بالکل تہی دست تھا، بس صرف تعلیم تھی جس سے میں اس وقت تازہ تازہ فری ہوا تھا، مگر آپ نے روز مجھ سے ملاقاتیں کر کے مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا...... اور آج میں اس خواب کو پورا کرنے کی خواہش میں الحمدللہ بہت اونچے مقام پر ہوں زیب! زیب!"

وہ مجھ سے نہ جانے کیا کیا کہتا جا رہا تھا...... مگر میں نے اس کی کسی بات کا جواب نہیں دیا...... اور فون بند کر دیا...... کتنی بے تکلفی سے وہ مجھ سے باتیں کر رہا تھا...... ایسے جیسے صدیوں سے مجھے جانتا ہو، برسوں میرے ساتھ رہا ہو اور میرا اس کا کوئی اجنبیت کا رشتہ ہو ہی نہیں۔

"کیا اس طرح بھی تعلقات بنتے ہیں......" میں نے خود سے سوال کیا۔

"زیب...... کسی کے بنے ہوں یا نہ بنے ہوں تیرے جوڑ کو اوپر والے نے تو اسی طرح لکھے ہیں......" اور میں نے مسکرا کر آنکھیں بند کر لیں۔

پھر یہ سلسلہ چل نکلا...... کوئی ملاقات میری بابر سے نہ ہوئی تھی، میں تو یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ وہ رہتا کہاں ہے، کیا کرتا ہے؟ مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں تھا، یہ معاملات تو وقت خود طے کرا دیتا ہے۔ بس وہ مجھے مل جائے میری یہی دعا تھی...... بابر کے فون اکثر آتے تھے مگر میں نے کبھی اس کی بات کا جواب نہیں دیا، ہاں صرف سنا ضرور تھا اور وہ نہ جانے کیا کیا کہتا رہتا تھا۔ میں نے تو کبھی sms تک نہیں کیے۔ نہ کوئی ملاقات کی، نہ کبھی اس نے اوچھی حرکت کی مجھ سے خواہش ظاہر کی۔ وہ بہت پاکیزہ تھا سوچ و قول کا...... اسے بھی یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن ہم ضرور ملیں گے...... اور ملتے تو ہم دونوں روز ہی تھے...... پچھلے سات سالوں سے مل رہے تھے۔ پھر......؟

میرے گھر کا ماحول نہایت صاف ستھرا اور حق پرست تھا۔ مذہب کو ہم لوگوں نے اپنی شان سمجھ کر اپنایا ہوا تھا۔ اس کی ایک ایک بات کو میرے بھائی ٹھونک بجا کر دیکھتے تھے مبادا کوئی غلطی ہو جائے، کہیں ہم انجانے میں ہی سہی اللہ کو ناراض نہ کر بیٹھیں اس لیے اللہ اور محمدؐ کے نام کے علاوہ تیسرا کوئی نام مشکل اوقات میں سنا ہی نہیں۔ ہمیشہ ہم سب نے اپنا سر اسی دربار میں جھکایا...... پابندی سے پنجگانہ نماز ادا ہوتی، سنتوں کا

خیال رکھا جاتا، بچوں کی تربیت کے معاملے میں لوگ ہماری اور ہمارے خاندان کی مثال دیا کرتے تھے۔ ہر بات کے فیصلے سے پہلے بھائی جان یہ کہتے تھے کہ: دیکھو اس بابت ہمارے نبی اور قرآن کا کیا کہنا ہے۔ وہی بات کرو جو قرآن کہتا ہے۔ اتنے پاکیزہ ماحول میں کیا کوئی کسی کے ساتھ حق تلفی کر سکتا ہے...... مگر......!

وہ پندرہ دسمبر کی شام تھی جب میں آنگن میں بیٹھی تھی مجھے سردیوں میں بھی کچھ دیر باہر بیٹھنا اچھا لگا کرتا تھا۔ میں تنہا تھی نہیں...... ! تنہا نہیں تھی، بابر میرے ساتھ تھے۔ اس مارچ میں پورے آٹھ سال ہونے والے تھے۔ جس میں سے تین سال ہماری ملاقاتِ حقیقی کے تھے اور پانچ سال غائبانہ ملاقات کے۔

''زیب......!'' بھائی جان اچانک میرا نام لے کر دہاڑے۔

''زیب کہاں ہے تو......؟''

''جی بھائی جان! میں یہاں۔ بھائی جان کی نکلنے والی غیر معمولی آواز نے سب کو ایک ساتھ آنگن میں جمع کر لیا۔

''کیا ہوا ہے......؟'' امّی نے آگے بڑھ کر بھائی جان کی قہر آلود نگاہوں کو دیکھا۔

''کیا ہوا...... ہے......؟'' بھائی جان نے حقارت آمیز لہجے میں میری طرف دیکھا۔

''پوچھیے...... اپنی اس ناز و نعم میں پلی بیٹی سے...... جو دن بھر گھر میں رہتی ہے مگر...... گل......''

''اف...... اب سارا ماجرا میری سمجھ میں آ گیا...... آج کسی نہ کسی طرح بھائی جان کو بابر کے بارے میں پتہ چل گیا ہے...... مگر ان کا لہجہ...... اتنا توہین آمیز کیوں ہے......؟'' میرے سینے میں ایک عجیب قسم کا درد اٹھا جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے دبا لیا مگر اس وقت میری طرف دیکھنے والا تھا ہی کون......؟

''کیا کیا ہے اس نے......؟'' امی نے بھائی جان کا گریبان پکڑ کر انھیں ہلا ڈالا......

''بتاؤ......؟'' تینوں بھابیاں میری طرف نہ جانے کیسی کیسی نظروں سے دیکھ رہی تھیں اور حیران بھی تھیں......

''یاور! بتاؤ مجھے، کیا کیا ہے اس نے......؟'' امی نے دوبارہ بھائی جان کو جھنجھوڑا۔

عشق...... لگا جیسے چاروں طرف شعلے بلند ہو گئے ہوں، بم پھٹنے لگے ہوں...... اور میرو جود میں جلنے لگا ہو......

''عشق کیا ہے ہماری بہن نے، بلکہ کر رہی ہے، عشق کر رہی ہے۔ یہ ہم سب کی ناک کے نیچے کیا کیا گل کھلاتی رہی اور ہم میں کسی کو بھنک تک نہ لگی۔ تین سال ہو گئے...... امی تین سال......'' بھائی جان نے میری طرف جن نظروں سے دیکھا اس پل میرا دل چاہا میں زمین میں دھنس جاؤں...... ان کی نظریں کہہ رہی تھیں۔

''زینب تو نے عشق نہیں کیا دھندا کیا ہے۔ محبت کا بازار گرم کیا ہے۔ تو اب اس گھر میں رہنے کے قابل نہیں ہے۔''

''مگر...... یہ میں اور بابر دونوں جانتے تھے۔ ہم نے صرف محبت کی ہے، پاکیزہ محبت جس میں روحانی محبت کے سوا اور کچھ بھی نہیں بلکہ گونگی محبت کی ہے میں نے اس سے...... مگر......''

امی نے بھائی جان کی بات سنتے ہی میرے گلابی گلابی رخسار پر طمانچے مارنے شروع کر دیے اور

بھابھیوں نے اپنے کان بند کر لیے۔ ایسا لگا وہاں ان کی بیٹی، بہن نہیں کوئی بازارو عورت کھڑی تھی۔ جس کا جرم ناقابل تلافی تھا اور بدقسمتی سے وہ اس گھر سے جڑی ہوئی ہو۔ کئی چانٹے مارنے کے بعد امی میری برابر والی چارپائی پر ڈھے سی گئیں۔ ماحول پل کے پل میں ماتم جیسا ہوگیا۔ جیسے وہاں سے ابھی ابھی کوئی جنازہ نکلا ہو......

''چل اندر......'' بھائی جان نے میری کلائی پکڑ کر اس طرح گھسیٹی کہ میں گرتے گرتے بچی......

''بتا کیا کیا ہے تو نے؟ اس......اس......''

''بھائی جان......کچھ نہیں......کچھ بھی تو نہیں، میں تو......''

''سچ سچ بتا نہیں تو گلا دبا دوں گا۔'' وہ شاید میرا گلا دبا بھی دیتے اگر چھوٹی بھابھی آگے نہ آ گئی ہوتیں......

''مگر یہ آج......سب ہوا کیا......؟''

بڑی بھابھی نے اصل بات جاننے کے لیے بھائی جان کو کرسی پر بٹھایا اور جلدی سے پانی کا گلاس پیش کیا۔

''ارے......آج میں سپر مارکیٹ چلا گیا تھا۔ کچھ کام تھا۔ وہیں سامنے ہی نیا مول بنا ہے، سوچا چلو دیکھ ہی لوں۔ وہاں میرے ایک دوست کا بھی جیولری کارنر ہے۔ اس سے باتیں کر رہا تھا کہ ایک لڑکا دکان پر آیا اور کچھ خرید کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد اس نے مجھ سے کہا' یار تمھیں پتا ہے یہ کون تھا......؟' میں نے حیرانی سے منع کیا تو بولا' کمال ہے......جبکہ تمھاری بہن اسے اچھی طرح جانتی ہے اور اکثر دونوں اس مول میں ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں......ہاں خود کو الگ الگ مصروف رکھتے ہیں مگر جب جب تمھاری بہن یہاں آتی ہے یہ لڑکا بھی آتا ہے اور اکثر یہ لیڈیز چیزیں بھی خرید کر لے جاتا ہے جیسے آج لے کر گیا ہے......' میں کس طرح مول سے یہاں تک پہنچا ہوں یہ آپ میں سے کوئی نہیں جان سکتا اور اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ آپ کے سامنے ہے......یہ لڑکی......'' انھوں نے پھر اپنی خون برساتی آنکھوں سے دیکھا۔

''بھائی......جان......یہ سب جھوٹ ہے۔ خدا گواہ ہے یہ سب جھوٹ ہے۔ سچ کیا ہے میں آپ کو بتاتی ہوں......''

''چپ......'' بھائی جان اتنی زور سے مجھ پر دہاڑے اور انھوں نے قریب رکھا شانی کا لکڑی کا بیٹ مجھے مارنے کے لیے اٹھا لیا کہ میں سہم کر ایک کونے میں سما گئی۔ بس وہ دن اس گھر میں میری بہن ہونے کا، بیٹی ہونے کا، لاڈلی ہونے کا آخری دن تھا۔ اس دن کے بعد میں نہ لاڈلی بیٹی رہی نہ بہن رہی، رہی تو صرف ایک ناسور، ایک بدنامی، ایک آوارہ لڑکی جس سے کوئی رشتہ رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ بس قدرت کا ایک عطیہ تھا کہ اس گھر کے لوگوں سے خونی رشتہ تھا جو ایسے حالات میں وہ سب مجھے چھت مہیا کرائے ہوئے تھے ورنہ اور کوئی دوسری وجہ نہیں تھی۔

رات تک یہ بات تینوں بھائیوں کو پتہ چل گئی......اور ہر ایک کی نگاہ میں میرے لیے وہی جذبات تھے، جو دوپہر سے بھائی جان کی آنکھیں بتا رہی تھیں......سب سر جوڑے نہ جانے کن کن مشوروں میں لگ گئے تھے۔ دروازے پر تالا تھا اور میرا موبائل ضبط کیا جا چکا تھا......میرا کمرہ بدل دیا گیا اور مجھے ایک بند کمرے میں رہنے کی ہدایت دی گئی، جس کی ہر دیوار اونچی تھی اور جس کی واحد کھڑکی گھر کے آنگن میں کھلتی

تھی، جبکہ میرا اپنا کمرہ جس میں، میں نے بابر کے ساتھ سات سال نو مہینے گزارے تھے۔ اس کی ایک کھڑکی گلی میں کھلتی تھی۔ مگر بابر تو آج تک بھی وہاں نظر نہیں آیا تھا، کیونکہ وہ آوارہ قسم کا لڑکا نہیں تھا۔ اگلے دن مجھے پتہ چلا کہ بابر کا فون آیا تھا جسے بھائی جان نے سنا اور فون پر دہاڑ کر اس سے کہا تھا کہ: اگر آئندہ اس نے اس نمبر پر فون کیا یا زیب سے کسی طرح کا تعلق رکھا تو اسے گولی ماردی جائے گی۔

میرے خواب میری پلکوں سے چھین لیے گئے تھے وہ بھی اس طرح کہ ان خوابوں کے ساتھ میں نے اپنی ایک ایک پلک بھی گنوادی تھی، کیسے نہ جاتی میری پلک سان کے باریک ریشموں میں تو میرے خواب قید تھے۔ پھر بھلا خواب جاتے، پلک نہ جاتی یہ ناممکن تھا اور میری پلکیں نہ جانے کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ پھر میری آنکھ کبھی بند نہ ہوئی......

گھر والوں کی نفرت کے سوا اب میرے مقدر میں کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ ماں جس نے نو ماہ مجھے اپنے بطن میں رکھا زمانے کے سرد و گرم سے بچایا، مجھے ارمانوں سے اپنی گود میں جھلایا وہ اب میری صورت تک دیکھنا گوارہ نہ کرتی۔

بابر برابر مجھ سے بات کرنے کی کوشش کر رہے تھے، مگر بار بار فون پر بھائی جان ہی ملتے...... جو اسے بہت سلواتیں سنا دیتے اور پھر مجھ پر برس پڑتے۔ وہ صرف مجھ سے ایک بار بات کرنا چاہتا تھا۔ کئی بار بھائی جان سے کہہ چکا تھا کہ میں نے آج تک زیب کو چھوا تک نہیں ہے، پھر آپ سب مجھے اور اسے اس طرح ذلیل کیوں کر رہے ہیں، میں اسے شرعاً طور پر اپنانا چاہتا ہوں اور یہ جائز بات ہے اس میں کچھ ناجائز نہیں۔ میں اپنے بڑوں کو آپ کے یہاں رشتہ لے کر بھیج دوں اگر آپ ہاں کر دیں تو...... کیونکہ اگر آپ کی اجازت کے بغیر میں انھیں بھیجوں گا تو آپ انھیں رسوا کر دیں گے اور میں ایک خاندانی شریف لڑکا ہوں کوئی سڑک چھاپ مجنوں نہیں...... مگر بھائی جان نے کبھی اس کی کسی بات پر غور نہیں کیا ہمیشہ اسے سڑک چھاپ عاشق کے نام سے ہی پکارا...... جس کو سن کر مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میں نے گناہ عظیم کر دیا ہو......

میں تو ایک کمرہ میں قید کر دی گئی تھی...... گھر کی کسی بات میں اب میرا عمل دخل نہیں تھا، میرے پیارے پھول سے بھتیجے اب میرے پاس بھٹکتے بھی نہیں تھے، وہ بھابیاں جو گھنٹوں میرے پاس بیٹھ کر مجھ سے نہ جانے کون کون سی باتیں کیا کرتی تھیں اور کون کون سے بیوٹی ٹپس لیا کرتی تھیں وہ اب مجھ سے ٹانکا بھی توڑنا گوارہ نہ کرتی تھیں۔ میں تو جیسے ہر ایک سے بولنے کو ترس سی گئی تھی، امی کہنے کو اتنا دل چاہتا تھا مگر جیتے جی میری ماں نے مجھ سے یہ حق چھین لیا تھا۔ دل چاہتا تھا اس محفل میں شریک ہونے کو جو رات کو کھانے کے بعد اکثر ہمارے یہاں جما کرتی تھی، جس میں اکثر موڈ ہو جانے پر ادبی رنگ بھی چھا جاتا تھا اور اکثر بھائی مجھ سے نعت، غزل کی فرمائش کیا کرتے تھے، کیونکہ اللہ نے مجھے آواز بھی بہت خوبصورت اور مترنم دی تھی۔ اکثر میرا دل چاہتا تھا کہ اپنے گھر کے پیارے پیارے بچوں کو سینے سے لگا کر بہت پیار کروں، آنگن میں رکھے چڑیوں کے پنجرے کے پاس بیٹھ کر انھیں دانہ کھلاؤں...... آسمان دیکھوں...... مگر اب مجھ سے یہ

سب چھین لیا گیا تھا صرف اس وجہ سے کہ بابر مجھ سے نکاح کرنا چاہتے تھے اور میں انھیں جانتی تھی...... کیا میری اتنی بڑی خطا تھی یا یہ سزا مجھے یوں دی جارہی تھی کہ آج بھی کسی لڑکی کو اپنے حق کا استعمال کرنے کا کوئی حق نہیں ہے یا اس لیے کہ میں بیٹی تھی جو ہمیشہ دوسروں کے رحم وکرم پر زندگی بسر کرتی ہے، اس کی اپنی نہ کوئی زندگی ہے، نہ خواہشات، نہ احساسات اور نہ کوئی پسند...... وہ اس گائے کی طرح ہی آج بھی کھونٹے سے بندھی ہے، جس کے مالک کو خیال آتا ہے تو وہ ضرورت پوری کرادیتا ہے اور اگر کسی ادا پر پیار آتا ہے تو اس کے قریب جا کر اس کی پشت پر ایک پیار بھرا ہاتھ پھیر دیتا ہے۔ لیکن اگر وہ کبھی مالک کے خلاف یا اپنی مرضی کا ایک لمحہ بھی جینا چاہتی ہے تو اس مالک کی ایک زوردار لات اسے احساس دلا دیتی ہے کہ تو مالک کے کھونٹے سے بندھی ایک بے بس لاچار گائے ہے اور کچھ نہیں......

میں اس دکھ کو سہہ کر جینا چاہتی تھی مگر میرے گھر والوں نے میرا ساتھ نہیں دیا شاید یہ جان بوجھ کر وہ میرے ساتھ ایسا سلوک کررہے تھے کہیں نہ کہیں ان سب کی یہ خواہش ہی ہونے لگی تھی کہ اب بس زیب کی سانس آنا بیکار ہے، سے یہیں تھما جائے...... مگر......!

ایک دن طلعت میری کزن میرے پاس آئی...... مجھ سے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی...... میں نے حیرانی سے اس کا منھ تکا کہ وہ یہاں تک آئی کیسے...... اور اب تک کہاں تھی......؟ تب اس نے بتایا کہ بھائی جان نے سخت ہدایات دے رکھی ہیں کہ تجھ سے نہ ملا جائے...... اور آج میں تائی امی سے بڑی منت کر کے تجھ سے ملنے آئی ہوں، زیب! بابر کا حال بہت برا ہے، وہ تجھ سے بات کرنا چاہتا ہے...... ابھی اس کا فون آتا ہی ہوگا...... اس نے اپنا فون میری طرف بڑھایا تبھی فون کی صرف لائٹ جلی گھنٹی نہیں بجی، کیونکہ یہ خطرہ وہ مول نہیں لے سکتی تھی۔

''زیب تو بات کر میں یہیں ہوں......'' میری آنکھیں جھر جھر ساون کی اس رات کی طرح برسنے لگیں جس کو دیکھ کر صبح کے آثار نظر ہی نہیں آتے، جو لگاتار مینھ برساتی رہتی ہے۔ بس نوحہ خواں رہتی ہے......

''زیب...... یہ سب کیا ہو رہا ہے...... میں نے بھائی جان سے بار بار کوشش کی کہ ہمارا نکاح کرا دیں مگر...... زیب...... دیکھو...... ہار نامت میں نے یہ فون تمھیں اس لیے کیا ہے...... ہم تو روحانی طور پر سالوں پہلے ہی مل چکے تھے۔ یہ نکاح تو دنیا میں رشتہ بنا کر جینے کا ایک ذریعہ ہے ورنہ ہمارے روحانی ملن کو کوئی کیا روک سکے گا۔ زیب...... دیکھو خود کو ہلاک مت کرنا...... بس اتنا یاد رکھنا: زیب زندہ ہے تو بابر زندہ ہے۔ اگر تم مجھے زندہ سلامت دیکھنا چاہتی ہو تو اپنا خیال رکھنا۔ حالات کچھ بھی ہوں بابر تمھارا تھا تمھارا ہے اور تمھارا رہے گا...... مجھے اب دنیا میں کسی شادی نام کے بندھن کی ضرورت نہیں ہے۔ بس ہم روز اسی طرح ملیں گے جس طرح ملا کرتے تھے...... روحوں میں بڑی طاقت ہوتی ہے اگر محبت اس طاقت کو حاصل کر لے تو پھر اسے کسی رشتے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی...... زیب! میں صرف تمھیں تصور اور تخیل میں پا کر ہی خوش رہوں گا اور تم بھی...... ہاں میں کوشش برابر کر رہا ہوں مگر......'' میں نے فون کٹ کر دیا کیونکہ وہ مجھے جینے کے

ہنر سکھا رہا تھا اور میں...... ! میں نے طلعت سے کہہ دیا تھا کہ: اب اس طرح بابر کی بات آئندہ مجھ سے مت کرانا۔ جب اللہ کا ہی حکم نہیں ہے تو یہ ذرائع کیا...... ؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم سے بھی یہ فون چھن نہ جائے......

بھلے ہی بابر نے مجھے حوصلہ دیا تھا...... نہیں یہ باتیں کر کے وہ خود اپنے حوصلوں کو مضبوط بنا رہا تھا۔ وہ خود کمزور ہو رہا تھا، ہار رہا تھا میری تلاش اسے دیوانہ بنائے دے رہی تھی، مگر میں کیا کر سکتی تھی...... وہ مجھ سے باوفا تھا، بس یہی بات میرے لیے باعثِ سکون اور حیاتِ جاوداں تھی...... ورنہ کہیں کوئی اس دور میں ایسی پاکیزہ محبت کرپاتا ہے...... آج کل تو عشق بڑے سستے داموں میں گلی گلی ٹکر ٹکر بک رہا ہے۔ محبت کے دعوے کر کے گھر بسانے والے چند دنوں میں ہی طلاق کے کاغذات لیے پھرتے نظر آتے ہیں، اور مرد تو ایسی محبتوں کو وقت کی پرچھائیں سمجھ کر آگے بڑھ کر کسی اور کے ساتھ زندگی گزار بھی لیتے ہیں وہاں لڑکیاں اکثر بے وفائیاں سہتی سہتی مرجاتی ہیں مگر وہ...... مجھ سے بے پناہ محبت کرتا ہے، اس نے مجھے اس حد تک چاہا کہ اب اسے دنیا میں میرے روحانی تعلق کے علاوہ اور کچھ چاہیے ہی نہیں یہ میرے لیے کیا کم خوش نصیبی کی بات تھی...... مرد کی ذات اور باوفا! زمانہ دانتوں تلے انگلیاں دبالیتا ہے اور وہ...... بابر جو اس طرح مجھ سے جڑا کہ پھر جدا ہی نہ ہو سکا...... بس یہی بات میرے لیے بہت تھی...... میں نے اس محبت کو پالیا تھا جس کی تلاش میں دنیا بھٹکتی پھر رہی ہے مگر سچائی دھوکے بازی کی گرد میں دب گئی ہے اور جس کی تلاش فی الحال ممکن نہیں...... مگر میرے پاس وہ محبت تھی مگر یہ دنیا مجھے اسے حاصل نہیں ہونے دے رہی تھی...... نہ ہونے دے...... مجھے کچھ چاہیے بھی نہیں......" میں نے اپنے قیمتی آنسوؤں کو صاف کیا جو صرف بابر کی یاد میں اکثر بہا کرتے تھے...... اور میرے لیے بہت قیمتی بھی تھے اور باعثِ فخر بھی۔

رفتہ رفتہ گھر کا نظام معمول پر آتا جا رہا تھا...... وہی حق پرستی کی باتیں، ہر بات میں چھان پھٹک کہ کسی کے ساتھ حق تلفی نہ ہو جائے، صدقہ، زکوٰۃ، خیرات، دینی مسئلے مسائل...... وہی انصاف پسندی، وہی ماحول گھر میں دوبارہ آنے لگا، بچے بھی ہنسنے مسکرانے لگے، دیورانیاں بھی آپس میں مل کر ادھر ادھر آنے جانے لگیں۔ امی بھی اپنے پرانے مشاغل میں مصروف ہو گئیں، بھائی بھی اپنے اپنے کاروباری مسائل حل کرتے رہے مگر بس ایک میں تھی...... جس کی زندگی تھمی جا رہی تھی جس کے وجود کی نہ کسی کو فکر تھی اور نہ کچھ اور......

میں اگر کبھی کمرے سے نکل کر دالان میں قدم رکھ بھی دیتی تو کوئی میری طرف توجہ ہی نہیں دیتا اور اس طرح میں اپنے آپ میں اتنی شرمندہ ہو جاتی کہ بس...... مگر کچھ دنوں سے ایک نئی آہٹ مجھے سنائی دے رہی تھی کہ: بھائی جان میرا نکاح کرانا چاہتے ہیں۔ اس خبر نے مجھے حیران بھی کیا اور حد درجہ پریشان بھی، تو وہ سب میرے اس بوجھ کو اس خوبصورتی سے اتارنا چاہتے تھے، مگر یہ مجھے گوارہ نہیں تھا۔ اس طرح ذلیل و خوار زندگی گزار کر میں اس دہلیز سے رخصت بھی ہو جاؤں وہ بھی کسی اور کے ساتھ کبھی نہیں...... ہاں اگر میرے ساتھ یہ رویہ نہ رکھا ہوتا اور مجھے سمجھا ہوتا اور مجھے سمجھایا ہوتا اسی رشتے سے اپنایا ہوتا جو میرا حق تھا تو شاید میں

راضی ہوجاتی مگر اب اس طرح ہرگز نہیں ایں چاہے کتنی بھی بدنصیب لڑکی تھی، بیٹی تھی مگر مجھ سے یہ حق کوئی نہیں چھین سکتا۔ چاہے میری ماں اپنی جان کی دہائی ہی کیوں نہ دیں مگر میں نکاح کے لیے کبھی ہاں نہیں کروں گی میں نے دل ہی دل میں یہ فیصلہ کرلیا تھا......

پھر کیا ہوا مجھے پتہ نہیں...... مگر ایک دن چھوٹے بھیا میرے پاس پھر گرجتے برستے آئے اور میرے بال پکڑ کر ایک زوردار تھپڑ میرے منھ پر مارا...... اور بولے: "سن...... ابھی بابر کا فون آنے والا ہے...... اگر تو نے اس سے یہ نہیں کہا کہ تو نے کبھی اس سے پیار کیا ہی نہیں تو دیکھ لینا...... میں اسی لمحے اس چاقو کو اپنی گردن میں گھونپ لوں گا...... اور مرجاؤں گا...... اگر تجھے اپنے بھائی کا ذرا بھی خیال ہے تو...... فیصلہ کرلے...... ورنہ جو تیرے جی میں آئے کرنا...... مگر یہ یاد رکھ کہ میرے مرنے کے بعد بھی بھائی جان کبھی بابر سے تیرا نکاح نہیں کریں گے...... ناخلف لڑکی......!"

میرے سر کی تمام رگیں جیسے پھٹنے لگیں...... میرے بال ان کی جنونی مٹھی میں قید تھے اور تمام اہل کرم مجھے اس طرح اذیت میں دیکھ رہے تھے جس میں اور کوئی شامل تھا یا نہیں مگر میری ماں بھی شامل تھی، جس کی آنکھوں میں اس وقت میرے لیے صرف نفرت ہی نفرت تھی اور یہ پیغام بھی کہ کاش...... وہ مجھے زہر دے کر مار سکتی اور اسلام نے انہیں اس کی اجازت دی ہوتی......

چھوٹے بھیا نے چند منٹ کے بعد میرے بال چھوڑ دیے...... اور میں اپنے بیڈ پر جا گری...... یہ اچانک کیا ہوا تھا، قیامت کیوں آئی تھی مجھے اس کی کچھ خبر نہیں تھی...... اور نہ میں سننا چاہتی تھی۔ میری روح جو چھالوں سے بھری پڑی تھی میرا دل جوان اپنوں کے نشتروں سے بھر اپڑا تھا اور ہر طرف سے لال فوارہ پھوٹ رہا تھا۔ میرا ذہن جو بیمار تھا، کمزور تھا...... وہ یہ سب اب سننا بھی نہیں چاہتا تھا، میں بس اب خدا کے حضور تھی اور کہیں کچھ نہیں......

"اب...... کیا ہوا ہے؟" امی نے آگے بڑھ کر چھوٹے بھیا کا پسینہ پونچھا...... اور میرے ماتھے سے نکلتا ہوا خون یوں ہی تکیہ میں جذب ہوتا رہا......

"ہوا کیا......؟ آج میں اُسے قتل ہی کرڈالتا...... پھر سے دکان پر آگیا...... اور وہی پرانی رٹ...... سالے کو کہیں سے پتہ چل گیا کہ زیب کا رشتہ ہونے جارہا ہے...... کہنے لگا کہ خدارا زیب کا رشتہ کرنے سے پہلے ایک بار اس کی مرضی ضرور معلوم کرلیجیے گا ورنہ آپ اپنی بہن کو کھودیں گے...... بے ہودہ...... سوچ رہا تھا کہ اس طرح وہ اس......" انھوں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا انھیں امی کی کوئی تربیت یاد آگئی تھی جس میں گالی نہ دینے کی ممانعت تھی ورنہ نہ جانے ان کا اس وقت کیا دل چاہ رہا تھا اور میری طرف کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

"ایک ہنگامہ کھڑا کردیا اس بیہودہ لڑکے نے...... بہت مارنا چاہتا تھا میں، دل چاہ رہا تھا کہ اس کی جان لے لوں مگر بس...... نہ جانے کون سی طاقت نے ہاتھ روک دیا۔ کہہ دیا میں نے اس سے یہ سب تیری سازش ہے۔ زیب تجھے نہیں چاہتی...... میں اس کے منھ سے کہلوادوں گا...... تب تو ہماری زندگی سے چلا جائے گا......"

"تب...... اس نے...... ہاں کی کہ اگر زیب ایک بار کہہ دے کہ اس سے کوئی تعلق نہیں ہے تو وہ پھر کبھی پریشان نہیں کرے گا...... اور آج میں یہ طے کرکے آیا ہوں کہ اگر زیب کی زبان سے ہاں نہ نکلی تو میں اپنی جان دے

دوں گا...... ذلیل کر کے رکھ دیا ان دونوں نے...... یا تو آج وہ نہیں یا میں نہیں...... اب فیصلہ اس کے ہاتھ ہے۔"

وہ شعلے برساتے ہوئے اور مجھے جلاتے ہوئے آئے تھے بھسم کر کے چلے گئے...... اب میرے سامنے امی تھیں...... جو نہ جانے کن نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھیں میرے قریب آئیں اور بولیں:......

"اس گھر کی بیٹی نے تو مجھے سکون لینے نہ دیا...... مگر اس گھر سے میرے بیٹے کو مت چھین...... کیسی بہن ہے تو اپنے بھائی کو مراد کیھ سکے گی......" میری ویران آنکھوں نے جو خون بہہ جانے اور روحانی جسمانی کمزوری بڑھ جانے سے بند ہوئی جا رہی تھیں امی کو دیکھا...... دل چاہا ایک بار ان کے سینے میں منھ چھپا کر اتنا روؤں اتنی زور سے دہاڑیں ماروں کہ میرے اندر کا سارا کرب بہہ جائے...... مگر میں چاہ کر بھی ایسا نہ کر سکی...... خون اب ماتھے سے بہہ بہہ کر میری گردن پر آ چکا تھا...... مگر مجھے اس چوٹ نے اتنی تکلیف نہیں دی تھی جتنی تکلیف ان سب اپنوں نے دی تھی جو درد ان سب نے مل کر مجھے دیا تھا...... وہ اس چوٹ سے کہیں زیادہ تھا......

امی اپنی چاہت بتا کر جا چکی تھیں...... اب میرے سامنے چھوٹے بھیا کی بیوی تھیں میری پیاری بھابھی...... چھوٹی بھابھی...... جن کا دلہناپا میں نے اس طرح کرایا تھا کہ ابتدائی آٹھ دن انھوں نے میرے ارمانوں کے ہاتھوں پر اپنے پیر رکھے تھے تب انھیں چپل نظر آتے تھے...... جن کے بناؤ سنگھار کے لیے میں ہر وقت تیار رہتی تھی، اور جن کی تنہائی میں نے اپنی کمپنی دے کر دور کی تھی کیونکہ قدرت نے انھیں اولاد کی نعمت بہت دیر سے دی تھی اور جب دی تھی تو پورے نو ماہ انھیں بستر پر گزارنے پڑے تھے ایسے میں بھیا کے حکم کے ساتھ ساتھ امی کی سخت ہدایات تھیں کہ انھیں ایک پل کو بھی تنہا نہ چھوڑا جائے اور میں نے اکیلی لڑکی ہونے کے باوجود ان پر ہزاروں مرتبہ اپنے پروگرام قربان کیے تھے کہ چلو یہ پروگرام تو پھر بھی اٹینڈ کیے جا سکتے ہیں مگر اس وقت انھیں میری سب سے زیادہ ضرورت تھی...... وہی بھابھی جنھوں نے...... اس دن کے بعد سے میری شکل دیکھی تھی...... جنھیں نہ میرے ماتھے کی چوٹ نظر آ رہی تھی نہ دل کی...... بس آج اپنے شوہر کی زندگی خطرے میں دیکھ کر میرے آگے کھڑی تھیں۔

"زیب اخدارا انکار کر دینا...... بابر کا فون آئے تو...... دیکھو تمھارے بھائی تمھیں بدنامی سے بچانا چاہتے ہیں۔ تمھیں جو چاہیے لے لینا مگر بابر کو بھول جاؤ۔ تمھیں پتا ہے نا تمھارے بھیا کا غصہ کتنا خراب ہے وہ سچ مچ خود کو ہلاک کر ڈالیں گے پھر میرا کیا ہوگا...... اور ان بچوں کا...... ؟ زیب، میری بہن انکار کر دینا...... میں تمھارے بھیا سے بعد میں بات کر کے تم جو چاہو گی تمھیں دلا دوں گی مگر اس وقت ان کی جان تمھارے ہاتھ میں ہے۔ کیا تم اپنے بھائی کے جنازے کو لانگھ کر اپنی ڈولی سجا سکو گی......"

وہ میرے سامنے رو رہی تھیں۔ مطلبی آنسو...... میں انھیں دیکھتی رہی پھر اپنے کمرے میں آ گئی اپنی پناہ گاہ میں...... جس کی ایک ایک دیوار میری ماں تھی باقی تین دیواریں میرے تینوں بھائی اور کھڑکیاں میرے پیارے بھتیجے تھے...... جن سے لپٹ لپٹ کر میں روز روز آنسو بہایا کرتی تھی...... پھر بابر مجھے سنبھال لیتے تھے اور میں......

سب لوگ رات کا کھانا کھا چکے تھے تب میرے کمرے میں کھانے کی ٹرے آئی، کون رکھ کر گیا تھا

پتہ نہیں۔ میں تو بس آنکھیں بند کر کے اس مولا کو یاد کر رہی تھی، جس کے ہاتھوں میں ہم سب کی ڈور ہے۔ کھانا تو کھانا ہی تھا اللہ کی اس نعمت سے میں کیوں محروم رہتی کہ اس نے تو مجھے بہت نوازا تھا...... مگر یہ میرے اپنے تھے جو آج میرے دشمن بنے بیٹھے تھے۔ اچانک پھر شور کی آواز آئی۔ تینوں بھائی باہر گئے ہوئے تھے۔ چھوٹے بھیا پھر بڑی تیزی سے میرے کمرے میں آئے۔ ابھی میں نے بسم اللہ پڑھی ہی تھی کہ انھوں نے فون میرے آگے کر دیا...... اور چاقو اپنی گردن پر...... فون سے بابر کی آواز آ رہی تھی...... جو برابر "ہیلو زیب......" کہہ رہے تھے...... بھابھی تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ امی...... اپنا دل پکڑے مجھے گھور رہی تھیں موت کا سناٹا ہر طرف چھایا ہوا تھا......

"زیب...... پلیز بھائی جان نے کہا ہے کہ اگر تم ایک بار ان کے سامنے فون پر اقرار کر لو گی کہ تم بھی میرے ساتھ زندگی گزارنا چاہتی ہو تو وہ سب مان جائیں گے اور بھائی جان اس وقت میرے برابر بیٹھے ہوئے ہیں...... پلیز زیب خدا نے یہ موقع دیا ہے...... کچھ بولو......"

میرے دل نے ایک زور کا ٹھہا کا لگایا...... "کتنے معصوم ہیں بابر آپ...... ان لوگوں کی چال کو سادگی سمجھ لیا...... یہ لوگ بہت شاطر ہیں۔ وہاں ایک بھائی تمھیں پھنسائے بیٹھا ہے اور یہاں دوسرا مرنے کی دہائی دے رہا ہے۔" بابر نے کئی بار اپنی بات دہرائی...... مگر میں بھی چپ تھی...... بالکل اسی طرح جس طرح کسی مجرم کو سزا سنائی جانے والی ہو کہ اب اس کی زندگی کا کیا فیصلہ ہوگا...... میں نے فون اپنے کان پر لگایا اور "رانگ نمبر کہہ کر کاٹ دیا......" میرے رانگ نمبر کہہ دینے سے لگا امی کا چہرہ کھل اٹھا، چھوٹے بھیا نے فوراً چاقو اپنی گردن سے ہٹا کر دور پھینک دیا...... اور بھابھی نے آگے بڑھ کر شاید مجھے گلے لگانا چاہا تھا...... مگر میں نے خود کو دوڑ کر باتھ روم میں بند کر لیا کیونکہ میں ان اپنوں کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ سب میرے کمرے سے چلے گئے...... تب میں باہر آئی...... کھانے کی ٹرے اٹھا کر ٹیبل پر رکھ دی اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی...... اس کے بعد کیا ہوا مجھے کچھ پتہ نہیں......

ہاں بس ایک دن طلعت پھر میرے پاس آئی اس کے پاس آج بابر کی تحریر تھی جسے دے کر وہ فوراً چلی گئی...... شاید اب اس میں میرا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔

میں نے خط کھولا...... بابر کی تحریر جسے آج میں پہلی بار دیکھ رہی تھی تین سال سے ہم ایک دوسرے کو جانتے تھے مگر آج تک ایسا کبھی نہیں ہوا تھا......

"زیب......!

خدا تمھیں سلامت رکھے۔

معلوم ہے کہ اس دن تم نے فون پر جو کچھ کہا وہ تمھاری مجبوری تھی...... زیب...... مجھے کسی سے کوئی شکوہ نہیں، تم سلامت رہو بس یہی میرے لیے کافی ہے...... اور پھر تم تو اب بھی میرے پاس ہو، میری روح میں تحلیل ہو، میری سانسوں میں رچی بسی ہو میرے دل کی ہر دھڑکن میں زندہ ہو تو پھر کیسی دوری...... کچھ نہیں زیب...... اس طرح ہمت نہ ہارنا محبت کی

توہین ہوگی...... اپنا خاص خیال رکھنا یہ سوچ کر تم زندہ ہو تو میں زندہ ہوں...... بس اس بات کو زندگی جینے کی وجہ بنالو کہ میں نے تمہیں بے حد چاہا ہے اور یہ چاہت خدا نے ڈالی ہے اس وقت جب میں تم سے اور تم مجھ سے ملی نہیں تھیں...... میں ہمیشہ تمہارا رہوں گا...... !

بابر

دو موتی میری ہیرے جیسی کٹورہ آنکھوں سے نکل کر کہاں گرے پتہ ہی نہیں چلا...... میں نے خط سنبھال کر اپنی ڈائری میں رکھ لیا کہ اب یہ باب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا تھا...... مگر خدا نے ایک کرم ان دنوں مجھ پر کیا کہ ...... میری طبیعت خراب رہنے لگی...... اور اس وجہ سے میرے آنے والے تمام رشتے لوٹا دیے گئے...... اچھا ہوا کہ میرا فیصلہ کسی کو پتہ ہی نہیں چلا ورنہ اس بار تو شاید چھوٹے بھیا کو چاقو اپنے حلق کے پار کرنا ہی پڑ جاتا......

گھر کی بگڑی فضا پھر سے بدلنے لگی سب پہ کچھ ہی ہونے لگا جیسے کچھ ہی جیسے میت کے گھر میں ہوتا ہے پہلے دن کچھ اور دوسرے اور تیسرے اور پھر مہینے بھر بعد کچھ اور...... سب مرنے والے کو کرتک کرنا چھوڑ دیتے ہیں اور مگن ہو جاتے ہیں اپنی دنیا میں...... میں بھی اس گھر میں مر چکی تھی اور مجھے کوئی اپنی یادوں میں بھی زندہ رکھنا نہیں چاہتا تھا...... پھر بھلا میرا ذکر کیونکر......؟

رمضان آئے وہی عبادات کا اہتمام وہی سحری افطار کی بہاریں...... وہی صدقات وخیرات کا در کھل جاتا...... سوال لیے لوگ آتے اور جھولیاں بھر بھر دعائیں دے کر چلے جاتے پھلنے پھولنے کی، ہر جگہ ہمارے گھر کا ماحول اتنا پاکیزہ مشہور تھا کہ لوگ اکثر مسائل کا حل پوچھنے آتے تھے کہ کیا کیا جائے......

امی کی پاکیزہ عبادتیں مشہور تھیں، گھر میں اتفاق رشتے داروں کے حقوق کی ادائیگی، نبھاؤ، سب کچھ بہت مشہور تھا...... رمضان المبارک کی ستائیسویں تاریخ تھی کہ بھائی جان، چھوٹے بھیا اور بھیا میرے کمرے میں آئے ان کے ساتھ امی بھی تھیں...... میں نے حیرانی سے انھیں دیکھا...... ان کے ہاتھوں میں کچھ کاغذات تھے۔

"زیب...... ابو کی جائداد کا بٹوارہ ہو گیا ہے اور ہم کسی کا حق نہیں مارنا چاہتے۔ ہم حقوق العباد کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ یہ تیرے حصے کی جائداد کے کاغذات ہیں خدا ہمیں کسی پکڑ میں نہ پکڑے ہم نے انصاف سے کام کیا ہے امی گواہ ہیں......"

انھوں نے کئی کاغذات میری طرف بڑھا دیے...... جنھیں میں نے دیکھا ضرور مگر پکڑا نہیں...... میں ان انصاف پسند لوگوں کو دیکھ کر حیران تھی جو اپنے عدل وانصاف کے ثبوت دینے آئے تھے، سرخروئی چاہتے تھے، انھیں اللہ کا قول یاد تھا کہ قیامت کے دن منصف کی سخت پکڑ ہوگی...... "مگر کیا صرف جائداد کے منصفوں کی؟ کیا ان کے ضمیر مطمئن ہیں؟ انھوں نے واقعی میرے ساتھ انصاف کیا ہے؟ ہاں زمانے کو پتہ ہے انصاف کیا ہے: باپ کی جائیداد کی رتی رتی کا حساب کیا ہے لوگ واہ واہ کر رہے ہیں کہ بہن کو اس کا پورا پورا حق دے دیا......" میری اس بے حسی نے انھیں مزید کچھ کہنے سے روکے رکھا اور میرے اس بیگانہ رویہ نے ان کی ہمت توڑ دی...... اور وہ کاغذات میرے آگے ڈال کر چلے گئے۔

اللہ کی رحمت میری طرف بڑھ رہی تھی مجھے اس کمرے میں بند ایک سال ہو گیا تھا...... میری طبیعت اب بخار کی شکل اختیار کر چکی تھی، جو ہر وقت مجھے رہنے لگا تھا...... میری بیماری نے ایک دن مجھے ہاسپٹل پہنچا دیا جہاں مجھے یہ خوش

خبری ملی کہ مجھے ٹی بی ہو چکی ہے۔ گھر والوں کے لیے یہ خبر خوشی کی تھی یا غم کی مجھے نہیں پتہ مگر میرے لیے، بہت دنوں بعد نوید مسرت آئی تھی۔ اس کی رحمت کے آگے میرا سر جھک گیا۔ مجھے آزادی ملنے میں اب زیادہ دیر نہیں تھی۔ اب میرا ہر ماہ چیک اپ ہوا کرتا تھا ڈاکٹر مجھے ایک ماہ کی دوائیں دے کر بھیج دیا کرتے...... اور سخت ہدایات بھی کہ "دوائیں برابر کھانا ہیں۔"

بھیا بھی مجھ سے کئی بار کہہ چکے تھے: دوا وقت پر کھالیا کرو۔ مگر میں، کاش میں خود کو ہلاک کر سکتی...... مگر میں اللہ کے آگے جھکا سر اس کی حکم عدولی نہیں کر سکتی تھی اس لیے کچھ اس طرف سوچا ہی نہیں...... ہاں روز رات کو بابر مجھ سے شکایت ضرور کرتے تھے کہ: "زیب، دوائیں کھایا کرو، کھڑکی کے باہر پھینکا مت کرو......" کیونکہ ڈاکٹر کے کہنے کی وجہ سے میں اپنے پرانے کمرے میں آگئی تھی کہ میرے لیے تازہ ہوا بہت ضروری تھی اور اس کمرے کی ایک کھڑکی باہر کی طرف کھلتی تھی...... اور یہیں میں پہلی بار انھی دیواروں اور چھت کے زیر سایہ اپنے تخیلات میں بابر سے ملی تھی۔ مجھے اس سے ملے اب نو سال ہونے کو آئے تھے...... مگر میں بابر سے کچھ کہہ نہیں پاتی تھی...... مجھے ڈر لگتا تھا تو صرف بابر سے...... کیونکہ مین نے ایک گولی بھی آج تک دوا کے نام پر نہیں کھائی تھی...... دوائیں آتی ضرور تھیں مگر ہر ہفتہ میں انھیں باہر پھینک دیا کرتی تھی اور گھر والے مطمئن تھے کہ میرا علاج ہو رہا ہے مگر حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے اب اپنے رب کے پاس جانے کی جلدی تھی، میں اس جسم کے بندھن سے آزاد ہونا چاہتی تھی۔ یہ جسم جس کو ان لوگوں نے اتنا بڑا مسئلہ بنالیا اور میرے روحانی پیار کو مارنا چاہا وہ تو ایک دن ایک پل بھی نہیں مرا...... کیا سچی محبت مر سکتی ہے...... نہیں محبت ہمیشہ زندہ رہتی ہے، مر تو ہم جاتے ہیں...... اسے تو حیات جاوید حاصل ہے۔ فانی تو ہم ہیں...... اسے تو کائنات چلاتی ہے اور ہم اس کائنات کی خاک میں مل کر مٹی ہو جاتے ہیں......

مجھے اس دن کے بعد سے پتہ نہیں بابر کا کیا ہوا وہ کیسا رہا...... ہاں مجھ سے وہ روز اسی طرح ملنے آتا تھا، اور مجھے جینے کا ہنر سکھا کر چلا جاتا تھا...... کہتا تھا: ہم اس کے یہاں ضرور مل جائیں گے تو بابر...... اب تمھارے بغیر میں جی ہی نہیں سکتی...... سب سمجھتے ہیں وہ جیت گئے...... مگر جیت تو اس پاکیزہ محبت کی ہوئی ہے، جو ہمارے دلوں میں زندہ ہے......

میری سانس اکھڑ رہی ہے...... لگتا ہے آج بابر سے ملنے کی ساعت قریب آتی جا رہی ہے...... آج میں اس ڈائری کا آخری ورق لکھ رہی ہوں...... کہ مجھے بابر کے پاس جانا ہے...... میری آنکھیں بند ہو رہی ہیں...... یہ کیا بابر تم بھی آج میرے ساتھ آنکھیں بند کیے لیٹے ہو...... اچھا مجھے یقین ہو گیا...... تم بھی آج ہی مجھ سے ملنے جا رہے ہو تو چلو...... پھر اُڑ جائیں...... اللہ حافظ...... زیب النساء

جنازے کی رخصتی کے بعد کمرے سے چھوٹے بھیا یہ ڈائری اٹھا کر لائے تھے اور پڑھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے کہ: زیب یہ تو نے کیا کیا...... تو نے ایک بار کہا تو ہوتا...... ایک بار...... اور آس پاس بیٹھے لوگ انھیں تسلیاں دے رہے تھے۔

☆☆☆

شجر ممنوعہ کی چاہ میں

• پرویز شہریار

اس نے کہا تھا:

"ازدواج کی عارضی ادلا بدلی سے فرسودہ رشتے میں نئی بہار آجاتی ہے جس سے رشتے کی جڑ مضبوط ہوتی ہے اور محبت کے بوسیدہ شجر پر نئی کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں۔"

اس نے جھوٹ کہا تھا:

"میں اس شجر ممنوعہ پر چڑھنا نہیں چاہتی تھی۔ مجھے اس سے کراہیت ہوتی تھی۔ لیکن، اس کی خوشی کے لیے، میں نے خود کو سمجھا لیا تھا۔ اپنے دل کی ایک نہیں سنی تھی اور بے قرار دل پر پتھر رکھ کر اس کی باتوں میں آ گئی تھی۔"

مجھے نیچے سے دھکا دے کر جب وہ شجر ممنوعہ پر چڑھانے لگا، تب میرا ماتھا ایک دم سے ٹھنکا تھا۔ میں نے نیچے گہرا کنواں دیکھ لیا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں اور تمام اعضا جواب دینے لگے تھے۔ میں درخت سے نیچے گرنے ہی والی تھی کہ تبھی کسی نے اوپر درخت سے ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔ میں نے دیکھا، کوئی شخص پہلے ہی سے وہاں مجھے سہارا دے کر اوپر اٹھانے کے لیے موجود تھا۔ ایک پل کو مجھے لگا میرے تن پر ایک کپڑا نہیں ہے۔ دنیا مجھے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی ہے۔ لیکن جب حواس ٹھکانے لگے اور غور سے دیکھا تو وہاں ہر طرف ہمارے ہی جیسے لوگ موجود تھے۔ شجر ممنوعہ کا سرسبز و شاداب نخلستان اور دور دور تک ریگستان کا لامتناہی گھُپ اندھیرا۔ ہر درخت پر کوئی آدم زاد موجود تھا اور حوا کی بیٹیاں شجر ممنوعہ پر زبردستی چڑھائی جا رہی تھیں۔ درخت کے پھل کھاتے ہی احساسِ زیاں جاتا رہا اور گہرے کنویں کا خوف بھی کافور ہو گیا۔ ہر طرف اٹکھیلیاں چل رہی تھیں اور خشک ریگستان کے ٹھیک بیچوں بیچ قہقہوں کے قل قل کرتے چشمے پھوٹ رہے تھے۔

ہم محبت کے رس میں بھیگے ہوئے تھے۔ ہمیں غیر مرد کی آغوش میں خود سپردگی کے لیے خود ہمارے شوہر آمادہ کر رہے تھے۔ ان کی مدد سے ہم اپنے لباسوں کی قید سے انتہائی حساس طریقے سے دھیرے دھیرے آزاد ہو رہی تھیں۔ ہمارے جسم کے تمام رونگٹے کانٹے دار گرگٹوں کی طرح کھڑے ہوتے جاتے تھے، جوں جوں مردانہ ہاتھوں کے لمس سے ہماری حساس جلدیں مس ہوتی جاتی تھیں۔ اوپر سے نیچے تک ہمارے اعضا بھی گرگٹ کی طرح رنگ بدل رہے تھے... کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کون سا ہاتھ اپنے اور کون سا پرائے مرد کا ہے۔ پورے

بدن میں کپکپاہٹ سی دوڑ رہی تھی۔ ہم پر بے خودی اس قدر طاری تھی کہ کچھ بھی سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ ہر پل بلکہ ایک ایک پل کے ہزارویں حصے میں بھی احساس کی لاکھوں کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ ہمارے جنسی غدودوں میں اس قدر ہلچل مچی ہوئی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ پرکرتی اور پُرش کے اس ملن نے فطرت کے کاموں میں دخل در معقولات کر کے جوالا مکھی، طوفان اور سیلاب تینوں کے گیٹ بیک وقت کھول دیئے ہوں۔ ہم خس وخاشاک کی طرح جنسی ہیجان کے سیل رواں میں بہتے جا رہے تھے۔

ہوش تب آیا جب دھیرے دھیرے موسیقی کی دھن مدھم پڑنے لگی اور جلتی بجھتی برقی قمقموں کی رنگ برنگی روشنی ماند پڑنے لگی۔ جسموں کے ملن کا سنگم پھیتری ہوئی پرچھائیوں کی اوٹ میں گم تھا۔ وہاں تو صرف لیزر بیم کی چھنکتی روشنی میں کوئی مخصوص عضو روشن ہو اٹھتے تھے۔ کون سا عضو کس کا تھا، اسے دیکھنے کا ہوش کسے تھا۔

میرا شوہر شروع سے شہوت پرست اور حسن کا پرستار تھا۔ لیکن ہماری شادی شدہ زندگی میں جب چنگاریاں سرد پڑنے لگیں تو ایک دن، شام کی ملگجی روشنی میں اس نے سرگوشی سے میرا دل ٹٹولتے ہوئے کہا تھا۔ جانِ من! میں ایک ایسی جگہ جانتا ہوں جہاں جانے سے ہماری ازدواجی زندگی کی خوشیاں پھر سے لوٹ آئیں گی۔"

میں اپنی پوری شدت سے اُسے اُس کے ارادے سے باز رکھنے کے لیے منع کرتی رہی...

لیکن مجھے معلوم تھا۔ وہ ایک بار کسی چیز کی ضد پکڑ لے تو اسے منع کرنا بہت ہی مشکل کام ہو جاتا تھا۔

مجھے جس بات کا سب سے زیادہ ڈر تھا، آخر وہی ہوا۔ دھیرے دھیرے اس نے احساس محرومی میں مبتلا ہو کر بہت زیادہ شراب نوشی کرنی شروع کر دی۔ رات میں گھر دیر سے آنے لگا۔ ہر وقت اس کا موڈ اکھڑا اکھڑا سا رہنے لگا۔

مجھے طرح طرح سے، اس نے یہ باور کرانے کی کوشش کرنی شروع کر دی کہ "وہ سہی" ہے اور میں اس کی بات مان لوں... آخر ایک دن اس کی ضد کے آگے میں جھک گئی۔ کیونکہ، میں اسے زیادہ دنوں تک روٹھا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ آخرکار، ایک دن جب میں اچھے موڈ میں تھی تو میں نے اُس کے لیے "حامی" بھر لی۔

وہ خوشی سے ناچ اُٹھا۔ اُس کے دل کی مراد پوری ہو گئی تھی۔

وہ مجھے اُس پُر اسرار جگہ پر لے گیا۔

وہ جگہ کیا تھی، ایک خفیہ کلب تھا۔ جہاں زوج کی ادلا بدلی ہوتی تھی۔ اصل میں، وہ کلب کثیر جنسی سرگرمیوں کی آماجگاہ تھا۔

اس کے دونوں ہاتھ کھمبے کے ساتھ ریشم کی ڈور سے بندھے ہوئے تھے اور وہ مست ہاتھی کی طرح جھوم رہا تھا۔ نسائی ہاتھوں کی مخروطی انگلیوں کے لمس سے اس کی گردن، پیٹھ اور پہلوؤں میں متواتر سہرن سی دوڑ جاتی تھی۔ یہ جسم وجاں کے اندر موجود مثبت حیوانی توانائیوں کو ہوا دے کر اسے تسخیر کرنے کا عمل تھا۔ جسے عرفِ عام میں کالا جادو جگانے کے عمل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اول اول مرد وزن خوشنما پوشاکوں میں ملبوس یہاں وہاں گھوم ٹہل رہے تھے۔ لیکن جوں جوں موسیقی کی دھن

میں تیزی آتی گئی، ان کے جسم کپڑوں سے بے نیاز ہوتے چلے جاتے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے، مادرزاد انسانوں کا وہاں ایک جمگھٹا سا نظر آنے لگا تھا۔ وہ سب کسی اور ہی دُنیا سے آئے ہوئے دُم کٹے جانور معلوم ہوتے تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ عریانیت کوئی معیوب چیز نہیں ہے۔ جب خدا، گوڈ اور ایشور نے ہمیں اسی روپ میں بنایا ہے تو پھر اس پر سے یہ آورن کیوں اوڑھا جائے۔ ننگے رہنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ جب ہم دوسروں کی بیویوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں تو ہمارے اندر منفی توانائی پیدا ہوتی ہے جس کا انخلا ضروری ہے۔ اس طرح سے آزادانہ رہ کر ہم جس استری سے جی چاہے سمبھوگ کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ استری بھی آپ کے اندر کشش محسوس کرتی ہو۔

اس عمل سے ہمارے اندر مثبت توانائی پیدا ہوتی ہے اور وقفے وقفے سے بطن اور دماغ میں مجتمع ہونے والی منفی توانائیوں سے ہمیں نجات ملتی ہے۔ ہم برے خیالات سے بچتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ایشور ہمیں ایسے روپ میں زیادہ پسند کرتا ہے۔ ہاں! جس کے اندر شہوانی جذبات کو مہمیز نہ ملتی ہو وہ شانت رہ سکتا ہے۔ اسے اسی میں آنند آتا ہے لیکن جس کی ترشنا جتنی تیز ہوتی ہے، وہ ترپتی کے لیے اتنا ہی زیادہ پریاس کرتا ہے۔ یہ فطری بات ہے۔ آپ پیاسے گھوڑے کو پانی پینے سے روک تو سکتے ہیں لیکن جس گھوڑے کو پیاس ہی نہ لگی ہوئی سے آپ زبردستی پانی نہیں پلا سکتے۔ اسی طرح آپ کسی بھی کام کو زبردستی نہیں کر سکتے۔ اگر روچی نہ ہو تو کھانے سے ہاتھ کھینچ لینے ہی میں بھلائی ہے۔

میں نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔

اس وقت میری عمر چھیالیس سال کی ہو چکی تھی۔ لیکن میرے شوہر کی بھوک تھی کہ اس کی عمر میں اضافے کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہی جا رہی تھی، اس کی شہوانی خواہشات مزید جوان ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ مجھے اپنے ہاتھوں سے بنا و سنگھار کر کے کلب لے جاتا۔ میرے گورے گورے انگوں میں ایک قدرتی کساؤ برقرار تھا اور میرے جوبن کے اُبھار بھی ماند نہیں پڑے تھے۔ لیکن اندر سے میں خود کو کمزور محسوس کرنے لگی تھی۔ میں اپنے شوہر کی خوشی کے لیے وہ سب کچھ کر رہی تھی جس سے کہ وہ خوش رہے۔ مجھے غیر مردوں کے ہاتھوں میں جھولنے، ان کی بانہوں میں مچلنے اور اپنے ہونٹوں کے زاویے میں ان کی زبان کی پھسلن محسوس کرنے میں کچھ مزہ نہیں آتا تھا۔ لیکن جب اپنے شوہر کے سامنے دوسرا مرد آپ کے وجود کو جھنجھوڑتا ہے تو یقیناً آپ کے اپنے مرد کے اندر رقابت اور حسد کا ایک شعلہ سا لپک اٹھتا ہے اور وہ اس کی تپش میں جھلس کر اپنے اندر کی گرمی دوسری عورتوں کے اندر جا کر ٹھنڈا کرتا ہے۔ یہ شعلوں سے کھیلنے کا ایک غیر فطری عمل ہے۔ لیکن یہی کام میرے شوہر کے اندر ہر بار جینے کی ایک نئی امنگ پیدا کر دیتا تھا۔ کئی ماہ تک آنکھ مچولی کا یہ سفلی کھیل چلتا رہا۔ اس کے اندر تیزی سے تبدیلی آ رہی تھی۔ یہاں تک کہ ہماری ازدواجی زندگی میں ایک ایسا بھی موڑ آیا جب مجھے اس کی خوشی سے نفرت اور چڑھ سی ہونے لگی۔

دراصل، وہ نیا نیا امیر ہوا تھا اور اپنی اسی امارت کے گھمنڈ میں دُنیا کی حسین ترین دوشیزاؤں کو اپنی بستر کی زینت بنا رہا تھا۔ اس کا دل ہر پل کسی ایسی الھڑ اور البیلی حسینہ کو ڈھونڈتا جو اس کے پہلوؤں کو ہر وقت گرم کرتی رہے، —— اُس کا ماننا تھا کہ آج جو کچھ بھی اس کے پاس ہے وہ سب اس کی نجی محنت کا ثمرہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ میرا شوہر بہت لکی تھا۔ اس نے اپنے بھائی کے ساتھ مل کر ریئل اسٹیٹ کا کاروبار شروع کیا تھا۔ اسے دن دوگنی رات چوگنی ترقی ملی۔ گویا کوئی پارس پتھر اس کے ہاتھ لگ گیا ہو۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ایمپائر کھڑے کر لیے، فارم ہاؤس خرید لیے اور شہر کے گرد و نواح میں کئی ہوٹلیں کھول لیں۔ ہر ہوٹل میں باربی کیو اور ڈانس فلور بنوا رکھے تھے جہاں نوجوان جوڑیاں ڈنر سے پہلے اپنی بھوک بڑھانے کے لیے ڈانس کیا کرتی تھیں۔ کبھی کبھی میں اپنے شوہر کے ساتھ وہاں جاتی تو ان کا دل رکھنے کی خاطر میں بھی کچھ اسٹیپس کر لیا کرتی تھی۔ وہ مزید ضد کرتا لیکن میں زیادہ ساتھ نہیں دے پاتی تھی۔

میری شادی جب ہوئی میں سولھویں سال کے میٹھے شباب کے دور سے گزر رہی تھی۔ جب بالی عمر کی لڑکیاں سپنوں میں اپنے شہزادے کو گھوڑے پر آتا ہوا دیکھتی ہیں۔ مہوئے کے رس سے جب انگ انگ مہک رہا ہوتا ہے اور درد کے میٹھے چبھن سے سارا جسم ٹوٹ رہا ہوتا ہے۔ ایسے میں من کرتا ہے کہ کوئی آپ کو ٹوٹ کر چاہے، کوئی پیار کرے اور کوئی آپ پر اپنی جان نثار کرے۔ میں بھی چاہتی تھی کہ میں ایسے سپنوں کے راجکمار کے ہاتھوں میں اپنے حسن کے خزانے سونپ کر اس کی باہنوں میں سکھ چین کی بانسری بجاتی ہوئی عمر بسر کردوں۔

لیکن ایسا نہیں ہوا۔

جب میری شادی ہوئی۔ میرے شوہر کی عمر بیس سال تھی۔ اس کے ہاتھوں میں اپنا کوئی کاروبار نہیں تھا۔ وہ اپنے مالدار بھائی کا شافر تھا۔ بھائی کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ وہ پیر و فقیر اور درگاہوں کی خاک چھان کر تھک چکے تھے۔ تبھی انھیں کسی نے مشورہ دیا کہ اپنے چھوٹے بھائی کی شادی کر دو۔ شاید اس کی قسمت سے اولاد کا سکھ نصیب ہو جائے۔ میرے شوہر کے ماں باپ بچپن میں ہی خدا کو پیارے ہو گئے تھے۔ وہ یتیم تھا۔ میں بیاہ کر آئی۔ گھر میں پھول جیسے دو بچے ہوئے۔ بڑے لاڈ پیار سے ان کی پرورش ہوئی۔ بڑے ہوئے، پڑھنے کے لیے یونیورسٹیوں میں چلے گئے۔ تعلیم مکمل کی، ملازمت ملی، پھر وہیں کے ہو کے رہ گئے۔

ایک دن میرے شوہر نے اداسی بھرے لہجے میں کہا تھا:

اتنی کم عمر میں شادی ہوئی۔ کیسے بچے ہوئے۔ کب پلے بڑھے کچھ پتہ ہی نہیں چلا۔ شادی تو گڈے گڑیے کا کھیل ہو گیا۔ جب تک سمجھ میں آیا کہ شادی کیا ہوتی ہے، کیوں ہوتی ہے اور زندگی کا لطف کیسے لیتے ہیں۔ تب تک پل کے نیچے سے بہت سارا پانی بہہ چکا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ زندگی صرف ایک بار ملی ہے لہٰذا اسے کھل کر اپنی پوری قوت سے جینا چاہتا تھا۔

اُس نے کہا تھا:

میں ایک خود ساختہ انسان ہوں۔ تم جانتی ہو، میں سڑک سے اُٹھ کر یہاں تک پہنچا ہوں۔ جہاں دُنیا کی عظیم الشان چیزوں تک آج میری رسائی ممکن ہو پائی ہے۔ آج میں جب چاہوں، حسین سے حسین دوشیزہ کو اپنے بستر کی زینت بنا سکتا ہوں۔ یہ سب میں نے اپنے عزیز ترین جذباتی رشتوں کو کھو کر حاصل کیا ہے۔ اس مشینی دور میں، اپنے سچے اور معصوم جذبات کا میں نے خود اپنے ہاتھوں سے خون کیا ہے۔

تم جانتی ہو، میں ایک مابعد جدید انسان ہوں۔ میں ان سب چیزوں سے کسی بھی قیمت پر تیاگ نہیں لے سکتا۔ میں سنیاسی بن کر جینا نہیں چاہتا۔ یہ زندگی صرف ایک بار ہی ملی ہے۔ لہٰذا، میں اس سے لطف اُٹھانا چاہتا ہوں۔ میں اپنی جنسی تشنگی کو تہہ دامن دبا کے مہاپرش اور مہاتما بننے کا آڈمبر نہیں رچ سکتا.....

میں اپنے شوہر کے ارادے کے حوالے سے ایک التباس میں مبتلا تھی۔ ایک طرف وہ قدرت سے اپنے شخصی نقص کا انتقام لینا چاہتا تھا۔ تو دوسری طرف اس کے دماغ میں ازدواجی زندگی سے متعلق ایک تشنگی سی گھر کر گئی تھی۔ بس، یہی فتنہ سا خیال تھا۔ جس کے انکر نے کے بعد کونپلیں متواتر پھوٹتی رہیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک تناور درخت میں تبدیل ہوگیا۔ اس کی بوالہوی نے کسی برگد کی جڑوں کی طرح سے اپنے شاخسانے چاروں طرف پھیلانے شروع کر دیئے۔ حتیٰ کہ اب وہ بڑھتے بڑھتے ایک مہیب جگادری درخت میں منتقل ہو چکا تھا۔

ہاں! وہی شجرِ ممنوعہ:

اس شجرِ ممنوعہ کی جڑوں سے لگا ایک گہرا کنواں بھی تھا جسے دیکھ کے ڈر لگتا تھا۔ مگر اس درخت کے پھل نے مجھے اوّل اوّل ایسا مدہوش کیا کہ اس کی سرشاری میں میرے حواس ٹھکانے نہ رہے اور جب ہوش آیا تو میری دنیا پوری طرح سے اُجڑ چکی تھی۔

وہ کالی بھوجنگ تھی، جیسے کوؤں کی کوئی پری!

اُس کی بوٹی بوٹی چمکتی تھی، کسی ناگن کی طرح۔ ایک بار جو اُسے آنکھیں بھر کے دیکھ لیتا مجال نہیں کہ اس کی نگاہیں اس پر سے دم بھر کو بھی ہٹ جائے۔ یہ سچ ہے کہ اس کے اندر بلا کی کشش تھی۔

میرا شوہر بلا کی کشش کی زد میں آ چکا تھا۔ وہ اُس پر لٹو تھا۔ اسے ایسی پُرکشش عورتیں بڑی مرغوب تھیں۔ لیکن اس کے اندر اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ انھیں اپنی طرف متوجہ کر سکے۔ وہ انھیں مخاطب کرنے سے ڈرتا تھا۔ کیوں کہ اس کے اندر ایک قدرتی نقص تھا، 'وہ ہکلاتا تھا'۔ وہ اپنے اس ہکلے پن کے قدرتی نقص کو خالقِ کائنات کا تخلیقی نقص تصور کرتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ قدرت نے اس کے ساتھ بے انصافی کی ہے۔ چنانچہ، وہ اس کا انتقام اس کی مخلوق سے لینے پر آمادہ تھا۔ اس انتقام کی آگ میں وہ جل رہا تھا۔ اس نے اس کے لیے انتھک محنت کی اور جوں ہی خاطر خواہ دولت جمع کر لی، وہ اپنے مشن پر لگ گیا تھا۔ تبھی اسے اس کلب کا پتہ چلا تھا۔ اس نے اپنا وقت ضائع کیے بغیر ایک تہہ شدہ منصوبے کے مطابق مجھے شیشے میں ڈھال لیا تھا۔

اُس کی طرف سے میں غفلت میں تھی۔ جب ہوش میں آئی، بہت دیر ہو چکی تھی۔ تب تک وہ قدرت کے ہر شاہکار کو شکست و ریخت کر دینا چاہتا تھا۔ اس کی نظر میں عورت سے بڑھ کر قدرت کا شاہکار اور بھلا کون ہو سکتا تھا!

لہٰذا، اس نے ہر مسکراتی ہوئی کلی اور ہر کھلتے ہوئے پھول کو اپنے پیروں تلے بے رحمی سے روندنا شروع کر دیا تھا۔

اس نے جھوٹ کہا تھا:

''ازدواج کی عارضی ادلا بدلی سے فرسودہ رشتے میں نئی بہار آ جاتی ہے۔ جس سے رشتے کی جڑ مضبوط ہوتی ہے اور محبت کے بوسیدہ شجر میں نئی کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں۔''

لیکن —— جب کبھی سوچتی ہوں تو لگتا ہے:

اس نے سچ ہی کہا تھا۔

''محبت کے بوسیدہ شجر میں نئی کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں۔''

ہاں! کونپلیں تو پھوٹیں اور خوب پھوٹیں لیکن یہ اور بات ہے کہ اس کے ساتھ ہی میری قسمت بھی پھوٹ گئی۔

وہ میرے سامنے اس کلجگ کی گوپیوں سے پینگیں بڑھاتا رہا اور میں گم صم بنی اپنی آنکھوں سے یہ سب تماشہ دیکھتی رہی۔ بھانت بھانت کے رنگ روپ کے مردوزن جب ایک دوسرے میں پیوست ہوتے تو آدم زادوں کا ایک ایسا ہیولا تیار ہو جاتا تھا، جو اپنے آپ میں کسی شجر ممنوعہ سے کم نہ تھا۔ اس پر مستزاد وہ لمبی سیاہ زلفوں والی ڈائن تھی جو مردوں کے ہاتھوں میں شراب سے لبریز کسی پیمانے کی طرح گردش کرتی رہتی حتیٰ کہ اس کے گرد مردوں کی لام لگ جاتی اور وہ سب اکٹھے اسے اپنے گرم گرم ہونٹوں سے چومتے تھے۔

ادھر میں اپنے ہاتھوں سے اپنے نصیبوں کو رو پیٹ کر بیٹھ چکی تھی۔ میری حیثیت اُس چوسی ہوئی آم کی گٹھلی کی مانند ہو چکی تھی جو آدم زادوں کی ٹھوکروں کی زد پر ایک جگہ سے دوسری جگہ پر جا کر گر پڑتی ہے۔ جسے گدھے بھی سونگھ کے چھوڑ دیتے ہیں۔

میرا شوہر بھی بہت بڑا گدھا تھا۔ اس کا سر گدھے ہی جیسا لمبا تھا جسے وہ سنبھال کر اپنے قابو میں نہیں رکھ سکتا تھا۔ جب اسے عشق کا دورہ پڑتا تو ڈھینچو ڈھینچو کرتا ہوا، سرعام اپنی سنک پوری کرنا شروع کر دیتا تھا۔

ایسے ہی کسی افسردگی کے اداس لمحوں میں میرے شوہر کے بڑے بھائی نے مجھے شہر کے سب سے قدیم سینے گاگ کے ایک ربیؔ سے ملاقات کروائی تھی۔ میری درد بھری داستان سننے کے بعد اُس نے مجھے توریت کا ایک واقعہ سنایا تھا۔

انھوں نے کہا تھا:

آدم جب جنت میں اپنے اکیلے پن سے گھبرانے لگے تو خدا نے ان کی دل جوئی کے لیے آدم کی پسلی سے حوا کو پیدا کیا۔ ایک ساتھی مل جانے کے بعد آدم اور حوا جنت میں خوب شاداں و فرحاں رہنے لگے۔ تبھی للت۔ جس کی شکل عورت کی تھی مگر اس کا بدن سانپ کا تھا، اُسے یہ سب دیکھ کے برداشت نہ ہوا۔ کیونکہ وہ جنت میں اس وقت سے موجود تھی جب حوا کا وہاں وجود بھی نہ تھا۔ دراصل، حوا وہاں بعد میں آئی تھی اور للت وہاں پہلے سے رہ رہی تھی۔ ایک دوسری عورت کو دیکھ کے للت کے اندر جلاپا شروع ہو گیا۔ اس نے آدم اور حوا کے خلاف ایک سازش رچی اور باغ بہشت کے ایک خاص شجر ممنوعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ارے یہ کیا بات ہوئی کہ جنت کا جو سب سے بہترین پھل ہے، بھلا اسے ہی کھانے سے منع کر دیا جائے۔ اس نے بی بی حوا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

دیکھو! تم یہ پھل ضرور کھانا۔ اس جیسا جنت میں کوئی دوسرا پھل نہیں ہے۔''

اتنا سننا تھا کہ حوا اپنی فطری معصومیت کی وجہ سے سازش کا شکار ہو گئیں۔ جنت کا پھل چکھتے ہی ان

کی شرمگاہیں عیاں ہوگئیں اور پھل کھا لینے کی پاداش میں انھیں خلد سے نکال دیا گیا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن عورت ہی عورت کے اخلاقی زوال کا سبب بنی ہوئی ہے۔

اس واقعہ کے سننے کے بعد مجھے لگا۔ میں بھی کسی سازش کا شکار ہوئی ہوں۔

میرے شوہر اور وہ سیاہ فام چڑیل ایک دوسرے کو شاید، بہت پہلے سے ہی جانتے تھے۔

وقت گزرتا رہا اور زندگی کسی ناگن کی طرح رات کی تنہائی میں ڈستی رہی مجھے برسوں۔ حتیٰ کہ رات کی تنہائی کے تصور سے ہی میری ہڈیوں میں کوئی سرد سی لہر دوڑ جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ، میری حالت غیر ہونے لگی۔ مجھے اپنے شوہر کی ایسی ذلیل حرکتوں سے نفرت سی ہونے لگی۔ وہ میرے پاس ہوتے ہوئے بھی مجھ سے کوسوں دور محسوس ہونے لگا تھا۔ میں اپنی نظروں کے سامنے اسے اپنے سے دور ہوتا دیکھتی رہی۔

میری اس لامتناہی اداسی اور گہری خاموشی کو دیکھتے ہوئے۔ میرے شوہر کے بڑے بھائی نے بڑی پدرانہ شفقت سے سمجھاتے ہوئے تھا۔

"دیکھو بیٹا!

محبت آزاد پرندہ ہے۔ اسے کھلی فضا میں چھوڑ دو۔ اگر لوٹ آئے تو تمھارا ورنہ وہ تمھارا کبھی تھا ہی نہیں۔"

یہ ایسی حقیقت تھی کہ جس کے تلخ گھونٹ مجھے تنہا پینے پڑے۔

میرا پرندہ کسی اور ہی مٹی کا بنا تھا۔ اسے نہیں لوٹنا تھا، وہ نہیں لوٹا ـــــــ میں یہ سب کس سے شیئر کرتی؟

میری مَتی ماری گئی تھی۔ کلب کی رنگین پرچھائیاں اس خرد ماغ کو شراب و شباب سے خوب شرابور کرتی رہیں اور میری آنکھیں دھوکا کھاتی رہیں، میری عقل پر پتھر پڑ گیا تھا۔ میری نظروں کے سامنے وہ اس سیاہ سمندر کے نمکین پانی میں غوطے کھاتا رہا ہے، متواتر ڈوبتا رہا، متواتر ابھرتا رہا اور حیرت ہے کہ اس کے قہقہوں کی آواز میرے کانوں میں نہیں پڑ رہی تھیں۔

آج، میں خود کو اکیلے پن کے ایسے اندھے کنویں میں گری ہوئی محسوس کر رہی ہوں، جہاں سے میری آواز باہر کی دُنیا تک پہنچ نہیں سکتی ہے۔ میں اندر ہی اندر چیخ رہی ہوں لیکن میرے آس پاس مجھے کوئی سننے والا نہیں ہے۔

افسوس!

افسوس! صد افسوس!! میں نے یہ کیا کیا!

شجرِ ممنوعہ کی چاہ میں!

☆☆☆
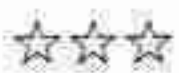
آدھی ادھوری عمارت کے آسیب

● راجیو پرکاش ساحر

وہ ایک اہم چوراہا تھا۔ نیشنل ہائی وے کے بیچوں بیچ ایک نقاشی دار فوارہ کو نصب کر کے اسے بنایا گیا تھا۔ اس فوارہ کے چاروں طرف چار رقص کرتی نیم برہنہ رقاصاؤں کے سفید پتھر کے مجسمے لگائے گئے تھے۔ ان کے چاروں طرف گولائی میں قرینے سے پتھر بچھا کر لوہے کی ریلنگیں لگائی گئی تھیں۔ چوراہے کے بائیں طرف اور دائیں طرف بھی اعلیٰ درجے کی کالونیاں تھیں۔ چاروں طرف سے چوڑی چوڑی سڑکیں اس چوراہے پر آ کر ٹکراتی تھیں۔ ادھر صبح گرم ہوئی نہیں کہ ٹریفک پورے جاہ وجلال سے اس چوراہے کے ارد گرد، ادھر ادھر دوڑنے لگتا تھا۔ پیدل، سائیکل، رکشے، ٹرالی، آٹو، ٹیمپو، سٹی بس، اسکوٹر، موٹر سائیکل اور کاروں کی چیخ پکار مچ جاتی تھی۔ یہ سلسلہ دیر رات تک چلتا ہی رہتا تھا، پھر مرکری لائٹوں کی چکاچوند تکبر بھری روشنیوں میں مہنگی رنگ برنگی لکژری کاریں نازنینوں کی طرح اترائی سرپٹ بھاگی جاتی تھیں۔ تیز رفتار بائکوں پر نوجوان، ان سے لپٹی ہوئی معشوقائیں، گھر لوٹتے کام کاجی لوگ وغیرہ وغیرہ سے چہل پہل بنی رہی رہتیں۔ چوراہے کے پاس ایک عالیشان مول بھی تھا، جس میں دو ملٹی پلیکس تھیٹر بھی تھے اور ایک بار تھی۔ اس کی رونق کا تو کہنا ہی کیا تھا۔

اس مول کے پیچھے ایک ادھوری بنی پانچ منزلہ عمارت تھی۔ عمارت کیا عمارت کا ڈھانچہ کہیے۔ برسوں سے یوں ہی ویران کھڑی تھی۔ تعمیری کام اس میں رکا پڑا تھا۔ اس کے کمپاؤنڈ میں جھاڑ جھنکھاڑ اُگ آئے تھے۔

اس وقت وہ اسی عمارت کے بیسمنٹ میں تھا۔ پانچ سال قبل صرف بیسمنٹ ہی بن پایا تھا کہ اس کی اپنے پارٹنر سے لڑائی ہو گئی۔ راجیش ڈوا کو اس بات کا احساس تھا کہ غلطی سراسر اس کی تھی۔ وہ بزنس میں اس قدر اندھا ہو گیا تھا کہ وہ دراصل اپنے پارٹنر کے ساتھ دھوکہ کرنا چاہتا تھا۔ اس کے پارٹنر کا گوا اور دبئی میں بڑا بزنس تھا۔ وہ دبئی چلا گیا اور جانے سے پہلے اس نے صرف اتنا کہا:

'راجیش، تم اس عمارت کو مانگ لیتے تو میں نا نہیں کرتا۔ میں دوستی سے زیادہ اہمیت کسی کو نہیں

دیتا...... مگر تم ...... تم رشتوں میں بھی ایماندار نہیں نکلے۔ اب تم اس عمارت کو کبھی بنوا نہیں سکو گے۔ میں کوئی مقدمہ نہیں کروں گا مگر تم نے دوبارہ اس عمارت میں ہاتھ لگانے کی کوشش کی تو پھر میں اپنا شیئر لینے آ جاؤں گا۔'

برس گزر گئے تھے۔ ان برسوں میں اس آدھی ادھوری عمارت کا بیسمنٹ ہی تھا جس کو اس نے آفس کی شکل دے رکھی تھی اور یہیں سے وہ اپنا بزنس مینجمنٹ چلایا کرتا تھا۔

شام کے ۷ بج گئے تھے۔ شکھا ابھی ابھی کمرے سے باہر نکلی ہے...... آدھی ادھوری عمارت کے بیسمنٹ میں اس وقت وہ بالکل تنہا ہے۔ لیکن شکھا کے الفاظ اب بھی اس کے کانوں میں گونج رہے ہیں:

'تم سن رہے ہو راجیش دُوا نہیں، تم نہیں سن رہے ہو......'

شام کے سائے گہرے ہو گئے ہیں۔ باہر اس کی گاڑی کھڑی ہے۔ آفس کے اسٹاف ۶ بجے ہی گھر چلے جاتے ہیں۔ وہ دوبارہ اٹھنے کی کوشش کرتا ہے مگر...... اس کا سر گھوم رہا ہے...... آفس کی ایک ایک شئے ناچتی ہوئی لگ رہی ہے۔

انھی دنوں جب اس کا پارٹنر اس کو چھوڑ گیا تھا اور اس نے بیسمنٹ پر آفس رکھنے کی قانونی اجازت حاصل کر لی تھی۔ شکھا اس سے ٹکرائی تھی۔ شکھا او برائے۔ لیکن شکھا او برائے کسی 'او برائے ہوٹل' کے مالک کی بیٹی نہیں تھی۔ ابھی ابھی کالج سے نکلی ہوئی ایک لڑکی تھی، جسے زندگی شروع کرنے کے لیے ایک جاب کی تلاش تھی۔

شکھا نے پہلی بار میں ہی اسے بتایا تھا:

'ممی نہیں چاہتی تھیں کہ میں کچھ کروں۔ مگر پاپا...... اکثر ان کی آنکھوں میں دیکھ کر لگتا، جیسے دنیا بھر کے آسیب گھوم رہے ہوں...... یہ آسیب نہیں ہیں......' وہ تلخی سے مسکرائی تھی۔ 'دراصل یہ میں ہوں۔ میں لڑکی ہوں نا...... لڑکی کا جوان ہو جانا ایک بوڑھے باپ کے لیے اس قدر مشکل ہوتا ہے کہ اسے آسیب گھیر کر بیٹھ جاتے ہیں۔'

'آسیب......؟' وہ چونکا تھا۔

شکھا نے قہقہہ لگایا۔ سر، مجھے دیکھیے۔ میں کسی آسیب سے کم ہوں کیا۔

'قیامت کو اگر آسیب کہتے ہیں تو......' وہ کہتا کہتا رک گیا تھا۔ شکھا کے سراپے کا جائزہ لیا۔ عمر یہی کوئی بیس بائیس۔ جینس کی پینٹ۔ ریڈ کلر کی ٹی شرٹ...... کچھ دیر تک شکھا سوچتی رہی۔ پھر پلٹ کر اس کی طرف دیکھا:

'ممی چاہتی تھیں، خاموشی سے میرے ہاتھ پیلے ہو جائیں......' وہ ہنس رہی تھی...... 'لیکن آج کل رنگ بھی مہنگے ہو گئے ہیں سر۔ پاپا میرے لیے پیلا رنگ کہاں سے لاتے اور میں...... اس نے زور دے کر کہا تھا۔ میں زندگی میں کمپرومائز کی قائل نہیں سر۔ میں آگے بڑھنا چاہتی ہوں۔ میرا گھر ایک چھوٹا سا دربہ ہے۔ جہاں سیلن بڑھ گئی ہے۔ میں اس دربے سے نکلنا چاہتی ہوں۔'

اور اس کے بعد شکھا اس کے آفس اور اس کے وجود کا ایک حصہ بن گئی تھی۔

پہلی بار اسے احساس ہوا تھا کہ زندگی کچھ اور بھی ہے...... زندگی صرف ایک آدھی ادھوری کنکریٹ کی عمارت نہیں ہے، ایک اور راستہ ہے جو چپکے سے زندگی کی ان حقیقتوں کو بیان کرتا ہے، جس کی

موسیقی وہ آج تک سن نہیں پایا...... شکھا دفتر کا ایک حصہ بن گئی۔ پھر دفتر سے گھر تک کے راستے کھل گئے۔ گھر، جہاں وہ اکیلے رہتا تھا۔ ایک تنہا زندگی اور اس زندگی میں پیسوں کی چمک دمک، شراب اور شباب کی راتوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ مگر شکھا کے آنے کے بعد اس زندگی میں تبدیلیاں آگئی تھیں۔ جیسے یہ کہ وہ سچ بولنے لگا تھا۔

اس رات...... شکھا خاموشی سے صوفے پر بیٹھی ہوئی کچھ سوچتی رہی۔ پھر پلٹ کر پوچھا:

'تو تم نے اپنے دوست کو دھوکہ دیا؟'

'ہاں۔'

'کم از کم سچ کہنے کی ہمت تو ہے تم میں۔'

'پتہ نہیں۔'

شکھا آہستہ سے بولی۔ 'کیوں سوچتے ہو کہ ایک دن یہ آدھی ادھوری عمارت مکمل ہوگئی تو تم بھی مکمل ہو جاؤ گے؟'

وہ اچانک چونک گیا تھا۔ شکھا اپنی دھن میں کہے جا رہی تھی — 'میں ایک دھند سے نکلی ہوں۔ گھبرا گھبرا سا۔ میرا پورا وجود بچپن سے اس کہاسے میں گم تھا۔ اس لیے جانتی ہوں، پیسہ ایک بڑی حقیقت ہے...... لیکن سب کچھ پیسہ ہی تو نہیں ہے......'

'وہ آہستہ سے بولی...... 'اپنے دوست سے معافی مانگ سکتے ہو تو مانگ لینا کبھی۔ میری خاطر......'

کنکریٹ کی آدھی ادھوری عمارت۔ اس نے اس عمارت کے چاروں طرف مضبوط دیواریں کھڑی کر دی تھیں۔ پھر بھی رات کے بانہیں پھیلاتے ہی عمارت کا خالی حصہ کسی آسیبی حویلی کی یاد دلانے لگتا تھا۔ کئی بار اسے احساس ہوا، یہ جسم بھی کتنا عجیب ہے، مانگیں تو ہوتی ہیں اور مانگیں کبھی بھی پوری کی جا سکتی ہیں مگر اس مانگ میں محبت شامل ہو تو احساس کے شبنمی قطرے مقدس ہو جاتے ہیں — وہ نہیں جانتا، شکھا اس کے لیے کیوں کمزور ہوئی؟ یا شکھا نے آفس اور آفس سے بستر تک آتے ہوئے کیوں سمجھوتہ کیا — شاید کہیں اندر چھپی ہوئی ایک آگ بھی ہوتی ہے۔ یہ آگ شکھا کے جسم میں بھی تھی اور تھوڑی بہت مدافعت کے بعد شکھا نے خود کو اس کے حوالے کر دیا تھا۔ مگر ان برسوں میں دوست کے ساتھ کی جانے والی بے وفائی کے صدمے کو شکھا بھول نہیں پائی تھی...... وہ اکثر رات کے سناٹے میں اس سے ہمکلام ہوتی......:

'ایک بار کی بے وفائی آگے کے لیے راستہ کھول دیتی ہے۔'

'ایسا نہیں ہوتا شکھا۔'

'ہوتا ہے......'

'کہیں تم......؟'

بستر سے اچانک اپنے نازک جسم کو سنبھالے وہ اٹھ کھڑی ہوتی، پھر کھڑکی کا دروازہ کھول کر کہیں دور

دیکھنے لگ جاتی۔

اس درمیان آدھی ادھوری عمارت کے دوسرے مسائل اور آفس کی زندگی سے الگ اس کے سامنے ایک نئی دنیا آباد ہو رہی تھی۔ لیکن اچانک وہ حادثہ ہو گیا تھا۔ وہ حادثہ جس نے اس کی پوری زندگی کو بدل دیا۔ دیکھا جائے تو اس سے پہلے آفس میں کام کرنے والی کسی بھی لڑکی رکمنی، شیلا یا مدھو کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہ تھا۔ بلکہ موٹے پیسوں کے عوض اس طرح کے امتحان سے گزرنے کے لیے وہ آسانی سے تیار ہو جایا کرتی تھیں۔ مگر اس بار اس امتحان کے لیے اس کے سامنے شکھا کا نام تھا۔ ایک لمحہ کے لیے بزنس جاگ گیا تھا اور محبت سو گئی تھی — اسے اس بات کا احساس تھا کہ پتہ نہیں شکھا اس کی اس بات کو کیسے قبول کرے گی۔ مگر اسے یقین تھا جس طرح آفس اور آفس سے بستر تک آتے ہوئے شکھا نے کوئی مزاحمت نہیں کی، ویسے یہ راستہ بھی آسان ہو جائے گا۔

شہر کے سب سے بڑے بلڈر آر۔ جے۔ بلڈر کی طرف سے اسے ایک بڑا کنٹریکٹ ملنے کی امید تھی — جس کو ملنے کے بعد وہ اپنی آدھی ادھوری حسرت کے خوابوں کی تعبیر آسانی سے دیکھ سکتا تھا۔ مگر اس لیے آر جے یعنی راجندر جین کو خوش کرنا تھا۔ اور اس کام کے لیے شکھا سے بہتر نام اس کے ذہن میں نہیں تھا۔

رات آدھی سے زیادہ گہری ہو گئی ہے۔ آسمان میں چاند تاروں کا رقص جاری ہے۔ اس رات شکھا کو بانہوں میں لیتے ہوئے وہ آہستہ سے بولا تھا...... 'کہیں قریب منزل کی موسیقی سنائی دے رہی ہے مجھے......'

'تو منزل کو پاس لے آؤ نا......'

اس نے چونک کر شکھا کو دیکھا اور اس کے برہنہ جسم کو اپنے جسم میں قید کر لیا۔

'لیکن اس منزل کے لیے.....وہ کہتا کہتا ٹھہر گیا تھا۔

'ہاں بولو نا......'

'مجھے تمھاری ضرورت ہے شکھا.....'

شکھا نے چپکے سے اس کے ہونٹوں پر بوسہ رکھ دیا — 'میں بھی تو اس دن کا انتظار کر رہی تھی......'

'انتظار۔' وہ ایک دم سے چونک گیا تھا۔ اس نے کپڑے تبدیل کر لیے — آئینہ کے سامنے کھڑا ہوا۔ سانسوں کو برابر کیا۔ اور پھر.....وہ شکھا کی طرف گھوما:

'آر جے بلڈر...تم جانتی ہو نا......'

'ہاں.....' شکھا چونک گئی تھی......

'تم آر جے کی خواہش پوری کر دو۔'

'وہاٹ......'

شکھا تیز آواز میں چیخی — 'تو تمھاری منزل سے مراد......'

وہ جلدی جلدی اپنے کپڑے پیکن رہی تھی ...... کمرے میں اس کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔ وہ ایک لفظ نہیں بولی۔ باہر ستاروں کا رقص تھم گیا تھا۔ وہ حیران سا شکھا کو باہر جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ یہ سوچنے سے قاصر تھا کہ آدھی رات کے سناٹے میں شکھا کس طرح اپنے کمرے میں جائے گی...... مگر اس کے ٹھیک دوسرے روز شکھا نے اپنا استعفٰی اس کے ٹیبل پر رکھ دیا۔ اس کی آواز بھاری تھی ......

ذہن میں اس وقت صرف تیز تیز آندھیاں چل رہی تھیں۔

'سنو راجیش' ایک وقفہ کے لیے وہ ٹھہری ...... پھر بولی ...... ' کچھ لوگ مکمل نہیں ہوتے ...... آدھے ادھورے ہی ہوتے ہیں۔ مجھے لگتا تھا میں بھی خود کو مکمل کرلوں گی۔ اور ایک دن تم کو احساس ہوگا کہ وقت نے ابھی تک کتنا آدھا ادھورا رکھا ہے تم کو...... مگر ......'

وہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی ...... 'اس آدھی ادھوری عمارت کی طرح تم ادھورے ہی رہے...... میں جا رہی ہوں......'

اس نے نظر اٹھائی تو تا حدِ نظر صرف اندھیرا تھا......

وہ ابھی تک اس اندھیرے کے درمیان کھڑا ہے...... اور محسوس کرتا ہے کہ اس نے خود ہی ہر اس روشندان کو بند کر دیا ہے، جہاں سے کبھی روشنی کی کرنیں بھی آیا کرتی تھیں——

☆☆☆

نالۂ شب گیر

● مشرف عالم ذوقی

(1)

نینی تال کے لیے دوبارہ نکلتے وقت کمال یوسف کے پیغام کا آخری جملہ مجھے بار بار پریشان کررہا تھا:
'زندگی میں بہت کچھ تبدیل ہو چکا ہے..... 'میں چاہتا تو فون پر یہ باتیں اس سے دریافت کرسکتا تھا۔ مگر وہاں پہنچنے تک میں اپنے تجسس کو قائم رکھنا چاہتا تھا۔ آخر زندگی میں کیا تبدیلی آئی ہوگی — ؟ لیکن اُس سے پہلے ایک جملہ اور تھا— کہانی بھیانک ہوگئی ہے— دلّی آئے ہوئے چھ مہینے گزر چکے تھے۔ کیا صرف ان چھ مہینوں میں بہت کچھ تبدیل ہوگیا— ؟ جیسا کہ کمال یوسف نے لکھا: 'کہانی بھیانک ہوگئی ہے'۔ میں بار بار اس جملے پر آکر رک جاتا تھا۔ آخر اس درمیان ایسی کیا بات ہوگئی ہوگی کہ کمال یوسف یہ لکھنے پر مجبور ہوا— نینی تال کی ہوشربا وادی میری نظروں کے سامنے تھی۔ میں کچھ لمحے کے لیے کمال یوسف، ناہید اور صوفیہ مشتاق احمد کی کہانیوں سے الگ قدرتی مناظر میں کھوجانا چاہتا تھا۔ مجھے ایک انگریزی نظم کی کچھ لائنیں یاد آرہی تھیں:

'یہاں جو کچھ ہے تمہارے لئے ہے،
تمہاری آنکھوں کے لئے،
اور جو کچھ تم سمیٹ سکتے ہو،
وہ تمہارا ہے۔'

میں نہیں جانتا، میں نے کچھ سمیٹنے کی کوشش کی یا نہیں۔ سمیٹنا چاہا تو ناہید ناز کی کہانیوں کے صفحے کھل جاتے:

'ایک دن اس سرزمین پر
عورت نہیں ہوگی،

ایک دن سبزہ سے خالی ہو جائے گی زمین پر
پھر ایک دن
مرد بھی نہیں ہوں گے نر

اور — کسی نے کہا تھا — سب سے پہلے عورتیں رخصت ہوں گی اس سرزمین سے۔ مرد وحشی اور درندے ہو کر اپنا ہی لہو بہاتے ہوئے نظر آئیں گے — حقیقت یہ ہے کہ دلّی کے ان چھ مہینوں میں، میں ناہید ناز کی زندگی کے خوفناک ترین صفحوں سے بندھ کر رہ گیا تھا — اور جیسا کہ ناز نے اپنی کہانی سناتے ہوئے غصے سے کہا تھا...... عورت ہر بار ایک جسم ہوتی ہے۔ عورت ہر بار ایک آگ ہوتی ہے۔ میں عورت کے وجود سے یہ جسم کھینچ لینا چاہتی ہوں...... میں مرد کو ایک جسم بنانا چاہتی ہوں...... جیسے مرد ہر بار یہ سوچے کہ وہ مرد کم ایک جسم زیادہ ہے، جیسے آنکھیں کھولتے ہی لڑکیاں...... اور لڑکیوں سے بنتی عورت ہر لمحہ یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ وہ لڑکی یا عورت بعد میں ہے...... پہلے ایک جسم ہے۔ اور مرد اس جسم پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑا کرتا ہے۔ اسے اذیت دیتا ہے۔ اس کی جسمانی کمزوریوں پر حاوی ہوتا ہے......'

'لیکن جسم تو مرد کے پاس بھی ہوتا ہے؟'

'نہیں —' وہ پہلے چیخی پھر زور سے ہنسی تھی...... جسم کہاں ہوتا ہے، وہ تو کچا پکا لوہا ہوتا ہے......' وہ کہتے کہتے اپنے ہی الفاظ کی کشمکش میں گم تھی...... لوہا نہیں...... مگر مرد اسے جسم نہیں سمجھتا۔ جسم تو بس عورت کو سمجھتا ہے...... گوشت خور......'

مجھے یاد ہے، اُس وقت وہ دور کہیں، کھڑکی کے اُس پار دیکھ رہی تھی...... میں اُس کے لفظوں کی یورش میں گم تھا۔ مرد کے پاس جسم کہاں ہوتا ہے...... میں نے خود کا جائزہ لیا...... آنکھوں کے آگے مردانہ علاج سے لے کر کنڈوم تک کے اشتہارات گھوم گئے۔ ناز جو کچھ کہہ رہی تھی وہ ممکن ہے ناز جیسی عورتوں کے لئے نفسیات کا ایک پہلو ہو، مگر ہزار ایسی عورتیں بھی ہیں اور ان اشتہاروں میں بھی، جو مردانہ جسم کو ہوس بھری نگاہوں سے دیکھ رہی ہوتی ہیں۔ اشتہار سہی، لیکن مرد کو بھی کہیں نہ کہیں عورت ایک جسم کے طور پر دیکھتی ہے۔ مگر بقول ناز، مردوں کے پاس جسم کہاں ہوتا ہے — اور اُس کی جنگ اس بات سے بھی تھی کہ مرد جب دیکھتا ہے تو لڑکی یا عورت غائب ہو جاتی ہے اور محض اُس کی جگہ ایک جسم ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے یہ پہلو بھی اُسی نفسیات سے وابستہ ہو، ناز نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں اور مسلسل جبر برداشت کرتی ہوئی وہ مردوں سے نفرت کرنے لگی تھی — ☆☆

(2)

اس بار نینی تال کی فضا بدلی ہوئی معلوم ہوئی۔ درختوں پر بھی خوشحالی کی جگہ ویرانی کا احساس ہوا۔ گھر میں میرا استقبال کمال یوسف نے کیا مگر اُس کے چہرے کے تاثرات سے ایسا لگا جیسے وہ ان لمحوں میں کسی

کشمکش سے گزر رہا ہو اور مجھے دیکھ کر تھوڑا پریشان بھی ہے۔
وہ آہستہ سے بولا: '......سب کچھ بدل گیا ہے......'
'ہاں۔ مجھے احساس ہو رہا ہے......'
پھر اُس نے بہت پیار سے آواز دی '......صوف......'
اور اب میرے چونکنے کی باری تھی۔ بیڈ روم سے ناہید کی جگہ شلوار اور جمپر میں ملبوس صوفیہ بھاگی ہوئی آئی تھی۔ مجھے جلدی سے سلام کرنے کے بعد وہ وحشت زدہ انداز میں کمال کی طرف مڑی:
'تم ٹھیک تو ہو......؟'
'ہاں کیوں؟'
'تم نے اتنی زور سے آواز دی...... میں تو پریشان ہو گئی۔'
'مہمان آئے ہیں......'
صوفیہ نے جلدی سے کمال کا ہاتھ چھوڑا...... 'میں ابھی چائے بنا کر لائی' کہتی ہوئی اندر کمرے کی طرف غائب ہو گئی—
میں نے سفری بیگ بستر پر رکھ دیا۔ اب میں کمال کی طرف دیکھ رہا تھا—
'سب کچھ بدل گیا ہے......'
'ہاں۔'
'شاید سب کچھ بدلنے کے لئے ہی ہوتا ہے......'
'شاید......'
'چائے پی لو...... پھر تم سے دریافت کروں گا کہ یہ سب کیسے ہوا......'
یہ وہی کمرہ تھا جہاں میں پہلے بھی ٹھہرا ہوا تھا۔ مگر اب یہ کمرہ مختلف تھا۔ دیواروں کے رنگ تک تبدیل ہو گئے تھے۔ بستر پر خوشنما چادر بچھی تھی۔ مجھے صوفیہ کو دیکھ کر حیرانی تھی۔ اور خاص کر جس طرح وہ کمال کے آواز دینے پر بھاگ کر آئی تھی، یہ بات مجھے پریشان کر رہی تھی...... وہ مکمل طور پر ایک بدلی ہوئی صوفیہ تھی۔
چائے پینے کے بعد میں نے کمال کی طرف دیکھا۔ وہ کھڑکی کے پاس کھڑا ہوا باہر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ مڑا اور بستر کے قریب والے صوفے پر بیٹھ گیا۔
'کہاں سے سناؤں؟' وہ ابھی بھی کشمکش میں تھا۔
'ناہید کہاں گئی؟'
'چلی گئی۔'
'کہاں؟'

'یہ ہمیں بھی نہیں معلوم......'

'لیکن یہ کب ہوا؟'

'جب آپ گئے تھے، اُس کے کچھ ہی دنوں بعد—

'اوہ......' میرے لئے شاکنگ نیوز تھی— لیکن ابھی میں جان بوجھ کر ناہید کے معاملے کو طول نہیں دینا چاہتا تھا۔ ابھی سب سے پہلے مجھے صوفیہ کے بارے میں پوچھنا تھا۔ ناہید کے بارے میں مجھے حیرانی تھی۔ آخر وہ اس طرح کیسے جا سکتی ہے— جب میں نے اس کا اظہار کمال یوسف سے کیا تو اُس نے لمبی سانس لی۔ میری طرف دیکھا......

'مجھے خود حیرانی ہے۔'

'باشا کہاں ہے؟'

'باشا صوفیہ کے پاس رہتا ہے۔ صوفیہ باشا میں اتنی گھل مل گئی ہے کہ اب اُسے باہر جانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔'

'ہونہہ—' میرے اندر کشمکش چل رہی تھی۔ میں نے غور سے کمال یوسف کے چہرے کا جائزہ لیا۔

'تم نے اسے تلاش نہیں کیا......'

'کیوں نہیں کیا۔ سب جگہ کیا۔ پولس میں رپورٹ لکھوائی۔ مگر......'

وہ آگے بولنا چاہتا تھا مگر میں نے اسے روک دیا۔

'ابھی ناہید کی کہانی روک دو۔ ہم اس کہانی پر بعد میں آئیں گے۔ ابھی میری دلچسپی صوفیہ میں ہے۔ صوفیہ یہاں کیسے—؟ ویسے کچھ معاملات تو میری سمجھ میں آنے لگے ہیں۔ مگر یہ سب اچانک......'

'یہ سب اچانک ہی ہوا' کمال یوسف کی نگاہیں کھڑکی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

'یہ انھی دنوں کی بات ہے۔ جب ناہید جا چکی تھی۔ ہم اُسے تلاش کرتے ہوئے پریشان ہو چکے تھے۔ پولس کی طرح میرا ابھی یہی خیال تھا کہ اب وہ اس دنیا میں موجود نہیں ہے۔ مجھے افسوس ہے لیکن شاید ناہید نے خود ہی یہ خوفناک راستہ اپنے لئے منتخب کیا تھا۔ پولس کا خیال تھا، پہاڑیوں سے کود کر اس نے جان دے دی۔ ایسی وارداتیں یہاں اکثر ہوا کرتی ہیں۔ میرے لئے مشکل یہ تھی کہ میں باشا کی پرورش کیسے کر پاؤں گا؟ وہ بھی اکیلے۔ باشا: مجھے تعجب تھا۔ ناہید نے باشا کے بارے میں کیوں نہیں سوچا۔ اچانک ناہید کا غائب ہو جانا۔ مجھے یہ پوری کہانی ہی پر اسرار نظر آ رہی تھی۔ میں غور سے کمال کا چہرے پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

'تو ناہید ایک دن اچانک چلی گئی......؟'

'اچانک نہیں۔'

'کوئی حادثہ ہوا تھا—؟'

'ہاں......وہ میں آپ کو بتانے والا تھا......'

'نہیں، ابھی اُس حادثے کے لئے رک جاؤ۔ تو ناہید چلی گئی اور تم نے اُس کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔
اور پولس کا بھی یہی خیال تھا کہ کوئی پہاڑی سے کود کر جان دے دے تو یہاں لاشیں برآمد کرنا آسان نہیں۔'
'ہاں۔'
اور تم نے سوچ لیا کہ اُس حادثے کے بعد، یعنی جو تم مجھے آگے بتاؤ گے، اُس کے بعد ناہید نے اچانک گھر چھوڑ دیا۔ اور اتنا بڑا فیصلہ۔'
'ہاں۔'
'میں یہی بات ماننے کو قطعی تیار نہ تھا۔ یعنی ناہید جیسی لڑکی جو زندگی کے اتنے سرد وگرم کو قریب سے دیکھنے کے بعد بھی زندہ رہی، اتنا خوفناک فیصلہ کیسے کرسکتی تھی؟ اگر اُس نے یہی فیصلہ کیا تھا تو اس کی زندگی میں پہلے بھی ایک ہزار مواقع آئے ہوں گے جب وہ اس قسم کا فیصلہ کرسکتی تھی۔ پھر اُس نے ان لمحوں میں یہ فیصلہ کیوں نہیں کیا؟ کیا شادی سے پہلے کی بغاوت اور شادی کے بعد کی زندگی اور بغاوت میں فرق ہوتا ہے۔ ناہید کا چہرہ آنکھوں کے پردے پر لہراتا تو احساس ہوتا، ناہید ایسا نہیں کرسکتی۔ مگر کمال یوسف کی باتوں پر بلا وجہ شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی میرے پاس۔ اس درمیان گفتگو کرتے ہوئے ہم چھت پر آ گئے تھے۔
کمال گہری سوچ میں ڈوبا تھا۔ ظاہر ہے، ناہید کے ساتھ ایک لمبا ساتھ رہا تھا۔ کچھ موقعوں پر اُس کے لہجے کی تھرتھراہٹ بھی میں نے محسوس کی تھی۔ چھت سے نیلا آسمان جھانک رہا تھا۔ دور تک پہاڑیاں اور جھیلیں نظر آرہی تھیں۔ یہاں شہر کسی حسین ساحرہ کی طرح نظر آرہا تھا۔ دلکش بھی۔ دلفریب بھی۔ اور یہ وہی لمحہ تھا جب تیز تیز بھاگتی اور سانسوں کو برابر کرتی صوفیہ مشتاق احمد ہماری تلاش میں چھت پر آ گئی تھی۔ کمال کو دیکھ کر اس کے وحشت بھرے چہرے پر ایک چمک پیدا ہوئی۔ آگے بڑھ کر ٹھیک اُسی انداز میں اُس نے کمال کے دونوں ہاتھوں کو تھام لیا:
'کیوں چلے جاتے ہو بغیر مجھ سے کچھ کہے......'
کمال ہنسا— 'ارے ہم چھت پر آئے تھے۔ اپنے ہی گھر میں ہیں۔'
'کہیں بھی ہو۔ بتا کر آنا چاہیے نا......' وہ چوری سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ ایسے مت جایا کرو کمال...... تم جانتے ہو نا، میں پریشان ہو جاتی ہوں......'
'کیوں ہوتی ہو.' ...... کمال مسکرایا......
'میں نے پہلے بیڈروم دیکھا۔ تم وہاں بھی نہیں تھے۔ برآمدے میں گئی۔ وہاں بھی نہیں۔ دیکھو...... میرا دل ابھی بھی کانپ رہا ہے......' وہ آہستہ آہستہ بول رہی تھی......
کمال نے مسکرانے کی کوشش کی۔ 'صوف...... تم ابھی جاؤ۔ ہم لوگ کچھ سیریس باتیں کر رہے ہیں۔'
'چائے لاؤں؟'
'نہیں رہنے دو......'

دیکھو۔ ''یہیں رہنا۔ بغیر مجھے بتائے کہیں مت جانا......'

آخری جملہ کہہ کر میری طرف ندامت سے دیکھتے ہوئے وہ واپس لوٹ گئی تھی۔ میں جاتے ہوئے اُس جگہ کو دیکھتا رہا، جہاں سے ابھی ایک سکنڈ، کچھ لمحہ پہلے وہ اوجھل ہوئی تھی۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ یہ کیا ہے۔ مگر میں کمال یوسف سے جاننے کا خواہشمند تھا اور جاننے کے درمیان ناہید ناز کی یہ خوفناک کہانی سامنے آگئی تھی۔

میں نے کمال کی طرف دیکھا...... ہاں تو تم بتا رہے تھے...... ناہید چلی گئی...... اور تم نے تلاش کرنے کی کوشش بھی کی — مائی گاڈ۔ اتنا بڑا حادثہ...... زندگی سے ناہید جیسی کسی عورت کا اس طرح گم ہو جانا...... کیا تمہیں لگتا ہے، یہ ایک بھول جانے والا حادثہ ہے؟ تم اس کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ باشا کی ماں تھی۔ تمہاری بیوی تھی...... تم نے لَو میرج کی تھی...... کیا اس کا گم ہونا صرف ایک حادثہ تھا؟ مجھے معاف کرنا کمال...... مجھے لگا کہ تم دیوانوں کی طرح اسے تلاش کرتے......

''میری کوشش اسی طرح کی تھی — اس کی آواز کمزور تھی۔ مگر جانے سے پہلے...... آپ نہیں جانتے......' اس کی آواز ایک بار پھر بجھ گئی تھی۔ اُس نے مجھے وہ مینٹل اسٹروک دیا تھا کہ...... وہ لمبی سانسیں لے رہا تھا...... ہاں یہ سچ ہے کہ اُس کے جانے کے بعد اس کو لے کر میں زیادہ اذیت سے نہیں گزرا۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اُس نے محبت کے لئے میرے دل میں کہیں کوئی جگہ نہیں چھوڑی تھی۔ کمال یوسف تھوڑی دیر کے لئے رکا اور جیسا کہ آپ دیکھ چکے تھے...... میں آہستہ آہستہ ناہید سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ میں یہ ضرور کہوں گا کہ اس ویرانی اور خزاں میں صوف کی موجودگی مجھے خوش کرتی تھی...... اور میں بھی یہ محسوس کر رہا تھا کہ میری موجودگی میں صوف تھوڑا سا پریشان ہو جاتی ہے۔ اور شاید ناہید آہستہ آہستہ اس حقیقت کو سمجھنے لگی تھی......

'کبھی اُس نے اس بارے میں کچھ پوچھا؟'

'نہیں۔'

پھر ممکن ہے، یہ محض تمہارا خیال ہو......'

'ہو سکتا ہے......'

'پھر کیا ہوا؟'

اُس دن رات کے دو بجے ہوں گے۔ لاجو جا چکی تھی اور اُس کی بہن رُکمنی واپس آگئی تھی۔ وہی باشا کو سنبھالتی ہے......'

وہ کہتا کہتا رکا۔ میں نے غور سے کمال کے چہرے کی طرف دیکھا...... مجھے لاجو کی یاد آگئی۔ برساتی ندی کی طرح اپنے حق پر قبضہ کرنے والی۔ مجھے وہ منظر یاد آگیا، جہاں وہ دیوانگی کے عالم میں کمال کے ہونٹوں کا بوسہ لے رہی تھی......

'لاجو کیوں گئی؟ میں نے پوچھا۔

'ناہید نے اُسے نکال دیا۔ اور اُس کی بہن کو واپس بلا لیا۔'

'کیا ناہید نے کچھ دیکھا تھا......؟'

'شاید نہیں۔'

'کیا ناہید کو کچھ شک ہوا تھا......؟'

'نہیں۔'

'پھر اچانک۔'

وہ ہماری گورنیس رُکمنی کی جگہ تھی۔ رکمنی آنے والی تھی۔ اس کا فون آ گیا تھا۔ مگر اس سے ایک دن پہلے ہی ناہید نے لاجو کو بلا کر جانے کے لئے کہا۔ ناہید نے کہا...... تم باشا کے حصے کا دودھ پی جاتی ہو...... لاجو نے حیرت سے کہا...... میں دودھ تو پیتی ہی نہیں...... ناہید نے چیخ کر کہا۔ زبان مت لڑاؤ۔ تم باشا کا حق چھین رہی ہو۔ اور میں تمہیں یہ حق چھیننے نہیں دوں گی۔'

'کیا تم کو بھی لگتا ہے کہ لاجو ایسا کرتی ہوگی؟'

'لاجو کو باشا کے حصے کا دودھ پینے کی کیا ضرورت تھی؟

'مجھے نہیں لگتا۔ میں لاجو کو جانتا تھا۔ وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ یا وہ ایسا کوئی کام نہیں کر سکتی تھی کہ ناہید اُسے ہٹانے کے بارے میں سوچ سکے۔'

میں نے غور سے کمال کی طرف دیکھا۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ محبت نے کہاں کہاں خاموشی سے اپنی بستیاں آباد کر رکھی ہیں۔

'کیا لاجو مل کر گئی تھی؟'

'مجھ سے۔؟'

'ہاں۔'

'اتفاق سے میں اُس دن گھر میں ہی تھا۔ میں اتنا جانتا تھا کہ اُس نے ناہید سے زیادہ باتیں نہیں کی ہوں گی۔ میں نے خود کو باتھ روم میں بند کر لیا تھا۔ میں جانتا تھا، لاجو کی نگاہیں مجھے تلاش کرنے کی کوشش ضرور کر رہی ہوں گی۔ جب مجھے احساس ہوا کہ وہ جا چکی ہے۔ پھر میں اپنے کمرے میں واپس لوٹا۔

میری الجھن یہ تھی کہ ناہید نے لاجو پر جھوٹا الزام کیوں لگایا۔ وہ بھی ایک معمولی سا الزام۔ میں پھر کہانی پر لوٹ آیا تھا۔

'ہاں تم بتا رہے تھے کہ اُس رات......'

کمال یوسف نے میری طرف دیکھا— 'وہ ایک خوفناک رات تھی...... بہتر یہ ہے کہ میں آپ کو وہ پورا منظر دکھا دوں...... کیونکہ اسی رات سے میری زندگی کا نیا سفر شروع ہوتا ہے۔'

اس کی آنکھیں بند تھیں۔ کچھ دیر تک وہ اپنے خیالوں میں گم رہا۔ جیسے ماضی کی چھک چھک کرتی ہوئی

ریل اس کی نگاہوں کے آگے سے گزر رہی ہو۔

(2)

سالوے پوائنٹ سے لے کر ہائی وے تک جاتی ہوئی سڑک تک سناٹا ہی سناٹا تھا۔ کمال یوسف کی مشکل یہ تھی کہ ان دنوں زیادہ تر خود کو دوسرے کاموں میں بہلانے کی کوشش کرتا — تنہا ہوتا تو ناہید کا خیال، یادوں کی کشتی کا بادبان کھولے اسے ڈرانے آجاتا۔ وہ ابھی تک پولس اور قانون کی دسترس سے پوری طرح باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ مگر اس معاملے میں بہت حد تک صوفیہ کے کہنے سے ناگارجن سینی نے اس کی مدد کی تھی۔ اُن کے کئی جاننے والے پولس میں بڑے عہدوں پر تھے۔ ایک تو پولس کمشنر ہی تھے، جو پہلے ہردوئی میں تھے۔ اور اکثر ان کے گھر آیا کرتے تھے۔ عام طور پر اس طرح کے معاملات میں ایک شوہر شک کے گھیرے میں ہوتا ہے۔ پولس کو یہ بات سمجھانے میں پریشانی ہوئی کہ جب اُس پر نفسیاتی دورے پڑتے تھے تو وہ ڈاکٹر کے پاس لے کر کیوں نہیں گیا — پولس نے جب آپسی تعلقات کے بارے میں جانا تو شک کی سوئی مزید گہری ہوگئی۔ لیکن تفتیش اور کھوج بین کے دوران کسی لاش کا نہ ملنا بھی اُس کے حق میں رہا — جیسے ناگارجن سینی کا کہنا تھا کہ کوئی ضروری نہیں ہے، اُس نے کسی پہاڑی پر چڑھ کر چھلانگ ہی لگائی ہو۔ ممکن ہے وہ کہیں چلی گئی ہو اور ممکن ہے وہ واپس آجائے۔ لیکن واپس آنے کی بات پر کمال مطمئن تھا۔ جن حالات میں اور جس طریقے سے ناہید گئی تھی، وہ جانتا تھا، وہ واپس نہیں آئے گی — اب دو سوال تھے جن کا جواب اُسے آسانی سے نہیں ملا۔ ناہید کیوں گئی؟ اور ناہید نے جانے کے لئے اُس آخری حادثے کا انتخاب کیوں کیا......؟ معاف کیجئے گا، اس آخری حادثے کی رپورٹ قارئین کو بعد میں دی جائے گی۔ ایک سوال اور بھی تھا کہ کیا ناہید نے واقعی کسی پہاڑی سے چھلانگ لگایا ہوگا — ؟ رشتوں کی تلخی کے باوجود اس حادثے پر غور کرنا کمال کے لئے آسان نہ تھا۔ اس دوران ان واقعات کا سب سے زیادہ اثر صوفیہ پر ہوا تھا۔ اور صوفیہ برابر اس کے گھر آنے لگی تھی۔ باشا کو دیکھنا۔ رُکمنی کے ساتھ مل کر چائے اور کھانا بنا دینا...... کئی بار ناہید کو یاد کرتے ہوئے اس نے صوفیہ کو آنسو بہاتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ مگر حقیقت یہی تھی کہ ناہید چلی گئی تھی — اور ناہید کا آنا ممکن نہیں تھا — کم و بیش وہ یہی سوچتا تھا۔ وہ صوفیہ کی بڑی بڑی گہری آنکھوں میں ڈوب جاتا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ ناہید کی موجودگی میں ہی وہ صوفیہ کی طرف اپنی بڑھتی کشش کو محسوس کرنے لگا تھا۔ صوفیہ کو خوف اس بات سے تھا کہ اب کیا کروگے......؟

وہ معصوم صورت بنا کر پوچھتی: تمہیں کھانا کون دے گا؟

'رُکمنی ہے نا......؟'

'رُکمنی کب تک دے گی......؟'

'نہیں جانتا۔'

'باشا کی دیکھ بھال کون کرے گا—؟'
'نہیں جانتا۔'
'اتنی لمبی زندگی۔ کیسے گزاروگے......؟ کیوں گئی وہ......؟واپس آئے گی نا......؟' صوفیہ جب اپنی ہی باتوں سے لہولہان ہوجاتی تو اُس کی خواہش ہوتی آگے بڑھ کر وہ اسے بانہوں کے گھیرے میں لے لے۔ اپنے ہونٹ اس کے کانپتے ہونٹوں پر رکھ دے۔ مگر اخلاقیات...... تہذیب کے پڑھے ہوئے چھوٹے چھوٹے سبق اسے روک دیتے۔ پتہ نہیں کیوں، اُسے لگتا، اگر وہ ایسا کرتا ہے تو صوفیہ کو برا نہیں لگے گا۔ کیونکہ اب یہ صوفیہ بھی اس کے لئے نرم جذبات رکھتی ہے، اور اسے اس بات کا احساس تھا کہ شاید ناگارجن سینی بھی اس بات کو جانتے ہیں—اور کئی موقعوں پر وہ صوفیہ کی بات چھیڑتے ہوئے خاموش ہوگئے۔ اس درمیان اُس نے صرف ایک بات محسوس کی تھی۔ پرندوں کی طرف صوفیہ کی کشش بہت حد تک کم ہوگئی تھی۔ گو ابھی بھی وہ باہر برآمدے میں جاکر درختوں کے پاس کسی دوست چڑیا کو تلاش کرتی مگر وہ جلد ہی واپس آجاتی۔ اور بقول ناگارجن سینی، ہم تو فقط بزرگ سائبان ٹھہرے، وہ پرندوں میں پیار تلاش کرنے جاتی تھی......

'پرندوں میں......'

'پرندوں کی جگہ کوئی انسان آگیا تو......' ناگارجن نے غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا' ...... میرا تجربہ کہتا ہے...... وہ انسان کی ہوجائے گی اور ایسے ہوجائے گی کہ والہانہ پن اور دیوانگی دونوں ساتھ ہوگی۔'

میں اس وقت ناگارجن سینی کی اس دلیل کو سمجھ نہیں سکا تھا۔ لیکن میں نے ان کے الفاظ میں اترنے کی کوشش کی تو ایسا لگا جیسے یہ جملے صرف میرے لئے ادا کیے گئے ہوں۔ ناہید اور صوفیہ کا موازنہ کرتا تو یہ موازنہ آسمان اور زمین کا ہوتا۔ ایک سرکش ندی کی طرح باغی اور دوسری معصوم میمنے، جیسی—اور مجھے بار بار یہ خیال آرہا تھا کہ اب مجھے صوفیہ سے اپنے دل کی بات کہہ لینی چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ پھر دیر ہوجائے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ کئی دن گزر گئے تھے اور میں ناہید کی طرف سے مایوس ہوچکا تھا۔ وہ زندہ ہوتی تو واپس ضرور آتی۔ حویلی میں کوئی نہ تھا جہاں وہ واپس جائے...... میں نے اس کی تلاش میں جوناگڑھ کی حویلی میں ایک قاصد بھی بھیجا جو ایک ٹکا سا جواب لایا...... ایک داڑھی والا ملا۔ زیادہ عمر نہیں تھی۔ اس نے کہا مرگئی ہوگی۔ یہ بھی کہا کہ یہاں آتی تو یہی حشر ہوتا۔ ناہید کے پاس کوئی دوسرا گھر نہیں تھا اور مجھے اس بات کا بھی احساس تھا کہ رُکمنی باشا کا ویسا خیال نہیں رکھ پا رہی ہے، جیسا کہ اسے رکھنا چاہیے۔ وہ صرف اپنی ذمہ داریاں ادا کررہی ہے۔

اس دن پھر اسے پولس اسٹیشن بلایا گیا تھا۔ اور وہاں جانے سے پہلے ایک بات ہوئی۔ کمال نے بہت دنوں بعد آسمان میں اڑتے ہوئے ایک گدھ کو دیکھا تھا۔ عقب میں اڑتے ہوئے کوؤں کا غول تھا اور اس وقت آسمان کوؤں کی کاؤں کاؤں سے گونج رہا تھا۔

کمال پولس اسٹیشن پہنچا تو پولس افسر کوشاری میز پر پاؤں پھیلائے ہوئے چائے پی رہا تھا۔ اس کا ایک اسسٹنٹ

پاس میں ہی کھڑا تھا۔ کوشاری نے اپنے اسسٹنٹ کو بھدا سا اشارہ کیا اور اسے کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ پھر پوچھا......

'اچھا بتاؤ۔ کیسے مارا اُسے؟'

'کسے؟'

'اب مورکھ نہ بناؤ ہمیں۔ بیوی کو......'

'میں نے نہیں مارا۔'

'مارا تو تم نے ہے،' وہ ڈھٹائی سے ہنسا۔ مارا کیسے...... 'پہاڑی سے دھکا دیا یا گھر میں خون کر دیا پھر لاش پہاڑی پر سے پھینک دی۔'

'دیکھیے۔ میں نے نہیں مارا...... 'کمال کی زبان گنگ تھی......

'ارے مارنے کے تو سو طریقے ہو گئے ہیں اور پہاڑیوں میں تو ایک ہی طریقہ عام ہے۔ ہلدی لگے نہ پھٹکری۔ اتنی ساری پہاڑیاں...... کہیں بھی لے جاؤ۔ دھکا دے دو......'

'میں نے نہیں مارا......' کمال آہستہ سے بولا......

وہ اتفاق تھا کہ گھر سے نکلتے ہوئے کمال کی ملاقات ناگارجن سینی سے ہو گئی تھی اور ناگارجن نے اپنے کمشنر دوست کو فون کر دیا تھا۔ جس وقت کوشاری بھدے الفاظ میں ناہید اور اس کے تعلقات کے بارے میں بتا رہا تھا۔ ٹھیک اُسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ (یہ معاملہ ایسا تھا کہ اُسے ناہید اور اپنے خراب تعلقات کے بارے میں بہت سی باتیں پولس والوں کو بتانی پڑی تھیں اور اس وقت اسے افسوس ہو رہا تھا کہ ان باتوں کو آسانی سے چھپایا جا سکتا تھا۔) کوشاری نے فون اٹھایا تو اچانک اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ فون پولس کمشنر کا تھا اور فون کے بعد ہی اس کا لہجہ بدل گیا تھا:

'جاؤ جی۔ گھر جاؤ— عیش کرو—'

کمال کو گھر آئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ اچانک دروازہ کھلنے کی آواز آئی— اُس نے دیکھا— یہ صوفیہ تھی جو ہڑبڑائی اور گھبرائی ہوئی اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ اور چہرہ الجھن اور کشمکش کی کہانی بیان کر رہا تھا— اس وقت صوفیہ کی آمد اسے اچھی لگی مگر صوفیہ کو الجھن میں دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا تھا۔

'کیا بات ہے......؟'

'وہ آ گیا ہے......' اُس کا لہجہ ڈرا ڈرا تھا—

'کون آ گیا ہے؟'

وہی...... بتایا تھا نا...... وہ آنے والا ہے......'

'کون؟'

اس بار میرے سوال پر وہ ذرا زور سے چیخی تھی— 'آپ سب بھول جاتے ہیں— آپ کو بتایا تھا—

وہ..........——'

اچانک مجھے یاد آیا۔ دو دن پہلے باشا کو کھلاتے ہوئے صوفیہ نے بتایا تھا کہ ناگارجن جی کا چھوٹا بیٹا آنے والا ہے— صوفیہ اسی بیٹے کے بارے میں بات کر رہی تھی—

'ناگارجن جی کا بیٹا!'

'ہاں۔'

'اس سے ڈرتی ہو؟'

صوفیہ کی آنکھوں میں خوف تیر رہا تھا— وہ اچھا نہیں ہے۔ آج ہی ابو اور امی سے اس کا جھگڑا ہوا ہے— مجھے ایسی آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ مجھے ڈر لگتا ہے—

'کیسی آنکھوں سے؟'

'مجھے بتانا پڑے گا۔؟— نہیں سمجھ سکتے—'

اس کا لہجہ ایسا تھا جیسے اب وہ رو دے گی۔ اُس کی آنکھیں نم تھیں اور سہمی ہوئی ہرنی کی طرح وحشت زدہ...... میں گہری سوچ میں تھا اور اس وقت میں یہی سوچ رہا تھا کہ کیا صوفیہ کو روک لوں—؟ مگر اس گھر میں صوفیہ کیوں رُکے گی؟ کس رشتے کی بنا پر..........

'میں سوچتی ہوں......'صوفیہ کہتے کہتے ٹھہر گئی—

'کیا......؟

'میں بھاگ جاؤں......'وہ رو رہی تھی— اور بس یہی لمحہ تھا، کمال کو احساس ہوا جیسے اچانک بدن میں خون کا دوران تیز ہو گیا ہو۔

'نہیں صوفیہ...... بھاگنا مت......'

ہزاروں بکھری ہوئی پرچھائیاں مل کر پیار بن گئے تھے۔ اور اس ایک لمحے میں زندگی آ گئی تھی۔ کمال نے صوفیہ کو اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے لیا تھا— بالکل اچانک...... اور صوفیہ.......... جو اس لمحے کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ اس کے سینے سے لگی ہوئی آنسو بہا رہی تھی .... اُس کی سسکیاں تیز تھیں......

'بھاگ جاؤں گی...... میں بھاگ جاؤں گی۔ تب سے بھاگ ہی تو رہی ہوں...... زندگی سے بھاگتی پھر رہی ہوں...... پھر بھاگ جاؤں گی......

'نہیں— تم نہیں بھاگو گی صوفیہ—

وہ میری قید سے نکلی۔ آنسوؤں میں موٹے موٹے قطرے تیر رہے تھے۔ 'پھر کہاں جاؤں گی میں......'

کمال نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس معصوم پری کو بہت پیار کرنے کی خواہش ہو رہی تھی۔ ہاتھ آگے بڑھے۔ صوفیہ کے آنسوؤں کو خشک کیا۔ دونوں ہاتھوں میں صوفیہ کا چہرہ لیا......

'کوئی پریشانی ہے تو تم یہاں رہ سکتی ہو۔ ابھی سے...... اسی لمحہ سے......'

صوفیہ شاید اسی لمحے کی منتظر تھی یا خدا معلوم اس کے اندر کیسی کشمکش چل رہی تھی۔ ادھر اس کی تلاش میں ناگار جن سینی آ گئے تو وہ ان کے ساتھ چلی گئی۔ جاتے ہوئے پلٹ کر صوفیہ نے اس کی طرف دیکھا۔ کمال اپنی جگہ پتھر کے مجسمہ کی طرح کھڑا تھا...... جیسے اچانک ہوا کے تیز جھونکے اُس کی محبوب شئے کو اُڑا کر اس سے کہیں دور لے گئے ہوں...... جسم میں وہ خوشبو ابھی بھی رچی بسی تھی...... ابھی بھی وہ سہمی آنکھیں، آنکھوں کی پتلیوں میں تیر رہی تھیں...... میں بھاگ جاؤں گی......

'اس رات دیر تک کمال یوسف کو نیند نہیں آئی — ناہید کا خوف کہیں دور چلا گیا تھا — اور صوفیہ کے نرم و نازک جسم نے اس کی جگہ لے لی تھی...... رات آدھی سے زیادہ ہو گئی تھی۔ تیز ہوا تھی۔ کھڑکی کے پٹ ڈول رہے تھے۔ دو بار باشا کے رونے سے اس کی نیند ٹوٹی — دونوں بار رکمنی بھاگتی ہوئی آئی۔ باشا کو گود میں لیا...... بہلایا۔ پھر سلا دیا...... رات کے ۳ بجے ہوں گے کہ اچانک دروازے کی بیل سن کر وہ چونک گیا......

کوئی تیز تیز دروازہ پیٹ رہا تھا۔ کمال تیزی سے اٹھا — دوڑ کر باہر آیا — دروازہ کھولا...... اور اچانک جیسے اپنی جگہ پر منجمد ہو گیا۔ صوفیہ تھی...... جو تھر تھر کانپ رہی تھی۔ دروازہ کھولتے ہی وہ اُس کے جسم سے بری طرح لپٹ گئی......

'صوفیہ......'

قیامت برپا کرنے والی سسکیاں تھیں۔ صوفیہ کے ہاتھوں نے سختی سے اسے تھاما ہوا تھا۔ جیسے پکڑ ڈھیلی ہوئی تو وہ بکھر کے رہ جائے گی...... وہ پھر چلایا......

'صوفیہ...... کیا ہوا ہے...... صوفیہ...... کچھ بولو تو سہی......'

اُسے احساس ہوا...... صوفیہ کے ہاتھوں کی گرفت آہستہ آہستہ کمزور ہو رہی ہے......

'صوفیہ......' کمال ایک بار زور سے چلایا......

اُسے احساس ہوا...... اس کے سینہ سے لگی ہوئی صوفیہ کا سر ڈھلک گیا ہے...... وہ بیہوش ہو گئی تھی......

'صوفیہ......'

ایک بیہوش جسم اس کے ہاتھوں میں جھول رہا تھا اور یہ لمحہ کمال کو حقیقت سے نکال کر پریوں کے دیس پہنچا گیا تھا۔ بانہوں میں ایک نازک سا جسم اور ان لمحوں میں صوفیہ نے خود کو اُس کے حوالے کر دیا تھا — صوفیہ کے سرد جسم کو گود میں لیے وہ بستر تک آ گیا۔ بستر پر لٹایا۔ منہ پر پانی کا چھڑکاؤ کیا تو اچانک تیز چیخ کے ساتھ وہ اٹھی اور دوبارہ اس سے لپٹ گئی......

'وہ میرے کمرے میں تھا......'

'کون......'

'وہی......'

صوفیہ سسکیاں لے رہی تھی...... میں وہاں نہیں رہ سکتی۔ میں نے بڑی مشکل سے خود کو اُس کی گرفت سے آزاد کیا ہے...... وہ شاخوں کی طرح کمال سے لپٹی ہوئی اس کے وجود میں اپنا تحفظ دیکھ رہی تھی۔

کمال آہستہ سے بولا ’...... اب تم کہیں نہیں جاؤ گی صوفیہ...... تم یہیں رہو گی۔‘

صوفیہ بڑی بڑی آنکھیں نکالے خوفزدہ سی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ہونٹ خاموش تھے اور جسم ابھی بھی کانپ رہا تھا......

’وہ میرے...... کمرے میں تھا...... مجھے مار ڈالے گا......‘

اُس کی آنکھیں خوف میں ڈوبی تھیں — باہر اچانک دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز ہوئی تو کمال چونک گیا۔ اُس نے پلٹ کر صوفیہ کو دیکھا — دوڑ کر دروازہ کی طرف بھاگا — دروازہ کھولا تو دروازے پر حیران پریشان سے ناگارجن کھڑے تھے۔

’صوفیہ آئی ہے نا......‘

’آپ آیئے میرے ساتھ —‘

صوفیہ نے ناگارجن کو دیکھا تو دوڑ کر ان سے لپٹ گئی —

ناگارجن کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے —

’میں شرمندہ ہوں بیٹی اور اس کے سوا میرے پاس کوئی لفظ نہیں ہے......‘

’آپ کیوں شرمندگی کا اظہار کر رہے ہیں......‘ روتے روتے وہ زور سے چیخی۔ آپ نے جو کیا ہے...... وہ کوئی نہیں کر سکتا......‘

صوفیہ تکیہ میں منہ دیے سسکیاں بھر رہی تھی۔

ناگارجن نے کمال کی طرف دیکھا...... اشارہ کیا ’...... تم آؤ...... تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں......‘

کمال ناگارجن کے ساتھ کمرے سے باہر آ گیا — ناگارجن نے غور سے کمال کی طرف دیکھا — اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

’میں نے بیٹی کہا تھا۔ اور بیٹی مانتا تھا — میں نے سوچا تھا میرا بیٹا بھی یہی رشتہ نبھائے گا۔ مگر...... وہ لوگ...... وہ مقدس رشتوں کی زنجیر میں کیوں نہ جکڑے ہوں، دو الگ الگ خیال ہوتے ہیں — مجھے نہیں معلوم میرا بیٹا رات میں کس ارادے سے صوفیہ کے کمرے میں گیا...... مگر میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کا ارادہ ٹھیک نہیں تھا...... وہ وہاں محفوظ نہیں ہے......‘

ناگارجن کی آنکھیں نم تھیں۔ لفظوں میں تھرتھراہٹ تھی...... ’صوفیہ بہت ڈر گئی ہے۔ اور اسے ڈرنا بھی چاہئے۔ شاید ایک لڑکی کہیں بھی محفوظ نہیں ہے۔ اپنے باپ کے گھر میں بھی نہیں......‘

ناگارجن کی آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ ٹپکا...... ’تمہیں پتہ ہے نا۔ صوفیہ نے مجھے قرآن شریف لا کر

دیا تھا۔ خالی وقت میں وہ مجھے قرآن شریف پڑھ کر سنایا کرتی تھی اور اس کے معنی بھی سمجھایا کرتی تھی۔ میں سنتا رہتا تھا۔ کہتے ہیں خدا جب ایک راستہ بند کرتا ہے تو دوسرا کھول دیتا ہے — وہ لکھا ہے نا...... اُس کی ذات سے اُس کی نعمتوں سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں اور دیکھو بیٹا۔ کتنی دیر میں یہ بات سمجھ میں آئی......'

ناگارجن غور سے کمال کی طرف دیکھ رہے تھے —

'صوفیہ کے لئے خدا نے ایک دروازہ بند کیا۔ اور دیکھو — پڑوس کا ہی ایک دوسرا دروازہ کھول دیا —'

کمال چونک گیا...... 'میں نے مطلب نہیں سمجھا۔'

'میں سمجھاتا ہوں —' ناگارجن نے کمال کے کندھے پر ہاتھ رکھا —

'سب خدا کی مصلحت...... تمہاری بیوی چلی گئی۔ ہم نے تفتیش میں کوئی کمی نہیں رکھی — لیکن حقیقت سے تم بھی واقف ہو — وہ اب نہیں آئے گی...... لیکن اُس خلا کو بھرنا ضروری ہے — ایک زندگی یوں تنہا نہیں گزاری جاسکتی...... اور ایسی حالت میں جب ایک ننھا شیر خوار بھی تمہارے ساتھ ہے......'

'میں اب بھی نہیں سمجھا......'

'تم سمجھ رہے ہو بیٹے۔ میں جو کہنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ وہ تم سمجھ رہے ہو...... اور مصلحت دیکھو...... خدا نے میرے گھر کا راستہ بند کیا، صوفیہ کے لئے تمہارے گھر کا راستہ کھول دیا۔ اور کھولا ہی نہیں۔ گھر سے بیڈ روم کا راستہ بھی دکھا دیا...... اس مصلحت کو سمجھو...... میں نے صوفیہ کی آنکھوں کو پڑھا ہے...... اور جانتا ہوں...... وہ تم سے پیار کرتی ہے...... اور اس حقیقت سے بھی واقف ہوں کہ تم بھی......'

کمال نے سر کو جھکا لیا......

ناگارجن نے آگے بڑھ کر کمال کے ہاتھوں کو مضبوطی سے تھام لیا...... اُسے بھگوان کہوں...... خدا کہوں...... کچھ بھی کہوں...... وہ آزمائش دیتا ہے تو راستہ بھی دیتا ہے......'

'جی......'

'تم سمجھ رہے ہو نا......' ناگارجن کی آنکھوں میں چمک تھی۔ باپ ہوں نا...... اس صدمے سے اچانک گھبرا گیا تھا۔ اور دیکھو تو سہی۔ وہ خوفزدہ ہو کر پناہ تلاش کرنے آئی بھی تو کہاں آئی؟ تمہارے پاس...... کیونکہ اُسے پتہ ہے...... یہاں اُسے پناہ ملے گی...... تم پناہ دو گے اُسے......'

'جی......'

'میرے خیال سے اب دیر کرنا مناسب نہیں ہے — صوفیہ تمہارے پاس ہی رہے گی — میں اب مطمئن ہوں — صوفیہ کو ایک مضبوط سہارا مل گیا ہے، ایک باپ کو اس سے زیادہ اور کیا چاہئے......'

ناگارجن کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔ پھر وہ ٹھہرے نہیں، تیزی سے دروازے سے باہر نکل گئے —

کمال کچھ دیر تک ساکت و جامد اپنی جگہ کھڑا رہا — جیسے ایک لمحہ میں ایک پوری کائنات تبدیل ہو گئی تھی —

دروازہ بند کیا۔۔۔ بیڈ روم کے دروازہ پر آ کر ٹھہرا۔۔۔ تکیہ کو سینے سے لپٹائے صوفیہ ایک معصوم سی گڑیا نظر آ رہی تھی۔۔۔۔۔۔ یہ وہ صوفیہ نہیں تھی، جو درختوں کی قطار کے درمیان دونوں ہاتھ پھیلائے پرندوں کو آواز دیا کرتی تھی۔۔۔۔۔۔ اس وقت وہ مزے سے لیٹی تھی۔۔۔۔۔۔ یا سو گئی تھی۔۔۔۔۔۔

'صوفیہ۔۔۔۔۔۔'

اُس نے آہستہ سے آواز دی تو وہ اچانک ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔۔۔

کمال آگے بڑھا۔ بانہیں پھیلائیں۔۔۔ صوفیہ نے کوئی مدافعت نہیں کی۔ اس وقت اسے ان بازوؤں کی شدت سے ضرورت تھی۔۔۔ ایک کانپتا ہوا گرم جسم کمال کے جسم میں پیوست ہو رہا تھا۔۔۔۔۔۔

کمال نے آہستہ سے صوفیہ کے کان میں کہا۔۔۔

'پریشان مت ہو۔ اب تم میری ہو۔ اب یہی گھر تمہارا ہے اور تم اس گھر سے اب کہیں نہیں جاؤ گی۔۔۔۔۔۔'

باشا رو رہا تھا۔ صوفیہ اچانک پلٹی۔۔۔۔۔۔ اور روتے ہوئے باشا کو اپنی گود میں لے لیا۔۔۔۔۔۔

☆☆

کمال خاموش ہوا تو میں کچھ دیر تک غور سے کمال کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھتا رہا۔۔۔

'پھر تم نے شادی کر لی۔'

'ہاں۔ یہاں پاس میں ہی ایک مسجد ہے۔ سارا انتظام ابو نے کیا تھا۔'

'ناگارجن سینی نے؟'

'ہاں۔۔۔'

'نکاح ہوا۔۔۔ ایک چھوٹی سی تقریب۔ ملنا ملانا ہوا۔ میرے دو چار دوست ہی اس رسم میں شریک ہوئے۔ نکاح سے پہلے ہی صوفیہ نے سارے گھر کی ذمہ داری سنبھال لی تھی۔۔۔۔۔۔'

'وہ خوش ہے؟'

'بہت زیادہ۔'

'اور تم؟'

کمال نے پلٹ کر دیکھا' ۔۔۔۔۔۔ آپ کہہ سکتے ہیں۔ میں محبت کے اس انداز سے واقف نہیں تھا۔ صوفیہ تو میرے لئے پاگل رہتی ہے۔ دو پل بھی مجھے نہ دیکھے تو پتہ نہیں اسے کیا ہو جاتا ہے۔ آپ نے غور کیا ہوگا۔۔۔ وہ بار بار بھاگ کر میرے پاس آ جاتی ہے۔'

کمال کا چہرہ فرطِ جذبات سے روشن تھا' ۔۔۔۔۔۔ سچ پوچھیں تو اب تک میں اسی پیار کے لئے بھٹک رہا تھا۔ پیار ایسا بھی ہوتا ہے۔ میں جانتا بھی نہیں تھا۔ پیار اس طرح جسم کے پور پور میں بسا ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔ میں نے کب سوچا تھا۔۔۔۔۔۔ میں سب کچھ بھول گیا۔۔۔۔۔۔ اب کچھ بھی یاد رکھنے کی خواہش نہیں۔۔۔۔۔۔ اور آپ نہیں جانتے

جب وہ خوشبو کی طرح مجھ میں اترتی ہے...... ہوا کی طرح میرے جسم سے گزرتی ہے...... سانسوں کی بہشت کے ہر دروازے پر ایک ان دیکھا پیار ہوتا ہے......

کمال اچانک ٹھہر گیا تھا۔ سامنے صوفیہ تھی۔ اس درمیان شاید اُس نے کپڑے تبدیل کیے تھے...... اُس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی...... مگر میں اس مسکراہٹ کے پیچھے چھپی وحشت دیکھ رہا تھا— آخر ایسا کیوں ہے؟ صوفیہ لہروں کی طرح اتنی بے قرار کیوں ہے...... مجھے اندیشہ تھا...... محبت کی یہ بیقراری اُسے بیمار بھی ڈال سکتی ہے...... آہستہ آہستہ وہ جنون کی جن منزلوں سے گزر رہی ہے...... وہ اس کے حق میں بہتر نہیں ہے— صوفیہ کچھ لمحے کے لئے ٹھہری— کمال کو دیکھ کر کچھ اشارہ کیا— کمال نے سر ہلایا— اور پھر کچھ دیر بعد کمال مجھے لے کر نیچے ڈرائنگ روم میں آ گیا— جہاں نمکین بسکٹ اور چائے ہمارا انتظار کر رہی تھی— اس درمیان باشا کو لیے ہوئے وہ دوبار ہمارے پاس سے گزری— کمال کی آنکھیں چھت کو دیکھ رہی تھیں۔ میں صوفیہ کی زندگی کے اس نئے باب میں الجھ کر رہ گیا تھا...... ڈراکیولا...... خوف کی وادیاں، ہجرت...... نینی تال میں آنا...... پرندوں کے پیچھے بھاگنا اور کمال سے ملتے ہی بیقرار لہروں کا اُس کے اندر پیدا ہونا......

میں اچانک اُس وقت چونکا، جب کمال مجھ سے مخاطب تھا......

'آپ ناہید کے بارے میں جاننا چاہتے تھے......؟'

'ہاں— لیکن اس سے پہلے صوفیہ کی کہانی کو جاننا ضروری تھا—' میں مسکرایا...... زندگی بھی کتنی عجیب ہے کمال...... پانچ چھ ماہ قبل ہم میں سے کون سوچ سکتا تھا کہ زندگی اپنی سمت تبدیل کر دے گی...... ایک جھونکا آئے گا اور زندگی تبدیل ہو جائے گی......'

'آپ نے درست کہا' کمال آہستہ سے بولا: 'زندگی نے آخر راستہ بدل دیا۔ سمت بدل گئی۔' وہ رُکا...... پھر بولنا شروع کیا: میں نے آپ کو بتایا تھا، ان دنوں ناہید میں باغیانہ انداز کچھ زیادہ ہی آ گیا تھا۔ مجھے کئی بار احساس ہوتا کہ اگر اُسے مصروف کر دیا جائے، تو ممکن ہے یہ باغیانہ احساس بہت حد تک اُس کے اندر سے نکل جائے۔'

'ہونہہ......'

'انھی دنوں میرے دوست نرمل اساس ڈکشنری پر کچھ بڑا کام کر رہے تھے۔ ان کا اپنا پبلشنگ ہاؤس ہے۔ ان کی کتابیں زیادہ تر باہر ایکسپورٹ ہوتی ہیں۔ وہ کئی زبانوں میں لغات کا کام کرا رہے تھے۔ انہیں اردو لغات بھی چاہئے تھی۔ جو جامع بھی ہو اور جس میں وقت کے ساتھ نئے الفاظ کو بھی جوڑا جا سکے۔ نئے الفاظ...... آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا......

'جی—'

'میں نے اس کا اظہار جب ناہید سے کیا تو وہ خوشی سے اچھل پڑی۔ اُس نے کہا کہ یہ کام وہ کر سکتی ہے اور پوری ذمہ داری سے کرے گی۔ سمرویلے اسکول سے آنے کے بعد وہ اس لغات کو وقت دے دیا

کرے گی۔ میں نے جب نزل اساس سے اس بارے میں گفتگو کی تو وہ خوش ہو گئے اور فوراً ہی لغات کی پانچ سات کتابیں انھوں نے میری گاڑی میں رکھوا دیں اور کہا: 'مجھے اس کام کی جلدی ہے انھی لغات کا سہارا لینا ہے اور نئے الفاظ کو زیادہ سے زیادہ شامل کرنا ہے......'

'پھر......'

کمال یوسف کے چہرے پر یادوں کے سائے گہرے ہو گئے تھے۔

(3)

'سنو' ناہید چلاتی ہوئی، سیڑھیاں طے کرتی ہوئی کمال کے سامنے آ کر رک گئی:

صبح کے آٹھ بج گئے تھے۔ کمال آفس کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ آئینہ میں ناہید کا عکس ابھرا تو اس نے پلٹ کر ناہید کی طرف دیکھا—

'کیا ہے......'

'میں اتنی دیر سے آواز دے رہی تھی......'

'سنا میں نے......'

ناہید زور سے چیخی 'پھر کان کیوں بند کیے رہے— منہ سے جواب کیوں نہیں دیا—'

'تم دیکھ رہی ہو— میں تیار ہو رہا تھا—'

'تیار ہونے میں بھی جواب دیا جا سکتا تھا' ناہید غصے میں تھی— 'بس ہم لوگوں سے ہی امید کرتے ہو کہ ایک آواز پر حکم ماننے کو تیار ہو جائیں—'

'یہ کوئی لڑنے کا وقت ہے۔'

'لڑ کون رہا ہے......' ناہید کی آواز میں ناراضگی تھی— 'میں کچھ کہنے آئی تھی......؟'

'ہاں بولو......'

'میں کل دیر رات تک لغات کا کام کرتی رہی۔'

'ہاں— میں نے دیکھا تھا۔'

'کئی الفاظ سمجھ میں نہیں آئے'۔ اور تم نے کہا تھا: 'میں اپنی آزادی کا استعمال کر سکتی ہوں۔'

'زیادہ آزادی نہیں۔ یہ لغات ہے۔ ذمہ داری کا کام ہے......'

'میں جانتی ہوں۔ تم کو بتانے کی ضرورت نہیں۔' ناہید غصے میں تھی۔ 'یہ لغات کون تیار کرتا ہے......؟'

'مطلب؟' کمال چونک گیا تھا۔

''میں پوچھ رہی ہوں کہ عام طور پر اس طرح کے لغات کون تیار کرتا ہے......؟'

'یہ کیسا سوال ہے؟'

'سوال ہے — کیوں کہ لغات کے اندر جو معنی دیے گئے ہیں، وہ مردوں کے حساب سے ہیں۔'
پہلی بار کمال یوسف کو لگا تھا کہ لغات کا کام کہیں اس نے ناہید کو دے کر کوئی غلطی تو نہیں کی ہے۔ اسے امید نہیں تھی کہ ان سوالوں سے بھی دوچار ہونا پڑ سکتا ہے......
ناہید کہہ رہی تھی: 'میرے خیال سے اب تک لغات پر جتنے بھی کام ہوئے ہیں، مردوں نے کیے ہیں۔'
'لیکن تمہیں کیا...... تم تو خود کو مرد کہتی ہو......'
'مرد ہوں۔' اس بار ناہید زور سے چیخی تھی: 'بار بار مجھے عورت کہہ کر یا میرے اندر کی عورت کو دکھا کر اپنی مردانگی کو مطمئن کرنا چاہتے ہو؟'
'میں نے ایسا کب کہا......؟'
'کہا نہیں — لیکن میں دیکھ رہی ہوں — تمہارا مطلب یہی ہوتا ہے —'
'یہ تم پر ہے — تم کچھ بھی مطلب نکال سکتی ہو —'
ناہید اس بار پھر زور سے چیخی: 'میں کوئی مطلب نہیں نکالتی — میں تو بس ایک عام سا سوال پوچھنے آئی تھی کہ میں تھوڑی سی آزادی لے سکتی ہوں —'
'لغات کے کام میں کیسی آزادی؟' کمال کو بیساختہ ہنسی آ گئی —
ناہید کا پارہ چڑھ گیا: '...... تم ہنسے کیوں؟'
'تمہاری باتوں پر اور کیا کروں......'
ناہید آہستہ سے بولی: 'میں کچھ جگہ اٹک جاتی ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ اب ایک لفظ ہے آبرو — اور اس کے ساتھ محاورے دیے گئے ہیں۔ مثال کے لیے آبرو اتارنا، آبرو تھامنا، آبرو پر حرف آنا، آبروریزی، آبرو رکھنا، آبرو ننگی کی ہو جانا، آبرو کے درپے ہونا...' ناہید غور سے کمال کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھی: 'یہ آبرو کس سے منسوب ہے۔ سن رہے ہو تم...... میں اس لفظ کو بدلنا چاہتی ہوں......'
'مطلب؟'
'ابھی نہیں کہہ سکتی...... مگر یہ لفظ اور محاورے مجھے کچھ پسند نہیں آئے۔ خیر میں دیکھتی ہوں......'
ناہید کمرے سے باہر نکل گئی تو کمال سوچ میں پڑ گیا — لغات کا کام دے کر اس نے کوئی نئی آفت تو نہیں مول لے لی...... ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ تیز ہوا کی طرح ناہید دوبارہ کمرہ میں داخل ہوئی......
'وہ آتشک کا نام سنا ہے......؟'
'ہاں...... کیوں؟'
'بیماری ہے نا......؟'
'ہاں......'

میں نے اُس کے آگے لکھ دیا—— ' آتشک : ایک جنسی بیماری جو مردوں کو ہوتی ہے......' اُسے اندھیرے میں چھوڑ کر ناہید پھر سے ہوا ہو گئی تھی......

☆☆
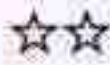
ناہید کی مشکل یہ تھی کہ جب سے اس نے یہ کام لیا تھا اُس کی دنیا بدل گئی تھی جیسے اب وہ الفاظ کے درمیان تیر رہی تھی۔ الف ب سے ی تک حروف الگ الگ شکل بنا کر اُسے گھیر لیتے—— کبھی کبھی الفاظ میں گھر کر وہ باشا کے رونے کی آواز بھی نہیں سن پاتی...... مشکل یہ تھی کہ کچھ دنوں سے یہ الفاظ حرکت میں آ گئے تھے......

وہ حروف کے درمیان تھی......

الف ڈنڈا بن کر عصائے موسوی کی طرح اس کے سر پر لہرانے لگتا......

ب...... ہوا میں لہراتی ہوئی گیند ٹھہر جاتی...... اور وہ چت اُس گیند پر لیٹ جاتی......

الگ الگ حرف جسم کی الگ الگ شکلیں اختیار کر لیتے۔ وہ خوف سے باہر نکلتی تو ان سارے حروف کو لغات سے باہر پھینکنے کی خواہش زور پکڑنے لگتی۔ جیسے اسے یہ احساس ہوتا کہ لغات ہی ہے جس نے بکھرے ہوئے بیشمار حروف کو الفاظ و معانی اور زبان کا خوفناک تحفہ دیا ہے: جیسے وہ یہ سوچتی کہ اگر اچھے لفظ ہیں تو برے لفظ کیوں ہیں۔ اچھائی ہے تو برائی نہیں ہونی چاہیے۔ عروج ہے تو زوال کا ہونا لازمی نہیں ہے۔ زندگی اور موت میں کسی ایک کو ہی ہونا چاہیے۔ آگے بڑھتے ہوئے وہ خوفناک لفظوں میں گھر جاتی: ناگن، بھوت، جنات، آسیب۔ جیسے وہ اس نتیجہ پر پہنچ رہی تھی کہ ان خوفناک لفظوں کو لغات میں رکھا ہی نہ جائے۔ کبھی کبھی مترادف الفاظ کو لے کر اُس کے کانوں میں نگاڑے بجنے شروع ہو جاتے......:

زندگی ہے...... اس لیے موت بھی ہے......

اچھائی ہے...... اس لیے برائی بھی ہے......

مرد ہے...... اس لئے......

لغات میں جہاں انسانی اعضاء کے نام اور تفصیلات لکھی تھیں وہاں پہنچتے ہوئے اچانک اس کی حالت خراب ہو جاتی۔ وہ خود کو جونا گڑھ کی اُسی حویلی میں محسوس کرتی۔ دھوکہ: کانوں میں گونجتی ہوئی نوحہ کی آوازیں، عظیم بھائی کے ہاتھوں کی گرفت، دو ہاتھ آگے بڑھ کر اُس کے لباس کی دھجیاں بکھیر رہے ہوں: یہ سب اس قدر اچانک ہوتا کہ اس کا چہرہ سپید پڑ جاتا۔ وہ لکھنا بند کر دیتی۔ بالکونی میں آ کر تیز تیز لمبی لمبی سانسیں لینا شروع کر دیتی اور اس کیفیت سے باہر نکلنے میں اسے گھنٹوں گزر جاتے......

دن ہے...... اس لئے رات ہے......

پانی ہے...... اس لئے آگ ہے......

سچ ہے...... اس لئے جھوٹ ہے......

زمین ہے...... اس لئے آسمان ہے......

کمال ہے...... اس لئے ناہید......

نہیں: کاغذات کے ڈھیر کے درمیان صرف سلگتی ہوئی آگ ہوتی اور وہ ہوتی۔ غلامی ہے اس لئے آزادی ہے......

اُس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی مگر جلد ہی یہ مسکراہٹ ڈھل گئی۔ لغات آئینہ خانہ میں تبدیل ہو گئے تھے: الفاظ اس آئینہ خانہ کے چاروں طرف طواف کر رہے تھے: اچھے لفظ برے لفظ، صحت مند لفظ، بیمار لفظ اور اسی لیے اس رات ڈنر کرتے ہوئے وہ اپنے سہمے ہوئے لفظوں کے ساتھ ایک خاموش اور پُر اسرار دنیا میں تھی۔

کمال غور سے اس کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور جب اُس سے رہا نہیں گیا تو وہ آہستہ سے بولا:

'تمہیں کیا ہو گیا ہے ناہید؟'

'کچھ نہیں۔'

کچھ تو ضرور ہوا ہے۔ میں کئی دنوں سے دیکھ رہا ہوں...... تم کسی اور ہی دنیا میں ہوتی ہو۔'

ناہید اچانک زور سے چلّائی — تو تم نے اُس دنیا کا پتہ لگانے کی کوشش کیوں نہیں کی......'

'تم ڈھنگ سے بات ہی کہاں کرتی ہو کہ میں کوشش کرتا۔'

'اس نے ناہید کے چہرے کی طرف دیکھا — چہرہ سرخ ہو رہا تھا — کشمکش اور الجھن چہرے سے عیاں تھی۔ وہ شاید لفظ جوڑ رہی تھی...... پھر اُس نے سر اٹھایا۔ کمال کی طرف دیکھا:

'میں بتاؤں گی بھی تو تم نہیں سمجھو گے۔'

'کیا نہیں سمجھو گے......'

میں اگر کہوں تنہائی میں یہ لفظ زندہ ہو جاتے ہیں...... میرے اردگرد طواف کرنے لگتے ہیں......'

'یہ لغات تمہیں بیمار کر رہے ہیں۔ مت کرو۔ میں انھیں لے جا کر واپس کر دوں گا —'

'نہیں تم واپس نہیں کرو گے — میں دیکھنا چاہتی ہوں کیا زندگی میں آنکھیں کھولنے کے بعد انسان محض ایک پرزہ ہوتا ہے —؟ طاقتور لفظ ہوتے ہیں۔ لفظ جو کسی کو بیمار بنا سکتے ہیں۔ کسی کو مضبوط۔ کسی کو بچا سکتے ہیں۔ کسی کی جان لے سکتے ہیں۔ اُس نے ذرا توقف کے بعد آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا...... حرف سے حرف ملتے ہیں تو ایک دنیا آباد ہونے لگتی ہے...... لفظ بننے کے عمل کے ساتھ ہی معنی شور کرنے اور چنگھاڑنے لگتے ہیں۔ کیا کبھی تم نے ایسا محسوس کیا کمال؟ یا یہ صرف میں محسوس کر رہی ہوں......'

'میں تمہاری بات سمجھ ہی نہیں پا رہا تو جواب کیا دوں؟'

'کیوں نہیں سمجھتے یا سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔' وہ زور سے چلّائی...... میں معصوم کہتی ہوں...... تو ایک سراپا بنتا ہے...... نور کی کرنیں پھیلتی ہیں۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ آتی ہے۔ اور معصوم کی جگہ میں حرامی...... کتے کا

پلا...... باسٹرڈ، قاتل، ہتیارا کہتی ہوں تو جبڑے پھیل جاتے ہیں...... آنکھوں میں چمک کی جگہ وحشت آجاتی ہے۔ چہرے کے انداز بدل جاتے ہیں......'

'یہ ایک عام سی بات ہے......'

'ہاں جانتی ہوں۔ لیکن تب کیا کہو گے، جب قاتل کہتے ہی کمرے میں ایک قاتل موجود ہو — عضو تناسل کا نام لیتے ہی دیواروں پر ہاتھیوں کے سونڈ کی تصویریں ابھرنے لگیں...... اور ساتھ ہی آنکھوں کے سامنے ایک بدنما کھیل شروع ہو جائے۔ فنتاسی نہیں۔ خیال نہیں مسٹر کمال...... یہ حقیقت ہے اور میں یہ سب مسلسل دیکھ رہی ہوں۔ عورتوں کے اعضا کا ذکر آتے ہی میں دور گیدڑوں کے رونے کی آواز سنتی ہوں...... اور مردانہ اعضا کے ذکر کے ساتھ کمرے میں اتنی تیز آندھی چلتی ہے کہ مجھے خود کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔'

کمال سکتے کی حالت میں تھا۔ وہ غور سے ناہید کا چہرہ پڑھنے اور اسے سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

'اس طرح تو تم بیمار ہو جاؤ گی۔'

'نہیں۔ میں بیمار نہیں ہوں۔ نہ بیمار ہو جاؤں گی......' ناہید زور سے بول رہی تھی — 'تم کیوں سمجھتے ہو ایسا کہ میں بیمار ہوں...... میں تمہاری اصلیت بتا رہی ہوں۔ انسان ہونے کی اصلیت صرف یہ جسم نہیں ہے۔ یہ جسم تو محض کھلونا ہے۔ الفاظ...... ہونٹوں سے نکلتے ہی فضا میں پھیلتے اور جمع ہوتے ہیں اور اپنے حساب سے انسانی جسم کو چلاتے ہیں۔ تم اپنے الفاظ کے سہارے چل رہے ہو اور میں اپنے الفاظ کے سہارے۔'

کمال آہستہ سے بولا' ...... بولیاں نہیں ہوتیں...... زبان نہیں ہوتی...... حروف اور الفاظ نہیں ہوتے، تب بھی انسانی جسم میں ہلچل تو مچتی نا......؟ جسے تم کھلونا کہہ رہی ہو۔ اس میں زندگی ہے۔ بھرپور زندگی...... اور زندگی اپنے حساب اور احتیاط سے جو پانا چاہتی ہے وہ پا لیتی ہے...... جو کرنا چاہتی ہے وہ کر لیتی ہے......'

'صرف ایک نقطہ خدا کو جدا کر دیتا ہے......' ناہید کی آنکھیں کھلی ہوئی کھڑکی کے باہر دیکھ رہی تھیں......

کمال کی آنکھیں دھند میں اتر گئی تھیں — عرصہ پہلے پڑھی ہوئی جارج آرویل کی کتاب 1984 اس کی آنکھوں کے آگے گھوم رہی تھی۔ الفاظ پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ کتابوں کا گھروں میں رکھنا جرم ہے۔ قدم قدم پر Thought پولس یہ دیکھنے میں لگی ہے کہ آپ کچھ سوچ تو نہیں رہے ہیں۔ انسان سوچنا بند کر دے تو زندگی آسان ہو جائے مگر کیا ایسی زندگی، زندگی کہلائے گی؟'

کمال خود کو ایک اعصابی جنگ میں گھرا ہوا محسوس کر رہا تھا اور اس وقت ناہید کے کسی سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

ناہید کو پتہ تھا کہ اس وقت اس کی ذہنی کیفیت کو سمجھنا کسی کے لیے بھی آسان نہیں ہوگا۔ خاص کر کمال کے لیے۔ مگر یہ بھی سچ تھا کہ لغات پر کام کرنے کے دوران اس کی زندگی میں کئی تبدیلیاں آئی تھیں — جیسے وہ خود سے لڑ رہی تھی۔ جیسے کاغذ پر تنہائی لکھتے ہی وہ تنہا ہو جاتی تھی اور شور لکھتے ہی باہر سے بچوں کے شور کی

آوازیں کانوں میں گونجنے لگتی تھیں۔ اس درمیان دولفظوں پر وہ ٹھہر گئی تھی...... اسے نہیں معلوم کہ یہ دولفظ بار بار اسے اپنے حصار میں کیوں لے رہے ہیں۔ ایک لفظ فرار تھا۔ اور دوسرا انتقام— اس دن اچانک وہ چونک گئی تھی۔ باشا کو رُکمنی کے پاس سونپنے کے بعد جب وہ کام کرنے بیٹھی تو اچانک ایک حادثہ ہوا۔ لغات سے یہ دونوں لفظ نکلے اور اس کے اردگرد طواف کرتے ہوئے کھڑکی سے دور چلے گئے۔ وہ گہرے سناٹے میں تھی۔ پہلے تو ناہید نے اسے محض اپنا واہمہ تصور کیا۔ پھر جب لغات کی طرف دیکھا تو اس کی پریشانیوں میں اضافہ ہو چکا تھا۔ یہ دونوں لفظ حقیقت میں لغات سے غائب تھے۔ پبلشر نے اس اہم کام کے لیے، اس طرح کے کئی لغات سے سہارا لینے کے لیے کہا تھا۔ مگر یہ عجیب حقیقت تھی کہ اس وقت کسی بھی لغت میں یہ دونوں لفظ موجود نہیں تھے۔

کہاں گئے؟

یہ کیسے ہوسکتا ہے—؟

وہ گہری سوچ میں ڈوبی تھی اور اس بات سے قطعی انجان تھی کہ آنے والے دنوں میں ان دونوں لفظوں سے اس کا واسطہ پڑنے والا ہے۔

(4)

باشا رُکمنی کے پاس تھا۔ رُکمنی باشا کو لیے گانا گنگناتی ہوئی اسے بہلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کمال آفس جا چکے تھے۔ وہ سب کچھ بھول کر اس وقت لغت کی تکمیل میں مصروف ہونا چاہتی تھی۔ کئی دنوں سے وہ اچھے اور برے الفاظ کو الگ الگ کرنے میں مصروف تھی۔ وہ محاوروں کو بھی نئے زمانے کے حساب سے ڈھال رہی تھی اور ایسا کرتے ہوئے اسے قلبی سکون مل رہا تھا۔ پھر اس نے ایسے لفظوں کی فہرست بنائی، جو عام طور پر عورتوں سے منسوب تھے۔ اور اب وقت کے ساتھ ان کے معنی تبدیل کرنے کی کوشش کر رہی تھی......

جیسے آوارہ، اس نے آوارہ کے آگے لکھا: بدچلن مرد۔ مردوں کے چال چلن عام طور پر خراب ہوتے ہیں۔

فاحشہ...... بدکار مرد...... رحرام کار...... بدکار مرد...... رحرامی...... بدذات مرد...... رمطعون...... بدنام زمانہ مرد...... رطوائف...... ناچنے گانے والا مرد...... رہجڑا.... مردوں کی اعلیٰ قسم..... رِرنڈی...... بازارو مرد...... رعیاش...... یہ بھی مردوں کی صفت ہے رکسبی (کلنکنی)...... بدذات مرد رحرافہ... بدکار مرد.........

لکھتے لکھتے وہ اچانک ٹھہر گئی۔ کہیں دور پازیب بجنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ پھر گھنگھروؤں کی آواز ابھری اور اس آواز میں مردانہ قہقہے شامل ہو گئے۔ جونا گڑھ کی پرانی حویلی آنکھوں کے سامنے تھی: اس حویلی کی یاد سے اسے ہر بار گھبراہٹ ہوتی تھی۔ مگر ماضی کے دریچے سے ہر بار یہ حویلی نکل کر اس کے سامنے کھڑی ہو جاتی۔

خستہ محرابوں سے جھانکتی روشنی، جونا گڑھ کی حویلی: محرابوں پر کوئی عبارت لکھی تھی، وقت کے ساتھ حروف مٹ گئے تھے لیکن وہ دیکھ رہی تھی: لغات کے فرار اور انتقام میں سے ایک لفظ انتقام اس وقت خستہ محرابوں سے ابھر کر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ایک بار پھر سے خوف کی وادیوں میں تھی۔ گزری ہوئی کہانی کے باقی ماندہ صفحے کھل

گئے تھےاوران بوسیدہ صفحوں میں امی کی سسکیوں کے علاوہ تھا بھی کیا۔ کوئی بھی دن ایسا نہیں گزرا، جب اس نے امی کی آنکھوں میں آنسو نہ دیکھے ہوں۔ اس موقع پر آنسو بہاتی ہوئی امی اسے گود میں کھینچ لیتیں......

وہ بڑی بڑی آنکھیں گھماتی ہوئی ایک ٹک امی کی طرف دیکھتی جاتی......

محرابیں روشن تھیں: الفاظ چمک رہے تھے۔ اور وہ آخری منظر ناہید کی نظروں کے آگے تھا: ان دنوں جب بجیا کی خبریں حویلی سے باہر تک پھیل رہی تھیں۔ ابو ایک دن غصے میں امی کے پاس آئے۔ دو بجے کا وقت تھا۔ برآمدے میں مرغیوں کے دربے سے مرغیوں کی کڑکڑاہٹ کی آوازیں اندر تک آ رہی تھیں۔ ابا زور سے چیخ رہے تھے......

'سب تمہارا قصور ہے......'

باورچی خانے کی سیاہ پڑی دیواروں کے ایک طرف اماں خاموش کھڑی تھیں۔ چولھے پر پڑی ہوئی ہانڈی سے بھاپ نکل رہی تھی اور ہانڈی کا ڈھکن بار بار کھل اور بند ہو رہا تھا۔

'چاروں طرف نام نکل رہا ہے۔ عزت اور شرافت کی دھجیاں بکھر رہی ہیں......'

اماں نے پہلی بار ابا کو سنتے ہوئے صرف ایک جملہ ادا کیا...... 'یہ تو آپ کو بھی سمجھنا چاہئے تھا نا......'

پھر تو قیامت آ گئی——

'زبان لڑاتی ہے۔'

ابا تیزی سے آگے بڑھے۔ غصے میں اماں کا سر دیوار سے ٹکرا دیا۔ اس پر بھی بس نہیں چلا تو غصہ میں تھر تھر کانپتے ہوئے اماں کو کھینچتے ہوئے باہر دروازے تک لے آئے......

'دفع ہو...... نکلو گھر سے —— ابھی اس گھر سے نکلو'

وہ حیرانی سے یہ منظر دیکھنے پر مجبور تھی۔ اماں کا جسم پتھر کا ہو رہا تھا اور شاید یہ مردوں کا آخری حربہ ہوتا ہے...... نکلو گھر سے۔ جس عورت نے زندگی بھر گھر کی سیڑھیوں سے آگے نکل کر بازار تک کا رخ نہ کیا ہو، وہ بھلا کہاں جائے گی۔ ابا کی نامردی بھری غیرت میں ایک مرد آ گیا تھا۔ یہ مرد ایسے موقعوں پر ہی آتا ہے، جب ایسے نامرد خود کو ناکارہ قبول کر لیتے ہیں —— امی نے جسم پتھر کا بنا لیا تھا مگر آنکھوں میں آنسو کا ایک قطرہ نہ تھا —— ابا ان کو کھینچنے اور باہر نکالنے میں ہانپ گئے تھے......

باہر نکلو......

باہر نکلو......

چلو...... باہر نکلو......

میں اس آواز کی زد میں تھی...... باہر نکلو...... باہر نکلو۔ ابا کی تیز آواز سنتے ہوئے ابو چا اور گھر کے دوسرے مرد جمع ہو گئے تھے۔ وہ لوگ بڑی مشکل سے ابا کو قابو میں کرتے ہوئے کھینچ لے گئے تھے۔ اماں پتھر کے مجسمہ کی طرح بہت دیر تک باہر والے دروازے کے پاس کھڑی رہیں۔ جیسے اندر ایک کشمکش چل رہی ہو۔

لغات سے نکلا ہوا لفظ آنکھوں کے آگے روشن تھا: انتقام...... اس نے اپنا کام مکمل کرلیا تھا۔ کاغذوں کو سمیٹا۔ ایک فائل میں رکھا۔ وہ مطمئن ابھی بھی نہیں تھی۔ سانس ابھی بھی تیز تیز چل رہی تھی......

دوسرے دن کمال نے آفس جاتے ہوئے ڈکشنری کا مسودہ نرل اساس کے پاس جمع کرادیا۔ نرل اساس نے روکا۔ چائے پی کر جاؤ۔ مگر کمال کو دیر ہو رہی تھی۔ نرل نے کہا: مسودہ دیکھنے میں کچھ وقت لگے گا۔

لیکن یہ اتفاق تھا کہ شام کے ۷ بجے ہی کمال کے پاس نرل اساس کا فون آگیا:

'میں نے مسودہ دیکھ لیا۔ ممکن ہو تو اپنی اہلیہ کے ساتھ آجانا۔'

کمال نے منظور کرلیا۔ لیکن نرل کی باتوں سے ایسا لگ رہا تھا، جیسے کوئی خاص بات ہوئی ہو۔ لیکن وہ خاص بات کیا ہو سکتی ہے، وہ دیر تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔

☆☆

دوسرے دن صبح گیارہ بجے وہ نرل اساس کے کمرے میں تھا۔ ناہید بھی اس کے ساتھ تھی۔ یہ ایک خوبصورت کمرہ تھا۔ دیوار پر ایک حسین تجریدی پینٹنگ آویزاں تھی۔ نرل اساس نے چائے کا آرڈر دیا۔ اس درمیان کمال نے محسوس کیا، نرل بار بار ترچھی نظر سے ناہید کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ناہید نے شلوار جمپر پہنا ہوا تھا۔ اور اس لباس میں وہ خوبصورت لگ رہی تھی۔ چائے ختم ہوتے ہی نرل نے ناہید کی طرف دیکھا۔ ہونٹوں میں مسکراہٹ پیدا ہوئی:

'آپ کو کافی محنت کرنی پڑی۔'

'جی ہاں......'

'لیکن آپ نے بہت جلد اس کام کو مکمل کردیا۔ مجھے اتنی جلدی امید نہیں تھی۔'

کمال خاموشی سے یہ گفتگو سن رہا تھا اور سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ناہید آہستہ سے بولی: 'اچھے کام میں وقت تو لگتا ہے۔'

'ہاں کیوں نہیں۔' کیوں نہیں۔ کو کافی کھینچ کے بولا گیا تھا۔

اور میں دیکھ رہا تھا: نرل کے ہونٹوں کی مسکراہٹ بہت گہری تھی۔ آپ نے کچھ زیادہ ہی آزادی لینے کی کوشش کی ہے۔

'کچھ زیادہ نہیں۔' ناہید کے چہرے پر معصومیت تھی۔ 'مگر جیسا آپ نے کہا تھا۔ وقت کے حساب سے......' وہ ٹھہری...... مجھے لگا...... 'وقت کے حساب سے بہت کچھ تبدیل ہو گیا ہے۔'

'ہونہہ۔' نرل اساس کی آنکھیں چھت کو دیکھ رہی تھیں۔ انھوں نے جبراً مسکرانے کی کوشش کی اور اس بار کمال یوسف کی طرف دیکھا:

'پرفیکٹ میچ......' وہ کہتے کہتے ٹھہرا......

کمال یوسف کو احساس ہوا کہ اس پر فیکٹ میچ میں دراصل اس کا مذاق اڑانے کی کوشش کی گئی ہو۔
نرل اساس کچھ سوچتا ہوا بولا: 'میں پبلشر ہوں۔ کتابوں کا بزنس کرتا ہوں۔ ڈکشنری کے کام اس سے پہلے بھی کئی کرا چکا ہوں۔ مگر اس بار' اس نے ہنسنے کی کوشش کی: 'پہلی بار مجھے لگا، میں اس نظام کا حصہ نہیں ہوں۔ یا میں اس نظام کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ دنیا اس حد تک تبدیل ہو چکی ہے مگر اس بارے میں مجھے کچھ نہیں پتہ۔ میں بالکل انجان کسی ننھے منے سے بچے کی طرح ہوں، جس کے سامنے سے نکل کر یہ دنیا پوری طرح بدل گئی اور مجھے احساس تک نہ ہو سکا......'
ناہید مسکرا رہی تھی۔
کمال نے چونک کر پوچھا۔ 'میں نے کچھ سمجھا نہیں۔'
اساس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس نے ناہید کی طرف اشارہ کیا: 'انھوں نے بتایا کہ یہ دنیا بدل چکی ہے۔ بہت سے لفظ اپنی پہچان کھو چکے ہیں اور ان کی جگہ نئے الفاظ آ چکے ہیں۔ بہت سے لفظوں نے ندی کی لہروں کی طرح معنی کا رخ ہی بدل دیا ہے۔ کاش، ایسا ہوتا! کاش!!' نرل اساس نے دوبار کاش کو دہرایا۔
'مگر کیا سچ مچ ایسا ہے میڈم...... نہیں مجھے معاف کیجئے گا۔ کیا یہ دنیا اس حد تک بدل چکی ہے۔؟'
'یہ اپنے اپنے نظریے سے سوچنے اور دیکھنے کی بات ہے......'
'ہاں۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔' نرل اساس مسکرانے کی کوشش کر رہا تھا: 'اور آپ نے صحیح کہا۔ ڈسکو چلے جائیے۔ نئی نسل کو دیکھئے۔ مرد عورت اور عورت مرد یعنی سمجھ میں نہیں آتا کہ کون کیا ہے۔ میرے بیٹے کانوں میں چھلے پہنتے ہیں۔ بیٹی لڑکوں کی طرح رہتی ہے۔ شاید آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ لیکن اس بدلی ہوئی صورتحال میں......
وہ شیشے کی کیبن کے باہر دیکھ رہا تھا— 'تبدیلی۔ بہر حال ہم ایک بڑی اور خوفناک تبدیلی کی زد میں ہیں۔ وہ ہنسا— 'میں کہتا ہوں جو لغات آپ نے تیار کیا ہے اسے ویسا مارکیٹ میں ڈال دوں تو زلزلہ آ جائے گا۔ مجھے لگتا ہے یہ ایک بڑی خبر بھی بن سکتی ہے۔ ہاٹ نیوز۔ اخباروں سے لے کر ٹی وی چینلس تک۔ اور کیا پتہ باہری میڈیا بھی اسے کور کریں...... باہر کے ملکوں میں الفاظ و معانی کی یہ تبدیلی نئے بحث کھڑا کر دے گی۔ کیا سچ مچ ایک پوری تہذیب بدل رہی ہے—؟ بدل رہی ہوگی' اساس نے آہستہ سے کہا— 'عورتیں زیادہ آزادانہ طور پر کنڈوم خریدتی ہیں۔ مرد رات میں بیڈ روم میں نائٹی پہن لیتے ہیں۔ سیکس کے تجربے بڑھ رہے ہیں۔ عورتیں فائٹ کر رہی ہیں۔ آپ صحیح ہیں۔ تبدیلی آئی ہے اور اسی دنیا میں آئی ہے تو پھر لغات، ڈکشنری، شبدکوش...... یہ لفظ کیوں نہ بدلے جاتے۔ بدلے جائیں گے......'
نرل اساس دوبارہ شیشے کی کیبن کے باہر دیکھ رہا تھا۔ 'مگر......' اس نے فائل کے صفحے پلٹے۔ ایک صفحہ ناہید کے آگے کر دیا: 'یہ آپ نے لکھا ہے نا...... اسے پڑھیے......'
'میں نے پڑھ لیا ہے۔'
'کیا......'

'جو آپ دکھا رہے ہیں۔'

میں کیا دکھا رہا ہوں......

ناہید مسکرائی تھی— عورتوں کے حصے کے تمام نام میں نے مردوں کے خانے میں ڈال دیا ہے۔ مثلاً داسی، طوائف، کلنکنی، چھنچھنی، بے حیا، فاحشہ...... رنڈی......'

'رنڈی' نزل اساس نے لمبی سانس کھینچی، کمزور آواز میں پوچھا گیا: 'معاف کیجیے گا، اپنی تسلی کے لیے پوچھ رہا ہوں۔ رنڈی کو مرد کے حوالے سے رنڈا ابھی تو لکھا جا سکتا ہے۔ مثال کے لیے بھڑوا۔'

'نہیں۔' ناہید ناز مطمئن تھی— 'اب ان میں سے کوئی بھی لفظ بدلا نہیں جائے گا۔ آنے والے وقت میں مردوں کو انھی ناموں کے ساتھ جینا ہوگا۔'

'بالکل ٹھیک......'

نزل اساس کا لہجہ اس بار خوفزدہ تھا۔ وہ کرسی پر اس طرح ہل رہے تھے جیسے اچانک ذہنی رو بگڑ گئی ہو...... آنکھیں چھت کو دیکھ رہی تھیں اور انھوں نے کئی بار اس جملے کو دہرایا...... بالکل ٹھیک۔ اچانک انھوں نے کرسی سیدھی کی۔ اور کمال کی طرف مڑے:

'کمال ہے...... واہ کمال ہے......'

'جی......'

'آپ ابھی تک نہیں سمجھے— 'نزل اساس ہنسنے کی کوشش کر رہے تھے اور ہنسنے کی کوشش میں ان کا چہرہ اس وقت کسی مسخرے کے چہرے میں تبدیل ہو گیا تھا۔ وہ مسکرا رہے تھے مگر اندر ہی اندر جیسے کوئی تیز آندھی اٹھ رہی ہو...... وہ پھر کمال کی طرف مڑے...... 'آپ اور میں جتنا اس دنیا کو جانتے ہیں، وہ ناکافی ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں۔ اس دنیا کو آپ کی بیوی میرا مطلب ہے...... میڈم زیادہ جانتی ہیں۔ دنیا اتنی تیزی سے بدلی ہے کہ بہت تیز دوڑنے والا بھی اس رفتار کو پکڑ نہیں سکتا۔ کیوں میڈم۔ اب لیوان ریلیشن شپ کو ہی لیجیے۔ باضابطہ قانون آچکا ہے۔ ایک مرد دو عورتوں کے ساتھ رہ سکتا ہے۔ ایک دروازہ دوسری عورت کے کمرے میں کھلتا ہے۔' وہ ہنس رہے تھے— 'محبت کو ہی لیجیے۔ محبت کے لیے جنس مخالف کی کوئی شرط نہیں ہے۔ بلکہ لڑکے لڑکوں سے لڑکیاں لڑکیوں سے پیار بھی کر رہی ہیں اور شادی بھی۔ پھر ڈکشنری کے الفاظ تو بدلے جائیں گے۔ کیونکہ کل تک کہاں یہ سب بیماریاں...... معاف کیجیے گا میڈم...... مجھے اس وقت اور کوئی اصطلاح نہیں سوجھ رہی ہے۔ میرا مطلب ہے...... یہ دنیا کچھ برس پہلے تک اتنی تیزی سے کہاں پھیلی تھی۔ ہم زندگی کے نئے ہائی وے پر ہیں اور نیا شہر بسانے کی تیاری کر رہے ہیں...... چیلنج بڑھیں گے تو مسائل بڑھیں گے۔ بلکہ بدلیں گے اور بدلیں گے تو معنی کی ایک نئی دنیا ہوگی۔'

نزل اساس کا چہرہ کئی طرح کے جذبات سے دوچار تھا— 'ایک طرف ہم مارس پر جا رہے ہیں۔ چاند

پر پانی اور زندگی کی تلاش ہو رہی ہے، بلکہ زمین کی بکنگ بھی شروع ہو چکی ہے۔ اور دوسری طرف وہی زندگی، وہی تہذیب، وہی دقیانوسی باتیں، وہی لفظ اور وہی معنی...... نہیں چلے گا...... کیوں میڈم......؟'

'بالکل صحیح......' ناہید کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ مگر اس وقت یہ آنکھیں ایسی تھیں جیسے نرمل اساس کی ذہنی روش کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

کمال خاموشی سے دونوں کے چہروں کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے لیے سمجھنا آسان نہیں تھا کہ اس وقت نرمل اساس اور ناہید میں کون صحیح اور کون غلط ہے۔ اور یہ بھی کہ کون کس کا مذاق بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ کیا نرمل اساس واقعی ناہید کے کام سے خوش ہوئے ہیں؟ ایسا اسے نہیں لگ رہا تھا۔ اس لیے کہ اس وقت جو نرمل اساس کرسی پر مسلسل ہل رہے تھے، وہ چہرہ اور کردار اس کے لیے نیا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ پچھلے پانچ برسوں میں اس نے نرمل اساس کا یہ چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ ایک بات واضح تھی۔ وہ یہ کہ ناہید کے کام سے نرمل اساس بری طرح ہل کر رہ گئے ہیں۔ مگر ایسا کیوں ہوا، اس کی نفسیاتی وجوہات بھی ہو سکتی ہیں۔ جیسے ابھی کچھ دیر پہلے انھوں نے اپنی بیٹی اور بیٹے کا تذکرہ کیا۔ لیکن اصلیت کیا ہے، یہ ابھی سمجھ پانا مشکل تھا۔ اس درمیان نرمل اساس نے ایک زور کا ٹھہا کا لگایا۔ باری باری سے دونوں کے چہروں کو دیکھا۔ پھر خصوصی طور پر ناہید کی طرف دیکھ کر مخاطب ہوا:

'میڈم معاف کیجئے گا۔ اپنی معلومات بھر باتیں آپ سے شیئر کر رہا ہوں۔ کیونکہ اس کا ذکر بھی آپ کے لغات سے ہے۔ معلومات بھر، آپ سمجھ رہی ہیں نا۔ اور اگر میں یا میرے الفاظ غلط ہوں تو میں پہلے ہی اس کے لیے معافی مانگ لیتا ہوں۔'

'نہیں آپ کہیے۔' ناہید نے جلدی سے کہا۔

'شکریہ۔ میں تبدیلی کی بات کر رہا تھا۔ جیسا کہ آپ نے لغات میں تبدیلی کے دوران محسوس کیا ہوگا۔ اگر تبدیلی آئی ہے تو دو چند لوگ ہی کیوں محسوس کریں؟ میں پچھلے دنوں جان گرے کی ایک کتاب 'مین آر فرام مارس اینڈ ویمن آر فرام وینس' پڑھ رہا تھا۔ سیکسوئیلیٹی کو ہی لیجئے۔ عورت زیادہ سخت ہوگئی ہے۔ بیڈروم کا مرد ہار رہا ہے۔ باب ڈلن کا ایک گیت یاد آ رہا ہے: کیا تم کھانا پکا سکتے ہو، بیج بو سکتے ہو؟ پھول کھلا سکتے ہو؟ کیا تم میرے درد کو محسوس کر سکتے ہو؟ اور نیا مرد کہتا ہے: ہاں، یہ نیا مرد آج شیف ہے۔ سب سے اچھا کھانا بناتا ہے۔ مساج پارلر میں آج اس کی ڈیمانڈ عورتوں سے زیادہ ہے۔ وہ جم جا کر باڈی بھی بنا رہا ہے اور جسم میں لچک بھی پیدا کر رہا ہے۔ وہ کانوں میں چھلّے پہنتا ہے۔ وہ مونچھ اور داڑھی کٹا رہا ہے۔ اسے چکنا نظر آنا زیادہ پسند ہے۔ وہ نیا ماچو مین ہے۔ وہ کچن بھی سنبھال رہا ہے اور گھر بھی۔' نرمل اساس کا لہجہ بدلا ہوا تھا: 'یہ نیا مرد وجود میں آ چکا ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں پیدا ہو رہا ہے۔ ایک لچر سماج میں، ایک ختم ہوتی تہذیب میں، ایک کمزور ہوتی جمہوریت میں اور اس آئی ٹی انڈسٹری میں ہم نے نئی عورت اور نئے مرد کو تلاش کر لیا ہے۔ یہ ہماری ٹنڈ منڈ اور مغرب سے برآمد تہذیب، ملی جلی اکانومی اور پزا برگر کے ذائقہ سے برآمد ہوا ہے اور حقیقت ہے کہ اس وقت سب بدل چکا ہے۔ آئینہ کے سامنے لپسٹک لگاتا ہوا مرد اور فائیلوں میں گھری عورت۔' نرمل اساس آہستہ سے بولے: 'خوفناک......'

کیا..... ناہید چونک کر بولی.....

'اور اب میری سمجھ میں آیا کہ ان سب کے پیچھے کون ہے؟ مائی گاڈ! سب کچھ آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے تھا اور ہم کتنے بے خبر تھے۔

'ان سب کے پیچھے کون ہے؟' ناہید کا لہجہ بھی بدل گیا تھا۔

'عورت۔'

نرل اساس کا لہجہ اس وقت برف کی طرح سرد تھا— 'عورت، جس نے آئی ٹی انڈسٹری سے سائبر اسپیس تک قبضہ کرلیا۔ اور انتہائی ہوشیاری سے مردوں کو ایک نیا مرد بنادیا۔ یعنی عورت.....'

ناہید ہنس رہی تھی لیکن اس وقت اس کی یہ ہنسی مجھے نا قابل برداشت لگ رہی تھی۔ یہ ہنسی ایسی تھی کہ مجھے طلسم ہوشربا کی کہانیوں میں اس مکار حسین عورت کی یاد آگئی، جو دراصل عورت نہیں تھی بلکہ ایک راکشش تھی۔ اور راز کے کھلتے ہی وہ زور زور سے قہقہہ لگا کر اپنے اصل روپ میں واپس آگئی تھی۔

'مائی گاڈ..... عورت— یہ سارے جال عورت نے بُنے اور کمال ہوشیاری سے کہ مردوں کو پتہ بھی نہیں چلا.....' نرل اساس اس بار زور سے چیخے تھے۔

'اب آپ کیا چاہتی ہیں.....؟'

'میں کچھ نہیں چاہتی۔'

'پھر یہ کیا ہے.....' نرل نے اس بار فائل کو زور سے دیوار پر دے مارا اور فائل میں جمع کاغذات ہوا میں اڑتے ہوئے بکھرتے چلے گئے۔

'آپ پاگل تو نہیں ہو گئے ہیں۔' اس بار کمال نے غصہ سے کہا تھا۔

'مسٹر کمال..... بہتر ہوگا کہ ابھی آپ انہیں لے کر چلے جائیں۔ اور معاف کیجئے گا۔ میرا دماغ اس وقت بالکل قابو میں نہیں ہے۔'

کمال نے ناہید کی طرف دیکھا۔ ناہید کا چہرہ سپاٹ تھا۔

اور اس وقت اس کے چہرے کے تاثرات سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔

کمال نے ناہید کا ہاتھ تھاما اور نرل اساس کے کمرے سے باہر آ گیا—

اور اس وقت اس کے دماغ میں تیز تیز آندھیاں اٹھ رہی تھیں۔

☆☆

بطور مصنف، میرے لیے ان واقعات سے سرسری گزرنا آسان نہیں تھا کیونکہ نئی صدی کی شروعات سے ہی ان تبدیلیوں کا بہت کچھ اشارہ ملنے لگا تھا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ نئی، تیز رفتاری سے بدلتی ہوئی دنیا اگر نئی عورت کو ڈسکور کر رہی تھی تو یہاں نیا مرد بھی پیدا ہو رہا تھا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ یہ نیا مرد اور یہ نئی عورت سائبر سے آئی ٹی انڈسٹری اور تمام گلیمر ورلڈ تک پھیل

گئی تھی۔ اور یہ بھی حقیقت کہ اس انڈسٹری کی اپنی سوشل نیٹ ورکنگ تھی۔ فیس بک سے ٹوئٹر تک پرانے الفاظ غائب ہوتے چلے گئے تھے۔ اور ان کی جگہ نئے الفاظ لے رہے تھے۔ ٹوئٹ کرنے والوں اور فیس بک کا استعمال کرنے والوں کے لیے الفاظ و معنی کی اپنی دنیا آباد تھی اور ان میں بیشمار الفاظ ایسے تھے جو لغات یا ڈکشنری میں نہیں تھے اور یہ نسل اس نئی سوشل نیٹ ورکنگ کے سہارے رشتے، معیار اور زندگی کا اپنا راستہ تلاش کر رہی تھی یا ان کی نئی تعریفیں ڈھونڈھنے میں لگی تھی۔ کرن جوہر، راہل ملہوترہ جیسے ہزاروں نام جس نے ماچو مین کی تعریف بدل کر رکھ دی ہے۔ آپ کمال یوسف کو بھی اس صف میں رکھ سکتے ہیں۔ باشا کے کپڑے بدلتا ہوا، ضرورت پڑتی تو کچن میں چائے بناتا ہوا۔ مجھے بار بار نرمل اساس کے جملے یاد آ رہے تھے: کیا مرد کو اس نئی تہذیب میں لانے والی عورت ہے؟ مرد سیلون جاتے ہیں، فیشل اور پیڈیکیور کراتے ہیں، وہ اچھا نظر آنا چاہتے ہیں اور جیسا کہ ایک سائیکو تھیراپسٹ نے کہا تھا: 'ہندوستانی مردوں میں عورتوں کی صفات دیگر ملکوں سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔' لیکن ہوتی ہر جگہ ہے۔ ہر ملک میں۔ اور اس لیے مرد کے تصور میں ایک نئی عورت سامنے آ گئی تھی——

میں فکری سطح پر الجھ کر رہ گیا تھا۔ ایک طرف ناہید تھی تو دوسری طرف صوفیہ مشتاق احمد بھی تھی اور کمال بھی تھا جس نے ناہید کے کہنے پر عورتوں کے لباس بھی پہنے اور مردانگی کی حد تک یا عورتوں کی صفات کی حد تک خود کو ناہید کے کہنے پر ڈھال لیا تھا۔ یا اس نے ڈھالنے کی کوشش کی تھی۔ دراصل یہاں ہر شخص ایک نئے سوشل اسپیس کے لئے جگہ بنا رہا ہے——

مجھے واشنگٹن ارونگ کی وہ کہانی یاد آ رہی تھی جہاں ایک کردار بیس سال تک سوتا رہا اور اچانک جب وہ جاگا تو ایک پوری دنیا تبدیل ہو چکی تھی۔ ایک ایسی دنیا جہاں آڈیو، ویڈیو اور ڈکشنری یا الفاظ کی سطح پر بھی مسلسل انسانی زندگی کا گراف تبدیل ہو رہا ہے: گوگل، فیس بک سے ٹوئٹر تک، سوشل نیٹ ورکنگ نیا اسپیس، اور نئے لفظ ڈسکور کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ شاید اسی لیے ٹیکنالوجی سے نظریہ، محاورے سے بازار تک ہم رشتوں اور نیٹ ورکنگ کی نئی دنیا میں ہیں اور جس کے بارے میں مارک زبرگر کہتا ہے کہ آپ چھپ نہیں سکتے۔ آپ دنیا کے کسی کونے میں ہوں، آپ کو پہچان لیا گیا ہے——

میں اپنا ہوم ورک کر چکا تھا اور اس ہوم ورک میں، میں ناہید کو لے کر اب تک الجھن کا شکار تھا اور دل کسی طور پر یہ ماننے کو تیار نہ تھا کہ وہ یہ قدم اٹھا سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے، سوشل نیٹ ورکنگ کی اس نئی اصطلاح مائی اسپیس میں اس نے اپنے لیے ایک ایسا خلا پڑھ لیا ہو، جس کے بعد اس نے زندگی کی کوئی ضرورت محسوس نہ کی ہو۔ میرے سامنے مہذب دنیا میں اس وقت ایسی کئی مثالیں تھیں اور ایسے زیادہ تر لوگ نوجوان تھے، جنھوں نے آسانی سے اپنی زندگی کو محض اس لیے ختم کر لیا تھا کہ اب وہ جینے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے۔ ایک نسل خوف اور صدمے میں انجانی موت کی طرف بڑھتی ہوئی۔ مجھے اس ازبیک شاعر کی یاد آ رہی تھی جس نے کہا تھا: ہم مرنے کے لئے پیدا ہوتے ہیں ....

اور اس پوری کہانی کا موہوم سا سچ یہ تھا کہ ناہید نے اپنے لیے ایک ایسی ہی موت کا انتخاب کیا تھا: وہ موت جو علم الحساب، ضرب، تقسیم، لغات کے بوسیدہ الفاظ اور ''مائی اسپیس'' کے خلا کو نہ بھر سکنے کی صورت میں سامنے آئی تھی یا جسے ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اُس کے اندر کے دھماکے اتنے بڑھ گئے تھے کہ وہ خاموشی کے جسم میں تحلیل ہو گئی۔ کبھی کبھی اندازے اور قیاس غلط بھی ثابت ہوتے ہیں اس لئے ان تفصیلات کو کمال

یوسف سے جاننا ضروری تھا۔ جیسے کمال نے بتایا کہ: ہم نرمل اساس کے کمرے سے نکل کر گاڑی میں بیٹھے تو میری اور اس کی کیفیت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔۔۔

''مثال کے لئے، اگر میں جاننا چاہوں تو؟''

'ظاہر ہے۔ مجھے نرمل پر غصہ تھا۔ میں اسے پانچ برسوں سے جانتا تھا اور میں نے اس کا یہ رویہ کبھی نہیں دیکھا تھا'

'اس وقت ناہید کی کیفیت کیا تھی؟'

'ہم باہر آئے تو وہ بے مطلب کچھ گنگنا رہی تھی جیسے اندر جو کچھ ہوا' اُس کا اس پر کوئی اثر نہیں تھا۔۔۔'

کیا اُس نے واقعی کوئی اثر نہیں لیا تھا؟

''نہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ اس لیے کہ اُس کے بعد جو کچھ گھر میں ہوا......'

میں نے کمال کو روک کر کہا: 'مگر جیسا کہ آپ بتا رہے ہیں، نرمل اساس کے کمرے سے باہر نکلنے تک وہ نارمل تھی؟'

'جی ہاں۔۔۔'

یہ میرے لئے حیرت کی بات تھی، کیوں کہ ایسے موقع پر جب سامنے والا شخص ناہید جیسی باغی عورت کو کمرے سے باہر جانے کے لئے کہہ رہا ہو، ناہید کا نارمل حالت میں ہونا مجھے پریشان کر رہا تھا: کیا یہ ناہید کے لئے فتح کا احساس تھا؟ اگر ہاں تو کیوں۔۔۔؟

کمال نے میری طرف دیکھا:

'میں آپ کو پورا واقعہ بتاتا ہوں بلکہ دکھانے کی کوشش کرتا ہوں۔۔۔'

(5)

کمال کو اپنی غلطی کا اعتراف تھا۔ اس نے اگر یہ پروجیکٹ ناہید کو نہ دیا ہوتا تو شاید نرمل اساس نے اس طرح بے عزت کر کے اُن دونوں کو کمرے سے باہر نہیں نکالا ہوتا۔۔۔ وہ باہر آیا تو ناہید کوئی گیت گنگنانے میں لگی تھی۔۔۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔۔۔ اور اُس کی آنکھوں کو دیکھنے کے بعد کہیں سے بھی یہ محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ نرمل اساس کی باتوں سے اسے چوٹ لگی ہو۔۔۔

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کمال نے زور سے کہا۔۔۔

'آج تمہاری وجہ سے ہماری بے عزتی ہوئی ہے۔۔۔'

'میری وجہ سے کیوں؟'

'تم نے دیکھا اُس کا لہجہ کیسا تھا؟'

'وہ تمہارا دوست ہے۔'

'لیکن اس نے ایک پروجیکٹ دیا تھا اور اس پروجیکٹ کے لئے وحشی بننے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔۔۔'

'میں وحشی ہوں۔۔۔' ناہید زور سے چلائی۔۔۔

'چیخو مت—'

'مجھے وحشی کہنے کی تمہاری ہمت کیسے ہوئی؟'

ناہید مسلسل چیخ رہی تھی۔ کمال نے گاڑی کے شیشے چڑھا لیے۔ اسے یقین تھا، اس وقت ناہید کو کوئی بھی جواب دینا مناسب نہیں۔ وہ باہر کے مناظر میں جذب ہو کر ناہید کے غصے کو بھولنا چاہتا تھا۔ گاڑی آہستہ آہستہ پہاڑی راستوں پر آگے بڑھ رہی تھی۔ سرسبز و شاداب، گھنے درخت اور جنگلات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ۔ خوبصورتی ایسی کہ کوئی نعم البدل نہیں! کمال نے تصور کیا کہ یہ سبزہ اور درخت وادیوں سے گم ہو جائیں تو کیا یہ دنیا زندہ رہے گی......

'تمہارے ساتھ زندگی گزارنا مشکل ہے— تم نے مجھے وحشی کیوں کہا؟'

اس بار ناہید غصے سے چلائی اور اچانک کچھ لمحے کے لئے اس کا توازن کھو گیا۔ گاڑی تیزی سے چرمرائی اور ایک جھٹکے سے رک گئی۔ سامنے ہزاروں فٹ نیچے کی گہرائی تھی اور اگر اس نے جھٹکے سے بریک نہ لیا ہوتا تو شاید اس کی گاڑی ان گہرائیوں کی نذر ہو چکی ہوتی—

'یہ کیا کیا تم نے— گاڑی روک کیوں دی—؟'

'خدا کا نام لینا چاہتا تھا—'

'کیوں؟' ناہید غصے سے چیخی—

'مرنے سے پہلے خدا کو یاد کیا جاتا ہے—'

'تو تم مجھے مارنے چلے تھے—'

'گاڑی میں اکیلے تم نہیں ہو۔ میں بھی ہوں۔ اور میں تمہارے اس روز روز کے پاگل پن سے تھک چکا ہوں—'

'اور اسی لیے مجھے مارنے کا ارادہ کر لیا—؟' ناہید غصے سے چیخ رہی تھی— گاڑی روکو— تمہارا ماغی توازن ٹھیک نہیں ہے—'

کمال کو ہنسی آ گئی— لیکن ناہید کا غصہ اُبال لے چکا تھا—

'تو تم اسی لیے آئے تھے— میری رسوائی کا تماشہ دیکھنے اور اس کے بعد مجھے ان گہرائیوں میں پھینکنے کے لئے—' ناہید کی آنکھیں سلگ رہی تھیں—

'پاگل ہو گئی ہو تم—'

'تو تم مجھ سے اب گھبرا چکے ہو۔ اور اب مجھے مارنا چاہتے ہو— دراصل میں تمہاری اس نفسیات کو سمجھ رہی تھی— میں لگاتار تمہیں سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی— اور میں اس نتیجہ پر پہنچی کہ تم ایسا کر سکتے ہو......'

کمال نے غور سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس نے کوشش کی کہ لہجہ میں توازن کو برقرار رکھا جا سکے مگر ناہید نے صبر کے پیمانے کو چھلکا دیا تھا۔ وہ دیر تک پیچ و تاب کھاتا رہا۔ جب احساس ہوا کہ سانسیں گھٹن کا شکار ہیں تو وہ آہستہ سے بولا......

'تم اپنے ہوش کھو بیٹھی ہو تم بھول گئی ہو کہ یہ کام میں کہیں بھی کر سکتا تھا مگر سوال ہے، میں تمہیں کیوں ماروں گا—؟

'کیونکہ تم مجھ سے گھبرا چکے ہو؟'

'کیوں — چلو مان لیں میں گھبرا چکا ہوں تو تم اس رشتہ کو اس مقام تک کیوں لے آئی —؟'

'میں نہیں لائی۔' ناہید کی آواز میں غصہ برقرار تھا: 'تم بدل گئے ہو اور تم میں ایک مرد آ گیا ہے!'

'میں مرد ہوں — میں مرد تھا......' کمال نے مسکرانے کی کوشش کی — 'اور مرد رہوں گا۔ اور میں مرد نہ ہوتا تو تمہارے لئے مجھ میں کشش بھی نہ ہوتی اور نہ تم مجھ سے شادی کرتی —'

'واہیات' — ناہید ناخن چبانے کی کوشش کر رہی تھی...... اور اس وقفہ میں شاید وہ کچھ سوچ بھی رہی تھی۔ ناہید نے پلٹ کر کمال کو دیکھا......

'اور تم نے دیکھا — میں نے لغات کو ہی تبدیل کر دیا — مرد میں ہوں......'

مسکرانے کی کوشش میں اُس کے جبڑے پھیل گئے تھے — اور پہلی بار کمال کو، ناہید کو دیکھتے ہوئے خوف محسوس ہوا تھا — ناہید میں، وہ مکمل طور پر ایک مرد کو داخل ہوتے ہوئے محسوس کر رہا تھا —

'کیا ہم یہیں لڑتے رہیں گے یا گھر بھی چلیں گے؟'

کمال نے گاڑی بیک کی۔ اور پھر گاڑی کو گھر کی طرف موڑ لیا۔ دو ایک بار پلٹ کر اُس نے ناہید کی طرف دیکھا۔ ناہید کے چہرے پر کشمکش کے آثار تھے۔ جیسے ابھی بھی ایک جنگ اُس کے اندر چل رہی ہو —

گھر آنے کے بعد کمال کی خواہش تھی کہ وہ اُس سے جتنا دور رہے وہی اس کے لئے ہی بہتر ہے۔ کیونکہ کمال کو اس بات کا احساس تھا کہ اس وقت اس کی حالت اُس زخمی شیرنی جیسی ہو رہی ہے جو کسی بھی بات پر کاٹنے کو دوڑ سکتی ہے۔

کمال نے شاور لیا۔ اس وقت وہ سب کچھ بھول کر خود کو ہلکا کرنا چاہتا تھا۔ مگر شاید ناہید ایسا نہیں چاہتی تھی — باہر سے تیز تیز بولنے کی آواز آ رہی تھی —

کپڑے پہن کر وہ باہر آیا تو ناہید اُسے دیکھتے ہی زور سے چلائی —

'اب میری سمجھ میں آ رہا ہے، تم مجھے اپنے دوست کے پاس کیوں لے گئے تھے؟'

'میں نہیں لے گیا تھا — اس نے تمہارا یہ ذلیل کام دیکھنے کے بعد مجھے فون کیا تھا — اور فون پر درخواست کی تھی کہ تمہیں لے کر آؤں۔'

''مجھے بے عزت کرنے کے لئے؟ اور تم تماشہ دیکھ رہے تھے —' ناہید زور سے چلائی — 'تم اس لیے خوش رہے کہ تمہیں مزہ آ رہا تھا۔ وہ کمبخت میری محنت کی دھجیاں اڑا رہا تھا اور تم دیکھ رہے تھے۔ جس وقت اُس نے فائل ہوا میں اڑائی۔ میں اسے تھپڑ بھی مار سکتی تھی۔ مگر میں صرف تمہارے لیے خاموش رہی۔'

'میرے لیے کیوں؟ مجھ پر یہ احسان کیوں کیا؟'

'کیونکہ شاید تمہارے اندر کی مردانگی......، وہ کہتے کہتے رک گئی۔ پھر تیزی سے بولی...... کہ شاید تم شرم محسوس کرو — اور اس سے کہو کہ اُسے اس انداز میں بات نہیں کرنا چاہئے۔'

’تم پاگل ہوگئی ہو — یاد کرو، میں نے یہ بات اُس سے کہی تھی۔‘

’تمہاری آواز میں جوش نہیں تھا — اور میں اب تمہارے اس ڈرامے کو سمجھ رہی ہوں — دراصل یہ تم دونوں کا پلان تھا۔ وہ غصے میں چیخی۔ میں بتاؤں گی نہیں۔ سن لیا تم نے...... میں بتاؤں گی نہیں —‘

ناہید پاؤں پٹختی ہوئی چلی گئی۔ کمال کچھ دیر تک سناٹے میں ڈوبا رہا۔ ناہید کا آخری جملہ ابھی بھی کانوں میں گونج رہا تھا۔ اُس کے لیے یہ سمجھنا مشکل تھا کہ کیا ناہید اب اپنا ذہنی توازن کھونے لگی ہے۔ یا وہ بغاوت کی اس منزل پر ہے جہاں کچھ بھی کرسکتی ہے۔ اُس کے لئے یہ سمجھنا مشکل تھا کہ اس رشتہ میں بغاوت کہاں سے آگئی؟ اور ناہید نے اچانک یہ نیا ڈرامہ کیوں شروع کردیا، کمال یہ بھی سوچتا تھا کہ آخر اُس سے غلطی کہاں ہوئی۔ مگر یہ حقیقت تھی کہ ناہید کا یہ مزاج اب اُسے دن بہ دن ناہید سے دور کرتا جارہا تھا۔

رات ہوگئی تھی۔

نینی تال میں موسم سرما کی ہوائیں ایک قطار سے کھڑے درختوں کو چومتی ہوئی گزر جاتی ہیں۔ پتوں کے ہلنے سے پہاڑیوں میں ایک پُر اسرار موسیقی کی گونج ہوتی ہے۔ اس موسیقی میں خوف کے ساتھ جنون کا بھی احساس ہوتا ہے۔ رات میں کہتے ہیں ان پہاڑیوں کی چٹانیں جاگ جاتی ہیں اور جب کبھی کوئی گاڑی ان پہاڑی راستوں سے گزرتی ہے تو چٹانیں خوفناک موسیقی کے ذریعہ اُسے آنے والے خطرات کا احساس بھی دلاتی ہیں...... ایک گہری خاموشی — اور اس وقت ساری دنیا سو چکی ہے۔ لیکن کیا کوئی طوفان آنے والا ہے......؟

کیا حقیقت یہ ہے کہ ان الجھی ہوئی سانسوں اور بیقراری کا کوئی انت نہیں ہے؟ ایک گہرا کنواں ہے اور جیسے ایک بے بس جسم اس کنویں میں اترتا چلا جارہا ہے، دور کہیں آگ جل رہی ہے اور چند قبائلی رقص کرتے ہوئے منہ سے عجیب عجیب آواز نکال رہے ہیں اور فضا میں بھنے ہوئے گوشت کی بو پھیلی ہوئی ہے۔ کمال کو احساس ہوا، چاروں طرف چیخیں جمع ہیں اور وہ دیکھ سکتا ہے: انسان آہستہ آہستہ خاتمہ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ڈھول بج رہے ہیں۔ قبائلی زور زور سے تانڈو کرتے ہوئے منہ سے عجیب عجیب آوازیں نکال رہے ہیں اور اچانک......

کمال کو احساس ہوتا ہے۔ پاؤں کی انگلیوں کے پاس حرکت ہوئی ہے...... وہ جسم میں سہرن سی محسوس کرتا ہے...... پاؤں کی انگلیوں سے ہوکر جانگھوں تک...... سرسراتے ہوئے ہاتھ......

باہر تیزی سے بجتے ہوئے ڈھول مجیرے...... وہ ان خوفناک وادیوں میں تھا جہاں قبائیلی رزمیہ کرتے ہوئے دنیا کے فنا ہونے کی کہانیاں سنا رہے تھے...... چیخ رہے تھے...... شور کر رہے تھے۔

چٹانوں سے گزرتی ہوئی سرد ہوا خاموشی کو توڑ رہی تھی — رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی — اور اب وہ ہر طرح کے احساس سے باہر نکل آیا تھا۔ اور یہ محض خیال نہیں تھا...... دو ہاتھ اُس کے پاؤں کے پاس سرسرا رہے تھے...... اور اچانک اُسے احساس ہوا...... وہ بے لباس ہے — پائجامہ اتر چکا ہے...... اور کوئی انسانی جسم اُس کے ننگے پاؤں کے پاس جھکا ہوا اُسے غور سے دیکھ رہا ہے —

وہ زور سے چلایا...... اور ہربڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے ناہید کو دیکھنے لگا — وہ بے لباس تھا اور ناہید اُس کے پاؤں کے پاس جھکی ہوئی اس کے نازک اعضا کو غور سے دیکھ رہی تھی...... اس وقت اس کے سارے بدن میں خوف کے ساتھ کپکپی بھی داخل تھی...... ناہید کا چہرہ سپاٹ تھا — جذبات سے عاری۔

کمال زور سے چیخا — کیا کر رہی تھی تم......؟'

'دیکھ رہی تھی۔'

دیکھ رہی تھی...... یا — ' کمال کو اچانک صبح میں بولے گئے ناہید کے لفظوں کی یاد آ گئی — 'مردانگی' کہتے ہوئے وہ ٹھہر گئی تھی — تو کیا بغاوت کی ہر منزل سے گزر کر وہ اُس کی مردانگی کو ختم کرنے آئی تھی — وہ غور سے ناہید کو دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا — کہیں اُس کے پاس کوئی چاقو، کوئی ہتھیار تو نہیں۔ اور ان دنوں ناہید جس غصے اور بغاوت کے ساتھ نظر آ رہی تھی، وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔

کمال کا خوف ابھی بھی کم نہیں ہوا تھا۔ وہ پھر زور سے چلایا:

'تم کیا کر رہی تھی — ؟ تم نے میرے کپڑے کیوں اتارے — ؟'

ناہید کا چہرہ سپاٹ تھا — 'میری خواہش ہوئی۔'

'کیوں، سیکس کی آگ جاگ گئی تھی۔ بھوک؟'

ناہید کے چہرے کا رنگ بدلا۔ اب یہ چہرہ ایک خوفناک چہرے میں تبدیل ہو چکا تھا:

'نہیں۔'

پھر کیا کر رہی تھی — ؟' کمال کی آنکھوں میں خوف تھا — 'مجھے یقین ہے تم کچھ برا سوچ کر آئی تھی۔ اور اگر میری آنکھ نہیں کھلتی تو شاید تم کچھ کر گزرتی۔ مگر کیا کر گزرتی — ؟ مائی گاڈ! میں سوچنے سے قاصر ہوں کہ آدھی رات، جب کہ ساری دنیا سو چکی ہے، ایک بے رحم عورت، جو بدقسمتی سے میری بیوی بھی ہے، میری جانگھوں پر جھکی ہوئی ہے۔ اُس نے میرا پائجامہ اتار ڈالا ہے۔ تو یہ سب بے مقصد تو نہیں ہو سکتا......؟'

'میں نے کب کہا کہ بے مقصد تھا؟'

'پھر......' کمال غصہ سے چلایا...... یہ تم نے اپنے ہاتھوں میں کیا چھپا رکھا ہے...... مائی گاڈ...... دکھاؤ مجھے......

'کچھ نہیں ہے۔' ناہید کا لہجہ اس بار بھی سپاٹ تھا۔

'کچھ نہیں ہے تو تم نے ہاتھ پیچھے کی طرف کیوں باندھ رکھے ہیں۔ دکھاؤ مجھے کیا ہے......'

کمال اچھل کر پشت پر آ گیا۔ اور اس نے ناہید کے ہاتھوں میں چھپے ہوئے چاقو کے پھل کو دیکھ لیا۔ اس نے تیز چیخ ماری۔ لباس کا جائزہ لے۔ کچھ دیر پہلے چاقو کا پھل لیے ناہید اُس کے جانگھوں کے درمیان جھکی ہوئی تھی۔ صبح گفتگو کے درمیان وہ مردانگی کے الفاظ پر آ کر ٹھہر گئی تھی اور پھر کمرے سے باہر جاتے ہوئے اس نے کہا تھا: 'دیکھ لوں گی؟' تو کیا آدھی رات، ہاتھ میں چاقو لیے وہ اس کی مردانگی کا خاتمہ کرنے آئی تھی؟ یہ تو اچھا ہوا کہ اُس کی چھٹی حس نے اسے جگا دیا۔

'چاقو دو مجھے......'

'چاقو کہاں ہے؟' ناہید نے دونوں ہاتھوں کو کھول دیا۔

'چاقو تمہارے ہاتھ میں تھا۔'

'تمہارا وہم ہے۔'

'میں کہتا ہوں، تھا۔'

'تم پاگل ہو گئے ہو۔'

'میں کہتا ہوں، تمہارے ہاتھ میں چاقو میں نے خود دیکھا ہے۔'

'یہ تمہاری سوچ کا فتور ہے۔'

'فتور نہیں۔' کمال زور سے چیخا۔ 'تمہارے ہاتھ میں چاقو تھا اور میں نے خود دیکھا ہے۔ بولو تم نے کہاں چھپایا—؟'

'میں نے کہیں نہیں چھپایا—؟'

'تم نے چھپایا ہے—' کمال زور سے چیخا۔ اور اس بار اچھل کر دوبارہ ناہید کے آس پاس تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ شک کی نگاہوں سے ناہید کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ناہید کا چہرہ سپاٹ تھا۔ لیکن ابھی اس چہرے میں اسے عیاری اور مکاری دونوں کی جھلک نظر آرہی تھی۔ جب کمال کو چاقو نہیں ملا تو وہ تھک کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ سانس تیز چل رہا تھا۔ وہ الجھن اور کشمکش بھرے لمحوں سے گزر رہا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے...... میں نے صاف دیکھا تھا۔ چمکتا ہوا چاقو کا پھل۔ یہ وہ چاقو ہرگز نہیں تھا جو کچن میں ہوتا ہے اور جس سے سبزیاں کاٹی جاتی ہیں۔ ذہن میں آندھیاں الجھ رہی تھیں۔ اور اس وقت کمال ایک ایسے کرب سے گزر رہا تھا۔ جسے لفظوں کا لباس نہیں پہنایا جا سکتا۔ ذہن میں انگارے برس رہے تھے۔ اور بس ہر دھما کہ یہی کہہ رہا تھا: یہ عورت تمہاری مردانگی کو ہمیشہ کے لئے سلانے اور ختم کرنے آئی تھی۔ یہ دنیا کی پہلی عورت ہے جو اپنے ہی شوہر کی مردانگی ختم کرنے آئی تھی۔ یہ گونج کچھ ایسی تھی کہ تھر تھر کانپتے ہوئے کمال نے ایک بار پھر ناہید کی طرف دیکھا اور غصے میں چیخا:

'میں تم سے نفرت کرتا ہوں۔ سن رہی ہو تم۔ اب اس رشتے میں کچھ بھی نہیں رہ گیا ہے۔ سنا تم نے...... اور مجھے حیرانی ہے کہ میں تمہارے ساتھ کیوں رہ رہا ہوں۔ کیا مجھے تمہارے ساتھ رہنا چاہئے۔ رہنا چاہیے تو کیوں؟ اس خوف کے ساتھ کہ تم کبھی بھی مجھ پر حملہ کر سکتی ہو۔ کبھی بھی غصہ میں آکر میرے مرد ہونے کے احساس کو کاٹ سکتی ہو...... اور میں ابھی بھی تمہارے ساتھ رہ رہا ہوں۔'

'تو کیوں رہ رہے ہو...... چلے کیوں نہیں جاتے۔' ناہید نے اطمینان سے جواب دیا۔ اتنے اطمینان سے کہ کمال یوسف کے غصے کا پارہ آسمان چھو گیا۔ اس نے ایک گندی سی گالی بکی اور غصہ میں اس سے پہلے کہ ناہید پر تھپڑ اٹھاتا، ناہید نے اس کے ہاتھوں کو تھام لیا۔ اسے احساس ہوا، اس وقت ناہید کے ہاتھ پتھر کی طرح سخت ہیں۔ اور اُس نے شاید چاقو بھی چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ اس کے ہاتھوں میں تھرتھراہٹ تھی۔ ناہید نے ہاتھ چھوڑ دیا۔ کمال

یوسف نے محسوس کیا کہ اس وقت اس کے جسم میں تھرتھراہٹ ہے۔ اور اس کا ہاتھ سرد ہو رہا ہے۔ بلکہ لیج بچ...... اس نے دروازے کے ہلنے کی آواز سنی۔ پھر جیسے سناٹا چھا گیا......

☆☆

'رکو—'

بطور مصنف میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ اور میرے لیے ضروری ہو گیا تھا اور میں کمال کو آگے کی کہانی سنانے سے روک دوں۔ میں نے محسوس کیا، اس وقت بھی کمال کے جسم میں تھرتھراہٹ تھی اور ممکن ہے، وہ دوبارہ اسی منظر کی زد میں ہو اور اس سے باہر نکلنا اس کے لئے آسان نہ ہو۔

'میرے پاس اس وقت دو سوال ہیں۔ اور مجھے کہنا چاہئے کمال! میں تم سے کہیں زیادہ الجھ کر رہ گیا ہوں۔ پہلا سوال تو یہ ہے کہ: جب ناہید تم پر جھکی ہوئی تھی تو کیا تم نے اُس کے ہاتھ میں واقعی چاقو دیکھا تھا؟

'ہاں— مجھے یقین ہے۔ اُس کے ہاتھ میں چاقو تھا بلکہ چاقو کے پھل کی چمک ابھی بھی میری آنکھوں میں خوف پیدا کر رہی ہے۔'

'ممکن ہے یہ تمہارا وہم ہو۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو ہم سوچ لیتے ہیں، وہی ہمیں نظر بھی آتا ہے۔ ممکن ہے اُس موقع پر ناہید سچ بول رہی ہو۔ تو سوال یہ ہے کہ وہ تم پر جھکی ہوئی کیوں تھی؟

'میں نے کہا نا، اس کے ہاتھ میں چاقو تھا— اور اُس دن اچانک ہی اُس نے غصہ میں بولتے ہوئے ایک لفظ ادا کیا تھا۔ مردانگی— اور اس کے بعد وہ خاموش ہو گئی تھی......'

'تو تم محسوس کرتے ہو کہ......' میں نے کمال کی آنکھوں میں جھانکا۔

'محسوس نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔'

'اچھا یہ بتاؤ—' میرے ذہن میں وہ منظر کوند گیا تھا جب کمال، ناہید پر چلاّ رہا تھا اور ناہید کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔ کمال نے ناہید پر ہاتھ اٹھانے کی کوشش کی تھی اور ظاہر ہے ناہید جیسی عورت خاموشی سے باہر نہیں نکل سکتی تھی۔ میں نے کمال کی طرف دیکھا۔ ایک ساتھ بہت ساری الجھنیں میرے چہرے پر جمع ہو گئی تھیں۔

'سنو کمال، سوچ کر جواب دینا۔ جب ناہید پر تم نے ہاتھ اٹھایا اور وہ تمہارے کمرے سے باہر نکلی، کیا اُس وقت اُس نے کچھ کہا تھا یا خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گئی......؟

'چوہا—' کمال کو جیسے اچانک کچھ یاد آ گیا— ہاں یہی کہا تھا اُس نے— میں نے پلٹ کر دیکھا بھی کہ کہیں آس پاس کوئی چوہا تو نہیں۔ کیونکہ ان دنوں گھر میں عام طور پر چوہے گھومتے رہتے تھے اور ناہید چوہوں کی یورش سے پریشان رہتی تھی۔'

'چوہا......' میری ذہنی رَو گھوم رہی تھی...... اس موقع پر ناہید کا چوہا کہنا اور کمرے سے باہر نکل جانا...... میں نے اس پورے منظر کو اپنی آنکھوں میں بسا لیا تھا۔ رات کی تاریکی میں ناہید کا کمال کے پاس ہونا......

اُس کے پاجامے کو اتارنا...... کمال کا اُس کے ہاتھوں میں چاقو دیکھنا۔ دونوں میں جنگ ہونا اور ناہید کا چوہا کہہ کر کمرے سے باہر نکل جانا...... وہ بھی خاموشی سے — اُف خدا...... مجھے چکر آرہا تھا۔ انسانی اخلاقیات کی کتاب میں شاید اظہار کے اس نئے اور انوکھے طریقے پر ابھی بندش ہے اور سنگسار ہونے کا خطرہ — مگر اس مہذب ترین دنیا اور اب تک کی دنیا کے مرد اور ان کی مردانگی پر ناہید ایک خوفناک تبصرہ کر کے گزر گئی تھی...... 'چوہا...... 'صدیوں کی یہ مردانگی کندن کی طرح تپے ہوئے احساس کے پیکر کا حصہ نہیں تھی، یہ مردانگی کوئی سایہ دار درخت، کوئی سائبان، سہارا دینے کا عمل یا برگد کی چھاؤں سے عبارت نہیں تھی...... یہ مردانگی ایک چوہے میں تبدیل تھی...... اور مرد ذات کی اب تک کی حماقتوں یا مردانگی پر یہ ایک ایسا یک لفظی بھرپور تبصرہ تھا، کہ اس وقت مرد اس اس معاشرے میں چوٹ کرنے والا اس سے بھیانک تبصرہ شاید کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا تھا۔

'مائی گاڈ— ہم اکیسویں صدی میں ہیں اور مرد ایک چوہا بن رہا ہے۔ اس کاسموپولیٹن کلچر، چیٹ لائن، انٹرنیٹ مکالمہ، اور کنزیومر تہذیب میں وہ جس تیزی سے کپڑے اتار رہا ہے، اُس تیزی سے تو عورتیں بھی نہیں اتار رہی ہیں۔ اس کی سیکسول اور مردانگی کی امیج کہیں دور ہوگئی ہے۔ اور ایک زیادہ بڑے سماج سے وابستہ مردوں کے بارے میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ان میں ایک بڑی اکثریت نے خود کو چوہے کی حد تک قبول کر لیا ہے......

'مطلب؟' کمال بونقوں کی طرح میرا چہرہ پڑھ رہا تھا۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ یہ چوہا حملہ بھی کرتا ہے...... دلی کے گینگ ریپ یا اس طرح کی کوئی بھی مثال، ممکن ہے مردانگی کی سطح پر خود کو آزمانے کا چیلنج ہو لیکن کتنا بیہودہ اور کتنا خوفناک...... اس کوسمو کلچر میں مرد اپنے مرد ہونے کی صفات کے وسیع تر دائرے کو چھوڑ کر صرف ایک معمولی چوہے کی حد تک سمٹ آیا ہے۔ غیر معمولی طاقت، غیر معمولی فکر، سیاست، حکمرانی، نگہبانی اور اس طرح کی تمام صفات اُس سے چھین لی گئی ہیں۔ وہ اس وسیع کائنات کا ایک معمولی پرزہ ہے بلکہ ایک معمولی چوہا......

میں نے کمال کی طرف دیکھا: وہ اب بھی ناسمجھوں کے انداز میں میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اور محض ناہید کے بولے گئے ایک لفظ میں مجھے صدیوں کے ظلم وستم کے اشارے مل رہے تھے۔ صدیوں کی داستان، غلامی، Chastity Belt سے ہو کر گزرنے والے خوفناک قصے: یہاں مرد حاکم تھا۔ عورت صرف ایک ربر کی گڑیا۔ صدیوں کے جبر وظلم کے بعد ذرا سا آزاد ہونے کی کوشش میں اگر عورت نے مرد کا جائزہ لیا تو اسے کہاں دیکھا تھا؟ کافکا کے کردار گریگور سمسا کی آنکھیں ایک صبح کھلتی ہیں تو وہ خود کو ایک عظیم کیڑے میں تبدیل ہوا دیکھتا ہے۔ لیکن اس مہذب صدی میں دو عظیم جنگوں سے نکلنے کے بعد جدید ٹیکنالوجی اور کمرشیلزم کے اس دور میں مرد کی حقیقت کیا رہ گئی تھی؟ اور حقیقت یہ تھی کہ ناہید اس 'محض چوہا' کے احساس کے ساتھ زندگی گزارنے کو تیار نہیں تھی......

'تو کیا اس دن وہ چلی گئی؟'

'آہ— نہیں۔'

'ہونہہ — 'میرے اندر کشمکش ابھی بھی جاری تھی۔
'تو کیا اس نے اس ذلیل چوہے کو سبق سکھانے کا فیصلہ کیا تھا؟'
'ذلیل چوہا — ؟' اس بار خوف سے کمال نے میری طرف دیکھا۔
'آہ...... 'مجھے ہنسی بھی آ رہی تھی۔ اور دنیا کے تمام مردوں کے لیے ترحم کا جذبہ بھی پیدا ہو رہا تھا...... آہ...... تمہیں کیسے سمجھاؤں میرے دوست۔ تم اُس کے لئے کچھ بھی نہیں رہ گئے تھے۔ شونیہ۔ صفر...... یا پھر مجھے معاف کرنا۔ ایک معمولی چوہا...... اس سے زیادہ تم نہیں تھے۔ تم کوئی سایہ دار برگد نہیں تھے۔ تم اُسے تحفظ نہیں دے سکتے تھے۔ اس نے تمہاری تمام بڑی بڑی حقیقتوں کو جھٹلا دیا تھا اور اسی لئے اسے جانا تھا اور اُس نے جانے کا فیصلہ کر لیا۔'
پھر اس نے خودکشی کیوں کی؟'
'تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ اس نے خودکشی کی ہوگی؟'
کمال سوچ میں گم تھا: 'پولیس بھی تفتیش کر کے ہار گئی۔ وہ اپنی حویلی میں بھی نہیں ملی۔ پھر اور کیا ہو سکتا ہے؟'
'یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ مگر میں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ ناہید اس طرح کی کوئی حرکت نہیں کر سکتی تھی — ممکن ہے، جیسا تم نے بتایا، وہ رات کے وقت گھر سے نکلی تھی۔ ممکن ہے اندھیرے میں اگر وہ کسی گہری کھائی میں گر گئی ہو تو الگ بات ہے مگر دانستہ طور پر وہ یہ قدم نہیں اٹھا سکتی تھی...... '
کمال سوچ میں ڈوب گیا...... وہ چھت کی طرف دیکھ رہا تھا۔
'اچھا اس حادثہ کے بعد کیا ہوا؟ یعنی جب تمہیں وہ چوہا کہہ کر کمرے سے باہر نکلی، کیا وہ معمول پر آ چکی تھی؟'
'شاید ہاں...... شاید نہیں۔ میں ٹھیک سے نہیں بتا سکتا۔ کمال نے کچھ سوچتے ہوئے کہا: ...... دراصل اس حادثے کے بعد میں اتنا ڈر گیا تھا کہ میں اُس سے خود ہی جان چھڑانا چاہتا تھا۔ کیونکہ مجھے اس سے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ لیکن میں جانتا تھا، وہ اس طور پر نہیں جائے گی۔ ممکن ہے میرے اشتعال دلانے سے وہ چلی جائے۔ دوسرے دن صبح میں اُس کی تلاش میں گیا تو وہ باہر برآمدے میں کرسی پر جھکی ہوئی تھی اور اُس کے ہاتھ میں روٹی کا ایک ٹکڑا تھا۔ وہ پورے انہماک سے اپنے کام میں مصروف تھی۔ میں غور سے دیکھ رہا تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے...... وہ روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر رہی تھی۔ اور اس کے بعد جو میں نے دیکھا، میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔'
'کیوں؟'
'اس کے پاس ایک چوہے دانی پڑی تھی...... چوہے دانی کے اندر وہ روٹی کا ٹکڑا ڈال رہی تھی......
پہلے میں نے نرم لہجہ اختیار کیا — 'کیا کر رہی ہو؟'
'دیکھتے نہیں۔ کیا کر رہی ہوں۔'
'ہاں دیکھ رہا ہوں۔ تبھی پوچھ رہا ہوں۔'
'جب دیکھ رہے ہو تو پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔'

'لیکن اتنی صبح یہ چوہے دانی کہاں سے ملی ـــــ؟'

'مل گئی کہیں سے۔ دیکھتے نہیں۔ گھر میں چوہے کافی آ گئے ہیں۔'

میں نے اقرار میں سرہلایا۔'آتو گئے ہیں۔ لیکن تم نے اس سے قبل کبھی چوہے دانی لانے کے بارے میں نہیں سوچا؟'

ناہیدا اپنے کام میں مصروف تھی۔ اس نے اُسی لہجے میں جواب دیا ـــــ 'جو کام پہلے نہیں ہوا۔ وہ بعد میں بھی تو ہوسکتا ہے۔' وہ مسکرائی تھی۔'اب دیکھنا۔ چوہا مرے گا......'

اس کا لہجہ اور انداز ایسا تھا کہ میں ڈر گیا......

کمال یوسف خاموش ہوا تو میں نے پوچھا:'اس میں ڈرنے والی بات کون سی تھی ـــــ؟'

'اس کا لہجہ: مجھے اس لہجے سے خوف کی بو آرہی تھی۔ اور میں کمرے میں واپس آ کر سوچ رہا تھا کہ اگر مجھے ناہید کو خود سے دور کرنا ہے تو اسے اشتعال دلانا ہوگا۔ دوسری صورت میں، میں نے ان تمام پہلوؤں پر غور کرلیا تھا کہ میں اُس کے ساتھ رہ سکتا ہوں یا نہیں۔ اگر پچھلی رات والا حادثہ نہ ہوا ہوتا تو شاید میں اس احمقانہ خیال کے بارے میں سوچتا بھی نہیں کہ اس سے پیچھا کیسے چھڑایا جائے۔ لیکن پچھلی رات جس طرح وہ مجھ پر جھکی ہوئی تھی، میں کہہ سکتا ہوں، میں اس قدر ڈر گیا تھا کہ اب اس کے ساتھ رہنا کم وبیش میرے لیے آسان نہیں رہ گیا تھا۔'

'پھر کیا ہوا......؟'

'وہی اشتعال دلانے والی بات......' کمال نے میری طرف دیکھا ـــــ 'بہتر ہے میں وہ پورا منظر آپ کو دکھا دوں:......'

(6)

دھوپ سر پر آ گئی تھی مگر کمال کی آنکھوں کے سامنے جو کھیل چل رہا تھا، اُس نے خوشگوار صبح کے تاثر کو زائل کر دیا تھا۔ ناہید ابھی بھی چوہے دانی میں الجھی ہوئی تھی: روٹی کے چھوٹے ٹکڑے چوہے دانی کے اندر تار میں احتیاط سے لٹکائے جارہے تھے...... درختوں کے سبز پتوں کے درمیان سے چھن چھن کر آنے والی سورج کی کرنوں کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے ہر کرن سے چمکتے ہوئے سفید سفید چوہے زمین پر گرتے جارہے ہوں...... اس وقت وہ چوہوں کی زد میں تھا۔ ہر طرف سے جیسے چوہوں نے اس پر حملے کردیے ہوں۔ کمال کو اُس جادوگر کی یاد آرہی تھی جو بانسری بجاتا ہوا پہلے گاؤں سے چوہوں کی فوج کو لے کر پہاڑوں کی ترائی میں اُتر گیا۔ پھر اس کے پیچھے پیچھے گاؤں کے تمام بچے پہاڑی کی ترائی میں اتر کر غائب ہوگئے۔ یہ چوہے کچھ بھی کر سکتے ہیں...... کمال کے سامنے البیر کامو کے ناول دی پلیگ کا کردار ڈاکٹر ریو بھی تھا، جس نے اپنے گھر کی سیڑھیوں پر ایک چوہے کو مردہ دیکھا تھا اور اس کے بعد ہی سارے شہر میں ہیضہ پھیل گیا تھا۔ ڈاکٹر ریو غائب تھا اور جادوگر بھی پہاڑ کی ترائی میں اتر چکا تھا...... دھوپ کی اجلی کرنوں کے درمیان انہماک سے اپنے کام میں مصروف ناہید تھی۔ اور ایک کمال: جس نے کبھی ناہید کو اس طرح بیکار کے کاموں میں الجھا ہوا کبھی نہیں پایا تھا۔ رات کی آندھی ابھی مکمل طور پر رخصت نہیں ہوئی تھی...... اور اس

وقت اس آندھی نے کمال کو دوبارہ اپنے نرغے میں لینا شروع کر دیا تھا......اس کے باوجود وہ اس لمحے کو ایک سکون آمیز لمحے میں تبدیل کرنے کا خواہشمند تھا......اُس نے مسکرانے کی کوشش کی — ناہید کی طرف دیکھا......

'تو چوہا مارنے کا خیال ہے......؟'

'ہاں......'

''سفید یا سرخ......؟'

'چوہے — چوہے ہوتے ہیں —' ناہید کا چہرہ سپاٹ تھا......'چوہے بزدل ہوتے ہیں — کوئی سفید بزدل چوہا بھی آسکتا ہے اور کوئی سرخا بھی —'

کمال نے پھر مسکرانے کی کوشش کی — 'کہتے ہیں انسان کی طرح چوہے بھی صدیوں سے ہیں — انسان کے سب سے پرانے دوست......'

ناہید نے نظر اٹھائی — اُس کے چہرے پر سختی تھی — اس بار وہ خاموش رہی —'

کمال کو مزہ مل رہا تھا — اس نے دوبارہ کہا — ایک چوہا ہمارے لیپ ٹاپ اور کمپیوٹر میں بھی ہے...... ماؤس......' وہ زور سے ہنسا — چوہے شکل بدل کر زندہ رہتے ہیں اور کہیں بھی آجاتے ہیں — ہمارے نیٹ سسٹم کو وہی چلاتے ہیں......'

ناہید کی آنکھوں میں انگارہ چھپا تھا — اب ماؤس کی ضرورت نہیں ہے —' وہ زور سے ہنسی تھی — اسی لیے اس چوہے دان میں......تم سمجھ رہے ہو نا......' اُس کا لہجہ اُکھڑا ہوا تھا —

'لیکن تم ایسا کر نہیں پاؤ گی — اور مجھے اس کا افسوس رہے گا ناہید —' کمال غور سے ناہید کے چہرے کو پڑھتا ہوا بولا — چوہے ہر جگہ ہیں......اب تو دھماکہ خیز مواد اور منشیات کو سونگھنے کے لیے بھی چوہوں کو کتوں کے طرز پر تربیت دی جا رہی ہے — کتوں کی طرح چوہے بھی کھوجی بن گئے ہیں — کہا جاتا ہے کہ کتوں کے مقابلے چوہوں میں سونگھنے کی حس، کہیں زیادہ ہوتی ہے — کتوں کو زیادہ تربیت کی ضرورت ہوتی ہے جبکہ چوہے، بہت کم وقت میں اچھے کھوجی چوہے ثابت ہوتے ہیں —' کمال مسکرایا......'جب تک تم اسے پکڑنے کی کوشش کرو گی۔ وہ کسی چوہیا کی تلاش میں نکل چکا ہوگا۔'

ناہید نے جیسے سنا نہیں — وہ اپنے کام میں الجھی ہوئی تھی — کمال کو یاد آیا، یہ وحشت ناہید پر رات سے سوار ہوئی تھی جب اُس کے کمرے سے جاتے ہوئے ناہید نے آہستہ سے اس لفظ کی ادائیگی کی تھی......

'چوہا' — لیکن تب کمال یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ صبح ہوتے ہی، رات کی 'جبلت' سے پہرہ ہٹتے ہی، وہ اس چوہے کے تعاقب میں اتنی دور نکل جائے گی کہ صبح ہی صبح ان چوہوں کو پکڑنے یا مارنے کے لئے ایک چوہے دانی لے کر آجائے گی — کمال ابھی تک ناہید کے اس مزاج کو سمجھ نہیں پایا تھا — وہ اب بھی اُس کی طرف دیکھ رہا تھا — وہ ایک بار پھر آہستہ سے بولا —

'چوہا بہت جلد انسان سے مانوس ہو جاتا ہے......'

ناہید چپ رہی—

'جنگلی چوہے گھر بنانے کے فن میں ماہر ہوتے ہیں—'

ناہید اس بار بھی چپ رہی—ناہید کی خاموشی کمال کو اُکسانے پر مجبور کر رہی تھی—اُس نے آہستہ سے کہا—ایک شخص چوہوں سے پریشان تھا—اُس نے ایک چوہے دانی لگائی......'

ناہید نے نگاہیں اوپر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا—

کمال نے اپنی بات جاری رکھی...... 'لیکن وہ شخص کنجوس تھی—روٹی کے ٹکڑے کی جگہ اُس نے اخبار سے تراشی ہوئی روٹی کے ٹکڑے کی تصویر چوہے دانی میں رکھ دی......'

ناہید کا چہرہ آہستہ آہستہ تبدیل ہو رہا تھا—

'دوسرے دن جب وہ شخص چوہے دانی کے پاس گیا تو معلوم ہے اُس کو کیا ملا—روٹی کی تصویر کے پاس ہی اخبار سے کتری ہوئی چوہے کی ایک تصویر رکھی ہوئی تھی......'

اس سے پہلے کہ کمال قہقہہ لگا پاتا، اُس نے دیکھا، ناہید اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس کی آنکھیں جل رہی تھیں اور گلے سے غرّاتی ہوئی آواز نکل رہی تھی۔ کمال کے لیے یہ چونکنے والا لمحہ تھا، کیونکہ اس سے قبل کبھی اس نے ناہید کا یہ روپ نہیں دیکھا تھا۔ ناہید کی آنکھیں خوفناک لگ رہی تھیں، وہ چیخ رہی تھی—

'تم پاگل ہو گئے ہو...... تم جانتے بھی نہیں کہ چوہا کیا ہوتا ہے...... گوشت کی ایک جھلّی...... ایک منحوس ٹکڑا—میں چاہتی تو چوہے مارنے والی دوائی بھی لا سکتی تھی—آج کل تو چوہے مارنے کے پاؤڈر بھی ملتے ہیں—بسکٹ بھی— مگر نہیں—میں اُسے پکڑنا چاہتی ہوں—روندنا چاہتی ہوں—مسلنا چاہتی ہوں......ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہتی ہوں...... سمجھ رہے ہو تم......

'ناہید......' کمال زور سے چیخا—اس وقت یہ چہرہ اُس کے لیے اجنبی تھا—وہ زور سے چیخا—'تم جانتی بھی ہو تم کیا کہہ رہی ہو—میں مذاق کر رہا تھا—اور تم......'

'تم مذاق نہیں کر رہے تھے......' ناہید پھر زور سے چلّائی...... کمال کو ذہن ڈوبتا ہوا محسوس ہوا—اس کا لہجہ سرد تھا—میں تو یوں ہی چوہے کے بارے میں......'

'جانتے بھی ہو چوہا کیا ہے؟' ناہید کی آواز میں سانپ کی پھنکار شامل تھی...... 'چوہا ایک بھوک ہے۔ روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو کترنے کے بعد بھی اُس کی بھوک شانت نہیں ہوتی۔ اُس کی بھوک بڑھ جاتی ہے...... اور وہ ہر بار اپنی بھوک مٹانے کے لئے آ جاتا ہے...... پہلے سے کہیں زیادہ طاقتور بن کر...... لیکن میں چھوڑوں گی نہیں، ماردوں گی، وہ جہاں کہیں بھی ہوگا۔ چھت پر، برآمدے میں...... بلوں میں، کونے کتروں میں۔ میں اسے تلاش کروں گی اور ماردوں گی......' ناہید کے چہرے پر ایک سفاک مسکراہٹ تھی۔ اور ادھر کمال کو اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ اچانک اُس کی

مسکراہٹ چھین لی گئی ہے جیسے اُس نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہو...... کوئی آسیب...... بھوت...... ڈراکیولا...... اچانک اُس کے سامنے آگیا ہو...... درختوں کی اوٹ سے آتی ہوئی سورج کی کرنوں کی جگہ چھن چھن کر چوہے زمین پر گر رہے تھے...... وہ حیران نظروں سے چوہوں کو دیکھ رہا تھا...... ایک...... دو...... تین...... ہزار...... چاروں طرف چوہے تھے......

کیا یہ ناہید کی گفتگو کا ردِعمل تھا؟ اُس کو چکر آرہے تھے۔ رات کا واقعہ یاد آرہا تھا اور ناہید کے ابھی کے الفاظ کانوں میں گونج رہے تھے...... میں ماردوں گی...... میں اُسے تلاش کروں گی اور ماردوں گی......'

کمال نے نفرت سے ناہید کی طرف دیکھا: 'اور اسی لئے کل آدھی رات تم مجھے مارنے کے لئے آئی تھی......؟'

'نہیں ــــ؟

'جھوٹ ــــ تم مجھے مارنے آئی تھی...... تمہارے لئے مارنا کھیل ہے ــــ اور مجھے لگتا ہے، تمہارے پاس سے زندگی، زندگی کو قائم رکھنے والا جذبہ، محبت سب کچھ غائب ہو چکا ہے......'

'اسے تم نے غائب کیا ہے ــــ'

'میں نے......'

'دھکا لگا ــــ؟' ناہید کے ہونٹوں پر پھر وہی سفاک مسکراہٹ تھی ــــ 'تمہاری بھوک کچھ بھی زندہ رہنے کہاں دیتی ہے ــــ تمہاری بھوک سب کچھ مردہ کر دیتی ہے ــــ'

یہ بھوک کہاں سے آئی ــــ'

ناہید نے قہقہہ لگایا ــــ چوہے دانی کو ہلا کر بولی ــــ 'روٹی کے ٹکڑے رکھے ہیں ــــ بھوک جمع کر رہی ہوں ــــ وہ آئے گا اور یہ لکڑی کا پٹرہ گر جائے گا ــــ اور ادھر دیکھو...... یہاں جالی بنی ہے...... میں اُسے دیکھ سکوں گی...... قید میں تڑپتے ہوئے...... اور پھر میں اُسے ماردوں گی ــــ'

ناہید اُسے دیکھ کر مسکرائی تھی۔ لیکن اس وقت اس پراسرار مسکراہٹ کو سمجھنا کمال کے لئے مشکل تھا۔ وہ کچھ دیر دم بخود اپنی جگہ کھڑا رہا۔ گھنے سائے تھے جو تیز دھوپ کے باوجود اُس کی آنکھوں کے آگے لہرا رہے تھے...... اور شاید وہ تا دیر اسی کیفیت میں رہتا...... اگر وہ میٹھی سریلی آواز اُس کے کانوں میں نہ گئی ہوتی:

''منگری ــــ میں جانتی ہوں تم یہیں ہو......'

''منگری...... کہاں ہو تم......'

اچانک دوڑتے ہوئے پاؤں ٹھہر گئے تھے۔ کمال نے پلٹ کر دیکھا: یہ وحیدہ تھی...... گھنے سائے اچانک دور ہو گئے ــــ کمال کے چہرے پر مسکراہٹ تھی

'آپ......'

'وہ...... آپ نے منگری کو دیکھا......'

'منگری......'

'میری دوست ہے — ہر سال اسی موسم میں سائبیریا سے آتی ہے.....' وحیدہ کے ہونٹوں پر شکایت تھی — ابھی اڑتی ہوئی اس طرف آئی تھی — اچھا چلتی ہوں'...... منگری...... منگری......'

وحیدہ آواز دیتی ہوئی آگے بڑھ گئی تھی۔ کمال کی خواہش ہوئی کہ یہ دریافت کرے، وہ ان پرندوں کی ہی تلاش کیوں کرتی ہے؟ جو دور رہتے ہیں اور مسافر پرندے ہوتے ہیں — مگر اس وقت کمال کی باتیں سننے کے لئے وحیدہ موجود نہیں تھی —

دو بجے چوہوں نے پھر شور مچایا —

اس درمیان کمال کی کوشش تھی کہ ڈراونے خواب جیسے واقعات سے الگ اپنی سوچ وحیدہ پر مرکوز کرے اور اس کا فائدہ بھی ہوا تھا۔ پچھلے کئی مہینوں سے چلنے والے خوفناک واقعات کی جگہ ہرنی کی طرح سہمی ہوئی وحیدہ آ گئی تھی۔ اور یہ ایک حقیقت تھی کہ اب وحیدہ اُسے اچھی لگنے لگی تھی۔ لیکن کیا ناہید کو اس کی خبر تھی؟ کیا ناہید نے اسی لیے اب وحیدہ سے دور رہنا شروع کر دیا تھا؟ جب کہ ایک وقت تھا، وہ وحیدہ کا نام لیتے ہوئے تھکتی نہیں تھی —

'کیا ناہید میں ایک دوسری عورت آ گئی ہے؟ اور یہ عورت وحیدہ کی وجہ سے ہے؟'

کمال یہ ماننے کو قطعی تیار نہ تھا، ایک وجہ تو یہ تھی کہ اگر ایسا کچھ تھا تو بیحد خاموشی سے تھا۔ اگر وحیدہ بھی اُسے پسند کرتی تھی تو اس نے کبھی اظہار نہیں کیا تھا۔ اور کمال نے کبھی بھی ناہید کے سامنے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ وحیدہ کے لئے کمزور ہو رہا ہے۔ اس کے باوجود، اگر ناہید کے اندر یہ باغی اور خطرناک عورت آ گئی ہے تو اس کی وجہ کیا ہے؟

اور حقیقت میں، کمال کوئی بھی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ گھر کی فضا کچھ ایسی تھی کہ بار بار اسے خوف کا احساس ہو رہا تھا۔ پہلے اُسے اس بات کا یقین تھا کہ ناہید کسی نفسیاتی بیماری کی شکار نہیں ہے۔ مگر اب جو واقعات پیش آ رہے تھے، اُس سے کہنا مشکل تھا کہ ناہید بیمار نہیں ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہے کہ ناہید نے خود کو بیمار کر لیا ہے۔ ممکن ہے یہ واقعات اُس کے ساتھ پیش نہ آئے ہوتے، تو اس کے لئے یہ یقین کرنا مشکل ہوتا کہ کوئی عورت ایسی بھی ہو سکتی ہے —

دو بجے کا وقت ہوگا۔ اچانک کمال ناہید کی چیخ سن کر چونک گیا...... آواز کچن سے آئی تھی۔ ادھر لگاتار ہی نئی نئی باتیں ہو رہی تھیں مگر اب محتاط رہنا ضروری ہو گیا تھا۔ وہ بھاگ کر کچن میں آیا تو اچانک چونک پڑا۔

کچن جنگ کا میدان بنا ہوا تھا۔ برتن اور سامان ادھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ کچن کے فرش پر خالی بوتلوں کے ڈھیر لگے تھے۔ ان میں تیل، گھی، بورن ویٹا ہارلکس کے خالی ڈبے بھی تھے۔ یہ وہ ڈبے تھے جن کے خالی ہو جانے کے بعد وہ کچن کے نیچے کی طرف کھلنے والی الماری میں ڈالتی چلی جاتی تھی...... ناہید کا چہرہ سیاہ پڑ گیا تھا۔ آنکھیں خوف سے پھیلی ہوئی تھیں —

'کیا ہوا......؟'

'چوہا......' ناہید زور سے چلاّ کر۔ 'میں یہ خالی ڈبے نکال رہی تھی...... اُس نے اشارہ کیا...... دو موٹے چوہے...... اچانک کود کر باہر آئے اور مجھ پر حملہ کر دیا...... پھر کئی کئی چوہے......' وہ خوفزدہ نظروں سے کمال کو دیکھ رہی تھی۔ 'یہ چوہے خوفناک ہو گئے ہیں۔ ہر جگہ ہیں، سمجھ رہے ہو تم......' وہ دوبارہ چیخی: ناقابلِ برداشت...... اُس نے ٹھہر کر اس لفظ کو دہرایا۔ اب

بھی وہ خوف اور غصے سے اُس کی طرف دیکھ رہی تھی —

'اس میں چیخنے کی بات کیا ہے — چوہے ہر گھر میں ہیں —'

'ہر گھر میں ہیں — کیا یہ خوفناک بات نہیں — ؟' اُس نے غصہ سے اشارہ کیا — 'وہ دیکھو...... یہ تم نے کیا ہے......'

'کیا...... ؟'

کمال نے پلٹ کر دیکھا اور اس لمحہ اُسے اپنی ہنسی کو روکنا مشکل ہو گیا: صبح جس چوہے دان کے ساتھ وہ روٹیاں ڈالنے اور چوہے کو پکڑنے کی تدبیر کر رہی تھی، وہ چوہے دان ٹوٹا پڑا تھا۔ لکڑی کے پٹرے الگ تھے۔ روٹی کے ٹکڑے بھی باہر بکھرے ہوئے تھے......

'چوہے، چوہے دان بھی...... چبا گئے؟'

'نہیں — یہ تم نے کیا ہے —'

'تم پاگل ہو گئی ہو —'

'یہ تم نے کیا ہے۔ جھوٹ مت بولو۔ میں صبح ہی تمہارا منشا جان گئی تھی...... ناقابل برداشت۔ ناہید نے دوبارہ یہ لفظ دہرایا...... چوہوں کے ساتھ رہنا مشکل ہے...... تم سمجھ رہے ہو نا...... مشکل ہے رہنا' کچن سے باہر نکلتے ہوئے ناہید ایک لمحہ کے لئے رُکی — پلٹ کر کمال کی طرف دیکھا:

'میں اس گھر کو چوہوں سے پاک کر دوں گی — سمجھ رہے ہو تم......'

☆☆

کمال اپنی دنیا میں واپس آ چکا تھا۔ میں بغور اُس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ خوف کا عکس اُس کے چہرے پر اب بھی موجود تھا، جیسے ابھی بھی وہ خوفناک چوہوں کے درمیان ہو۔ چوہے جو کچھ بھی کتر سکتے ہیں۔ چوہے۔ جو چوہے دانی کترنا بھی جان گئے ہیں...... چوہے جو کھوجی، جاسوس اور خوفناک بیماریوں کی وجہ بھی ہیں۔ لیکن یہ چوہے ناہید کی نظر میں کیا تھے؟ میں نے کمال کو دیکھا: وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر واش بیسن تک گیا، چہرے پر پانی کے دو چار چھینٹے مارے، پھر واپس آ گیا جیسے وہ ان خوفناک واقعات کو دہراتے ہوئے ایک بار پھر سے ان حادثوں کا حصہ بن گیا تھا۔ اس درمیان صوفیہ دو بار آئی اور گئی۔ وہ خاموش تھی۔ میں نے اُس کی آنکھوں کو غور سے پڑھنا چاہا تو وہ مجھے اتنی ویران نظر آئیں کہ مجھے اس معصوم سی لڑکی سے ہمدردی پیدا ہو گئی۔ وہ ہر کچھ دیر بعد کمال کو اس طرح دیکھنے یا کھوجنے چلی آتی جیسے اُس کا قیمتی کھلونا کہیں گم نہ ہو جائے۔ میں نے دوبارہ کمال کی طرف دیکھا۔ میرا ذہن بھی الجھ چکا تھا۔ پچھلی رات سے لے کر دن کے دو بجے تک کا جو واقعہ کمال نے سنایا تھا، میں اُسے سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا —

'چلو، کہیں باہر چلتے ہیں — ممکن ہو تو صوفیہ کو بھی لے لو......'

اس وقت ذہن اتنا پریشان تھا کہ نینی تال کے حسین مناظر ہی مجھے ان حادثوں اور الجھنوں سے باہر نکال

سکتے تھے۔ کہنے بھر کی دیر تھی کہ صوفیہ تیار ہوگئی۔ کمال نے گاڑی نکال لی۔ گاڑی ہائی وے کی طرف بڑھ رہی تھی کہ میں نے رُکنے کے لئے کہا۔ یہاں دونوں طرف تنگ راستے تھے۔ تھوڑا اوپر جانے کے بعد ہزاروں فٹ نیچے کی خوفناک گہرائی تھی۔ اگر یہ قبول کیا جائے کہ ناہید کو مرنا ہی تھا تو اس کو بہت دور جانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے ڈاکٹر سانیال یاد آرہے تھے جو کہا کرتے تھے کہ: خودکشی کرنے کے لئے ارادہ کرنے سے زیادہ ضروری ہے، زندگی سے ہار مان لینا یا آخری امید بھی اٹھا لینا۔ جب ایسا انسان یہ سمجھ لیتا ہے کہ آگے کوئی راستہ نہیں ہے اور موت ہی الجھنوں سے چھٹکارے کا واحد علاج ہے تو ایسا سوچتے ہی دماغ کی متحرک نسیں کام کرنا بند کر دیتی ہیں۔ پھر وہ ایک لمحہ...... ایک بھیانک لمحہ...... اس لمحے کے لئے خودکشی کرنے والے کو بہت زیادہ سوچنا نہیں پڑتا لیکن سچ تو یہ ہے کہ اس پوری کہانی میں مجھے کہیں ایسا نہیں لگ رہا تھا کہ ناہید زندگی سے ہار گئی ہو۔ وہ عشق سے ہار سکتی تھی، مگر نہیں.... وہ عشق سے بھی کہاں ہاری تھی۔ ہارتی تو انتقام نہیں لیتی۔ اور اُس کے اندر جو غصہ یا آگ بھری تھی، وہ کسی کمزور، خودکشی کرنے والی لڑکی کی دلیل کو غلط ثابت کر رہی تھی۔ لیکن سوال تھا، ناہید کہاں گئی؟ لیکن ابھی اس کہانی کے کچھ اور پڑاؤ باقی تھے۔ اور مجھے ان کے بارے میں جاننے کا تجسس برقرار تھا۔

لورز پوائنٹ، آئس ہل کی سیر، کشتی بانی، اور نڈلس، آئس کریم کھانے کے بعد ہم دوبارہ گھر کی طرف چل پڑے۔ اس اثنا میں، میں برابر صوفیہ کے چہرے کے تاثرات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کم بول رہی تھی لیکن اُس کی نظریں کمال کے چہرے سے ہٹتی نہیں تھیں اور کمال کی طرف دیکھتے ہوئے محبت سے زیادہ میں نے اُس کے چہرے پر خوف کے آثار پائے تھے۔

☆☆

رات ڈنر کرنے کے بعد ہم ٹیرس پر آگئے۔ یہاں سے اندھیرے میں پہاڑیوں پر بنے ہوئے مکانات اور دور سے جلتی بجھتی روشنیوں کے درمیان شہر کو دیکھنا میرے لیے کسی فنتاسی سے کم نہیں تھا۔ ہوا تیز تھی۔ صوفیہ چائے بنانے کے لئے گئی تھی اور یہ موقع میرے لئے مناسب تھا کہ میں کمال سے آگے کی کہانی جان سکوں...... میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا:

'تو ناہید نے جاتے ہوئے کہا: وہ گھر کو چوہوں سے پاک کر دے گی۔'

'ہاں......'

'اور اس وقت ظاہر ہے وہ غصہ میں رہی ہوگی۔'

'ہاں۔'

'پھر تم نے کیا کیا......'

'مجھ سے ایک غلطی ہوگئی۔' کمال آہستہ سے بولا: 'مجھے باشا کی یاد آرہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ ممکن ہے رات جو کچھ ہوا، وہ محض ایک پاگل پن ہو۔ ممکن ہے وہ مجھے مارنے نہیں آئی ہو اور کوئی بھی عورت اپنے شوہر کا قتل کیوں کرنا چاہے گی......؟ میں ناہید کے غصے کو کم کرنا چاہتا تھا اور اس کے لئے ضروری تھا کہ میں خود کے جذبات پر بھی قابو پانے کی کوشش کروں لیکن

اس درمیان کئی روز سے مجھے ایک چیز پریشان کر رہی تھی اور آپ دیکھ رہے ہیں، میری کوئی زیادہ عمر نہیں ہے یعنی اس عمر میں...... اگر ایک شوہر کوئی کئی راتیں یوں ہی گزارنے کی نوبت آئے تو...... میرے خیال میں آپ سمجھ گئے ہوں گے — '

'ہونہہ — ' میں نے آہستہ سے کہا —

'میں اندر کی سلگتی ہوئی آگ کو لے کر پریشان تھا — اس لیے جب ناہید غصہ میں یہ بولی کہ میں چوہوں سے اس گھر کو پاک کردوں گی تو اچانک میرے منہ سے نکلا...... '

کمال کھڑکی کے باہر دیکھ رہا تھا —

'کیا نکلا — ؟'

میں نے کہا...... لیکن اس سے پہلے میں تمہیں ناپاک کرنا چاہتا ہوں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں، ایسے مذاق شوہر بیوی کے درمیان ہوتے رہتے ہیں، یہ کوئی ایسی ویسی بات بھی نہ تھی مگر باہر جاتے جاتے میرے اس مذاق پر ناہید کے جسم میں آگ لگ چکی تھی: وہ اتنی زور سے چیخی کہ اگر یہ گھر کمزور ہوتا تو شاید اُس کی چیخ کی تاب نہ لا کر گر پڑا ہوتا...... وہ ہسٹریائی انداز میں چیخ رہی تھی...... کیا کہا تم نے...... ناپاک کرنا چاہتے ہو مجھے...... بھوک...... بھوک سے آگے بھی کچھ جانتے ہو...... ؟ ہمیشہ بھوک میں رہتے ہو...کتے کے پلّے...... میں زور سے چیخا: بس کرو ناہید...... مگر وہ جیسے پاگل پن کے انداز میں کچھ بھی سننے اور سمجھنے کو تیار نہیں تھی۔ وہ زور زور سے چلا رہی تھی...... اور شاید غصے میں، میں بھی چلایا تھا: ہاں مرد ہوں میں...... مجھے بھوک لگتی ہے...... میں مرد ہوں...... مجھے بھوک لگتی ہے...... '

'...... میں اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ میرا دماغ گھوم گیا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا اب اس عورت کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ میں مطمئن تھا کہ ناہید بھی یہی سوچ رہی ہے۔ اسی اُدھیڑ بن میں رات کے ۱۰ بج گئے تھے۔ ہم دونوں میں سے کسی نے بھی کچھ نہیں کھایا تھا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ ناہید نارمل ہو گی تو اطمینان سے اُس سے بات کروں گا کہ اگر دو لوگ ایک چھت کے نیچے چین سے نہیں رہ سکتے تو انھیں الگ ہو جانا چاہئے مگر دشمنوں کی طرح نہیں۔ کیونکہ اس طرح رہنے میں تین زندگیاں داؤں پر لگ جاتی ہیں اور ہمارے معاملے میں سب سے زیادہ متاثر باشا ہوگا — '

'...... مجھے احساس تھا کہ جب میں یہ موضوع چھیڑوں گا تو ناہید اس مدعے پر غور ضرور کرے گی اور ممکن ہے آپسی رضامندی سے یہ مسئلہ حل ہو جائے کیونکہ ناہید کو بھی ایک زندگی چاہئے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ خود بھی اس زندگی سے پریشان ہو گئی ہوگی۔ میں نے یہ بھی سوچ لیا تھا کہ باشا کا معاملہ بھی آپسی رضامندی سے طے کر لیں گے۔ اگر ناہید باشا کو رکھنا چاہے گی تو میں اعتراض نہیں کروں گا۔ مگر رات دس بجے اچانک جو واقعہ پیش آیا، میں نے کبھی خواب میں بھی اس کا تصور نہیں کیا تھا —

'مطلب ؟' میں نے کمال کی طرف دیکھا: وہ کسی بچے کی طرح کانپ رہا تھا۔ صوفیہ چائے رکھ کر جا چکی تھی۔ کمال نے چائے کا کپ خالی کیا۔ میری طرف دیکھا —

'مرد کسی عورت سے پریشان ہو جائے تو اُس کا آخری حربہ کیا ہوتا ہے؟'

'مطلب؟' اب چونکنے کی باری میری تھی۔—

'مثلاً ایک شوہر ہے۔ وہ بیوی سے ناراض رہتا ہے۔ اس کی زندگی میں کوئی بھی دن خوشی کا نہیں ہے تو وہ کیا کرے گا......؟'

'کچھ بھی......'

'مثلاً......؟'

'وہ چلائے گا......'

'اس کے بعد بھی عورت نے اس کو پریشان کیا، تو؟'

'وہ سمجھائے گا۔'

'عورت ماننے والی نہ ہوئی۔ یا مرد کا دل اس عورت سے بھر گیا ہو تو ایسا مرد کیا کرے گا؟'

'وہ دھکے مار کر گھر سے باہر نکال دے گا۔'

'بالکل صحیح۔' کمال نے میری طرف دیکھا: 'اُس نے یہی کیا کیونکہ وہ ایک شوہر تھی! رات دس بجے بیڈروم کا دروازہ زور سے کھلا جیسے زلزلے کا جھٹکا آیا ہو۔ میں نے دیکھا: دروازے پر ناہید تھی، اس کے ہاتھ میں لوہے کا ایک بڑا ساڈنڈا تھا۔ منہ سے خوفناک آواز نکالتی ہوئی وہ حملہ آور موڈ میں میری طرف رہی تھی...... نکلو...... نکلو...... یہاں سے۔ میں نے کہا تھا نا...... تمہارے ساتھ رہنا مشکل ہے۔ اب حد ہو چکی ہے۔ اب تم اس گھر میں نہیں رہ سکتے۔'

'ناہید......'

'میرا نام مت لو...... نکلو یہاں سے—'

'کہاں—؟ پاگل ہوگئی ہو تم......'

'جو بھی سمجھ لو— لیکن نکلو...... اس نے اشارہ کیا...... یہ لوہا ہے— میں مار دوں گی...... یہیں مر جاؤ گے— نکلو یہاں سے—'

میں کانپ رہا تھا— 'تم جانتی بھی ہو تم کیا کر رہی ہو— پاگل ہوگئی ہو تم—'

'بس نکلو— ورنہ دھکے مار کر......' لوہے کا ڈنڈا پاگل پن کے انداز میں گھماتی ہوئی وہ مجھے باہر والے دروازے تک لے آئی— اُس کے چہرے کا رنگ اچانک بدلا تھا— اب اُس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی— وہ غصہ سے میری طرف دیکھتی ہوئی چیخی— تم لوگ ایسے ہی اپنی بیویوں کو گھر سے باہر نکالتے ہو نا—؟ دھکے مار کر......؟ سوچتے بھی نہیں کہ وہ کیا کرے گی؟ کہاں جائے گی— تمہارے الفاظ اُس پر کیا اثر کریں گے—؟ سب کچھ بھول جاتے ہو تم لوگ نا......؟ اب میں یہی کرنے والی ہوں...... دیکھ کیا رہے ہو— نکلو باہر...... باہر نکلو—'

'تم پاگل ہوگئی ہو— سنو— میری بات سنو— ہم دونوں ایک ساتھ نہیں رہنا چاہتے تو مشکل کیا ہے— آرام سے بھی تو الگ ہوا جا سکتا ہے—'

اُس کے آواز میں سانپ کی پھنکار شامل تھی — 'نکلو باہر — مجھے کچھ نہیں سننا —'

'لیکن اتنی رات گئے۔ میں کہاں جاؤں گا۔ پہاڑی علاقہ ہے۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں سو گئے ہوں گے......'

'میں کچھ نہیں جانتی —' وہ ہنس رہی تھی...... 'وہ عورتیں بھی اسی طرح روتے ہوئے مکالمہ ادا کرتی ہوں گی نا — 'تم ذرا رو کر دکھاؤ۔ شاباش — ممکن ہے میرا ارادہ بدل جائے —' اس کے چہرے پر پھر سے سختی آ گئی تھی — 'نہیں میرا ارادہ نہیں بدلے گا — باہر نکلو...... ابھی بھی باتیں کرتے رہے تو میں ڈنڈا چلا دوں گی — نکلو باہر — دھکے مار مار کر دروازے سے باہر نکال دوں گی —'

'...... مجھے احساس تھا کہ اس وقت اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں جو کچھ وہ کہہ رہی ہے...... وہ کر سکتی ہے...... گھبرایا ہوا میں پیچھے ہٹتا ہوا دروازے سے باہر تھا۔ پھر میں نے آواز سنی: وہ دروازہ بند کر رہی تھی......'

کمال بولتے بولتے ٹھہر گیا تھا — کچھ دیر تک سر جھکائے وہ زمین کی طرف دیکھتا رہا — ممکن ہے، ایسا کرنے ہوئے وہ اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہو — میں نے دیکھا — 'اُس کی آنکھیں نم تھیں — شاید ان موقعوں پر خود کو سنبھالنا آسان نہیں ہوتا — ماحول میں خاموشی پسری ہوئی تھی — حقیقت فنتاسی سے زیادہ تلخ ہوتی ہے — ان واقعات کا تصور کرتے ہوئے میرے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے — اور یہ کہنا مشکل نہیں کہ اس وقت کمال پر کیا گزر رہی ہوگی — میں نے دیکھا — کمال نے اپنی ایک ہتھیلی سے اپنا چہرہ چھپا لیا تھا — وقت ٹھہر گیا تھا — یہ ایک ایسا لمحہ تھا، جب خاموشی دھماکے کر رہی تھی اور اس وقت اس کی گونج یہاں صرف ہم دونوں سن رہے تھے —

ہر بار ایک دنیا ہمارے لئے نئی ہو جاتی ہے۔ ہر بار ایک تہذیب پرانی ہو کر گم ہو جاتی ہے۔ ہر بار ہم ایک نئی تہذیب کے ساتھ حیران ہو رہے ہوتے ہیں۔ لیکن کیا ناہید کی بغاوت سے کہیں کچھ فرق پڑا تھا؟ کیا اربوں، کروڑوں میں ایسی کوئی ایک بغاوت اس سماج اور معاشرے پر کوئی اثر ڈال سکتی ہے؟ لیکن اس کا جواب بھی میرے پاس موجود تھا: ناہیدیں پیدا ہو رہی ہیں...... اور اس مرد اساس معاشرے کو آہستہ آہستہ اس کا جواب ملنے لگا ہے۔ ایک بدلتی ہوئی، جاگتی ہوئی عورت جو بچوں کی تربیت سے لے کر سیکس تک ہر مورچے پر اپنی شناخت اور مضبوطی بھی قائم رکھتی ہے — جیسے ایک عورت سہاگ رات میں اپنے شوہر سے پوچھتی ہے...... مجھے اپنی میڈیکل رپورٹ دکھاؤ۔ اس کے بعد ہی میں اس حسین رات کے لئے کچھ سوچ سکتی ہوں...... اور یہاں اس نئے ماحولیات میں جنم لیتا ہوا مرد ہے، جواب ایسے سوالوں میں اپنی مردانگی تلاش نہیں کرتا۔ ڈائناسور جیسے عظیم الشان، قوی الجثہ جانوروں کی نسلیں ختم ہو گئیں کیونکہ اس کے پس پشت ماحولیات کا دخل تھا کہ جس قدر زمین، پانی اور ہوا ان کے نشو و نما اور زندگی کے لیے چاہئے تھا وہ انھیں میسر نہیں تھے...... مرد سے مردانگی کے عنصر چھینے جا رہے تھے......'

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی — مرد سکڑ رہا ہے — میں نے کمال کی طرف دیکھا —

'تو تم گھر سے باہر تھے—'

'ہاں......'

'تم اپنے ہی گھر سے نکال دیئے گئے تھے—'

'ہاں۔ یہ انوکھی بات تھی۔ میں سمجھنے سے قاصر تھا کہ میرے ہی گھر کے دروازے میرے لیے بند کر دیئے گئے ہیں۔ اور مجھے میرے ہی گھر سے نکال دیا گیا ہے اور مجھے نکالنے والی اور کوئی نہیں میری بیوی ہے۔'

'وقت کیا ہوا تھا؟'

'اس پورے ہنگامے میں رات کے بارہ بج چکے تھے۔ تنہائی مجھے خوفزدہ کرتی ہے...... پہاڑیوں کی ویرانی اور سناٹگی کا احساس اس وقت آپ کو پاگل کر دے گا جب اچانک آپ کو احساس ہو کہ نیم شب میں آپ اکیلے اس بھیانک پتھریلے راستے اور ہزاروں فٹ نیچے کی گہرائیوں کا حصہ ہیں۔ میں نے دیکھا: دور تک درخت ہی درخت۔ آس پاس سے، کہیں سے بھی کتوں تک کے بھونکنے کی آواز نہیں آرہی تھی۔ ہوا کا چلنا رک گیا تھا۔ پیڑ پودے ساکت وجامد کھڑے تھے۔ سامنے وحیدہ کا گھر تھا۔ پہاڑیوں پر یوں بھی گھر دور دور بنے ہوتے ہیں۔ میری خواہش ہوئی کہ وحیدہ کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹاؤں۔ پھر خیال آیا کہ انھیں کہوں گا کیا: یہ کہ میری بیوی نے مجھے نکال دیا ہے۔ اس خوفناک سناٹے میں تاریکی کے آسیب جاگ رہے تھے اور میرے جسم میں کپکپی پیدا ہو رہی تھی۔ میں دیر تک اپنے ہی گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتا رہا۔ میں چیخ رہا تھا: پاگل ہو گئی ہو۔ میں رات کہاں گزاروں گا...... دروازہ کھولو ناہید۔ میں کہتا ہوں دروازہ کھولو...... میں نے ہزاروں بار بیل بجائی ہوگی۔ مجھے تیز نیند کا احساس ہو رہا تھا۔ اور قدم شل تھے...... میں یہ سوچنے سے قاصر تھا کہ کیا ساری رات مجھے اس مقام پر گزارنا ہوگا؟ وہ بھی تنہا۔ کیا اس طرح میں زندہ رہوں گا؟ ایک طرف خوف اور دوسری طرف بھیانک سناٹا۔ میں سڑک کی طرف گزرتی ہوئی گاڑیوں کی تلاش میں آ گیا کہ شاید کوئی گاڑی نظر آئے تو فریاد کر سکوں۔ کار کی کنجی اور موبائیل دونوں گھر کے اندر رہ گئے تھے۔ میں ایک ایسا لاچار شخص تھا جس کے پاس ان بھیانک لمحوں میں زندگی کا ہر دروازہ بند تھا۔ کوئی گاڑی مل جاتی تو میں کسی ہوٹل میں چلا جاتا یا کسی دوست کے پاس۔ کوئی بہانہ بنا دیتا۔ اس درمیان سڑک پر گشت کرتے ہوئے بھی دو گھنٹے گزر گئے تھے۔ مجھے خیال آیا، گھر چلنا چاہئے۔ ایک بار پھر دروازہ کھٹکھٹانا چاہئے۔ ممکن ہے، ناہید کو مجھ پر رحم آجائے۔'

'پھر—؟'

'میں جیسے ہی گھر کے دروازے پر آیا، میں حیران رہ گیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر کی روشنی باہر تک آرہی تھی۔ ناہید کا نام لیتے ہوئے میں تیزی سے گھر میں داخل ہوا...... میں نے چاروں طرف دیکھا۔ ڈرائنگ روم، بیڈروم۔ بیڈروم میں باشا ابھی بھی سویا ہوا تھا۔ ممکن ہے درمیان میں اٹھا ہو، پھر روتے روتے سو گیا ہو...... کچن، لیٹرین، باتھ روم۔ لیکن ناہید کہیں نہیں تھی۔ مجھے خیال آیا۔ یقیناً وہ اپنے کیے پر شرمندہ ہوگی اور ابھی مجھ سے چھپنے کی کوشش کر رہی ہوگی۔ لیکن سوال یہ بھی تھا کہ ناہید اگر گئی تو کہاں گئی؟'

'تم نے تلاش کیا؟'

'ہر جگہ۔ گوشہ گوشہ۔ جہاں کہیں بھی میں تلاش کرسکتا تھا...... میں یہ بھی دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اگر مان لیا کہ وہ کہیں چلی گئی ہے تو کیا اس نے کوئی خط چھوڑا ہے؟ مگر ایسا کوئی خط بھی موجود نہیں تھا۔ شاید یہ وہی وقفہ رہا ہوگا جب میں باہر سڑک پر مدد کے لیے گاڑیوں کو تلاش کر رہا تھا، اور اسی درمیان ناہید نے یہ گھر چھوڑ دیا ہوگا۔ ممکن ہے اس نے مجھے دیکھا ہو...... یوں بھی اس طرف راستوں کی کوئی کمی نہیں۔ لیکن سوال ہے کیا وہ پیدل گئی۔ کہاں گئی؟ اب میں خطرہ محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اپنے دو چار دوستوں کو فون کرکے بتایا کہ ناہید گھر چھوڑ کر چلی گئی۔ مجھے اس بات کا احساس تھا کہ آنے والا وقت میرے لیے سنگین ہوسکتا ہے۔ میں نے دوستوں کو یہی بتایا کہ ہمارا آپس میں کچھ جھگڑا ہوا۔ جیسے جھگڑے عام طور پر میاں بیوی میں ہوتے رہتے ہیں۔ مگر یہ جھگڑا اتنا شدید نہیں تھا کہ ناہید نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا ہو......'

'پھر؟'

گورنس چھٹی پر تھی۔ باشا کو گھر میں اکیلے چھوڑنا مناسب نہیں تھا۔ اس درمیان ایک گھنٹہ بعد میرے ایک دوست اپنی اہلیہ کے ساتھ آگئے۔ باشا کو ان کی اہلیہ کے حوالے کرکے ہم ناہید کی تلاش میں نکل گئے۔ گاڑی میں ہی چلا رہا تھا۔ مجھے خطرہ اس بات کا تھا کہ کہیں غصہ اور جذبات میں ناہید نے کوئی غلط قدم تو نہیں اٹھالیا؟ سات بجے تک ہم گھر واپس آگئے۔ میرا دوست خاموش تھا۔ ہم دونوں ایک ہی نتیجے پر پہنچے کہ ناہید کے غصے نے اس کو خوفناک انجام تک پہنچا دیا۔'

'خوفناک انجام یعنی خودکشی......؟' میں کمال کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

'جی۔'

'یعنی تمہیں یقین ہے کہ رات جب تمہیں ناہید نے گھر سے باہر نکالا...... یعنی میرا مطلب ہے تمہارے جاتے ہی اس نے خودکشی کرنے کا ارادہ کرلیا......؟'

'میں اس بارے میں نہیں جانتا۔'

'لیکن یہ کام تمہیں گھر سے باہر نکالنے سے پہلے بھی وہ کرسکتی تھی۔؟'

'جی......'

'پھر اس نے اتنا انتظار کیوں کیا—؟'

'مطلب......؟'

'مطلب تمہیں پہلے گھر سے نکالا اور پھر مرنے کے لیے گھر چھوڑ دیا—'

'یہ میں بھی نہیں سمجھ سکا۔' کمال کے چہرے پر حیرانی تھی۔

میں کمال کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ 'تمہیں یاد ہے کمال۔ تمہارے دوست نرمل اساس نے کیا کہا تھا...... تبدیلی آرہی ہے اور بہت تیزی کے ساتھ۔ ہم ہر لمحہ تاریخ کی موت کے ساتھ جی رہے ہیں۔ ممکن ہے اس فلسفے پر اعتبار نہ کیا جائے مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ نوجوان نسل آگے بڑھتی ہوئی پیچھے دیکھنے کی قائل نہیں ہے۔ اور اسی لیے اس نے تاریخ سے اپنی توجہ ہٹا کر

مستقبل پر نظریں مرکوز کر رکھی ہیں۔ اور اسی لیے....' میں نے کمال کی طرف دیکھا...... مجھے یقین نہیں کہ ناہید نے ایسا کیا ہوگا اس کے لیے تاریخ سے زیادہ اس کا ہونا اہم تھا۔ مردہ تاریخ سے الگ وہ ایک مضبوط مستقبل سے نبرد آزما تھی اور اسی لیے اس نے نئے عہد میں جیتے ہوئے لغات تک کو بدلنے کا فیصلہ کیا'۔ میں ایک لمحہ کو رکا: 'یہ بات مجھے قائل نہیں کر پا رہی ہے کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟ یا وہ گئی تو کہاں گئی—'

'یہی تو میری بھی سمجھ میں نہیں آ رہا'۔

'اس کے بعد کیا ہوا؟'

'اس کے بعد کی کہانی تو آپ جانتے ہیں: پولیس تفتیش۔ مجھ پر شک کیا جانا...... ناگارجن جی کا مدد کرنا......اور صوفیہ کا میرے گھر آنا......'

'صوفیہ....' میں نے کمال کی طرف دیکھا۔ ابھی بھی ذہن میں چلنے والی آندھیوں کو سنبھالنا میرے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ میں نے کمال سے پوچھا: 'کیا پولیس تفتیش میں کوئی ایسی بات سامنے آئی جس سے کوئی سراغ مل سکے......؟'

'نہیں'۔ کمال کچھ سوچتے ہوئے رکا— 'کتابوں کی الماری سے ایک بچکانہ سی تصویر ملی تھی— ٹھہریے۔ میں دکھاتا ہوں آپ کو۔ پولس دیر تک اس تصویر میں الجھی رہی۔ مگر وہ آخر تک سمجھنے سے قاصر رہی کہ یہ کیا ہے۔ پھر یہ تصویر پولیس نے زمین پر پھینک دی۔

'تصویر—'

'ہاں۔ وہ اکثر بیٹھی بیٹھی کاغذ پر کچھ آڑی ترچھی لکیروں سے تصویریں بنایا کرتی تھی۔ میں نے اکثر دیکھا تھا'۔

'کیا وہ تصویر ہے تمہارے پاس۔؟'

'ہاں، کیوں نہیں'۔ کمال اٹھتے ہوئے بولا: 'میں نے جان بوجھ کر تصویر ضائع نہیں کی۔ کیا پتہ پولس کو کب اس تصویر کا خیال آجائے۔ مگر...... اس نے میری طرف دیکھا: 'آپ کو اس تصویر میں کچھ بھی نہیں ملے گا۔ یہ معمولی چوہے بلی کی تصویر ہے......'

'چوہے بلی کی......' بطور مصنف اس پورے مکالمے میں، میں پہلی بار اپنی جگہ سے اچھلا تھا۔ اور اس وقت میری جگہ ایڈگر ایلین پو آگیا تھا...... جس کو اس تصویر میں ایک بڑا خزانہ ملنے کی امید پیدا ہوگئی ہو۔

کچھ ہی دیر میں کمال واپس آگیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک میلا سا کاغذ تھا۔ میں نے کاغذ پر دیکھا...... دو تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ پہلی تصویر چوہے کی تھی۔ دوسری تصویر ایک بلی کی تھی۔ اور اس چوہے کو بلی کے پیٹ کے اندر دکھایا گیا تھا۔

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ یہ ایک بچکانہ سی تصویر تھی جیسی تصویریں ہم بچپن میں بنایا کرتے تھے۔ میں نے آہستہ سے پوچھا:

'کیا میں یہ تصویر رکھ سکتا ہوں —؟'

'کیوں نہیں۔ کمال مسکرایا۔ بس اسی طرح کی تصویریں وہ اکثر بنایا کرتی تھی۔'

'کیا اس سے پہلے بھی ناہید نے چوہے اور بلی کی تصویر بنائی تھی —؟'

کمال نے کچھ سوچتے ہوئے کہا — 'نہیں۔'

میں نے تصویر جیب میں رکھ لی۔ لیکن یہی وہ لمحہ تھا جب ایک بلی غراتی ہوئی میرے قریب آگئی تھی۔ مائی گاڈ...... میں نئی صدی کے ان ۱۵-۱۴ برسوں کا محاکمہ کر سکتا تھا۔ ہر قدم پر ایک خوفناک انقلاب کا سامنا: یہ نئی صدی دنیا کو بدلنے والی صدی تھی اور دنیا کو بدلنے کا خطرہ آئی ٹی انقلاب نے اٹھایا تھا...... اچانک ہمارے بازار بدل گئے۔ آئی ٹی نے کارپوریٹ انڈیا کا چہرہ تبدیل کر دیا۔ پہلی بار اس دن برسوں میں کارپوریٹ انڈیا کے عالمی بازار نے 'لبریشن' یا 'آزادی' کے معنی کو سمجھا۔ ایک بڑی دنیا سامنے تھی: اور ایک نئی تہذیب جہاں عالمی بازار کے سامنے مرد اور عورت میں کوئی تفریق نہیں تھی، جہاں صرف انسانی ضرورتوں کے حصول کے لیے اس بازار کو سجایا جا رہا تھا اور اس طرح لندن، نیویارک اور بنگلور سب ایک دوسرے کے قریب آگئے تھے ایک دنیا تبدیل ہو رہی تھی۔ ساری دنیا کے لائف اسٹائل کم و بیش ایک ہی رہے تھے۔ اور ایک نئی تہذیب اس آئی ٹی انقلاب میں پرورش پا رہی تھی...... 'آزادی'...... اور اچانک آزادی کے اس خول سے ایک بلی غراتی ہوئی باہر آگئی تھی......

مجھے یاد آیا: ناہید نے غائب ہونے سے ایک دن قبل کمال کے کمرے سے جاتے ہوا ایک بے رحم لفظ کی ادائیگی کی تھی...... چوہا...... تو کیا کمال کے لفظوں میں، میلے کاغذ پر بنی ہوئی یہ تصویر سچ مچ بچوں جیسی حرکت تھی؟ یا ایک غراتی ہوئی بلی نے اس اسپیس ایج، آئی ٹی کلچر اور نئی تہذیب کے دہانے پر دستک دیتے ہوئے اپنی 'آزادی' کے احساس کو زندہ کیا تھا؟ اور ایک گوشت کی جھلی جیسے بدنما چوہے کو کھا کر اپنے پیٹ میں اتار لیا تھا......

کمال میرے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ مگر اس وقت میں کمال کو کچھ بھی بتانے یا سمجھانے سے قاصر تھا۔ ناہید کی پوری کہانی میرے سامنے تھی۔ مگر ابھی بھی ایک سوال رہ گیا تھا: آخری سوال...... خوفناک بلی کمزور چوہے کو نگل چکی تھی۔ باہر جنگل لرز رہا تھا......

میں نے کمال کی طرف دیکھا...... میرا لہجہ کمزور تھا...... آواز ٹوٹ رہی تھی...... 'پتہ نہیں مجھے یہ سوال کرنا چاہئے یا نہیں۔ مگر...... تم سمجھ رہے ہو نا کمال...... شاید ناہید کو جاننے کے لیے یہ سوال بھی ضروری ہے......'

'جی......'

'میں پہلے ہی اس سوال کے لیے معافی مانگ لیتا ہوں۔ مگر...... جیسا تم سمجھ رہے ہو...... یہ بھی ایک سوال ہے۔ اور شاید میری نظر میں ضروری......'

'آپ پوچھ سکتے ہیں۔'

'بیحد شکریہ۔' میں نے کمال یوسف کی طرف دیکھا...... 'پرائیویٹ سوال ہے، لیکن پوچھنا ضروری ہے......'

لفظ کام نہیں کر رہے تھے...... میں نے غور سے کمال کی طرف دیکھا...... ناہید ناز کے ساتھ تمہارے تعلقات...... میرا مطلب سیکس کے وقت...... جنگل میں چیخ گونج گئی تھی...... زیادہ تر ناہید ناز کیا پوز پسند کرتی تھی......؟

کمال یوسف کی آواز سرد تھی...... 'زیادہ تر میں نیچے ہوتا تھا۔ اور وہ کسی بھیانک آندھی کی طرح مجھ پر سواری کرتی تھی......'

'ایلس اِن ونڈر لینڈ' سے وہ غراتی ہوئی بلی اچانک میرے سامنے آ گئی تھی۔ اور میں دیکھ رہا تھا...... وہ خوش نظر آ رہی تھی اور بار بار دیوار پر پنجے مارتی ہوئی اپنی خوشی کا اظہار کر رہی تھی۔

میں سکتے کی کیفیت میں باہر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سناٹا چھا گیا تھا۔

باہر تیز اٹھنے والی آندھی کے بعد ایک کے بعد ایک منظر تبدیل ہو رہے تھے...... جوناگڑھ کی حویلی...... نیم شب حویلی کے خستہ وجود سے بلند ہوتی ہوئی چیخیں...... اور ان سب کے درمیان میرے کانوں میں ناہید کی آواز گونج رہی تھی...... مرد سمجھتے ہیں کہ وہ مرد ہیں۔ دراصل جو طاقتور ہوتا ہے، وہی مرد ہوتا ہے۔ اس نئی دنیا میں دیکھیے۔ یہاں مرد اکثر ہار جاتا ہے...... عورت جیت جاتی ہے......'

کمال کی کہانی ختم ہو چکی تھی۔ میں ابھی بھی ایک منظر کی زد میں تھا۔ اور اس منظر نے جیسے مجھے اپنی جگہ منجمد کر دیا تھا۔ کمال کو دھکا دے کر باہر نکالنے کے بعد نیم شب کے سناٹے میں ہذیان کی کیفیت میں دروازہ کھول کر چپکے سے ایک عورت کا باہر نکلنا اور شب کے طلسم میں کھو جانا...... خوفناک سیاہ پہاڑیوں کی آغوش میں ایک جسم کا تحلیل ہو جانا......

کیا کہانی ختم ہو گئی تھی؟: ہم ہر بار ایک بوجھ جیسی رات سے طلوع ہوں گے / اور ہر بار / ایک بوجھ جیسی رات میں سما جائیں گے۔/

☆☆☆

(۱)

چاند کہاں ہے!

● اکبر لغاری

● ترجمہ: شاہد حنائی [کویت]

آج چودھویں کی رات ہے اور آسمان پر چاند نہیں ہے۔ مطلع بالکل صاف ہے۔ آسمان پر بادل بھی نہیں ہیں، لیکن چاند کی صورت ندارد۔

ہم دونوں چاند کی کھوج میں نکل پڑتے ہیں۔ ہمیں ایک شخص ملتا ہے، ہم اس سے پوچھتے ہیں کہ چاند کہاں ہے، تو وہ جواب دیتا ہے کہ ''رات کے بارہ بجے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ بلا وجہ ہنسنے لگتا ہے اور سیٹی بجاتے ہوئے چلا جاتا ہے۔

ہم دونوں اپنے قدم آگے بڑھا دیتے ہیں اور طے کرتے ہیں کہ کسی سیانے بندے سے پوچھا جائے کہ آخر آج چاند گیا کہاں! پہلے تو چاند اس طرح کبھی غائب نہیں ہوا تھا۔ ہمیں ایک پڑھا لکھا شخص دکھائی دیتا ہے۔ ہم آگے بڑھ کر اس سے دریافت کرتے ہیں:

''چاند کہاں غائب ہو گیا ہے!''

''میں گونگا ہوں، آپ کو کچھ بھی نہیں بتا سکتا۔'' وہ شخص جواب دیتا ہے۔

''لیکن آپ تو بول رہے ہیں، براہِ کرم ہمیں چاند کے بابت کچھ بتائیں۔''

''میں روزنامہ 'صداقت' کا مدیر ہوں، ابھی ابھی کاپی پریس کو بھیج کر آ رہا ہوں۔ مجھے گھر جانے

دیں، مجھے پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ عجلت میں چل دیا۔

ہم دونوں حیران و پریشان رہ گئے۔ دوسری کوئی راہ نہ پا کر ہم تھانے پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں ایک حوالدار بیٹھا ہے، جسے عرفِ عام میں ہیڈ محرر کہا جاتا ہے۔

''چاند کہاں ہے؟ کیا آپ، اسے تلاش کرنے میں ہماری کوئی مدد کریں گے!'' ہم ہیڈ محرر سے سوال کرتے ہیں۔

''فریادی کا نام؟'' ہیڈ محرر کان میں اڑسی ہوئی پنسل نکالتا ہے اور کورا کاغذ سامنے رکھ کر پوچھتا ہے۔

''ہم نے فریاد نہیں لکھوانی، ہم چاند کے متلاشی ہیں۔ آج چودھویں کی رات ہے بلکہ رات ختم ہونے کو ہے، لیکن چاند آسمان سے غائب ہے۔ آپ ہماری مدد کریں اور بتائیں کہ چاند کہاں ہے۔'' ہم نے کہا۔

''کتنے دنوں سے لاپتا ہے۔'' ہیڈ محرر جھولتے ہوئے پوچھتا ہے۔

''آج رات سے۔'' ہم نے جواب دیا۔

''آپ کو کسی پر شک ہے!''

''ہمیں کسی پر بھی شک نہیں ہے۔''

''جائے واردات پر آپ موجود تھے؟''

''جناب ہماری کوئی چوری نہیں ہوئی ہے، ہمیں تو چاند کی تلاش ہے۔''

''اوئے چوری نہیں ہوئی ہے تو ہمارا قیمتی وقت کیوں برباد کر رہے ہو۔ نکلو یہاں سے .... یہ تھانہ ہے تھانہ، کوڑے خان کی بیٹھک نہیں ہے..... جس کو دیکھو منھ اٹھائے چلا آتا ہے۔''

پکھیرو اپنی نیند پوری کر کے پرواز کرنے لگے ہیں اور مشرق سے ابھرتا سورج دھیرے دھیرے تاؤ کھانے لگا ہے۔ اسی اثنا میں ہمیں فیکٹری کی طرف جاتے چند مزدور نظر آتے ہیں، ہم انھیں روک کر ان سے پوچھتے ہیں:

''بھائیو! کیا آپ کو کچھ پتا ہے کہ چاند کہاں غائب ہو گیا ہے؟''

''جناب اس میں ہمارا کیا قصور! جا کر سیٹھ صاحب سے پوچھیں۔ وہ آخر تین ماہ سے ہمیں بونس کیوں نہیں دے رہا۔'' یہ کہہ کر وہ جلدی جلدی فیکٹری کی طرف چلے جاتے ہیں۔

ہم ایک کالج میں جا پہنچتے ہیں، جہاں ہمیں نوجوان شاگرد ''بھاگ دوڑ'' کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ معلوم پتا چلتا ہے کہ سالانہ امتحانات ہو رہے ہیں۔ ہم ایک طالب علم سے پوچھتے ہیں:

''بھائی! آپ ہمیں بتا سکتے ہو کہ چاند کہاں ہے؟'' وہ جواب دیتا ہے: ''یہ کتنے نمبروں کا سوال

ہے؟ رات جو پرچہ آؤٹ ہوا تھا، اس میں تو یہ سوال نہیں تھا۔ اب بورڈ والے بھی دھوکہ دہی پہ اتر آئے ہیں، اپنے دام پورے کھرے کرتے ہیں مگر پرچہ آدھا آؤٹ کرتے ہیں۔ ہمارے پیسے حرام کے ہیں کیا؟ یہ کہہ کر وہ نقل کرنے کے لیے ''کارتوس'' تلاش کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔

ہمیں اس کالج میں ڈیوٹی پر مامور ایک استاد دکھائی دیتا ہے۔ ہم اس سے بھی وہی سوال کرتے ہیں اور وہ جواب دیتا ہے کہ: ''بڑا مشکل پرچہ ہے۔ ہم چار اساتذہ نے مل کر حل کیا ہے لیکن پھر بھی ایک آدھ سوال رہ ہی گیا ہے۔ آپ کو کس سوال کا جواب چاہیے؟''

ہم کالج سے نکل کر ادھر ادھر دیکھتے ہیں تو ہمیں ایک بہت بڑے ڈاکٹر کا بورڈ نظر آتا ہے۔ ہم اس کے کلینک پر چلے جاتے ہیں اور اس سے دریافت کرتے ہیں:

''ڈاکٹر صاحب ہم بہت دیر سے چاند کی تلاش میں ہیں، لیکن ہمیں کوئی بھی اس کا اتا پتا نہیں بتاتا۔ ہم تو اب مایوس ہو چلے ہیں۔''

''مایوسی کفر ہے جناب،'' ڈاکٹر نے اپنا چشمہ صاف کرتے ہوئے کہا: ''یہ مرض اب لاعلاج نہیں رہا ہے، آپ پہلے یہ ٹیسٹ کروالیں، دوا کا نسخہ میں بعد میں لکھ دوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ پیڈ پر کچھ لکھنے لگا۔

''لیکن ڈاکٹر صاحب، ہم بیمار تو نہیں ہیں، ہم تو چاند کے متلاشی ہیں۔ براہ کرم ہمیں یہ بتائیں کہ چاند کہاں ہے۔''

''دیکھیں جناب میرا وقت نہایت قیمتی ہے، مجھ سے بحث نہ کریں۔ میں صرف دو منٹ معائنہ کرنے کے تین سو روپے لیتا ہوں۔ آپ یہ ٹیسٹ کروا آئیں، باقی پھر دیکھیں گے۔'' یہ کہہ کر ڈاکٹر دوسرے مریض کو بلانے کی غرض سے گھنٹی بجانے لگا۔

ڈاکٹر کے کلینک کے باہر ہمیں ایک ماں نظر آئی، جس کی گود میں ایک کم سن بچہ تھا۔ ماں کی آنکھوں سے اشک رواں تھے۔ ہم نے ہمت کر کے اس سے پوچھا: ''مہربانی کر کے ہمیں بتائیں کہ چاند کہاں ہے''۔ ماں نے جواب دیا: ''تین دن سے بیمار ہے۔ ڈاکٹر تین سو روپے مانگتا ہے۔ میں کہاں سے لاؤں اتنی بڑی رقم۔''

ہم رات بھر چاند کی تلاش میں مارے مارے پھرتے رہے تھے اور اب آدھا دن بھی گزر چکا تھا، لیکن کوئی بھی ہمیں چاند کا پتا بتانے کو تیار نہیں تھا۔ ہم دل برداشتہ ہو کر واپس لوٹ رہے تھے کہ میرے ساتھی نے کہا: ''سنا ہے کہ اس شہر میں نیا اسسٹنٹ کمشنر آیا ہے، وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے شاید وہ کوئی مدد کر سکے۔''

ہم دونوں اے۔ سی۔ کے دفتر میں آ گئے۔ اے۔ سی۔ سے ملنے کے لیے کئی افراد انتظار کر رہے تھے۔ ان میں ایک بوڑھا ضعیف شخص بھی تھا، جس کے کپڑے میلے اور پھٹے ہوئے تھے۔ سر پر صافہ اور پیٹھ پر گٹھری باندھ رکھی تھی۔ بوڑھا اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا:

''اے۔سی۔صاحب اب ہماری اپیل کا فیصلہ ضرور کرے گا۔اس بار ایم این اے کا رقعہ جو لائے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ بیڑی سلگا کر کھانسنے لگا۔ہم جیسے تیسے کر کے دفتر کے اندر پہنچ جانے میں کامیاب ہو گئے۔ہم نے وہاں دیکھا کہ ایک مشہور و معروف شخصیت کا پرائیویٹ سیکریٹری موجود تھا اور وہ اے۔سی۔ سے کہہ رہا تھا:

''صاحب اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لیے گئے ہوئے ہیں اور مجھے آپ کی طرف بھیجا ہے۔ہمیں پتا چلا ہے کہ چند شر پسند افراد چاند کی تلاش میں مصروف ہیں۔صاحب کا حکم ہے کہ ایسے لوگوں پر کڑی نگاہ رکھی جائے۔چاند کے متلاشی، سماج دشمن عناصر ہیں اور یہ وطنِ عزیز کے اندر انتشار چاہتے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی چاند کی تلاش شروع ہوتی ہے، تب اقتدار کے ایوانوں میں زلزلہ آتا ہے اور امن و امان کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔''

اسسٹنٹ کمشنر، جو اب تک سب کچھ خاموشی سے سن رہا تھا، گویا ہوا:

''جناب! آپ چنداں فکر نہ کریں۔میں آج ہی یہاں دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دیتا ہوں۔یہاں جو بھی چاند کو ڈھونڈے گا اسے بلا تاخیر گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا جائے گا۔ اور کوئی حکم؟''

ہم خاموشی کے ساتھ وہاں سے نکل آتے ہیں۔

☆☆☆

(۲)

اجنبی

● موہن راکیش

● ترجمہ: ڈاکٹر نوشاد عالم

کُہرے کی وجہ سے کھڑکی کے شیشے دھندلے پڑ گئے تھے۔ گاڑی فی گھنٹہ چالیس کی رفتار سے سنسان اندھیرے کو چیرتی چلی جارہی تھی۔ کھڑکی سے سر لگا کر بھی باہر کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا اس کے باوجود میں باہر دیکھنے کی کوشش کررہا تھا۔ کبھی کبھی درخت کی ہلکی گہری لکیر ہی گزرتی نظر آجاتی تو کچھ دیکھ لینے کا اطمینان ہوتا۔ دل کو الجھائے رکھنے کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ آنکھوں میں ذرا بھی نیند نہیں تھی۔ گاڑی کو جانے کتنی دیر بعد کہیں جا کر رکنا تھا۔ جب اور کچھ دکھائی نہ دیتا، تو اپنا سایہ تو کم سے کم دیکھا ہی جاسکتا تھا۔ اپنے سایے کے علاوہ اور بھی کئی سایے تھے۔ اوپر کی برتھ پر دراز آدمی کا سایہ عجب بے بسی کے ساتھ حرکت کررہا تھا۔ سامنے برتھ پر بیٹھی عورت کا سایہ بہت اداس تھا۔ اس کی بھاری پلکیں پل بھر کے لیے اٹھتیں، پھر جھک جاتیں۔ دھندلی شکلوں اور بے نام ہیئتوں کے علاوہ کئی بار نئی آوازیں دھیان کھینچ لیتیں جن سے پتا چلتا کہ گاڑی پل کے اوپر سے جارہی ہے یا مکانوں کی قطار کے پاس سے گزر رہی ہے۔ درمیان میں اچانک انجن کی چیخ سنائی دیتی جس سے تاریکی اور تنہائی مزید گہری محسوس ہونے لگتی۔

میں نے گھڑی میں وقت دیکھا، سوا گیارہ بجے تھے۔ سامنے بیٹھی عورت کی آنکھیں بہت خالی خالی تھیں۔ وقفے وقفے سے ان میں ایک لہر سی اٹھتی اور معدوم ہوجاتی۔ وہ جیسے آنکھوں سے دیکھ اور سوچ رہی تھی۔ اس کی بچی جسے فر کے کمبل میں لپیٹ کر سلایا گیا تھا، ذرا بے چین ہونے لگی۔ اس کی گلابی ٹوپی سر سے

اتر گئی تھی۔ اس نے دو ایک بار پیر پٹکے، اپنی بندھی ہوئی مٹھیاں اٹھائیں اور رونے لگی۔ عورت کی ویران آنکھیں دفعتاً امڈ آئیں۔ اس نے بچّی کی ٹوپی درست کی اور اسے کمبل سمیت اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

لیکن اس سے بچّی کا رونا بند نہیں ہوا۔ اس نے اسے ہلا کر اور پیار کر کے چپ کرانا چاہا، مگر وہ پھر بھی روتی رہی۔ اس پر اس نے کمبل تھوڑا ہٹا کر بچّی کے منہ میں دودھ دے دیا اور اسے اچھی طرح خود سے چمٹا لیا۔

میں پھر کھڑکی سے سر لگا کر باہر دیکھنے لگا۔ دور بتیوں کی ایک قطار نظر آ رہی تھی۔ شاید کوئی آبادی تھی، یا صرف سڑک ہی تھی۔ گاڑی تیزی سے چل رہی تھی اور انجن بہت پاس ہونے کی وجہ سے کہرے کے ساتھ دھواں بھی کھڑکی کے شیشوں پر جمتا جا رہا تھا۔ آبادی یا سڑک، جو بھی وہ تھی، اب دھیرے دھیرے پیچھے جا رہی تھی۔ شیشے میں دکھائی دیتے عکس پہلے سے زیادہ گہرے ہو گئے تھے۔ عورت کی آنکھیں مند گئی تھیں اور اوپر لیٹے آدمی کا بازو زور زور سے ہل رہا تھا۔ شیشے پر میری سانس کے پھیلنے سے سائے مزید دھندلے ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ سارے سائے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ میں نے تب جیب سے رومال نکال کر شیشے کو اچھی طرح پونچھ دیا۔

عورت نے آنکھیں کھول لی تھیں اور ٹکٹکی باندھے سامنے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی لکیر پھیل گئی تھی، جو مسکراہٹ نہیں تھی۔ مسکراہٹ سے بہت کم اس لکیر میں کہیں متانت اور اضمحلال و افسردگی بھی تھی۔ جیسے وہ یوں ہی ابھر آئی کسی یاد کی لکیر تھی۔ اس کی پیشانی پر ہلکی سی شکن پڑ گئی تھی۔

بچّی نے جلد ہی دودھ چھوڑ دیا۔ اس نے سر اٹھا کر اپنا بن دانتوں والا منہ کھول دیا اور کلکاری مارتی ہوئی ماں کے سینے پر مٹھیوں سے مارنے لگی۔ دوسری طرف سے آ رہی ایک گاڑی تیزی سے گزری تو وہ ذرا سہم گئی، مگر گاڑی کے نکلتے ہی اور بھی منہ کھول کر کلکاری مارنے لگی۔ بچّی کا چہرہ گدرایا ہوا تھا اور اس کی ٹوپی کے نیچے سے بھورے رنگ کے ہلکے ہلکے بال نظر آ رہے تھے۔ اس کی ناک ذرا چھوٹی تھی، لیکن آنکھیں ماں کی ہی طرح کشادہ اور گہری تھیں۔ ماں کے گال اور کپڑے نوچنے کے بعد اس کی آنکھیں میری طرف گھوم گئیں اور وہ بانہیں ہوا میں پٹکتی ہوئی مجھے اپنی کلکاریوں کا نشانہ بنانے لگی۔ عورت کی پلکیں اٹھیں اور اس کی اداس آنکھیں پل بھر میری آنکھوں سے ملی رہیں۔ مجھے ایک لمحے کے لیے لگا کہ میں ایسا منظر دیکھ رہا ہوں جس میں گہری شام کے بھی ہلکے گہرے رنگ جھلملا رہے ہیں اور جس کا منظر لمحے کے سوویں حصے سے بدلا جا رہا ہے......

بچّی میری طرف دیکھ کر بہت ہاتھ پٹک رہی تھی، اس لیے میں نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا اور کہا: ''آ بیٹے آ......''

میرا ہاتھ پاس آ جانے کی وجہ سے بچّی کے ہاتھوں کی حرکت بند ہو گئی اور اس کے ہونٹ روہانسے ہو گئے۔
عورت نے بچّی کے ہونٹوں کو اپنے ہونٹوں سے چھوا اور کہا: ''جا بنو، جائے گی ان کے پاس؟''
لیکن بنو کے ہونٹ اور بھی روہانسے ہو گئے اور وہ ماں سے چمٹ گئی۔

’غیر آدمی سے ڈرتی ہے!‘ میں نے مسکرا کر کہا اور ہاتھ ہٹا لیا۔
عورت کے ہونٹ بھنچ گئے اور پیشانی پر تھوڑا اونچا وپیدا ہو گیا۔
اس کی آنکھیں کسی پرانی یاد میں کھو گئیں۔ اچانک وہ اس سے ابھر آئی اور بولی: ’’نہیں، ڈرتی نہیں۔ اسے دراصل عادت نہیں ہے۔ یہ آج تک یا تو میرے ہاتھوں میں رہی ہے یا نوکرانی کے ....‘‘ اور وہ اس کے سر پر جھک گئی۔ بچّی اس کے ساتھ چپک کر آنکھیں جھپکانے لگی۔ عورت اسے ہلاتی ہوئی تھپکیاں دینے لگی۔ بچّی نے آنکھیں موند لیں۔ عورت اس کی طرف دیکھتی ہوئی اسے تھپکیاں دیتی رہی۔ پھر اچانک اس نے جھک کر اسے چوم لیا۔
بہت اچھی ہے، ہماری بٹو، فوراً سو جاتی ہے۔ یہ اس نے جیسے خود سے کہا اور میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک اداس سا جوش بھر رہا تھا۔
’’کتنے سال کی ہے یہ بچّی؟‘‘ میں نے پوچھا۔
’’دس دن بعد پورے چار مہینے کی ہو جائے گی‘‘ وہ بولی، ’’لیکن دیکھنے میں ابھی اس سے چھوٹی لگتی ہے، نہیں؟‘‘
میں نے آنکھوں سے اس کی تائید کی۔ اس کے چہرے سے سلیقگی اور متانت جھلکتی تھی۔ میں نے سوئی ہوئی بچّی کے گال کو ذرا سا سہلا دیا۔ عورت کا چہرہ اور زیادہ احساس سے بھر گیا۔
’’لگتا ہے آپ کو بچّوں سے بہت پیار ہے‘‘ وہ بولی: ’’آپ کے کتنے بچّے ہیں؟‘‘
میری آنکھیں اس کے چہرے سے ہٹ گئیں۔ بجلی کی بتّی کے پاس ایک کیڑا اڑ رہا تھا۔
’’میرے؟‘‘ میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، ’’ابھی تو کوئی نہیں ہے، مگر....‘‘
’’مطلب شادی ہو گئی ہے، ابھی بچّے وچّے نہیں ہوئے‘‘ وہ مسکرائی۔ ’’آپ مرد لوگ تو بچّوں سے بچے ہی رہنا چاہتے ہیں نا؟‘‘
میں نے ہونٹ سکیڑ لئے اور کہا ’نہیں، ایسی بات نہیں....‘
’’ہمارے یہ تو بچّی کو چھوتے بھی نہیں!‘‘ وہ بولی: ’’کبھی دو منٹ کے لیے بھی اٹھانا پڑ جائے تو جھلّانے لگتے ہیں۔ اب تو خیر وہ اس مصیبت سے نجات پا کر باہر ہی چلے گئے ہیں۔‘‘ اور اچانک اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ رونے کی وجہ سے اس کے ہونٹ بالکل اس بچّی کی طرح ہو گئے تھے۔ پھر اچانک اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لوٹ آئی۔ جیسا اکثر سوئے ہوئے بچّوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس نے آنکھیں جھپکا کر خود کو سنبھال لیا اور بولی: ’’وہ ڈاکٹریٹ کے لیے انگلینڈ گئے ہیں۔ میں انھیں بمبئی میں جہاز پر سوار کرا کر آ رہی ہوں۔ ویسے چھ آٹھ مہینے کی ہی بات ہے۔ پھر میں بھی ان کے پاس چلی جاؤں گی۔‘‘
پھر اس نے مجھے ایسی نظر سے دیکھا جیسے اسے شکایت ہو کہ میں نے اس کی اتنی نجی بات کیوں جان لی۔
’’آپ بعد میں اکیلی جائیں گی؟‘‘ میں نے پوچھا: ’’اس سے تو بہتر تھا کہ آپ ابھی ساتھ چلی

جاتیں......"

اس کے ہونٹ سکڑ گئے اور آنکھیں پھر اندر کو جھانکنے لگیں۔ وہ کچھ لمحے خود میں ڈوبی رہی اور اسی جذبے سے بولی: "ساتھ تو نہیں جاسکتی تھی کیونکہ اکیلے ان کے جانے کا بھی انتظام نہیں تھا۔ لیکن ان کو میں نے کسی طرح بھیج دیا ہے۔ چاہتی تھی کہ ان کی کوئی بھی خواہش مجھ سے پوری ہو جائے۔ ڈیڈی کی باہر جانے کی بہت خواہش تھی۔ اب چھ آٹھ مہینے میں اپنی تنخواہ میں سے کچھ پیسہ بچاؤں گی اور تھوڑا بہت کہیں سے قرض لے کر اپنے جانے کا انتظام کروں گی۔"

اس نے فکر میں غلطاں و پیچاں اپنی آنکھوں کو اچانک سنبھالا اور پھر کچھ لمحے شکایت بھری نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ پھر بولی: "ابھی بٹو بھی بہت چھوٹی ہے نا؟ چھ آٹھ مہینے میں یہ بڑی ہو جائے گی اور میں بھی تب تک تھوڑا اور پڑھ لوں گی۔ ڈیڈی کی بہت خواہش تھی کہ میں ایم۔ اے۔ کرلوں۔ مگر میں ایسی اجڈ اور ناکارہ ہوں کہ ان کی کوئی بھی خواہش پوری نہیں کر پاتی۔ اسی لیے اس بار انھیں بھیجنے کے لیے میں نے اپنے سب زیوارت بیچ دیئے ہیں۔ اب میرے پاس بس میری بٹو، اور کچھ نہیں۔" اور وہ بچّی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئی بھری بھری نگاہ سے اسے دیکھتی رہی۔

باہر وہی سنسان اندھیرا تھا، وہی لگاتار سنائی دیتا انجن کا پھک پھک! شیشے سے آنکھ ٹکا کر دیکھنے پر بھی دور تک ویرانہ ہی ویرانہ نظر آتا تھا۔

لیکن اس عورت کی آنکھوں میں جیسی دنیا بھر کی ہمدردی سمٹ آئی تھی۔ وہ پھر کئی ساعتوں تک خود میں ڈوبی رہی۔ پھر اس نے ایک سانس لی اور بچّی کو اچّھی طرح کمبل میں لپیٹ کر سیٹ پر سلادیا۔

بالائی برتھ پر لیٹا آدمی خرّاٹے بھر رہا تھا۔ ایک بار کروٹ بدلتے ہوئے وہ نیچے گرنے کو ہوا، لیکن اچانک ہڑبڑا کر سنبھل گیا۔ پھر کچھ ہی دیر میں وہ زیادہ زور سے خرّاٹے بھرنے لگا۔

"لوگوں کو جانے سفر میں کیسے اتنی گہری نیند آجاتی ہے!" وہ عورت بولی: "مجھے دو دو راتیں سفر کرنا ہو تو بھی میں ایک پل نہیں سو پاتی۔ اپنی اپنی عادت ہوتی ہے!"

"ہاں، عادت کی ہی بات ہے۔" میں نے کہا: "کچھ لوگ بہت آسودہ ہو کر جیتے ہیں اور کچھ ہوتے ہیں کہ........"

"بغیر فکر اور سوچ کے جی ہی نہیں سکتے۔" اور وہ ہنس دی۔ اس کی ہنسی کی آواز بھی بچّوں جیسی ہی تھی۔ اس کے دانت بہت چھوٹے اور چمکیلے تھے۔ میں نے بھی اس کی ہنسی میں ساتھ دیا۔

"میری بہت خراب عادت ہے" وہ بولی: "میں بنا مطلب سوچتی رہتی ہوں۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ میں سوچ سوچ کر پاگل ہو جاؤں گی۔ یہ مجھ سے کہتے ہیں کہ مجھے لوگوں سے ملنا جلنا چاہیے، کھل کر ہنسنا اور بات کرنا چاہیے، مگر ان کے سامنے میں ایسی گُم سُم ہو جاتی ہوں کہ کیا کہوں! ویسے اور لوگوں سے بھی میں زیادہ

بات نہیں کرتی لیکن ان کے سامنے ایسی چپی لگ جاتی ہے جیسے منھ میں زبان ہی نہ ہو.... اب دیکھیے نا اس وقت کیسے خوب بات کر رہی ہوں۔" اور وہ مسکرائی۔ اس کے چہرے پر ہلکا سا تکلف تھا۔

"راستہ کاٹنے کے لیے بات کرنا ضروری ہے" میں نے کہا: "خاص طور سے جب نیند آ رہی ہو۔"

اس کی آنکھیں پل بھر پھیلی رہیں۔ پھر وہ ذرا گردن جھکا کر بولی: "یہ کہتے ہیں کہ جس کے منھ میں زبان ہی نہ ہو، اس کے ساتھ پوری زندگی کیسے گزاری جا سکتی ہے؟ ایسے انسان اور پالتو جانور میں کیا فرق ہے؟ میں لاکھ چاہتی ہوں کہ انھیں خوش دکھائی دوں اور ان کے سامنے کوئی نہ کوئی بات کرتی رہوں، لیکن میری ساری کوششیں بے کار ہو جاتی ہیں۔ انھیں پھر غصہ آ جاتا ہے اور میں رو دیتی ہوں۔ انھیں میرا رونا بہت برا لگتا ہے۔" کہتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے جنھیں اس نے اپنی ساڑی کے پلّو سے پونچھ لیا۔

"میں بہت پاگل ہوں!" وہ پھر بولی: "یہ جتنا مجھے ٹوکتے ہیں، میں اتنا ہی زیادہ روتی ہوں۔ در اصل یہ مجھے سمجھ نہیں پاتے۔ مجھے بات کرنا اچھا نہیں لگتا، پھر جانے کیوں یہ مجھے بات کرنے کے لیے مجبور کرتے ہیں!" اور پھر پیشانی کو ہاتھ سے دباتے ہوئے بولی: "آپ بھی اپنی بیوی سے زبردستی بات کرنے کے لیے کہتے ہیں؟"

میں نے پیچھے ٹیک لگا کر کندھے سکیڑ لیے اور ہاتھ بغلوں میں دبائے، بتّی کے پاس اڑتے ہوئے کیڑے کو گھورنے لگا۔ پھر سر کو ذرا سا جھٹک کر میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ متجسّس نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"میں؟" میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "مجھے یہ کہنے کا کبھی موقع ہی نہیں ملتا۔ بلکہ پانچ سال سے میں یہ چاہ رہا ہوں کہ وہ ذرا کم بات کیا کرے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کئی بار انسان چپ رہ کر زیادہ بات کہہ سکتا ہے۔ زبان سے کہی گئی بات میں وہ رس نہیں ہوتا جو آنکھ کی چمک یا ہونٹوں کی کپکپی یا پیشانی کی ایک لکیر سے کہی گئی بات میں ہوتا ہے۔ میں جب اسے یہ سمجھانا چاہتا ہوں تو مجھے تفصیل سے بتا دیتی ہے کہ زیادہ بات کرنا انسان کے بے غرض اور بے لوث ہونے کا ثبوت ہے اور یہ کہ میں اتنے برسوں میں اپنے تئیں اس کے جذبات کو سمجھ نہیں سکا۔ وہ در اصل کالج میں لیکچرر ہے اور اپنی اس عادت کی وجہ سے گھر میں بھی لیکچر دیتی رہتی ہے۔"

"اوہ!" وہ تھوڑی دیر دونوں ہاتھوں سے اپنا منھ چھپائے رہی۔ پھر بولی، "ایسا کیوں ہوتا ہے، یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ مجھے دیشی سے یہی شکایت ہے کہ وہ میری بات نہیں سمجھ پاتے۔ میں کئی بار ان کے بالوں میں اپنی انگلیاں الجھا کر ان سے بات کرنا چاہتی ہوں، کئی بار ان کے گھٹنوں پر سر رکھ کر بند آنکھوں سے کتنا کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ لیکن انھیں یہ سب اچھا نہیں لگتا۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ سب گڑیوں کا کھیل ہے، ان کی بیوی کو جیتا جاگتا انسان ہونا چاہیے۔ اور میں انسان بننے کی بہت کوشش کرتی ہوں، لیکن نہیں بن پاتی، کبھی نہیں پاتی۔ انھیں میری کوئی عادت اچھی نہیں لگتی۔ میرا دل کرتا ہے کہ چاندنی رات میں کھیتوں میں گھوموں، ندی میں پیر ڈال کر گھنٹوں بیٹھی

رہوں، مگر یہ کہتے ہیں کہ یہ سب آئیڈیل من کی باتیں ہیں۔ انھیں کلب، موسیقی کی محفلیں اور ڈنر پارٹیاں اچھی لگتی ہیں۔ میں ان کے ساتھ وہاں جاتی ہوں تو میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ مجھے وہاں ذرا بھی اپنائیت محسوس نہیں ہوتی۔ یہ کہتے ہیں کہ تو پچھلے جنم میں مینڈکی تھی جو تجھے کلب میں بیٹھنے کے بجائے کھیتوں میں مینڈکوں کی آوازیں سننا زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے۔ میں کہتی ہوں کہ میں اس جنم میں بھی مینڈکی ہوں۔ مجھے برسات میں بھیگنا بہت اچھا لگتا ہے اور بھیگ کر میرا دل کچھ نہ کچھ گنگنانے لگتا ہے۔ حالانکہ مجھے گانا نہیں آتا۔ مجھے کلب میں سگریٹ کے دھوئیں میں گھٹ کر بیٹھے رہنا نہیں اچھا لگتا۔ وہاں میری جان گلے میں آنے لگتی ہے۔"

"آپ کچھ سوچ رہے ہیں؟" اس عورت نے اپنی بچی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

میں نے فوراً خود کو سنبھالا اور کہا: "ہاں، میں آپ ہی کی بات کے متعلق سوچ رہا تھا۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں جن سے بناوٹی و مصنوعی اخلاق و اطوار بہ آسانی نہیں اوڑھا جاتا۔ آپ بھی شاید انھی لوگوں میں سے ہیں۔"

"میں نہیں جانتی" وہ بولی: "مگر اتنا جانتی ہوں کہ میں بہت سے شناسا لوگوں کے بیچ خود کو اجنبی، بیگانہ اور بے جوڑ محسوس کرتی ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ مجھ میں ہی کچھ کمی ہے۔ میں اتنی بڑی ہو کر بھی وہ کچھ نہیں سمجھ بوجھ پائی جو لوگ کم عمری میں سیکھ جاتے ہیں۔ دیشی کا کہنا ہے کہ میں سماجی نقطۂ نظر سے مس فٹ ہوں۔"

"آپ بھی یہی سمجھتی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"کبھی سمجھتی ہوں، کبھی نہیں بھی سمجھتی" وہ بولی: "ایک خاص طرح کے سماج میں میں ضرور خود کو مس فٹ محسوس کرتی ہوں۔ مگر..... کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جن کے درمیان جا کر مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ شادی سے پہلے میں دو ایک بار کالج کی پارٹیوں میں پہاڑیوں پر گھومنے کے لیے گئی تھی۔ وہاں سب کو مجھ سے یہی شکایت تھی کہ میں جہاں بیٹھ جاتی ہوں وہیں کی ہو رہتی ہوں۔ مجھے پہاڑی بچے بہت اچھے لگتے تھے۔ میں ان کے گھر کے لوگوں سے بھی بہت جلدی دوستی کر لیتی تھی۔ ایک پہاڑی خاندان مجھے آج بھی یاد ہے۔ اس خاندان کے بچے مجھ سے اتنے گھل مل گئے تھے کہ میں بڑی مشکل سے انھیں چھوڑ کر ان کے یہاں سے رخصت ہوئی تھی۔ میں کُل دو گھنٹے ان کے پاس رُکی تھی۔ دو گھنٹے میں میں نے انھیں نہلایا دھلایا بھی، ان کے ساتھ کھیلتی بھی رہی۔ بہت ہی اچھے بچے تھے وہ۔ ہائے، ان کے چہرے اتنے لال تھے کہ کیا کہوں! میں نے ان کی ماں سے کہا کہ: وہ اپنے چھوٹے لڑکے کشنو کو میرے ساتھ بھیج دے۔ وہ ہنس کر بولی کہ: تم سبھی کو لے جاؤ، یہاں کون ان کے لیے موتی رکھے ہیں! یہاں تو دو سال میں ان کی ہڈیاں نکل آئیں گی، وہاں کھا پی کر اچھے تو رہیں گے۔ مجھے اس کی بات سن کر رونا آنے لگا۔ میں اکیلی ہوتی، تو شاید کئی دنوں کے لیے ان لوگوں کے پاس رہ جاتی۔ ایسے لوگوں میں جا کر مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ اب تو آپ کو بھی لگ رہا ہوگا کہ کتنی عجیب ہوں میں! یہ کہا کرتے ہیں کہ مجھے کسی اچھے ماہر نفسیات سے اپنا چیک اپ کرانا چاہیے۔ نہیں تو کسی دن میں پاگل ہو کر پہاڑوں میں بھٹکتی پھروں گی!"

"یہ تو اپنے اپنے مزاج اور طبیعت کی بات ہے" میں نے کہا: "مجھے خود پرانے سنگ کاروں کے لوگوں کے درمیان رہنا بہت اچھا لگتا ہے۔ میں آج تک ایک جگہ گھر بنا کر نہیں رہ سکا اور نہ ہی امید ہے کہ کبھی رہ سکوں گا۔ مجھے اپنی زندگی کی جو رات سب سے زیادہ یاد آتی ہے، وہ رات میں نے پہاڑی گوجروں کی ایک بستی میں بتائی تھی۔ اس رات اس بستی میں ایک شادی تھی، اس لیے ساری رات وہ لوگ شراب پیتے اور ناچتے گاتے رہے۔ مجھے بہت حیرانی ہوئی جب مجھے بتایا گیا کہ وہ گوجر دس روپے کے لیے آدمی کا خون بھی کر دیتے ہیں!"

"آپ کو سچ مچ اس طرح کی زندگی اچھی لگتی ہے؟" اس نے کچھ تعجب اور حیرانی سے پوچھا۔

"آپ کو شاید خوشی ہو رہی ہے کہ پاگل ہونے کی امیدوار آپ اکیلی ہی نہیں ہیں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ وہ بھی مسکرائی۔ اس کی آنکھیں اچانک وفورِ جذبات سے بھر اٹھیں۔ اس ایک لمحے میں اس کی آنکھوں میں نہ جانے کتنا کچھ دکھائی دیا۔ رحم، درد، ممتا، عزت، پشیمانی، ڈر، تذبذب اور شفقت! اس کے ہونٹ کچھ کہنے کے لیے کانپے، لیکن کانپ کر ہی رہ گئے۔ میں چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ کچھ لمحوں کے لیے مجھے محسوس ہوا کہ میرا دماغ بالکل خالی ہے اور مجھے پتا نہیں کہ میں کیا کہہ رہا تھا اور آگے کیا کہنا چاہتا تھا۔ دفعتاً اس کی آنکھوں میں وہی سونا پن نمودار ہونے لگا اور پل بھر میں ہی وہ اتنا بڑھ کر پھیل گیا کہ میں نے اس کی طرف سے آنکھیں ہٹا لیں۔

بتی کے پاس اڑتا کیڑا اس سے چپک کر جھلس گیا تھا۔

بچی نیند میں مسکرا رہی تھی۔

کھڑکی کے شیشے پر اتنی دھند جم گئی تھی کہ اس میں اپنا چہرہ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔

گاڑی کی رفتار دھیمی ہو رہی تھی کوئی اسٹیشن آ رہا تھا۔ دو ایک بتی تیزی سے نکل گئی۔ میں نے کھڑکی کا شیشہ اٹھا دیا۔ باہر سے آتی برفانی ہوا کے جھونکوں نے میرے اعصاب کو تھوڑا سا سنبھال دیا تھا۔ گاڑی ایک بہت نیچے پلیٹ فارم پر آ کر کھڑی ہو رہی تھی۔

"یہیں کہیں تھوڑا پانی مل جائے گا؟"

میں نے چونک کر دیکھا کہ وہ اپنی ٹوکری سے کانچ کا گلاس نکال کر غیر یقینی کے ساتھ ہاتھ میں لیے ہوئے ہے۔ اس کے چہرے کی لکیریں پہلے سے زیادہ گہری ہو گئیں تھیں۔

"پانی آپ کو پینے کے لیے چاہیے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ قلی کروں گی اور پیوں گی بھی .... نہ جانے کیوں ہونٹ کچھ چپک سے رہے ہیں، باہر اتنی سردی ہے پھر بھی۔"

"دیکھتا ہوں اگر یہاں کوئی نل ول ہو تو .... "

میں نے گلاس اس کے ہاتھ سے لیا اور جلدی سے پلیٹ فارم پر اتر گیا۔ نہ جانے کتنا منحوس اسٹیشن تھا کہ کہیں کوئی انسان نظر نہ آ رہا تھا۔ پلیٹ فارم پر پہنچتے ہی ہوا کے جھونکوں کی وجہ سے ہاتھ پیر شل ہونے

لگے۔ میں نے کوٹ کے کالر اونچے کر لیے۔ پلیٹ فارم کے جنگلے کے باہر سے پھیل کر اوپر آئے دو ایک پیڑ ہوا میں سرسرا رہے تھے۔ انجن کے بھاپ چھوڑنے سے لمبی شوؤں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ شاید گاڑی وہاں سگنل نہ ملنے کی وجہ سے رک گئی تھی۔

دو رکئی ڈبے پیچھے ایک نل دکھائی دیا تو میں تیزی سے اس کی طرف چل پڑا۔ اینٹوں کے پلیٹ فارم پر جوتے کی آواز مجھے بہت عجیب معلوم ہوئی۔ میں نے چلتے چلتے گاڑی کی طرف دیکھا۔ کسی کھڑکی سے کوئی چہرہ باہر نہیں جھانک رہا تھا۔ میں نل کے پاس جا کر گلاس میں پانی بھرنے لگا۔ تبھی ہلکی سی سیٹی دے کر گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ چل پڑی۔ میں بھرا ہوا پانی کا گلاس لیے اپنے ڈبے کی طرف دوڑا۔ دوڑتے ہوئے مجھے لگا کہ میں اس ڈبے تک نہیں پہنچ پاؤں گا اور سردی میں اس اندھیرے اور سنسان پلیٹ فارم پر ہی مجھے بغیر سامان کے رات بتانا ہوگی۔ یہ سوچ کر میں اور تیز دوڑنے لگا۔ کسی طرح اپنے ڈبے کے برابر پہنچ گیا۔ دروازہ کھلا تھا اور وہ دروازہ کے پاس کھڑی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر گلاس مجھ سے لے لیا۔ فٹ بورڈ پر چڑھتے ہوئے ایک بار میرا پیر ذرا سا پھسلا، مگر اگلے ہی پل سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ انجن تیز ہونے کی کوشش میں ہلکے ہلکے جھٹکے دے رہا تھا اور اینٹوں کے پلیٹ فارم کی جگہ اب غیر واضح گہرائی دکھائی دینے لگی تھی۔

''اندر آجائیے......اس کے یہ لفظ سن کر مجھے احساس ہوا کہ مجھے فٹ بورڈ سے آگے بھی کہیں جانا ہے۔ ڈبے کے اندر قدم رکھا تو میرے گھٹنے ذرا ذرا کانپ رہے تھے۔

اپنی جگہ پر آ کر میں نے ٹانگیں سیدھی کر کے پیچھے ٹیک لگالی۔ کچھ دیر بعد آنکھیں کھولیں تو لگا کہ وہ اس درمیان منھ دھو آئی ہے۔ پھر بھی اس کے چہرے پر پژمردگی سی چھا رہی تھی۔ میرے ہونٹ خشک ہو رہے تھے پھر بھی میں ذرا سا مسکرایا۔

''کیا بات ہے آپ کا چہرہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں کتنی منحوس ہوں!...... کہہ کر اس نے اپنا نچلا ہونٹ ذرا سا کاٹ لیا۔

''کیوں؟''

''ابھی میری وجہ سے آپ کو کچھ ہو جاتا.........'

''یہ خوب سوچا آپ نے!''

''نہیں، میں ہوں ہی ایسی......'' وہ بولی، زندگی میں ہر ایک کو دکھ ہی دیا ہے۔ اگر کہیں آپ نہ چڑھ پاتے.........''

''تو؟''

''تو؟'' اس نے ہونٹ ذرا سکیڑے، ''تو مجھے پتا نہیں...... لیکن''

اس نے خاموش رہ کر آنکھیں جھکا لیں۔ میں نے دیکھا کہ اس کی سانس تیز تیز چل رہی

ہے۔میں نے محسوس کیا کہ حقیقی مصیبت کے مقابلے خیالی مصیبت کتنی سنگین اور خطرناک ہوتی ہے۔شیشے کھلے رہنے کی وجہ سے کھڑکی سے سرد ہوا آرہی تھی۔ میں نے شیشے کھینچ کر نیچے کردیے۔

''آپ کیوں گئے تھے پانی لانے کے لیے؟ آپ نے منع کیوں نہیں کردیا؟'' اس نے پوچھا۔

اس کے پوچھنے کے لہجے سے مجھے ہنسی آگئی۔

''آپ ہی نے تو کہا تھا.... 'میں بولا

''میں تو بیوقوف ہوں کچھ بھی کہہ دیتی ہوں۔آپ کو تو سوچنا چاہیے تھا۔''

''اچھا، میں اپنی غلطی مان لیتا ہوں۔''

اس سے اس کے مرجھائے ہوئے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

''آپ بھی کہیں گے کیسی لڑکی ہے!'' اس نے اندرونی جذبے سے کہا۔

''سچ کہتی ہوں مجھے ذرا عقل نہیں ہے۔اتنی بڑی ہوگئی ہوں، لیکن ذرہ برابر نہیں ہے.... سچ!''

میں پھر ہنس دیا۔

''آپ ہنس کیوں رہے ہیں؟'' اس کی آواز میں پھر شکایت کا انداز تھا۔

''مجھے ہنسنے کی عادت ہے!'' میں نے کہا۔

''ہنسنا اچھی عادت نہیں ہے۔''

مجھے اس پر پھر ہنسی آگئی۔

وہ شکایت بھری نظر سے مجھے دیکھتی رہی۔

گاڑی کی رفتار پھر تیز ہوگئی تھی۔اوپر کی برتھ پر لیٹا آدمی دفعتاً ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور زور زور سے کھانسنے لگا۔کھانسی کا دورا ختم ہونے پر اس نے کچھ دیر سینے کو ہاتھ سے دبائے رکھا، پھر بھاری آواز میں پوچھا: ''کیا بجا ہے؟''

''پونے بارہ''۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔

''کُل پونے بارہ؟'' اس نے مایوسانہ لہجے میں کہا اور پھر دراز ہوگیا۔کچھ ہی دیر میں وہ پھر خراٹے لینے لگا۔

''آپ بھی تھوڑی دیر سو جایئے۔'' وہ پیچھے ٹیک لگائے شاید کچھ سوچ رہی تھی یا صرف دیکھ رہی تھی۔

''آپ کو نیند آرہی ہے آپ سو جایئے'' میں نے کہا۔

''میں نے آپ سے کہا تھا نا، مجھے گاڑی میں نیند نہیں آتی۔آپ سو جایئے۔''

میں نے لیٹ کر کمبل لے لیا۔میری آنکھیں دیر تک اوپر کی بتی کو دیکھتی رہیں جس کے ساتھ جھلسا

ہوا کیڑا چپک کر رہ گیا تھا۔

"رضائی بھی لے لیجیے کافی ٹھنڈ ہے۔" اس نے کہا۔

"نہیں، ابھی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے بہت سے گرم کپڑے پہنے ہیں۔"

"لے لیجیے، نہیں تو بعد میں ٹھٹھرتے رہیے گا۔"

"نہیں ٹھٹھروں گا نہیں" میں نے کمبل گلے تک لپیٹتے ہوئے کہا: "اور تھوڑی ٹھنڈ محسوس ہوتی رہے تو اچھا لگتا ہے۔"

"بتی بجھا دوں؟" کچھ دیر بعد اس نے پوچھا۔

"نہیں رہنے دیجیے۔"

"نہیں بجھا دیتی ہوں، ٹھیک سے سو جائیے۔" اور اس نے اٹھ کر بتی بجھا دی۔ میں کافی دیر اندھیرے میں چھت کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر مجھے نیند آنے لگی۔

شاید رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی جب انجن کی سیٹی کی آواز سے میری نیند کھلی۔ وہ آواز کچھ ایسی بھاری تھی کہ میرے سارے جسم میں ایک جھرجھری سی بھر گئی۔ پچھلے کسی اسٹیشن پر انجن بدل گیا تھا۔

گاڑی دھیرے دھیرے چلنے لگی، تو میں نے سر تھوڑا اونچا اٹھایا۔ سامنے کی سیٹ خالی تھی۔ وہ عورت نہ جانے کس اسٹیشن پر اتر گئی تھی۔ اسی اسٹیشن پر نہ اتری ہو، یہ سوچ کر میں نے کھڑکی کے شیشے اٹھا دیے اور باہر دیکھا۔ پلیٹ فارم بہت پیچھے رہ گیا تھا اور بتیوں کی قطار کے سوا کچھ صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے شیشے پھر نیچے کھینچ لیے۔ اندر کی بتی اب بھی بجھی ہوئی تھی۔ بستر میں نیچے کو سرکتے ہوئے میں دیکھا کہ کمبل کے علاوہ میں اپنی رضائی بھی لیے ہوں جسے اچھی طرح کمبل کے ساتھ ملا کر دیا گیا ہے۔ گرمی کی کئی ایک سہرنیں ایک ساتھ جسم میں بھر گئیں۔ اوپر کی برتھ پر لیٹا آدمی اب بھی اسی طرح زور زور سے خراٹے لے رہا تھا۔

☆☆☆

(۳)

فائٹر پائلٹ

● ہمایوں جمیل

● اردو: شرجیل احمد خاں

اُس نے آسمان کی طرف مایوسی سے دیکھا۔ گھنے بادل آسمان میں گھر آئے تھے اُنھوں نے کفن کی طرح سورج کو چاروں طرف سے ڈھک لیا تھا جس کی سلوٹوں سے سورج کی کرنیں باہر نکل نہیں پا رہی تھیں بھری دوپہر میں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ شام آ گئی۔

اُس دن تیز بارش نہیں ہوئی تھی صرف ہلکی پھواریں، پانی کی ننھی ننھی بوندیں اُس کے گھنے بالوں اور ہاتھوں کے روؤں پر اٹی پڑی تھیں۔ کپڑے ابھی بھیگے نہیں تھے لیکن گیلا پن جیسے ہڈیوں میں سما گیا تھا۔ آسمان میں ہیلی کوپڑ اسی طرح چکر کاٹ رہے تھے جیسے بیابان میں شکار کی تلاش میں عقاب چکر کاٹتے ہیں۔ لیکن یہ نہ تو کوئی بیابان تھا اور نہ یہاں کسی عقاب کو شکار کی تلاش۔ دراصل یہ ابھی ابھی تیج پور ایرفورس اسٹیشن کی سرحد میں داخل ہوا تھا۔ آسمان میں اُڑتے ہوئے ہیلی کوپٹر گم شدہ مگ (Mig) کی تلاش میں تھے۔

اُس کے ساتھ چل رہے سرجنٹ کی عمر ۲۲-۲۰ سے زیادہ نہیں ہوگی۔ فوج کی نوکری نے ابھی تک اس کے چہرے پر وہ گہری لکیریں پیدا نہیں کی تھیں جو ایک فوجی کو عام آدمی سے الگ کرتی ہیں۔ وہ آج صبح ایرفورس اسٹیشن کے گیٹ پر اُسے لینے آیا تھا۔ وہاں سے وہ سیدھے گیسٹ ہاؤس گئے۔ اپنا سامان گیسٹ ہاؤس و جئے ہانڈا سے ملنے جا رہا تھا۔ گمشدہ مگ کا پائلٹ اسکواڈرن لیڈر تبریز خاں اُس کا چھوٹا بھائی تھا۔

مگ کی گمشدگی کی خبر نے پورے اسکواڈرن میں غم کی لہر دوڑادی تھی۔ اسکواڈرن کا پورا عملہ حرکت میں آ گیا تھا۔مگ کی تلاش زور شور سے شروع ہو گئی تھی۔ کمانڈر آفس کی ٹیلی فون کی گھنٹی برابر بج رہی تھی۔ پولس الرٹ تھی۔ ہیلی کوپٹر تلاش میں چکر کاٹ رہے تھے۔ایرفورس کا اسچنج آفس کالوں کی بہتات سے جام ہو گیا تھا۔ یہ سب کال مگ حادثہ ہی سے تعلق رکھتے تھے۔

''آپ کا سفر کیسا رہا؟'' آفس سے کا استقبال کرتے ہوئے .C.O نے پوچھا، جواب کا انتظار کئے بغیر اُس نے مزید کہا: ''مجھے افسوس ہے کہ صبح آپ کو لینے اسٹیشن کوئی نہیں جا سکا۔'' اُسے وجئے بانڈا کی اس وقت رسمی باتیں اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔ وہ بھائی کی خیریت جاننے کے لیے بے چین تھا، شاید وہ کوئی بڑی مصیبت میں پھنس گیا ہو۔ شاید اب بھی مدد کی کوئی گنجائش ہو۔

''.C.O صاحب تبریز کی مگ (Mig) کا کوئی پتہ چلا؟''

اُس نے گروپ کیپٹن بانڈا کی طرف دیکھتے ہوئے بے چینی سے پوچھا۔ ''جی نہیں ابھی تک تو کوئی سراغ نہیں ملا ہے۔ ایئر فورس کے ہیلی کوپٹر کل سے علاقے کا دورہ کر رہے ہیں لیکن جائے حادثہ کی نشان دہی نہیں کی جا سکی ہے۔'' اُن کا سپاٹ جواب تھا۔

بعد میں .C.O نے حادثہ کے متعلق اُسے تفصیل سے بتایا: دولڑاکو مگ (Mig) Air Combat exercise میں شامل تھے پہلا Combat جو دفائی رول میں تھا، Base پر خیریت سے لوٹ آیا تھا۔لیکن پیچھا کرنے والے جہاز کا کوئی اتا پتہ نہیں لگا۔ اس جہاز پر Sqdr، Lead er تبریز خاں ایک Trainee پائیلٹ کو Combat ٹریننگ دے رہے تھے۔شیلانگ کے ٹائیگر ہل (Tiger Hill) پر قائم رڈار پر وہ دس بج کر پانچ منٹ تک تھا، پھر اچانک پردے سے غائب ہو گیا Protocol کے مطابق آگے جانے والے جہاز کو پیچھے آتے ہوئے جہاز کی خیریت لے کر ہی واپس آنا چاہئے تھا۔لیکن یہ ایک Training اُڑان تھی۔ شعبہ جاتی جانچ میں ایسی کئی خامیاں سامنے آنے والی تھیں۔

''ہمالیہ کی ترائی کا یہ علاقہ بہت ہی خطرناک ہے۔ گھنے جنگلوں میں حادثہ شدہ Mig کا پتہ چلانا، رائی میں سوئی ڈھونڈنے جیسا ہے CO نے اُس کو صحیح حالات سے واقف کرانے کی کوشش کی۔

''لیکن جنگلوں میں چھان بین کے لئے فوج کی مدد تو لی جا سکتی تھی'' وہ ابھی حالات سے سمجھوتہ کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ ''آپ اندازہ نہیں لگا سکتے یہاں کے جنگل کتنے گھنے اور خوفناک ہیں۔ ایک کیلو میٹر کی چھان بین میں ایک ہفتے کا وقت لگ سکتا ہے۔''

''ضروری تو نہیں کہ جہاز کریش کر گیا ہو، شاید تبریز ہندوستانی سرحد سے باہر نکل گیا ہو، اور پڑوسی ملک نے مداخلت کر کے اپنے کسی Base پر اتار لیا ہو'' وہ ابھی تک پر اُمید تھا۔

''ہماری معلومات کے مطابق ایسی کوئی بات ممکن نہیں ہے، .C.O نے اپنی صفائی دی۔ لیکن یہ علاقہ

انتہائی مشکل ہے تو آپ کریش (Crash) کی جگہ کیسے ڈھونڈھ پائیں گے۔'' اس نے مایوسی کا اظہار کیا۔

"Combat exercise" کے دوران دونوں جہازوں کا ہوائی راستہ رڈار کے Data سے معلوم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس سے ہم ممکنہ حادثہ کے دائرے کو چھوٹا کر سکتے ہیں اور اس طرح Combing Oparation کم سے کم وقت سے پورا کیا جا سکتا ہے''۔ C.O اپنا پلان سمجھا رہا تھا۔

''کتنے دنوں میں کریش کی جگہ پہنچنے کی اُمید کی جا سکتی ہے'' اُس کی آواز میں اب مخالفت کا کوئی جز باقی نہیں بچ رہا تھا''

''کہنا مشکل ہے، شائد دو تین ہفتے یا شائد اور زیادہ'' گروپ کیپٹن وجے ہانڈا نے کہا۔

''اس طرح تو بہت دیر ہو جائے گی'' وہ مایوسی سے بولا۔ ایئر ہیڈ کوارٹر سے تھرمل امیجنگ thermal Imaging کا آلہ منگانے کی کوشش کی جا رہی ہے، گمشدہ جہاز میں ممکن ہے تیل کی ٹنکی بھری ہو۔ تھرمل امیجنگ آلہ کی وجہ سے ایندھن میں بھیانک آگ لگ جاتی ہے اور وہاں حرارت کا درجہ بہت بڑھ جاتا ہے۔ اس طرح حادثہ کی جگہ کا ٹھیک ٹھیک پتہ لگ سکتا ہے۔ اگر آلہ (Thermal Imaging) آ گیا تو ہم کریش کی جگہ کا پتہ لگا لیں گے۔'' C.O نے اسے امید دلائی۔

کل ہی کی تو بات ہے، چھٹی کا دن تھا۔ وہ بستر پر لیٹا تھا شاید اُس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ تبھی فون کی تیز گھنٹی کی آواز سے وہ بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ فون تبریز کی بیوی کا تھا۔ وہ اپنے بچوں کے ساتھ اپنے میکے دہرہ دون میں تھی۔ وہ اُس وقت بہت پریشان تھی۔

''بھیا، تھوڑی دیر پہلے ایئر فورس کے C.O کا فون آیا تھا۔ آج تبریز کی Combat اُڑان کے بعد اُس کا جہاز اڈے پر نہیں پہنچا'' اتنا کہتے کہتے زہرہ (تبریز کی بیوی) کی آواز رندھ گئی۔ ایک ایئر فورس افسر کی بیوی ہونے کی حیثیت سے وہ ان حالات کا مطلب خوب سمجھتی تھی۔

''گھبراؤ نہیں۔ تبریز کو فلائیٹ کا کافی تجربہ ہے۔ ہو سکتا ہے۔ اُسے کسی دوسرے Base پر ایمرجنسی لینڈنگ کرنی پڑی ہو۔ وہ جلدی لوٹ آئے گا۔ اور دیکھو تم ہمت سے کام لو ورنہ تمھیں پریشان دیکھ کر بچے بھی گھبرا جائیں گے۔'' اُس نے زہرہ کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن بات تو گھبرانے والی ہی تھی۔ اگر تبریز کسی دوسرے Base پر ایمرجنسی لینڈنگ کرتا، تو اس کی خبر ابھی تک تیج پور پہنچ جاتی۔ اگر Combat اُڑان کے دوران اُس کا جہاز ہندوستان کی سرحد کے پار چین پہنچ گیا ہو اور چینی ایئر فورس کے حملے نے پوچھ گچھ کے لئے اُسے قید کر لیا ہو؟ لیکن امید کی یہ بہت دھندلی تصویر تھی۔ جہاز کے کریش ہونے کا اندیشہ قوی تھا۔ کیا کریش ہونے کے قبل اسے bailout ہونے کا موقع ملا ہوگا؟ اگر ہاں، تو وہ ابھی کہاں ہے۔ کن حالات میں ہے اُس کے دماغ کی رگ میں تناؤ پیدا ہو گیا۔ ان حالات میں وہ مزید کچھ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ فون رکھنے کے پہلے اس نے زہرہ کو تسلی دی: ''تم اپنا خیال رکھنا اور C.O سے تبریز کے متعلق ضروری معلومات حاصل کرتی رہنا۔

آج میں ایرفورس اسٹیشن کے لئے روانہ ہو رہا ہوں۔'' اُس رات وہ گوہاٹی کی ٹرین پر سوار ہو گیا تھا۔ ٹرین بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ برتھ پر بیٹھے بیٹھے کبھی اس کی آنکھ لگ جاتی کبھی وہ گھبرا کر جاگ جاتا، پتہ چلانا مشکل تھا کہ کتنی رات باقی ہے۔

ٹرین کی چال میں ایک لے تھی اور آواز میں ایک تال............وہ ایک چھوٹا سا بچہ تھا جو اپنے بستر پر پڑا تھا۔ ماں بھی کہیں قریب لیٹی تھی، پاس بیٹھا تبریز جذباتی انداز میں کچھ پوچھ رہا تھا۔ اس کی آواز میں ہمیشہ کی طرح کسی بات کی جلدی تھی۔ تبریز عمر میں اس سے دو سال چھوٹا تھا۔ چھوٹا بھائی کم دوست زیادہ تھا۔ مشترک بچپن تھا، مشترک یادیں تھیں۔ دنیا کی ہر چیز دونوں میں مشترک تھی۔ ایک ہی سائیکل میں وہ ڈبل رائیڈنگ کرتے تھے، اسکول جاتے تھے۔ ایک ہی بستر پر سوتے تھے۔ ساتھ کھیلتے تھے اور جب محلّے کے بچّوں سے جھگڑا ہوتا، دونوں مل کر مورچہ سنبھالا کرتے تھے۔ حد تو یہ تھی کہ نوجوانی میں ایک لڑکی سے عشق ہوا تو ایک دوسرے کی خاطر کسی نے شادی نہیں کی۔

ٹرین کا آہنگ ٹوٹ گیا تھا۔ رات میں ڈراونی آواز نکالتے ہوئے جھٹکے لے لے کر ٹرین آگے بڑھ رہی تھی۔ یہ ریل گاڑی نہیں ایک ٹائم مشین تھی جو زمان و مکاں کی حدوں کو توڑتی ہوئی کہیں دور نکل گئی تھی۔ ماضی کے واقعات ایک ایک کر کے اُس کی نظروں کے سامنے سے کچھ اس طرح گزر رہے تھے جیسے کسی فلم کا ٹریلر ہو۔

اسکول میں گرمی کی چھٹی ہو چکی تھی۔ ماں سب کو لے کر نانی کے گھر آئی ہوئی تھیں۔ نانی ایک سیدھی سادی دراز قد خاتون تھیں، خوش مزاج اور زندگی سے بھرپور جیسا کہ اکثر گاؤں کے لوگ ہوا کرتے ہیں۔ جب وہ خوش ہو کر ہنستیں تو ان کا جسم زور زور سے کچھ اس طرح ہلتا جیسے بچّے بیر کے درخت کی شاخوں کو ہلاتے ہیں۔ ننہیال میں بڑا مزہ آتا تھا۔ نانی کے آم کے بہت سارے باڑ تھے۔ گرمی کے دنوں میں گھر مختلف قسم کے آموں سے بھر جاتا۔ پیلے پیلے ہلکے چھلکے والے خوشبودار زرد آلود گدّے دار مالدہ جس میں گٹھلی صرف نام کی ہوتی تھی۔ دل لبھانے والے بمبئیا جس کے رس دار گودے کا مزہ روح کو تازہ کر دیتا اور سدا بہار بیجو جو سب سے پہلے آتا اور آم کے موسم کے آخر تک رہتا۔

اس سال گرمیوں کی چھٹی میں خاصی مصروفیت تھی۔ عید کی تقریب اور رمضان کے روزے تھے۔ نماز کی پابندی بڑوں کے لئے اور عید کی خوشیاں بچّوں کے حصے میں آئیں۔ نئے نئے کپڑے لذیذ سویاں، طرح طرح کے کھلونے، گلابی دھنیا اور پیسوں سے بھرے ہوئے بڑے بچّوں کی چھوٹی سے دنیا میں دل لبھانے کے کتنے سامان تھے۔

نانی اپنے سبھی پوتے اور ناتی کے لئے کپڑے سلوا رہی تھیں۔ لڑکوں کے لئے کلی دار کرتا اور پاجامہ، لڑکیوں کے لئے کپڑے کے بہت سے اقسام تھے۔ شلوار جمپر، گھا گھرا چولی، غرارہ، شرارہ وہ بھی چوڑی دار .... اللہ جانے اور کیا کیا۔ بچّوں میں ایک ہوڑ سی لگ گئی تھی۔ ہر بچہ سب سے شاندار دکھنا چاہتا تھا۔

لیکن ایک پریشانی تھی۔ تبریز کی پسند۔ سب بچّوں سے الگ تھی۔ اسے تو بوتل گرین ملیٹری یونی

فارم Uniform سلوائی تھی، لیک وغیرہ کے ساتھ دس سال کے بچے کے لئے یہ ایک انوکھی پسند تھی۔ خاندان کے بڑے بوڑھوں کے بیچ اس بات پر ایک زوردار بحث چھڑ گئی۔ کیا عید کے موقعہ پر ملیٹری یونیفارم ایک مناسب پہناوا ہے؟ کیا اس پوشاک میں عید کی نماز پڑھی جاسکتی ہے؟

تبریز کسی سمجھوتہ کے لے تیار نہیں تھا۔ فوجی بننے کا شوق اسے بہت ہی چھوٹی عمر سے تھا۔ اس خاص موقعہ پر وہ ملیٹری لباس ہی سلوانا چاہتا تھا۔ نانی نے سمجھا بجھا کر سب کو راضی کر لیا۔ تبریز کو جو چاہئے تھا مل گیا۔ وہ ملیٹری لباس پہن کر عید کی نماز پڑھنے گیا۔ اور وہاں سے لوٹ کر نانا کی دونالی بندوق لے کر فوجی آن بان کے ساتھ اپنی تصویر کھنچوائی۔

فلم کا ٹیریلر جاری تھا۔ آنکھوں کے سامنے اب دوسرا منظر تھا۔ وہ ڈرائینگ روم میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ صبح کا وقت تھا۔ ہوا میں ٹھنڈک تھی زندگی گویا ایک ریل گاڑی تھی جو اسٹیشن سے چھوٹتے ہی ایک مستقل رفتار پر آگے بڑھ رہی تھی۔ ہر ایک اگلا دن گزرے ہوئے دن کے مماثل تھا۔ تبریز N.D.A کے امتحان میں کامیاب ہو گیا۔ اُس کا پہلا تقرر کلائی کنڈہ ایرفورس میں ہوا۔ وہ خود کامیاب ہو کر بینک میں Probation افسر بحال ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب طلبا ہر وہ امتحان دیتے جس میں نوکری ملنے کی تھوڑی سے بھی گنجائش ہوتی۔ وہ اس وقت تک امتحان دیتے رہتے۔ جب تک اُن کی ناؤ پار نہیں لگ جاتی۔ طلبا اکثر ریاضی کا مضمون اکسڑا رکھتے تھے۔ تاکہ وہ میڈیکل میں داخلہ لینے کے علاوہ انجینیرنگ کا امتحان بھی دے سکیں۔ وقت کا یہی تقاضہ تھا۔ نوکری کوئی بھی اچھی تھی جو گھر کے افراد کو پیٹ بھرنے کا سامان مہیا کردے، دن میں تین بار اور ہفتہ میں سات دن۔

اچانک اس کی نظر اخبار کے پہلے صفحہ کے حاشیے پر چھپی ایک خبر پر پڑی ’’مگ۔۲۱ حادثہ کا شکار‘‘ اُس کے دل کی دھڑکن جیسے رُک گئی۔ تبریز ایرفورس کے روسی Stream میں تھا۔ وہ کلائی کنڈا میں مگ ہی اڑاتا تھا۔ اُس نے جلدی سے پوری خبر پڑھی۔ حادثہ ہندوستان اور بنگلہ دیش کی سرحد پر ہوا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اخبار میں حادثہ کا شکار پائلٹ کا نام بھی شائع ہوا تھا۔ اُس کا اندیشہ سچ ثابت ہوا۔ وہ تبریز ہی تھا۔ خبر کے مطابق تبریز بری طرح زخمی ہو گیا تھا۔ اور اسپتال میں I.C.U میں زیر علاج تھا۔

اُس نے بڑی سرعت سے کام کیا تھا۔ اپنے والد کو اس حادثہ کی خبر نہیں دی اور خود دفتر سے چھٹی لے کر کلائے کنڈا پہنچ گیا۔ ایرفورس اسٹیشن کے گیٹ پر گارڈ کھڑے تھے۔ گارڈ نے اُسے کچھ دیر انتظار کرنے کو کہا۔ اُن دنوں تبریز کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ وہ بیچلر کوارٹر میں رہتا تھا۔ اُس کے آنے کی خبر Squadron کو دے دی گئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر تبریز مسکراتا ہوا پہنچا۔ وہ ٹھیک ٹھاک تھا۔

اخبار کی خبر غلط نہیں تھی۔ اڑان کے دوران تبریز کے جہاز کا انجن بند ہو گیا تھا۔ انجن کو پھر سے فعال بنانے کی ہر کوشش ناکام ہو گئی تھی، بالکل آخری وقت میں تبریز نے جہاز سے Bail Out کیا تھا۔ یہ ایک Textbook exercise تھا۔ کہانی میں اور بھی موڑ تھے۔ بہت ہی تشویشناک واقعات آنے باقی تھے۔

تبریز کا پیراشوٹ ہندوستان اور بنگلہ دیش کی سرحد پر ایک دھان کے کھیت میں گرا تھا۔مگ کریش کے دھماکے نے گاؤں والوں کو خبر دار کر دیا تھا۔ کچھ گاؤں والوں نے پیراشوٹ کو گرتے ہوئے دیکھا بھی تھا۔ نیچے گرنے کے بعد جب تبریز پیراشوٹ کی ڈور سے اپنے کو الگ کر رہا تھا، گاؤں والے اس کے چاروں جانب جمع ہونے لگے۔ گاؤں والے اسے بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ کسی نے اس کے یونیفارم Uniform میں لگا افسر کا نیم پلیٹ زور سے پڑھا۔ نیم پلیٹ میں جلی حروف میں ''فلائیٹ آفیسر تبریز خان'' لکھا ہوا پڑھا ،اچانک وہ شخص زور زور سے چلایا: ارے یہ شخص تو پاکستانی ہے۔ یہ نام خان! مارو سالے کو مارو......

بھیڑ پاس آنے لگی ۔ ماحول گرم ہونے لگا۔ کچھ لوگوں نے پیچھے بھاگ کر اپنے کو لاٹھی اور ہنسوا سے لیس کر لیا۔ وہ تشدد کے موڈ میں آگے بڑھ رہے تھے۔ تبریز کو حالات کی سنگینی سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ وہ خود کو سنبھالتے ہوئے انھیں سمجھانے کی کوشش کرنے لگا: دیکھو بھائی گھس پیٹھ نہیں ہوں ،میں ہندوستانی ایر فورس کا ایک افسر ہوں۔'' لیکن اس کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس کا نام اس کے پاکستانی ہونے کا جھوٹا ثبوت دے رہا تھا۔ پاکستانی جاسوس کا بھلا کون یقین کرے۔ لوگ اسے سنگ سار کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اسے جلد ہی خطرے سے باہر ہونے کا راستہ بھی ڈھونڈ نا تھا۔

اچانک اسے پیراشوٹ کے سیفٹی کٹ safety kit میں رکھے ہوئے پستول کا خیال آیا۔ اُس نے جھپٹ کر پستول نکال لیا۔ تشدد پر آمادہ بھیڑ پر نشانہ سادھتے ہوئے گرجا: ''خبر دار! کوئی ایک قدم بھی آگے بڑھا تو گولی ماردوں گا، اُس کا تشدد آمیز رویہ اور ہاتھوں میں ہتھیار دیکھ کر لوگ ٹھٹھک گئے۔

''چلو پیچھے ہٹو۔ تمہارا مکھیا کدھر ہے۔ اُس کو بلا کر لاؤ مجھے ان سے ضروری باتیں کرنی ہیں''۔ اب تبریز حالات کو پوری طرح قابو میں لے چکا تھا۔ موت کے ڈر نے اس کے اندر عزت کا احساس پیدا کر دیا تھا۔ فوراً مکھیا کو بلایا گیا۔ طاقت کی پوجا اور طاقت ور کی غلامی ہمارے اندرون کی گہرائیوں میں آج بھی موجود ہے۔ مکھیا کے آنے پر تبریز نے فوراً اُن کو پولس بلانے کو کہا۔ پولس کو اس حادثہ کی خبر پہلے ہی مل چکی تھی۔ خبر ملتے ہی پولس حادثہ کی جگہ پہونچ گئی۔ قصہ مختصر یہ کہ پولس نے آتے ہی ملک کے افسر کو حفاظت میں لے لیا۔

کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ اُس نے مشکل سے اپنی آنکھیں کھولیں اور دروازہ کی طرف دیکھا، دماغ خالی تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ پھر دھیرے دھیرے حالات کا احساس ہوا۔ پچھلا پورا دن Deltasquadron کے گروپ کیپٹن وجے پانڈا سے ملنے اور اُن سے بات چیت میں گزرا تھا۔ حادثہ کے بعد بھائی کا کوارٹر Seal کر دیا گیا تھا۔ اُن سے کہا گیا تھا کہ جب تک گمشدہ مگ کا پتہ نہ چل جائے وہ واپس نہ آئیں۔

رات ائیر فورس Air force کے گیسٹ ہاؤس میں بڑی بے چینی سے گزری تھی۔ اُس نے بستر سے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ دروازہ پر گیسٹ ہاؤس کا محافظ رتن سنگھ تھا۔ اُس نے کہا: ''سرجنٹ صاحب ملنے آئے ہیں۔'' سرجنٹ وجے رانا جو پہلے ہی دن سے اس کا محافظ تھا، لابی میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ بہت خوش مزاج انسان تھا۔

زندگی میں مشکل سے مشکل کام انجام دینے کے لئے ہمیشہ تیار رہتا۔ اُس سے مل کر دل کو سکون ملتا تھا۔

'رتن سنگھ! دو عدد بلیک ٹی مل سکتی ہے کیا؟' اُس نے ایزی چیر کھینچا اور سرجنٹ کے قریب بیٹھ گیا۔

خان سر کے کچھ ساتھی آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔" سرجنٹ نے جان کاری دی۔" میں گیسٹ ہاؤس میں ہی ہوں وہ جب چاہیں مل سکتے ہیں۔" اُس نے جواب دیا اور پھر نوجوان سرجنٹ سے وہ اُس کے گاؤں اور خاندان کے بارے میں بات چیت کرنے لگا۔ سرجنٹ کی باتیں سُن کر اس کو انسانی فطرت کی اچھائی پر یقین ہونے لگا۔

"صاحب! خان سر کو بھی بلیک ٹی بہت پسند تھی۔ وہ یہاں جب بھی آتے بلیک ٹی بنوا کر پیتے"۔ رتن سنگھ ٹیبل پر چائے کا ٹرے رکھتے ہوئے اداس لہجے میں بولا۔ اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کپ میں شکر کا کیوب ڈالنے لگا۔" میں نے تو آپ کو دیکھ کر پہلے دن ہی کہا تھا کہ آپ سر کے بھائی ہیں"۔ رتن سنگھ نے اپنی باتیں جاری رکھیں۔ یہ عجیب بات تھی دونوں بھائیوں کی شکلیں ایک دوسرے سے بالکل نہیں ملتی تھیں۔ لیکن تبریز کو جاننے والے اُس میں تبریز کا عکس ڈھونڈ لیتے تھے۔ آپ کے بھائی ایک جانباز آفیسر تھے اور ایک اچھے انسان بھی۔ میں نے اس اسٹیشن پر اپنی آدھی زندگی گزاری ہے۔ ہزاروں آفیسر دیکھے ہیں لیکن SQR Leader تبریز کی طرح آفسر کہیں نہیں دیکھا۔ وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے کہ ایسا کہاں سے لاؤں کہ تم سا کہیں جسے، نئے آفیسروں کو لے کر جب فلائیٹ پر جاتے تھے تو اُن کا بہت خیال رکھتے تھے۔ سرجنٹ وکرم رانا چائے کا کپ اُٹھاتے ہوئے بولا۔" سرجنٹ صاحب گاما اسکوڈارن کے پچھلے سال والا حادثہ یاد ہے؟ کتنی بدقسمتی کی بات ہے ونگ کمانڈر گپتا نئے ٹریننگ کے لئے افسر کو جہاز پر لے گئے، جہاز میں کچھ تکنیکی خرابی آئی، خطرہ دیکھ کر وہ خود Bail Out ہو گئے، پائیلٹ آفیسر بیچارہ کریش میں مارا گیا، رتن پوری بات ایک ہی سانس میں بول گیا۔

"ہاں اُس وقت مگ کافی اونچائی پر تھا۔ ونگ کمانڈر اُس کو زمین پر اُتارنے کی کوشش کر سکتے تھے۔ خطرناک حالات میں وہ Panic میں آ گئے۔ ہوش و حواس کھو بیٹھے۔ حادثہ کے بعد اُن کا نروس بریک ڈاون ہو گیا تھا، ایک عرصہ تک وہ زیر علاج رہے۔ لیکن پھر کبھی وہ فلائنگ نہیں کر سکے۔" سرجنٹ نے پوری بات بتا دی۔

اسے یاد آیا کلائی کنڈا کے حادثے کے بعد اُس نے تبریز کو فلائنگ چھوڑ کر، گراونڈ ڈیوٹی جوائن کرنے کی صلاح دی تھی۔ لیکن تبریز اُس کی بات ہنس کر ٹال گیا۔ اُس کا کہنا تھا کہ گراونڈ ڈیوٹی وہی پائلٹ کرتے ہیں جو بیمار ہوں یا حادثے کا شکار ہو کر فلائینگ کے ناقابل ہو گئے ہوں۔ اسے یہ بات منظور نہیں تھی کہ کوئی پائیلٹ خطرے کی وجہ سے فلائینگ چھوڑ دے اور گراونڈ ڈیوٹی پر چلا جائے، یہ تو بزدلی ہے۔

فلائنگ تبریز کے لئے روٹی روزی ہی نہیں عشق بھی تھا۔ کھلے آسمان میں قلابازیاں کھاتے ہوئے اُس نے آزادی اور سکون کے جن لمحوں کو محسوس کیا تھا وہ شاید زندگی کی دوسری دشاؤں میں انسان کو میسر ہی نہیں ہوتی۔

چائے پینے کے بعد سرجنٹ ڈیوٹی پر چلا گیا۔ رتن سنگھ نے اسے نہا دھو کر تیار ہونے کو کہا تا کہ وہ

اُس کے لئے ناشتہ لگادے۔ ناشتہ کرنے کے بعد وہ تھوڑی دیر کے لئے گیسٹ ہاؤس سے باہر نکلا، اسے گھر فون کرنا تھا۔ رتن سنگھ نے بتایا کہ گیسٹ ہاؤس سے تھوڑی دور پر ایک کینٹن ہے اور اُس کے قریب ہی ایک ٹیلیفون بوتھ ہے۔ وہ ٹہلتا ہوا وہاں پہنچا۔ فون کرنے کے بعد وہ ٹیلی فون بوتھ سے باہر نکلا اُسی وقت کسی نے آواز دی: ''صاحب!'' اُس نے مڑ کر دیکھا۔ دھوبی اسٹال سے ایک آدمی اُس کی جانب آرہا ہے۔ ''آپ خان سر کے بھائی ہیں؟'' اُس نے پوچھا۔ ''ہاں، کیا بات ہے؟'' کسی اجنبی کا اُسے تبریز کا بھائی پہچان لینا۔ اسے دوسری بار تعجب ہوا تھا۔

''جی! میں نے سنا تھا کہ خاں سر کے بھائی گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ آپ کو دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ آپ ہی ہیں۔ شام کو گیسٹ ہاؤس آتا ہوں آپ سے بات کروں گا۔'' پتہ نہیں وہ کیا بات کرنا چاہتا تھا وہ سوچنے لگا۔

قریب چار بجے تبریز کے پانچ ساتھی گیسٹ ہاؤس پہنچے اور اس سے بڑی محبت سے ملے۔ سبھی بہت دکھی تھے۔ یہ حادثہ اُن کے بیچ کا تھا۔ تبریز کی جگہ اُن میں سے کوئی بھی ہوسکتا تھا۔

"Khan sir was one 'A' fighter-pilot and very popular among the trainees."

فلائٹ لفٹنٹ کارتیکین نے کہا:

"well ! the situation that day was tough even for the best in trade."

یہ بات اسکواڈرن لیڈر سوسلیند رراؤ نے کہی۔

''اُس دن دو مگ Combat پر گئے تھے۔ موسم اچانک خراب ہوگیا تھا۔ Visibility ۵۰۰ میٹر تک رہی ہوگی''۔ فلائیٹ لفٹیننٹ کارتیکین نے کہا۔

''پیچھا کرنے والے مگ پر SQR Leader خان اور اس کے Trainee پائیلٹ ڈوگرا تھے۔ اُن کا کام آگے بھاگنے والے Mig کو مار گرانے کے دائرے میں لانا تھا۔'' SQR Leader گرمیت سنگھ نے کارتیکین کی بات پوری کی۔ حادثہ کے وقت Mig کون اڑا رہا تھا؟ تبریز یا Trainee اُس نے جاننا چاہا۔ ٹریننگ کے دوران Flight تو Trainee کرتا ہے لیکن پیچھے بیٹھا۔ Trainer سارے ایمرجنسی Operation کو کنٹرول کرسکتا ہے۔'' گرمیت سنگھ نے جواب دیا۔ ''اُس طرح کے Combat Operation میں آگے بھاگنے والے فایٹر کی پوزیشن اچھی رہتی ہے، اسے سامنے آنے والا خطرہ پہلے نظر آجاتا ہے۔ جب وہ خطرے سے بچنے کا اُپائے آخری وقت میں کرے گا تو پیچھا کرنے والے پائلٹ کو خطرے کی جانکاری دیر سے ہوگی۔'' Flight Lft راؤ نے کہا۔

''ہاں یہ بات عین ممکن ہے۔'' گرمیت سنگھ نے ہاں میں ہاں ملائی۔ دوسرے مگ کا پائلٹ

کون تھا؟ اس نے راؤ سے پوچھا۔ ''فلائٹ لفٹیننٹ بی پل چودھری، راؤ نے بتایا۔ یہ بات اُسے عجیب لگی۔ بی پل چودھری وہاں موجود نہیں تھا۔ وہ اُس سے ملنے کیوں نہیں آیا۔ کہیں ایسا نہیں کہ Combat exercise کے درمیان اُس نے جان بوجھ کر ایسے حالات پیدا کر دیئے ہوں جس کی وجہ سے پیچھے آنے والا مگ حادثہ کا شکار ہو گیا ہو۔ پھر اُس نے سوچا ایسا تو نہیں ہونا چاہئے۔ وہ ہر بات کو شک کی نگاہ سے کیوں دیکھ رہا ہے۔ اُس دن وہاں آنے والے افسران میں ایک Trainee بھی تھا۔ وہ چپ چاپ بیٹھ کر سب باتیں سن رہا تھا۔

''راؤ صاحب؟ کیا! ایسا ممکن ہے کہ چین نے اپنی سرحد میں مگ کے اچانک گھس جانے کی وجہ سے تبریز کو اپنے base پر اترنے کے لئے مجبور کر دیا ہو۔'' اُس نے راؤ کی طرف اُمید بھری نگاہوں سے دیکھا۔ ''اُس دن ایسا ممکن نہ تھا۔'' راؤ نے جواب دیا۔ ''لیکن کیوں؟'' اُس نے بے چین ہو کر پوچھا۔

''کسی اڑان کے لئے مگ میں تقریباً ۴۵ منٹ کا ایندھن ہوتا ہے۔ رڈار پر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ تبریز لگ بھگ ۴۰ منٹ کی اُڑان پوری کر چکا تھا۔ اُس میں ۴ یا ۵ منٹ کا ایندھن بچ رہا ہوگا۔

اُس جگہ سے کسی بھی پڑوسی ملک کی دوری کم از کم ۲۵ یا ۳۰ منٹ کی ہے اتنے کم ایندھن میں تبریز کا وہاں پہنچنا ناممکن تھا۔

بات چیت کے درمیان فلائٹ لفٹیننٹ رنجیت مہرا نے ایک نئی بات بتائی: حادثے کے دن تقریباً دس بجے اُس کے ساتھی نے اپنے ہیلی کوپٹر کے ریڈیو پر ایک کال سنی تھی۔ کال کرنے والا اس پر کنٹرول سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اکثر پائلٹ ایرٹاور سے کسی ہدایت کے لئے رابطہ قائم کرتے ہیں لیکن عجیب بات یہ تھی کہ جس Frequency سے کال کیا گیا تھا وہ کنٹرول روم سے رابطے کے لئے مناسب نہیں تھا۔ اُس Frequency پر تو ساتھ اُڑنے والے پائلٹ ایک دوسرے سے رابطہ قائم کرتے ہیں۔ اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ کال کا وقت تو وہی تھا جب رڈار سے تبریز کا مگ غائب ہوا تھا۔ اُس نے تبریز کے ساتھیوں سے صحیح بات معلوم کرنے کی کوشش کی۔ بہت سے امکانات تھے۔

تو یہ کہ تبریز کے مگ کے نشریات کے کسی آلہ میں خرابی آ گئی ہو۔ پہلا کال کنٹرول پاور پر موصول نہیں ہونے کی وجہ سے مجبوراً دوسری Distress call بھیجی گئی ہوگی۔ ایک اور بات ممکن ہے۔ نازک حالات میں درست Frequency کی پہچان میں غلطی ہو گئی ہو؟

بات چیت ختم ہونے کے بعد سوشلندر نے اُس کو اپنے یہاں کھانا کھانے کی دعوت دی۔ دعوت میں جانے کو اس کا دل گوارا نہیں کر رہا تھا۔ کھانا تو بہر حال گیسٹ ہاؤس میں بھی تھا۔ سوشلندر نے زور دے کر کہا۔ اس کی بیوی روز کی طرح کھانا بنائے گی، تو وہ راضی ہو گیا۔

راؤ ٹھیک آٹھ بجے اس کو لینے آ گیا۔ کوارٹر پہنچنے میں دیر نہیں لگی۔ گاڑی سے اترتے وقت راؤ نے بتایا کہ تبریز کا

کوارٹر جو سیل کر دیا گیا ہے، اُس کے کوارٹر کے سامنے ہے۔ نستے بھائی۔ گھنٹی کی آواز سنتے ہی راؤ کی بیوی جیا نے دروازہ کھولا۔ جواب میں اس نے اپنا سر ہلا دیا۔ جیا اُسے صوفے پر بٹھا کر خود کچن چلی گئی۔ دس سال کا ان کا بیٹا کمپیوٹر پر کھیل رہا تھا۔

ڈرائینگ روم بڑی خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ ٹی۔ وی کیبنیٹ، شوکیس اور کتابوں کی الماریاں الگ الگ تھیں۔ بظاہر ایسا تبادلے کو دھیان میں رکھ کر کیا گیا تھا تا کہ سامان اُٹھوانے میں آسانی ہو۔ شوکیس کے اُوپر والے خانے میں ٹرافیاں اور کپ ٹرے قاعدے سے رکھے گئے تھے۔ اس کے نیچے کے خانوں میں مختلف قسم کے فائٹر جہاز کے نمونے رکھے ہوئے تھے بیچ میں ٹی وی کا سٹ تھا اور اس کے دائیں جانب کے شیلف میں رکھی ہوئی کتابیں گھر میں رہنے والوں کے ذوق کی گواہی دے رہی تھیں۔ ڈرائنگ روم کے اس دیوار کے سامنے صوفہ سیٹ تھا جس پر وہ بیٹھے تھے، صوفے کی دوسری جانب چار کرسیوں والا ایک خوبصورت ڈائیننگ سٹ لگا تھا۔

جیا کچن سے ایک ٹرے میں شربت بھرے تین گلاس لے کر آئی اور بیچ کے ٹیبل پر رکھ کر خود صوفے پر بیٹھ گئی۔ شوسلندر نے آگے کی طرف جھک کر شربت کا گلاس اس کی طرف بڑھایا اور کہنے لگا: "جو ہوا اُس پر اب بھی یقین نہیں آتا۔" اُس دن جیا، نرین کو لے کر اسکول گئی ہوئی تھی۔ فلائنگ کے لئے میں تبریز کے ساتھ ہی بس پر پہنچا تھا لیکن ہیڈ کمانڈ آفس سے مجھے کسی کام سے گوہاٹی جانے کا حکم آ گیا۔ لوٹنا شام ہی تک ممکن تھا۔ میں نے جانے سے پہلے اپنے کوارٹر کی چابی تبریز کو دے دی تھی تا کہ جیا کے اسکول سے آنے پر وہ اُسے دے دے۔ سارٹی پر جاتے وقت چابی تبریز کی جیب میں تھی۔ اور آج تک اُس کے پاس ہے۔ اُس رات ہم لوگوں نے گھر کا تالا توڑا۔ اُس روز بارش موسلا دھار ہو رہی تھی اور ہم پلنگ پر پڑے جاگتے رہے تھے۔ زندگی بھی عجیب شئے ہے:

"سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں۔"

"آپ کو نہیں معلوم ہم لوگوں نے کیسا محسوس کیا تھا۔ اُس دن مون سون کی وہ آخری اُڑان تھی۔ موسم خراب ہو چلا تھا۔ بادل گھر آئے تھے۔ شائد وہ اُڑان کے لئے مناسب دن نہیں تھا۔" شوشیلندر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"بھائی جان، جب یہاں فلائینگ ہوتی ہے، کسی کام میں دل نہیں لگتا ہر شام یہاں صوفہ پر بیٹھی رہتی ہوں جب تک شوشیل گھر واپس نہیں آ جاتے۔" جیا نے اپنے دل کی بات بتائی۔ "میں آپ کے جذبات سمجھ سکتا ہوں وہ آہستہ سے بولا۔" رن وے یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے، ہر بار جب کوئی مگ یہاں سے ٹیک آف کرتا ہے یا لینڈ کرتا ہے تو اتنی تیز اور گرجدار آواز ہوتی ہے کہ دل دہل جاتا ہے، آپ کو عجیب لگے گا۔ ایک ایک کر کے جب سب مگ ٹیک آف کرتے ہیں تو میں دل میں اُن کی گنتی کرتی ہوں اور اُڑان پوری کر کے جب سب لینڈ کرتے ہیں تو میں حساب لگاتی ہوں کہ سارے مگ واپس آئے کہ نہیں۔" جیا کی آواز میں رات کی اُداسی گھل گئی تھی۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ جس درد و دکھ کو وہ پچھلے کئی دنوں سے جھیل رہا ہے تقریباً وہی درد جیا ہر شام اپنے شوہر کے اُڑان سے واپس آنے کے انتظار میں جھیلتی ہے۔

"Do not take it seriously ورنہ وہ یہ دعویٰ بھی کرے گی کہ مگ کے لینڈنگ کی آواز پر وہ

جان جاتی ہے کہ وہ میں ہوں یا کوئی دوسرا پائلٹ۔'' شوشیل نے ماحول میں تھوڑی نرمی پیدا کر دی۔'' میں آپ لوگوں کے لئے کھانا لگاتی ہوں۔'' جیا نے ٹیبل سے گلاس اور ٹرے اُٹھالیا اور کچن میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے لیے ڈرائینگ روم میں خاموشی چھا گئی۔ صرف نرین کے کمپیوٹر گیم کی آواز کبھی کبھی آجاتی تھی۔

''مگ کے حادثے آج کل بہت ہو رہے ہیں۔'' اُس نے خاموشی توڑی۔ ''ہوں'' شوشیل نے حامی بھری۔'' پتہ نہیں اتنے زیادہ حادثے کی کیا وجہ ہے؟''

''وجوہات تو بہت ہیں اور اس کا علم بھی لوگوں کو ہے۔''

''میڈیا میں یہ بحث چھڑ ہوئی ہے کہ حادثات Human errors کی وجہ سے ہو رہے ہیں یا مشین کی گڑ بڑی سے اسے ٹی۔وی پر دیکھا گیا، ایک پروگرام یاد آ گیا:

''کسی فائٹر پلین میں آواز سے تیز اُڑتے ہوئے، زندگی اور موت کے درمیان بہت تھوڑا فرق رہ جاتا ہے۔ ایسے بہت سے حالات آتے ہیں جب سکنڈ کے دسویں حصے میں لیا گیا پائلٹ کا فیصلہ یہ طے کرتا ہے کہ وہ بیس base پر لوٹے گا بھی کہ نہیں،'' شوشیل اسے فلائینگ کی باریکیاں بتا رہا تھا۔

''لیکن اگر اچانک مشین میں کوئی خرابی آجائے، تو پائلٹ کیا کر سکتا ہے۔'' اُس نے ایک دوسرا سوال پوچھا۔ وہ دراصل Machine کی خرابی کی بات کر رہا تھا۔'' تبریز ایک دفعہ روسی مگ کا مقابلہ یورپین مگ سے کر رہا تھا۔ تبریز نے بتایا تھا کہ مگ بالکل روسی دہقانی کی طرح ہے، مضبوط اور جھگڑالو۔ اُس کی بناوٹ گرچہ بے ڈھب سی ہوتی ہے۔ باڈی پر یہاں وہاں بے ترتیبی سے لگے بولٹ اور نٹ نظر آجاتے ہیں، لیکن طاقت اور کارگردگی میں وہ بے مثل ہیں۔ اُس کے برخلاف یوروپین فائیٹر کی بناوٹ اور ڈیزائین میں شہریت کی نفاست ہے۔ نئی ٹیکنولوجی کی بدولت اس میں پائلٹ کی آسانی اور حفاظت کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ لیکن روسی مگ اپنے حریف یوروپین فائٹر سے فلائینگ مشین کی حیثیت سے بالکل یکساں ہے۔ Basically Mig is not suitable for Training purposes. It is too fast and complicated for a trainee." سوشیل نے کہا۔

''میں نے کہیں پڑھا ہے کہ لافونیٹن کمیٹی نے بہت پہلے ہی نئے پائیلٹوں کی ٹریننگ کے لئے اڈوانس جٹ ٹرینرز مہیا کرنے کی سفارش کی تھی۔'' وہ جلدی سے بول پڑا۔

''فلائینگ سکھانے کے لئے ٹرینرز کا مہیا نہیں ہونا آئے دن حادثوں کی ایک بڑی وجہ ہے۔'' سوشیل نے اپنی بات پوری کی۔'' تبریز ایک فلائنگ پائلٹ ہونے کی حیثیت سے اخباروں اور جریدوں میں فلائینگ کے متعلق شائع ہونے والی خبروں اور مضامین کو غور سے پڑھتا تھا۔ ایک اعلیٰ سطح کے جریدے میں تحقیقی رپورٹ میں دیئے گئے اعداد و شمار اسے زبانی یاد تھے:

1970-80 کے درمیان ۵۰۰ کی تعداد میں مگ حادثے کے شکار ہوئے تھے جن میں ۱۸۰

سے زیادہ پائلٹ کی جان گئی۔ یہاں تک کے اس مضمون میں مگ کو' flying cofin' تک کہا گیا تھا۔ ان باتوں سے ظاہر ہے کہ مگ بنانے اور اُن کے رکھ رکھاؤ میں یقینی کوئی بڑی کمی تھی۔

شروع شروع میں روسی مگ کے خراب پرزوں کو اصلی پرزوں سے بدل دیا جاتا تھا۔ لیکن روس کے بکھر جانے کے بعد خراب پرزوں اور مشینوں کی بھیڑ لگ گئی۔ نتیجتاً گھوٹالے اور رشوت خوری راہ پا گئیں اور مگ کی پہلی سی قدر و قیمت برقرار نہیں رہ سکی۔

دوسری طرف سرکاری کمپنی Hindustan aeronautics میں تعمیر کی گئی Mig کی قدر اور قیمت ۱۹۷۰ کی دہائی سے ہی شک کے دائرے میں رہی۔ اخبار والوں نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ لگاتار ہونے والے کچھ Mig کے حادثے کی وجہ اُن کی تعمیر کے دوران انجن کے بیئرنگ کا غلط فٹ کیا جانا تھا۔"

کھانے کے بعد شوشیل نے اپنی کار سے اسے واپس گیسٹ ہاؤس پہنچا دیا۔ تھکاوٹ کی وجہ سے بستر پر لیٹتے ہی اُسے نیند آ گئی۔ ساری رات وہ عجیب و غریب خواب دیکھتا رہا۔ وہ اپنے گاؤں میں تھا۔ مکئی کے کھیت میں ہرے ہرے بھٹے لگے تھے۔ اُسے بھٹے بہت پسند ہیں۔ بھٹے توڑنے کے لئے جیسے ہی وہ کھیت میں گھسا۔ بھٹے کے پورے سنسنا کر اونچے ہوتے گئے۔ اُس نے ایک بھٹے کو پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ اُس کی پہنچ سے بہت آگے نکل گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بھٹے کے نازک ہرے بھرے پودے لمبے لمبے درختوں میں تبدیل ہو گئے۔ اور وہ اُن کے بیچ گھر گیا۔ وہ وہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔ آگے بڑھنے کے لئے اُسے درختوں کے بیچ جگہ بنانی پڑ رہی تھی۔

اُس نے چاروں جانب نظر دوڑائی۔ بڑے بڑے لمبے سے نکلنے والے بھورے کالے رسی جیسے بال پیڑوں کے تنوں کے چاروں طرف لٹک رہے تھے۔ انھیں پکڑ کر وہ ایک درخت پر چڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔ آہستہ آہستہ وہ اوراوپر چڑھا۔ کافی اوپر چڑھنے پر اُس نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا پرندہ تنے سے لگے بھٹے پر بیٹھا اُس کے سیب جیسے بڑے بڑے دانوں کو نوچ کر کھا رہا ہے۔ وہاں سے نکلنے کی غرض سے اُس نے جھپٹ کر پرندے کے دونوں پاؤں مضبوطی سے پکڑ لئے۔ پرندہ تیز آواز نکالتے ہوئے وہاں سے اُڑا اور اسے لے کر درختوں کے اوپر آسمان میں منڈلانے لگا۔

اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ صبح صادق کی روشنی کھڑکی سے ہو کر اندر آنے کی کوشش کر رہی تھی ایر کنڈیشن ہونے کے باوجود اُس کا بدن پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔

رتن سنگھ کا لایا ناشتہ ابھی ختم بھی نہیں کر پایا تھا کہ کوئی اُس سے ملنے گیسٹ ہاؤس آ گیا، وہی دھوبی جس سے اس کی ملاقات کینٹین کے پاس ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں اخبار میں لپٹے ہوئے کچھ کپڑے تھے۔ "صاحب، کپڑے خان سر کے ہیں۔ اُنھوں نے دھونے کے لئے دیئے تھے۔ کل کینٹین کے پاس یہ کپڑے آپ کو دینے میں اچھا محسوس نہیں ہوا۔ سوچا گیسٹ ہاؤس میں جا کر دے دوں گا۔" اُس نے کپڑے لے لیے۔ یونیفارم کا ایک جوڑا، ایک پینٹ اور ایک شرٹ کل چار کپڑے تھے۔ کمرے میں جا کر اُس نے بریف کیس میں کپڑے رکھے اور واپس دھوبی کے پاس آ گیا۔

آپ کا پہلا بھی کوئی حساب باقی ہے؟" اس نے دھوبی سے پوچھا۔"نہیں صاحب! سر تو فوراً پیسے دے دیتے تھے۔"
اور اس بار کتنا ہوا۔

"رہنے دیں صاحب۔" دھوبی پیسے نہیں لینا چاہتا تھا۔

"ارے نہیں بھائی .... ایسا نہ کرو، لو اسے رکھ لو۔" اس نے پچاس کا نوٹ اُس کی جانب بڑھایا۔ "میڈم آئیں گی تو ان سے حساب کرلوں گا۔" وہ جانے کے لئے مڑا۔ "ایک ہی بات ہے" اُس نے آگے بڑھ کر نوٹ اُس کی مٹھی میں تھما دیا۔

دھوبی کے جانے کے تھوڑی دیر بعد C.O. وجے ہنڈا کا فون آیا۔ اس نے بتایا کہ تیج پور کے چیف کمانڈ ایر وائس مارشل وینک چوہان ٹھیک چار بجے اُس سے اپنے آفس میں ملنا چاہتے ہیں۔ میٹنگ کے لئے وہ اُسے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔

C.O. اُسے لے جانے کے لیے ٹھیک وقت پر آ گیا۔ آج خبر آئی ہے کہ ڈرانگ ضلع کے ایک گاؤں میں لوگوں نے نے ایک مگ کو دس بجے تیزی سے پہاڑوں کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ لیکن اُس کے آگے کچھ پتہ نہیں چلا، نہ تو کسی نے کوئی دھماکہ سنا اور نہ ہی آسمان میں کوئی روشنی، دھواں، دیکھے جانے کی خبر ہے۔ اندازہ ہے کہ حادثہ ڈرانگ ضلع سے آگے اونچی پہاڑی میں ہوا ہوگا۔ وجے ہنڈا نے اُسے بتایا۔

"لیکن C.O. صاحب! اگر حادثہ کے پہلے دونوں پائلٹ بیل آؤٹ کر گئے ہوں تو .... شاید وہ کسی گھنے جنگل میں پھنسے ہوں"۔ "We must do some thing for them." رات کا ڈراؤنا خواب اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ خواب اور حقیقت ایک دوسرے سے گڈمڈ ہونے لگے you my friend need not worry جس جگہ مگ کو دیکھے جانے کی خبر ہے اس کے آگے اونچا اور تیکھا پہاڑ ہے This was a combat exercise, visibility was very low .... there would just not be enough time for ejection.

C.O. نے ایک خوشی خبری کی طرح یہ بات کہی تھی۔

چیف سے ملنے دونوں ساتھ ساتھ کمانڈ آفس پہنچے۔ اپنے شاندار آفس میں ساگوان کے ٹیبل کے پیچھے بیٹھا تھا وہ تھکا تھکا لگ رہا تھا Refreshment کا پوچھے جانے پر اس نے انکار کر دیا۔ چیف سیدھا موضوع پر آ گیا۔ اُس کا لہجہ پہلے سے لکھا ہوا کوئی بیان پڑھنے جیسا تھا۔

حادثے کے وقت تبریز کا مگ ہمالیہ کے پہاڑوں سے گزر رہا تھا۔ وہاں پائن Pine کے بہت گھنے جنگل ہیں۔ درختوں کی اونچائی ۶۰۔ ۸۰ فٹ تک ہے۔ ایسے پس منظر میں گم شدہ مگ کو ڈھونڈ نکالنا بہت مشکل کام ہے۔ خراب موسم نے حالات کو اور بھی مشکل بنا دیا ہے۔ امریکہ سرکار سے اس وقت کی satelite تصویریں بھیجنے کی درخواست کی گئی ہے۔ اگر رپورٹ مل گئی تو حادثے کی جگہ معلوم کی جا سکتی ہے۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے ایک ایسا ڈراما کھیلا جا رہا تھا، جہاں قانون نے اسے اپنا رول ادا کرنے کی چھوٹ تو دے دی تھی لیکن Script پہلے ہی لکھی جا چکی تھی۔ حالات ایسے تھے، کہ یہاں اُس کی مرضی کو کوئی دخل نہیں تھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ اپنے کو اتنا مجبور پا رہا تھا۔

اسے اپنے والد کی بات یاد آ گئی، والد نے اُس کے ایرفورس آفس جانے کے وقت جو کہی تھی: ''بیٹا، وہاں جا کر ایرفورس کے سب سے بڑے آفسر سے کہنا کہ میں اپنا بیٹا اُن سے نہیں مانگ رہا ہوں لیکن وہ مجھے یہ بتائیں کہ کن حالات میں میں نے اپنے بیٹے کو کھو دیا''۔ حادثہ کے وقت Mig میں ایندھن نام کو تھی۔ حادثہ کے بعد کوئی بڑی آگ لگنے کا امکان نہیں ہے۔ Thermal Image سے بھی حادثہ کی جگہ کا پتہ نہیں چلایا جا سکتا۔ چیف گویا اُس کے واحد سوال کا جواب دے رہا تھا۔

''اُن سے کہنا جس دن تبریز نے پائلٹ کی زندگی منظور کی تھی، اسی دن میں سمجھ گیا تھا کہ شاید بڑھاپے میں وہ میرے ساتھ نہیں ہوگا۔ آج میں اپنی قسمت کو رو رہا ہوں لیکن میں یہ ضرور جاننا چاہتا ہوں کہ میرے بیٹے کے آخری لمحات کہاں اور کیسے گزرے۔''

''Mig کا حادثہ یہیں کہیں پہاڑوں میں ہوا ہے۔ B.S.F. کی مدد سے کھوج کا کام جاری ہے لیکن ابھی تک کامیابی نہیں ملی ہے۔'' چیف کمانڈر نے کہا۔

''تبریز کی لاش ہندوستان کے سپریم کمانڈر عزت مآب صدر پر میرا قرض ہے۔ اُن پر فرض ہے کہ وہ قرض لوٹا دیں۔ میں اُسے گھر لا کر آخری رسوم ادا کرنا چاہتا ہوں۔'' اُس کے کانوں میں والد کی آواز پھر گونجی۔

ایرفورس وائس مارشل نے ایک گہری سانس لی۔ وہ خاموش ہو گیا تھا۔ وہ تھک گیا تھا۔ خوبصورت ٹی کوسٹر سے ڈھکا گلاس اُٹھا کر اُس نے اپنی پیاس بجھائی۔ اگلے دن اُس نے ایرفورس اسٹیشن چھوڑ دیا۔ وہ گھر واپس جا رہا تھا ریل گاڑی گوہاٹی اسٹیشن سے چھوٹنے والی تھی۔ خوش مزاج سرجنٹ الوداع کہنے اسٹیشن آیا تھا۔ لیکن آج وہ بالکل خاموش تھا۔

جیسے ہی ٹرین گوہاٹی سے کھلی اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ پڑا۔ پہلی بار اسے اپنے نقصان کا احساس ہوا۔ پچھلے کئی دن بیکار گئے۔ اس کی ساری کوششیں ناکام ہو گئیں۔ اس کے دل میں ایک ہوک سی اُٹھی۔ تبریز کو لیے بغیر وہ گھر جا رہا تھا۔

اس نے ٹرین کی کھڑکی سے باہر جھانکا۔ کالے گھنے بادل آسمان میں چھا گئے تھے۔ سورج چاروں طرف سے بادل میں گھر گیا تھا جس کی سلوٹوں سے سورج کی کرنیں باہر نکل پا رہی تھیں۔ اُس نے سوچا آج رات پھر زور کی بارش ہوگی۔

☆☆☆

(۴)

وہ آنکھیں

• گنگادھر گالگل

• ترجمہ: محمد اسد اللہ

رپ ۔رپ ۔رپ ۔اس کے جوتوں کی آواز ابھر رہی تھیں ۔ اپنا موٹا سا ڈنڈا زمین پر پٹکتا ہو انمبر ۳۲۲ر رات میں پہرہ دے رہا تھا۔ گھنی مونچھیں، چوڑی بھنویں، موٹی موٹی سیاہ آنکھیں، پتھر میں تراشے ہوئے مجسمے جیسا چہرہ، یہ تھا نمبر ۳۲۲ کا حلیہ۔ گھر بار نہ بال بچے، بن داس قسم کا آدمی، فسادات کے زمانہ میں تل بازار جاتے ہوئے پستول بردار صاحب بھی گھبراتا تھا۔ لیکن یہ تن تنہا رات یا دن کے کسی بھی حصے میں ادھر نکل جاتا اسے کبھی ڈرتے ہوئے نہیں دیکھا، نہ سنا۔ ایک چاقو تھامے ہوئے خونی کو اس نے بکرے کی طرح پکڑ لیا تھا ۔وہ ایڑیاں جوڑ کر سلامی دیتا تو کل پرسوں کے سب انسپکٹر بنے نوجوان بھی چونک پڑتے۔

پیروں کی اسی وندناہٹ کے ساتھ گشت کرتے ہوئے اس نے فٹ پاتھ کی جانب یوں ہی نظر دوڑائی تو اسے ایک کونے میں ایک بھکاری لڑکی گھاس کا تنکا دانتوں میں دبائے ہوئے اپنے آپ میں گم بیٹھی ہوئی دکھائی دی۔ کوئی بارہ سال کی عمر رہی ہوگی ۔اس کے پھٹے پرانے میلے کچیلے بلاؤز کے اندر سے ایک ایک پسلی بہ آسانی گنی جا سکتی تھی ۔سیاہ چہرہ، چہرے پر جھولتے ہوئے چھدرے چھدرے بال، البتہ آنکھیں سیاہ اور چمکدار تھیں ۔لگتا تھا کسی شاہی خاندان سے تعلق رکھتی ہو۔ وہ سامنے کی دیوار سے نظر کو لگائے دیکھ رہی تھی۔ نمبر ۳۲۲ر اس کے قریب آکر رکا رہا پھر بھی اس کے انہماک میں کوئی فرق نہ آیا۔ نمبر ۳۲۲ر کو یہ اپنی ہتک محسوس ہوئی۔ اس نے اس کی پیٹھ پر ایک ڈنڈا رسید کیا۔۔۔۔۔ 'چل نکل یہاں سے'۔ اس لڑکی کی کراہنے کی ہلکی سی آواز ابھری۔ اور اس کا ہاتھ فوراً درد کی جگہ سہلانے لگا۔ عجیب بات یہ تھی کہ وہ گھبرا کر وہاں سے بھاگی نہیں ۔نہ ہی کتوں کی سی لاچاری کا اظہار کیا۔ بلکہ اپنی قہر آلود نظریں ۳۲۲ر پر جما

کر پوری طاقت سے چیخی۔۔۔'نہیں!'۔اس کے چیخنے پر آس پاس کے کتے بھی بھونکنے لگے۔
نمبر۳۲۲ رغصے سے سرخ ہو اٹھا۔ پولس کی بے عزتی کرنے والی اس حقیر بھکارن کو سبق سکھانے کی غرض سے اس نے اپنی لاٹھی اٹھائی۔اسے محسوس کرتے ہوئے لڑکی کو جھرجھری لیتے ہوئے اس نے دیکھا مگر پھر بھی لڑکی نے اپنی نظریں اس پر سے ہٹائیں نہیں۔اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سے احساس کی چمک تھی۔ گویا حقارت سے کہہ رہی ہو:'واہ رے مرد! ایک تیرہ سالہ کمزور لڑکی پر لاٹھی اٹھاتا ہے۔'نمبر۳۲۲ راپنی زندگی میں کبھی اس طرح چکرایا نہیں تھا۔اس نے اپنی لاٹھی خلا میں روک دی اور غرایا: 'چل اٹھ بیٹھ، دماغ بتاتی ہے۔ہڈی پسلی ایک کردوں گا'۔اور اس نے چلنا شروع کردیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ وہ۔لڑکی اسی طرح دیوار پر نظریں گڑائے بیٹھی رہی۔
نمبر۳۲۲ رکی دو تین پھیریاں ہوئیں۔تب بھی وہ لڑکی اسی حالت میں بیٹھی رہی۔نمبر۳۲۲ ر کو شرارت سوجھی:
'لڑکی! لگتا ہے تیرا کوئی ماں باپ نہیں ہے؟'
لڑکی تھوڑی دیر خاموش رہی پھر پیروں پر نگاہ ڈالتی ہوئی بولی'ماں تھی، پرسوں ہی مرگئی'۔اس کے پیروں میں ہلکی سی جنبش ہوئی گویا اس سے زیادہ ان جذبات کا اظہار کرنا اسے گوارا نہ ہو۔نمبر۳۲۲ رکو تجسس پیدا ہوا'اور باپ؟ کہ اس کا کوئی اتا پتا نہیں؟'اور ہنسنے لگا۔لڑکی نے اسے گھور کر دیکھا اور بولی:'پھانسی ہوگئی اس کو ،کانگریس کے ساتھ تھا۔ماں کہتی تھی پھانسی چڑھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو تک نہیں تھا'نمبر۳۲۲ ر نے سوچا اس پاگل لڑکی سے بات کرنا فضول ہے۔وہ گشت پر چل پڑا مگر ان خیالات سے چھٹکارا نہ پاسکا۔آخر جھنجلا کر بولا:'ارے تجھے نیند کیوں نہیں آتی کیا شہزادیوں کی طرح لوری دے کر تجھے سلانا پڑے گا'۔اور وہ ہنس پڑا۔
'پیٹ میں اناج نہیں، پانی پیا تو درد ہو رہا ہے'۔یہ کہہ کر اس لڑکی نے ہونٹ بھینچ لیے۔
'کیوں بھیک مانگنا نہیں ہوتا؟'نمبر۳۲۲ نے کہا۔
لڑکی کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھری'بھیک مانگنے کا دھندا نہیں ہمارا۔میرا باپ۔۔۔'اور وہ رک گئی۔اس کی سانسیں تیز تیز چلنے لگیں۔نمبر۳۲۲ رکو محسوس ہوا گویا وہ اس سے بات نہیں کرنا چاہتی۔اس نے زور سے زمین پر ڈنڈا پٹخ کر گویا کسی خیال کو اپنے ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی۔
صبح ہو رہی تھی۔نمبر۳۲۲ رنے ایک چائے خانے کے پاس رک کر چائے منگوائی۔دیوار سے ٹیک لگائے چائے پیتے ہوئے اس نے اس لڑکی کی طرف دیکھا۔وہ اسی کو دیکھ رہی تھی۔اس نے سکہ دکاندار کی طرف بڑھایا اور اس لڑکی کے کٹورے میں ایک کپ چائے ڈالنے کے لئے کہا۔وہ حیرت زدہ رہ گئی اور منہ جلنے کے باوجود چائے بڑی پھرتی کے ساتھ پی گئی۔اور چائے ختم کر کے فوراً اپنا کٹورا اٹھا کر وہاں سے چل دی۔
تیسرے دن نمبر۳۲۲ رکی ڈیوٹی بدل گئی۔۔یہ عام قسم کی ایک صبح تھی۔گیارہ بجے کے قریب

وہ ایک پان والے کی دکان کے قریب   گتیں ہانک رہا تھا۔ ایک عمارت سے ایک بڑھیا پتوں پر کھانا لیے برآمد ہوئی اور اسے گائے کے سامنے رکھ دیا۔ اسی لمحہ ایک بھکارن لڑکی نے بجلی کی سی پھرتی سے وہ کھانا اُچک لیا۔ بڑھیا نے آپے سے باہر ہوکر اسے دو چار چانٹے رسید کیے۔ لڑکی کی غضبناک نظریں اس بڑھیا پر جم گئیں۔ اور اس کے بعد جو حرکت اس نے کی اسے دیکھ کر سارے راہگیر حیران رہ گئے۔ لڑکی نے وہ کھانا پتوں سمیت بڑھیا کے منہ پردے مارا اور کانپتی ہوئی کھڑی رہی۔

راستے میں بھیڑ اکٹھا ہوگئی۔ ایک ادھیڑ عمر شہری نے اسے ڈانٹ کر اپنے فرائض انجام دیے اور چند جوشیلے نوجوان اسے پیٹنے کی غرض سے آگے بڑھے۔ اور ایک سرکاری ملازم بھکاریوں سے لوگوں کو ہونے والی پریشانی پر تقریر کرنے لگا۔ نمبر ۳۲۲ ر دوڑا۔ اس کا رعب دار چہرہ دیکھ کر ہی بھیڑ تتر بتر ہوگئی۔ اس نے لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا جس سے اس کا بلاؤز پھٹ گیا۔ اس کی چمکیلی آنکھیں نمبر ۳۲۲ ر پر جم گئیں۔ وہ اسے وہاں سے ہٹا کر گرجا: 'لگاؤں کیا دو چار جھاپڑ!' لڑکی نے اس پر تکی نظریں ہٹائیں نہیں اور آہستہ سے بولی: 'مجھے معلوم ہے تو ویسا نہیں ہے'۔ نمبر ۳۲۲ ر نے اسے چونک کر دیکھا، اس کی آنکھیں اعتماد کا اظہار کس خوبی سے کر لیتی ہیں!

اس نے لڑکی کا ہاتھ چھوڑ دیا اور چل دیا۔ پھر کچھ دیر بعد منہ میں پان کا بیڑا دباتے ہوئے اسے وہی چمکدار آنکھیں یاد آگئیں،۔۔۔ 'مجھے معلوم ہے تو ویسا نہیں ہے'۔

وہ تمسخر سے مسکرانے کی کوشش میں کھل پڑا۔

آٹھ دنوں بعد نمبر ۳۲۲ ر کی ڈیوٹی پھر اسی راستے پر لگ گئی۔ رپ۔ رپ۔ رپ۔ جوتوں کی آواز پیدا کرتا ہوا وہ گشت کرنے لگا۔ انجانے میں اس کی نظر اس پتھریلی دیوار کی طرف اٹھ گئی۔ اور اس تجسس کے پیدا ہونے پر غصہ ظاہر کرنے کے لیے اس نے زور سے زمین پر ڈنڈا پٹخا۔ راستے سے چلتے سرگوشیاں کرتے ہوئے دو لوگ چونک کر خاموش ہوگئے۔ وہ لڑکی اسی جگہ بیٹھی تھی۔ ان ہی پھٹے کپڑوں میں۔ اس کی سانسیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ چہرے کا رعب ذرا کم تھا۔ آنکھیں جیسے بجھی ہوئی ہوں۔ نمبر ۳۲۲ ر اس کی طرف دیکھ کر کرخت آواز میں بولا: 'کیوں لڑکی تیری مستی نہیں گئی اب تک؟' لڑکی نے اس کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں وہی پرانی چمک موجود تھی۔ پھر اس نے آنکھیں جھکا لیں۔ وہ ایک قیمتی گڑیا سے کھیل رہی تھی۔ 'یہ گڑیا کس نے دی تجھے؟'

'میں نے چرائی ہے۔' وہ گڑیا کو پچکارنے لگی۔ نہ جانے کیوں نمبر ۳۲۲ ر کو خیال آیا کہ اس کے جذبات کا مذاق اڑانا مناسب نہیں۔ وہ آگے بڑھ گیا اور اپنے خیالات میں گم، گشت کرنے لگا۔ اس قسم کے نازک خیالات اس کے مزاج کے خلاف ہیں۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے پھر ایک چکر دور تک لگایا گویا اپنے اندر کے پولس پن کو بیدار کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ تین چار پھیروں کے بعد وہ اکتا گیا۔ اور اس

لڑکی کے پاس پہنچ کر اس کا مذاق اڑانے لگا: 'ارے تیرا کوئی ماما، کا کا نہیں ملتا تجھے۔'
'ملتا تھا ایک اندھا ماما!' وہ کہتا تھا تو روتی گڑگڑاتی نہیں'۔ اور کچھ اداس ہوکر بولی: 'آتا ہی نہیں مجھے'۔ لمحہ بھر کے لیے اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک ابھری اور پھر وہ گڑیا کو پچکارنے لگی۔
'اور اس لیے تو نے اس اندھے کو چھوڑ دیا؟' نمبر۳۲۲ ڈنڈے پر ٹک کر جھولتا ہوا بولا۔
'نہیں نہیں مجھے اس اندھے نے۔۔۔' اور وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ اس کے ہاتھ میں موجود تنکا اس نے دور پھینک دیا۔
نمبر۳۲۲ ر نے تجسس کے ساتھ پوچھا: 'پھر تو نے کیا کیا؟'
' اس کا گلا دبا دیا۔ مر گیا ہوگا وہ اندھا'۔۔۔ عجیب سی بے کسی اس کی آنکھوں سے جھانکنے لگی۔
نمبر۳۲۲ ر اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر یکایک اس کے اندر کا پولس جاگ اٹھا۔ 'تو چوری کرتی ہے، لوگوں کے گلے دابتی ہے۔ تجھے تو تھانے لے جا کر پٹائی کرنی چاہیے۔' وہ جوشیلے انداز میں بولتا جا رہا تھا۔
'مجھے پھانسی دے گا، نا۔ مجھے مار۔۔ نا، مجھے بھگوان کے یہاں جانا ہے۔ وہاں ایسے کتوں کی طرح بھیک تو نہیں مانگنا پڑے گا۔' اس کی سیاہ آنکھوں میں عجیب سی امید کی کرن جگمگا اٹھی۔
نمبر۳۲۲ ر سے نہ رہا گیا: 'ایسے چور اور خونی لوگ بھگوان کے ہاں نہیں جاتے، نرک میں جاتے ہیں۔'
کسی زخمی پرندے کی طرح لڑکی نے اس پر نظر ڈالی۔ پوری طاقت سے چیخی: 'جاتے ہیں۔ جاتے ہیں ۔۔ میرے بابا بھگوان کے یہاں گئے۔ میری ماں گئی۔ میں بھی جاؤں گی۔ اس کی آنکھوں میں ایک پُر اسرار سی چمک تھی۔ نمبر۳۲۲ ر چونک گیا۔ اسے کوئی جواب نہ سوجھا، ایسا لگا جیسے وہ لڑکی کوئی عظیم راہبہ ہے۔ اس بیکراں آسمان کے نیچے پتھریلی دیوار کی طرف ٹک لگائے ریاضت میں مگن اور وہ عظیم سچائی اس کی طویل تپسیا کا حاصل ہے۔ اس میں اس سچائی کی مخالفت کی طاقت نہیں تھی۔ ایک سرد ہوا کا جھونکا اس کے پھٹے ہوئے بلاؤز میں داخل ہوکر اس کے بدن کو چھو کر گزر گیا۔ اس کے تھکے ماندے جسم میں حرکت ہوئی۔ اس کی آنکھوں کی روشنی لڑکھڑاتی ہوئی سی محسوس ہوئی اور وہ فٹ پاتھ پر لڑھک گئی۔
نمبر۳۲۲ ر فوراً اس کے قریب گیا۔ اس کی آہٹ سے چونک کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھوں میں شدید درد، صبر، فریاد، خودداری، بے بسی اور قوت متضاد جذبات تھے۔
نمبر۳۲۲ ر نرم دل شاعر نہیں تھا، پولس محکمہ میں رہ کر اس کا دل سخت ہوگیا تھا اس کے باوجود لڑکی کی نگاہیں اس کا دل چیر کر اندر تک اتر گئیں۔ ٹھنڈ سے کپکپاتے ہوئے اس کے چہرے کی طرف اس نے دیکھا اور نہ جانے کیا سوچ کر اپنا کوٹ اس پر ڈال دیا۔ کوٹ کو اپنے جسم کے گرد لپیٹتی ہوئی وہ بولی: 'مجھے مرنا ہے، مجھے ماں کے پاس جانا ہے'۔ اور وہ گڑیا کو سہلانے لگی۔

پہرے پر آگے چلتے چلتے ، اس نے سوچا اور ایک چور لڑکی کو اپنا کوٹ دے دینے پر اسے اپنے آپ پر حیرت ہوئی ، وہ کسی قدر فکر مند بھی ہوا۔ دوسری صبح اس نے اس لڑکی کے کٹورے میں چائے انڈیل دی وہ اٹھی اور چائے پی لی جس سے اس کے اندر کچھ توانائی پیدا ہوگئی۔ اس نے کوٹ اپنے جسم سے علاحدہ کر دیا اور تپتی ہوئی آنکھیں ایک سمت میں گڑائے لڑکھڑاتی ہوئی چلنے لگی۔ زمین پر گرا ہوا کوٹ جھٹکتا ہوا نمبر ۳۲۲ر اسے دور جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ نمبر ۳۲۲ر چوکی کے کمپاؤنڈ میں کھڑا تھا۔ دھوپ بہت تیز تھی۔ سامنے کھڑی چپٹی ناک والی پولس لاری منہ کھولے ہوئے مگر مچھ کی طرح نظر آرہی تھی۔ اسی اثنا میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا نمبر ۳۲۲ر اس کے قریب آیا۔ اس کی آنکھوں میں شدید حیرت تھی۔ وہ نمبر ۳۲۲ر کی پیٹھ پر تھاپ مارتا ہو بولا: 'ان ملٹری کے لوگوں نے بھی بہت دھوم مچا رکھی ہے۔ ابھی ابھی ایک بھکارن کی لاش ملی ہے۔ لاری اس کے اوپر سے چلی گئی۔ منہ پوری طرح پھٹ گیا۔ آنکھیں لٹک گئیں۔ ایسا لگتا ہے اس کے پاس ایک گڑیا بھی تھی۔۔۔۔۔' نمبر ۳۲۲ر بری طرح چونکا۔ لاٹھی پر اس کی گرفت مضبوط ہوگئی۔ اپنے جسم پر موجود کوٹ پر اس نے نظر دوڑائی۔ اور منہ کھولے ہوئے مگر مچھ کی طرح دکھائی دینے والی لاری کی طرف دیکھا اور مبہوت رہ گیا۔ اس کے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات کا احساس نمبر ۳۲۲ر کو ہوا تو وہ حیرت سے بولا: 'کیوں ، کیا ہوا؟'

نمبر ۳۲۲ر نے چونک کر اوپر دیکھا اور اپنی گھنی مونچھوں میں انگلیاں پھیر کر اپنا ڈنڈا زور سے زمین پر دے مارا۔ گویا کہہ رہا ہو:۔۔ 'جو میرے اندر ایسے جذبات پیدا کرنے کی کوشش کرے گا میں اسے اسی طرح سزا دوں گا'۔

☆☆☆

تمل نظم: وائرا متھو

اُردو ترجمہ: رفیق انجم

اکیسویں صدی

خوش آمدید اکیسویں صدی
یا وہاں سے ہر روز ایک بار
ہمارے لیے تم کیا لاؤ گے
وہاں سے خون بہے گا
کیا تم ہمارے لیے
پالنا بناؤ گے کیا زمین
یا پھر ہمیں
مصنوعی سیاروں کے گرد
گھومے گی
صلیب پر چڑھاؤ گے
یا مصنوعی سیارے
زمین کے گرد
شفقت اور
کیا بالترتیب آئیں گے
محبت کے شجر اُگتے رہیں گے
یا وقت رک جائے گا

یا ماں کا دودھ
دوبارہ شروع ہونے کے لیے
ٹیسٹ ٹیوب سے ٹپکے گا
کیا مرد و زن کی محبت
کیا گاڑی کے پہیے
آنکھوں سے جنم لے کر
سورج کی توانائی سے چلیں گے
شاعری میں ڈھل جائے گی
یا پھر
سورج دھوئیں کے
چادر ہی میں
اس کا آغاز وانجام
لپٹا رہے گا
چادروں کے درمیان
کیا پکانے والا گیس
مقیّد رہے گا
سلنڈر میں ملتا رہے گا
کیا ہتھیار فنا ہو جائیں گے
یا پھر انھیں سلنڈر میں
اور آدمی

زندہ رہے گا
آکسیجن بیچا جائے گا
یا آدمی فنا ہو جائے گا
کیا انسان کے پاس
اور ہتھیار
زندہ رہیں گے
کھانے کو وافر غلہ ہوگا
خوش آمدید اکیسویں صدی
یا پھر انسان
اور خاتون
مگر تم کیوں آرہے ہو
میں بٹ جائے گا
ہمارے لیے پریشانی سے
مبرّا قوم لاؤ
کیا پورا ملک
ایک گھر جیسا ہوگا
دروازوں کے بغیر
ایک گھر لاؤ

• اُردو ترجمہ: رفیق انجم

یا ہر گھر ایک الگ ملک جیسا
گناہوں سے پاک
ایک دل لاؤ
جب انسان
چاند پر بس جائے گا
ہمارے لیے
امن کا تحفہ لاؤ
اور چار دانگ عالم کے لیے
تب چاند کی کرنیں
زمین تک پہنچیں گی
امن وشانتی لاؤ
تاکہ دنیا
اس کے سائے تلے سُو سکے!

[مکمل نظم]

☆☆☆

گجراتی: غلام محمد شیخ

جیسلمیر

ریگزار میں یہ موتیوں جڑا شہر
محراب تلے بیٹھے طاؤس
دیواروں کے گرد چکر لگاتے فیل
ہر بالاخانہ پتھروں میں گندھا ہوا
ہر روزن کند تیغوں سے زخمی
جھٹپٹے میں دھانی چنریا کی مانند چمکتے دیوار
آٹھ نسلوں کی صناعی نے
ان آہنی کڑیوں کو
جلا بخشی ہے
صحن میں گھومتی کالی بکریاں
اور صحن کے آخری
سرے پر دروازے کے باہر
فرض شناس ہنہناتے اونٹ
وسطی دیوار پہ سوکھتا سرخ لباس
کمرے کی ڈھلی تاریکی میں
اک چراغ کی لو پھڑکتی ہے
افق کی سرخی
اور چنری کی چمک میں
ایک سنہری لڑکی
روٹی کی مانند ایک شہر کو گوندھتی ہے

طبع زاد نظم: رفیق انجم

جوکر

کوئنس نیکلس کے سائے میں
کانپتے سائے
پتھریلی چٹانوں سے چپکے گم سم بت
کولتار کے سینے پر
تیز رَو پھسلتے ڈبے
اور ان میں دھنسی ہوئی اکتاہ ہر چہرے کو
چھلانگتی
نئی منزل کی جستجو میں
ادھر سے ادھر لپک رہی ہے
تا حدِ نگاہ فلک بوس گھونسلے

طبع زاد نظم

• رفیق انجم

اوران میں رہنے والی
پستہ قد چڑیاں
اپنی ہی ذات میں
سونے کے حصار میں قید
سوچ رہی ہیں کہ
صندلی اور
تانبے کے بدن کو پگھلا کر
کیسے سونے میں تبدیل کیا جائے
اوراپنے گھونسلے کی
دیواروں کو
اور بلند کیا جا ے
بارش زر سے
چٹیل مید ا نو ں میں
اُگتی ہوئی عمارتیں
اوردھواں اُگلتی ہوئی چمنیا ں
چوس چوس کر
انگنت آ ہنی
اور صندلی ہاتھوں کو
روشن کررہی ہیں
چند گھونسلے

عجیب سرکس ہے یہ
جہاں عجیب کرتب ہورہے ہیں
اور بے چارہ جوکر
آنکھوں میں حیرتی حلقے لئے
سوچ رہا ہے کہ
کب پردہ گرے
اوروہ
پہلے اوردوسرے شو کے
درمیانی وقفے
میں آرام کرلے !

☆☆☆

انگریزی نظم : میکسن کیومن　　　　　　　　اُردو ترجمہ: رفیق انجم

پس من تو شدم تو من شدی

پسِ وصال منتظر ہے سمجھوتہ
جسم لوٹ جاتے ہیں
اپنی اپنی سرحدوں میں
میرے پیروں کو تمھارے بازو
اپنے گھیرے میں لے لیتے ہیں
ہماری انگلیوں کے حلقے ہونٹ
اپنی ملکیت کا اظہار کرتے ہیں
بستر جمائی لیتا ہے

ایک دروازہ بے مقصد کھل جاتا ہے
اور چھت کے اوپر سے ایک جہاز
پُر شور موسیقی کے ساتھ
نیچے کی جانب آتا ہوا
کچھ بھی نہیں بدلا
بجز اس لمحہ کے
جب
وہ بھیڑیا جو ذات کے باہر
ایستادہ تھا
دھیرے سے لیٹ کر سو گیا ہے!

☆☆☆

کیل ایسپ مارک [سویڈن]

اردو ترجمہ: صبا اکرام

پتھروں میں تحریر

قریب آؤ
مرے کچھ اور بھی نزدیک ہو جاؤ
کہ میں بھی سنگ کے اندر سے
بڑھتا ہوں تمہاری اُور
تم بھی انگلیوں کو میری
اپنی انگلیوں سے چھو کے دیکھو گے
تو دل کی دھڑکنیں محسوس کر لو گے
وہیں سے
اپنی دنیا سے
لگی ہے سازشِ بے نام کی صورت
جو میری جان کے پیچھے

☆

مجھے یوں تو نہیں اب یاد
کیا تھی زندگی اپنی مگر شاید
مری تحریر نے رستہ نکالا تھا
مرے اندر بسی اک ذات کی جانب
جسے خود میرے ہی لفظوں میں رہنا تھا
کوئی چاہے اگر ملنا
تو وا ہے در چلا آئے

☆

مجھے لگتا ہے جیسے میں کوئی
گاؤں کا باسی ہوں
مری جانب اگر چاہو کبھی آنا
تو جھک کر
پتھروں کے پاس اپنے کان لے جاؤ
سنو گے تم مرے افکارِ زندہ کی صدا اس طرح
جیسے کوہ کے دامن میں جاتی
بیل گاڑی کی کراہیں ہوں

☆

سویڈش نظم

•اردو ترجمہ: صبا اکرام

بہت ممکن ہے
میں نے اک خطیبِ کامراں کی طرح
لوگوں کی بڑی اک بھیڑ
اپنے ساتھ کر لی ہو،
کبھی اوران کبھی کچھ ایسی باتوں سے
رمق جن میں بظاہر زندگی کی ہے
مگر جو اصل میں دھوکہ ہیں جیون کا

☆

قریب آؤ
ذرا اس سنگ کے سینے میں
تھوڑی دور تک اُترو
مجھے آواز دو
پھر میں بتاؤں گا
تمہاری کیا حقیقت ہے
اگر تم چند لمحوں کے لئے آنکھیں مجھے دو گے
تو میں تم کو دکھاؤں گا وہ دنیا
جو انوکھی ہے
اگر دو چار سانسیں دو گے تم اپنی
گھڑی بھر کو
تو یوں محسوس ہوگا
ایک لمبی عمر کاٹی ہے
حیاتِ خضر جیسی زندگی تم نے گزاری ہے!!

☆☆☆

شاعرِ فطرت نا۔دھو۔مہانور

●تعارف و ترجمہ :اسلم مرزا

۱۹۶۰ء کی دہائی میں مراٹھی شاعری کو نئے نظریات ،خوبصورت لفظیات اور منفرد اسلوب سے زردار کرنے والے شعرا کی قلیل تعداد میں ایک اہم نام بلند پایہ شاعر، ادیب اور کاشتکار جناب نام دیو ڈھونڈو مہانور کے نام سے معروف ہیں۔ مراٹھی شاعری کے قدردان انھیں سچا ''دیہی شاعر'' یا'' کسان شاعر'' سمجھتے ہوئے ان کی نظموں کو'' جنگل کی سبز زبان'' کی حیثیت سے شناخت کرتے ہیں۔ مہانور کی شاعری کے بارے میں مراٹھی ناقدین کی رائے ہے کہ جس طرح وندا کرندیکر، گریش اور آرتی پربھو نے گذشتہ تیس، پینتیس برسوں سے اپنی نظموں کی تازگی اور قدرت کو برقرار رکھا اس روایت میں مہانور بھی شریک ہیں۔ مہانور کی شاعری نے مراٹھی کے جدید اور مابعد جدید شعرا کی دونسلوں کی ذہنی آبیاری کی ہے۔ مہانور کی شاعری پر بال کوی اور بہنا بائی کی شاعری کے گہرے اثرات رہے لیکن وہ چاہتے تھے کہ ان کی اپنی شاعری میں ان کا اپنا چہرہ ہی نظر آئے۔

موضع پلسکھیڑ، تعلقہ سوئیگاؤں، ضلع اورنگ آباد کے ایک کسان خاندان میں ۱۶ر ستمبر ۱۹۴۲ء کو نام دیو مہانور کی پیدائش ہوئی۔ یہ ۶ر بھائیوں میں سب سے بڑے ہیں۔ خاندان بہت بڑا تھا اور آمدنی کے وسائل کم، اس لیے ابتدائی زندگی کسمپری میں گزری۔ گاؤں کے اسکول میں تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ ساتویں جماعت میں پہنچے تو ۲۸ر جون ۱۹۵۵ء کو صرف چودہ سال کی عمر میں ان کی شادی ناسک کی سلوچنا بائی سے کردی گئی۔ بڑی مشکل سے انھوں نے ہائی اسکول میں داخلہ لیا لیکن عمر کے اٹھارہ سال ہی میں تعلیم ترک کرکے اپنے آبائی کاشتکاری کے پیشے کی ذمہ داریوں میں الجھ گئے۔

نام دیو مہانور کو بچپن سے کھیتی باڑی کے کاموں سے گہری دلچسپی رہی لیکن انھوں نے اپنا مطالعہ جاری رکھا۔ اس دوران انھیں لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ وہ کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے اور اپنی تک بند شاعری اپنی بیوی کو سناتے۔ کاشتکاری کی صعوبتوں، جنگلوں کی سیر اور فطرت کی گود میں پلتے ہوئے ان کے مزاج میں حالات سے سمجھوتا کرنے، ان پر قابو پانے اور ان سے نمٹنے کی حیرت انگیز صلاحتیں پیدا ہوگئیں۔ کاشتکاری کرتے ہوئے جب کوئی خیال سوجھتا، کوئی مضمون ذہن میں آتا تو وہ فوراً اسے لکھ لیتے اور یوں ۱۹۶۰ء کے آس پاس ان کی باقاعدہ شاعری کا آغاز ہوا۔

مہانور کے مطابق فطرت کے ذرّے ذرّے میں اور عوامی زندگی ان دونوں میں شدید ہم آہنگی ہوتی

ہے۔ انھیں عوامی زندگی اور عوامی فنون سے رغبت رہی۔ کھیتوں میں ایک دھیمی دھیمی موسیقی بجتی رہتی ہے، وہ اس موسیقی سے کھیت اور کھلیانوں کی خوبصورتی سے اور سُر تال سے ہم آہنگ ہوگئے، جب ہوائیں چلتیں، فصلیں لہلہاتیں ، بادل گرجتے، رم جھم بارش ہوتی، پرندے ایک لَے میں چہچہاتے اور اڑتے چلے جاتے، درختوں پر بندھے ہوئے جھولے ایک لَے اور تال میں نیچے سے اوپر جاتے، اوپر سے نیچے آتے، تالاب کے پانی پر کرنیں رقص کرتیں، مور رقص کرتے، جانور جگالی کرتے تو یہ سب ان کی روح میں ایک نئی تازگی کو بیدار کرتے اور اسی خوبصورتی اور موسیقی کو انھوں نے اپنی شاعری میں جذب کرلیا۔ انھوں نے کسانوں کی زندگی اور کاشتکاری کے شب و روز کو لفظوں کا پیراہن عطا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن انھیں اس بات کا اعتراف ہے کہ فطرت کو اس کی تمام جادوگری کے ساتھ لفظوں میں قید کرنا ایک بہت بڑا چیلنج ہوتا ہے۔ انھیں پودوں اور درختوں کے پتوں پر، گھاس پر اور مٹی کے ڈھیموں پر شبنم کی بوندوں میں نورنگ دکھائی دیتے ہیں اور یہ تجربہ ان کے لیے عجیب و غریب اور حیرت انگیز ہوتا ہے۔

مہانور کا اولین شعری مجموعہ रानातल्या कविता (جنگل کی نظمیں) ۱۹۶۷ء میں جب منظر عام پر آیا تو ان کی شہرت کو پر لگ گئے۔ مراٹھی شاعری میں یہ منفرد شعری تجربہ تھا۔ اس کے بعد انھوں نے پروفیسر چندر کانت پاٹل کے ساتھ ۱۹۴۵ء اور ۱۹۶۵ء کے درمیان ابھرنے والے مراٹھی کے جدید شعرا کی ایک مختصر انتھالوجی पुन्हा कविता (پھر نظم) کے عنوان سے شائع کی اور اس طرح روایت اور جدیدیت سے ان کا سابقہ ہوا۔ اب ان کی ادبی زندگی کا ایک طویل سفر شروع ہونے جارہا تھا۔

مہانور نے مراٹھی شعر و ادب کو نہ صرف دیہی شاعری کی جمالیات سے روشناس کیا بلکہ کاشتکاری میں بھی نئے نئے تجربات کرتے ہوئے اپنے کھیتوں میں اناج کی پیدائش کو فزوں تر کرنے کی حتی الامکان کوششیں کیں۔ انھوں نے جدید تکنالوجی کو اپنایا اور اطراف کے کسانوں کو اس سے متعارف کیا۔ مہانور کی شعری، ادبی اور دیگر موضوعات پر بے شمار کتابیں اب تک شائع ہو چکی ہیں۔

مہانور کی چند بہت ہی خوبصورت نظموں کو موسیقار پنڈت ہردے ناتھ منگیشکر اور دیگر موسیقاروں نے سریلی دھنوں پر ترتیب دے کر بعض مراٹھی فلموں میں شامل کیا ہے۔ ان کے یہ گیت عوام میں بہت پسند کیے گئے ہیں۔

مہانور کو حکومت ہند نے پدم شری کے خطاب سے نوازا ہے۔ آپ ۱۹۷۸ء تا ۱۹۸۴ء اور اس کے بعد ۱۹۹۰ء تا ۱۹۹۲ء یعنی دو مرتبہ مہاراشٹر لجسلٹو کونسل کے نامزد رکن بھی رہے ہیں۔ ۲۰۰۰ء میں انھیں ان کے شعری مجموعہ ''پت جھڑ'' پر ساہتیہ اکادمی نے انعام سے نوازا ہے۔

آپ نے ہندوستان کے مختلف شہروں کے علاوہ یوروپ اور امریکہ کا سفر بھی کیا ہے۔ آپ اپنے گاؤں پلسکھیڑہ میں رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ آپ کا پتہ یہ ہے:

Na-Dho. Mahanor" ,Swapangandha",Palskheda - VIA Ajantha,
Dist. Aurangabad. Phone : 025722600

[اسلم مرزا]

کھیت کی سبز زبان

کس قدر لگاؤ ہو گیا ہے
اس کھیت سے
سکھ میں، دکھ میں
ایک دوسرے کے خیر خواہ
ہنسے روئے مل کر ساتھ ساتھ
اور اب
یہ دل اس کے ساتھ
ایسا بندھ گیا
کہ میں
کھیت کی سبز زبان کا
ایک لفظ بن چکا ہوں۔

☆☆☆

درخت آنکھیں چراتے ہیں

درخت اس سے آنکھیں نہیں ملاتے
وہ جانتے ہیں اس کی بلی جیسی آنکھیں
اُن آنکھوں کی دیدہ دلیری اور انکا ڈر اور
کئی برسوں کی رفاقت
خوشبو چنبیلی کے پھولوں کی
اور انھی پھولوں کے دست بند

عین موسم میں
خشک ہو گئے انگور کے باغ
علم ہے اُسے ان سے بھی زیادہ
بے شمار باتوں کا
سب کچھ........سب کچھ
آج کئی دنوں بعد اُس نے اپنے بال سنوارے
اور جوڑے میں سجائے چنبیلی کے پھول
تالاب کے ٹھہرے پانی میں
اس نے خود کو بغور دیکھا
آنکھوں میں آنکھیں
اس نے اپنی آنکھوں سے آنکھیں چرائی
تالاب میں بادل۔سرکتے، سرکتے
چنبیلی کے پھولوں پر۔پھولوں کے اردگرد
تجربہ کار رشیالی آنکھوں کے اطراف پھیل گئے
وہ آسمان کو اپنی کولی میں بھرنا چاہتی ہے
تالاب کے پانی میں
درخت اس سے آنکھیں نہیں ملاتے۔

☆☆☆

● نا۔ دھو۔ مہانور

اے مہربان بادل !

اے مہربان بادل
اپنا سرمئی تاج ایک مرتبہ سر پر رکھ لے
اور نکال باہر کر
جو کچھ ہے تیرے دل میں
شدید گھن گرج کے ساتھ
صاف دلی سے معاف کردے
اس ملک کے کمزوروں اور ناتوانوں کو
موسلا دھار بارش میں
کھڑا ہونے دے اس ملک کو
یہ انسان، یہ چرند، پرند
زندہ رہنے دے انھیں
گھونسلوں میں اپنے اپنے
امن اور چین کے ساتھ
تاریکی سے
دوبارہ روشنی کی سمت جانے والا
اپنا دائمی آشیرواد دے
گھنگھروؤں کی تال پر دور تک
پھیلے ہوئے کھیتوں میں بوائی ہوگی
ہر ایک باندھ پر
قطار در قطار دیپ جگمگا اٹھیں گے
سبز چوڑیاں اپنے گھروں کی دہلیزیں
لیپیں پوتینگی گوبر سے
رنگولی سجائیں گی
مٹی کے ڈھیموں سے ہر طرف
ابلتی ہوئی مہک پھیل جائے گی
پیپل کے پیڑوں پر
ندی نالوں پر
پرندے آئیں گے سمندر چھوڑ کر
گیت گائیں گے
راشٹریہ گیت جیسے خوبصورت اور مقدس
تیرا تنہا آنا ہی کافی ہے
اس کے علاوہ ہمیں کسی سے کچھ بھی نہیں مانگنا
اے مہربان بادل !

☆☆☆

پانی میں منجمد ہوگئیں پرچھائیاں

پانی میں منجمد ہوگئیں پرچھائیاں
ساحل خاموش، پرسکون
گھٹنے گھٹنے پانی کے اوپر
لڑکھڑائی قرمزی جھلک

● نا۔ دھو۔ مہانور

وہ عجلت میں حواس مجتمع کرتی ہے اور
اپنی رانوں میں الجھنیں سمیٹتی ہیں
اور صاف شفاف بدن کی دھوپ
پانی میں چھلک پڑی
درختوں میں آنکھیں اُگ آئیں
آنکھوں میں سمایا نہیں وہ روپ
رانوں میں الجھنیں سمیٹے
وہ خاموش کھڑی ہے آئینے میں !

☆☆☆

الفاظ پرندوں کی طرح ہوتے ہیں

پرندوں کی بولی سمجھ میں نہیں آئی کبھی
لیکن، آنکھوں کی مناسبت سے
چہچہاتے لفظوں کے ساتھ بھی
کچھ ایسے ہی ہوا
منعکس ہوئیں ندی کے پانی میں
روشنی کی لکیریں
سبز پتوں کے جھرمٹ میں
بالکل اچانک
جگمگا اٹھیں اس کی آنکھیں
اس نے دریافت کیے
دھوپ۔ چھاؤں کے معنی
وہ بھی آنکھوں سے
مجھے عادت ہوگئی تھی
اس لیے میں نے بھی الفاظ استعمال نہیں کیے
میری آنکھوں کے تالاب میں
طاؤسوں کے پر، پیروں کی رم جھم
مرتعش سبز پتوں کے جھرمٹ کی طرح
میں نے بھی اپنی پلکوں کی جنبش سے
اس کے معنی پوچھے اُس سے
اُسے ایک انجانی پھریری آئی
اور وہ کپکپا اٹھی مورنی کی طرح
اس نے گیت گائے بغیر لفظوں کے
پانی پر رقصاں دھوپ چھاؤں کے۔
تالاب میں غرق ہوتے وقت
دونوں کے پر سمٹ گئے
ہلکے پھلکے چند الفاظ اس کے
پرندے کی طرح

☆☆☆

گیت بجھ گئے

میں نے
کسی زمانے میں چڑیوں کو دانے ڈالے تھے
اب بھی پھر پھر کرتی، اڑتی، دروازے پر آئیں
کسی دور دراز ملک کی ایک چڑیا نے
میرے لفظوں کے پاس اپنا نشیمن بنایا
اور چلی گئی۔
اس دیہات کی فلاح و بہبود کے لیے
میں نے بہت کچھ کیا
اپنی زندگی کے قیمتی لمحے دیے
دیکھے ہیں میں نے مجھ پر جال ڈالنے والے
وہی، جنھیں میں نے اپنے منہ کا آدھا نوالہ دیا۔
دیہات کی طرف چلو، دیہات کی طرف چلو
کس کی خاطر؟ کس کے لیے؟
جاہلوں کے ہاتھ میں طاقت اور سیاہ کاٹھی
ان کی پرچھائیوں تلے
بھیڑیوں کے ڈیرے
جنھوں نے اپنے شفاف مفاد کی خاطر
انسانوں کو میلا کر دیا۔
کسی کی جان چلی جائے
ان کے کرسی کے کھیل جاری
مہاتما کی تخلیق کے نیچے آگ لگائی
ان کی حرکتوں نے سچائی کو پارہ پارہ کر دیا
پورے گاؤں کو تہس نہس کر دیا
بھری برسات میں
انسان کو کہاں تلاش کریں،
کوسوں دور تک سب ویران
دور ہیں عزیز و اقارب میرے
الفاظ بھی ہیں اداس
مندر میں ٹمٹماتا مدھم چراغ
لبوں پر آئے ہوئے گیت
لفظوں کے ساتھ ہی بجھ گئے۔

☆☆☆☆

یخ بستہ رات

یخ بستہ رات
سرد ہوائیں
بھیگی بھیگی
نم جوار پر

● نا۔ دھو۔ مہانور

چاندنی کا چمکیلا روغن
دور، جھلملاتے چراغوں کی روشنی
اور بیدار گاؤں
میں
یہاں تنہا۔
اپنی گدڑی سے ہم آغوش۔

بھراپُرا گاؤں
اور وہ
اس گاؤں میں تنہا
اور وہ
اس گاؤں میں تنہا
اکیلی۔

☆☆☆ ☆☆☆

زندگی بہہ گئی

بار بار سدھارتی ہے
لیپا پوتی کرتی ہے
چھلکے ہوئے چھپّر کی دیوار کو۔
گیلے اُپلوں کو چولھے میں
پھونکتی رہتی ہے بار بار
آنکھوں میں آئے ہوئے پانی کی طرح
نادانستگی میں بہہ گئی زندگی۔
چہار سمت سیاہ دھول
آنکھوں میں بے لفظ کہانی
برہنہ پاؤں
راستے چلے گئے ہیں دور دور
اس کی زندگی کی طرح

دعوت
تھکن سے آنکھیں چور ہو گئیں۔
آ 'پرندے کی طرح
پھر چلا جا۔
کھیت جوبَن پر ہے
ذرا۔ آ
کھڑی فصل میں ہنگامہ مچا،
اور چلا جا۔

☆☆☆

ہمارے لیے کم ہیں

اک اک دانے سے
پھوٹ رہی ہیں کونپلیں
جیٹھ کا مہینہ
بھیگی بھیگی مہک
جذب ہو گئی ہے مٹی میں۔

ہر طرف، لہراتے ہوئے پرندوں کے پر۔
آسمان کی وسعتیں بھی
کم ہیں ہمارے لیے۔

☆☆☆

پرندہ

کل
کپاس چنتے ہوئے وہ اچانک ٹھٹکی
اس نے سنا
دریا کے کنارے مٹی کے رودے پر اُگی
گھاس
پانی کے کانوں میں
سرگوشیاں کرتے ہوئے
اسے کسی بات پر اُکسا رہی تھی۔
میں نے اسے کئی مرتبہ سمجھایا اور جان گیا
نہیں۔ نہیں۔ نہیں
ایسا کچھ بھی کبھی ہوا ہی نہیں۔

میں نے اُسے
صرف ایک پکا ہوا انار دیا
شام کے وقت
اور جہاں اس کا پیر پھسلا تھا
مجھے ہنسی آ گئی۔
لڑھکتے ہوئے الفاظ بے لگام ہوتے ہیں
میں خود پر کیسے قابو پاؤں
قرمزی دھوپ میں
ناراض جنگل میں۔
نرم و نازک خوبصورت پرندہ

☆☆☆

قاضی عبدالستار کی روودادِ عشق

● مصاحبہ کار : ڈاکٹر راشد انور راشد

راشد: قاضی صاحب! عشق کا فلسفہ بے حد پیچیدہ ہوتا ہے، اس کے باوجود کم وبیش ہر انسان اس فلسفے کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہر انسان وادیِ عشق میں قدم رکھنے کے لیے مجبور ہوتا ہے، اور جب وہ عشق میں گرفتار ہوتا ہے تو رفتہ رفتہ فلسفۂ عشق کے مختلف رموز ونکات سے کچھ کچھ آگاہی ہونا شروع ہوتی ہے۔ فلسفۂ عشق کو مکمل طور پر تو کوئی نہیں سمجھ پاتا لیکن اتنی بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ عشق کے مرحلے آسان نہیں۔ منزلِ عشق تو کم ہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے لیکن راہِ عشق کے نشیب وفراز ہی فلسفۂ عشق کو وقار عطا کرتے ہیں۔ آپ نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں عشق کی مختلف النوع کیفیتوں کو جس فن کاری کے ساتھ پیش کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ جب آپ کے فن پاروں میں عشق کی مختلف جہتیں دیکھنے کو ملتی ہیں تو یہ ممکن ہی نہیں کہ آپ کی زندگی کی کتاب، بابِ عشق سے خالی ہو۔ پتہ نہیں مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ عشق کے سلسلے میں ایک آدھ نہیں، بلکہ کئی واقعات آپ کی زندگی سے وابستہ رہے ہوں گے۔ برائے کرم اپنی زندگی کے ان لمحوں کو تازہ کرنے کی کوشش کریں جو یقیناً افسانوں سے زیادہ دلچسپ ہوں گے۔

قاضی عبدالستار: بھئی راشد صاحب، آپ نے ایک ایسا سلسلہ چھیڑ دیا جو مجھے کئی دنوں تک پریشان کرتا رہے گا۔ زندگی میں بہت سی باتیں وقت گزرنے کے ساتھ دھندلی ہوتی چلی جاتی ہیں، لیکن عشقیہ لمحات ذہن میں پوری تازگی کے ساتھ ہمیشہ محفوظ رہتے ہیں۔ عشق کے سلسلے میں ایک نہیں چار واقعات ہیں اور چاروں ہی ایک دوسرے سے مختلف، لیکن کسی کو کسی پر فوقیت نہیں دی جا سکتی۔ میں فرداً فرداً زندگی کے ان حسین لمحوں کو بیان کروں گا۔ میرا پہلا عشق: انٹرمیڈیٹ کے زمانے میں ہوا۔ پرانے سیتاپور کے ایک الگ تھلگ محلّے ترین پور میں تین عمارتیں مشہور تھیں: محل، وارث منزل اور راجہ سروپ نرائن کی کوٹھی۔ محل، ایک بڑی عمارت تھی جسے انگریزوں نے توڑ کر وہ سڑک نکالی جو فتن سرائے چوراہے کو جی ٹی روڈ سے ملاتی ہے۔

ترین پور سے جب ہم چلتے تو کھڑ نجے کے ڈھال سے نیچے اُترتے، فتن سرائے کی سڑک کو کراس کرتے، پھر چڑھتے اور محل کے ایک کونے پر ایک انصاری کے مکان کے سامنے سے پھر نیچے اُترتے تو انگریزی شاعری میں جو نقشہ بروک کا ہوتا ہے، وہی تصویر سامنے ہوتی۔ یعنی نشیب میں حد نگاہ تک ہریالی اور داہنی طرف سے سرائن ندی کی ایک شاخ پتلی سی لکیر کی طرح گزرتی ہے اور اس پر لکڑی کا پل بنا ہے جس پر ہوتے ہوئے ایک چوڑی چکلی پگڈنڈی پر چلتے ہوئے امرودوں کے باغ سے گزرتے پکے پل پر چڑھ جاتے۔ پکے پل سے ہمارا اسکول سو گز پر تھا۔ میں انٹرمیڈیٹ میں پڑھتا تھا۔ سائیکل میرے پاس تھی، لیکن میں چلاتا نہیں تھا۔ وہ ہماری آمدنی کا ایک ذریعہ تھا کہ آج یہ خراب ہوگیا، آج وہ خراب ہوگیا۔ امّاں سے پیسے مل جاتے تھے اور زندگی مزے میں گزرتی تھی۔ میں عام طور پر اسکول اکیلا جاتا۔

ایک دن میں ڈھال سے اُتر رہا تھا کہ ایک خوش بدن سی لڑکی پل سے گزر رہی ہے۔ میں تیز قدم چل کر اس کے برابر آگیا۔ صورت دیکھی تو عجیب سی بھولی بھالی شرمائی ہوئی سی شکل تھی۔ بہت اچھی لگی۔ ہم اس کے ساتھ چلے تو وہ آہستہ ہوگئی۔ ہم بھی آہستہ ہوگئے۔ خیر امرود کے باغ تک پہنچے تو میں نے امرود خریدے۔ ایک پیسے کے چار، اور میں نے اسے انتہائی بے تکلفی اور پوری ہمت کے ساتھ ایک امرود پیش کیا۔ اس نے انکار کردیا۔ اس نے کہا: میں نہیں کھاتی۔ ہم اصرار کرتے رہے، وہ انکار کرتی رہی۔ بہرحال اس امرود نے تقریب کلام تو پیدا کردی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ آپ کا اسکول کتنے بجے ختم ہوتا ہے۔ اس نے بہت شرما کر جواب دیا: میرا مشن اسکول چار بجے تک ہے۔ ہمارا کالج بھی چار بجے تک تھا۔ میں چار بجے سے کچھ پہلے پکے پل پر آگیا اور اس کا انتظار کرنے لگا۔ جب وہ میرے قریب آئی تو مجھے اس کی نظروں میں شناسائی کا احساس ہوا۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ بڑی حیرت ہوئی کہ وہ وارث منزل کے پائیں باغ کے نیچے جو گلی ہے، اس کے سامنے ایک دو منزلہ مکان میں رہتی ہے۔ اس مکان میں ایک ڈپٹی کلکٹر کرائے پر رہتے تھے۔ میں نے اس کو پہنچا کر طے کرلیا کہ اس سے دوستی کرنی ہے، اس لیے کہ اسی گھر کا لڑکا میرے دوستوں میں تھا۔ اس کا نام تھا تقی اللہ کرمانی تھا۔ شام کو ہم لوگ وارث منزل کے سامنے میدان میں ہاکی کھیلتے تھے۔ تقی بھی آتا تھا۔ ایک دو دن کے بعد ہم نے تقی سے پوچھا کہ: یہ لڑکی جو آپ کے یہاں سے مشن اسکول میں پڑھنے کے لیے جاتی ہے، کون ہے۔ اس نے بتایا: یہ ہمارے ابا جان کی مرحوم بہن کی اکلوتی بیٹی ہے اور ان کے ابا جان بھی مرگئے ہیں اور یہ ہمارے ابا جان کے پاس رہتی ہے۔ تقی کی ایک بہن لکھنؤ کرامت حسین گرلز کالج میں پڑھتی تھی۔ اس کے کپڑے لتے، تقی کا لباس اور قمر کے کپڑوں میں بہت فرق تھا۔ اس فرق نے دل میں اور ہمدردی پیدا کردی۔ میں تقی کے ساتھ کیرم کھیل رہا تھا کہ وہ ڈرائنگ روم میں آئی، یہ پوچھنے کے لیے کہ آپ چائے پئیں گے۔ تب تقی نے جواب دیا چھبّن بھائی سے پوچھو۔ اس نے مجھ سے پوچھا: آپ چائے پئیں گے۔ میں نے جواب دیا: آپ کے ہاتھ کی چائے سے کون

انکار کر سکتا ہے۔ وہ شرما کر چلی گئی۔ تقی پر اس جملے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اب خیال آیا کہ تقی کی والدہ اکثر وارث منزل آتیں اور وارث منزل کی خواتین بھی ڈپٹی صاحب کے یہاں جاتیں۔ ایک دن میں نے تقی سے ایک سوال کیا کہ: تمھارے گھر سے مشن اسکول بہت دور ہے۔ قمر چھوٹی ہے۔ یہ اکیلی پیدل اسکول جاتی ہے۔ تقی نے بہت لاپرواہی سے جواب دیا: ہمارا چپراسی ان کو پہنچانے جاتا تھا لیکن اس کی سائیکل چوری ہوگئی۔ اس لیے اب یہ پیدل جاتی ہے۔ میں نے کہا: تم میری سائیکل لے لو۔ اس نے جواب دیا: یہ بات ابا جان کو پسند نہیں ہوگی۔ چند روز کے بعد میں نے قمر سے کہا کہ آپ میرا انتظار کیا کیجیے تاکہ میں آپ کے ساتھ چل سکوں، میں نہیں چاہتا کہ آپ اکیلی جائیں۔ میں نے اپنا راستہ بدل دیا اور جب میں کوٹھی کے سامنے سے گزرتا تو وہ تیار ملتی۔ کبھی کبھی مجھے انتظار کرنا پڑتا۔ ڈپٹی کلکٹر کی بیگم کو یہ بات معلوم ہوگئی، لیکن انھوں نے کسی ناگواری کا اظہار نہیں کیا۔ قمر جتنی شرمیلی تھی، اس سے زیادہ شرمیلے ہم خود تھے۔ ہم دونوں کے درمیان کی ساری گفتگو امرود اور کیرم کے اردگرد گھومتی اور بس۔ ایک دن ہم اور تقی کیرم کھیل رہے تھے کہ وہ آئی۔ اس نے مجھ سے پوچھا: آپ سوئیٹر بنوائیں گے۔ میں نے کہا: ہاں میں بنواؤں گا۔ کتنے میں بُنتا ہے۔ اس نے کہا: شاید چھ یا سات روپے میں اون آتا ہے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے میں کل بتاؤں گا۔ ہم رہتے سیتاپور میں تھے، لیکن ہمارے کپڑے مچھریٹہ میں دھلتے تھے۔ ہر سنیچر کو ملازم کپڑے، انڈے، حلوے، گھی وغیرہ لے کر آتا تھا اور میلے کپڑے لے جاتا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ خبر بھیجی اپنی اماں کو کہ دس روپے بھیج دیجیے۔ میں سوئیٹر بنواؤں گا۔ دوسرے سنیچر کو پیسے آگئے اور میں نے نیلے رنگ کا اون خرید کر قمر کو دیا۔

آٹھ دس دن گزرے تھے کہ اس نے مجھ سے کہا کہ میں آپ کا ناپ لوں گی، تو پہلی بار اس نے میرے جسم کو ہاتھ لگایا۔ یہ محسوس ہوا جیسے دونوں شانوں میں آگ لگ گئی، جو سینے کو پھونکتی ہوئی کمر تک پہنچ گئی اور جب اس نے ہاتھ ہٹا لیے یعنی ناپ لے لی تو بہت افسوس ہوا۔ اب ہمارے ساتھ وہ کیرم بھی کھیلنے لگی۔ اب ہماری بے قراری اتنی بڑھ گئی کہ ہم پائیں باغ میں لگے کمرخ کے درخت کی شاخ پر بیٹھ کر ریلنگ میں کھڑی قمر کو دیکھنے کے لیے دیر تک بیٹھے رہتے۔ پھر وہ سوئیٹر بن گیا، اور ہم نے اسے بہت شوق سے پہنا، اور اسے برسوں پہنا۔ خیر اب ہمارے درمیان خطوط کا تبادلہ بھی ہونے لگا۔ اس کا مضمون بڑا دلچسپ ہوتا۔ آپ نے کھانا کھایا؟ آپ کے کھانے میں کیا تھا، کل جو امرود آپ نے کھایا تھا وہ کیسا تھا، کیا ترکیب کی جائے کہ ہم دونوں ایک ساتھ فلم دیکھیں۔ دیکھیے آپ یہ یاد رکھیے کہ میں ایک یتیم لڑکی ہوں۔ اگر ماموں جان کو کچھ معلوم ہوگیا تو گھر سے نکال دی جاؤں گی، اس لیے آپ ایسی خواہشات کا اظہار مت کیا کیجیے۔ میں نے نوٹنکی کے اداکاروں کی طرح سینے پر ہاتھ مار کر کہا کہ اگر آپ کے ماموں جان آپ کو نکال دیں گے تو ہم آپ کو اپنے گھر لے جائیں گے۔ دیکھیے ہم اکیلے ہیں۔ ہماری ایک چھوٹی سی بہن ہے اور ماں ہے اور ہمارے پاس جائداد ہے، ہم کسی کے محتاج نہیں ہیں۔ ہم اور آپ ٹھاٹ سے رہ سکتے ہیں۔ وہ چپ سنتی رہتی، خاموش رہتی، کبھی کبھی

آب دیدہ ہو جاتی۔ فلموں میں دیکھے ہوئے ہمارے ڈائیلاگ سن کر وہ چپ رہتی۔ آج خیال آتا ہے کہ لڑکی، لڑکے کے مقابلے میں کم عمری کے باوجود کتنی بالغ ہوتی ہے۔

پھر پورا ایک سال گزر گیا۔ ایک بار میں نے اپنی اماں سے ذکر کرنے کی بڑی کوشش کی، لیکن ہمت نہیں پڑی۔ میں نے اپنی چچی جان بیگم قاضی محمود علی سے دوسرے جاڑوں میں کہا۔ یعنی اب میں انٹرمیڈیٹ فائنل میں آ گیا تھا۔ میں نے چچی جان سے گزارش کی کہ اماں سے بات کیجیے۔ وہ بھی اماں سے بہت ڈرتی تھیں۔ فرمایا موقع محل دیکھ کر جب بھابھی جان کا موڈ اچھا ہوگا، تب کہوں گی اور تمھاری شادی ابھی کیسے ہو سکتی ہے۔ انٹرمیڈیٹ پاس نہیں ہو، بی اے کرو، ایل ایل بی کرو، وکالت پاس کرو، تب ہم تمھاری مدد کر سکتے ہیں۔ ہم سنتے رہتے اور سوچتے رہتے کہ سب کر کے دکھا دیں گے۔ مارچ کا مہینہ تھا، ہمارے امتحانات ہو رہے تھے۔ تقی ہائی اسکول کا امتحان دے رہا تھا۔

ہم دونوں امرود کے باغ میں داخل ہو رہے تھے۔ دونوں نے امرود خریدے۔ ادھر اُدھر دیکھ کر کھانے لگے۔ تقی نے کہا ایک خبر سنائیں تم کو چھبن بھائی۔ میں نے کہا ہاں سناؤ۔ کسی سے کہیے گا تو نہیں۔ ہم نے کہا ہرگز نہیں کہیں گے۔ اس نے کہا ہم لوگ پاکستان جا رہے ہیں۔ ابا جان کے ایک عزیز ہیں جو کراچی میں ہیں اور کسی بہت بڑی پوسٹ پر ہیں۔ انھوں نے بلایا ہے، ہم لوگ بہت خاموشی سے نکل جائیں گے۔ ابا جان کی ابھی بارہ چودہ برس کی ملازمت باقی ہے۔ وہاں ان کو بڑی پوسٹ مل جائے گی۔ وہ باتیں کر رہا تھا اور ہماری سماعت سُن ہو گئی تھی۔ ہم چل نہیں رہے تھے، لڑھک رہے تھے۔ ہمارے کان بجنے لگے تھے اور ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ تقی کو کس طرح خاموش کریں۔ اپنے دروازے پر پہنچ کر اس نے مجھ سے کہا کہ تمھیں کیا ہو گیا ہے چھبن بھائی۔ آپ چلیے میں ہاکی کھیلنے کے لیے آ رہا ہوں۔ چھبن بھائی آپ رو رہے ہیں؟ چھبن بھائی کیا ہو گیا، میں نے کہا نہیں میں نہیں رو رہا ہوں۔ تمھیں بس ویسے ہی لگ رہا ہوگا۔ اچھا میں چلتا ہوں۔ ہاکی کھیلنے ضرور آنا۔ میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ گم صم خاموش بیٹھا رہا۔ نوکر میرا ناشتہ رکھ گیا جو ویسے ہی رکھا رہا۔ میں نے اپنا لباس بھی تبدیل نہیں کیا کہ تقی آ گیا۔ ارے چھبن بھائی آپ تو یوں ہی بیٹھے ہیں۔ نہ نیکر پہنے ہیں، نہ ٹی کیپ لگایا ہے، ہاکی کیسے کھیلیں گے۔ تقی آج ہم تمھارے ساتھ ایسے ہی کھیلیں گے۔ اتنے میں ہماری ممانی جان یعنی بیگم قاضی جمیل الدین آ گئیں۔ تم اندر کیوں نہیں آئے؟ نہ تو تم نے ناشتہ کیا، نہ چائے پی، نہ ہی تم نے کپڑے تبدیل کیے۔ کیا بات ہے، مجھے بتاؤ۔ یہ رونے کی کیا ضرورت ہے؟ بیٹے کیا ہو گیا ہے؟ میں نے کہا: نہیں ممانی جان میں رو نہیں رہا ہوں۔ تو کیا آنکھوں سے پانی بہہ رہا ہے۔ بے وقوف کہیں کا۔ تقی بولے: آج پتہ نہیں اس کو کیا ہو گیا ہے۔ میں اُٹھا اور ہاکی لے کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ ممانی جان اسی طرح کھڑی تھیں۔ تقی کا دل بھی ہاکی کھیلنے میں نہیں لگا۔ اس لیے کہ میں فارم میں نہیں تھا۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گیا، ڈرائنگ روم میں

بٹھایا اور خود اوپر اپنی ماں کے پاس گیا کہ پتہ نہیں چھبن بھائی کو کیا ہوگیا ہے کہ انھوں نے ناشتہ نہیں کیا، چائے نہیں پی۔ میں کیرم کھیلنے بیٹھ گیا لیکن ہاکی کی طرح ہاتھ نہیں چل رہا تھا۔ اتنے میں قمر کشتی لے کر آئیں۔ اس میں دو کباب اور چائے کی پیالی تھی۔ ہمیشہ کی طرح وہ کشتی رکھ کر جانے نہیں لگی بلکہ کھڑی ہوگئی کہ کھا لیجیے۔ میں نے نگاہ اُٹھا کر دیکھا تو اس کی آنکھیں نم تھیں۔ میں خاموش بیٹھا رہا۔ تقی نے کہا چھبن بھائی کباب کھانے پڑیں گے۔ اس نے بھی کہا: اللہ کھا لیجیے نا۔ میں نے کباب کھا لیے۔ پیالی اُٹھائی تو اس میں ایک آنسو گر پڑا۔ تقی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ قمر بھاگ گئی۔ یہ چائے خراب ہوگئی۔ میں دوسری بناتا ہوں۔ میں نے کہا نہیں میرا ہی آنسو ہے نا اور میں نے چائے کا گھونٹ لے لیا۔ تھوڑی دیر میں تقی کی اماں جان آگئیں۔ چھبن میاں، آپ کی کسی سے لڑائی ہوئی ہے اسکول میں، یا کسی ماسٹر نے کچھ کہا ہے۔ تقی کہہ رہا تھا کہ آپ جب سے اسکول سے آئے ہیں، مسلسل رو رہے ہیں۔ میں نے بڑی مشکل سے، بڑے ضبط سے اپنے آپ کو سنبھالا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میں پھٹ پڑوں گا۔ میں ان کو کوئی جواب دیے بغیر اُٹھا اور تیر کی طرح واپس آ گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ڈرائنگ روم کے دروازے سے نکل کر چبوترے پر آ گئی تھیں اور مجھے دیکھ رہی ہیں۔ رات میں بخار آ گیا۔ ماموں جان نے سائیکل پر کسی کو بھیج کر میری ماں کو اطلاع کر دی۔ اس لیے کہ بخار ایک سو تین ہو گیا تھا۔ ماموں صاحب مجھے خود لے کر ڈاکٹر شیام سندر مشرا کے یہاں پہنچ گئے جو اُن کا دوست تھا۔ سب کا خیال تھا کہ میں اپنے باپ کی یادوں میں اچانک مبتلا ہو گیا ہوں۔ ڈاکٹر مشرا نے بھی کہا کہ اس کو Shock پہنچا ہے۔ شام کو اماں پالکی پر چڑھ کر آ گئیں۔ میں نے سوچا کہ اب اس راز کو فاش کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے، اس لیے کہ کرمانی صاحب کی روانگی میں صرف دو دن باقی ہیں۔ دوسرے دن میں ٹھیک وقت پر کالج کے لیے تیار ہوا اور لکڑی کے پل کے پاس انتظار کرتا رہا۔ وہ نہیں آئی۔ سارا دن گزر گیا۔ میں سوچتا رہا کہ آج ممانی جان نے کیوں روک لیا؟ تب میں تقی کو ڈھونڈھنے گورنمنٹ اسکول گیا۔ معلوم ہوا کہ تقی بھی نہیں آیا۔ میں پریشان ہو گیا اور گھر آ گیا۔ ڈپٹی صاحب کی کوٹھی پر پہنچا تو ان کا چپراسی کھڑا ہوا تھا۔ میں نے کہا تقی کو آواز دو تو وہ مسکرایا کہ وہ لوگ تو رات میں ہی چلے گئے۔ میں اپنی ماں سے اور سب سے جھگڑ کر بخار کی حالت میں نکلا تھا۔ اس خبر سے جیسے صحت ہو گئی۔ میرا بخار اُتر گیا۔ یہ عجیب بات ہے۔ چپ چاپ اپنے گھر چلا آیا۔ معلوم ہوا کہ تقی نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ صحیح تاریخ اس نے مجھے نہیں بتائی تھی، یا اس کے ماں باپ نے اس کو نہیں بتائی۔ بہر حال ہم نے وہ سوئٹر بہت احتیاط سے رکھ لیا۔ اس حسین و جمیل سوئٹر کے ہر پھندے میں نافہمیدہ آرزوؤں کا کارواں، نادیدہ خوابوں کے قافلے لرزاں ہیں۔ ان گلابی لانبی اور مخروطی انگلیوں کے مہکتے ہوئے لمس میں سارا سوئٹر شرابور ہو رہا ہے۔ جب میں اسے پہنتا تو محسوس ہوتا کہ میں اس کے کمرے میں کیرم کھیل رہا ہوں۔ ابھی وہ کسی کمرے سے طلوع ہوگی۔ خاموش، حیران اور التفات میں ڈوبی ہوئی، بے نیاز آنکھوں کے تکلم اور تبسم سے سارا کمرہ چھلکنے

لگے گا۔ ابھی میں اس کی دید سے آسودہ بھی نہیں ہوسکوں گا کہ وہ کسی دروازے میں غروب ہوجائے گی اور میں اس کے کزن تقی کے ساتھ خالی خالی آنکھوں سے ، مرے مرے قدموں سے چلتا ہوا ہاکی کھیلنے فیلڈ میں پہنچ جاؤں۔ ۱۹۴۸ء سے 1983ء تک وہ سوئٹر ایک قیمتی دولت کی طرح میرے پاس محفوظ رہا۔ ۱۹۸۳ء میں جب کوثر پر دورے پڑنے لگے اور انھوں نے میرے سب دھراؤ کپڑے ضائع کردیے تو معلوم ہوا کہ قمر کی انگلیوں کے لمس کی دولت کہیں کھوگئی۔ ہماری دھروہر غریب ہوگئی۔ ہمارا حافظہ مفلس ہوگیا۔

راشد: آپ کی روودادِ عشق سنتے ہوئے یہ اندازہ ہوا کہ حقیقی زندگی کے نشیب وفراز، افسانوں کے اُتار چڑھاؤ سے کہیں زیادہ حیرت انگیز اور جذبات سے پُر ہوتے ہیں۔ ایک معصوم محبت جس میں ہوس کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا، وہ بھی جذباتی سطح پر ہمیں حد درجہ انگیز کرسکتی ہے۔ نہ صرف تحریری طور پر بلکہ زبانی بھی آپ واقعات کا بیان اس طرح کرتے ہیں کہ سننے والا سحر میں گرفتار ہوجاتا ہے۔ پہلے عشق کی جس منزل پر پہنچا کر آپ دم لینے کو رُکے ہیں، کیا یہی اس روودادِ عشق کا انجام ہے۔ بظاہر تو ایسا معلوم نہیں ہوتا کہ ایک ادھورے عشق کا بیان آپ کی ترجیحات میں اوّلیت رکھتا ہو۔ آپ کے ناولوں اور افسانوں میں تو لازمی طور پر بہترین عشق کا کلائمکس موجود ہوتا ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ زندگی کی ایسی دلچسپ کہانی میں کوئی اہم موڑ نہ آیا ہو؟

قاضی عبدالستار: درست فرمایا آپ نے۔ کہانی ابھی مکمل نہیں ہوئی۔ کہانی کے اصل موڑ تو ابھی آئے ہی نہیں۔ درمیان میں تھوڑا استالینا ضروری ہوتا ہے۔ لگا تار بولنے سے پریشانی ہوتی ہے۔ عمر کا اثر ہے۔ بہرحال اس قصے کو جاری رکھتا ہوں۔ ۱۹۸۹ء میں جب ہم پاکستان گئے اور تقریباً پندرہ دن لاہور میں رہے۔ اخبار میں خبریں چھپتی رہیں۔ کسی مجلسِ ادب کے تحت ایک ''شامِ افسانہ'' کا انعقاد کیا گیا۔ ''نقوش'' کے مدیر محمد طفیل اس کے کنوینر تھے۔ میں کچھ پاکستانی دوستوں کے ساتھ کمرے میں بیٹھا تھا۔ جلسہ شروع ہونے میں دیر تھی کہ طفیل صاحب تشریف لائے۔ مجھ سے کہا کہ ایک لیڈی ڈاکٹر آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ میں نے سمجھا کوئی افسانہ نگار ہوں گی، یا افسانے سے دلچسپی ہوگی۔ میں ان کے ساتھ گیا، سفید کوٹ، سفید شلوار، سفید دوپٹے کے ہالے میں قمر کا بھرا بھرا سُرخ وسفید چہرہ جگمگا رہا تھا۔ اس کے منھ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ میرے منھ سے صرف اتنا نکلا — قمر۔ محمد طفیل سمجھ گئے۔ فوراً ہٹ گئے۔ ہم لوگ دیر تک کھڑے رہ گئے۔ میں گونگا ہوگیا تھا۔ وہ بھی بولنا بھول گئی تھی۔ اتنے میں ایک شخص عمدہ سوٹ پہنے کمرے میں آیا۔ قمر نے کہا چھمن بھائی ہمارے شوہر ڈاکٹر انور۔ میں نے اپنا لکڑی جیسا مردہ ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اس نے بہت گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ قہقہہ لگایا۔ چھمن بھائی، جب آپ کو پدم شری ملا تو ہماری بیگم نے ہماری دعوت کی تھی پہلی بار۔ قمر کے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔ اس جلسے کے بعد میں آپ کو لے چلوں گا۔ مجھے یاد نہیں جلسے میں کیا ہوا۔ میں تو قمر کو دیکھ رہا تھا۔ قمر مجھے دیکھ رہی تھی۔ ایسی پاکیزہ نظروں سے ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے کہ اپنی فرشتگی پر حیرت تھی۔ پھر ہم اس کے گھر گئے۔ انارکلی یاد ہے۔ اس کے بعد کا راستہ یاد

نہیں ہے۔ چھوٹی سی کوٹھی، دو بورڈ لگے ہوئے۔ ڈاکٹر انور قمر، ڈاکٹر قمر انور۔ دونوں لاولد۔ ڈاکٹر نے مجھے وہسکی صَرف کی، میں نے ذرا سے تامل کے بعد اس کا گلاس قبول کرلیا۔ قمر قسم قسم کے پکوان کھلاتی رہی۔ ہم کو کہیں کھانے پر جانا تھا۔ ہم نے وہ ملتوی کر دیا، اور ہم ڈاکٹر انور کے واسطے سے قمر سے باتیں کرتے رہے۔ ایک بار گھڑی دیکھی گئی تو معلوم ہوا کہ بارہ بج گئے ہیں۔ قمر پہلی بار میرے بہت قریب آئیں۔ چھمن بھائی، ہلکی ہلکی بارش ہو رہی ہے، جی چاہے تو یہیں ٹھہر جائیے، صبح چلے جائیے گا۔ نہیں نہیں۔ ہم جائیں گے۔ ڈاکٹر انور ہمیں گیسٹ ہاؤس تک پہنچا دیں گے۔ وہ دونوں ہمیں پہنچانے آئے۔ یہ وعدہ لے کر گئے کہ جب تک ہم لاہور میں ہیں، رات کا کھانا انھی کے ساتھ کھاتے رہیں گے۔ ایسے ہی کئی دن گزر گئے۔ گھنٹوں ہم دونوں کو تنہا رہنے کا موقع ملا، لیکن ہاتھ کے علاوہ ہم نے ایک دوسرے کے جسم کے کسی حصے کو نہیں چھوا۔ مجھے اپنے اوپر حیرت ہے کہ میں نے قمر کی محبت کا اتنا احترام کیسے کرلیا۔ قمر پر حیرت نہیں ہے۔ پاکستان میں وہ رات ہماری آخری رات تھی۔ ہم کو معلوم تھا کہ ہم قمر کے ساتھ آخری ڈنر لے رہے ہیں۔ ابھی ہم لوگ شاہی ٹکڑے تک پہنچے تھے کہ ڈاکٹر انور کا فون آگیا۔ ان کے کسی مریض کی حالت غیر ہو چکی تھی۔ وہ تولیہ سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اُٹھ گئے۔ واش بیسن پر ہم نے قمر سے کہا کہ تمھارا تحفہ ہمارے پاس آج بھی محفوظ ہے۔ اس نے ابروؤں کی کمانوں کو جوڑتے ہوئے پوچھا: کون سا تحفہ؟ سوئٹر۔ سوئٹر!! اللہ۔ سچ مچ۔ اپنے سر کی قسم۔ قسم بھی اپنے سر کی کھائیے گا۔ ہاں اسی پر تو اختیار ہے۔ بی بی جی کافی تیار ہے۔ تب ہم دونوں کو معلوم ہوا کہ ہم ہاتھ دھو چکے ہیں۔ قمر نے تولیہ پیش کرتے ہوئے پوچھا ہاتھ دھو چکے؟ ہم تو مدتوں پہلے ہاتھ دھو چکے۔ حافظہ دھندلانے لگا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ عمر بھر کے لیے جگمگانے کا سامان ہو گیا۔ ہم سگریٹ رول کر رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ڈاکٹر انور نے قمر سے کہا پروفیسر کو جانے مت دینا۔ ہم آ ہی رہے ہیں۔ اگر ہم کو اپنی خوش نصیبی پر یقین ہوتا اور یہ گمان بھی ہوتا کہ تم ہماری آنکھوں کو نصیب ہو جاؤ گی تو ہم اس کو پہن کر آتے۔ چاہے قمیص کے نیچے ہی پہننا پڑتا۔ پھر الفاظ ختم ہو گئے اور آنکھیں باتیں کرتی رہیں۔ پھر فون آیا کہ پروفیسر کو جانے مت دینا۔ ہم آ ہی رہے ہیں۔

لاہور اسٹیشن پر ڈاکٹر انور نے کہا: چھمن بھائی، آپ نے ہمارے گیٹ پر نیم پلیٹ دیکھی۔ کچھ خیال نہیں کیا ہے۔ کیوں؟ ہمارے ابا جان کا نام قمر الدین عابدی ہے۔ ہم ڈاکٹر انور قمر ہو گئے۔ جب ڈاکٹر قمر سے ہماری شادی ہوئی تو وہ ڈاکٹر قمر انور ہو گئیں۔ آپ نے یہ خوب صورت اتفاق دیکھا کہ ہم ڈاکٹر انور قمر ہیں اور ہماری بیگم ڈاکٹر قمر انور۔ زندگی میں تو بہت سی باتیں عجیب ہوا کرتی ہیں ڈاکٹر صاحب۔ جب بھیڑ کم ہوئی تو ڈاکٹر انور نے مجھے چاندی کا ایک سگریٹ کیس پیش کیا اور مسکرا کر کہا سگریٹ کیس میرا ہے۔ اس کے سگریٹ قمر نے رول کیے ہیں۔ سگریٹ تو ختم ہو جائیں گے، لیکن سگریٹ کیس آپ کو یاد دلاتا رہے گا۔ جی ہاں، ڈاکٹر صاحب۔ سگریٹ ختم اس وقت ہوں گے جب ہم پئیں گے اور

ہم ڈبے میں داخل ہو گئے۔ لاہور اسٹیشن پر کتنے لوگ رخصت کرنے آئے تھے، لیکن ایسا لگتا تھا کہ صرف دو آنکھیں مجھے رخصت کرنے آئی ہیں۔ ٹرین میں بیٹھے بیٹھے ہی شعر ہو گیا:

یاد آتی ہیں کس قدر آنکھیں
وقتِ رخصت وہ تربہ تر آنکھیں

وہ آنکھیں آج بھی یاد آتی ہیں تو بستر پر اُٹھ کر بیٹھ جاتا ہوں اور میری آنکھیں ایک گزرے ہوئے کارواں کی جگالی کرتی رہتی ہیں۔

راشد: بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ جس معصوم عشق کا بیان آپ نے شروع کیا ہے اس کے اختتام میں ایسے ڈرامائی موڑ شامل ہوں گے۔ کوئی بھی کہانی تخلیقی فن کار کے تخیل سے وابستہ ہوتی ہے۔ اس میں دلچسپ اور حیرت انگیز موڑ شامل کیے جاسکتے ہیں تاکہ کہانی کی اثر انگیزی برقرار رہے، لیکن زندگی کی کہانی میں ایسے موڑ بھی شامل ہوتے چلے جاتے ہیں جو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتے۔ ان معنوں میں دیکھا جائے تو زندگی کی کہانی، قوتِ متخیلہ کے ذریعے بنی گئی کہانی سے زیادہ توجہ طلب ہوتی ہے اور آپ کے دلچسپ بیان نے رودادِ عشق کے تاثر کو دوگنا کر دیا۔ جب پہلے عشق سے ساعتیں روشن ہوگئی ہیں تو اگلے عشق یعنی دوسرے عشق کی روداد سننے کی بے چینی مزید بڑھ گئی ہے۔ اپنے دوسرے عشق کو اسی طرح تفصیل سے بیان کریں۔

قاضی عبدالستار: لکھنؤ میں ہیوٹ ہوسٹل کے کمرہ نمبر ۱۰۲ میں میرا قیام تھا۔ ہوسٹل میں ایک صاحب ہوا کرتے تھے، جنگ صاحب۔ یہ نیپال کے بادشاہ کے کچھ عزیز ہوا کرتے تھے۔ ان کے بڑے بھائی لکھنؤ کینٹ میں بریگیڈیر تھے۔ جنگ صاحب بارہ سال سے فیل ہو رہے تھے۔ اس لیے کہ اگر پاس ہو جاتے تو لکھنؤ چھوڑنا پڑتا۔ مجازی دعوتوں کے سلسلے میں ہماری ان کی دوستی ہو گئی۔ ان کو رقص و موسیقی سے بھی دلچسپی تھی۔ ہمارے ہوسٹل کے وارڈن مشہور زمانہ اے سی چٹرجی جو یوپی میں ہاکی کے لیجنڈ تھے، ہمارے وارڈن تھے۔ ایک رات جنگ صاحب کے کمرے میں مجرا ہو رہا تھا۔ ہم بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ کسی لڑکے نے مخبری کر دی۔ اے سی چٹرجی آگئے اور جو کچھ ہوا، وہ تو ہوا۔ ہمارا سامان کمرے سے نکال کر نیچے رکھ دیا گیا اور تانگا بلوا لیا گیا۔ صبح نو بجے ہمیں ہاسٹل چھوڑنا تھا۔ سخت پریشان۔ کیا کریں، کہاں جائیں کہ خیال آیا کہ ہمارے ایک دور کے عزیز کشمیری محلے میں رہتے ہیں اور نواب صاحب کہے جاتے ہیں۔ ہم لدے پھندے انھی کے یہاں پہنچ گئے۔ نواب صاحب جن کو ہم بڑے ماموں کہتے تھے، برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ تانگے والے نے سامان اُتار کر رکھ دیا۔ ہم نے نواب صاحب سے کہا کہ ہمیں ہاسٹل سے نکال دیا گیا ہے اور یہ کہ ہم بہت بے قصور ہیں۔ بس ضد میں نکال دیا وارڈن صاحب نے، نواب ہمارے رہنے کا انتظام کر دیجیے۔ انتظام کے کیا معنی؟ پورا محل پڑا ہوا ہے، رہیے۔ نہیں نواب ماموں کوئی جگہ بتا دیجیے ہمارے لیے بالکل الگ۔ انھوں نے سامنے کھڑے ہوئے ملازم کو حکم دیا: بھیا کا سامان کنارے والی بارہ

دری میں لگا دو۔ یہ ایک چھوٹی سی اکائی تھی۔ بارہ دری کے پیچھے ایک ہال، ایک طرف ضرورت خانہ، دوسری طرف سامان رکھنے کی کوٹھری۔ ہم رہنے لگے۔ تیسرا دن تھا کہ ہماری والدہ بھی آ گئیں۔ وہ کسی تقریب کے سلسلے میں لکھنؤ آئی تھیں۔ نواب صاحب سے ملنے کے لیے ان کے محل آئیں اور ہم کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئیں، لیکن نواب ماموں نے کہانی سنا کر ہموار کر لیا۔ اماں تھیں ایک کڑھی ہوئی خاتون۔ نواب سے کہا: چھبن، یہاں رہتے ہیں، رہیں، لیکن کھانا ہوٹل میں کھائیں گے۔ نواب خود ٹیڑھے آدمی تھے، لیکن اماں کی اس شرط پر رضامند ہو گئے۔ ہم چوک کے سب سے اچھے ہوٹل میں کھانا کھانے لگے۔ ایک دن ہم بارہ دری میں بیٹھے تھے کہ دس قدم کے فاصلے پر دوسرے مکان کی بارہ دری کے در میں ایک پری چھم سی نظر آئیں۔ انھوں نے ہم کو دیکھا۔ ہم نے ان کو دیکھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر وہ چلی گئیں۔ شام کا وقت تھا۔ دوسرے دن ہم اسی وقت اپنی بارہ دری کی کرسی پر بیٹھ کر ان کا انتظار کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد وہ آ گئیں۔ دالان کے سامنے چبوترے پر ٹہلیں، کیاریوں سے دو ایک پھول توڑے اور سر سے پاؤں تک گلدستہ بنی چلی گئیں۔ تین چار دن اسی طرح گزر گئے۔ ہوٹل کا کھانا اچھا تھا، لیکن ہوٹل کا کھانا تھا۔ چند روز میں ہم اُوب گئے۔ ایک شام ایک ملازمہ آئی۔ ایک پلیٹ میں چار کباب لائی اور کہا کہ آپ کو بٹیا صاحب نے بھیجا ہے۔ ہم نے نگاہ اُٹھا کر دیکھا تو وہ دالان میں کھڑی تھی۔ ملازمہ چلی گئی۔ ہم اور قریب آئے۔ دس گز کے فاصلے پر آ کر ہم نے ان سے پوچھا یہ کباب آپ نے بھیجے ہیں۔ انھوں نے کہا جی ہاں۔ آپ ہوٹل کا کھانا کھاتے ہیں، اس لیے ہم نے گھر کے کباب بھیج دیے، اور شرما کر چلی گئیں۔ اب ہر دوسرے تیسرے دن کچھ نہ کچھ آنے لگا۔

ایک روز میں یونیورسٹی جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا کہ نواب ماموں نے فرمایا کہ میں چند روز کے لیے باہر جا رہا ہوں۔ آپ جب جایا کیجیے تو اپنا کمرہ بند کر دیا کیجیے۔ اس دن شام کو وہ پھر نظر آئیں تو ہم نے اپنی شخصیت کی ساری جسارت اور جرأت سمیٹ کر انھیں اپنے یہاں آنے کی دعوت دی، اور ہم حیرت زدہ رہ گئے کہ وہ بغیر کسی تکلف کے تشریف لے آئیں۔ ہم نے ان کو قریب سے دیکھا تو وہ اور بھی اچھی لگیں۔ بہت دیر تک رسمی گفتگو ہوتی رہی۔ ابھی گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ ان کی عورتوں نے اشارے سے کہا شمیم بٹیا آ جائیے، امّی یاد کر رہی ہیں۔ بہت بے نیازی سے جواب دیا آ رہی ہوں۔ پھر پوچھا آپ نے چائے پی لی۔ میں نے کہا نہیں۔ میں تو آپ کو دیکھنے کے لیے یہاں بیٹھا ہوا ہوں اور آپ کے پاس بیٹھ کر چائے پینے کا خیال تک نہیں آیا۔ وہ شرما گئیں۔ میں چائے بھیجتی ہوں۔ کھڑی ہو گئیں، چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ ادھیڑ عمر کی ایک خاتون برآمدے میں آئیں۔ میری طرف دیکھا۔ میں نے کھڑے ہو کر سلام کیا۔ انھوں نے خاصی بلند آواز میں جواب دیا جیتے رہیے۔ بیٹھیے بیٹھیے۔ میں چائے بھیجتی ہوں۔ ان کو یہ خیال آیا کہ نواب ماموں تو باہر گئے ہوئے ہیں۔ ملازموں نے چائے بنا کر نہیں دی۔ سو ایک کشتی میں ناشتے، دوسری کشتی میں چائے کی کیتلی بھجوائی۔ دو ملازمائیں لے کر آئیں۔ ساتھ میں شمیم بٹیا

بھی تھی۔ قیمہ بھرے تکونے تھے اور حلوہ تھا۔ ہم نے بلاتکلف دونوں پلیٹیں صاف کر دیں۔ شمیم نے چائے بنائی۔ پوچھا شکر کتنی لیں گے۔ میں نے جواب دیا؛ چائے ہم اس لیے پیتے ہیں کہ وہ میٹھی ہوتی ہے۔ اس نے چار پانچ چمچے ڈال دیے اور ہم بلاتکلف پی گئے۔ دوسری پیالی جب بنائی تو کہنے لگی کہ ہم آپ سے دودھ پوچھنا تو بھول ہی گئے۔ میں نے کہا: دودھ پینے کی ایک عمر ہوتی ہے جو گزر گئی۔ پہلی بار وہ کھل کر ہنسی اور پیالی میں دودھ دان تقریباً انڈیل دیا۔ پہلی بار معلوم ہوا کہ وہ ''تعلیم گاہِ نسواں'' میں نویں درجے میں پڑھتی ہیں۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر وہ چلی گئیں۔ اس رات نیند بہت دیر میں آئی۔ دوسرے دن شام کے وقت ایک ملازمہ آئی اور کہا کہ بیگم صاحبہ نے فرمایا ہے کہ آپ چائے وہیں پی لیں۔ ہم دالان سے ہوتے ہوئے، گیلری سے گزرتے ہوئے ڈائننگ ہال میں داخل ہوئے۔ بہت خوب صورت فرنیچر تھا۔ عمدہ فانوس جھول رہے تھے۔ ادھیڑ عمر کی بیگم صاحبہ ایک شان دار خاتون کی طرح داخل ہوئیں۔ میرے سلام کا جواب دیا اور کہا شمیم کے ابا کہہ رہے تھے کہ آپ نے بی اے میں ٹاپ کیا ہے۔ میں نے کہا: جی ہاں میں بی اے آرٹس کا اسٹوڈنٹ ہوں۔ میرا رزلٹ اس سال کے امتحان کے بعد ڈکلیئر ہوگا۔ امید ہے کہ میں ٹاپ کروں گا۔ پھر وہ میرے گھر کے بارے میں معلومات حاصل کرتی رہیں، باتیں کرتی رہیں، زمین داری کے بارے میں پوچھتی رہیں اور میں خوش خوش ان کو سب کچھ بتاتا رہا۔ آخر میں انھوں نے پوچھا کہ آپ نے ہاسٹل کیوں چھوڑ دیا تو میں نے کہا وارڈن صاحب سے میری لڑائی ہوگئی اور سگریٹ پینے کی وجہ سے انھوں نے مجھے ہاسٹل سے نکال دیا۔ انھوں نے بڑی حیرت سے کہا کہ میرا ایک بھانجا حبیب اللہ ہاسٹل میں رہتا ہے اور سگریٹ پیتا ہے۔ کئی بار بہت ڈانٹا گیا، مارا گیا، لیکن نالائق پیتا ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ آپ کا ہاسٹل بہت اچھا تھا۔ جب تک نواب بھائی نہیں آجاتے، آپ چائے یہیں پی لیا کیجیے، اور بچے بہت زیادہ تکلف نہیں کرتے۔ جب آنے کو جی نہ چاہے تو ملازم سے کہیے چائے لے آئے۔ بالکل اپنا گھر جانیے۔ خیر ہم نے ڈٹ کر ناشتہ کیا، چائے پی، سلام کیا، چلے آئے۔ ایک روز ہم چائے پینے گئے تو شمیم نے پیشوائی کی۔ معلوم ہوا کہ ان کی والدہ پڑوس میں تشریف لے گئی ہیں۔ اس دن ہم ان کے کمرے میں پہنچ گئے۔ پوری بے حیائی کے ساتھ ان کے بستر کی تعریف کرتے رہے، تکیوں کو سونگھتے رہے اور ان کی خوشبو کی داد دیتے رہے۔ وہ بیر بہوٹی کی طرح شرماتی، ہنستی اور مسکراتی رہی۔ وہ شام بہت خوب صورت گزری۔ جب رات ہوگئی تب ہم اپنی بارہ دری میں واپس آئے۔

اس رات نیند نہیں آئی۔ کوئی ڈھائی بجا ہوگا جب ہم حاجت کے لیے اُٹھے تو محسوس ہوا کہ برآمدے میں کوئی چل رہا ہے۔ ہم نے لائٹ آن کی اور باہر نکل کر دیکھا تو شمیم کھڑی تھی۔ ہم بجلی کی طرح اس کے پاس پہنچ گئے اور پوچھا کیا بات ہے۔ وہ خاموش رہی، اماں کہاں ہیں۔ سو رہی ہیں۔ اور ابا جان آپ کے۔ وہ بھی سو رہے ہیں۔ اور آپ؟ مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔ تو آپ ہمارے ساتھ چل کر ہمارے کمرے میں بیٹھیے۔ ہیٹر پر چائے بنائی گئی۔ ہم دونوں پیتے رہے، لیکن معمولی رسمی گفتگو کے علاوہ کسی

موضوع پر بات کرنے کی ہمت نہیں پڑی۔ ساری کاروائی آنکھوں کے ذریعے ہی ہوتی رہی۔ پہلی بار میں نے اس کے ہاتھ کو چھوا تو جیسے کرنٹ لگ گیا۔ میں دیر تک ہاتھ پکڑے بیٹھا رہا۔ کچھ چاپ محسوس ہوئی۔ ہم دونوں اٹھ کر فوراً باہر آ گئے۔ ان کے دالان میں ایک ملازمہ کھڑی تھی۔ وہ شب بخیر کہہ کر دوسری طرف دوڑ گئی۔

صبح ہم چائے پی رہے تھے تو پہلا خط آیا۔ کوئی القاب، نہ آداب۔ صرف اتنا لکھا تھا کہ: آپ پریشان مت ہویئے گا۔ لنا میرے کمرے میں سوتی ہے۔ اس کی آنکھ کھلی اور مجھ کو موجود نہ پا کر وہ دالان میں آ گئی۔ کسی کو کچھ نہیں پتہ چلا ہے۔ آپ بالکل پریشان نہ ہوں، اور اگر اس خط کا جواب آپ دینا چاہیں تو یہ انا دالان میں آتی جاتی رہے گی، اس کو دے دیجیے گا۔ میں اسکول جا رہی ہوں۔ اب باقاعدہ خطوط بازی ہونے لگی۔ نواب آ گئے لیکن ہم چائے پینے جاتے رہے۔ ایک دن ہم شام کو چائے پی کر اپنی بارہ دری میں داخل ہوئے تو یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے کہ نواب ماموں ایک آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ کہاں گئے تھے آپ؟ میں نے مختصر الفاظ میں سب بتا دیا۔ ایک بات غور سے سن لیجیے، نواب ماموں نے سنجیدگی سے کہا۔ شمیم اکلوتی بیٹی ہے۔ اس کا بڑا بھائی انگلینڈ میں ہے۔ ڈاکٹر ہے۔ آپ اکلوتے بیٹے ہیں۔ ایک جائداد کے مالک ہیں، لیکن آپ سنّی ہیں اور شمیم شیعہ ہیں۔ میرا فرض ہے کہ میں آپ کو ساری بات بتا دوں تا کہ آپ اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکیں۔ شمیم کے والد نواب نہیں ہیں، لیکن ایک بڑی جائداد کے مالک ہیں، اور خاص حیثیت کے آدمی ہیں، اور یہ روز چائے پینے جانے کا سلسلہ مناسب نہیں ہے۔ کبھی کبھی جایا کیجیے۔ یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔ ہم بہت پریشان ہوئے۔ جب کھانا کھانے چلے، ہم راستے بھر سوچتے رہے۔ کھانا بھی ٹھیک سے نہیں کھایا گیا۔

اس رات کوئی بارہ بجا ہوگا کہ ہم کو چاپ محسوس ہوئی۔ شمیم آ گئی تھیں۔ ہم نے پہلی بار اس کو دبوچ لیا، اور اتنے پیار کیے کہ وہ بے دم ہو گئی اور نواب ماموں کی تمام باتیں سنا دیں۔ اس نے کہا اماں جان نے بھی ہم کو سمجھایا تھا کہ آپ میں ہر خوبی ہے لیکن آپ سنّی ہیں، اسی لیے، ہم دونوں کو ایک دوسرے کے قریب نہیں آنا چاہیے، ایک دوسرے سے دور رہنا چاہیے اور یہ سب باتیں، بہت سختی سے کہی گئی ہیں۔ ابھی ہم لوگ کسی نتیجے پر نہیں پہنچے تھے کہ نواب ماموں آ گئے۔ وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ نواب ماموں نے آہستہ سے کہا: بیٹے، بیٹھ جایئے۔ مجھے آپ دونوں کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ اب میں آپ دونوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ آپ اپنی دوستی کو دوستی کی حد تک رکھیے۔ اس سے زیادہ کا خواب مت دیکھیے۔ آپ کی والدہ اور شمیم کی والدہ دونوں بہت سخت ہیں۔ کسی سمجھوتے کی مجھے کوئی امید نہیں ہے، اور یہ وقت ملنے ملانے کا نہیں ہوتا، صرف شام کو ملا کیجیے۔ میں کل سے پہرا کھڑا کر دوں گا۔ یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ تھامے ہوئے دیر تک بیٹھے رہے۔ پھر اس کے دالان سے کھکھارنے کی آواز آئی۔ وہ کھڑی ہو گئیں اور کہا اب جاؤں گی۔ انا بلا رہی ہیں۔ تین چار دن گزرے تھے کہ شمیم کے والد اور والدہ ایک شام کسی شادی کی تقریب میں کہیں چلے گئے۔ شمیم طبیعت کی ناسازی کا بہانہ کر کے رُک گئی۔ یہ شاید مارچ کا مہینہ تھا۔ اس لیے کہ ہمارے امتحانات شروع ہو چکے تھے۔ میں بہت اطمینان کے ساتھ اپنا پرچہ کرتا،

تھوڑی دیر لائبریری میں بیٹھتا، وہیں لنچ لیتا اور شام کو گھر آجاتا اور شمیم سے ملاقات کرتا یا ملاقات کے انتظار میں بیٹھا رہتا۔ اب شمیم پر بھی نگرانی ہونے لگی تھی۔ اس شام میں آٹھ بجے رات تک بیٹھا رہا۔ اس کی جھلک نظر نہیں آئی۔ میں کھانا کھانے کے لیے باہر نکلا تو پھاٹک پر نواب کھڑے تھے۔ مجھے غور سے دیکھا اور کہا آپ ایک سائیکل خرید لیجیے۔ کھانا کھانے جانے میں بہت وقت ضائع ہوتا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ میں لکھنؤ میں سائیکل چلا نہیں پاؤں گا۔ وہ چپ ہوگئے۔ تھوڑی دیر میں جب میں کھانا کھا کر واپس آیا تو اس کی انا ایک خط لے کر آئی، شمیم نے لکھا تھا: آج پھر ابا جان اور اماں جان اچانک کسی تقریب میں چلے گئے ہیں۔ میرے اوپر دو عورتیں تعینات کی گئی ہیں۔ ان کو حکم ہے کہ میں ہرگز آپ کے پاس نہ آنے پاؤں۔ کیا اچھا ہوتا کہ آپ آجاتے۔

مجھے نواب ماموں کی تمام باتیں یاد تھیں، لیکن میں نے وہ سب بھلا دیں اور فوراً پہنچ گیا۔

چار بجے صبح کے قریب دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ شمیم نے کہا: ابا جان آرہے ہیں۔ میں اطمینان سے اُٹھ کر اپنی بارہ دری میں آگیا۔ دوسرے دن چھٹی تھی۔ وہ دوپہر میں آگئی۔ میں نے پوچھا اماں جان کہاں ہیں۔ اس نے جواب دیا ابا جان کے ساتھ ڈاکٹر کے یہاں گئی ہیں۔ ایک بات کہنے آئی ہوں، آپ میرا ہاتھ تھامتے ہیں اور چھوڑ دیتے ہیں۔ میرے باپ سخت شیعہ ہیں اور آپ کی ماں سخت سنّی ہیں، تو کیا آپ میں لڑنے کی طاقت ہے۔ میں نے کہا: شمیم، تم بتاؤ تم میں لڑنے کی طاقت ہے۔ اس نے کہا ہاں۔ اگر مجھ میں لڑنے کی طاقت نہ ہوتی تو میں یہ سوال کیوں کرتی۔ میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں، مگر آپ کو چھوڑنے پر رضامند نہیں ہوں۔ اس بات کا احساس اماں جان کو ہو چکا ہے، لیکن ابا جان لاعلم ہیں۔ ابھی ہم لوگ گفتگو کر ہی رہے تھے کہ کھکھارنے کی آواز آئی، اور وہ چھلاوے کی طرح اُٹھ کر چلی گئی۔ میں ساری رات، سارے نشیب و فراز پر غور کرتا رہا، جاگتا رہا اور سوچتا رہا اور اپنے آپ کو یقین دلاتا رہا کہ میری ماں میری محبت میں شمیم کو قبول کرلے گی۔ ایک رات شمیم ہمارے پاس آگئی۔ وہ رات اس کے کنوارپن کی آخری رات تھی۔ ہم دونوں اپنی تقدیر کا فیصلہ کر چکے تھے۔ دوسرے دن اس کی اماں نے مجھے کھانے پر بلایا۔ کھانا صرف میرے لیے لگایا گیا۔ شمیم اسکول میں تھی۔ اس کی اماں جان نے میری پیٹھ پر ہاتھ رکھا اور فرمایا: میرے بھی ایک بیٹا ہے جو لندن میں ڈاکٹری کر رہا ہے، اور یہ بیٹی ہے جو نویں میں پڑھتی ہے۔ آپ بہت پیارے بچّے ہیں۔ آپ کے چہرے پر جو شرافت ہے وہ مجھے متاثر کرتی ہے، لیکن بیٹے، شمیم کے باپ وہ سب کچھ نہیں ہونے دیں گے، جو آپ دونوں چاہتے ہیں۔ اسی لیے میرا مشورہ ہے کہ اپنے آپ کو شمیم سے دور کر لیجیے۔ اس جملے کے بعد انھوں نے کیا کچھ کہا مجھے یاد نہیں۔ میں کچھ نہیں سن پایا۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر چلا آیا۔ شام گزر گئی۔ رات گزر گئی۔ شمیم کی جھلک نظر نہیں آئی۔ میرا ایک امتحان ختم ہو چکا تھا، دوسرا امتحان شروع ہونے والا تھا۔ میں صبح میں ناشتہ کر رہا تھا کہ اس کی انا خط لے کر آئی کہ میں اسکول جا رہی ہوں۔ آپ اسکول کے گیٹ پر ٹھیک دس بجے آجائیے۔ میں انتظار کروں گی۔ ٹھیک دس بجے وہ پھاٹک کے باہر آئی۔

تھوڑی دور چل کر ہمیں تانگا مل گیا۔ ہم حضرت گنج آگئے اور ایک اسٹوڈیو میں پہنچ کر کئی تصویریں کھنچوائیں۔ بنارسی باغ چلے گئے۔ وہاں تنہائی میں پڑی ہوئی بنچوں پر بیٹھے رہے، باتیں کرتے رہے اور فیصلہ کرلیا کہ ہم دونوں ساتھ ساتھ رہیں گے یا ساتھ ساتھ مریں گے۔ وہیں حضرت گنج میں کھانا بھی کھایا۔ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گھومتے رہے، اور بالکل جیسے بغاوت کا اعلان کرنے والے تھے۔ کوئی خوف نہیں تھا۔ جب اندھیرا ہونے لگا تب ہم لوگ حضرت گنج سے نکلے۔ نخاس کے کونے پر وہ اُتر گئیں۔ وہ دوسرے تانگے پر بیٹھ کر اپنے گھر چلی گئی۔ جب ہم گھر پہنچے تو دنگ رہ گئے۔ والدہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ نواب ماموں نے میری ماں کو جس دن امتحان ختم ہوا تھا، اس کے ایک دن بعد بلا لیا تھا اور شاید انھیں سمجھا بھی دیا تھا۔ وہ رات بہت بھاری گزری۔ ہم ایک دوسرے سے ہرگز نہیں مل سکے، قطعاً نہیں مل سکے۔ صبح اماں مجھ کو لے کر مچھریٹہ آگئیں جس کا علم بھی اس کو نہیں ہوسکا۔ بہت سختی کے ساتھ ہم سے مچھریٹہ میں کہہ دیا گیا کہ: شیعہ لڑکی سے ہرگز ہرگز شادی نہیں ہوسکتی اور ہم پر سخت نگرانی شروع ہوگئی۔ ہمیں سیتاپور تک جانے کی اجازت نہیں ملی۔ ڈاک خانے پر ایک آدمی تعینات ہوگیا کہ جو خط ہمارا آئے، ہمارے نام سے آئے، وہ وصول کرلیا جائے اور والدہ کو دے دیا جائے۔

جو آدمی ہمارے بازار کی وصولیابی کرتا تھا، اس وصولیابی سے ہم تھوڑا تھوڑا کر کے روپیہ جمع کرتے رہے۔ ایک مہینے کے اندر ہمارے پاس سو روپے جمع ہوگئے۔ پہلے کارتوس لینے ہم خود سیتاپور جاتے تھے۔ اب کارتوس کا روپیہ ہمارے ہاتھ میں نہیں دیا جاتا۔ ملازم سے منگوائے جاتے۔ بہر حال سو روپیہ میں نے بچا کر رکھا اور کہا کہ میں لکھیم پور شکار کھیلنے جاؤں گا۔ میرا پلان تھا کہ میں لکھیم پور جانے کے بہانے لکھنؤ نکل جاؤں گا، لیکن میرے ساتھ دو آدمی کیے گئے، اور حکم ہوا کہ تم ان کے ساتھ لکھیم پور میں اپنے ایک عزیز قاضی فدا حسین صاحب کے یہاں جاؤ۔ خیر مجبوراً ہم ان آدمیوں کے ساتھ وہاں پہنچے۔ اماں کا مفصل خط مجھ سے چھپا کر قاضی صاحب کو پہنچا دیا گیا۔ وہ سائے کی طرح میرے ساتھ رہنے لگے۔ ایک دن میں نوکروں اور قاضی صاحب کو چرکا دے کر اسٹیشن آگیا۔ لکھنؤ کی گاڑی آنے میں ابھی وقت تھا۔ میں ایک کونے پر بنچ میں بیٹھا ہوا ٹکٹ کھڑکی کے کھلنے کا انتظار کررہا تھا کہ قاضی فدا حسین صاحب جن کو میں چچا میاں کہتا تھا، چار پانچ آدمیوں کے ساتھ آگئے اور مجھے بہت سمجھا بجھا کر گھر لے آئے۔ رات میں بہت پیار سے سمجھاتے رہے اور صبح ایک جیپ پر بٹھا کر ہمیں مچھریٹہ لے آئے۔ اب سختی اور ہونے لگی۔ اب شکار پر کئی آدمی ساتھ جانے لگے۔ شکار پر جتنے آدمی ساتھ جایا کرتے تھے ان میں تین چار اور بڑھا دیے گئے۔ کسی طرح جولائی کا مہینہ آیا۔ دو آدمی ہمارے ساتھ کیے گئے کہ ہم کو لکھنؤ نواب ماموں کے پاس پہنچا دیں اور ان کو ایک لمبا چوڑا خط بھی لکھ کر دیا گیا۔ ہم لوگ چار بجے شام کو نواب ماموں کے سامنے پہنچے۔ وہ دیکھتے ہی بگڑ گئے۔ بہت غصے سے فرمایا، یہ تو سنا تھا کہ مچھریٹہ کے لوگوں کے کاٹنے کا منتر نہیں ہوتا، لیکن آج معلوم ہوا کہ ایسی بھولی بھالی شکل اور ایسے کالے کرتوت۔ پورے محلّے میں منھ دکھانے کے قابل نہیں

رہے ہم۔ میں نے کہا: نواب ماموں ہوا کیا؟ فلانے ایک دودھ کی شیشی میں نپل لگا کر لے آؤ۔ بھیا ابھی شیر خوار ہیں۔ میں نے کہا نواب ماموں آپ مجھے کچھ تو بتائیے۔ تو سنیے میری زبان سے کہ شمیم نے زہر کھالیا اور ان کی ماں کو ہارٹ اٹیک ہوگیا۔ وہ بلرام پور ہوسپٹل میں داخل ہیں۔ تسلی ہوگئی آپ کی۔ میرے پیروں سے زمین نکل گئی۔ میں واپس جانے لگا تو نواب ماموں نے مجھے روکا۔ فرمایا اب آپ کہاں جارہے ہیں۔ میں نے کہا میں ہاسٹل جارہا ہوں۔ انھوں نے بہت سمجھایا لیکن میں نہیں رکا۔ میں سیدھا ہاسٹل میں جنگ صاحب کے پاس پہنچا۔ قیام کیا، آدمیوں کو روانہ کیا۔ وہ سب سن ہی چکے تھے۔ دوسرے دن میں جنگ صاحب کی موٹر سائیکل پر ان کے نوکر کے ساتھ اس کے محل کے سامنے سے دوبار گزرا۔ بلا سبب، لیکن دل کو کسی طرح قرار نہ آیا۔ بہت سوچتے سوچتے یہ دل چاہا کہ میں بلرام پور ہاسپٹل میں شمیم کی ماں سے مل لوں، لیکن آخر آخر اس فیصلے کو بھی نظر انداز کرنا پڑا، اور میں دوسری گاڑی سے مچھریٹہ آگیا۔ پورے ایک ماہ تک میں مچھریٹہ میں پڑا رہا۔ بیس بائیس اگست کو لوگوں کے بہت سمجھانے بجھانے سے لکھنؤ جانے پر رضامند ہوا۔ مہینوں کلاس روم میں بیٹھتا، لائبریری میں جاتا، ہر جگہ گھومتا، لیکن کسی طرح قرار نہیں ہوا۔

راشد: قاضی صاحب دوسرے عشق کی روداد نے تو دہلا کر رکھ دیا۔ عشق کا ایسا افسوس ناک انجام کہ ذہن و دل اگر حالات کے نشیب و فراز کے متعلق غور کریں تو بالکل سکتے میں آجائیں، لیکن ہم سنجیدگی سے غور کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان مخصوص حالات میں یہ عین ممکن تھا۔ مسلکی معاملے عام حالات میں بھی کہاں سلجھ پاتے ہیں۔ کوشش کے باوجود حالات بہتر ہونے کی سبیل نہیں نکل پاتی اور یہ تو خیر عشق کا معاملہ تھا۔ اگر حالات مختلف ہوتے اور مسلکی تفاوت کا مسئلہ سامنے نہ آتا تو کسی بھی صورت یہ انجام نہ ہوتا، لیکن درمیانی راہ کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی اور عشق تھا کہ کسی بھی دوسری صورت حال کے لیے آمادہ نہ تھا۔ لہٰذا، ناسازگار حالات نے آنکھوں کو وہ منظر دکھایا جو کسی کے وہم و گمان میں نہ تھا۔ اب تک آپ کے دونوں عشق کا بیان ہم نے سنا۔ ان میں وصال کے بجائے ہجر کی تلخیاں ہی سامنے آئیں۔ میں نے تو یہ سوچا تھا کہ قاضی عبدالستار کی داستانِ عشق، روایتی اور عمومی عشق کی لذتوں سے یقیناً مختلف ہوگی، لیکن اس نوع کی مختلف ہوگی، اس کا قطعی اندازہ نہ تھا۔ میں جانتا ہوں ایسی یادوں کو تازہ کرنا آپ کے لیے آسان نہیں اور آپ کئی دنوں تک تلخیوں کے کرب سے دوچار ہوئے ہوں گے۔ پھر بھی تیسرے عشق کی روداد سنانے کے لیے آپ کو زحمت دینا چاہوں گا کیوں کہ اس حقیقت سے ہم سب اچھی طرح واقف ہیں کہ بڑی سے بڑی مصیبت آپ کو مقصد کے حصول سے کبھی باز نہیں رکھ سکی ہے۔

قاضی عبدالستار: بھئی، ہجر اور وصال کا جہاں تک تعلق ہے، دنیا کی ہر داستانِ عشق وصال کے بجائے ہجر سے ہی وابستہ رہی ہے۔ میری قسمت کہیے یا حالات کی ستم ظریفی کہ میرے یہاں عشق کے معاملات اسی نوعیت کے رہے۔ زندگی نے مجھے قدم قدم پر آزمائشوں میں مبتلا رکھا۔ خوشی کے لمحے نصیب ہوئے لیکن بدقسمتی سے تادیر قائم نہ رہ سکے۔ میری زندگی کی یہی حقیقت ہے جسے کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

۶۳۔۱۹۶۲ء کا زمانہ تھا۔ کرنل بشیر حسین زیدی وائس چانسلر تھے۔ ان کا اردلی ایک خط لے کر آیا کہ آج کی رات آٹھ بجے وائس چانسلر لاج تشریف لایئے اور ڈنر میں شرکت فرمایئے۔ میں نے جذبی صاحب اور ایک دو لوگوں سے پوچھا۔ معلوم ہوا کہ صرف مجھ کو بلایا گیا ہے۔ سخت اضطراب کے عالم میں حاضر ہوا۔ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ زیدی صاحب نے کھڑے ہوکر ہاتھ ملایا اور فرمایا کہ نواب صاحب اکبرآباد آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ اکبرآباد کے لفظ سے جیسے بجلی سی چمک گئی۔ میں نے بزرگوں سے سنا تھا کہ ہماری کوئی شاخ وہاں بھی ہے۔ اتنے میں ایک صاحب، ایک شاندار ادھیڑ عمر کا آدمی جو کڑھا ہوا کرتا اور چوڑی دار پاجامہ پہنے تھا، کمرے میں داخل ہوا۔ میں نے خم ہوکر سلام کیا۔ زیدی صاحب نے فرمایا: قاضی عبدالستار۔ انھوں نے مجھے سینے سے لگالیا۔ اتنے میں ایک خاتون کمرے میں داخل ہوئیں۔ سفید چوڑی دار سوٹ، سفید دوپٹہ، سفید سینڈل اور سارا زیور سفید ہیرے کا۔ کروشیس بھاری بدن، کھلتا ہوا گندمی رنگ، مغرور چہرہ، بے قرار آنکھیں۔ یہ آپ کی بہن ہے۔ نواب نے فرمایا۔ اس کا نام... خیر یہ تو خود ہی بتادیں گی۔ بیٹھیے۔ ہم سب بیٹھ گئے۔ میرے منھ سے آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔ نواب صاحب نے فرمایا: آج جب میں آیا تو زیدی صاحب نے فرمایا کہ آپ جس کو حکم دیں، ڈنر پر بلالوں۔ کل میں نے آپ کی ''شب گزیدہ'' ختم کی۔ خیال آیا کہ آپ ہی کو بلاؤں۔ بہت خوشی ہوئی آپ کو دیکھ کر۔ پھر والدہ اور والد سے متعلق سوالات کرتے رہے۔ میں جواب دیتا رہا۔ اتنے میں خادم نے اطلاع دی، میز تیار ہے۔ ہم ڈائننگ روم میں داخل ہورہے تھے کہ ایک خادمہ نے صاحب زادی کو مخاطب کیا: بٹیا سرکار یہ لے لیجیے۔ کوئی چیز تھی اس میں۔ معلوم ہوا کہ بٹیا سرکار میز پر میرے بالکل سامنے تھیں۔ میں کھانا کم کھاتا رہا، آنکھوں سے اس کے حسن کو زیادہ پیتا رہا۔ کھانا کھا کر ہم لوگ کافی روم میں کافی پینے آئے۔ ابھی بیٹھے تھے کہ ایک خادم حاضر ہوا۔ سرکار کا فون ہے۔ نواب کے ساتھ زیدی صاحب بھی اُٹھ گئے۔ اتنی دیر میں میں نے یہ سوچ لیا کہ اودھ کے کوئی راجہ ہیں۔ تعلقے دار اور انھوں نے اپنے آپ کو نواب کہلایا ہے، ورنہ ہندوستان میں اودھ وہ واحد علاقہ ہے جہاں کا مسلمان رئیس بھی راجہ کہلاتا ہے، اور یہ صاحب زادی ۲۶۔۲۷ سال کی، ان کی دس پانچ اولادوں میں سے ایک اولاد ہیں۔ آپ کا کیا نام ہے، میں نے ان کو مخاطب کیا۔ وہ میرے صوفے پر ہی بیٹھ گئیں۔ بجائے اپنا نام بتانے کے، فرمانے لگیں آپ کی تمام کتابیں ابا جان کو میں نے ہی پڑھائیں۔ آپ سے ملنے کا اشتیاق تھا۔ بہت خوشی ہوئی۔ کل ہم لوگ صبح جارہے ہیں۔ آپ تو دلی آتے ہوں گے۔ ساری گفتگو وہی کرتی رہی۔ میری آواز اس کے رعبِ حسن نے اچک لی تھی۔ میں ہوں اور ہاں میں جواب دیتا رہا۔ سچ یہ ہے کہ میری سماعت بھی متاثر ہوچکی تھی۔ میرے پاس اس وقت صرف آنکھیں تھیں جو اس کے حسن سے سیراب ہورہی تھیں اور سارے حواس جیسے ماؤف ہوچکے تھے۔ مجھے نہیں معلوم وہ اور کیا کہتی رہی۔ اتنے میں نواب صاحب اندر آگئے۔ میں کھڑا ہوا۔ جی چاہتا تھا کہ میں بٹیا سرکار کے پاس تھوڑی دیر بیٹھوں، اور دیکھوں اور سنوں،

لیکن میرے پاس اپنا کچھ بھی نہیں رہا۔ میں نے خم ہو کر ہاتھ ملایا۔ نواب صاحب نے کہا اب کی دہلی آیئے تو میرے پاس ضرور آیئے۔ یہ کہہ کر کارڈ مجھے دے دیا۔ بٹیا سرکار مجھے ورانڈے تک رخصت کرنے کے لیے تشریف لائیں۔ وی سی لاج سے جب میں نکلا تو محسوس ہوا کہ میں وہیں رہ گیا ہوں، صرف جسم کی ایک زندہ لاش ہے جسے ڈھو رہا ہوں۔ ساری رات بٹیا سرکار کے حسن و جمال میں کھویا رہا۔

چند روز گزرے تھے اور بٹیا سرکار کی شخصیت کا جادو دھندلانے لگا تھا کہ ایک دستک ہوئی۔ چار بجے شام کا وقت تھا۔ ملازم نے آکر بتایا کوئی صاحب آئے ہیں۔ باہر گیا تو بند گلے کا سفید کوٹ، خاکی پتلون، کرچ کا جوتا، سفید صافہ پہنے ایک صاحب کھڑے تھے۔ انھوں نے ایک ڈبہ پیش کیا اور ایک لفافہ بھی دیا۔ میں دہلی سے آیا ہوں۔ بٹیا سرکار نے یہ آپ کو بھیجا ہے۔ خم ہوا اور چلا گیا۔ میں نے ڈبہ کھولا تو اس میں کئی قسم کے حلوے تھے۔ خط پڑھا تو ہوش اُڑ گئے۔ وہ ایک انتہائی احتیاط سے لکھا ہوا عشق نامہ تھا، جس کا لب لباب یہ تھا کہ وہ مجھے ابھی تک فراموش نہیں کر پائی اور میں پہلی فرصت میں اس سے ملاقات کروں۔ جو زخم بھرنے لگا تھا، اس سے لہو بہنے لگا، لیکن نواب کا کارڈ۔ ہز ہائی نس نواب آف اکبر آباد۔ میں سوچتا رہا کہ ملنے جاؤں، لیکن ہمت نہیں پڑتی تھی۔ مجھے اپنے آپ سے بھی ڈر لگتا تھا کہ میں اتنا بے محابہ ہوں کہ ممکن ہے کہ میں بے خودی میں اسے دبوچ لوں اور نواب کے کسی سپاہی کا شکار ہو جاؤں۔ میں نے اپنے ایک دو دوستوں سے مشورہ کیا۔ انھوں نے بھی اس سے اتفاق کیا کہ آپ اس چکر میں نہ پڑیے، چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ ٹیں ہو جائیں گے، پتہ بھی نہیں چلے گا کون تھا۔ راشد صاحب، آپ میری بے قراری کو اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے، جب تک میں پوری بات نہ بتاؤں۔ کافی دن ہوئے شاید ۵۳-۵۴ کا زمانہ تھا۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں گھر گیا ہوا تھا۔ حسب عادت صبح ناشتہ کر کے میں ہاتھی پر سوار ہوتا اور شکار کو نکل جاتا۔ رات میں گھر میں مہمان آئے تھے۔ تین عورتیں، دو مرد اور دو بچے۔ ایک خاتون کافی دل کش تھیں۔ کھانا کھاتے ہوئے احساس ہوا کہ وہ کافی خوب صورت ہیں۔ میں تھوڑی دور چلا تھا کہ کسی نے کہا کہ جمعرات ہے۔ میں دھک سے رہ گیا کہ اگر والدہ کو معلوم ہو گیا کہ میں جمعرات کو بھی شکار پر جانے لگا ہوں تو ڈانٹ ڈپٹ کے علاوہ بندوقوں کی ضبطی بھی یقینی ہے۔

والد شکار پر تھے اور گھر کا سارا نظم و ضبط اماں کے ہاتھوں میں تھا۔ میں بہت خاموشی کے ساتھ باہری زینے سے بالا خانے پر پہنچا۔ بہت آہستہ آہستہ کہ کسی کو معلوم نہ ہو کہ میں اب آیا ہوں۔ دالان میں قدم رکھا تو معلوم ہوا کمرے کے اس طرف دالان میں پانی گر رہا ہے۔ پرانے دروازے، چوڑی چوڑی جھریاں۔ نو بجے کا وقت تھا۔ پوری دھوپ دالان میں بھری ہوئی۔ جھانک کر دیکھا تو وہی خاتون جو مجھے اچھی لگی تھیں، غسل فرما رہی تھیں۔ زندگی میں پہلی بار میں نے کسی خاتون کو برہنہ دیکھا تھا۔ نہا کر انھوں نے چھوٹے چھوٹے کپڑے دھوئے اور آنگن کے تار پر بہت اطمینان سے ڈالتی رہیں۔ یعنی حسن بے

لباس کا کوئی زاویہ، کوئی پوز ایسا نہیں تھا، جو ہم نے نہ دیکھا ہو۔ پھر انھوں نے سرخ شلوار، سفید جمپر پہنا، سرخ دوپٹہ سر سے اوڑھا اور اندرونی زینے سے نیچے اُتر گئیں۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں درد ہونے لگا، حلق خشک ہونے لگا، پنڈلیاں کانپنے لگیں۔ میں کسی طرح باہر کے زینے سے اندر آیا۔ دو کٹورے پانی پی کر میں اپنے کمرے میں لیٹ گیا۔ کسی نے نوٹس بھی نہیں لیا۔ وہ خاتون تین دن مہمان رہیں اور میں چوری چوری انھیں دیکھتا رہا اور انتظار کرتا رہا کہ یہ پھر نہانے جائیں، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ یہ سوچ کر افسوس ہوتا تھا کہ یہ چلی جائیں گی۔ جس دن لکھنؤ سے جیپ انھیں لینے آئی تھی، میں نے ناشتہ کیا اور شکار کے لیے روانہ ہو گیا تا کہ ان کی رخصت کا قیامت خیز سماں نہ دیکھ سکیں۔ جب اماں نے شادی پر بہت زور دیا تو جی چاہا کہ ویسی ہی خاتون میری بیوی بن کر آئے۔ خاندانوں میں جہاں تک میری رسائی تھی، میں نے سب کو دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کی، لیکن کہیں کامیابی نہیں ملی۔ بٹیا سرکار کو دیکھا تو ایسا محسوس ہوا جیسے برسوں سے دیکھے جانے والے خواب کی تعبیر مل گئی ہو۔

ہر تیسرے چوتھے مہینے ایک شخص آتا اور تحائف پیش کر دیتا۔ عمدہ قسم کے حلوے، گیلانی خشکا اور زردہ۔ تین چیزیں وہ ہر تیسرے چوتھے مہینے بڑی تعداد میں بھیجتیں۔ جب میری کوئی کتاب چھپتی تو ان کا ملازم ایک خط کے ساتھ کتاب لاتا کہ اس پر دستخط کر دیجیے۔ میں ہر کتاب پر بٹیا سرکار کے لیے لکھ کر بھیج دیتا جس کا جواب نامہ بھی ایک آدمی لے کر آتا۔ بہت خوشی کا اظہار کیا جاتا۔ کچھ بہت قیمتی تحفے بھی آئے جو میں نے واپس کر دیے، کیوں کہ وہ میری بساط سے بہت زیادہ تھے۔ پھر ایک صاحب زادے نے ایم اے میں داخلہ لیا، جو اُن کے پروردہ تھے اور پاس ہوتے ہی وہ ریڈیو میں ملازم ہو گئے۔ ان کے وسیلے سے بھی تحائف اور خطوط کا سلسلہ چلتا رہا۔ دو ایک بار میں نے ان سے وعدہ کیا کہ میں بٹیا سرکار سے ملوں گا لیکن عین وقت پر منھ چرانا پڑا۔ ہمت نہیں ہوئی۔ ایک بار میں دہلی ریڈیو اسٹیشن میں کسی کام سے شام کے وقت پہنچا۔ صبح میٹنگ تھی۔ میں نے سوچا کہ رشید کے گھر ٹھہر جاؤں گا۔ وہ بہت خوش ہوا۔ بہت تواضع کی اور اجازت لے کر چلنے لگا تو میں نے کہا کہ اگر آپ نے کھانے میں تکلف کیا تو میری آمد پہلی ہی نہیں آخری بھی ہو گی۔ ایک دن پہلے میں کلکتہ سے آیا تھا۔ ابھی تھکن اُتری نہیں تھی کہ دہلی کے لیے روانہ ہونا پڑا۔ بدن جیسے چور چور ہو گیا۔ میں نے پردے برابر کیے۔ اپنے بیگ سے وہسکی کی بوتل نکالی۔ ہر چند کہ ابھی عصر کی اذان ہوئی تھی، لیکن میں شروع ہو گیا۔ بقول غالب کے، بدن میں زندگی دوڑ گئی، حواس تر و تازہ ہو گئے۔ ہم اپنے خوابوں کی دنیا میں آرام سے بیٹھے تھے کہ رشید کی آواز آئی، سر ادھر دیکھیے کون آیا ہے۔ نگاہ اُٹھائی تو قیامت مجسم کھڑی تھی۔ کمر تک خم ہو کر اس نے سلام کیا، میں عالمِ تحیر میں اُٹھ پڑا اور بے خودی میں اس کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا: آپ نے مجھے پہچانا؟ میں نے بغیر کسی ارادے کے صرف بدحواسی میں اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنے پاس بٹھا لیا۔ کاش، بٹیا سرکار کا دیدار اور تعارف ایک ساتھ نصیب ہوا ہوتا۔ ہم نے یہ جانا تھا کہ آپ اودھ کے کسی نواب کی دس پانچ اولادوں میں سے ایک اولاد

ہوں گی تو ملنے کی آرزو کی تھی، لیکن رشید سے معلوم ہوا کہ آپ دو دو حکمراں ریاستوں کی مالک ہیں۔ آپ آسمان، ہم زمین اور زمین بھی ایسی جو اُٹھائی جا چکی۔ ہمارے اور آپ کے درمیان گیارہ گیارہ توپوں کی سلامی کی ریاستیں دیواروں کی طرح کھڑی ہیں۔ ہم کو اپنے اوپر حیرت تھی کہ ہم کیسے بول رہے ہیں۔ ایک بار اس کی طرف گھوم کر دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ بٹیا سرکار یہ آنسو دیکھنے کی تاب نہیں ہے مجھ میں۔ سر، یہ آنسو نہیں ہیں، آنکھیں برسوں سے جس کو دیکھنے کے لیے بے قرار تھیں، اس کی دید پر خوشی سے یہ موتی لٹا رہی ہیں۔ بٹیا سرکار، آپ کو میرے سر کی قسم۔ یہ قسم مت دیجیے۔ خدا کے واسطے یہ قسم مت دیجیے۔ واپس لیجیے اس لیے کہ مجھے اپنے آنسوؤں پر اختیار نہیں۔ وہ گریۂ عشق میں مبتلا ہو چکی تھیں۔ ہم نے بھی سوچا کہ یہ بادل برس جانے دو۔ پردے کے پیچھے سے آواز آئی: بٹیا سرکار میں چائے لے آؤں؟ لے آؤ، وہ ذرا سا ہٹ گئی۔ ہم نے تیسرے گلاس کے آخری گھونٹ پیٹ میں اُتارے اور ان کی دید میں مبتلا ہو گئے۔ چائے بنائی، پیش کی، اس طرح پیش کی جیسے کہ یہ میرے تمام خوابوں کی تعبیر ہو۔ جب وہ برتن لے کر اندر جانے لگیں تب معلوم ہوا کہ ہم چائے پی چکے۔ رشید نے بہت کوشش کی کہ وہ کشتی تھام لے، لیکن کامیاب نہیں ہو سکا۔ کمرے میں آتے ہی رشید باہر چلا گیا۔ دروازہ بند کر لیا۔ وہ کھڑی تھیں۔ میں نے ان کا چہرہ سمیٹ لیا۔ اس نے دیکھا اور کہا ہم کو تو آپ نے اپنے تخاطب کے قابل بھی نہ جانا۔ کسی خط کا جواب بھی نہیں ملا۔ بہت سے تحفے وصول نہیں کیے گئے اور اب آپ اتنے ڈلار کر رہے ہیں۔ میں اسے کیا سمجھوں؟ میں نے کہا: بٹیا سرکار، آپ کے سر کی قسم۔ زمین، آسمان تک پہنچنے کی ہمت نہیں کر سکی۔ یہ تو آپ کی محبت ہے کہ زمین پر اُتر آئیں، ورنہ میں کس قابل۔ مت کہیے ایسی باتیں۔ ایک بات کہوں۔ فرمائیے۔ ہم آپ سے ملنے نہیں آئے ہیں۔ ہم آپ کو لینے آئے ہیں۔ آپ ہمارے ساتھ محل میں چلیے۔ بٹیا سرکار، رات کے وقت مجھے اپنے ساتھ محل لے جانا آپ کی شان کے خلاف ہے۔ ہم بدنامی اور رُسوائی کے لیے تیار ہیں، لیکن آپ سے دور رہنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس بدنامی اور رُسوائی کا سبب بھی تو میں رہوں گا جو میں برداشت نہیں کر سکتا۔ میری بساط نہیں ہے۔ وہ سوچتی رہی، اس کے آنسو بہتے رہے، اس کا چہرہ میں نے اپنے سینے پر رکھ لیا۔ وہ سسکتی رہی، پھر سر اُٹھایا اور کہا اچھا ایک بات اور ہو سکتی ہے۔ یہ گھر بھی ہمارا ہی ہے۔ ہم بابا سرکار سے اجازت لے کر یہیں آپ کے پاس قیام کر سکتے ہیں۔ اس میں تو آپ کی رُسوائی نہیں ہے۔ بٹیا سرکار زندگی میں پہلی بار اگر میں آپ سے کچھ کہوں گا تو آپ مان لیں گی۔ سر، ہم تو اپنی سب دیواریں توڑ کر اور کشتیاں جلا کر آپ کے پاس آئے ہیں۔ آپ حکم دیجیے۔ مفارقت کے اس لمبے عرصے میں میری خاطر سے چند گھنٹوں کا پیوند لگا لیجیے۔ صبح ریڈیو اسٹیشن سے میں سیدھا آپ کے محل آؤں گا۔ بہت دیر تک بحث و تمحیص کے بعد وہ رضامند ہوئی۔ دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھا اور رشید سے کہا: جب تک فرخ زاد، سر کے لیے کھانا لے کر نہیں آتی، آپ دسترخوان نہیں چنیں گے اور بیگ کو ہاتھ بھی نہیں لگانے دیں گے۔

بٹیا سرکار، میری کیا مجال؟ ساڑھے تین گز کے دوپٹے سے انھوں نے اپنا پورا بدن چھپا لیا۔ میرے قریب آئیں۔ یہ وعدہ جو آپ نے کیا ہے، دوسرے وعدوں کی طرح بے وفا تو نہیں ہوگا۔ میں نے کہا بندوق کی نال پر بھی نہیں۔ رشید کے ساتھ وہ چلی گئیں۔ گھڑی دیکھی تو ساڑھے نو بج رہا تھا۔ مجھے پریشانی لاحق ہوئی کہ اگر بابا سرکار کو معلوم ہوگیا تو کیا ہو سکتا ہے، کیا نہیں ہو سکتا ہے۔ میں سوچتا رہا کہ رشید آگیا۔ رشید، کیا بابا سرکار محل میں تھے؟ میں نہیں بتا سکتا۔ اس لیے کہ بٹیا سرکار نے مجھے ڈیوڑھی سے واپس کردیا کہ آپ تنہا ہیں۔ ابھی ہم بیٹھے کل کے پروگرام کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ ایک خوب صورت سی عورت بڑا سا ناشتہ دان اور ایک بیگ لے کر حاضر ہوئی۔ دونوں چیزیں میز پر رکھ دیں اور بولی سر، یہ بٹیا سرکار نے خاصہ بھیجا ہے اور اس میں عرق گلاب ہے۔ مجھ کو اجازت ہو تو میں چلی جاؤں۔ میں نے اسے رخصت کیا۔ میں نے عرقِ گلاب کی بوتل کھولی جس میں پرچہ رکھا ہوا تھا۔ French Tin عرقِ گلاب کی بوتل میں اس لیے بھیجی جارہی ہوں کہ اگر رشید کی تجن والدہ کی نظر پڑ بھی جائے تو وہ کچھ سمجھنے سے عاجز رہیں۔ میں ابھی سے انتظار میں مبتلا ہو چکی ہوں۔

ہم اور رشید ریڈیو اسٹیشن سے نیچے اُترے تو ایک لمبی سی گاڑی ہماری منتظر تھی۔ رشید نے ہم کو بٹھا دیا۔ ایک بڑی سی عمارت کی پھاٹک پر ڈرائیور نے تین ہارن دیے۔ جب گاڑی پورٹیکو میں پہنچی تو ڈیوڑھی کا دروازہ کھلا اور کئی عورتوں کے جھرمٹ میں بٹیا سرکار طلوع ہوئیں اور فوراً آکر گاڑی کا دروازہ کھولا۔ تشریف لائیے سرکار والا تبار۔ ہمارا غریب خانہ آپ کی میزبانی کا منتظر ہے۔ ہم باہر آئے۔ تو یہ ہے آپ کا غریب خانہ۔ معلوم نہیں دولت خانہ کسے کہتے ہیں۔ نگاہ اُٹھائی۔ سرخ زربفت کی جوتیاں، سرخ ریشم کا چوڑی دار، پنڈلیوں پر کسا ہوا، سفید جمپر منڈھا ہوا اور بہت بڑا سا دوپٹہ۔ سرخ دوپٹہ جو چہرے پر ہالے کی طرح چھایا ہوا تھا۔ سر کے تاج سے پیروں کے پازیب تک سارا زیور سرخ تھا۔ ڈیوڑھی کی پوشش بھی سرخ تھی۔ چند قدم چل کر بٹیا سرکار نے ہمیں اپنا بلیرڈ روم دکھایا۔ پھر ہم ڈرائنگ روم میں داخل ہوگئے۔ میں خاموش بیٹھا انھیں دیکھ رہا تھا۔ پوچھا اتنے غور سے کیا دیکھ رہے ہیں۔ میں نے کہا ہم نے آسمان کو ان جوتیوں میں ستارے ٹانکتے دیکھا ہے۔ ہم نے شراب کو ان آنکھوں سے نشے کی بھیک مانگتے دیکھا ہے۔ سر۔ شکار تو قدموں میں پڑا ہے۔ یہ اس پر تیر اور تیر کیوں چلا رہے ہیں۔ آواز آئی بٹیا سرکار سوپ تیار ہے۔ وہ کھڑی ہوئیں، ابھی انتظار کرو۔ ہم بھی کھڑے ہوئے۔ ڈرائنگ روم میں تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ ہم انھیں دیکھ رہے تھے۔ ہم نے ہاتھ بڑھا کر ان کے چہرے کی کتاب دونوں ہاتھوں میں لے لی، اور ہونٹوں سے اوّل سے آخر تک تلاوت کرلی۔ تم کو یقین آیا کہ تم کتنی خوب صورت ہو۔ ۲۷ سال کی ایک لڑکی جس کی سہیلیاں اسے موٹی بھی کہتی ہیں، اگر خوب صورت ہو سکتی ہے تو ہم ہیں۔ تھوڑی دیر تک یوں ہی گفتگو ہوتی رہی۔ سوپ پینے کے بعد ہم لوگ ڈائننگ روم میں داخل ہوئے تو دیکھا نواب صاحب

دوسرے دروازے سے داخل ہورہے ہیں۔ ہم نے بہت خم ہوکر آداب کیا۔ انھوں نے ہمیں سینے سے لگالیا۔ بٹیا سرکار نے آج تیسری بار آپ کے لیے گاڑی بھیجی۔ بابا سرکار، ہر مرتبہ میرے ساتھ کچھ ایسے لوگ ہوتے جن کو میں بٹیا سرکار سے ملانے نہیں لاسکتا تھا۔ ہم نے سنا تھا کہ آپ کمیونسٹ ہیں۔ آپ نے ہم کو بابا سرکار کہا تو ہم کو خوشی ہوئی۔ اس لیے کہ کمیونسٹ حضرات تخاطب میں بہت محتاط ہوتے ہیں۔ آپ نے ہماری بیٹی کا اتنا خیال کیا ہم کو مزید خوشی ہوئی۔ بسم اللہ کیجیے، ہم ڈائننگ روم میں قد آدم تصویریں دیکھ رہے تھے کہ ملازمہ نے ڈش بڑھائی اور آہستہ سے کہا لے لیجیے۔ ہمارے سامنے گنگا جمنی پلیٹ (سونے چاندی کی پلیٹ) اُلٹی رکھی تھی۔ ہم نے چمچا اسی پر انڈیل دیا۔ بٹیا سرکار جو اپنے باپ کے پہلو میں بیٹھی تھی، چمک کر اٹھیں، لیکن ان کے آنے سے پہلے ہی خادمہ نے انتہائی احتیاط سے پلیٹ اُٹھالی اور دوسری لگادی۔ بابا سرکار کی آواز بلند ہوئی۔ بٹیا سرکار آپ وہیں بیٹھ جائیں، اور اب وہ جواہر پوش ہاتھ ہماری پلیٹ کی خدمت کرنے لگے۔

پروفیسر صاحب، پہلے یہ بتائیے کہ گھر میں والدین آپ کو کیا کہتے ہیں۔ میں نے کہا بابا سرکار، مجھ کو بھیا کہتے ہیں۔ تو ٹھیک ہے۔ صاحبان کی تو یہاں بھیڑ لگی ہوئی ہے آپ کھو جائیں گے، اس لیے آج سے نہیں، ابھی سے آپ کو بھیا سرکار کہا جائے گا۔ ایک بات اور۔ ہمارے محل کا قاعدہ ہے کہ مہمان اپنی مرضی سے آتا ہے لیکن جاتا ہماری مرضی سے ہے۔ کم از کم، کم از کم تین دن کے بعد۔ بابا سرکار یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ جس وقت آپ نے گاڑی پر قدم رکھا ہے، ہم نے اسی وقت آپ کے وائس چانسلر کو فون کیا تھا کہ آپ کو کم از کم تین دنوں کی ڈیوٹی لیو (Duty leave) منظور کرلی جائے۔ انھوں نے ازراہ عنایت دس دنوں کی Duty leave منظور کرلی۔ اس لیے یہ موضوع ختم ہوگیا۔ کھانا ختم ہوا۔ کئی عورتوں کی موجودگی میں بٹیا سرکار میرے ہاتھ دھلانے بڑھیں۔ میں نے منع کیا۔ بابا سرکار مسکرائے۔ کرنے دیجیے پروفیسر صاحب۔ کسی کی تو خدمت کریں۔ ہاں ایک بات آپ سے اور کہنا ہے۔ ہمارا پروگرام کل رات بن چکا تھا باہر جانے کے لیے۔ ہر چند کہ آپ کی موجودگی میں باہر جانا آداب میزبانی کے خلاف ہے، لیکن مجبوری ہے اور پھر مہمان آپ میرے تھوڑے ہی ہیں، بٹیا سرکار کے ہیں۔ ہم کافی روم میں آپ کے ساتھ چلتے لیکن ہمارے پاس وقت نہیں ہے، ہم کو اجازت دیجیے۔ بٹیا سرکار نے فرمایا۔ بھیا سرکار میں بابا سرکار کو ڈیوڑھی تک پہنچانے جارہی ہوں۔ میں نے کہا ہم بھی چلیں گے۔ دونوں بہت خوش ہوئے۔ ڈیوڑھی پر گاڑی لگی تھی۔ انھوں نے ملازم کو آواز دی۔ حکم دیا کہ ہماری عدم موجودگی میں محل بھیا سرکار کے حکم کا پابند ہوگا۔ وہ چلے گئے۔ ہم چائے کے وقت تک زبان سے بولتے رہے اور دماغ سے سوچتے رہے کہ اس بے محابہ سپردگی کا سبب کیا ہے۔ ایسا تو کہانیوں میں بھی نہیں ہوتا۔ ہم اگر کوئی ناول لکھ رہے ہوتے تو ہرگز ہرگز ایسا نہیں لکھ سکتے تھے۔ جب شراب آئی تو جو عورتیں کھڑی تھیں، میں نے انھیں ہٹنے کا اشارہ کیا اور بٹیا سرکار کا ہاتھ تھام لیا۔ آپ کو میرے سر کی قسم ہے، سچ سچ بتائیے کہ آپ کی بے پناہ سپردگی کا سبب

کیا ہے۔ ایسا تو میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ وہ گردن جھکائے چپ بیٹھی رہی۔ پھر ہمارے شدید اصرار پر بولی: ہماری نانی جان کے ایک پیر تھے جنھوں نے نانی جان کو ایک وظیفہ بتایا تھا کہ اگر کوئی شخص نئے کپڑے پہن کر تہجد کی نماز کے بعد وظیفہ پڑھے تو اس کو اپنے سوال کا جواب مل جاتا ہے۔ دوراز حال بابا سرکار شکار میں زخمی ہوئے۔ ہم نے وظیفہ پڑھا۔ جواب ملا کیوں پریشان ہوتی ہے۔ تو اب چندروز میں گھر آجائیں گے۔ ہماری والدہ کا Appendix کا آپریشن تھا، ہم نے وظیفہ پڑھا۔ جواب ملا کہ مشیت الٰہی میں کسی کا دخل نہیں۔ والدہ کا انتقال ہوگیا۔ دو ماہ قبل جب ہم بہت بے قرار ہوئے تو ہم نے وظیفہ پڑھا کہ آپ ہمارے گھر آئیں گے کہ نہیں۔ جواب ملا کیوں پریشان ہوتی ہے۔ وہ تیرا دولہا ہے۔ آئے گا کیسے نہیں، اور دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپالیا۔ کیا یہ بات بابا سرکار کو معلوم ہے؟ اس محل کی کون سی ایسی بات ہے، جو بابا سرکار سے راز رہ سکتی ہے۔ بابا سرکار کہیں نہیں گئے ہیں، دہلی میں ہیں۔ انھوں نے ہم کو مکمل آزادی اور تنہائی دینے کے لیے محل چھوڑا ہے۔ ان کی خادماؤں کو حکم ہے کہ آپ کو یہ راز معلوم نہ ہو اور آپ کی پوری خاطر تواضع کی جائے۔

تین دن کے بعد بابا سرکار آگئے اور ہم کو حکم دیا کہ آپ پوری چھٹیاں یہیں گزاریے، اور بٹیا سرکار کو حکم ہوا کہ آپ ہماری عدم موجودگی میں جس طرح بھیا سرکار کو رکھتی تھیں، اسی طرح رکھیں۔ دس دن کے بعد ہم گھر آئے تو معلوم ہوا کہ ہم شاگرد پیشہ میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ پھر چھٹیاں شروع ہوگئیں اور ہم پھر دہلی چلے گئے۔ چندروز بعد خاموشی کے ساتھ نکاح ہوگیا۔ ہم نے بٹیا سرکار کی تجمن عرفیت کے کئی نام دیے تھے۔ تاجو، تاجن، تاجی اور حجلۂ عروسی میں داخل ہوتے ہی ہم نے اسے تاجم سلطان کہا۔ ہمارا ناول تاجم سلطان اس بے نظیر محبت پر مبنی ناول ہے۔ چندروز گزرے تھے کہ ان کی ایک عزیزہ نے جنھوں نے اپنے چھوٹے بھائی کے لیے پیغام دیا تھا، لیکن بٹیا سرکار نے انکار کردیا تھا، انھوں نے اپنے یہاں دعوت دی۔ وسنت کنج میں ان کی کوٹھی تھی۔ ہم اور بٹیا سرکار گئے۔ اس عورت کو دیکھتے ہی مجھے محسوس ہوا کہ یہ عورت ناگن ہے، ڈائن ہے، لیکن میں کسی سے اظہار نہیں کرسکتا تھا۔ جلدی جلدی ہم نے کھانا ختم کیا اور بٹیا سرکار کو چلنے کا اشارہ کیا۔ اس عورت نے چلتے چلتے بٹیا سرکار کو ایک پان کھلایا۔ دوسرا میرے منھ میں رکھ دیا بہت محبت کے ساتھ۔ بٹیا سرکار سے گزارش کی کہ اس کی پیک مت تھوکیے گا۔ دیکھیے کتنا مزہ آتا ہے۔ گھر آکر میں نے کہا کہ یہ عورت ناقص ہے اور یہ پورا واقعہ میں نے بابا سرکار کو بتادیا۔ وہ چپ بیٹھے رہے۔ دوسرے دن ان کی طبیعت خراب ہوئی۔ بٹیا سرکار کے بہت سے ٹیسٹ ہوئے، لیکن کسی مرض کا پتہ نہیں چلا۔ چندروز گزرے تھے کہ بٹیا سرکار کو چکر آنے لگے، اور دل جیسے بیٹھا جانے لگا۔ ایک ہنگامہ ہوگیا۔ ڈاکٹروں کی بھیڑ لگ گئی، لیکن کوئی مرض تشخیص نہیں ہوسکا۔ بابا سرکار کے ایک دوست مہاراج دھراج جن کو بٹیا سرکار، پاپا جی مہاراج کہتی تھیں، انھوں نے انگلینڈ لے جانے کا مشورہ دیا۔ بابا سرکار تیار ہوگئے۔ میرے پاسپورٹ کی پوری کوششیں ہونے لگیں۔ اسی رات بٹیا سرکار نے غسل کیا۔ نیا جوڑا پہنا۔ تہجد کی نماز کے بعد وظیفہ پڑھا۔

مجھے حکم ہوا کہ آپ میری طرف مت دیکھیے۔ میں نے کہا یہ ممکن نہیں ہے۔ میں اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ فجر کی اذان کے ساتھ ایک چیخ بلند ہوئی۔ میں بھاگ کر کمرے میں پہنچا۔ وہ مجھ سے لپٹ گئی اور بچوں کی طرح تڑپ تڑپ کر روتی رہی۔ بہت مشکلوں سے وہ یہ کہہ سکی کہ مجھے موت کی بشارت ہوئی ہے۔ کہا گیا کہ مشیت الٰہی میں کسی کا دخل نہیں ہوسکتا۔ تین دن کے اندر اس کا انتقال ہوگیا۔ میں اس کے سوئم کے بعد بجائے علی گڑھ جانے کے مجسٹریٹ چلا گیا۔ بابا سرکار کے کئی خط آئے، لیکن میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ معلوم ہوا کہ وہ انگلینڈ چلے گئے۔

راشد میاں یہ تو ڈھانچہ ہے میری محبت کی کہانی کا۔ پورا ناول ''تاجم سلطان'' پڑھیے۔ لاحقے اور سابقے جو ناول کی بُنت میں استعمال ہوئے ہیں، انھیں نظرانداز کردیجیے۔ باقی تمام کہانی ایک ایک حرف سچ ہے۔ بٹیا سرکار کے انتقال کے بعد دو برس کیسے گزرے، یہ ناقابلِ بیان ہے۔ بس اس طرح گزرے جیسے کوئی کچے ریشم کی چادر ببول کے کانٹوں پر گھسیٹ رہا ہو۔

راشد: آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ اس واقعے اور اس وضاحت کے بعد ''تاجم سلطان'' کی باقاعدہ قرأت ناگزیر ہوگئی ہے۔ میں محسوس کررہا ہوں کہ آپ کی آواز بھرائی ہے۔ آپ کی آنکھیں نم ناک دکھائی دے رہی ہیں۔ ظاہر ہے جب کوئی قصہ افسوس ناک انجام سے دوچار ہوگیا، اور بعد کے حالات کو بیان کرنا خود آپ کے لیے مشکل ہورہا ہے تو میں زور نہیں دوں گا کہ آپ صبر آزما لمحات کو طول دیں۔ آپ نے اشارہ کیا ہے کہ عشق کے تمام قصوں کا اختتام خوش گوار نہیں ہے، اس کے باوجود میں آپ کو زندگی کی چوتھی اور آخری عشق کی روداد سنانے کی زحمت دینا چاہتا ہوں تاکہ یہ باب مکمل ہوسکے۔ مجھے اندازہ ہے کہ ابتدا میں جو چمک آپ کی آنکھوں میں دکھائی دے گی وہ روداد کے اختتام میں کافور ہوجائے گی، لیکن اس بات کی تسلّی بھی ہے کہ مشکل لمحات میں بھی جن لوگوں کے قدم نہیں ڈگمگاتے، ان لوگوں میں آپ ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

قاضی عبدالستار: چوتھے عشق کا معاملہ میرے لکچرر ہونے کے بعد کا ہے۔ لکچرر ہونے کے بعد شادی کا دباؤ بڑھتا گیا۔ شمیم کی موت نے مجھ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور شادی میں میری کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی، لیکن والدہ کے اصرار پر والدہ کے کزن کی بیٹی سے شادی ہوگئی۔ بیگم صاحب کا یہ مسئلہ تھا کہ وہ رانجہ نواب چودھری محمد محمود کی اولاد اکبر تھیں۔ پانچ سو بیگھہ زمین ان کے نام تھی۔ ان کا غرور ناقابلِ بیان تھا اور منکسر مزاج ہم بھی نہیں تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو Egos ٹکرائے۔ ایک شام انھوں نے فرمایا کہ میں ''کرسی'' جاؤں گی۔ میں نے کہا ابھی نہ جاؤ۔ ہم انتظام کردیں گے تب جانا۔ یہ کہہ کر ہم کلب چلے گئے۔ ان کا ایک ملازم بھی ساتھ رہتا تھا۔ ہم کلب سے واپس آئے تو معلوم ہوا کہ وہ چلی گئیں۔ سخت ناگوار ہوا۔ یہ واقعہ ۱۹۶۹ء کا ہے۔ دونوں بچے جو چھوٹے چھوٹے تھے، میرے ہی پاس تھے۔ میں نے اپنی والدہ کو بلالیا تاکہ بچوں کی پرورش ہوسکے۔ ان کو لینے کے لیے ماموں گئے، میرے بچا گئے، میری والدہ گئیں، لیکن ان کی ضد تھی کہ میں لینے جاؤں۔ میں نے انکار کردیا۔ نہ میں انھیں لینے

گیا، نہ ہی وہ واپس آئیں اور ان سے تعلقات کا سلسلہ یوں ہی ختم ہو گیا۔

۱۹۷۱ء میں میری بہن کے ساتھ ایک لڑکی آئی۔ وہ چائے پی رہی تھی جب میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ بہت اچھی لگی۔ معلوم ہوا کہ وہ ایم اے اردو میں داخلہ لینے آئی ہے، اور کسی طرح میری بہن سے متعارف ہو گئی ہے۔ ایم اے میں داخلہ ہو گیا۔ وہ کلاس میں جگمگاتی رہی۔ انتہائی اسمارٹ اور ذہین، خوش مزاج۔ میں نے آزمانے کے لیے بی اے کی کاپیاں دیکھنے کے لیے بلایا۔ وہ اتوار کو صبح آ گئی اور شام تک اس نے کاپیاں دیکھیں۔ بہت تکلف سے کھانا کھایا۔ اسی طرح چائے بھی پی۔ جتنا وقت گزرتا گیا، وہ قریب آتی گئی۔ ایم اے فائنل کا امتحان دے کر جب وہ جانے لگی تو میں نے پوچھا کہ تم دہلی کب جاؤ گی۔ اس نے کہا پرسوں میری سہیلیاں جا رہی ہیں، میں ان کے ساتھ جاؤں گی۔ میں نے اسے ڈرائنگ روم بلایا اور کہا کہ اگر تم مجھ سے شادی کرنے کے لیے رضامند ہو تو کل دس بجے آ جانا اور اگر رضامند نہیں ہو تو ہر گز مت آنا۔ وہ چلی گئی، بغیر کوئی جواب دیے۔ دوسرے دن ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے اور دس بجنے کا انتظار کرنے لگے۔ ٹھیک دس بجے وہ آ گئی۔ پہلی بار میں نے اس کو ہاتھ لگایا جس پر اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ کچھ دیر کے بعد صرف اتنا کہا کہ شادی کے لیے صرف میری رضامندی کافی نہیں ہے۔ میرے ماں باپ کا مسئلہ بھی تو ہے۔ ہر چند کہ آپ میں بہت سی خوبیاں ہیں، عمر کا بھی کوئی مسئلہ میرے نزدیک نہیں ہے، لیکن دو بچوں کے ساتھ دوسری شادی۔ ماں باپ آسانی کے ساتھ منظور نہیں کریں گے، جب کہ میرے دو پیغامات موجود ہیں۔ یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ میں نے اپنی والدہ سے مشورہ کیا۔ وہ میرے انتخاب سے خوش ہوئیں اور فرمایا کہ میں دہلی جاؤں گی اور ان کے ماں باپ سے بات کروں گی۔ چھٹیاں گزر چکی تھیں۔ میں نے دوسرے پتے پر جو اس نے بتلایا تھا، خط لکھا کہ تم ریسرچ میں داخلہ لینے کے بہانے علی گڑھ آ جاؤ۔ جب تک ہمارے ماں باپ رضامند نہیں ہو جاتے، کم سے کم ہم مل تو سکیں۔ وہ آ گئی۔ سرور صاحب کی نگرانی میں وہ ریسرچ اسٹوڈنٹ ہو گئی اور میرے ہی گھر میں رہنے لگی۔ برائے نام اس کا داخلہ ویمنس کالج ہوسٹل میں تھا، رہتی وہ میرے ساتھ تھی۔ خیر دو تین مہینے کی تگ و دو کے بعد ستمبر ۱۹۷۳ء میں ہماری شادی ہو گئی، اور پوری عمر میں زندگی پہلی بار خوب صورت معلوم ہوئی۔ گھر میں دلچسپی پیدا ہوئی اور اتنی پیدا ہوئی کہ کلب ناغہ ہونے لگا۔

میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں بچپن سے اپنے والد کا انتظار کرتا رہا ہوں۔ ان کی جدائی کا غم جیسے میری زندگی کا حصہ بن گیا اور شاید ہی کوئی رات ایسی گزرتی ہو جب میں ابو جان کو نہیں یاد کرتا ہوں۔ کوثر سے شادی کے بعد یہ غم جیسے کم ہو گیا۔ وہ آگ مدھم ہو گئی۔ شادی سے قبل بھی کچھ دلچسپ واقعات ہوئے۔ پہلا معاملہ تو یہ ہے کہ جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ میں شادی کرنا چاہتا ہوں تو خلیل الرحمن اعظمی اور شہریار نے پروفیسر آل احمد سرور سے فرمایا کہ طالب علم سے شادی کرنا بہت غلط ہے اور یہ مقدمہ

بداخلاقی یعنی moral tarpitude کے حدود میں آتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ سرور صاحب نے کیا کیا اور کیا کہا۔ یہ واقعہ جب کوثر کو معلوم ہوا تو اس نے اپنا داخلہ کینسل کرادیا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ کوثر میرے ساتھ بلیرڈ کھیلے۔ بلیرڈ روم عام طور پر مغرب کے وقت کھلتا تھا۔ ایک روز چار بجے میں کوثر کو لے کلب پہنچ گیا۔ بلیرڈ روم کھلوایا اور اس کو بلیرڈ سکھانے لگا۔ تین چار دن ہوئے تھے کہ وائس چانسلر نواب علی یاور جنگ بلیرڈ روم میں تشریف لے آئے۔ میرا تعارف ہو چکا تھا۔ وہ ٹینس کھیلنے آتے تھے، لیکن کسی وجہ سے، بلکہ میرا خیال ہے کہ کسی شکایت کی بنا پر بلیرڈ روم میں آ گئے۔ میں نے کیو رکھ دیا۔ کوثر بھی سمٹ کر ایک طرف بیٹھ گئی۔ انھوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ میں نے عرض کیا کہ سر میرا نام قاضی عبدالستار ہے۔ اردو ڈپارٹمنٹ میں؟ جی سر۔ آپ کی تعریف؟ میں نے عرض کیا یہ میری ہونے والی بیگم ہے۔ مسکرائے، ''نائس'' بہت زور سے کہا۔ سامنے کھڑے ہوئے بیئررس میں سے ایک کو بلوایا۔ اس کو دس روپے کا نوٹ دیا کہ اس کا خوردہ لے آؤ، اور میرے پاس ہی بیٹھ گئے۔ بلیرڈ کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ میں جو بہت خراب کھیلنے والا تھا، اس کے ساتھ وہ کھیلنے کھڑے ہو گئے۔ اتنے میں بیئر رخوردہ لے کر آ گیا۔ انھوں نے ایک پاکٹ سے سو روپے کا نوٹ نکالا۔ اس پر ایک روپیہ رکھا اور چار قدم چل کر ذرا سا خم ہو کر کوثر سے کہا would be بیگم صاحبہ اسے قبول فرمائیے۔ میں یہ منظر دیکھ کر ہل گیا۔ میں سخت پریشان تھا لیکن ان کے ساتھ آدھا گھنٹہ کھیلتا رہا۔ ٹھیک آدھے گھنٹہ کے بعد وہ مجھ سے جیت کر چلے گئے۔ جب طالب علموں سے ان کا جھگڑا ہوا اور ان کی انگلی زخمی ہوئی اور وہ ہسپتال میں زیر علاج ہوئے اور کسی کو ان سے ملنے کی اجازت نہیں دی گئی تب کوثر سے میری شادی ہو چکی تھی۔ ہم دونوں پھلوں کا ایک بکٹ لے کر ان سے ملنے گئے۔ ملازم نے صاف انکار کر دیا کہ ملاقات نہیں ہو سکتی۔ میں نے زور سے کہا کہ آپ میرا پرچہ دے دیجیے۔ نواب صاحب کا جی چاہے گا تو بلائیں گے ورنہ منع کر دیں گے۔ ملازم فوراً واپس آیا۔ آئیے۔ انھوں نے مسکرا کر ہم دونوں کے سلام قبول کیے۔ کوثر نے پھلوں کی بکٹ ان کے سرہانے رکھ دی۔ مسکرائے۔ ایک سو ایک روپیہ یاد ہے آپ کو۔ اس نے جواب دیا: سر۔ میری کیا بساط، وہ روپیہ تو میرے پاس یادگار کے طور پر محفوظ ہے۔ ہم دونوں کو چائے پلوائی گئی اور ہم واپس آئے۔ چلتے وقت نواب صاحب نے فرمایا: جب آپ کا جی چاہے، چلی آیا کیجیے۔

ایک اور دلچسپ واقعہ ہوا۔ میں پروفیسر رشید احمد صدیقی سے بہت گھبراتا تھا۔ میاں خاں (چپراسی) نے بتلایا کہ صاحب کی طبیعت خراب ہے اور وہ آپ کو پوچھ رہے تھے۔ ہم دونوں شام کو پہنچ گئے۔ کوثر سلیکس پہنے ہوئے تھی۔ استاد فراک چیئر پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم لوگ سامنے دوسری آرام کرسیوں پر تھے۔ بیگم صاحب کہیں پڑوس میں گئی ہوئی تھیں۔ اپنے ملازم سکندر کو انھوں نے حکم دیا کہ میرے لیے بیڑے لائے۔ ہم لوگوں نے بہت تکلف سے ایک ایک بیڑا کھایا۔ جب چائے پی رہے تھے تو رشید صاحب نے فرمایا: آپ کے شوہر کی تحریریں تہذیب کے بیان سے جگمگاتی رہتی ہیں، لیکن آپ پر تہذیب کا کوئی اثر نہیں ہے۔ یہ مغربی لباس ہے۔ کتنا اچھا ہوتا کہ آپ مسلمانوں کا

لباس پہن کر آتیں۔ ہم دونوں چپ بیٹھے رہے۔ ایک ایک پیڑا اصرار کر کے پھر کھلایا۔ ہم دونوں چپ چاپ رخصت ہوئے۔ چند روز کے بعد میں نے میاں خاں سے کہا کہ تم سکندر سے پوچھو کہ ہم لوگ آئیں گے تو ملاقات ہو جائے گی۔ سکندر نے جواب دیا، آپ کا جب جی چاہے چلے آیئے۔ اس بار کوثر شلوار سوٹ پہن کر دوپٹے میں سر کو چھپا کر سلام کے لیے خم ہوئیں تو رشید صاحب خوش ہوئے۔ کسی کو آواز دی آج دو دو پیڑے کھائیں گے یہ دونوں۔ لے کر آئے، اور ہم لوگوں کو دو دو پیڑے کھلائے گئے۔ چاے پلائی گئی، خوش ہوئے۔ بہت مسکرا کر سلام قبول کیا اور ہم لوگ رخصت ہوئے۔ آج بھی نواب صاحب یاد آتے ہیں، رشید صاحب یاد آتے ہیں۔

کوثر کی آمد سے ہمارا گھر جگمگانے لگا۔ پورے آٹھ برس ہم نے بہت آرام کی زندگی گزاری۔ ۱۹۸۰ء میں ہم نے فکشن پر ایک سمینار کیا۔ اس سمینار کی دعوت و تنظیم میں کوثر اپنے آپ سے گزر گئیں۔ پہلا اٹیک پاگل پن کا یہیں ہوا۔ جتنے ڈاکٹر ہماری دسترس میں تھے، ان سب کو ہم نے دکھلایا۔ کسی نے کچھ بتایا نہیں، علاج کرتے رہے۔ لاحاصل علاج کرتے رہے۔ ایک روز جذبی صاحب نے فرمایا کہ تم کے. پی. شاہ کو بھی دکھلاؤ۔ میں شہر گیا۔ کے. پی. شاہ سے گزارش کی۔ جب ان کا مطب ختم ہوا تب وہ تانگے پر بیٹھ کر اور مجھے آگے بٹھا کر روانہ ہوئے۔ کوثر کو دیکھتے ہی انھوں نے مجھ سے کہا کہ آپ دوسرے کمرے میں چلے جایئے۔ پورے چالیس منٹ وہ ان سے باتیں کرتے رہے اور جب انھوں نے مجھے آواز دی اور میں چاے لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو فرمایا کہ: ایسا مرض ہے آپ کی بیگم کو کہ ہر ڈاکٹر نے سمجھ لیا ہوگا، لیکن آپ کو بتلایا نہیں۔ میں بھی نہیں بتلاتا لیکن چوں کہ آپ کو جذبی صاحب نے میرے پاس بھیجا ہے، اس لیے میں آپ کو اندھیرے میں نہیں رکھ سکتا۔ آپ کی بیگم mentally retarded ہیں اور یہ مرض hereditary ہے اور جہاں تک میرا علم ہے، لاعلاج ہے۔ مجھ پر ایک عالم گزر گیا۔ انھوں نے کہا آپ میرے ساتھ چلیے۔ میں کچھ دوائیں دوں گا۔ اس سے مرض کو کچھ دبایا جا سکتا ہے۔ میں نے دواؤں کے ساتھ وہسکی کی بوتل بھی خریدی اور ساری رات بیٹھا رہا۔ چند روز کے بعد کے. پی. شاہ سے ملا تو انھوں نے کہا کہ آپ دلّی جایئے اور فیروز شاہ روڈ پر ایک ڈاکٹر رہتا ہے، جو ہومیو پیتھک کی دنیا میں ایک مشہور نام ہے اس سے ملیے۔ انھوں نے ڈاکٹر کا نام بھی بتایا تھا لیکن فی الوقت نام میں بھول گیا۔ میں نے جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو خط لکھ کر منڈی ہاؤس گیسٹ ہاؤس میں دو کمرے لیے۔ ۳۲ ر روز علاج کیا۔ ۳۲ ر روز کے علاج کے بعد ڈاکٹر نے مایوسی کا اظہار کیا، اور میں کوثر کو لے کر علی گڑھ آ گیا۔ پی ایف سے مجھے قرض لینا پڑا تھا، اور تمام چھٹیاں سوخت ہو گئیں، لیکن سب لاحاصل۔ اب وہ violent ہونے لگی تھیں۔ بچوں کے ساتھ ساتھ مجھ سے بدتمیزی اور بچوں سے مار پیٹ کرنے لگیں۔ میرے دوست کنور پال سنگھ نے مجھ سے کہا کہ آپ ڈپٹی کمشنر پونیا سے ملاقات کیجیے۔ ان کے کوئی خاص عزیز آگرہ کے مینٹل ہوسپٹل میں ہیں۔ شاید کوئی صورت پیدا ہو۔ پونیا صاحب نے فوراً خط لکھ دیا اور میں نے کوثر کو

وہاں داخل کرادیا اور دس دن تک آگرہ میں قیام کر کے روز اسپتال جاتا رہا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ مجبوراً گھر لے آئے۔ اس تمام دوڑ دھوپ میں بچّوں کی تربیت بری طرح متاثر ہوئی، اور پڑھنے کی طرف پوری لاپرواہی برتی، برباد ہو گئے۔ پندرہ سولہ سال کی عمر میں، کوثر کے بطن سے جو بڑا بیٹا تھا وُرریز ستار، اس نے شادی کرلی اور وہ لڑکی کو لے کر یا لڑکی اس کو لے کر خاموشی سے لکھنؤ بھاگ گئے۔ وُرریز نے میرے سیلف سے دس ہزار روپے نکال لیے اور لکھنؤ گل مرگ ہوٹل میں دونوں اس وقت تک رہے جب تک روپیہ خرچ نہیں ہوگیا۔ اس ٹریجڈی کا راز یہ ہے کہ سیتاپور سے علی گڑھ تک ہر جگہ یہ بات مشہور تھی اور کسی حد تک ہے کہ میرے پاس بہت بڑی جائداد ہے اور اس کی شہرت بھی شادی میں معاون ثابت ہوئی۔ خیر زندگی کھاروے کی چادر کی طرح لشتم پشتم گزرتی رہی۔ کیسے گزرتی رہی، یہ اگر لکھنے بیٹھوں تو دفتر تیار ہو جائے اور حاصل کچھ بھی نہ ہو۔ اپنی زندگی کے بارے میں سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ پوری زندگی کھاروے کا لباس ہے جس میں چھوٹے بڑے زربفت کے پیوند لگے ہیں۔ بٹیا سرکار کے انتقال کے بعد سال دو برس کیسے گزرے، یہ ناقابلِ بیان ہے۔ بس اس طرح گزرے کہ کیا کہوں۔

راشد: آپ نے حالات کی ناسازگاری کا جو بیان کیا تھا، اس کی اذیت، پوری شدّت کے ساتھ ذہن کو بدحواس کر گئی۔ واقعی انسان وقت اور حالات کے ہاتھوں محض ایک کھلونا ہوتا ہے۔ انسان لاکھ کوشش کر لے، لیکن وقت کی گردش سے نہیں بچ سکتا۔ قسمت کی لکیریں خاموشی کے ساتھ اپنا کام کرتی رہتی ہیں اور ہم بے بس ہو کر خود اپنا ہی تماشا دیکھنے کے لیے مجبور ہوتے ہیں۔ زندگی میں سب کچھ ویسا نہیں ہوتا، جیسا ہم چاہتے ہیں۔ ایسے حالات میں ہمیں اپنے آپ کو حالات کے سانچے میں ڈھالنا پڑتا ہے، لیکن بعض اوقات کے لیے حالات کے سانچے میں خود کو ڈھالنے کے باوجود زندگی کی آزمائشوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا۔ قاضی صاحب چوتھے عشق کے بیان میں آپ نے جس ذہنی انتشار کا ذکر کیا ہے اس کے تصور سے ہی وحشت ہونے لگتی ہے۔ زندگی جب چند برسوں کے لیے آپ پر مہربان ہوئی تو اس کے دھنک رنگوں سے حیات کا گوشہ گوشہ معطر ہوا تھا، لیکن اسی زندگی نے جب کروٹ بدلی تو ذہنی انتشار اپنے عروج پر پہنچ گیا۔ انتشار کا سلسلہ یہیں تھم گیا یا ذہنی اذیتیں آپ کے حوصلوں کا مزید امتحان لیتی رہیں۔

قاضی عبدالستار: اذیتوں کا سلسلہ یہاں ختم نہیں ہوا۔ تھوڑے دنوں کے بعد والدہ کا انتقال ہو گیا۔ ابھی ہم سنبھلے بھی نہ تھے کہ خبر آئی کہ میرا بیٹا دُرریز ستار، یاسین اور عدنان جو علی گڑھ کے بدنام بدمعاش تھے، ان کے ساتھ گرفتار ہو گیا۔ ہمارے پھریرے کے گھر کے سربراہوں نے بھی کتنے ہی قتل کرائے ہوں گے، کبھی کسی کا سپاہی گرفتار نہیں ہوا۔ تین چار دن میری عجیب حالت رہی۔ ایک لمحہ تو ایسا بھی آیا کہ میں نے Suicide کے لیے ریوالور نکال لیا۔ پانچوں کارتوس لگائے اور منھ میں رکھ کر فائر کیا، لیکن فائر نہیں ہوا۔ باہر نکال کر دیکھا تو کارتوس صحیح سلامت تھے۔ رات کے گیارہ بجے تھے۔ میں نے ایک کارتوس لگا کر صحن میں فائر کیا، فائر دھن

سے ہو گیا۔ اس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ابھی پروردگارِ عالم کو میری موت منظور نہیں ہے۔ تحقیقات کی تو معلوم ہوا کہ میرا بیٹا بے قصور ہے۔ صرف بدمعاشوں کے ساتھ دہلی میں کھانا کھا رہا تھا، گرفتار ہو گیا اور اندور کی جیل میں بھیج دیا گیا۔ میں فوراً اندور گیا، وہاں کے ڈائرکٹر جنرل سے ملاقات کی اور جناب ورمنی صاحب سے بھی ملاقات کی جو شاید ایڈیشنل جنرل تھے۔ انھوں نے بہت دلچسپی لی اور اس کو سلطانی گواہ بنوانے میں مدد کی۔ اگر دُرّریز سلطانی گواہ بن گیا ہوتا تو چند مہینوں میں باہر آ جاتا لیکن اس کو یہ ڈر پیدا ہوا جو کسی حد تک صحیح بھی تھا کہ اس کے بیان سے یاسین اور عدنان وغیرہ کو پھانسی ہو جائے گی اور ہو سکتا تھا جس کا قوی امکان تھا کہ مجھ پر حملہ ہو جاتا، اس لیے دُرّریز نے اپنا بیان بدل دیا اور جیل میں سڑتا رہا۔

ابھی سال دو برس بھی نہیں گزرے تھے کہ دُرّریز کی بیوی کی چھوٹی بہن نے دُرّریز کے چھوٹے بھائی کے ساتھ شادی کر لی۔ میں یہ سب تماشے دیکھتا رہا اور کچھ بھی کرنے سے عاجز رہا۔ صرف صبر اور برداشت کرتا رہا۔ ہم پر تو یہ گزر رہی تھی اور میاں شہریار کہتے پھر رہے تھے کہ: قاضی صاحب زمین دار کے پوت ہیں۔ مار مار کے بیوی کو پاگل بنا دیا۔ میں نے سنا، چپ رہا۔ شہریار میرے پاس آتے بھی تھے، تحفے بھی لاتے تھے، لیکن میں نے کچھ بھی نہیں کہا۔ جب خود شہریار کی بیوی نے شہریار سے طلاق مانگی تو شہریار میرے پاس آئے اور فرمایا کہ: خدا کے واسطے آپ اسے سمجھایئے۔ وہ آپ کا بہت ادب کرتی ہے، شاید مان جائے۔ میں نے جو کچھ ممکن تھا وہ سب کہا اور کیا، لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ تب شہریار کہتے تھے کہ: قاضی صاحب کا صبر مجھ پر پڑا ہے۔ شاویز نے شادی تو کر لی، لیکن اختلافات پیدا ہوتے رہے، سنگین ہوتے رہے اور ایک دن جب میں دہلی میں تھا، اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی، اور چند ماہ بعد میرے پڑوس میں رہنے والے فاضلی صاحب جو لکھنؤ یونیورسٹی میں میرے سنیئر تھے، ان کی بیٹی سے شادی کر لی۔ کوثر شاویز کے ساتھ رہتی تھیں۔ اس واقعے کے بعد شاویز کے سسرال والے کوثر کو لے کر میرے پاس آ گئے۔ اس لیے کہ مجھ پر ہارٹ اٹیک ہو چکا تھا اور میں میرس روڈ کے فرسٹ فلور کا مکان چھوڑ کر گراؤنڈ فلور کے ایک مکان میں رہ رہا تھا۔ میں نے کئی برسوں کے بعد کوثر کو دیکھا تھا۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا لیکن اس کو پہچاننے سے عاجز رہا۔ دماغی توازن کی خرابی نے اس کے نقش و نگار سب برباد کر دیے۔ اسے پہچاننا تک دشوار ہو گیا۔ اتنی اسمارٹ اور دل کش عورت ایسی ہو گئی کہ اگر اس کے کارڈی گن اور شال اور سینڈل پر نظر نہ پڑتی تو کسی گھر کی ماما معلوم ہوتی۔ میں کسی طرح دوسرے دن ان کو بہلا پھسلا کر شاویز کے پاس لے گیا کہ وہ دہلی میں اپنی نئی بیگم کے ساتھ رہ رہا تھا۔ اب اس قصے کو یہیں رہنے دیجیے۔

☆☆☆

شہر شناسائی

(۱)

عابد سہیل کی سوانح

ایک زندہ ادبی دوست کی نظر میں

● اقبال مجید

عابد سہیل کی سوانح ''جو یاد رہا'' میں درج ان کے بہت سے ادبی دوست اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں، جو زندہ ہیں مثلاً نیر مسعود، رتن سنگھ اور راقم الحروف، ان میں سے سب ہی اپنا سامانِ سفر باندھے ویٹنگ روم میں جانے والی گاڑیوں کے اعلانات پر کان لگائے بیٹھے ہیں زندہ دوست ان بیانات کو پڑھ کر مصنف سے کتنا اتفاق کریں گے یہ تو نہیں کہا جا سکتا لیکن مروتاً اتنا تو ضرور کہیں گے۔

کچھ خواب ہے کچھ اصل ہے کچھ طرزِ ادا ہے

خود اپنا تذکرہ پڑھ کر مجھے لگا کہ سوانح نگار کو اپنا بالادستی کو خاموشی اور ہوشیاری سے قائم رکھنے کی دیرینہ عادت کے سبب اُسے دو پرتوں میں چھپا کر جگہ جگہ اس طرح استعمال کیا گیا ہے کہ سامنے والا خود کو کمتر نہ محسوس کرے اور سوانح نگار اپنی بالادستی کی بھوک بھی مٹا سکے۔

کیا یہ کہا جائے کہ شاید ہر سوانح نگار کی پوشیدہ طور پر یہ خواہش ہوتی ہے اور وہ ایسی شخصیتوں اور واقعات کا متلاشی رہا کرتا ہے جن کے بیان کی مدد سے وہ اپنی علمیت، بذلہ سنجی، حاضر جوابی، خوش اخلاقی، ایثار و قربانی، راست گوئی اور نیک نیتی وغیرہ کی صفات کو اُجاگر کر سکے۔ عام زندگی میں تو ان خوبیوں کو فرد اپنے عمل سے نمایاں کرتا ہے جیسے کہ ذاکر حسین صاحب سے ایوان صدر میں ملاقات کے لیے ایک سے ایک بدکردار نیتا آیا کرتے تھے اور انھیں ذاکر صاحب واپسی میں پورچ تک چھوڑنے آیا کرتے تھے لیکن سوانح حیات میں خود کو لے کر ایسے واقعات کوئی عام آدمی بیان کرے تو اس کی صداقت پر شک ہونا عام بات ہو گی۔

یہاں آل انڈیا ریڈیو کے ڈائرکٹر بی، کے سنندی سے عابد سہیل کی جھڑپ کی مثال کام آ رہی ہے، عابد سے سنندی کا جھگڑا عابد کے کردار کے عین مطابق ہے، انھیں ملنے والے ریڈیو پروگراموں کو قبول کرنے

سے عابد کا انکار بھی ان کے مزاج کے عین مطابق ہے لیکن نندی کے تبادلہ ہو جانے کے بعد جی ایم شاد کے ساتھ پروگرام میں حصّہ لینے کے لئے ان کا جانا ریڈیو میں بڑی عام بات رہی ہے کیونکہ بلی کی غیر موجودگی میں چوہے کھل کر کھیلتے ہیں۔ اس میں عابد کی کوئی برائی نہیں تھی کیونکہ نندی کی ناراضگی کے ہوتے ماتحت افسر عابد کو پروگرام دیتے ہوئے نندی کے عتاب سے ڈرتے تھے اور اس کے جاتے ہی یہ روک ٹوک ختم ہوگئی لہٰذا عابد کا فخر سے یہ لکھنا کہ ریڈیو والے انھیں پروگرام کے لیے لے گئے تھے ریڈیو کے واسطے انھیں Inevitable ثابت نہیں کرتا۔

نندی بدتمیز ڈائرکٹر تھا اور عابد بھی ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیتے تھے۔ لیکن اس واقعے کو صرف نندی کی بدسلوکی اور عابد کے احتجاج تک محدود نہیں رکھا گیا بلکہ مصنف نے اپنی دبتی کا ایک راستہ نکال لیا، سوانح حیات کی تکمیل اور تعمیر میں سوانح نگار اگرچہ مکمل طور پر آزاد ہوتا ہے مگر اس آزادی میں کچھ خطرے بھی ہیں جو لکھنے کے زعم میں اگر یاد نہ رہیں تو قاری سے سوانح نگار کی شخصیت کو آنکنے میں غلطی ہو سکتی ہے۔

عابد کتابوں کے شوقین ہیں انھوں نے کتاب نام کا رسالہ بھی نکالا، ان کی اپنی کتابوں کی لائبریری بھی خوب ہے لیکن جس والہانہ انداز اور علمی تڑپ کے ساتھ ادا جعفری نے اپنی سوانح حیات ''جو رہی سو بے خبر رہی'' میں واشنگٹن کی کانگریس لائبریری کا تفصیل اسے ذکر کیا ہے۔ اُسی عقیدت اور محبت سے عابد کی سوانح میں اس باب کو کہیں نہیں چھوا گیا۔ یہ میرے لیے بڑی حیرت کے بات ہے۔

''جو یاد رہا'' کے لاکھوں قارئین اس پریشانی سے بچے ہوئے ہیں جس سے میں نہیں بچ سکتا اور وہ یہ کہ عابد سے میرے تعلقات اور دوستی نصف صدی پرانی ہے اور جس دوستی کو اتنا عرصہ گزر جائے اس کی نمود نہ تو بار بار ہو سکتی ہے اور نہ عمر کے ہر دور میں ایسا یارانہ ممکن ہے۔ ایسے ہی دوستوں کے لیے کہا جاتا ہے۔

اچھے ہو یا برے ہو پر یار ہو ہمارے

ایمانداری کی بات یہ ہے کہ عابد سہیل کی خودنوشت پر میرے لیے کچھ لکھ پانا اس لئے بھی خاصہ مشکل ہے کہ ہم دونوں اپنی زندگی کے ایک خاصے بڑے حصّے میں ایک ہی زمانے مِس کی ایک ہی مقام پر اور تقریباً مشترک احباب اور بزرگوں کے حلقے میں ایک ساتھ رہے ہیں جس کے سبب میں عابد کے مزاج، ان کے رویوں، برتاؤ اور طور طریقوں سے کسی حد تک واقف ہو چکا ہوں اس لئے بلاشبہ اس بات کا ڈر تو موجود ہے کہ میں سوانح کی خوبیوں کو بیان کرتے کرتے عابد کی شخصیت کے پردے میں چھپی بیتاب نرگسیت کے سبب بار بار کھٹکنے والا اجورو یہ سر اٹھانے لگتا ہے اور خوابوں کی خوش رنگ فضا کی بے حجابی اور سمتی کی جگہ تواتر کے ساتھ صحافیانہ پورٹنگ کا سوناپن دم گھٹانے لگات ہے اس کو کوسنا شروع نہ کردوں یا پھر سارا زور یادنگاری پر صرف ہوتے دیکھوں تو بوکھلا جاؤں۔ کیونکہ میں ایسا مانتا ہوں کہ سوانحی تحریر اصل واقعات کی محض کھتونی نہیں ہے، وہ بھی بعض ایسے واقعات جنھیں مختلف مصلحتوں کے سبب بھلایا نہیں گیا ہے اور ایک خاص نہج سے لکھنے

کے لیے یاد رکھا گیا ہے۔ سوانحی واقعات اپنی حقیقت میں تو کسی طرح کی ملاوٹ نہیں کرتے، کیونکہ یہ کام حقائق کے بیان میں ممنوع ہے لیکن انھیں واقعات کی بنیاد پر سوانح نگار خلاقانہ جہان معنی ترتیب دینے والی ایک فکر انگیز اور پُر مغز تحریر اسے ضرور بنا دیتا ہے جس میں بیان کا حسن اور تجسس کا دلچسپ عنصر بھی شامل ہوتا ہے۔ اگر سوانح میں اصل ہی اصل ہو اور طرز ادا ہی ادا ہو اور باقی خوش رنگ عناصر غائب ہوں تو اس دستاویز کو اس اعتبار سے اور بھی کام چلاؤ سمجھا جائے گا کہ دو سال کی فیلوشپ میں مکمل کئے جانے والا وہ پورا پروجیکٹ جس کے تحت اس سوانح کو لکھا گیا اور جسے عابد کے ایک دوست نے اپنے منصب کو استعمال کرتے ہوئے اس رعایت کے ساتھ عنایت کیا تھا کہ اس پر ہونے والے سارے مصارف اکیڈمی برداشت کرے گی اور مصنف خاطر خواہ اجرت کا بھی مستحق ہوگا۔

یہ پروجیکٹ عابد سہیل سے بھی زیادہ پرانے میرے یار جانی قمر رئیس نے عابد کو دلوایا تھا کیونکہ قمر اکادمی میں آنے کے بعد عابد کی ترقی پسندی نوازی کے اعتراف میں ان پر خصوصی التفات پرتنا چاہتے تھے، اسی طرح جس طرح اکیڈمی کا بہادر شاہ ظفر ایوارڈ دلوا کر انہوں نے مجھے ملتفت کیا تھا۔

رہ گیا عابد سہیل کو سوانح لکھنے کے لیے دیا گیا پروجیکٹ تو عابد کی بات دوسری ہے وہ افسانہ نگار بھی ہیں، نقاد بھی ہیں، برسوں ادبی صحافت بھی خوش اسلوبی سے انجام دی ہے۔ لیکن میں اردو ادب کا نہ بیدی اس لئے مجھے جب بھی کوئی اعزاز ملا ہے اور جہاں سے بھی ملا ہے، خواہ لکھنؤ ہو، بھوپال ہو یا دہلی، چاہے قومی سطح کا آل انڈیا ایوارڈ رہا ہو یا صوبائی سطح کا وہ میری صلاحیتوں یا ادبی خدمات کے مدنظر نہیں ملا ہے بلکہ دوستوں کی مہربانی کی وجہ سے ملا ہے۔ یہ تو عابد سہیل اور محمد حسن کی خوش قسمتی تھی کہ محمد حسن کے نام کا اختلاف کرنے والے ممبر نے محمد حسن کو ادبی خدمات کے باعث نہیں بلکہ عابد سہیل کی بزرگی کی لاج رکھتے ہوئے اپنے باٹ تولہ ماشا رتی تک واپس لے لئے ورنہ ہر ممبر دو دو تین تین نام جیب میں ڈال کر تولا جاتا ہی ہے۔ مجھے امید ہے کہ یوپی اکادمی سے ملنے والا پانچ لاکھ کا ایوارڈ ادیب کو صرف اس کی فنکارانہ صلاحیتوں پر دیا گیا ہوگا مگر وہ بھی تب جب جیوری میں سے کسی ممبر نے ادیب سے اپنی دوستی اور اس کے سفید بالوں کی لاج رکھنے کے لیے اپنے باٹ بادل ناخواستہ تولہ ماشہ رتی تک پلڑے سے ہٹا لئے ہوں لیکن ان کی تقسیم کی رسم میں جس بھر شاچار کے چرچے یہاں وہاں سننے کو ملتے ہیں اس پر کوئی احتجاج سوانح میں پڑھنے کو نہیں ملتا اور ہنستے مسکراتے ایک چپت لگاتے ہوئے وہ تمسخر کے ساتھ آگے ضرور بڑھ جاتے ہیں۔

اب جبکہ قبر میں پیر لٹکائے بیٹھا ہوں تو کہہ سکتا ہوں کہ اعزازات کی تقسیم کو لے کر جو متھ (Myth) کام کر رہی تھی اس کا بھانڈا تو پھوٹ چکا ہے لیکن عام لوگوں کا خیال ہے کہ اس اکھاڑے کی کشتی میں کچھ دھرا نہیں ہے۔ اُن لوگوں کا تجربہ عبرتناک ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس رسم کے خلاف کوئی طاقتور آواز اس لئے سر نہیں اُٹھاتی کیونکہ وہ خود بھی اس اعزاز کے انتظار میں بیٹھی ہوتی ہے۔ افسوس کہ عابد نے اس کا صحیح تجزیہ نہیں

کیا ہے ورنہ وہ خود اس انجام پر پہنچ جاتے کہ اعزازات اکثر دوستوں کی محبتوں کے سبب اور کبھی کبھی سفید بالوں کی لاج رکھنے کے لیے ملتے ہیں لیکن ادب میں برایا بھلا مقام فن کار کی ریاضت، خلوص اور تخلیقی قوتوں پر جلا رکھنے کے جنون سے ملتا ہے اس لئے باقی سب باتیں بھول کر میں عابد کے اس جنون کو جوان کی سوانح حیات میں بھی جھلکتا ہے سلام کرتا ہوں۔ خواہ اس کی مقدار کتنی ہی کم کیوں نہ ہو۔

میرے خیال میں Best Sellers کی طرح ''جو یاد رہا'' ایک پُر شور، متنوع، گہما گہمی سے لبریز، سفاک حدتک کھلی اور بیباک زندگی کا گرما گرم کلامیہ بنانے کے لئے نہیں لکھی گئی ہے اور نہ ''جو یاد رہا'' میں جی گئی زندگی فرانس کے Painters کی طرح ہی ایک مریضانہ تشنج کی مسلسل کیفیت میں بسر ہوئی ہے مگر اس بات کا احتمال ضرور ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ مصنف کی یاد نے انھیں وہی یاد لایا اور وہی لکھنے کی ترغیب دی جوان کی فطری طور پر احتیاط پسند طبیعت کی کسوٹی پر کھری اتری یا جس میں زیادہ تر مصنف کی شخصیت کے کسی اچھے پہلو کو تابناک بنانے کے موقعہ کا استعمال ہوا ہو۔ ایسا ہر جگہ تو محسوس نہیں ہوتا مگر مجموعی تاثر یہی ابھرتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ اپنی ہی کمزوریوں اور کمینگیوں کے بخئے ادھیڑنے کا فن اگر سنسنی خیزی پیدا کرنے کے لئے نہ ہو تو نسبتاً خاصہ مشکل فن ہے کیونکہ اُس صورت میں یہ فن انسان کی تہذیب کرنے اور اسے زندگی کا عمدہ وژن عطا کرنے میں کسی حدتک مددتو کرتا ہی ہے اس پہلو سے عابد کی یہ تحریر بہ وجوہ اتنی وزن دار خواہ نہ ہو لیکن اس وصف کا معترف تو ہونا پڑے گا کہ مجموعی طور پر یہ سوانح آج کے عام ادبی قاری کے لئے ذریعۂ انبساط بن جائے گی۔

اپنی یادوں کی بارات میں جوشؔ نے زیب داستاں کے لئے جس قدر لفظوں، محاوروں، تشبیہوں اور تمثیلوں کا میلہ لگایا ہے عابد نے اتنا ہی اس کھوکھلی سجاوٹ میں بخل سے کام لیا ہے۔ عابد کی سوانح زبان، واقعات کی نیرنگی اور طرز ادا کے سبب میرے خیال میں ادا جعفری کی 'جو رہی سو بے خبری رہی' سے زیادہ Readable ہے۔ اس تحریر کی ایک بڑی خوبی جگہ جگہ اس کے Flash back اور Flash farward ہیں جو یکا یک چپکے سے دوران تحریر در آتے ہیں اور بیانوں کو کسی جھٹکے کے بغیر آگے بڑھاتے ہیں۔ حالانکہ جتیندر بلو نے بھی اپنے سوانحی کولاژ میں بقول اُن کے مغربی ادب سے مستعار لے کر اس تکنیک کو ادا کیا ہے اس کولاژ کا عنوان اختر الایمان سے لے کر 'دیکھو ہم کیسے بسر کی، رکھا گیا ہے مگر عابد نے اس تکنیک کو جس چابکدستی اور سہل انداز میں برجستہ طور پر برتا ہے وہ قابل تعریف ہے۔

یہ کیا کم اچھی بات ہے کہ ''جو یاد رہا'' خیر سے کسی پیچیدہ مگر بلند مرتبہ خود پرست، خود پسند، خود فریب اور خودنگر شاعر کا بیمار مرقع نہیں ہے جیسی کی پاپ بیتی کو بڑھ کر اندازہ ہوتا ہے جس میں مصنف کے علاوہ باقی سب جاہل تو ہیں ہی لیکن اپنی جہالت پر شرمندہ بھی ہو چکے ہیں۔ پھر عابد ایسے یوسف ثانی بھی نہیں اور نہ جنسی طور پر ایسے کھلے سماج میں بدقسمتی سے انھیں رہنے کا موقع ملا ہے جہاں ان کی طرح دار جوانی کی بُو پا

کر ہی کم سن، جوان اور ادھیڑ عورت خواہ کسی قوم، کسی رنگ، مذہب یا نسل کی ہو یہ دیکھے بغیر کہ اندھیرا ہے یا اجالا، خلوت ہے یا جلوت انھیں چومنے چاٹنے اور ان سے ہم بستری کے لیے بلا تاخیر تیار ہو جائے گی یہ وصف تو اردو کی بانکی ترچھی پاپ بیتیوں میں ہی ملے گا۔

عابد کی سوانح نگاری کی خوبی یہ بھی ہے کہ ایسی تحریر میں درآنے والی بہت سیت مروجہ بیماریوں سے اپنی احتیاط پسند طبیعت کے ذریعے عابد نے اپنی سوانح حیات کو بڑی حد تک بچایا ہے۔ یہ کہنا کہ عابد نے خود فکلینی، خودنمائی اور خودستائی سے مالش کیے ہوئے چاق و چوبند گھوڑوں پر سوانح کے اکثر بیانات کے پردے میں سواری تو کی مگر ان منہ زور گھوڑوں کی ٹاپوں سے اپنی تحریر کے روندے اور تاراج کیے جانے سے بچایا بھی ہے۔

بقول یوسف ناظم نشے اور سوانح حیات میں بھی جو نہ کھلے اُس سے ڈرنا چاہیے۔ عابد نشہ کو کرتے نہیں لہٰذا وہاں کھلنے کا سوال ہی نہیں۔ رہ گئی سوانح حیات تو وہاں اس کے ماموں ڈاکٹر علیم والی مثالی احتیاط اتنا ہی کھلنے دیتی ہے جتنا ان کی نظر میں کھل جانے سے چیز بدنما نہ لگے چاہے قاری کتنا ہی بدمزہ کیوں نہ ہو جائے۔ دولڑکیاں ان کے مکان میں ساتھ رہنے آتی ہیں اور احتیاط کا میٹر ڈاؤن ہو جاتا ہے، ذات کے نہاں خانے میں کیا چل رہا ہے پھر کچھ یاد نہیں رہتا۔ بھاڑ میں جائے سوانح حیات، ہم تو نہیں کھلیں گے۔

ایسا لگتا ہے کہ اپنی ذات کی گہرائیوں میں ایمانداری اور غیر جانب داری سے اترنا اور اس کی رو پوش دنیا میں مچتی ہوئی اُتھل پتھل، غیر مادی اشکال اور ہیولوں سے دو دو ہاتھ کرنا عابد کے لئے تضیع اوقات سے کم نہیں۔ ایک بار ہمارے مشترک دوست فیاض رفعت پان کی دکان پر ظریفانہ موڈ میں باتیں کر رہے تھے۔ بولے ''عابد رنڈی بازوں کی طرح رنڈی کا بیان کرنے میں بری طرح ناکام رہیں گے''۔ یہ سن کر میں سوچتا رہ گیا کہ ممکن ہے یہ حقیقت ہو لیکن فیاض نے یہ کس سیاق و سباق میں کہا تھا۔

عابد فیاض رفعت والا کام چاہے نہ کر پائیں لیکن وہ ہنس ہنس کر دوسروں پر عیب لگانے یا دوسروں کے عیوب کھولنے میں Smartness کے ساتھ دلچسپی رکھتے ہیں، یہ خوبی سوانح میں بھی موجود ہے۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں ایک بار اردو ڈپارٹمنٹ میں، میں نے مہاتما بدھ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ بدھ نے خدا سے دو چیزیں مانگی تھیں ایک تو Compassions اور دوسری Tolerance ۔ میری بات ختم کرنے کے بعد عابد اُٹھے اور بولے ''یہ کہنا غلط ہے کہ بدھ خدا کو مانتے تھے، اس لئے وہ خدا سے دو چیزیں بھلا کیسے مانگتے۔

جواب میں میں کچھ نہ بولا۔ وہ خود بھی جانتے تھے کہ بدھ نے خدا کی تلاش میں بہت جدوجہد کی تھی اور اُن برہمنوں میں بھی کچھ عرصہ رہے تھے جو نفس کو ایذا پہنچا کر حقیقت یزداں تک پہنچنا چاہتے تھے انھیں برہمنوں میں سے ایک نے پوچھا تھا کہ ہم بھلا کیوں یہ دکھ جھیل رہے ہیں خدا اگر ہمیں مل بھی گیا تو ہم اس سے ایسی کیا چیز ہے جو مانگ سکتے ہیں۔ اس بات پر بدھ نے جواب دیا تھا ''اگر مجھے خدا مل گیا تو میں اس سے صرف دو چیزیں مانگوں گا۔ یہ واقعہ اپنی بالا دستی ثابت کرنے کی لت کے سوا اور کیا ہے؟ بعد میں میں نے

عابد کو فون پر وہ حالات یاد دلا دیئے جن کے سبب بدھ نے ایسا کہا تھا۔ اس لئے سچ تو یہ ہے کہ اچھے ہو یا برے ہو تم یار ہو ہمارے۔ اردو تھیٹر اور ڈرامہ نگاری کو لے کر کچھ برس میں نے جو خدمات انجام دیں، مختلف شہروں میں جو ڈرامے کھیلے، جو تھیٹر گروپ کئی برس فعال رکھا سا کی تفصیلی معلومات نہ ہونے کے باوجود عابد نے میرے اس شوق کو اپنی برتری دکھانے کی عادت کا نشانہ بنایا اور موصوف میرے دامن کو ظریفانہ کھینچتے ہوئے رتن سنگھ کو درمیان میں ڈال کر اپنا کام کر گئے۔

یہ بات تو عابد خود مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ ڈرامائیت گالی نہیں ہے بلکہ اردو ہی نہیں دنیا کی اعلیٰ فکشن ڈرامائیت کے دلچسپ اور موثر عنصر سے خالی نہیں ہے۔ منٹو کے بیسوں افسانوں میں ایسی ہی ڈرامائیت کی زیبائش اور مینا کاری سے چکا چوندھ ہے۔ ''کھول دو'' میں ڈرامائیت کے عنصر کے بارے میں کیا خیال ہے؟

سوانح حیات میں عابد کے بزرگوں کے بارے میں پڑھنے کے بعد مزاح نگاروں کی یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ عابد اُن لوگوں میں سے نہیں جو موزے صرف شادی کے موقع پر پہنتے ہیں اور یہ بھی کہ عابد کتنے ہی بوڑھے کیوں نہ ہو جائیں ان کے کھانے کے دانت تو گر سکتے ہیں مگر دکھانے کے دانت کبھی نہ گریں گے۔ ''جو یاد رہا'' عابد کی یادداشت کا ایک حیرت انگیز مرقع ہے۔ قدرت اللہ کا شہاب نامہ طوالت میں اس سے ٹکر لے سکتا ہے۔ جب اردو کا میلہ اُٹھ رہا ہے اور چند دکانیں اور تمبو قناتیں ہی سمٹنا باقی ہیں، ایسی حالت میں خود کے اجڑنے کے خوف اور اردو کی سکڑی سمٹتی اجتماعی ثقافتی یادداشت کے بجھ جانے کے شدید اندیشے کے تحت جب بڑے بڑے لکھاڑ اپنی تحریروں کے تعریفی بیانات کی اشاعت اور حفاظت کے لئے ضمیمے نکالتے ہیں کہ مبادا اردو کی بین الاقوامی برادری ان کی تحریر کو بھلا نہ دے ایسی حالت میں میرا یقین ہے کہ اگر آج عابد کے پاس کتابوں کی اشاعت کرنے والا ادارہ نصرت پبلشر بھی ہوتا تو عابد ''جو یاد رہا'' کے دو چار بار اشتہار چھاپنے کے علاوہ اور کچھ نہ کرتے جب اپنا پیسہ لگا کر بھی انھوں نے تاجرانہ گر نہ سیکھے اور نقصان اُٹھایا۔ اس نقصان میں ممکن ہے میرے دو افسانوی مجموعے بھی شامل ہوں جو انھوں نے شائع کئے تھے تو اپنی سوانح حیات کی اشاعت کے بعد تو وہ چین سے سو سکتے ہیں کہ اس کا کوئی بوجھ ان پر نہیں۔ آخر میں سوانح میں شائع ہونے والی ایک نظم کے لئے دو لفظ۔ یہ نظم عابد نے اپنی چھوٹی بہن نجمہ کے انتقال کی پہلی برسی پر لکھی ہے جسے پڑھ کر میرے ذہن میں بھی مرحومہ کی یادیں تازہ ہو گئیں۔ جن کا تعلق ۱۹۶۰ء میں اورئی کے دوران قیام سے ہے۔ خدا اسے غریق رحمت کرے کہ مجھے اپنا بزرگ سمجھتے ہوئے مسافرت کے اُن دنوں میں اس کی مؤدبانہ خدمات نے مجھے اور قیام سے ہے۔ خدا اسے غریق رحمت کرے کہ مجھے اپنا بزرگ سمجھتے ہوئے مسافرت کے اُن دنوں میں اس کی مؤدبانہ خدمات نے مجھے اور قیام سے ہے۔ خدا اسے غریق رحمت کرے کہ مجھے اپنا بزرگ سمجھتے ہوئے مسافرت کے اُن دنوں میں اس کی مؤدبانہ خدمات نے مجھے اور میری بیوی کو کبھی ایسا مسافر نہ محسوس ہونے دیا جو گھر سے دور ہونے کی بیکسی میں مبتلا ہو۔ یہ دراصل اس کی عابدہ اور زاہدہ والدہ کی تعلیمات اور سلیقہ مند پرورش کا نتیجہ تھا۔

☆☆☆

(۲)

چراغ حسن حسرت اور فیض احمد فیض

رونقِ بزمِ یاراں

تحریر: ظہیر جاوید [فرزندِ چراغ حسن حسرت]

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شعروادب کی دنیا میں جناب فیض احمد فیض نے امام وقت کا مقام حاصل کیا ہے اور شاعروں کی جس لڑی نے ولی دکنی، میر و سودا، انشاء و مصحفی، غالب و ذوق اور مومن و داغ سے لے کر شاد عظیم آبادی، علامہ اقبال اور جوش تک کو پرو رکھا ہے، فیض صاحب نے بھی اسی لڑی میں جگہ پائی ہے اور اب ان کے جانے کے بعد نگاہیں جوہر کامل کو ڈھونڈ رہی ہیں، اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فیض صاحب کو اردو کے ایک متحرک عہد نے فیض احمد فیض بنایا تھا، آج اردو کا ویسا متحرک دور نہیں ہے، اردو زبان اپنا مقام کھو رہی ہے، اس کی باریکیاں اور اس کی گہرائی نگاہوں سے اوجھل ہونے لگی ہے، اردو کے چلتے پھرتے سکول تہہ خاک سو گئے ہیں، معلم وقت کوئی نہیں اور دودِ چراغِ محفل کا کہیں دور دور تک نشان نہیں ہے،

آیئے! فیض احمد فیض کے قدموں کے نشان تلاش کریں،

فیض احمد فیض ۱۳ فروری ۱۹۱۱ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم انہوں نے مولوی ابراہیم سیالکوٹی کے مدرسے میں حاصل کی، پھر مشن ہائی سکول میں پڑھے، اس کے بعد فیض صاحب نے مرے کالج سیالکوٹ میں تعلیم پائی، اسی دورانئے میں انہوں نے عربی اور فارسی کی تعلیم حضرت علامہ اقبال کے استاد شمس العلما مولوی سید میر حسن سے حاصل کی، اس کے بعد جناب فیض نے لاہور کے گورنمنٹ کالج سے پہلے عربی میں بی اے آنرز کیا پھر انگلش میں ایم اے، یہ ۱۹۳۲ء کی بات ہے، ان کا اگلا قدم اورینٹ کالج لاہور سے ایم اے عربیک تھا، اتنی تعلیم پانے کے بعد انہوں نے ۱۹۳۵ میں ایم اے او کالج امرتسر میں پہلی

نوکری کی، اس وقت اس کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر تھے اور انہوں نے فیض صاحب کو انگریزی کا لیکچرر رکھا،

لاہور میں پہلی بار فیض صاحب کا قیام ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۵ء تک رہا، ان برسوں میں لاہور اردو زبان کا ترجمان بنا ہوا تھا، مولانا محمد حسین آزاد، مولانا الطاف حسین حالی کے بعد انجمن حمایت اسلام اور حکیم شجاع الدین کی محفلوں میں بہت سے نوجوان فیض پا چکے تھے اور ''شور محشر'' کی ادبی تحریروں نے بہت سے جوانوں کی تربیت کی تھی، ان بزرگوں سے ادبی محفل سجانے کے اسی رواج کو لے کر حضرت علامہ اقبال اٹھے تھے، انہوں نے بازار حکیماں میں ادبی تربیت گاہ قائم کی تھی، دوسری طرف نواب ذوالفقار خان نے پٹیالے سے لاہور آ کر ۱۹۱۲ء میں اپنی رہائش گاہ ''زرفشاں'' میں ادبی محفل کا اہتمام کر لیا تھا، اور علامہ کے ساتھ وہ بھی اردو کی درسگاہ بن گئے تھے،، ۱۹۱۸ء میں مولانا تاجور نجیب آبادی نے انجمن ارباب علم پنجاب قائم کی جس کے تاحیات صدر سر عبدالقادر ہوئے، اس انجمن نے کئی رسالے شائع کیے، نظموں کے کئی مجموعے مرتب کر ڈالے اور شعر وادب کی پرورش کے ہر رنگ اور ڈھنگ کو اختیار کیا،

سر عبدالقادر بڑی محترم شخصیت کے مالک تھے اور اس میں کچھ کلام نہیں کہ حضرت علامہ اقبال کا حوصلہ سر عبدالقادر ہی تھے علامہ نے جب جب شاعری ترک کرنا چاہی انہیں محترم عبدالقادر نے ہی روکا اور یہی سمجھایا کہ ان کی شاعری مسلمانوں میں زندگی کی نئی روح پھونک سکتی ہے، ان کی اس دوستی اور قربت کا ایک خوبصورت ثبوت حضرت علامہ کا پہلا شعری مجموعہ بانگ درا ہے، اس میں سر عبدالقادر پر علامہ کی نظم موجود ہے، اور اس کا دیباچہ سر عبدالقادر کا لکھا ہوا ہے، یہ شعری مجموعہ ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا تھا

یہ باتیں لاہور میں فیض صاحب کی آمد سے پہلے کی باتیں ہیں،

حضرت علامہ اقبال کی شخصیت پر سر عبدالقادر کی انگریزی میں ایک کتاب بھی موجود ہے اور انہوں نے ۱۹۳۰ میں پنجاب لٹریری لیگ کے پہلے اجلاس میں حضرت علامہ اقبال کی فارسی شاعری پر مضمون بھی پڑھا تھا، یہ مضمون ایک یادگار دستاویز ہے یہ تو علامہ سے ان کی نسبت کا معاملہ تھا اس سے ہٹ کر ارباب علم پنجاب نے مشاعروں کا جس طرح اہتمام کیا اور سر عبدالقادر کے ''مخزن'' نے جس طرح اردو کو آگے بڑھایا اس نے سخن وروں کی نئی فصل اٹھا دی،

انجمن ارباب پنجاب کے بعد ۱۹۱۹ء میں حکیم احمد شجاع نے ''ہزار داستان'' شائع کیا تو پطرس بخاری، امتیاز علی تاج، عبدالمجید سالک، عابد علی عابد اور اختر شیرانی جیسے اصحاب ابھر کے سامنے آئے، ان میں سے جناب حفیظ جالندھری نے دور جدید کے مخزن کی ادارت سنبھالی، حکیم یوسف حسن نے نیرنگ خیال نکالا، پطرس بخاری کا طنز ومزاح اور ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر کے تنقیدی مضامین ان دونوں ادبی رسالوں کی جان بنے،

جس وقت فیض صاحب نے لاہور میں قدم رکھا تو یہ ادبی تحریکیں اپنے عروج پر تھیں،
یہ سب اصحاب لاہور کے دل کی دھڑکن بنے ہوئے تھے اور نوجوان ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر کا ادبی چلبلا پن انہیں رونق بزم کا مقام عطا کر چکا تھا ایسے میں جناب تاثیر نے ایک ادبی شاہکار تخلیق کر ڈالا، اس شاہکار کا نام "کارواں" تھا، ڈاکٹر تاثیر کی پرورش میاں نظام الدین نے کی تھی، میاں نظام الدین، میاں امیر الدین کے تایا تھے اور میاں امیر الدین کے صاحبزادے صلاح الدین کی شادی علامہ اقبال کی بیٹی بی بی منیزہ سے ہوئی تھی، ان تعلقات نے جناب تاثیر کو بہت مضبوط بنا دیا تھا، پھر ان کے اپنے اندر علم کی روشنی اور علم کی لگن تھی جس نے انہیں آگے بڑھایا اور وہ ایک منفرد استاد، شاعر اور ادیب تسلیم کر لئے گئے، اب انہوں نے ایک قدم اور اٹھایا، ادب اور مصوری کے ملاپ کا ایک خوبصورت تجربہ کیا، اسے جناب عبدالرحمٰن چغتائی کی مصوری سے سجایا، جناب عبدالرحمٰن چغتائی، فن کی دنیا میں اسی مجلّے کی بدولت متعارف ہوئے تھے،
یہ ۱۹۳۰ء کا زمانہ ہے، چراغ حسن حسرت کلکتہ سے لاہور آ چکے ہیں اور عرب ہوٹل ان کی ادبی محفل کا مرکز بن چکا ہے، عرب ہوٹل ریلوے روڈ پر اسلامیہ کالج کے بالکل سامنے تھا، جناب تاثیر چونکہ اسلامیہ کالج میں پڑھاتے تھے اس لئے عرب ہوٹل کی محفلوں میں ان کی شرکت دوسروں سے زیادہ ہوتی تھی، اس زمانے میں لاہور کا ریلوے روڈ، برف خانہ چوک، نیچے دل محمد روڈ کی طرف نکلتی اور اوپر سرکلر روڈ کی جانب بڑھتی سڑک اخباری دنیا کا مرکز ہوا کرتے تھے، کتب خانے بھی یہیں پر تھے اس لئے یہ بڑا بارونق علاقہ تھا، چنانچہ لاہور کی دوسری ادبی محفلوں سے زیادہ ہجوم عرب ہوٹل میں ہوتا تھا اور مولانا عبدالمجید سالک، جناب تاثیر، پطرس بخاری، مجید ملک، اختر شیرانی، حفیظ ہوشیارپوری، مظفر حسین شمیم، کرشن چندر، باری علیگ، مولانا صلاح الدین احمد، حکیم محمد حسن قرشی، راجہ حسن اختر، پروفیسر علم الدین سالک، سید عبداللہ اور مولانا احمد شاہ بخاری یہاں زیادہ نظر آتے تھے، مولانا ظفر علی خان بھی گاہے گاہے قدم رنجہ فرماتے تھے
چراغ حسن حسرت کلکتہ میں قیام کے دوران ۱۹۲۵ء میں ایک ماہوار مصور اردو رسالہ آفتاب شائع کر چکے تھے، اور یہ رسالہ دو سال تک جاری رہا تھا والد صاحب نے مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار پیام سے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا، پھر وہ عصر جدید اور نئی دنیا کے مدیر رہے تھے، انہوں نے مولانا شائق احمد عثمانی سے صحافت سیکھی تھی، جناب شاد عظیم آبادی کی محفل میں غزل کی تربیت پائی تھی، آقائے موید الاسلام جلال الدین طہرانی سے سیاست پر گفتگو کا سلیقہ حاصل کیا تھا، وہ سبھاش چندر بوس سے بھی ملے تھے جناب بوس کی خواہش پر ہی "جمہور" جاری ہوا تھا اور والد صاحب اس سے وابستہ ہو گئے تھے،
لاہور میں ان کی آمد ۱۹۲۹ء میں ہوئی،، انہیں مولانا ظفر علی خان لائے تھے اور زمیندار کا مدیر معاون مقرر کیا تھا، اس وقت والد صاحب کے کالموں نے ہندوستان بھر میں دھوم مچا رکھی تھی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خان، مولانا حسرت موہانی اور حضرت علامہ اقبال ان کے کالموں

کی کھل کر تعریف کر چکے تھے، اس لئے وہ غیر معروف نہیں تھے، بلکہ لاہور کی ادبی شان کا ایک قابل قدر اضافہ تھے، لاہور کے ادیبوں سے والد صاحب کی دوستیاں آفتاب کے زمانے سے ہی قائم تھیں، اور اہل لاہور کی نظمیں غزلیں بھی شاد عظیم آبادی اور وحشت کلکتوی جیسے بزرگوں کے ساتھ شائع ہوتی تھیں، چنانچہ لاہور میں انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور احترام کے مقام پر بٹھا دیا گیا، لاہور کے سب دوستوں میں مولانا عبدالمجید سالک صاحب کے ساتھ والد صاحب کے تادم آخر گہرے مراسم رہے،

۱۹۳۰ء کے اس منظر نامے میں فیض احمد فیض بازار حکیماں سے لے کر عرب ہوٹل تک کی تمام محفلوں میں ایک سامع کی حیثیت سے شرکت کرتے اور بزرگوں کی گفتگو سے سیکھتے رہے ہیں،

فیض صاحب کی تربیت کرنے والوں میں ایک نام جناب پطرس کا ہے، بخاری صاحب اس وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی پڑھاتے تھے اور سول اینڈ ملٹری گزٹ میں ان کے مضامین انہیں ایک دنیا سے متعارف کرا گئے تھے، ان کی انگریزی کا لوہا منوا گئے تھے، پھر مخزن، ہزار داستان، نیرنگ خیال اور کاررواں میں ان کا طنز و مزاح اردو میں بھی ان کا سکہ رائج کئے ہوئے تھا، حضرت علامہ اقبال کے ہاں ان کی اکثر حاضری رہتی تھی وہاں یہ فلسفے پر نکتے اٹھاتے رہتے تھے، چنانچہ حضرت علامہ کی نظم ''ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام'' دراصل ان کے ہی نام ہے،، فیض صاحب اور ن م راشد نے گورنمنٹ کالج میں ان سے ہی انگریزی پڑھی تھی،

فیض صاحب کی تربیت میں مجید ملک صاحب کا بھی ہاتھ ہے مجید ملک لاہور کے رہنے والے اور ان کا تعلق انگریزی کی صحافت سے تھا، وہ لاہور کے روزنامہ مسلم آؤٹ لک سے وابستہ تھے مگر اردو پر بھی ان کی بڑی گرفت تھی ایک زمانے میں ان کی نظم ''مگر اے حسینہ ناز نیں، مجھے تجھ سے عشق نہیں نہیں'' بہت مشہور ہوئی تھی اور آج بھی عام طور پر ان کی شناخت اسی نظم سے ہوتی ہے یہ نظم پہلی بار کاررواں میں ہی ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی تھی، مجید ملک صاحب کی پہچان صرف یہ نظم نہیں ہے ان کا مقام بہت بلند ہے، مسلمانان ہند اور اسلامیان پاکستان کے لئے ان کی خدمات کا کچھ شمار ہی نہیں کیا جا سکتا،

اس میں کوئی شک نہیں کہ جناب مجید ملک، فیض صاحب کی اصلاح کرتے رہے ہیں، ڈاکٹر آفتاب احمد لکھتے ہیں کہ ایک دن میری موجودگی میں فیض سے کہنے لگے ''بھئی تم تو عربی دان ہو مگر کل جب تم اپنا ایک شعر سنا رہے تھے تو تم نے بے نیل مرام کو بے نیل و مرام پڑھا'' فیض نے جھینپ کے کہا ''مجید بھائی غلطی ہو گئی ہو گی'' مجید ملک صاحب نے جرح جاری رکھتے ہوئے کہا ''نہیں، میں آج تمہاری کتاب زنداں نامہ دیکھ رہا تھا اس میں بھی بے نیل و مرام لکھا ہے'' فیض صاحب نے بعد میں اس غلطی کو درست کر لیا اور نسخہ ہائے وفا میں اصلاح کے بعد ان کا شعر یوں آیا ہے کہ:

یوں بہار آئی ہے اس بار کہ جیسے قاصد
کوچہء یار سے بے نیل مرام آتا ہے

یاد رہے کہ زنداں نامہ ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی تھی اور مجید ملک صاحب کی اس اصلاح کا تعلق شاعری سے نہیں زبان سے ہے، شاعری میں فیض صاحب مجید ملک سے بہت آگے تھے، مجید ملک اوران کی بیگم اور ہماری خالہ آمنہ نے فیض صاحب کو انگریزی کا صحافت میں طاق کیا تھا، فیض صاحب خالہ آمنہ کے لاڈلے اوران سے چھوٹے بھائی کی طرح جھاڑیں کھا لیتے تھے، بنیادی طور پر یہ صاحبان انگریزی سے بندھے ہوئے تھے ان میں صرف والد صاحب ہی خالص مشرقیت کے ترجمان تھے،

ہمارے ہاں کھلی محفلوں کا کوئی تصور نہیں تھا، خانساماں تھا، بیرا تھا، چوکیدار تھا، ڈائنگ ٹیبل بجتی تھی، مہمانوں کو کشمیری چائے اور کھانے میں طرح طرح کی ڈشیں ملتی تھیں، مگر اس سے ہٹ کے کوئی بات نہیں ہوتی تھی، والدہ گھر کے تقدس اور میری پرورش کے معاملے میں کوئی رعایت نہیں کرتی تھیں، مردوں کی اور خواتین کی بیٹھک الگ رکھتی تھیں اور ہمارے گھر میں اونچی آواز میں بولنا یا ہنسنا برا سمجھا جاتا تھا، مہمانداری بہت تھی اور میرے والدین اسی میں خوش رہتے تھے کہ ان کے گھر میں ریل پیل لگی رہے، چنانچہ عزیز و اقارب کا آنا جانا لگا رہتا تھا، جو نہیں آتا اسے خط لکھ کے بلایا جاتا اور پوچھ ہوتی کہ میاں کیوں نہیں آئے، تاخیر کا سبب کیا ہے،

میں نے ان سب اصحاب کو جب پہلی بار دیکھا تو دہلی میں ہماری کوٹھی کے لان میں یہ بزرگ کشمیری چائے پی رہے تھے اوران کے درمیان ادبی گفتگو جاری تھی، والد صاحب اساتذہ میں سے کسی شاعر کا تذکرہ کر رہے تھے، ان کے شعر سنا رہے تھے اور بخاری صاحب، تاثیر صاحب چٹکیاں بھر رہے تھے جناب مجید ملک خاموش اور ہمہ تن گوش تھے، اور جناب فیض گفتگو سنتے ہوئے ٹہل رہے تھے خالہ آمنہ اندر والدہ کے پاس تھیں، والدہ، نمازی، پرہیز گار اور سادہ خاتون تھیں، مردوں کی محفل میں نہیں بیٹھتی تھیں ادیبوں کی بیگمات اوران کے بچے زنان خانے میں ان کے پاس آ کر محفل سجاتے تھے دہلی میں جناب غلام عباس کی والدہ ان کی پہلی بیگم اور بچے بڑے شوق سے آتے تھے، آنٹی کرس اگرچہ اردو نہیں بول سکتی تھیں مگر ہمارے ہاں گاہے بگاہے آتیں اور والدہ سے اشاروں میں باتیں کرتی رہتی تھیں، والدہ ان کے لئے چائے کے ساتھ اپنے ہاتھوں سے کوئی کشمیری ڈش بنا کے ضرور رکھتی تھیں، آنٹی ایلس بھی کبھی کبھی والدہ سے ملنے آتی تھیں، وہ اردو بول لیتی تھیں، اس لئے ان کے اور والدہ کے درمیان بات چیت آسان رہتی تھی، اور یہ بات چیت عموماً کھانے اوراس کی ترکیبوں کے گرد گھومتی رہتی تھی،

یوں تو یہ تمام اصحاب یعنی جناب پطرس، جناب مجید ملک، جناب تاثیر، جناب فیض اور والد صاحب ایک دوسرے کے بہت قریب تھے لیکن انکل تاثیر کے ساتھ والد صاحب کی گاڑھی چھنتی تھی، وہ تھے ہی دل کو چھو لینے والے، بچوں، بڑوں سب کے لاڈلے، مجھے انکل تاثیر ہمیشہ ٹھپر (شلغم) کہہ کر بلاتے تھے اور میں اتوار کو ان کی بیٹیوں سلمیٰ اور مریم کے ساتھ ہمایوں کے مقبرے جایا کرتا تھا، ہمیں اردو صحافت کی ایک

خاموش شخصیت بدرالدین کی نگرانی میں بھیجا جاتا تھا اور ہم وہاں آنکھ مچولی کھیلتے تھے، اگر ادھر نہیں جاتے تو قطب مینار کی طرف نکل جاتے تھے، مجھے یاد ہے کہ جب ہم لاہور میں تھے تو انکل باری علیگ، انکل رشید اختر ندوی، انکل کیپٹن ممتاز ملک، انکل غلام محمد اور ان کی بیگم خالہ ثریا اور کراچی میں انکل حفیظ ہوشیارپوری کے خاندان کے بچوں اور بیگمات کا ہمارے ہاں زیادہ آنا ہوتا تھا،

ان دوستوں میں پطرس بخاری صاحب شاعری نہیں فرماتے تھے، مگر جیسے رنگِ محفل کی بات ہوتی ہے اس حساب سے ان کے کوئی دس میں شعر ہیں، رہے مجید ملک تو وہ ۱۹۴۰ء سے پہلے ہی ادبی سرگرمیاں ترک کر چکے تھے، ان چاروں میں تاثیر صاحب کی اردو ادب کے ساتھ بندش بڑی توانا تھی، انہوں نے آخر دم تک اپنا یہ تعلق قائم رکھا، مجھے ان سے ان کا سنا ہوا ایک شعر آج بھی یاد ہے، جو یوں تھا کہ

دل میں جو کچھ ہے انھی کا ہے ہمارا کیا ہے

آرزو ان کی، طلب ان کی تمنا ان کی

کاررواں کا پہلا رسالہ ۱۹۳۲ میں منظر عام پر آیا اس کے بعد جناب تاثیر تو انگریزی کی اعلیٰ تعلیم کے لئے کیمبرج چلے گئے اور کاررواں کا دوسرا مجلہ مجید ملک صاحب نے چغتائی صاحب کے ساتھ مل کر شائع کیا، اس شمارے میں ہی نیاز مندان لاہور کا وہ مشہور مضمون ''یو پی کے تنقید نگاروں کی خدمت میں'' شامل اشاعت تھا، جس میں لاہور کے اصحاب اردو نے اہل پنجاب کی تحریروں پر اہل یو پی کی پھبتیوں کا جواب دیا تھا، یہ پہلا جواب تھا، اس کے بعد دونوں طرف سے جو علمی بوچھاڑ شروع ہوئی وہ دس برس تک جاری رہی، اور اس دوران میں زبان و بیان کی بڑی باریکیاں سامنے آئیں، اساتذہ کے کلام اور نگارشات کو دلائل کے طور پر پیش کیا گیا، انجمنوں، کالجوں اور ادبی رسالوں میں ایک ایک غلطی کو کھول کھول کر یوں بیان کیا گیا کہ ایک نوجوان نسل کی تربیت ہو گئی نیاز مندان لاہور میں مولانا عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت، پطرس بخاری، مجید ملک، ایم ڈی تاثیر، امتیاز علی تاج، صوفی تبسم، حفیظ جالندھری اور ہری چند اختر کے نام آتے ہیں اور ان بزرگوں کی ان ادبی کاوشوں کے نتیجے میں ہی لاہور کو اردو کی ادبی روایت میں دلی اور لکھنؤ کی طرح ایک منفرد دبستان کا مقام حاصل ہوا،

فیض احمد فیض، حمید نظامی، شورش کاشمیری، ن م راشد اور کرشن چندر جیسے اصحاب کی بنیادی تربیت، اسی ماحول میں اور ان بزرگوں نے ہی کی، پھر ان دنوں لاہوری دروازے کے قریب، اردو بازار کے سامنے ایک ہال ہوا کرتا تھا، یہاں باقاعدہ مشاعرے ہوتے تھے جن میں نیاز مندان لاہور کے مشاعرے میں مولانا عبدالمجید سالک، جناب حفیظ جالندھری، جناب تاثیر، جناب صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، اور مولانا تاجور کے مشاعروں میں جناب وقار انبالوی، جناب فاخر ہریانوی، جناب روش صدیقی، جناب اختر شیرانی، جناب احسان دانش جیسے بزرگ نغمہ سرا ہوتے اور اردو کا رنگ جماتے تھے، ان مشاعروں میں بھی ایک

دوسرے پر شعر اچھالے جاتے تھے اور ان سے نوجوانوں کو شعری آداب کا علم ہوتا تھا،

لاہور میں اردو کے ان بہتے دریاؤں سے بیشمار نوجوانوں نے علم و ادب کے موتی چنے اور ان میں سے ہر شخص اپنی لگن کے مطابق مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوا، جناب شورش کاشمیری اور جناب حمید نظامی نے صحافت میں نام پیدا کیا، محترم کرشن چندر افسانوں کی دنیا میں چمکے، جناب محمود نظامی اور جناب یوسف ظفر نے ریڈیو کو آباد کیا، ن م راشد، میرا جی نے شاعری میں قدر پائی مگر ان سب میں قد آور شخصیت جناب فیض احمد فیض کی رہی،

جناب پطرس بخاری، جناب تاثیر اور جناب مجید ملک انگریزی ماحول اور آداب کو پسند کرنے والے اصحاب تھے، اس لئے ان تین اصحاب میں زیادہ قرب تھا، ہم انہیں اس دور کے بادشاہ گر کہہ سکتے ہیں یہ اصحاب انگریزی کو اردو میں لانے کی شہرت رکھتے ہیں، جناب شورش کاشمیری اسے یوں بیان کرتے ہیں کہ تاثیر، پطرس اور مجید ملک کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے انگریزی خیالات کو اردو میں سمویا اور یورپی شعر وانشا کو اردو کا جامہ پہنایا، فیض صاحب نے انگریزی بود و باش کا انداز ان سے ہی حاصل کیا،

یوں اس محفل میں فیض صاحب نے شاعری کا یورپی انداز جناب تاثیر سے اور انگریزی صحافت کی تربیت مجید ملک سے حاصل کی، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ جناب فیض نہ تو انگریزی صحافت کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں اور نہ ان کی وجہ شہرت شاعری کے یورپی انداز کو اردو میں سمونے کی ہے، پھر ان کی شاعری کا انداز جناب تاثیر سے بھی مختلف ہے وہ تو خالص اردو کے شاعر ہیں اور "تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے" اور چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز" جیسے مصرعوں کو دلوں کی دھڑکن بناتے ہیں، یوں جناب پطرس بخاری، جناب تاثیر، جناب مجید ملک، اور خالہ آمنہ کے ساتھ اس محفل میں چراغ حسن حسرت کی شمولیت نمایاں ہو جاتی ہے اور میں شاہد ہوں کہ فیض صاحب نے والد صاحب کے ساتھ جو آخری نشست فرمائی تھی اس میں بھی وہ ان سے کرید کرید کر علم و ادب کی باتیں پوچھ رہے تھے، گفتگو استاد ناسخ کی غزل... کیونکر تیرے آگے نہ جھکے حور کی گردن... کے گرد گھومتی رہی تھی، مگر یہ بعد کی بات ہے،

میں دہلی کی جس ملاقات کا ذکر کر رہا ہوں وہ اغلبا ۴۳-۱۹۴۲ء کی ہے، اس وقت میں کوئی پانچ سال کا تھا، یہ وہ زمانہ ہے جب جناب مجید ملک برطانوی فوج کے تعلقات عامہ میں افسر ہو چکے تھے انہوں نے والد صاحب اور اپنے کئی دوستوں کو اس شعبے میں بھرتی کر لیا تھا، ان میں فیض صاحب بھی تھے، فیض صاحب ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۷ء تک فوجی خدمات انجام دیتے، انگریزوں کے حق میں پراپیگنڈہ کرتے اور ہندوستانیوں کو فوج میں بھرتی ہو کر جنگ میں جانے کی ترغیب بھی دیتے رہے تھے، فیض صاحب کی زندگی کے ان پانچ برسوں پر بہت کم کام ہوا ہے اور ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی فوجی زندگی کے ان پہلوؤں پر بات کی جائے انگریز سرکار کی اس ملازمت سے پہلے ان کا صرف ایک مجموعہ کلام نقش فریادی (۱۹۴۳ء)

منظر عام پر آیا تھا، اس فوجی دور میں بھی ان پر کچھ کچھ اشعار ضرور ڈھلتے رہے مگر ان کی حیثیت ابتدائی ہی رہی البتہ اس دور کے گزرنے اور آزادی ملنے پر فیض صاحب نے جو فرمایا وہ سحر بند ہے، وہ کہتے ہیں کہ :

جناب فیض نے یہ نظم تقسیم سے چند دن پہلے سرینگر میں سنائی تھی، اس کے بعد فیض صاحب کا صحافتی دور شروع ہوتا ہے وہ میاں افتخار الدین کے ادارے پروگریسو پیپرز لمیٹیڈ کے چیف ایڈیٹر ہو جاتے ہیں، پاکستان ٹائمز اور امروز نکلتے ہیں تو فیض صاحب کے کہنے پر والد صاحب کو امروز کا ایڈیٹر لیا جاتا ہے، ابتدائی دنوں میں امروز کا اداریہ فیض صاحب ہی لکھتے تھے، اس پر جناب شورش کاشمیری نے روزنامہ ''آزاد'' میں فیض صاحب کے اداریے کے سلسلے میں اداریہ لکھا کہ ''اظہار کی زبان اور خیال کی زبان میں تضاد پایا جاتا ہے'' شورش صاحب کا کہنا تھا کہ فیض صاحب اداریہ انگریزی میں سوچتے اور اردو میں لکھتے ہیں، شورش صاحب کے اداریے کا نتیجہ یہ نکلا کہ فیض صاحب امروز سے الگ ہو گئے اور پاکستان ٹائمز کو مشق سخن بنایا

اسی دور سے متعلق فیض صاحب کی اپنی ایک تحریر بھی ملتی ہے، جس سے ان اصحاب کے تعلق پر روشنی پڑتی ہے جناب پطرس پر اپنے مضمون ''..... کہ گوہر مقصود گفتگو ست'' میں وہ اس وقت کی بات لکھ رہے ہیں جب وہ چیف ایڈیٹر تھے، لکھتے ہیں ''ایک رات میرے ہاں محفل عین عروج پر تھی، تاثیر مرحوم، حسرت مرحوم، صوفی تبسم، عابد علی عابد، آغا بشیر احمد اور بخاری صاحب موجود تھے، حسرت صاحب نے انہی دنوں ایک عجیب و غریب عربی گانا ایجاد کیا تھا اور فلک شگاف آواز میں نظیری کی کسی غزل پر اس عربی دھن کی چھری چلا رہے تھے، اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، ہمارے رپورٹر میاں شفیع ٹیلیفون پر تھے، کہنے لگے، ابھی ابھی ایک ٹیلیفون اپریٹر نے گورنمنٹ ہاؤس سے ٹیلیفون ملاتے میں سنا ہے کہ قائد اعظم فوت ہو گئے ہیں، دفتر پہنچ کر ہزار جگہ سے خبر کی تصدیق چاہی لیکن کسی نے کچھ بتا کر نہ دیا، میں نے طے کیا پاکستان ٹائمز اور امروز کے ضمیمے بہر حال تیار کر لئے جائیں، ممکن ہے رات میں کسی وقت کوئی اطلاع پہنچ جائے، میں اداریہ لکھنے بیٹھا، بخاری صاحب مرحوم کی سوانح حیات مرتب کرنے لگے صوفی صاحب قطعہ تاریخ کی فکر کرنے لگے، تاثیر مرحوم اور حسرت مرحوم امروز کی ترتیب میں مصروف ہو گئے، تین بجے کے قریب خبر کی تصدیق ہوئی''

اس تحریر کی خاص بات یہ ہے کہ بخاری صاحب، تاثیر صاحب اور صوفی صاحب تو پی ایل کے عملے میں شامل نہیں تھے، پھر یہ اصحاب کیا کر رہے تھے؟؟؟ آج کا زمانہ ہوتا تو یہ کہتے اچھا بھائی تم کام کرو ہم چلتے ہیں مگر یوں نہیں ہوا، سب کچھ نہ کچھ کر رہے تھے، کیوں؟..... وہ اپنے دوستوں کو خوب سے خوب تر بنا رہے تھے، ان کی عزت بڑھا رہے تھے، یہ تھا اس زمانے کا دستور..... اتنی محبت، اتنا پیار کرنے والے دوستوں میں نفاق بہت دکھ دیتا ہے میں نے اپنے والد صاحب کو دیکھا ہے وہ تاثیر صاحب کو یاد کر کے بہت روتے تھے، تاثیر صاحب شاید اپنی بیماری کی بدولت کچھ الجھنے لگے تھے، انہوں نے پہلے حسن عسکری صاحب

کونشانہ بنایا، پھر ترقی پسند ادیبوں کو نشانہ بناتے بناتے پہلے والد صاحب سے الجھے آخر میں فیض صاحب کو بھی دکھی کر گئے،

جس زمانے میں روزنامہ امروز کا دفتر ایبٹ روڈ پر نشاط سینما کے ساتھ کھلا، اور والد صاحب اس سے وابستہ ہوئے تو میری عمر گیارہ برس کی ہو چکی تھی میں وہاں باقاعدگی سے جانے اور کلاسیکی ادب کے ساتھ ساتھ دور حاضر کو بھی پڑھنے لگا تھا، فسانہ آزاد، آب حیات، طلسم ہوشربا کے ساتھ ساتھ جناب شوکت تھانوی کی بکواسیات اور جناب نسیم حجازی کی داستان مجاہد کو بھی سبق بنا چکا تھا، اس زمانے میں میں جب انکل فیض کو دیکھتا تو وہ مجھے عجیب انسان معلوم ہوتے تھے نہ چٹکی بجاتے، نہ کوئی گیت گنگناتے تھے جبکہ میرے نزدیک شاعر وہی تھا جو سر تال میں رہے، سریندر، پنکج ملک، سہگل، مکیش اور طلعت جیسی آواز میں لہراتی ہوئی گفتگو کرے، میں چونکہ فیض صاحب کی نقش فریادی پڑھ چکا تھا اور یہ جانتا تھا کہ وہ شاعر ہیں اس لئے مجھے ان پر افسوس ہوتا تھا، میں ان کے لئے دکھی تھا اور یہ دکھ اس وقت اور بڑھ جاتا جب میں دیکھتا کہ وہ والد صاحب کے پاس آکر بیٹھتے ہیں، جھجک جھجک کر کچھ سیاسی باتیں کرتے ہیں، عجیب عجیب سوال پوچھتے ہیں اور چلے جاتے ہیں، نہ ہنستے ہیں نہ گاتے ہیں، آخر مجھ سے نہ رہا گیا میں نے ایک دن کوریڈور میں فیض صاحب کو روک لیا اور بڑے مدبرانہ انداز میں انہیں مشورہ دیا ''انکل آپ ماسٹر مدن کا.... یوں نہ رہ رہ کے ہمیں ترپایئے... سنا کیجئے'' فیض صاحب کچھ حیرت زدہ ہوئے، مسکرائے اور والد صاحب کے کمرے کی جانب بڑھ گئے، پہلے وہاں سے قہقہے اٹھے پھر میری طلبی ہوئی اور قہقہوں میں مجھ سے یوں نہ رہ رہ کر سنانے کی فرمائش ہوگئی، یہ فرمائش بھی میری کھنچائی کا حصہ تھی،

یہاں سے میری اور فیض صاحب کی جان پہچان ہوئی، وہ ملتے تو ایک آدھ فقرہ ضرور کہتے، مثلاً پوچھتے ''کیا پڑھ رہے ہو'' میں عرض کر دیتا، فسانہ آزاد، گلشن بیناریا جو کتاب زیر مطالعہ ہوتی اس کا نام لے دیتا، مجھے یاد ہے کہ یہ میرا ''طلسم ہوشربا'' پڑھنے کا وہ دور تھا جب میں زبان کا مطالعہ نہیں کر رہا تھا بلکہ ابھی صرف کہانی سے لطف لے رہا تھا، میری نظر عمر عیار کی عیاریوں اور برق کی چالاکیوں سے آگے نہیں گئی تھی، مگر نہ چاہتے ہوئے بھی طلسم ہوشربا کے اشعار، الفاظ کی بندش اور نقشہ کشی ذہن پر اپنے اثرات مرتب کرنے لگی تھی اور میں مزنگ سکول کی بزم ادب میں تاریخی کہانیاں سنانے لگا تھا،

جب کوئی اس راہ پر قدم اٹھالے تو اسے ادب کی تمیز آجاتی ہے وہ کچھ کچھ پہچاننے لگتا ہے، اس لئے مجھے جناب فیض سے لے کر قتیل شفائی تک سب کی تھوڑی تھوڑی پہچان ہوگئی اور میں مودب ہوتا چلا گیا، فیض صاحب آتے دکھائی دیتے تو میں راستہ چھوڑ دیتا، ہٹ کے کھڑا ہو جاتا اور انہیں سلام کرتا، وہ اپنی دھن میں ہوتے تو جواب بھی نہ دیتے اور اگر دیکھ لیتے تو مسکرا کے کچھ نہ کچھ کہہ دیتے، اس زمانے میں ہم وارث روڈ پر، تاثیر صاحب میسن روڈ پر اور فیض صاحب شملہ پہاڑی کے قریب رہتے تھے، اور تانگہ شاہی سواری

ہوتی تھی، بخاری صاحب ۵۰-۴۹ء میں اقوام متحدہ چلے گئے تو دوستوں کی یہ محفل بکھر گئی، پہلے تاثیر صاحب الگ ہوئے پھر ۳۰ نومبر ۱۹۵۰ء کو ان کا انتقال ہوگیا، مجید ملک صاحب اطلاعات کے محکمے سے وابستہ ہوکر کراچی چلے گئے ایسے میں لاہور میں فیض اور حسرت ہی رہ گئے اور ان کی محفلیں بھی پہلے سی نہ رہیں، یہی وہ وقت تھا جب مارچ ۱۹۵۱ء میں فیض صاحب فوج کے کئی جرنیلوں کے ساتھ گرفتار کر لئے گئے، اور پنڈی سازش کیس کی خبر سب کو مبہوت کر گئی، شروع شروع میں تو پتہ ہی نہیں چلا کہ فیض صاحب کس جیل میں ہیں، پھر جب والد صاحب کو ان کا ٹھکانہ مل گیا تو ان کی فکر کچھ کم ہوئی، انہوں نے اپنے ذرائع سے فیض صاحب کو سگریٹ اور کچھ لوازمات بھجوانے کا بندوبست کیا، مجھے لے کر آنٹی ایلس کے پاس پہنچے تو سلیمہ اور منیزہ لان میں اچھل کود رہی تھیں، ہم ڈرائنگ روم میں آنٹی ایلس سے ملے، مجھے یاد ہے کہ والد صاحب انہیں تسلیاں دے رہے تھے، آنٹی بوجھل دل لئے خاموش تھیں گو میں اس وقت تیرہ برس کا تھا مگر مجھے کچھ سمجھ نہیں تھی کہ مجھے کیا کرنا چاہئے، بس میں اپنی کرسی سے اٹھ کر ان کے پاس جا بیٹھا، میں نے اپنا ہاتھ آنٹی کے ہاتھ پر رکھ دیا اور بہت صبر والی آنٹی ایلس کے آنسو نکل آئے،

میں نے اب تک جو لکھا وہ تمہید ہے، محض تمہید، اور اس کا مقصد صرف ایک ادبی ماحول کو آپ پر اجاگر کرنا اور اس ادبی ماحول میں ان دونوں کے قرب کا ایک ہلکا سا خاکہ مرتب کرنا ہے، اپنے تعلق کی اصل تصویر تو ان دونوں بزرگوں نے خود آپ کے لئے مرتب کر دی ہے اور وہ تصویر ان دو خطوط سے واضح ہوتی ہے جو انہوں نے ایک دوسرے کو لکھے ہیں، یہ اس وقت لکھے گئے ہیں جب فیض صاحب پنڈی سازش کیس کی سزا کاٹ رہے تھے، یہ کل چھ خطوط تھے جو فیض صاحب نے مجھے بھیج دئے تھے، یہ خطوط مجھ سے نقوش والے طفیل صاحب نے والد صاحب کی وفات کے دو ماہ بعد لئے تھے اور واپس نہیں کئے، آیئے پہلے والد صاحب کا خط پڑھئے، اس خط میں میں زیادہ تر فارسی کے اشعار ہیں، جو اصحاب فارسی نہیں جانتے ان کی سہولت کے لئے ان کا ترجمہ درج کر دیا ہے تا کہ سب لطف لے سکیں، یہ ترجمہ ڈاکٹر طیب منیر نے کیا ہے اور خطوط بھی انہوں نے ہی فراہم کئے ہیں، والد صاحب لکھتے ہیں،

مکرمی!

میں نے آپ کو خط لکھا تو یہ امید نہیں تھی کہ اس قدر جلد جواب مل جائے گا، کیوں کہ مجھ سے بعض لوگوں نے کہہ رکھا تھا کہ قریب ترین عزیزوں کے سوا اور کسی سے خط و کتابت کی اجازت نہیں اور کرمانی (یہ ان ایوب کرمانی کا حوالہ ہے جو امروز کے اداراتی عملے میں ہوتے تھے) نے تو مجھ سے بکرات و مرآت کہا کہ اس نے کئی خط لکھے، کوئی جواب نہ ملا، اب معلوم ہوا کہ معاملہ کی نوعیت مختلف ہے، میں نے ملاقات کے لئے درخواست دے دی ہے، معلوم نہیں یہ درخواست کتنے مرحلے طے کرے، بہر حال آپ کو کسی کتاب کی ضرورت ہو تو لکھ دیجئے، ساتھ لیتا آؤں گا، میری دو بے حیثیت کتابیں (زرنیخ کے خطوط اور پربت کی بیٹی کی

طرف اشارہ) پچھلے دنوں چھپی ہیں، ان میں آپ کو لطف تو کیا آئے گا؟ پھر بھی ساتھ لے آؤں گا۔

اس گوشہ نشینی کے زمانے میں فارسی کے بعض شعرا کے کلام کے مطالعہ کا موقع ملا، سعدی کے کلیات کا ایک نسخہ ایران کا چھپا ہوا ہاتھ آیا ہے، لیکن اس میں مطائبات نہیں، غالباً اسے فحش سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا، نول کشور کا چھپا ہوا کلیات نہیں ملتا جس میں سعدی کا پورا کلام موجود ہے اور بھی کچھ کتابیں ملی ہیں، لیکن غلط سلط چھپی ہوئی، عرفی کے دیوان میں بہت سے شعر الحاقی ہیں، ظہیر فاریابی کا کلام بے مزہ ہے، نظیری کا کوئی اچھا نسخہ نہ مل سکا، مبارک علی نے دیوان نظیری چھاپا تو ہے، لیکن وہ سر بسر مجموعہ اغلاط ہے،

ان دنوں بعض ایسے شعرا کا کلام بھی نظر سے گزرا جنہوں نے زیادہ شہرت نہیں پائی، ان میں میر رضی دانش بھی ہے، جس کا دیوان نایاب ہے، اہل تذکرہ نے دو دو چار چار شعر نقل کر دیے ہیں، غلام علی آزاد بلگرامی کا انتخاب مجھے پسند نہیں، انہوں نے اساتذہ کے وہی شعر نقل کئے ہیں جو ان کے زمانے میں عام مذاق شعر سے مطابقت رکھتے تھے، یعنی زیادہ تر مثالیہ اشعار ہیں جو غنی، صائب، قدسی، اور علی قلی سلیم کے کلام کا اہم ترین حصہ سمجھے جاتے رہے ہیں البتہ مرزا مظہر خان جان جاناں نے خریطۂ الجواہر کے نام سے جو بیاض مرتب کی ہے، اس سے مرزا کے حسن ذوق کا ثبوت ملتا ہے، رضی دانش کے چند شعر لکھتا ہوں، یہ وہی شاعر ہے جسے دارا شکوہ نے ایک شعر پر ایک لاکھ کا انعام دیا تھا، یہ شعر آپ کو یاد ہوگا۔ (

اے بہار کے ابر نیسان، تاک کو سرسبز و شاداب رکھ، وہ قطرہ جو شراب بن سکتا ہے، اسے کیا پڑی ہے کہ وہ گوہر بنے...... نیسان رومی سال کا ساتواں مہینہ، مطابق ماہ اپریل، اس مہینہ کی بارش کو بھی نیسان کہتے ہیں، یہودیوں کے سال مقدس کا پہلا مہینہ ہے) علامہ اقبال مرض الموت کے زمانے میں رضی دانش کا یہ شعر اکثر پڑھتے تھے:

(رندوں کو مبارک کہو کہ محتسب کا جو پتھر ہے وہ ہمارے پر گرا ہے اور صراحی کے سر سے یہ آفت ٹل گئی ہے)

لیکن علامہ نے دوسرے مصرعے میں تصرف کر کے "سر" کو "دل" بنا لیا تھا، غالباً اپنے مرض کی رعایت مقصود تھی، کیوں کہ انہیں قلب کا عارضہ تھا، ایک دو شعر اور سنیے:

(وہ قیدی جو نمک حلال تھے جب قفس سے رہا ہوئے تو صیاد کے گھر کے پیڑ پر ہی آشیانہ بنایا)

(میں دیوار کے رخنے سے باغ کی بہار دیکھتا ہوں، جب تک باغبان دروازہ کھولتا ہے اس وقت تک بہار گزر چکی ہوتی)

(ہم جاں گدازوں کا سینہ حسرتوں کی کربلا ہے، ہماری آرزوئیں ہر طرف شہید پڑی ہوئی ہیں)

(صبح سے پہلے ہی وہ جل کر راکھ ہو گیا ہے، تاکہ وہ شمع کی جگہ خالی نہ دیکھے، پروانے نے موت کو اپنے اوپر آسان کر لیا ہے)

رضی دانش مشہد کا رہنے والا تھا، شاہ جہاں کے عہد میں ہندوستان آیا، کچھ عرصہ دلی اور لاہور میں رہنے کے

بعد دکن چلا گیا، زندگی کے آخری زمانے میں وطن کا قصد کیا اور مشہد میں ہی وفات پائی، نسبتی تھانیسری خالص ہندوستانی شاعر اور رضی دانش سے بہت زیادہ غیر معروف ہے، اس کے چند شعر ملاحظہ ہوں:::

(اس کا حسن اتنا بڑھ گیا اور میرے غم میں اتنا اضافہ ہوا، نہ میں نے اسے پہچانا اور نہ اس نے مجھے پہچانا)

(میں بہت ڈرتا ہوں کہ تجھے بہت چاہتا ہوں، تجھے چاہنے کی آرزو خوب ہے، لیکن اتنی خوب بھی نہیں ہے)

(اے نسبتی زلف، چشم وابرو اور رخسار یہ ایسے فتنے ہیں کہ ایک ہی زمانہ میں موجود ہیں)

(میری موت کی شان یہ ہے کہ تو صرف اتنا کہے گا کہ افسوس اس کی عمر اتنی نہ ہوئی کہ میں اس کے ساتھ وفا کرتا)

شیخ جمالی کنبوہ بھی انہیں لوگوں میں سے ہیں جنہیں اب کوئی نہیں جانتا، یہ شعر انھی کا ہے:

(ہمارے جسم پر تیری گلی کی خاک سے لباس بن گیا ہے اور اس کا حال بھی یہ ہے کہ وہ آنسوؤں سے دامن تک چاک چاک ہو چکا ہے) دارا شکوہ اور اورنگ زیب دونوں شعر کہتے تھے، اورنگ زیب کے تو صرف دو تین شعر مشہور ہیں، مثلاً یہ شعر اسی کا ہے:

(دنیا کا غم بے کراں ہے اور میرا دل ایک غنچے کی طرح ہے، اب میں صحرا کی ساری ریت کو شیشہء ساعت میں کیسے ڈالوں) لیکن دارا شکوہ کا پورا دیوان موجود ہے، ایک غزل کا مطلع ہے:

(دام ہو، زنجیر ہو، تسبیح ہو یا زنار ہو، جو خم اور پیچ بھی پیدا ہوا، زلف یار کی پیچیدگی سے پیدا ہوا)

جہانگیر نے بہت کچھ کہا ہوگا لیکن تذکروں میں چند شعر ملتے ہیں، یہ مطلع تو قیامت کا ہے:

(شراب کا ساغر باغ کے روبرو بیٹھ کے پینا چاہئے، ابر بھی بہت ہے اور شراب بھی بہت پینی چاہئے)

بابر بڑا صاحب ذوق شخص تھا ترکی اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتا تھا اور شعر سمجھتا بھی خوب تھا، اس کے مصاحبوں میں آتش قندھاری ایک شاعر تھا اس کا یہ مطلع خود بابر نے نقل کیا ہے، بچپن میں کہیں پڑھا تھا اب تک یاد ہے:

(میرے آنسو تیرے بغیر رفتہ رفتہ سمندر بن چکے ہیں، آ میری آنکھ کی کشتی میں بیٹھ اور اس دریا کی سیر کر)

سلیمہ سلطان مخفی، اکبر کی بیگم اور نہایت خوش ذوق خاتون تھی، اس کے کلام کا بڑا حصہ زیب النساء کے نام منسوب ہو گیا ہے، اس کی غزل کا ایک مطلع ہے:

(مستی کے عالم میں اگر میں نے تیری زلف کو رشتہء جاں کہہ دیا ہے تو میں مست تھا اس لئے پریشان خیالی کا شکار ہو گیا)

س سلسلے میں یاد آیا کہ گنا بیگم دختر قزلباش خاں امید بہت اچھے شعر کہتی تھی، شجاع الدولہ کی ایک لڑکی مینا بیگم سے بھی بہت سے شعر منسوب ہیں، مثلاً یہ مشہور شعر اسی کا ہے کچھ اور شعر سنئے:

دراصل میں تو چاہتا تھا کہ فارسی کے بعض غیر معروف شعرا کی پوری پوری غزلیں نقل کر دوں لیکن بہک کے کہیں سے کہیں جا پہنچا اور اب یہ خط اتنا لمبا ہو گیا ہے کہ کچھ اور کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہی، پھر موقع ملا تو

کچھ عرض کروں گا، عید الاضحیٰ آ رہی ہے، یہاں جن لوگوں سے آشنائی ہے، ان سے پختوں ملاقات نہیں ہوتی، امیر مینائی بھی کبھی بڑے مزے کا شعر کہہ جاتے ہیں، ان کا ایک شعر کہ حسب حال ہے یاد آ گیا بہر کیف عید کے دن لاہور کی طرف رخ کر کے نعرہ لگاؤں گا کہ

(وہ گروہ جو مے ساغر وفا سے مست ہے، وہ جہاں کہیں بھی ہو اس کو ہمارا سلام پہنچا دیجئے)

یا یہ کہہ کے چپ کا ہو رہوں گا کہ

(اے ہماری مجلس کے ہم نفسو، تم ہماری محفل سے چلے گئے ہو لیکن ہمارے دل سے نہیں گئے)

نیاز مند حسرت

اس مضمون کے شروع میں میں نے لاہور کی ادبی تحریکوں، ادبی محفلوں اور ادبی شخصیات کا ذکر کیا ہے، والد بزرگوار چراغ حسن حسرت کا یہ خط اس ماحول کی بھرپور عکاسی کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ محفل کیا ہوتی تھی، ادبی شخصیات جب مل بیٹھتی تھیں تو ان کی گفتگو کا دائرہ کیا ہوتا تھا اور جب کسی صورت وہ تنہائی میں ڈوب جاتی تھیں تو انہیں سکوت کے ٹوٹنے سے اٹھنے والی کون سی آواز پسند تھی، وہ کیا سننے کو بیتاب رہتے تھے، اس خط کو دیکھئے اور سوچئے کہ غیر ادبی ماحول میں قید فیض کے لئے بہترین تحفہ اس کے سوا کیا ہو سکتا تھا، پھر والد صاحب کی خوبی یہ تھی کہ انہیں دیوان از بر تھے اس لئے وہ ہر محفل کی ضرورت تھے،

جناب شورش کاشمیری، والد بزرگوار کے متعلق فرماتے ہیں کہ "وہ الفاظ کی نسلوں تک سے واقف تھے، انہیں معلوم تھا کہ فلاں محاورہ کہاں سے آیا، فلاں روزمرہ کی اصلیت کیا ہے؟ اس ضرب المثل کی بنیاد کس نے رکھی، یہ کہاوت کیونکر بنی، فلاں ادیب کا سرمایہ الفاظ کتنا ہے، فلاں شاعر کے ہاں کل کتنے الفاظ ہیں، عروض میں یگانہ اسناد میں منفرد" (نورتن)

جناب کرشن چندر لکھتے ہیں "اگر یہ کہا جائے کہ عرب ہوٹل لاہور کی بین الاقوامی شہرت محض حسرت کے طفیل تھی تو یہ بے جا نہ ہو گا لاہور کا یہ چھوٹا سا ہوٹل سند باد جہازی کی کرم فرمائی سے آج اچھا خاصا دارالادب بنا ہوا ہے اور لاہور آ کر تو ہر ادیب جہانگیر کا مقبرہ دیکھ چکنے کے بعد سیدھا عرب ہوٹل کا رخ کرتا ہے"

جناب سعادت حسن منٹو فرماتے ہیں "ان کا انداز گفتگو سارے لاہور میں مشہور ہے، انگوٹھے کے ساتھ والی دو انگلیوں میں سگریٹ دبا کر زور کا کش لگائیں گے اور پوچھیں گے مولانا آپ نے قاآنی کا مطالعہ کیا ہے؟ اگر آپ میری طرح کم تعلیم یافتہ ہیں اور آپ کو فارسی سے کوئی شد بد نہیں تو آپ مولانا چراغ حسن حسرت کے سامنے بالکل ایک چغد کی حیثیت سے بیٹھے ہوں گے پھر وہ آپ کو زیادہ چغد بنانے کے لئے، سعدیؒ، حافظ، غالب کا فارسی کلام سنائیں گے اور آپ کے دل میں یہ خواہش پیدا ہو گی کہ خودکشی کر لیں"

محترم ڈاکٹر طیب منیر کا ارشاد ہے کہ "چراغ حسن حسرت ایسا محور تھے جن کے گرد ہوٹل میں آنے والے اصحاب گردش کرتے تھے، کبھی کبھی تو یوں بھی ہوتا کہ صبح کا ناشتہ اسی ہوٹل میں کیا، دوپہر کا کھانا وہیں

تناول فرمایا، سہ پہر کی چائے وہیں نوش کی، پھر رات کا کھانا کھا کر وہاں سے اٹھے، حسرت اس زمانے میں عرب ہوٹل کی بالائی منزل پر رہتے تھے، اس لئے ہوٹل میں آنا فقط چند قدم کا فاصلہ تھا، جوں ہی حسرت ہوٹل میں آتے، احباب کی آمد شروع ہو جاتی، ہوٹل کی ہمہ گیری کا یہ عالم تھا کہ اخباروں کے دفاتر میں خبریں دیر سے آتیں عرب ہوٹل کی محفلوں میں پہلے آ داخل ہوتی تھیں، اسلامیہ کالج کے طلبہ تو ہر وقت حسرت صاحب کے گرد جمع رہتے، مولانا علم وحکمت کے آبدار موتی بکھیرتے رہتے اور اہل ذوق ان کو چنتے رہتے''

فیض صاحب کے ساتھ مراسم اسی عرب ہوٹل سے شروع ہوئے تھے، اور جیسا کہ زمانے کا دستور ہے کہ ذہین لوگ اپنی ذہانت کے اظہار سے دوسروں کو موہ لیتے ہیں، فیض صاحب نے بھی پطرس، تاثیر، مجید ملک اور حسرت کی محفل میں اپنا مقام بنالیا، یہاں جو پر کھولے تو پرواز کرتے اوپر ہی اوپر اٹھتے چلے گئے، برسوں پہلے کی بات ہے میں نے ڈرگ روڈ کراچی میں ان کے در دولت پر حاضری دی تھی، ان کا اچانک بلاوا ملا تھا اور میں لاہور سے اٹھ ان کے در پہ پہنچ گیا تھا، فیض صاحب تنہا تھے، ننگے پاؤں آئے، خود دروازہ کھولا، اپنے بستر پر جا کر ٹانگ پر ٹانگ رکھی اور لیٹ گئے، سکوت کا عالم تھا، کبھی کبھی ہاتھ بلند کر کے ہوا میں لہرا دیتے تھے، آدھ پون گھنٹے کی اس خاموش ملاقات کے بعد جب میں نے اجازت چاہی تو انہوں نے دو باتیں کہیں، ایک بات تو میں پہلے بھی کسی مضمون میں لکھ چکا ہوں کہ سبط حسن سے مل لینا دوسری بات اب بیان کرنے لگا ہوں،...... انہوں نے جو فرمایا اس کا لب لباب کچھ یوں تھا کہ ''حسرت صاحب کے عرب ہوٹل سے ہم نے بہت علم حاصل کیا تھا اگر ہو سکے تو عرب ہوٹل پر ضرور لکھنا''۔

والد صاحب کا خط آپ نے پڑھ لیا ہاں اب یہ بھی تو دیکھئے کہ والد صاحب کے خط کے جواب میں فیض صاحب کیا لکھتے ہیں۔ فیض صاحب کا خط یوں شروع ہوتا ہے:

''آپ کا گرامی نامہ کافی دنوں سے آیا رکھا ہے، ایک زمانے کے بعد کشاکش دیدہ و دل کا کچھ سامان ہاتھ آیا، اس لئے جواب کی کاوش کے بجائے خط اندوزی میں محو رہا، خاص طور پر رضی دانش کے یہ دو شعر بہت پسند آئے: اور پہلے شعر کا جزو داغ نے بھی باندھا ہے لیکن اس شعر کے مقابلے میں بہت پھیکا ہے، غالباً آپ کو بھی یاد ہوگا، گنا بیگم کے متعلق ایک عرصے سے تجسس تھا اس کے بارے میں کہیں ذخیرہ ہو تو لکھئے گا، اس کا ایک شعر مجھے بھی یاد ہے، آپ نے جو غزلیات طوالت کے ڈر سے نہیں لکھیں وہ اب لکھ بھیجئے اور اپنی نئی کتابیں بھی بھیج دیجئے (ایک سطر سنسر نے کاٹ دی)

ایک زمانے سے آرزو تھی کہ اردو شعرا کا کوئی ڈھنگ کا انتخاب مرتب ہو جائے آج کل اسی کام میں مصروف ہوں، تھوڑا سا گیا ہے بہت سا باقی ہے، حال ہی میں میر اور سودا کو دوبارہ استعجاب سے پڑھا، جس سے شبہ ہونے لگا ہے کہ سودا، میر سے بڑا شاعر تھا، یہ صحیح ہے کہ میر کے اچھے اشعار کی نظیر سودا کے ہاں نہیں ملتی لیکن سودا کے کلام کی عام سطح میر سے بلند ہے اور فنی دسترس میں میر ان سے یقیناً پیچھے ہے،

میں نے لغویات کا ایک نیا مجموعہ ''دست صبا'' (۱۹۵۲ء میں شائع ہوئی) کے نام سے چھپنے کے لئے بھیج دیا ہے، افسوس کہ آپ لاہور میں نہیں ہیں ورنہ میں چاہتا تھا کہ آپ ایک نظر دیکھ لیتے، چار پانچ سال انگریزی اخبار میں سر مارنے سے جو تھوڑی بہت اردو آتی تھی، وہ بھی بھول گئی ہے، اس لئے ان منظومات میں بہت سی قباحتیں رہ گئی ہیں، آپ دیکھ لیتے تو کچھ صاف ہو جاتا، عید کے دن آپ نے لاہور کی طرف رخ کر کے نعرہ لگانے کو کہا ہے، یہاں تو عید شب برات کی قید نہیں، مستقل یہی کیفیت رہتی ہے، اس کے اظہار میں ایک شعر میں نے بھی کہا تھا، اس وقت بے ساختہ مولانا عبدالباری آسی کی شرح غالب یاد آ گئی جس میں غالب کے ہر شعر کی تشریح کے بعد لکھتے ہیں ''میں نے بھی کہا ہے'' امید ہے آپ کا مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

فیض

نوٹ: یہ مضمون یہاں ختم نہیں ہوتا مگر اسکے بعد والد صاحب کی میری موجودگی میں فیض صاحب کے ساتھ ایک ملاقات ہے جو والد صاحب کی وفات سے کچھ پہلے لاہور میں ہوئی، اس پر پھر بات ہوگی۔ ......

....

☆☆☆

ادبی وبائیں

• محمد بشیر مالیر کوٹلوی

کسی چیز کی پرکھ کرنا اور پھر فیصلہ دینا بہت ہی مشکل اور ذمہ داری کا کام ہے مثال کے طور پر آپ ایک سنار ہیں آپ کو آزمانے کی غرض سے آپ کو ایک پیتل کا ٹکڑا دیا جاتا ہے آپ کسی مجبوری، دباؤ یا لالچ کے تحت فیصلہ سناتے ہو کہ دیا گیا ٹکڑا سونا ہے جب اصلیت کا پتہ چلے گا کہ یہ سونا نہیں پیتل ہے۔ تو ہمیشہ کے لئے آپ کی کسوٹی، پرکھ، نظر پر سوالیہ نشان لگ جائے گا آپ عوام کا بھروسہ کھو دیں گے۔ آپ کے بارے میں لوگوں کی ایک منفی رائے قائم ہو جائے گی اپنی اس بدنامی کی وجہ آپ خود ہوں گے کوئی دوسرا نہیں۔ اسی طرح موجودہ دور کے نقاد صاحبان آنکھیں موند کر کمزور ادب تخلیق کرنے والوں کی تعریفیں کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ پیسے کے زور پر کتابیں شائع کروا کر چھٹ بھیے اور کچے پکے ادیب ادب میں زبردستی گھستے آرہے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے مسودوں پر سینئر ادیبوں سے سفارشوں یا دوسرے ذرائع سے بڑے بڑے تعریفی نوٹ لکھوا لیتے ہیں۔ سینئر لوگ اپنے مضامین میں تعریفوں کے ساتھ اُن کو پڑھنے کی سفارش بھی کر دیتے ہیں۔ بڑوں کی سرپرستی کو دیکھ کر قاری کتاب خرید لیتا ہے۔ جب پڑھتا ہے تو سر پیٹ لیتا ہے۔ اس طرح بڑوں کی رہنمائی سے قاری دھوکا کھا جاتا ہے۔ اب قاری بھی کتنے دھوکے کھائے گا....؟ ایک.........؟ دو.........؟ شاید اس سے زیادہ نہیں۔ چھٹ بھیے بغیر محنت کئے ادب کے بیک دوڑ سے آرہے ہیں۔ آج کل اس دھوکے سے بچنے کا سیدھا طریقہ یہ ہے کہ جس کتاب میں بیساکھیوں یعنی تعریفی نوٹ ہوں وہ سمجھ لیجئے کمزور ادب ہے۔ سیدھی سی بات ہے بیساکھیوں کا سہارا تو اپاہج اور کمزور انسان ہی لیتا ہے جس کو اپنے آپ پر بھروسہ نہ ہو کہ وہ چل بھی پائے گا یا نہیں۔ سو جن کتابوں میں سفارشوں کے سہارے ہوں سمجھو اُن میں فن کی چاشنی نہیں۔

ادب میں آج کل وبائیں بہت پائی جانے لگی ہیں ایک وبا ایسی ہے جو عام ہونے لگی ہے وہ

ڈاکٹری کی وبا ایک طالب علم ایک استاد پروفیسر کی نگرانی اور اصلاح میں پی ایچ ڈی کی ڈگری پا لیتا ہے۔ استاد ہر طرح سے اُس کے کام کی اصلاح کرتا ہے یہاں تک کہ املا بھی درست کرتا ہے۔ زبان بھی سنوارتا ہے۔ ناموں کی لسٹیں، حوالے بلکہ اگر کام کسی تخلیق کار پر ہو رہا ہے تو اُس کی تخلیقات بھی جوں کی توں دے دی جاتی ہیں۔ اسی فیصد مقالہ تو ایسے ہو جاتا ہے بیس فیصد گائیڈ یا استاد کے کرم سے تیار ہو جاتا ہے۔ ہو گیا کام مکمل، ڈاکٹریٹ کی ڈگری مل گئی۔ ڈاکٹر بن کر طالب علم ادیب بن جاتا ہے پھر وہ اُسی مقالے پر جس پر گائیڈ کی مدد سے کام ہوا۔ استادوں کی آراء حاصل کر لیتا ہے۔ روپے خرچ کر کے کتاب شائع کروا لیتا ہے۔ ہو گئے صاحبِ کتاب؟ اب ادب میں داخل ہونے سے اُسے کون مائی کا لال روکے گا۔ نام کے آگے ڈاکٹر لگ گیا اور صاحبِ کتاب بھی ہو گئے اپنے تعارف میں دو کتابوں کا اور حوالہ دے دیا کہ زیرِ طباعت ہیں۔ بن گے ادیب مگر املا درست نہیں۔ زبان اور تذکر و تانیث کی تمیز نہیں۔ زہر کو مونث گردانتے ہیں اور سائیکل کو مذکر۔ ایسے چھٹ بھیئے داخل ہو رہے ہیں ادب میں۔ یہ وبا بہت پھیل چکی ہے جو لا علاج ہے۔

بہر حال بات ادب میں جبراً داخل ہونے کی ہو رہی ہے، تو صاحب ایسے لوگوں کے تخلیق کردہ خاص کر افسانے جب منظرِ عام پر آئیں گے تو نقاد حضرات تو کہیں گے کہ آج کا افسانہ رپورٹنگ بن کر رہ گیا۔ آج کل کوئی منٹو بیدی پیدا نہیں ہوتا۔ تعجب اس بات پر ہے کہ کمزور اور چھٹ بھئیوں کے ادب کو بڑھاوا بھی نقاد دیتا ہے اور عصری ادب میں کیڑے بھی خود ہی نکالتا ہے۔ الزامات لگانے سے پہلے یہ نہیں سوچتا کہ کمزور ادب کو آگے لانے کا ذمہ دار کون ہے؟......وہ خود ہی ذمہ دار ہے......! وہ بغیر سوچے سمجھے کسی دباؤ یا لالچ کے کیوں چھٹ بھیوں کی تعریف کرتا ہے۔ یہ ادب کے ساتھ ایمانداری نہیں ہوتی۔ کل کوئی جب اس دور کے ادب کی تاریخ مرتب کرے گا تو موردِ الزام آپ کو ہی ٹھہرائے گا۔ وقت ایک نہ ایک دن آپ سے سوال کرے گا۔ منٹو بیدی تو تمہارے دور میں بھی تھے اُن کو دیکھنے کی تمہارے پاس فرصت کیوں نہیں تھی......؟ معیاری ادب تو تمہارے دور میں بھی تخلیق ہوا مگر تم تو روپے۔ ایوارڈز اور فارن ٹورز سمیٹنے میں لگے رہے اور سچے ادب کا مطالعہ ہی نہیں کیا۔ سفارشوں اور تحائف کا چشمہ لگا کر غیر معیاری ادب کو معیاری کہتے رہے۔ ایسی ادبی وبائیں شاید ماضی میں پیدا نہیں ہوتی تھیں۔ اس دور کی سب سے مہلک وبا ہے۔ پی۔ آر۔ او جو ادب کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے۔ آپ کتنا ہی بہتر اور معیاری ادب تخلیق کر لیں اگر آپ کا PRO کمزور ہے تو سمجھ لیجئے کوئی نقاد کوئی مضمون نگار آپ کو ادیب نہیں مانے گا۔ آپ ادیبوں کی لسٹ میں شامل نہیں ہوں گے۔

ایسا ہر گز نہیں کہ بہتر لکھنے والے اپنی تخلیقات کو فائیلوں میں دبا کر رکھ لیتے ہیں۔ ایسی بہتر تخلیقات منظرِ عام پر نہیں آتیں۔ بہتر بلکہ بہترین افسانے اکثر فعال جرائد میں شائع ہوتے ہیں۔ بد قسمتی سے اُن پر کسی کی نظرِ انتخاب نہیں پڑتی۔ آیئے ذرا غور کریں کہ یہ پی آر او کی بیماری ہے کیا......؟ اور ادب کے لئے

کیوں مہلک ثابت ہو رہی ہے۔ پی۔ آر۔ او عام زبان میں پبلک ریلیشن آفیسر کو ہی کہا جاتا ہے۔ اردو ادب میں اسے عوامی رابطے کے طور پر نہیں لیا جاتا نقادوں اور مضمون نگاروں کے رابطے کے طور پر لیا جاتا ہے۔ جو افسانہ نگار واقعی فن کار ہے اپنی صنف کی تکنیک اور اُس کے رموز سے اچھی طرح واقف ہے اور اپنی تخلیقات سے مطمئن ہے اُسے احساس ہے کہ وہ معیاری ادب تخلیق کر رہا ہے وہ بڑی خاموشی سے اپنا کام کرتا رہتا ہے اُسے پروا نہیں ہوتی کہ لوگ اُس کے فن کو پہچانیں اور اُس کی تعریف کریں۔ اُس پہ تعریفی مضامین لکھے جائیں۔ اُس کے اعزاز میں تقاریب منعقد ہوں۔ وہ صوبائی اور قومی اعزازات سے نوازہ جائے ان معاملات میں وہ درویش صفت ہوتا ہے۔ وہ پی۔ آر۔ او کی وبا سے محفوظ ہوتا ہے۔ اُس کے مقابلے میں چھٹ بھیے۔ ادب کے نو آموز لونڈے جو راتوں رات بڑا ادیب بنا چاہتے ہیں پی۔ آر۔ او کا سہارا لیتے ہیں۔ ایسے گھٹیا ادب کے لئے سفارش لڑا کر یا پیسے کے زور پر اپنی تخلیقات پر بڑے ادیبوں سے تعریفی مضامین لکھوا کر کتابیں چھپوا لیتے ہیں اس طرح وہ ادب میں سینندھ لگانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ نقادوں سے ملتے ہیں اُن کی چاپلوسی کرتے ہیں تحائف دیتے ہیں کوئی براہ راست قابو نہ آئے تو اس کے کسی دوست کو پکڑ لیتے ہیں۔ بات اتنی سی ہوتی ہے کہ "بھائی جب کوئی افسانے کے بارے میں مضمون لکھیں تو اس چھوٹے بھائی کا خیال رکھیں۔ خوالوں میں نہیں تو افسانہ نگاروں کی لسٹ میں تو نام ضرور لکھیں۔ موبائل فون نے اس بیماری کو زیادہ تقویت بخشی ہے۔ صبح شام فون کرتے ہیں۔ کیسے ہیں بھائی......؟ جی......بس سلام کرنے کو جی چاہا تھا۔ سنا ہے فلاں جریدہ افسانہ نمبر نکال رہا ہے اور آپ سے مضمون مانگا ہے۔ بھائی میرا ضرور ذکر کر دیں......پلیز......! کتابیں تو میری آپ کے پاس موجود ہیں۔ میرے کسی افسانے کا ذکر ضرور کر دیں۔" جب وہ مضمون چھپ کر منظر عام پر آ جاتا ہے تو وہ چھٹ بھیا صاحب خوش ہوتے ہیں کہ وہ ایسٹیبلشڈ (Established) افسانہ نگار ہو گئے۔ یہ اس دور کا المیہ ہے یہی وجہ ہے کہ ہلکا اور بے معنی ادب آگے آ رہا ہے۔ یاد رکھئے آپ کو بڑا فن کار آپ کی محنت آپ کا مطالعہ بناتے ہیں۔ تا کہ آپ کا مضبوط پی۔ آر۔ او۔ آج سعادت حسن منٹو قبر سے اُٹھ کر ہمیں نہیں کہتا کہ ہم اُس کے فن کو لوہا مانیں۔ اُس کی تعریف میں کاغذات کالے کریں۔ یہ اس کا فن ہے اس کی محنت ہے اُس کی خداداد صلاحتیں ہیں جو ہمیں مجبور کرتی ہیں کہ ہم اُس کا نام لیں۔ اُس کو اپنے ہم عصروں میں بڑا مانیں۔ فن کار عظیم تھا تبھی منٹو کو دوسری زبانوں میں ٹرانسلیٹ کیا جا رہا ہے۔ یہ پی۔ آر۔ او کے غلام ذرا غور کریں۔ کہ جب کل وہ نہ ہوں گے تو اُن کا کون نام لیوا ہوگا۔ یاد رکھئے آپ کا تخلیق کردہ معیاری ادب ہی مرنے کے بعد آپ کو زندہ رکھے گا قارئین کے ذہنوں میں۔ ورنہ کمزور ادب کی پی۔ آر۔ او کے زیر اثر تعریفیں کرنے والے نقادوں پر آنے والا وقت لعنت بھیجے گا۔ یہ سچ ہے بلکہ کڑوا سچ۔ ایسے لوگ اپنی تعریف کا اپنے قد کو زبردستی بڑھانے کا چانس کبھی نہیں کھوتے۔ افسانے کے ایک بڑے فنکشن میں۔ ایک بڑا نقاد مسند صدارت پر رونق افروز تھا ایک افسانہ نگار دوست میری بغل

میں بیٹھا تھا۔تقاریر کا سلسلہ شروع تھا۔افسانہ نگار دوست نے اپنی جیب سے ایک سفید کاغذ کا ٹکڑا نکالا اور اُس پہ کچھ لکھنے لگے۔ مجھے اُس کا یہ عمل اچھا نہ لگا میں نے کروٹ بدل کر پڑھا تو وہ اپنے فن کی عظمت کے بارے میں جملے لکھ رہا تھا۔جب تقریب ختم ہوئی تو افسانہ نگار بھیڑ میں سے آگے بڑھا اور بڑے نقاد کے آگے وہ کاغذ پھیلا کر بولا ''سر پلیز دستخط کر دیجئے۔'' بڑے نقاد نے وہ تحریر پڑھی اور مسکرا کر آٹو گراف دے دیئے ۔ایک عرصہ بعد اس افسانہ نگار کا نیا افسانوی مجموعہ دیکھا تو وہی تحریر اُس کے فلیپ پر چھپی تھی۔جس پر نقاد صاحب نے آٹو گراف دیئے تھے۔

آپ خود ہی اندازہ لگالیں کہ کتابوں پہ تعریفی نوٹ کس کس طرح سے حاصل کر لئے جاتے ہیں ۔آج کا نقاد مصروف بہت ہے عصری ادب کا مطالعہ کرنے کے لئے اُس کے پاس وقت ہی نہیں اگر کسی موضوع پر مضمون لکھنا درکار ہے تو وہ آٹھ دس کتابوں کو نہیں کھنگالتا۔اس موضوع پر لکھے ہوئے دو چار مضامین ڈھونڈھ لیتا ہے کیوں کہ اُس میں حوالے تخلیقات اور افسانہ نگاروں کے ناموں کی لسٹ سب کچھ ریڈی میڈ مل جاتا ہے۔پرانے حوالے پرانی لسٹیں اُٹھائیں اور مضمون ہو گیا تیار۔پھر وہ کسی اکادمی یا یونیورسٹی کی تقریب میں مضمون پڑھتا ہے اور موٹی رقوم بٹورتا ہے۔حوالے چاہے کمزور ہوں چاہے چھٹ بھیّوں کے ہوں کیا فرق پڑتا ہے۔افسے تو اعزازات۔پے مینٹس اور فارن ٹورز تک مطلب ہے۔فارن ٹور پر مجھے یاد آیا ۲۰۱۲ء میں مجھے یو کے جانے کا اتفاق ہوا وہاں کے شعراء اور ادباء نے بڑی محبت کا اظہار کیا واپسی پر ایک ادب میں نو وارد افسانہ نگار صاحب نے مجھے دو کتابیں تھماتے ہوئے کہا کہ میں ہندوستان میں جا کر فلاں نقاد کو اُس کے یہ افسانوی مجموعے پہونچا دوں۔افسانہ نگار دوست نے مجھے بتایا کہ نقاد صاحب جو ترقی پسندی کے بڑے نقاد ہیں نے خود مطالبہ کیا تھا۔وہ اُس فارن افسانہ نگار کے فن سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے مجموعوں کا مطالبہ کیا کیونکہ اُن کی خواہش ہے وہاں صاحب پر مضمون لکھیں۔ہم افسانہ نگار ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ کون کتنے پانی میں ہے میں جانتا ہوں کون کیا لکھتا ہے۔ بلکہ یہ بھی کہ یہ کس سے لکھواتا ہے۔لوگ مجھے بھی جانتے ہیں کہ میں کیا لکھتا ہوں میری تخلیقات کا کیا معیار ہے۔کئی سال پہلے میں نے اسی صف اوّل کے نقاد کو کتابیں بھیجیں اور بار بار التجا کی کہ صاحب مضمون لکھ دیجئے۔ایک دو دوستوں سے کہلوایا بھی۔وعدہ کر کے بھی انہوں نے میرے لئے قلم نہ اُٹھایا۔اِن صاحب سے خود یہ کہہ رہے ہیں ٹھیک تو ہے۔میرے پاس لینے دینے کو کیا ہے۔اُس امپورٹڈ افسانہ نگار کی جیب میں قیمتی تحائف، پونڈ اور فارن ٹورز تھے۔مکھی میٹھے پر گری ہے نمک پر مکھیاں کب بھنبھناتی ہیں۔فارن ٹور کی کشش ہی کچھ اور ہے۔ہندوستان میں مشرق کے ایک زمانہ ساز ایڈیٹر ہیں جو قلم کے زور پر کمانا خوب جانتے ہیں۔قومی سطح پر ہم ادیبوں نے ادب کے دو بڑوں کو بڑے مان رکھا ہے۔ بات قابلیت کی نہیں پاور کی ہے۔دونوں بڑوں میں سے ایک بڑے کے لئے اُس مشرقی مدیر نے اپنے جریدے کا گوشہ نکال مارا بلا معاوضہ لیئے اور جم کر چھچ

گیری کی۔ کوشش ثمر آور ہوئی۔ بڑے صاحب جن کے ہاتھ میں ہمیشہ قومی، بین الاقوامی سطح کے ایوارڈ رہتے ہیں نے خوش ہو کر ایڈیٹر کے لئے فارن ٹور عطا کر دیے ایڈیٹر خوش ہوئے۔ تو صاحب یہ جو لین دین کا معاملہ ہے یہ بھی ادب میں مہلک وبا ہے۔ یہ اندھی ہوتی ہے، معیار یا مقام نہیں دیکھتی بس اگر تم نے مجھے حاجی کہہ دیا تو تو اگر حاجی ہے بھی نہیں تو بھی مجھے تیرے احسان کا بدلہ چکانا ہے۔ بعد میں شریعت یا دنیا کچھ بھی کہے کہتی رہے۔ تو نے مجھے اپنے مضمون میں پناہ دی تعریف کی تو میں تجھے کیسے بھول جاؤں گا۔ اسی طرح کی ایک وبا علاقائی وبا ہے۔ اگر آپ پنجابی ہیں اور میں آپ کے صوبہ کا آدمی ہوں تو آپ کی ساری کمزوریاں برطرف آپ کو ہر حالت میں مجھے صفِ اوّل کا افسانہ نگار قرار دینا ہے۔ لوگ تو مئوقر جرائد کے دفاتر میں جا کر گذارش کرتے نہیں شرماتے کہ جناب ہماری سٹیٹ کے ادیبوں کو زیادہ چھاپئے۔ چاہے جواب یہ ملے کہ بھائی ہم تو معیار دیکھتے ہیں وہ چاہے کسی صوبہ کا ہو ہمیں کوئی مطلب نہیں۔ صوبہ کے نام پر ایک افسوسناک قصہ یاد آ گیا۔ ہمارے ایک افسانہ نگار دوست جو ایک مقبول ادبی جریدے کے مدیر بھی ہیں پہلے وہ احمد آباد میں مقیم تھے آج کل لکھنو کے ایوانوں میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ میں تو سید مگر صفات پٹھانوں والی رکھتے ہیں۔ انتہائی خوددار، نڈر اور بے باک زبانی بھی اور تحریری طور پر بھی۔ ثابت قدم اور غیور ہیں۔ اُن میں میں نے جو کمی پائی تو صرف اتنی کہ وہ خطرناک حد تک شریف ہیں۔ پرچہ ۱۹۷۷ء سے نکال رہے ہیں۔ طویل عرصہ سے ادبی اور ملی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ۲۰۰۲ء میں سرکاری اعلیٰ عہدہ سے ریٹائر ہو کر احمد آباد سے لکھنو آ گئے پرچہ جاری رکھا جو آج بھی فعال ہے۔ پرچے پر پہلے سے زیادہ توجہ دینے لگے ہیں۔ پچھلے دنوں شاہ جہاں پور کے کسی مضمون نگار نے اتر پردیش کے فعال جرائد پر مضمون لکھا۔ مضمون نگار کا نام ہم نے پہلی بار سنا۔ مضمون نگار کو ہمارے دوست سے کس بات کا گلہ تھا کہ تھرڈ کلاس جرائد تک اور بند پڑے جرائد کا ذکر کر دیا ہمارے دوست کے بے حد فعال اور معیاری پرچے کا نام تک نہیں لیا۔ ہمارے مدیر اور افسانہ نگار دوست کی طبیعت پر تو مضمون نگار کی اس گھٹیا حرکت کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ ہمیں واقعی بہت غصہ آیا۔ یہ ادبی بددیانتی ہے۔ کسی کا حق کرتا ہے۔ محنت کرتا ہے۔ کس لئے؟......کیوں کرتا ہے......؟ اس لئے کہ لوگ اُس کی محنت کا اعتراف کریں اچھے الفاظ میں یا برے الفاظ میں اُس کے وجود کو مانیں۔ قلمکار اسی کو اپنا معاوضہ مانتا ہے اسے وہی نہ ملے۔ وہ نظر اندازی کا شکار ہو جائے اندازہ لگائیں اُسے کتنی تکلیف ہوتی ہوگی۔ مضمون نگار کا کیا جاتا تھا کہ وہ ایک دو جملے لکھ کر ہمارے دوست کی محنتوں کا اعتراف کر لیتا۔ یہاں کوئی رنجش یا گلے کا معاملہ نہیں تھا۔ ہمارے مدیر دوست کا پی۔ آر۔ او کمزور ہے ہمارے دوست غیور دوست کو چمچہ گیری اور چاپلوسی سے سخت نفرت ہے۔ نہ وہ کسی کا گوشہ نکالتے ہیں نہ خوشامد کر کے اشتہار لیتے ہیں۔ ہم تو یہی کہہ سکتے ہیں کہ بھائی صبر کرنے والوں کے ساتھ اللہ ہے۔ اس دور میں شاہ جہاں پوری، کانپوری یا ناگپوری بھی پی۔ آر۔ او کے مریض ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ پی۔ آر۔ او بڑی مہلک بیماری ہے یہ اسی ترقی

پذیر دور کی دین ہے جیسے فاسٹ فوڈ۔ وہ بچوں کی صحت خراب کرتا ہے یہ ادب کی صحت کو کمزور کرتا ہے۔ پی۔ آر۔ او کے مرض میں مبتلا ہمارے ایک افسانہ نگار دوست جو سے بہت جونیئر ہیں اُن کی تخلیق نے مجھے یا کسی اور ادیب دوست کو کبھی متاثر نہیں کیا۔ اپنے قلم سے خود ہی اپنی تعریف پہ بھی یقین کرتے ہیں۔ ایک ملاقات کے دوران مجھ سے بولے بشیر بھائی آپ افسانہ تو لکھ لیتے ہو مگر آپ کا پی۔ آر۔ او کمزور ہے آپ اپنی شناخت نہیں بنا سکے ابھی تک۔ بات انہوں نے درست کہی۔ واقعی ہمارا پی۔ آر۔ او کمزور ہے اور شاید آئندہ بھی کمزور رہے گا۔ ہم بہتر ادب تخلیق کرنے میں یقین رکھتے ہیں پی۔ آر۔ او سے تو ہمیں اکتاہٹ ہوتی ہے۔ میرے حساب سے تو اُس میں جزیات نگاری کی بھر مار تھی۔ اُس افسانے میں ان صاحب نے شاید اردو افسانے میں پہلی بار بچوں کے پیشاب دھار مقابلہ کی خوبصورت منظر نگاری کر ڈالی جب کہ پیشاب دھار مقابلے کا افسانے کے موضوع کے ساتھ کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ میں نے دوست کو فون کیا کہ بھائی ادب میں مکروہ چیزیں کیسے؟...... ادب میں کچھ باتیں پوشیدہ ہی بہتر ہیں۔ وہ بہت ہنسے اور بولے بشیر بھائی میں نے تو پیشاب دھار کا ذکر کیا تھا مجھے بہت سے فون آئے ہیں لوگ پیشاب دھار کو علامت سمجھ کر تعریفیں کر رہے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اگر کہوں کہ اُن کی اس غلاظت سے لوگ جمالیاتی پہلو نکال رہے ہیں۔ واہ بھئی یہ تو پی۔ آر۔ او کا نیا پہلو نکل آیا۔ اس سے پہلے ان صاحب کا ایک افسانہ سامنے آیا تھا جس میں انہوں نے فحش گالیاں جوں کی توں لکھی ہیں اُس کو نقاد حضرات ان کا بہترین افسانہ قرار دے رہے ہیں۔ یہ ہیں پی۔ آر۔ او کے چمتکار۔ میں نے مذاق میں کہا میاں خیال رکھئے گا آئندہ بیت الخلاء کی منظر نگاری نہ کر دینا۔

ادب تو ادب ہے۔ ادب میں بیڈ روم کے افعال، بیت الخلاء اور غسل خانے کے افعال پوشیدہ ہی رہنے چاہئیں۔ ادب کے بھی کچھ تقاضے ہیں۔ ادب بہر حال روح کی غذا ہے جب اس غذا سے کراہیت محسوس ہو تو ادب کہاں رہے گا؟ عصری ادب کی اچھائیاں اور برائیاں ہماری ہی ذمہ داری ہے۔ جو ادب کی تخلیق میں سرگرداں ہیں۔ فعال ادیب ہیں۔ دوسری ذمہ داری جرائد کے مدیران پر ہے کہ وہ ایسا کراہیت والا ادب منظر عام پر نہ لائیں۔ ادب کو پاک و صاف رکھیں۔ مدیران بھی بے چارے کئی بار پی۔ آر۔ او اور مقامی فرقہ پرستی کے شکار ہو ہی جاتے ہیں۔ مدیران کو غیر جانبدار اور معیار پسند ہونا چاہئے۔ جو مسودات ان کے پاس اشاعت کے لئے آئیں وہ ان کی کپڑ چھان کریں اور معیاری ادب کو ہی شائع کریں۔ یہ بہت بڑا کام ہوگا۔ صوبائی کشش کو بالائے طاق رکھیں، تعلقات جیب میں محفوظ کریں، بڑے ناموں سے متاثر نہ ہوں۔ ہر حالت میں مدیر ہونے کے فرائض نبھائیں۔ قاری کی بھی ذمہ داری ہے کہ اگر شائع شدہ ادب میں وہ کوئی کمی محسوس کریں کمزوری دیکھیں تو یہ سوچ کر الگ نہ ہو جائیں کہ چوڑو ہمیں کیا لینا دینا۔ ایسا ادب چھپتا ہے تو چھپتا رہے۔ آپ وقت نکال کر رسالے کو خط لکھیں اور اُن کمیوں کی طرف مدیران اور قلمکار حضرات کو متوجہ کریں۔ تاکہ آئندہ آگے بہتر ادب آئے۔ اس طرح معیاری ادب کو تقویت ملے گی اگر گھٹیا ادب چھپتا

ہے اور قاری خاموش رہتا ہے تو تخلیق کار سمجھتا ہے کہ اُس کی تخلیق قابل، اشاعت تو تھی ہی۔ عوام نے بھی اسے قبول کرلیا۔ اُس کا حوصلہ بلند ہوتا ہے وہ مزید ایسی تخلیقات کے لئے کمربستہ ہوجاتا ہے۔ میں خاص طور پر سینئر افسانہ نگار دستوں کو عرض کرنا چاہوں گا کہ آپ اگر افسانہ نگاری کے رموز سے واقف ہیں۔ کمزور افسانہ تخلیق کرنے والوں کو آئینہ ہی دکھادیں۔ ممکن ہے اس سے اُن کی اصلاح ہو، وہ بہتر لکھنے لگیں، چاہے چھٹ بھیئے خود کو کتنا ہی بڑا افسانہ نگار سمجھیں مگر تنہائی میں وہ اپنی کمزوریوں پہ ضرور نظر ڈالیں گے اگر اُن کو احساس دلایا جائے۔ میں سمجھتا ہوں یہ بھی ادب کی بہت بڑی خدمت ہے۔ اساتذہ اور سینئر افسانہ نگار کسی کے مسودے پر سوچ سمجھ کر اور ایمانداری سے آراء لکھیں۔ تو پی۔ آر۔ او کی وبا ختم نہیں ہو کم ضرور ہوسکتی ہے۔

باقی یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ فنکار بنا نہیں جاتا۔ فنکار ہوا کرتے ہیں۔ فن تو اُس مالک کی دین ہے جسے وہ نوازے اور اُس کے دینے کا کوئی پیمانہ نہیں۔ کوئی پرکھ نہیں ڈگریوں پر ڈگریوں لے کر آپ فن کار نہیں بن سکتے۔ غالب، منٹو علےٰ تعلیم یافتہ نہیں تھے۔ اُن کے فن پر لوگوں نے ڈگریاں لی ہیں۔ اگر آپ فنکار ہیں تو آپ کا فن آپ کا لوہا منوائے گا۔ آپ کی تخلیقات دنیا کو مجبور کریں گی کہ آپ کی تعریف ہو۔ آپ کا ادب ہاتھوں ہاتھ لیا جائے۔ ڈگریاں اور درجنوں کتابیں اور پی۔ آر۔ او آپ کو بڑے سے بڑا ایوارڈ دلوا سکتا ہے۔ فن کی چاشنی دینے والا ہی دیتا ہے اور صاحب فن کار کبھی نہیں کہا کرتے کہ وہ فن کار ہیں۔ وہ تو آخری دم تک خود کو طالب علم ہی کہتے ہیں۔ نرم طبیعت اور انکساری فن کار کا زیور ہوتا ہے۔ جب فن کار اکڑ جاتا ہے۔ اُس میں غرور آجاتا ہے تو فن اُس سے دور چلا جاتا ہے۔

☆☆☆

خاکہ

(۲)

بشر ہے کیا کہیے

● ڈاکٹر فیصل حنیف خیالؔ

دوحہ، قطر

دھرے ہیں سینے پہ ہاتھ دونوں یہ حفظِ عفت کا جوش دیکھو
یہ جان دیکھو، یہ عمر دیکھو، یہ عقل دیکھو، یہ ہوش دیکھو

بیس برس اُدھر ٹی وی پر قوت بخش شربت کا ایک اشتہار چلتا تھا جس میں ایک خوش شکل نوجوان لڑکا اور اس کے ہمراہ ایک ماہ لقا چلتی بس کے دروازے پر کھڑے ہوتے ہیں کہ ایک بزرگ بجلی کی سی سرعت سے دوڑتے ہوئے، فراٹے بھرتی بس میں لپک کر سوار ہو جاتے ہیں، دوشیزہ اس حیرت انگیز چستی و پھرتی کا مظاہرہ دیکھ کر انگشت بدنداں ہو جاتی ہے اور بڑے میاں کی طرف ہوش ربا انداز اور خود سپردگی کی نظر سے دیکھتے ہوئے کہتی ہے "ساٹھ سال کے بوڑھے یا ساٹھ سال کے جوان"- بڑے میاں کے ہونٹوں پر معنی خیز فاتحانہ مسکراہٹ بکھر جاتی ہے اور دوشیزہ کے ساتھ موجود نوجوان عرقِ ندامت میں غوطے کھاتا دکھائی دیتا ہے، اور ٹی وی کے سامنے بیٹھے نوجوان لڑکوں کا دل کباب ہوا جاتا ہے-

میرے عزیز دوست، مشفق بزرگ، ادبی نشستوں کے میرِ محفل، انتظامی صلاحیتوں میں کامل، اردو کی نسبت سے نجم الدولہ کہلائے جانے کے قابل، اہلِ نظر کے لیے دوحہ کی صحبتوں کا حاصل، بذلہ سنجی کے لیے ناگزیر، زندہ دلی و بشاشت کی تصویر، ملنسار پر انا کے اسیر، بری شاعری سے بیزار، شاعر فہم اور فرومایہ شاعروں کے لیے برہنہ تلوار، کل سے بے نیاز، ہمہ وقت ماضی کی رتھ میں سوار، دہلوی تہذیب و

ثقافت کے علمبردار، دشمن شناس، دوست ناشناس جناب سلیمان دہلوی کی شخصیت ایسی ہے جس پر مجھ کو رشک آتا ہے- وہ مجھ سے عمر میں دگنے اور چستی اور پھرتی میں بھی دگنے ہیں- اگر ۷۰ برس میں آدمی یوں ہو جاتا ہے تو میں آج بوڑھا ہونے کو تیار ہوں- جوانوں کے تیور اور صحت اور بزرگوں کا تجربہ اور متانت، کہیں اور یکجا ہوتے میں نے نہیں دیکھے- بہر کیف، سلیمان صاحب سے مل کر جہاں اگلے وقتوں کی وضع داری کے نمونے دیکھ کر دل باغ باغ ہوتا ہے وہاں کبھی کبھار حال اوپر بیان کیے ہوئے ٹی وی اشتہار دیکھنے والے نوجوانوں کا سا ہو جاتا ہے-

دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا
آج پھر اس کی روبکاری ہے

خاکہ نگاری فن کے زمرے میں آتا ہے، تاہم کسی زندہ شخص کا خاکہ نہ لکھنا زیادہ قابلِ قدر کارنامہ ہے- خاکہ نگاری کا اصول یہ ہے کہ جس کے بارے میں لکھا جائے اس کی شخصیت کے منفی پہلو بھی سامنے لائے جائیں اور جسے مشقِ ستم بنایا جائے اسے کوئی تکلیف بھی نہ ہو- زندہ لوگوں کے معاملے میں یہ کیونکر ممکن ہے؟ دوسرا، اور مروج طریقہ یہ ہے کہ خاکے میں تعریف و توصیف کی ایسی بھرمار ہو اور جھوٹ کے ایسے پل باندھے جائیں کہ ممدوح خود شرمندہ ہو جائے، مولانا آزاد کی طرح اپنے استاد کے ہاتھ سے استرا چھین کر تلوار تھما دی جائے- یا پھر مولانا حالی کی 'حیاتِ جاوید' کی طرح 'مدلل مداحی' لکھ دی جائے- سب سے آسان تو یہ ہے کہ یہ بھاری پتھر چوم کر چھوڑ دیا جائے کیونکہ دستر خوان بچھانے میں سو عیب پر نہ بچھانے میں صرف ایک عیب ہے-

میری کج روی دیکھیے کہ مجھ کو فن کی روایت سے چمٹے رہنے کی عادت ہے، اور حقیقت بھی یہ ہے کہ سچی خاکہ نگاری کثافتِ طبع نہیں بلکہ شوخیِ طبع کا بیان ہوتی ہے- اور ویسے بھی قصیدوں میں کیا لطف ہے- طبعیت الگ بیزار ہوتی ہے- بقول یوسفی، استاد ذوق ہر قصیدے کے بعد منہ بھر بھر کے کلیاں کیا کرتے تھے- میری کوشش ہے کہ میں خاکہ نگاری میں ان مخصوص مضامین سے کچھ پاک اور کسی حد تک معرا ہو جاؤں جو ہر 'بوالہوس' کا شعار ہے- یعنی سچ (حسبِ ذائقہ)، جو میں سمجھتا ہوں، لکھوں-

سلیمان صاحب عمدہ مضمون نگار ہیں، میں نے ایک بار کہا کہ حضرت مضمون چھوڑیے، خاکہ لکھیے اور ایسا کہ جس کا خاکہ لکھیں اس کی دھجیاں اڑ جائیں، حیران ہو کر فرمانے لگے کہ زندوں میں ایسا خاکہ کس کا لکھوں؟

میں نے کہا: آپ میرا خاکہ لکھیے ، میں آپ کا خاکہ لکھتا ہوں - بالکل ایسے جیسے بحوالہ آب حیات ، ایک عمر رسیدہ شاعر مرزا رفیع سودا سے ملاقات کو آئے -" بعد رسوم معمولی کے آپ نے پوچھا کہ فرمائیے میاں صاحب آج کل کیا شغل رہتا ہے ، انھوں نے کہا افکار دنیا فرصت نہیں دیتے ، طبیعت کو ایک مرض یاوہ گوئی کا لگا ہوا ہے ، گاہے بگاہے غزل کا اتفاق ہو جاتا ہے ، مرزا ہنس کر بولے کہ غزل کا کیا کہنا ، کوئی ہجو کہا کیجیے ، بیچارے نے حیران ہو کر کہا ہجو کس کی کہوں ؟ آپ نے کہا ، ہجو کو کیا چاہیے ، تم میری ہجو کہو ، میں تمھاری ہجو کہوں ۔"

تو یہ ہے اس خاکے کی وجہ تسمیہ - انگریز کی قید میں مولانا محمد علی جوہر پر ایک موقع وہ بھی آیا کہ جب مولانا کی خط و کتابت پر پابندی لگا دی گئی اور اُن کے اہل و عیال کے خطوط بھی سنسر ہونے لگے - مولانا نے اس موقع پر کہا

شرطِ تحریر پہلے سن لے پھر
خامے کو ہاتھ میں دلا لینا
نامۂ شوق اُن کو شوق سے لکھ
غیر کو بھی مگر دکھا لینا

میں نے کہا زبان کے آگے خندق نہیں ، میں خاکہ لکھوں گا اور آپ کو دکھا دونگا ، شرطِ تحریر بھی یہی تھی ، اگر پسند نہ آیا تو کہہ دوں گا کہ

گر نازنیں کہے سے بُرا مانتے ہو تم
میری طرف تو دیکھیے میں نازنیں سہی

اور اگر یہ بھی منظور نہ ہو تو اپنی مرضی سے کاٹ کوٹ کر کے خاکے کا وف مار لیجیے - آہ ! یوں کھینچی تصویر آدھی رہ گئی ، اب یہی نامۂ شوق پیش نمائش ہے -

میرے لیے سلیمان دہلوی کا خاکہ لکھنا ایسا ہی ہے جیسے غالبؔ کے لیے ذوقؔ کا قصیدہ کہنا ، یعنی اس مضمون میں جو بات سلیمان دہلوی کی خوبی بیان کرے ، پڑھنے والوں کو اسے سچ ماننے میں ذرا بھر تردد نہیں ہونا چاہیے کیونکہ "صادق ہوں اپنے قول میں" اور جہاں کسی خامی کا ذکر ہو تو اسے میرے رشک اور بدگمانی" ہوا ہے

شہ کا مصاحب" پر محمول کیا جائے اور درست نہ مانا جائے کیونکہ درست ماننے کی ایک وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ آپ نے بھی میری طرح ٹی وی پر جواں سال بوڑھے کا اشتہار دیکھا ہے۔ اس خاکے میں اچھائیوں کے معاملے میں غایت درجہ مبالغہ آرائی کی ذمہ داری میرے منہ زور قلم پر ہے۔ اس کے علاوہ، ستائش ممدوح کو بھی مرغوب ہے۔ خامیوں کے باب میں نکتہ رس انصاف پرور دلِ سلیمان کی اس بندۂ ناچیز سے مخفی گزارش ہے کہ

لکھ دیجیو فیصل اسے حصے میں عدو کے

یعنی سلیمان دہلوی کا خاکہ دوسروں کے خاکے میں دکھائی دینے کا سامان پیدا ہو گیا۔

ایک مشکل اور آن پڑی۔ اردو میں خاکہ لکھنے والے کو 'خاکہ نگار' کہتے ہیں۔ جس کا خاکہ لکھا جائے اس کے لیے کوئی لفظ کوئی ترکیب موجود نہیں۔ 'ممدوح' کہہ نہیں سکتے کیونکہ فقط مدح مقصود نہیں۔ 'محرک' کھردرا سا لگا۔ اسپ تخیل کو ہزار بار دوڑایا اور ہر بار وہ اُس گلی میں گیا اور سو گیا۔ پھر ایک اچھے دن، گزرگاہِ خیال فورم کے پروگرام 'جناب افتخار راغب کے شعری مجموعے 'غزل درخت' کی رونمائی' میں میری، بحرِ ظرافت و لطافت، بذلہ سنج، فنِ ندیمی میں طاق، شگفتہ مزاج جناب مرزا اطہر بیگ سے ملاقات ہو گئی۔ فرمانے لگے کہ 'خاکہ نشیں' کہہ لیجیے۔ کہا، یہ تو اسم کے بعد آ کر اسے اسمِ فاعل ترکیبی بنا دیتا ہے اس لیے ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ خاموش ہو گئے۔ میری اختراع پسند طبیعت کو اس مضمون کے باب میں اور بطورِ حرفِ نظر، یہ ترکیب بھا گئی۔ اور یوں سلیمان صاحب 'خاکہ نشیں' ٹھہرے۔

سلیمان دہلوی کی عمر ستر کے قریب ہے تاہم اپنی بزرگی اور تجربے کا لوہا منوانے کی خاطر اپنی عمر، اصلی عمر سے زیادہ بتاتے ہیں۔ تجربے کے اعتبار سے اس عجب مرحلۂ عمر میں ہیں جہاں ہر اچھی بات (دوسروں کی) بری بات نظر آتی ہے۔ اور ہر بری بات (اپنی) اچھی نہیں بلکہ بہت اچھی بات نظر آتی ہے۔ قد میانہ اور ہاڑ بھی میانہ، یعنی زیادہ چوڑا نہ تنگ، اونچی خوبصورت ناک، رنگ ایسا سانولا جو سانولا نہ لگے، سر کے بال سفید لیکن سر کے سامنے کی طرف سے بالوں کی شدید کمی کے باعث سفیدی مشاہدے میں نہیں آتی۔ کھنچی ہوئی بھنویں جو پرانی وضع کی عینک کے پیچھے سے کچھ کچھ دکھائی دیتی ہیں، لباس کے معاملہ میں سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود ہیں، یعنی ہمیشہ پاجامہ کرتا زیب تن کرتے ہیں۔ سردی ہو یا گرمی کرتے کی آستینیں چڑھائے رکھتے ہیں۔ بظاہر لا ابالی پر اندر سے سنجیدہ۔ اور خوبی بقول آپ "سب سے بہترین گالی دینا جانتا ہوں"۔

سلیمان دہلوی عاشق مزاج، رنگین طبع، لطیفہ سنج، ذکرِ شباب پر مچل جانے والے شاہد باز ہیں۔ زندہ دل ایسے کہ بزرگ ان کی صحبت میں بدحواس ہو جائیں اور جوان اپنا زانوئے تلمذتہ کرکے ان کی کیفِ شبانہ کی یاد سے نوجوانی کا سبق لینے لگیں۔ ستر برس کی عمر میں یہاں خواہشمندانِ تجدیدِ تمنائے نو قافلے کے سالار ہیں۔

کمر باندھے قطر میں آج بھی کچھ یار بیٹھے ہیں
جو بیاہے جا چکے اک بار پھر تیار بیٹھے ہیں

پیری میں وصالِ یار کسی صورت نہ پوری ہونے والی آرزو بن جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ آخری عمر میں فقط 'خیالِ حسن' سے بزرگوں کو پھریری آجاتی ہے، اور 'حسنِ عمل' کی خواہش میں کوچۂ دلدار میں جا کر عاشق شکن تجربہ ہوتا ہے کہ

ہم جن پہ ہر دم مرتے ہیں
وہ ہم کو دیکھ کے ڈرتے ہیں

دِلّی، جس کی خاک سے ایسی نابغۂ روزگار ہستیاں اٹھیں جنھوں نے اپنے کمال سے اردو کے دامن کو مرصّع و زرنگار بنا دیا، قالبِ گل میں ڈھلے سلیمان دہلوی اسی مردم خیز سرزمین کے گوہرِ گراں مایہ ہیں۔ دوحہ میں دِلّی کی ایسی یادگار اور کوئی نہیں۔ سلیمان صاحب اپنے علاوہ کسی دوسرے کو دل سے دِلّی کا نہیں مانتے۔ اگر دِلّی کے کسی صاحب سے ٹکراؤ ہو جائے تو بیخود دہلوی اور سائل دہلوی کا مشہور لطیفہ کارِ عمل لے آتے ہیں۔ ایک محفل میں دِلّی کے ایک صاحب سے ان کی ملاقات ہوئی۔ دورانِ گفتگو ان صاحب نے پوچھا کہ یہاں پر دِلّی سے اور کون کون لوگ موجود ہیں۔ سلیمان صاحب نے جواب دیا کہ "ایک آپ، ایک میں، اور آپ بھی کیا"۔ دوسرے صاحب بوجوہ "آپ بھی کیا" کا لطف نہ اٹھا سکے۔ اگر اٹھا سکیں تو آپ اٹھائیے۔

سلیمان دہلوی، مرزا نوشہ کے محلّہ دار ہیں، یعنی بلّی ماران کے ہیں۔ نخوت سے مرزا کو اپنا محلّہ دار بتاتے ہیں۔ مرزا کے خاص عقیدت مند ہیں، لیکن اس سے ذرا بھی مرعوب نہیں۔ مرزا کو کمتر نہیں سمجھتے اگرچہ میری طرح اسے کم سمجھتے ہیں۔ غالب کا شعر ہر کس و ناکس کو نہیں سناتے۔ کہتے ہیں کہ ایک دن ایک شخص کو غالب کا شعر سنا کر مجھے بہت دکھ ہوا۔ میں نے پوچھا کیوں؟ تو بولے کہ "وہ اس قابل نہیں تھا۔" غالب کے اکثر

فارسی زدہ مشکل اشعار انھیں ازبر ہیں جو وقتاً فوقتاً احباب کو مرعوب کرنے کی خاطر سناتے رہتے ہیں- سننے والا اپنی کم فہمی پر شرمندہ ہوتا ہے- یہ راز اب راز نہیں رہا کہ اکثر اس شعر کے معنی سے شعر سنانے والا اتنا ہی بے خبر ہوتا ہے جتنا سننے والا- غالب کا مصرع "شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے" ان پر صادق آتا ہے- ہر وہ شعر جس میں لفظ 'سلیمان' استعمال ہو، اسے اپنی فتراک کا نخچیر بنا لیتے ہیں، یعنی ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیتے ہیں اور با اہتمام وانصرام اکثر بے موقع پڑھ دیتے ہیں-

شعر کا انتخاب ایک بار وجہ محرومیت بن گیا- اپنی طالب علمی کی دور میں کالج کے ہر ہونہار طالب علم کی طرح تمنائی اور طالب مہر و وفا بھی تھے- ایک بت خود ان پر دل و جان سے فریفتہ اور مائل بہ کرم بھی تھا- اس صورتِ مہر نیم روز نے پہلی ملاقات میں شعر کی فرمائش کر دی- ایک آنچ کی کسر رہ گئی تھی کہ غالبؔ کی مشکل پسندی کی پسندیدگی لے ڈوبی اور انھوں نے اپنی 'گویم مشکل' زنبیل سے، مرعوب کرنے کی خاطر، مرزا کا یہ شعر سنا دیا-

تھیں بنات النعشِ گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

بد قسمتی سے یہ عقدۂ مشکل، مرغوبِ بتِ سہل، پسند نہ آیا- محبوب تھا تو غالبؔ کا طرفدار، پر شومئی قسمت نا سخن فہم تھا- شعر اور شعر سنانے والے کو 'فحش' سمجھ کر، یہ کہہ "ہائے اتنا گندہ" بھاگ کھڑا ہوا- تھوڑی دیر قبل کا سماں، جو خمارِ شوقِ محبوب، رستخیز انداز تھا، عاشق کو سپندِ بزمِ وصلِ غیر بنا کر گریے سے پنبۂ بالش کو کفِ سیلاب بننے کے لیے چھوڑ گیا-

سلیمان دہلوی کو مشاعروں سے خاص لگاؤ ہے- قطر میں مشاعرے کی روایت کو قائم کرنے اور اسے پروان چڑھانے والے پہلے شخص ہیں- مشاعرے کو فائیو اسٹار ہوٹل تک لے جانے کا سہرا بھی سلیمان دہلوی کے سر ہے- قطر کے ادبی منظر نامے پر یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ ان کی تنظیم انڈو قطر اردو مرکز کے مشاعرے، مشاعروں کا معیار جانچنے کا پیمانہ بن چکے ہیں- اپنی خاص طرز کے روایتی مشاعروں کے موجد بھی ہیں اور خاتم بھی- البتہ منکسر المزاج ایسے کہ دوسروں کے مشاعروں کو 'شعری نشست' کہتے ہیں- دادرسی، جس کو شاعر دادِ سخن کہتے ہیں، میں انھوں نے وہ مہارت بہم پہنچائی ہے کہ مشاعروں میں اکثر اپنے 'من پسند' شعراء کو داد اپنی کرسی پر سو کر پیش کرتے ہیں- داد کا یہ طریقہ پرانا اور مستند ہے جس کی ایک مثال جارج

برنارڈ شا بھی پیش کر چکے ہیں- کہتے ہیں کہ برنارڈ شا کے ایک دوست ڈارمہ نگار اور اداکار تھے- انھوں نے برنارڈ شا کو اپنے ڈرامے کا پاس بھیج کر ڈارمہ دیکھنے کی دعوت دی- برنارڈ شا تھیٹر پہنچ گئے اور کچھ دیر کھیل دیکھنے کے بعد اپنی نشست پر سو گئے- جب ڈارمہ اختتام کو پہنچا تو دوست بہت خفا ہوئے اور برنارڈ شا سے کہنے لگے کہ آپ نے ہمارے ڈرامے کے بارے میں اپنی رائے نہیں دی اور سوتے رہے- برنارڈ شا نے کہا کہ "سونا بھی تو ایک رائے ہے" - برنارڈ شا کے دوست کو اُن کی رائے سے کچھ 'افاقہ' ہوا یا نہیں، اس کا ذکر کہیں نہیں ہے، تاہم سلیمان صاحب کے ممدوح شاعر ان کے 'سونے' کو داد سمجھتے ہیں- اسی واسطے ان شعراء کی شاعری کا تنزل عروج پر ہے-

شعری نشستوں کا ذکر آیا، لیجیے بات میں بات نکل آئی- سلیمان صاحب احساسِ برتری کا شکار ہیں- ادبی نشستوں میں تصویر کھنچوانے سے احتراز کرتے ہیں مبادا ان کی شہرت کو دوسروں کی وجہ سے نقصان نہ پہنچ جائے یا ان کی وجہ سے دوسروں کو شہرت حاصل نہ ہو جائے- کسی بھی موضوع پر بحث کے لیے ہمہ وقت تیار اور ہر گفتگو کا ربط روایتی بزرگوں کی طرح اپنے تجربے سے جوڑ دیتے ہیں- اپنے تجربہ کو مستند ثابت کرنے کے لیے دوسروں کو ناتجربہ کار گرداتے ہیں- اپنے وہ تجربات جو زیادہ تر مشاعروں کے ضمن میں ہیں، کا اطلاق ہر چیز پر کرتے ہیں- ان کے تجربات کی آفاقیت کا قائل نہ ہونے کو بھی دوسرے کی ناتجربہ کاری بتاتے ہیں- مجھ سے اکثر 'شیر شاہ کی ڈاڑھی بڑی یا سلیم شاہ کی' کی طرح کے موضوعات پر بے تکان دلچسپ بحث ہوتی ہے، لیکن جب ان کو اندازہ ہوتا ہے کہ میں اِن کے تجربے کے باب میں 'وہ اِک نگہ کہ، بظاہر نگاہ سے کم ہے' کا قائل ہوں تو چیں بجبیں ہو جاتے ہیں- میں دل سے تو اِن کی تجربہ کاری، کارنجی اور فراست کا قائل ہوں لیکن 'چھیڑتا ہوں کہ اُن کو غصہ آئے" اور اس کا لطف لوں- جس طرح بسا اوقات لاعلمی بھی ایک نعمت ہوتی ہے اسی طرح کئی تجربات کا نہ ہونا بھی کسی نعمت سے کم نہیں- ۱۹۹۲ء کی امریکی صدارتی انتخابات کے دوران صدارتی امیدواروں کی آپسی بحث میں صدر سنئیر بش نے خود کو دوسرے امیدواروں، جن میں بل کلنٹن اور راس پیرٹ شامل تھے، سے تجربے کی بنیاد پر منفرد قرار دیا- راس پیرٹ، جو آزاد امیدوار تھے اور کسی پبلک آفس کا تجربہ نہ رکھتے تھے، نے کیا خوبصورت جواب دیا کہ "میں ناتجربہ کار ہوں- ہاں مجھے کئی کھرب ڈالر کی اکانومی کو ڈبونے کا تجربہ نہیں ہے-" سلیمان صاحب میری اس بات کو اسی انداز سے سنتے ہیں جیسے پیرٹ کی بات کو بش نے سنا تھا- یعنی سن کر نہیں سنتے-

دِلّی کی کرخنداری زبان، اس پر بے ساختگی اور روانی، پختہ اور شیریں لہجہ، تیز اور قابلِ حسد حسِ مزاح، ہر فقرہ سجا اور سنورا ہوا، اور خالص دہلوی محاوروں کا عام گفتگو میں چابکدستی سے استعمال، اِن کی گفتگو میں

ستارے بھر دیتا ہے- اپنی زباندانی اور دِلّی کی زبان پر مغرور ہیں اور کیوں نہ ہوں، ان کی زبان ہے ہی اس قابل- البتہ کبھی کبھار، خاص طور پر جب کسی کے تلفظ کی درستگی فرماتے ہیں تو تلفظ کی غلطی کر بیٹھتے ہیں- لیکن یہ بھی سچ ہے کہ مجھ سمیت یہاں بہت سے لوگوں کی زبان کی اصلاح اِن کے ٹوکنے سے ہوئی ہے، یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے- دِلّی والوں کی غلطی کو سند مانتے ہیں اور سند منوانا چاہتے ہیں- دِلّی کے اس طبقہ سے معلوم ہوتے ہیں جو مولانا الطاف حسین حالؔی کے نام کے ساتھ 'پانی پتی' کا اضافہ اُن کو 'نا اہلِ زبان' ثابت کرنے کے لیے کرتا تھا-

اپنی رائے کے بارے میں پختگی کے سب سے اونچے درجے پر فائز ہیں- اِن کی رائے کے خلاف، حق بات مع دلیل و ثبوت اِن سے منوانا جِن شیشے میں اتارنے اور سنگدل محبوبہ کے رام کرنے سے زیادہ مشکل ہے- اگر سورج کو سورج مان بھی لیں تو اپنی دلجوئی کی خاطر اس کی کوئی 'مناسب' تاویل تراش لیتے ہیں- بالکل ہمارے ایک دوسرے بزرگ دوست کی طرح جنھوں نے اپنی ایک تحریر میں املا کی غلطی کرتے ہوئے 'بدزن' لکھ دیا- جب اُن کو بتایا کہ درست 'بدظن' ہے تو مجھ سے بدظن ہو گئے- گہرے فکر کے بعد جب 'بد' اور 'زن' کو الگ کر کے دیکھا اور پوری ترکیب کا مطلب سمجھ میں آیا تو مزید 'بدظن' ہو گئے اور بولے "میری ترکیب بہتر اور زیادہ پر لطف تھی- تمہاری اصلاح سے زبان کا مزہ دب گیا اور اس کی تاثیر جاتی رہی-"

تمھیں انصاف سے اے حضرتِ ناصح کہہ دو
لطف اِن باتوں میں آتا ہے کہ اُن باتوں میں

اِن کے سامنے دوسرے کی خوبی بیان ہو تو خاموشی اختیار کرتے ہیں- خود پسند واقع ہوئے ہیں- اپنی تعریف سن کر نہال ہوئے جاتے ہیں- کوئی سنے یا نہ سنے، کوئی مانے یا نہ مانے اس سے ان کو کچھ بحث نہیں، بے کھٹکے بے جھجکے اپنی خوب تعریف کرتے جاتے ہیں- یہ طریقہ اسقدر برا بھی نہیں کیونکہ عام روش ہے کہ کسی کی اچھی بات کو اہتمام سے چھپا لیا جاتا ہے اور بری بات کی خوب تشہیر کی جاتا ہے- ایسا اگلے زمانے میں بھی ہوتا تھا، نظیر اکبرآبادی نے یونہی تو نہیں کہا تھا کہ

یہ ستم دیکھو ذرا منہ سے نکلتے ہی نظیر
اِس نے اُس سے اُس نے اُس سے اُس نے اُس سے کہہ دیا

طبیعت میں ردِ عمل کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہے- ان کی سعی ردِ عمل سے کسی کو نقصان ہو یا نہ ہو اس سے انھیں کوئی علاقہ نہیں- 'لطف کن لطف کہ بیگانہ شود حلقہ بگوش' کا سبق سن کر جز بز ہو جاتے ہیں- ایک گاؤں میں ایک صاحب نے اپنے اکلوتے فرزند کے ولیمے کی دعوت کھلے میدان میں رکھی، ایک تو موسم خوشگوار تھا اور دوسرے اتنے سارے لوگوں کی دعوت ایسی کھلی جگہ پر ہی ہو سکتی تھی- دعوت سے کچھ دیر پہلے، اُن صاحب کو یاد آیا کہ گاؤں کے مولوی صاحب کو تو دعوت دی ہی نہیں- فوراً دوڑے اور مولوی صاحب کے گھر پر جا کر کہا کہ "بہت معذرت، میں آپ کو بلانا بھول گیا تھا- اب دعوت دینے آیا ہوں، تشریف لے چلیے-" مولوی صاحب نے ناراضگی سے پہلو بدل کر فرمایا "اب کوئی فائدہ نہیں، میں بارش کی دعا مانگ چکا ہوں-" عموماً سلیمان دہلوی صاحب کے شدید ردِ عمل کا نتیجہ بھی، ان مولوی صاحب کے ردِ عمل کی طرح تباہ کن نہیں ہوتا- سر آئزک نیوٹن کے تیسرے قانونِ حرکت "ہر عمل کا ایک مساوی اور مخالف ردِ عمل ہوتا ہے" کی آدھی تصدیق کرتے ہیں- یعنی صرف وہ چیز جو ان کی طبیعت کے خلاف ہو، کے جواب میں غیر مساوی ردِ عمل کا مظاہرہ کرتے ہیں- مجھ سے فرمانے لگے "تم میرا خاکہ لکھو میں 'جوابی خاکہ' لکھوں گا-" اِن کی یہی عادت دوستدار دشمن ہے- اگر کہیں سو لوگ ہوں تو پچاس کے یہ دشمن ہیں اور بقیہ پچاس ان کے دشمن ہیں- حیف اس عجوبۂ روزگار بلغمی مزاج کو یہی راس ہے-

گر یوں ہوا تو کیا ہوا، اور ووں ہوا تو کیا ہوا

جہاں حق گوئی ان کی عادت ہے وہاں طبیعت میں بدگمانی نے بھی گھر کر لیا ہے، لیکن اس کے باوجود خوش مزاجی ایسی کہ ہر وقت ایک دل موہ لینے والا تبسم چہرے پر کھیل رہا ہوتا ہے- میں نے ان کو کبھی بھی روکھی صورت بنائے نہیں دیکھا- فنِ گفتگو میں طاق ہیں- ایسے منجھے ہوئے جادو بیاں مقرر اور خطیب ہیں کہ جس محفل میں ہوں سماں حکیم مومن خان مومن کے اس شعر کا سا بن جاتا ہے

مومن بخدا سحر بیانی کا جبھی تک
ہر ایک کو دعویٰ ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

ان کے حظ بھرے اقوال و اعمال کی ایک طویل فہرست ہے- کچھ نقل کیے دیتا ہوں- آپ بھی لطف اٹھائیے:

1- فارسی کی مثل 'کار از دست رفتہ، تیر از کمان جستہ باز نمی عاید' میں یوں اضافہ کیا ہے کہ لڑائی ختم ہو جانے

کے بعد جو مُکّا یاد آئے، اسے اپنے منہ پر مار لینا چاہیئے۔

۲ وہ آدمی اچھا نہیں اور شکل بھی اچھی نہیں۔

۳ یہ دیوار کی بلی ہے، دونوں طرف آنکھیں ہیں، جس طرف مطلب کی چیز دیکھتی ہے کود جاتی ہے۔

۴ یہ شخص عذاب جاریہ ہے۔

۵ آدمی تو اچھا ہے پر شاعر بھی تو ہے۔

۶ غالب کے شعروں کو سمجھنے سے زیادہ ان کی تشریح سمجھنا مشکل ہے۔

۷ اردو کی خدمت کرنے کے بہانے لوگ اردو سے خدمت لے رہے ہیں۔

۸ جس کی دُم اٹھاؤ، جنفی نظر آتا ہے۔

۹ قطر کی مشہور شخصیت محمد صبیح بخاری کو ذیابیطس کی تشخیص ہوئی تو ان سے کہنے لگے "میاں مبارک ہو، لمبی عمر پاؤگے۔"

۱۰ یہی بخاری صاحب جو پچاس کے پیٹے میں ہیں، کے دو دیرینہ دوست یکے بعد دیگرے جہاں سے گزر گئے - ان کو اداس دیکھ کر کہنے لگے "میاں اب عادت ڈال لو۔"

۱۱ سنا ہے کہ ایک صاحب نے ان پر بہتان لگایا، ان کا ناریل چٹک گیا، اُن کو ڈھونڈ کر سامنے کھڑے ہو، دلی کی خالص زبان میں ۲۲ گالیاں انگلیوں پر گن کر عطا کیں اور پوچھا کہ "ابے، اب بتا اس سے پہلے بھی کوئی ایسی گالی سنی ہے۔"

۱۲ سگرٹ نوشی کے بارے میں راسخ العقیدہ ہیں کہ مرنے والوں میں سگرٹ نوشی نہ کرنے والوں کی تعداد سگرٹ نوشی کرنے والوں سے زیادہ ہے۔ یعنی طویل عمری کا راز سگرٹ نوشی ہے۔

۱۳ نااہل لوگوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں کہ ان ہی کی بدولت ہم ایسے اہل کمال کی قدر ہے اور غالب کا یہ مصرع دوہرا دیتے ہیں- 'لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی'

۱۴ میں نے یہ خاکہ سنا کر زبان کی تعریف سننا چاہی تو بولے "میاں صحبت کا بھی تو کچھ اثر ہوتا ہے۔"

۱۵ ایک شاعر نے ان کا گھر دیکھ لیا اور بلاناغہ ہر روز اپنا کلام سنانے آنے لگے- مارے مروت کے کئی روز تک صبر کی سل چھاتی پر رکھ کر صبر ایوبی کا مظاہرہ کرتے رہے کہ ایک دن صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اُن کو صحن میں لے جا کر ایک موٹا سا ڈنڈا دکھایا اور شفقت سے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ "میاں یہ ڈنڈا میں نے شاعروں اور بلیوں کے لیے رکھا ہوا ہے۔"

۱۶ برسبیلِ تذکرہ مرزا ہادی رسوا (امراؤ جان ادا والے) میں نے کہا کہ مرزا صاحب ایک بار بازار گئے اور دیکھا کہ پنساری اُن کی تحریر کے مسودے کے صفحوں میں لوگوں کو سودا سلف لپیٹ کر دے رہا ہے- دکاندار سے استفسار پر معلوم ہوا کہ مرزا صاحب کے لائق فرزند نے اُن کی غیر مطبوعہ تحریروں کے مسودے ردّی کے

مول پنساری کو فروخت کر دیے ہیں۔ یہ سن کر سلیمان صاحب گویا ہوئے کہ " کیا اُس زمانے کی اولاد بھی ایسی ہوتی تھی جیسی آج کل کی ہے۔ چلو نوجوان ماضی سے رشتہ جوڑے ہوئے تو ہیں؟"

کچھ زندہ دلی ، ردِ عمل ، جوش ، بے باکی
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے سلیمان

نخش لطیفہ گوئی میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں لیکن اپنی اس صلاحیت کو صرف نجی محفلوں میں بروئے کار لاتے ہیں۔ باتیں ہزار ہیں شدتِ ابتذال کے سبب سے قلم انداز کرنے کے سوا چارہ نہیں۔

سلیمان دہلوی، اردو زبان اور دِلّی ایسے لازم و ملزوم ہیں جیسے منصور الحلاج اور دار و رسن۔ دوحہ میں جب دِلّی کا ذکر ہوتا ہے تو علامہ اقبال کی طرح سوادِ رومۃ الکبریٰ میں دِلّی یاد آئی تھی، وہی عظمت وہی عبرت وہی شانِ دلاویزی کی تفسیر بن جاتے ہیں۔ سچ بھی یہی ہے کہ دوحہ میں یادگارِ بزمِ دِلّی ایک سلیمان ہی تو ہے۔ دِلّی کی تہذیب اور تاریخ سے اِن کو اسقدر لگاؤ اور واقفیت ہے کہ بسا اوقات وحشت ہونے لگتی ہے۔ ہمہ گیر مشاہدہ، زبان و بیان پر قدرت، ذہانت، تفکر، تدبر، زبان کا چٹخارہ، اسلوب کی دلکشی، فقروں کی لطافت اور حسن، اور بے تکلفی سے اپنی نثری تحریروں میں آسمان کے تارے توڑ لاتے ہیں۔ سلیمان دہلوی کے مضامین پیرو مہترانی، میر صاحب اور دیگر کئی منفرد اسلوب اور طرزِ خاص کی بدولت اس دور میں اردو ادب کے شاہکار کہلانے کے مستحق ہیں۔ صاحب زبان اور شکر گفتار ہیں، اس لیے تحریر میں جو چاشنی ہے وہی گفتگو میں ہے۔ یا پھر گفتگو کی چاشنی تحریر میں در آئی ہے۔ اِن کی صحبت میں وقت رک جاتا ہے۔ نواب مرزا خان داغؔ کا یہ شعر صرف داغؔ پر نہیں، سلیمان دہلوی کی معجز بیانی پر بھی اسی طرح صادق آتا ہے

نثار اس طرزِ گفتگو پر نہیں کہیں داغؔ سا سخنور
ہنسا دیا ہے رلا رلا کر، رلا دیا ہے ہنسا ہنسا کر

سلیمان صاحب کی شخصیت کا ایک پہلو اس قدر تابناک ہے کہ جس کی توصیف کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔ اِن کی بیگم مرحومہ ہاجرہ بانو، دوحہ کی مشہور علمی اور ادبی شخصیت تھیں۔ قطر ریڈیو اور انڈو قطر اردو مرکز کے تعلق سے اردو کے لیے قطر میں اُن کی خدمات بیش بہا ہیں، جن کے تذکرے کے لیے ایک باقاعدہ کتاب لکھنے کی ضرورت ہے۔ ہاجرہ بانو صاحبہ ایک طویل عرصے سے علیل تھیں، جس محبت، صبر، ذمہ داری اور اپنی جان کو

جان نہ سمجھتے ہوئے سلیمان صاحب نے قریباً پچیس برس اُن کی تیمارداری اور دلجوئی کی اور ہر لمحہ، اپنی ہر مصروفیت کو پس پشت ڈال کر، اُن کے ساتھ رہے، کی مثال میں نے آج تک سنی نہ دیکھی۔ کہتے ہیں کہ آخری عمر میں میاں بیوی میں سے ایک گزر جائے تو دوسرا خود بخود مر جاتا ہے۔ پچھلے برس بانو صاحبہ عدم کو آباد کرنے کی خاطر اپنے پیاروں کو تنہا چھوڑ گئیں۔ یہ عمر اور یہ غم، لیکن سلیمان دہلوی یہاں بھی منفرد نکلے۔ میاں بیوی کا آپس میں تعلق ایسا تھا کہ جس پر دنیا رشک کرے، اس کے باوجود سلیمان صاحب نے جس مضبوط اعصاب کے ساتھ یہ صدمہ سہا، اس کی مثال بھی ڈھونڈے نہیں ملتی۔ سنا ہے کہ ممتاز محل کے مرنے کے بعد غم کے مارے شاہجہاں کے سر کے بال چند ہفتوں میں سفید ہو گئے تھے۔ جبکہ سلیمان صاحب کے بال بانو صاحبہ کے انتقال کے چند دن بعد ہی سفید ہو گئے۔ شاہجہاں میں اور ان میں فرق یہ ہے کہ شاہجہاں کی 'سیاہ کاری' کا تعلق ممتاز محل کی زندگی میں بھی شباب سے تھا، خضاب سے نہیں۔

سلیمان دہلوی، بسا اوقات نا قابلِ برداشت، پر مجموعی طور پر انتہائی قابلِ محبت انسان ہیں۔ میں ان کو کم کم "بشر ہے کیا کہیے" کے زمرے میں رکھتا ہوں، زیادہ تر وہ مجھے "تم بشر نہیں خورشید و ماہ ہو" کی تصویر نظر آتے ہیں۔ میری خوش نصیبی ہے کہ مجھ پر خاص شفقت فرماتے ہیں۔ میں بلا خوفِ ابطال یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ سلیمان دہلوی کی ہفت رنگ شخصیت ایسی ہے کہ قطر میں رہتے ہوئے یا قطر آ کر ان سے نہ ملنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی آگرہ گیا اور تاج محل دیکھے بغیر لوٹ آیا۔

☆☆☆

شہرِ استقبال

سفر نامہ

'چند سیپیاں سمندروں سے'

● عتیق اللہ

بیانیہ جو ابھی ادھورا ہے:

"Narratives are everywhere, performing countless different functions in human interactions." 'Narrative, A Critical, Linguistic, Introduction'.

Michael J. Toolan

ہر شخص ایک بیانیہ ہے۔ اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی۔ اپنے آپ کو رقم کرنا، ایک بیانیہ کو زبان دینا ہے۔ ہمارے لیے دوسرے بھی بیانیہ ہیں، جو ہماری ہی طرح ایک مخصوص تناظر بھی رکھتے ہیں۔ کسی کے لیے اپنی زندگی پوری ایک جنگ ہے۔ کسی کے لیے عیش ہی عیش۔ کسی کے لیے محض ایک سوال، ایک شبہہ، ایک وہم۔ جب ہم کسی ضد سے دوچار ہوتے ہیں۔ جب ہمیں کسی ناآہنگی کا سامنا ہوتا ہے تو ایک تصادم کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ آسائشِ اربابِ غفلت کا بھرم ٹوٹ جاتا ہے اور ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہم زندہ ہیں، زمین کے کسی ٹکڑے پر ہم کھڑے ہیں اور وقت کی زد میں ہیں۔ لیجیے بیانیہ رقم ہوگیا۔ رقم ہوگیا لیکن ابھی ادھورا ہے۔ تماشہ ابھی ناتمام ہے۔ کیوں کہ تماشے کا تمام ہونا بیانیہ کا تمام ہونا ہے اور بیانیہ کا تمام ہونا زندگی کے لیے موت ہے۔ زندگی کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے بیانیہ کا جاری رہنا ضروری ہے اور بیانیہ کو جاری رکھنے کے لیے تصادم ضروری ہے اور تصادم کے لیے بہرحال اپنی ان عیش گاہوں کو تیاگنا ضروری ہے جو ہماری پناہ گاہیں بھی ہیں۔ جب تک کہ کوئی سودا سر میں نہ سمایا ہو۔ سود و زیاں کے پھیر سے ہم باہر نہ نکل گئے ہوں، دیوانگی کو ہم نے اپنا وطیرہ نہ بنالیا ہو۔ بیانیہ ایک بے نقط بیانیے کے مماثل ہے۔

☆

پروین شیر کا بہ ظاہر ایک مستقر ہے جس کا نام ونی پیگ (کناڈا) ہے، بہ باطن ان کا کوئی گھر نہیں ہے۔ گھر، عافیت کا استعارہ ہے اور پروین کو جو دل ملا ہے وہ بقول غالب 'وہ دلِ وحشی' کہ ہے 'عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا'۔ پروین کے لیے زندگی ایک مستقل سوال ہے، جواب کی تلاش: انھیں شعر کی ترغیب دیتی ہے۔ جواب کی تلاش انھیں موسیقی کی راہ مہیا کرتی ہے، جواب کی تلاش انھیں ہلکے گہرے رنگوں اور لکیروں کے سمندر میں غوّاصی کے لیے اکساتی ہے۔ انھیں ہر مقام پر بہت کچھ ملتا ہے پھر بھی کسی کمی کا احساس انھیں مستقل بے چین کیے رہتا ہے اور وہ جواب کی تلاش میں سفر کے لیے نکل پڑتی ہیں کہ ہر سفر ایک بیانیہ ہے۔

☆

پروین نے ساؤتھ افریقہ کے سفر سے مقامِ واپسیں تک اپنی سرگزشت کو بیانیہ کا رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔ شاید اسی لیے اپنے آپ کو وہ اس سفرنامے میں ایک کردار کے طور پر خلق کرتی ہیں۔ جیسے راوی کوئی دوسری ہستی ہے اور پروین کوئی دوسری ہستی۔ ممکن ہے انھیں یہ شبہہ ہو کہ کہیں 'آئی' یعنی 'میں' کسی خاص مرحلے پر غیر محسوس طریقے سے پروین کی بے نفسی اور بے غرضی کے آڑے نہ آجائے۔ پروین کو شعورِ ذات تو ہے حبِ ذات نہیں۔

پروین کا سفر ایک ایسا سفر ہے جو کہیں ایک روحانی واردات بن جاتا ہے۔ کہیں انھیں ایسی سرزمین سے دوچار کراتا ہے جو زخموں سے چور ہے، ایسا سمندر ملتا ہے جس کا پانی کالا ہے۔ ایک خلقت ہے جو اپنی بے کسی، بے بسی اور بے چارگی میں کسی دوسرے سیارے کی مخلوق نظر آتی ہے۔ زمین ایک ہے، گلوب ایک ہے لیکن مقدرات ایک نہیں۔ کہیں افراط ہے تو بے انداز ہے، کہیں کمی ہے تو اس کی کوئی تھاہ نہیں۔ پروین کسی جنت نگاہ کی تلاش میں وادیِ غربت کی راہ نہیں لیتی ہیں۔ کسی موسمِ سازگار کی جستجو ان کا مقصود نہیں ہے۔ وہ تو دنیا کے ان کونوں کھدروں کو دیکھنے کی آرزومند ہیں جہاں تاریخ کے زخم تاہنوز تازہ ہیں۔ جہاں معصومیتیں خود اپنے لیے سزا بن گئیں۔ جہاں کے ماضی کی خوں رنگ خراشیں ابھی بھی زبانِ خاموش سے ہزاروں ہزار المناک داستانیں رقم کر رہی ہیں۔ جہاں دکھوں نے ڈیرے جمار کھے ہیں۔ وقت جیسے رک سا گیا ہے۔

☆

مجھے مختلف ممالک کی تاریخ اور تہذیب کے بارے میں جاننے کا بہت پرانا شوق ہے۔ لیکن پروین کے سفرنامے 'چند سیپیاں سمندروں سے' سے اپنی لاعلمی کا شدید احساس ہوا۔ وہ یہ باور کراتی ہیں کہ دنیا چھوٹی نہیں ہے ہمارے پاؤں ہی چھوٹے ہیں۔ ایسے کئی مقامات ہیں جہاں پروین چونکاتی ہیں۔ کئی نئے جہانوں سے ہمارا تعارف کراتی ہیں۔ یہ بتاتی ہیں کہ سوآزی لینڈ، Southern Hemisphere کا سب سے چھوٹا ملک، میں واقع ذولوگاؤں بھی ہے جس کے باشندوں کا طرزِ زندگی، قبل از تاریخ کے اس

زمانے کی یاد دلاتا ہے جسے حجری دور Stone Age کہتے ہیں۔ ساؤتھ امریکہ میں 'انکا' تہذیب کے باقیات میں ایسے عقائد اور اوہام پر سے بھی وہ پردہ اٹھاتی ہیں، جو صدیوں سے چلے آرہے ہیں۔ 'انکا' تہذیب کو اسپین والوں نے بہت نقصان پہنچایا لیکن وہ پتھروں میں آج بھی زندہ ہے۔

☆

کسی کے لیے سفر کا مقصد تفریح ہوتا ہے، کسی کے لیے شوق کی آسودگی، کسی کے لیے پناہ گاہ کی تلاش، کسی کے لیے روزگار کا ذریعہ اور کسی کے لیے نامعلوم حیرتوں کو اخذ کرنے کی جستجو۔ دوری سب میں مقدر ہے اور دوری distance میں اپنا ایک رومان ہوتا ہے۔ میلوں کا فاصلہ ہو کہ صدیوں کا، ہر دوری ایک علیحدہ نوعیت کا انکشاف ہوتی ہے، ایک علیحدہ نوعیت کی حیرتوں کا سرچشمہ۔ انکشاف و حیرت کی یہی صورتیں کسی کے تخیل اور وجدان کے تئیں مہمیز کا کام کرتی ہیں اور دوری ایک بڑا سبب بن جاتی ہے اس کی تخلیقیت کو حرکت میں لانے کا۔

اردو سفرنامے کی تاریخ میں غالباً پروین وہ پہلی مسافر ہیں جنھیں سکون کی چاہ سے زیادہ دل و دماغ کے سکون کو غارت کرنے والی ان زندگیوں کی تلاش ہے، جنھوں نے آسائش کا نام سنا ہے لیکن آسائش ان کے تجربے سے کوسوں دور ہے:

> ''سوئیٹو کی گلیوں نے اس (پروین) کو تھام کر یہ احساس جگایا تھا کہ سیاحت صرف جمالیاتی ذوق کی تسکین نہیں — کھردری بدصورتی کی آگہی کا نام بھی ہے۔''

پروین کے اندر جذباتی طور پر خود کو اضطراب میں ڈالنے اور کسی نہ کسی ذہنی خلش میں مبتلا ہونے کی ایک ایسی تڑپ کو محسوس کیا جا سکتا ہے جو ہر آن انھیں نفسِ باطن سے ماورا the other self کو جاننے کی طرف مائل رکھتی ہے۔ ایک سطح پر ہر فن کار کے تخلیقی اظہار کا ایک قصد کشوِ ذات کے ساتھ خصوصیت رکھتا ہے۔ لیکن بعض ایسے دیوانے بھی ہیں جنھیں کشوِ ذات یا تسلیم ذات کے برعکس فنائے ذات self-destruction سے نسبتِ خاص ہوتی ہے۔ پروین کا شمار، میں زمرۂ دوم کے فن کاروں میں کرتا ہوں۔ پروین کی ذات، اپنے محدود معنی میں نفس باطن کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ذات ہر دوسرے نفس باطن سے اپنا ادراک کرتی ہے۔ جو اسی دنیا کے ساتھ وابستگی اور شرکت کا دم بھرتی اور تدریجی طور پر نشو و نمو پاتی ہے، جسے اپنا عرفان حاصل ہوتا ہے اس فطرت سے جو ایک عظیم ماں کا درجہ رکھتی ہے۔ ان انسانوں سے جو معلوم کم نامعلوم زندگی گزارنے پر زیادہ مجبور ہیں۔ اسی دنیا میں ایسی مخلوق بھی ہے جس کے پاس دولت و ثروت کی کوئی حد ہے نہ کوئی حساب، صارفی تہذیب کا جنھوں نے جال بچھا رکھا ہے لیکن ان کی اغراض جذبوں سے عاری ہیں۔ ان کی توجہ کا مرکز صرف ان کی ذات ہے۔ ان کی سماعتیں صرف اپنی آوازیں سنتی ہیں۔ غربت کا

نام انھوں نے کتابوں میں پڑھا ہے۔ بدحالی کے معنی سے وہ نابلد ہیں۔ فطرت ان کے نزدیک ایک غیر ذی روح مظہر کا نام ہے۔ پیرو میں پروین فطرت کے ایک مسحور کن پیش و پس سے دوچار ہوتی ہیں تو انھیں 'انکا' (Incas) پر رشک آتا ہے، جنھوں نے فطرت کے آغوش میں نشو و نما پائی ہے اور شہروں کی اُس صرف و حاصل گزیدہ دنیا سے دور اپنی بستیاں بسا رکھی ہیں جسے تھامس گرے نے Far From the Madding Crowd کے نام سے یاد کیا ہے:

"قدرتی حسن کی بانہوں میں جا کر اسے (پروین کو) اس کی پہچان
بھی واپس مل جاتی ہے... سوچ کی خشک رگوں میں قدرتی حسن خون
بن کر رواں ہو جاتا ہے۔ منجمد لطیف احساسات پگھلنے لگتے ہیں۔"

گویا پروین کی اپنی ذات، فطرت اور انسان سے ابدیت کا سراغ پاتی ہے۔ وہ تنہا ہوتے ہوئے بھی تنہا نہیں ہوتیں۔ گو تنہائی کو وہ ایک بہتر رفیق مانتی ہیں۔ دراصل انسان جب تنہا ہوتا ہے تو وہ اپنے آپ کو اپنے سے بے حد قریب پاتا ہے۔ لیکن ذات یا اَنا سے پرے ہو کر ہم یک لخت لامحدود infinite کو چھونے لگتے ہیں۔ انسان جتنا اپنے آپ کو اپنے سے قریب تر پاتا ہے اس سے زیادہ وہ اپنے ہاتھ سے اپنے آپ کو کھو بھی دیتا ہے کیوں کہ وہ تمام چیزیں جو اس کی رسا میں ہیں جیسے فطرت کا کھلا ہوا وسیع تر میدان، اپنے پیش و پس، دائیں بائیں تمام بکھری ہوئی اشیا، اچھے برے انسانوں کے طرف طرف ہجوم ان سب کے ساتھ ہی ہماری توثیق ذات بھی مشروط ہے۔ پروین کو اپنے وجود کو ریزہ ریزہ ہر چار طرف پھیلانے میں زیادہ مسرت حاصل ہوتی ہے۔ ان کا یقین monogenesis نظریے پر استوار ہے کہ تمام ذی روح مخلوقات ایک ہی خلیے سے خلق ہوئی ہے۔ اس معنی میں ہم سب ایک دوسرے سے ہم رشتہ ہیں۔ یہ سارے رشتے ہماری ذات کو کوئی معنی فراہم کرتے اور ہمیں اپنے ہونے کا یقین دلاتے ہیں۔ ان سے محروم ہونے کے معنی اپنے سے محروم ہونے کے ہیں۔ پروین کے لیے بھی ان رشتوں کی خاص اہمیت ہے۔ ان کا رشتہ تمام بنی نوع انسان سے ہے۔ اپنے چاروں طرف اپنے اپنے کاموں میں الجھی ہوئی خلقت سے ہے۔ پیڑ، پودوں، بے جان چیزوں جیسے آسمانوں سے اترتی ہوئی روشنی، آہستہ آہستہ حواس پر دستک دیتی ہوئی پھولوں کی خوشبو، ہلکے ہلکے تھپکیاں دیتی ہوئی ہواؤں، دریا، پہاڑ، ستاروں اور لاکھوں لاکھ کہکشاؤں سے معمور آسمان اور سیاروں کے وجود کو محسوس کرنا ان کے لمس سے سرشار ہونا ہے اور دوسرے لفظوں میں زندگی کے ایک نئے معنی سے روشناس ہونا ہے۔ پروین اپنے سفر کی ساعتوں میں اپنا یہ درس کہیں نہیں بھولتیں۔ پھر بھی کچھ ایسے سوالات انھیں بار بار بے چین کرتے رہتے ہیں جن سے آج کی عمومی دانش بھی جوجھتی رہتی ہے۔

- اس لامتناہی کائنات کی حد کیا ہے؟
- اس کا سرا کہاں ہے؟ شروع کہاں اور ختم کہاں؟

- یا پھر لامتناہی؟
- خلا میں بکھری ہوئی اور کتنی دنیائیں ہیں؟
- کائنات کے تخلیق کار کی اس کاریگری کی وجہ کیا ہے؟

اس معنی میں پروین کا سفر ایک ایسے فلسفیانہ ذہن کے حامل مسافر کا سفر ہے جو ہمیشہ وجودی اور مابعدالطبیعیاتی مسائل میں الجھا رہتا ہے۔ ہر چیز اس کے لیے سوال ہے۔ جس کا جواب اسے کہیں نہیں ملتا اور مل بھی نہیں سکتا کیوں کہ یہ سوال آج کے نہیں ہیں۔ صدیوں پرانے ہیں۔

☆

پروین کو ان سیاحوں کی بے حسی عجیب سی لگتی ہے جنھیں نہ تو انسان کے نفسِ باطن میں اترنے سے کوئی غرض ہے جو ان کے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔ نہ پہاڑوں، سمندروں، سبزہ زاروں کے جادو کا ان پر کوئی اثر ہوتا ہے نہ اس نابینا مغنی کی درد آگیں آواز انھیں چونکاتی ہے جسے شہر پونو (ساؤتھ امریکہ) میں پروین نے دیکھا تھا اور تھوڑی دیر کے لیے وہ اپنے باطن میں اتر جاتی ہیں۔ وہ اس کی منفرد واندرونی دنیا کے بارے میں سوچتی ہیں جس کا دروازہ کہیں اور کھلتا ہے:

> ''پروین اس انوکھے ساز سے نکلتی ہوئی دھن کے رس کو نچوڑ کر اس کی مٹھاس رگ و پے میں محسوس کر کے سرشار بھی تھی اور دوسرے راہ گیروں کی اس محرومی پر حیرت زدہ بھی۔''

☆

دنیا جیسی بھی ہے اسے ایک مستقل امکان کے طور پر قبول کرنے میں پروین جس لذت کے احساس سے گزرتی ہیں اس کا ایک عکسِ لطیف ان کی شاعری میں بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس کا تجربہ ان تصویروں میں محفوظ شبیہوں اور ہلکے گہرے رنگوں کے ظاہر اور باطن میں بھی کیا جا سکتا ہے جن میں حقیقت اور تجرید، سائے اور روشنی نے مل کر ایک سالم تجربے کی صورت اختیار کر لی ہے۔ وہی انسانی جوہر Human Essence جو پروین کی پینٹنگز میں تہہ بہ تہہ کارفرما ہے، شاعری میں لفظوں کی روح کے طور پر نمایاں ہوتا ہے اور سفرنامے کی مشمولہ نظموں میں اس کے اظہار کی ممکنتیں اپنے لیے کچھ زیادہ ہی گنجائش نکال لیتی ہیں۔ ان نظموں کی ایک خاص جہت ان کے ناراست طرزِ اظہار میں نمایاں ہے، جس میں پروین نے جا بجا زبان کے اس جوہر کو آزمایا ہے، جسے استعارہ کہتے ہیں۔ اسی چیز نے ان نظموں کو محض بیان ہونے سے بچا لیا ہے۔ مثلاً 'سیاہ روشنی' نام کی نظم کیا ہے۔ انسان کی درندگی اور اس کے پہلو بہ پہلو انسان کی بے بسی اور پھر اس کے حوصلوں اور قربانیوں کی پوری داستان ہے۔ جو سیاہی سے شروع ہوتی ہے اور اس کا خاتمہ اجالے پر ہوتا ہے:

> سیاہی کی آنکھوں سے چھلکی ہوئی

روشنی کی شعاعوں نے سرگوشیاں کیں
"مری ہر رگِ جاں کی لہروں پہ رقصاں ہیں
قوسِ قزح کے حسیں رنگ سارے
گلابی، ہرے، نیلگوں، زرد رنگوں
کا ہے اک مرکب یہ رنگ میرا
مگر اس سیاہی کے سینے میں جگنو کی تابندگی ہے!
یہ یک رنگ پیکر تمھارا
کہ جس میں دھنک رنگ کا کوئی امکاں نہیں ہے
یہ روشن سراپا تمھارا
کہ جس میں نہاں ہے اندھیرے کا یخ بستہ خنجر
اگر اس نے چیرا سیاہی کا سینہ
اجالے کا بپھرا سمندر نگل جائے گا ظلمتوں کو ـــــ!"

☆

پروین نے ساؤتھ افریقہ کے باب کو 'سیاہ روشنی' کا نام دیا ہے اور ساؤتھ امریکہ کے سفر کو 'طلسمی جہاں' سے موسوم کیا ہے۔ پروین اس سیاہ روشنی کی تہوں میں ڈوب کر ان دنوں کے سراغ کے لیے نکلی تھیں، جب نوآبادکار مقامی باشندوں کو جانور سے بھی حقیر اور بدتر سمجھتے تھے۔ فرانز فینن نے اس ضمن میں Black Skins White Masks (1967) میں نوآبادکاروں کے عہد مظلمہ کے بارے میں ان حقائق کی طرف بالخصوص واضح اشارے کیے ہیں کہ مقامیوں کو کس طرح پاگل، گنوار، اجڈ اور وحشی کے طور پر دیکھا جاتا تھا یعنی ایسی ہستی جو انسان نہیں، انسان سے کچھ کم ہے۔ ان کے لیے بعض حیوانیاتی اصطلاحوں zoological terms کا استعمال بھی کیا جاتا تھا۔ جیسے وہ کوئی غیر انسانی چیز dehumanised object ہیں جن کا کوئی تشخص ہے اور نہ کوئی شناخت۔ پروین نے حقیقت کے اس اذیت ناک پہلو کی بھی پردہ دری کی ہے کہ جنوبی افریقہ اپنے جلو میں نوآبادکاروں کے ظلم و ستم کی جو تاریخ رکھتا ہے اس کے باب ایفرو ایشیا ہی نہیں جنوبی امریکہ کے کئی ملکوں تک بکھرے پڑے ہیں۔ جہاں نسلی علیحدگی کے قوانین اور بے رحمانہ جسمانی قوتوں اور جذباتی و اقتصادی استحصال نے قدیم باشندوں کی زندگی کو ایک ڈراؤنے خواب میں بدل دیا تھا۔ فرانز فینن نے اسے power structure of the discourse of colour سے تعبیر کیا ہے۔ دوسرے معنی میں جس کا مطلب یہ ہے کہ سفیدی whiteness مکمل ہے اور سیاہی blackness ہمیشہ کے لیے نامکمل ہے۔ 'سیاہ روشنی' میں 'وقت سے پرے' والا باب اس سفرنامے کا

حاصل ہے جس میں پروین نے حقیقت کو بڑی خوبی سے fictionalize کیا ہے اور وہ حال سے یک لخت ماضی میں چلی جاتی ہیں۔ اس سانحے کے مشاہد کے طور پر وہ ایک چشم دید گواہ کا رول ادا کرتی ہیں جیسے طالب علموں کے احتجاج کے دوران پولیس ان کے سامنے گولیاں برسا رہی تھی اور ہیکٹر کی موت اور اس کی بہن کی بے بسی کا دردناک واقعہ ان کے سامنے رونما ہوا تھا۔

البرٹ میمی اپنے کلاسیکی مطالعے بعنوان The Coloniser and the Colonised (1965) میں اسی نتیجے پر پہنچتا ہے کہ ہر نوآبادکار قوم اپنی تہہ میں فسطائی تحریص کے بیج رکھتی ہے۔ اس کی تمام انتظامیہ اور سیاسی مشنری ایک خاص بیرونی اقلیت کے مفاد میں مقامی اکثریت کو بالجبر دبا کر رکھتی اور ان کی تحقیر کرتی اور ہر قسم کی ظلم و زیادتی کو روا رکھتی تھی۔ 'نگر' nigger بھی ایک ایسا ہی لفظ ہے جو بقول پروین "سیاہ لوگوں کے لیے حقارت سے استعمال کیا جاتا ہے۔ پروین کو ڈک گریگوری Dick Gregory کی آپ بیتی کے وہ لفظ یاد آتے ہیں جو اس نے اپنی ماں سے خطاب کرتے ہوئے کہے تھے:

> (تم اس دنیا سے غلام بن کر بے وجہ نہیں گئیں ماں! — تم اور وہ تمام سیاہ مائیں جنھوں نے اپنے بچوں کو طاقت دی، آگے بڑھنے کے لیے اور اب ہم تیار ہیں کہ وہ نظام بدل دیں جہاں ایک سفید شخص ایک سیاہ شخص کو برباد کر سکتا ہے صرف واحد لفظ — 'نگر' سے —— جب ہم کامیاب ہوں گے ماں! یہاں پھر کبھی کوئی 'نگر' نہیں ہوگا۔)

☆

پروین جا بجا تقابل بھی کرتی ہیں۔ ایک طرف زندہ رہنے کے سوجتن ہیں، ذہنی، اقتصادی پس ماندگی ہے۔ دوسری طرف ثروت ہی ثروت۔ ایک طرف فطرت کا وہ کردار جو طمانیت افزا، معصومیت ہی معصومیت، زندگی بخش ہی زندگی بخش ہے۔ یہی کردار فطرت کی گود میں پلنے والی خلقت کا ہے جو ہر طرح کے مکر و ریا سے عاری ایک ایسی بے خبر اور لاعلم زندگی گزار رہی ہے جس نے ابھی فریب کے معنی سیکھے ہیں نہ جھوٹ کو کلمہ بنایا ہے۔ اس کے برعکس شہر کی وہ زندگی ہے جس کا مقصد ہی آسودگیِ نفس اور دوسروں کو کچلتے ہوئے سبقت حاصل کرنا ہے۔ پروین شیر نے اس تضاد اور اس اذیت ناک آئرنی کو اپنی کئی نظموں میں بھی زبان دی ہے۔ اپنے سفر کے دوران بھی وہ انسان اور انسان کے درمیان واقع ہونے والی اس خلیج اور اس مغائرت کو بار بار نشان زد کرتی ہیں اور کئی سوال بھی قائم کرتی ہیں۔

☆

پروین شیر کا سفرنامہ، ایک ایسا تخلیقی سفرنامہ ہے جو محض روداد ہونے سے اس لیے بچ گیا کہ

موصوفہ کے تجربۂ ذات کا عکس اس کے ہر ہر جز میں شامل ہے۔ ہم داغ داغ اجالوں، شب گزیدہ صبحوں، گمشدہ تہذیبوں اور زمانوں، فطرت کے ہزار رنگوں ہی سے متعارف نہیں ہوتے۔ ایک ایسی شخصیت سے بھی متعارف ہوتے ہیں جسے ہم نے ان کی مصوری کے ان تجربوں میں متعدد بار دیکھا ہے جو ان کی شاعری ہی کی طرح زندگی کے ان دردناک پہلوؤں کے بھی حامل ہیں جو ہمارے اردگرد ہی واقع ہیں لیکن ہم انھیں دیکھنا نہیں چاہتے۔ کیوں کہ ہم وہی دیکھتے ہیں جو دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہی سنتے ہیں جو سننا چاہتے ہیں۔ ہمارے دماغ set ہیں، ہمارے ادراکات معیّن ہیں۔ ہمارے اغراض کی سمتیں مقرّر رہ ہیں۔ پروین ہمارے ذہنوں کو جھنجھوڑتی ہیں اور ان 'سیاہ روشنیوں' کی طرف متوجہ کرتی ہیں جو کچھ زیادہ ہی سیاہ ہیں۔ وہ ان طلسمی جہانوں کو نشان زد کرتی ہیں جو جتنے حیرت زا ہیں اتنے ہی داغ دار بھی ہیں۔ پروین کا سب سے بڑا دکھ یہی ہے کہ انسان اپنی جنگ جویانہ اور استحصالی فطرت سے باز نہیں آتا۔ وہ صدیوں سے مسلسل اپنے آپ ہی کو جھلاتا آرہا ہے۔ پروین نے اپنے سفرنامے میں انسانیت کے اس سبق کو ایک بار پھر یاد دلانے کی سعی کی ہے جسے میں ایک عظیم مقصد سے تعبیر کرتا ہوں۔

☆☆☆

شہر ملال

(۱)

محمد علی صدیقی یاد آتے ہیں

● صبا اکرام [پاکستان]

محمد علی صدیقی 8 / مارچ 1938ء کو امروہہ یوپی (بھارت) میں آغا علی مستحسن کے گھر پیدا ہوئے۔ ان کے والد نیو تھیٹرز سے اسکرپٹ رائٹر کی حیثیت سے منسلک تھے، اور کنانا حافظ عبدالوحید مدرسہ دد یوبند سے وابستہ تھے۔ انہوں نے خود بھی آٹھویں کلاس تک مدرسے میں تعلیم حاصل کی تھی، شاداسی لئے انہوں نے دونوں کے اثرات قبول کئے اور لکھنے لکھانے کی طرف چل نکلے۔ 1949ء میں پاکستان آمد کے بعد ان کا داخلہ چرچ مشن اسکول میں کرایا گیا، اس دوران انہوں نے کئی مضامین اسکول میگزین کے لئے لکھے۔ 1953ء میں میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہ اسلامیہ کالج پہنچے تو وہاں ان کے اساتذہ میں پروفیسر حسن عسکری جیسی قد آور ادبی شخصیت موجود تھی۔ اُن کے بارے میں محمد علی صدیقی کا خود کہنا تھا کہ وہی ان کے ادبی کیریر کے محرک تھے۔ ویسے نظریئے کے اعتبار سے ان کا جھکاؤ ہمیشہ ترقی پسندی کی جانب رہا۔ ان کے نزدیک ترقی پسندی ماضی سے روگردانی اور ماضی شکنی کے رویے کا نام نہیں تھا۔ اور نہ انہوں نے جمالیات پر کبھی نظریئے کو فوقیت دی، بلکہ وہ نظریئے اور جمالیات کر ساتھ ساتھ لے کر چلنے کی بات کرتے رہے ہیں۔

1965ء جامعہ کراچی سے انگریزی ادب میں ایم اے کرنے کے بعد کچھ عرصہ وہ انگریزی روزنامہ MORNING NEWS سے منسلک رہے، اوراس کے بعد برٹش کونسل کے انگریزی رسالے کی ادارت سنبھالی۔ اس طرح انہوں نے انگریزی صحافت میں تجربے کے بعد اردو صحافت کا رُخ کیا، اور ڈاون گروپ کے اس وقت کے مشہور اردو روزنامہ ''حریت'' کراچی کے مدیر ہو گئے۔ یہ سلسلہ منقطع ہوا تو دوبارہ وہ انگریزی صحافت کی طرف لوٹے اور معروف بزنس میگزین "PAKISTAN

"ECONOMIST" کو جوائن کرلیا۔ رُخ کیا درو تدریس کے شعبے کا۔ وہ پاکستان اسٹڈی سنٹر (جامعہ کراچی) پہنچ گئے۔ اس دوران ان کو مطالعے اور تحقیق کے لئے اتنا وقت میسر آیا کہ 1992ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرلی۔ اب خیر سے وہ ڈاکٹر کہلانے لگے تھے۔ 2007ء میں تو انہیں D-Liff کی ڈگری سے بھی نوازا گیا جو ایک بڑا اعزاز تھا۔ اقبال خورشید نے محمد علی صدیقی، کی پی ایچ ڈی کی ڈگری کے حصول کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے اپنی ایک تحریر میں انہیں جس طرح quote کیا ہے۔ وہ میں یہاں نقل کر رہا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیں:

> ''میرے نزدیک یہ تذلیل کی بات تھی کہ کسی سے کہا جائے کہ اگر تدریس سے وابستہ رہنا ہے، تو پی ایچ ڈی کرنی پڑے گی۔ میں کو استعفیٰ دے رہا تھا۔ خیر 92ء میں میں نے پی ایچ ڈی کی۔''

میرے خیال میں پی ایچ ڈی کے حصول سے ان کے ادبی کیریر میں تو یقیناً کوئی فرق نہیں آیا کیوں ایک نقاد کی حیثیت سے ان کا رتبہ پہلے ہی سے کافی بلند تھا، مگر ان کے پروفیشنل کیر ئیر کو اس سے فائدہ ضرور پہنچا۔ وہ قائدِ اعظم اکیڈمی کے ڈائریکٹر کے اہم عہدے پر فائز ہوئے اور ہمدرد یونیورسٹی میں شعبہ سماجی علوم کے ڈین کی کُرسی بھی انہیں سونپی گئی۔ یہاں سے مدتِ ملازمت کے اختتام کے بعد وہ بزنس منیجمنٹ میں اعلیٰ تعلیم دینے والے ایک اہم ادارے BIZTEK میں ڈین فیکلٹی آف منیجمنٹ اینڈ سوشل سائنسز مقرر ہوئے۔ یہاں سے وہ اپنی رحلت سے چند ماہ قبل وچانسلر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ انہیں 2003 میں PRIDE OF PERFORMANCE کے ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔

میں نے انہیں پروفیشنل کیر ئیر کے علاوہ ادبی اور تحریکی پلیٹ فارم پر بھی ہمیشہ بہت چاق و چوبند اور ایز جیٹک پایا۔ وہ پاکستان کے ساتھ ہندوستان کے ادبی میں اسٹڈیم سے بھی جڑے رہے۔ پاکستان کے ساتھ ہندوستان کے ادبی مین اسٹڈیم سے بھی جڑے رہے۔ پاکستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین پر 1954 میں سرکاری پابندی کے کئی برسوں بعد ڈاکٹر انوار احمد اور ان کے ساتھیوں نے، جن میں ڈاکٹر روبینہ ترین وغیر پیش پیش تھے، قاضی عابد اور ڈاکٹر روبینہ ترین وغیر پیش پیش تھے، جب 21 / اپریل 2007ء کو ملتان میں کانفرنس کا اہتمام کیا تا کہ انجمن کی تشکیل نو کی جاسکے، تو کراچی کے وفد میں محمد علی صدیقی آگے آگے تھے۔ افتتاحی اجلاس میں جس کی نظامت راقم الحروف کے ذمے تھی وہ مجلس صدارت میں شامل تھے۔ انہوں نے اس کی تنظیم نو کے حوالے سے بہت اہم اور مثبت مشورے دیئے۔

گذشتہ سال جب نئے عہدہ داران کے لئے لاہور میں انتخاب ہوا تو سوبھو گیان چندانی کی جگہ انہیں مرکزی صدر کے عہدہ کے لئے منتخب کیا گیا۔ اس انتخاب کے بعد وہ انجمن کی سرگرمیوں کو مزید تیز کرنے کے لئے پشاور اور پنجاب کے دورے پر نکلے اور وہاں کے عہدہ داران سے صلاح مشورے کئے۔ وہ پابندی

سے کراچی شاخ کی ماہانہ تنقیدی نشستوں میں شرکت کرتے تھے، اور صدارت فرماتے تھے۔ اپنی رحلت تک اس عہدے پر وہ فائز رہے۔

محمد علی صدیقی نے ایک عرصے تک ماہنامہ ''افکار'' میں مہمان مدیر کی حیثیت سے اداریے لکھے، جن کا ایک انتخاب اشاریئے'' کے نام سے شائع بھی ہو چکا ہے۔ ان اداریوں میں انہوں نے ادب کے علاوہ سماجی، ثقافتی اور سیاسی موضوعات پر بحث کی ہے جن سے نئے سوالات سامنے آئے ہیں،..... اظہار رائے کے لئے نئے در کھلے ہیں۔ فکری اعتبار سے کوئی دھندلا کا پرچھائیں نہیں بلکہ ایک اُجالا سا موجود ہے، جو راستوں کو منور کرتا ہے۔ ''افکار'' کے نومبر 1976ء کے شمارے میں شامل اُن کے اداریئے سے ایک اقتباس نقل کر رہا ہوں، ملاحظہ فرمائیں۔ آپ بھی تائید کریں گے میری رائے کی:

> ''........ماضی کی وہ تمام صحت مندانہ اور تعمیری اقدار اپنائیں جو آج کے دور کی ضروریات سے متصادم نہیں ...... زبان ویسے بھی بہت کم بدلتی ہے.........غالب سے لے کر فیض اور قاسمی تک ادبی زبان میں کس قدر تبدیلی ہوئی ہے؟ صرف برائے نام مقدار میں چند فی صد الفاظ سے زیادہ نہیں۔ لیکن طرزِ احساس وقت کے ساتھ بدلتا رہتا ہے..... پرانے الفاظ کو نئے پیکروں میں اور نئے مظاہر کو پرانے پیکروں میں سجانے کا نام ہی تازگی ہے۔ اس طرح فنا اور بقا کا متوازی عمل جاری رہتا ہے۔
>
> ''اور ہمارے لئے ''پورا ادب'' وہی ادب ہے جو روحِ عصر میں غوطہ زن ہو اور پورے آدمی کے ہمہ گیر تقاضوں میں سے کسی ایک تقاضے کو زیادہ اور دوسرے کو کم کر کے بیان نہیں کرتا بلکہ ''کل'' کو ''کل'' سمجھتا ہے۔''

(''ادب، زبان اور پورا آدمی'')

محمد علی صدیقی نے تقریباً چالیس سال قبل 'AERIAL' کے قلمی نام سے مقامی انگریزی روزنامہ ''DAWN'' میں ادبی کالم بعنوان ''LITERARY NOTES'' لکھنا شروع کیا تھا جو کئی دہائیوں تک جاری رہا۔ ان میں جگہ جگہ فکری مباحث سامنے آئے ہیں، اور ادب کے حوالے سے روشن خیالی کے پرچار کو...... بنایا گیا ہے۔ گزشتہ چند برسوں سے وہ اسی نام سے انگریزی روزنامہ ''BUSINESS RECORDER'' میں پندرہ روزہ کالم لکھنے لگے تھے جو تادمِ مرگ جاری رہا۔ اگر ان کالموں کو یکجا کیا جائے تو ان کی تعداد ہزاروں میں بنے گی۔ موضوع کے اعتبار سے ان کا انتخاب کر کے کتابی شکل دی جائے کو ان سے نئی نسل کے لکھنے والے استفادہ کر سکتے ہیں۔

محمد علی صدیقی کے انتقال کے فوراً بعد الطاف اسد نے ان کے ہم عصر کچھ ادیبوں کی آراء ان کے

بارے میں حاصل کی تھیں، اور انہیں انگریزی روزنامہ "THE NEWS" "CRITIC OF
OUR TIMES" کے عنوان سے شائع کیا تھا۔ یہاں اس عہد کے دو بہت اہم ادیبوں کی آراء کے تراجم پیش کر رہا ہوں۔ آپ کو اندازہ ہوگا کہ محمد علی صدیقی کے ہم عصر لکھنے والے ان کو کتنی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے:

"محمد علی صدیقی ایک سیلف میڈ شخص تھے جنہوں نے زندگی میں سخت جدوجہد کے بعد ایک نمایاں نقاد اور اسکالر کی حیثیت سے اپنی پہچان قائم کی تھی۔
محمد علی صدیقی کے تنقیدی مضامین پڑھیں تو ان کی علمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ ایک ترقی پسند، آزاد خیال اور دل میں انسانی ہمدردی کا جذبہ رکھنے والے انسان تھے۔
انہوں نے اردو ادب پر اپنا اَن مٹ نشان چھوڑا ہے"

اسد محمد خاں

"وہ بہت پیارے دوست تھے۔ ان سے میرے تعلقات خاصے پرانے تھے۔ کئی دہائیوں تک انہوں نے اردو ادب کو اپنی تحریروں سے مالا مال کیا۔ لکھنے کا آغاز انہوں نے ساٹھ کی دہائی میں کیا تھا، جب ترقی پسند ادب حملے کی زد میں تھا۔ پرانے ترقی پسندوں میں کئی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے، جو بچے تھے وہ کافی بوڑھے تھے، اور اس کا دماغ نہیں کر پا رہے تھے۔ محمد علی صدیقی نے اپنی تحریروں سے ترقی پسندی کا دفاع کیا اور اس کے مقاصد کی ترویج کے لئے بھرپور رول ادا کیا"

فتح محمد ملک

خود محمد علی صدیقی کا اپنے ہم عصر تین بڑے ادیبوں ڈاکٹر وزیر آغا، شمس الرحمٰن فاروقی ایسا......... حسین کے بارے میں کیا خیال تھا یہ بھی پیش کرنا چاہوں گا۔
ملاحظہ ہو سکریتا پال کمار کے انگریزی میں ایک انٹرویو سے یہ اقتباس:

"THERE ARE SOME WHO HAVE COME OUT OF RESTRICTIVE CRITICAL DOMAINS, WAZIR AGHA, SHAMSUR REHMAN FAROOQUI AND ALSO, PERHAPS INTEZAR HUSSAIN"

URDU (ANADA (Ed. Shaheen)

مگر ساتھ ہی ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ کچھ تو ایسے ادیب ہیں جو جدید اور ترقی پسند ہیں، مگر چند ایسے

بھی ہیں جو جدید اور ماضی پرست کہے جاسکتے ہیں عہد حاضر سے قائم تناؤ جیسی کیفیت سے نکل کر ماضی میں پناہ تلاش کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے اس سلسلے میں وضاحت نہیں کی کہ ان کا اشارہ کس کی طرف ہے۔ فاروقی صاحب اور انتظار حسین کے یہاں...... ہندا سلامی تہذیب کی بازیافت کا رویہ سامنے آیا ہے، اور ڈاکٹر وزیر آغا اپنی پہچان کے حوالوں کی تلاش میں اگر پراچین کال تک جانے کی بات کرتے ہیں، تو دونوں ہی صورتوں میں ایسا نہیں کیا جاسکتا کہ ماضی کی گھاؤں میں پناہ ڈھونڈھنے کی بات کی جارہی ہے۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی کا مطالعہ صرف ادب تک محدود نہیں تھا، بلکہ ان کی نظر فلسفہ، سماجیات، سیاسیات، تاریخ اور جدید علوم تک پہنچی ہوئی تھی، اور وہ ان سے اپنی تنقید میں استفادہ بھی کرتے تھے۔ بین الاقوامی ادبی اور سیاسی تبدیلیوں سے ہمیشہ خود کو باقید اور 'UP-TO DATE' رکھتے تھے۔ نئے تھوریز کا انہوں نے بغور مطالعہ کیا تھا۔ ساختیات، جس کا گزشتہ دہائی میں کافی چرچہ رہا ہے، انہوں نے دس پندرہ سال قبل اردو میں اس پر پہلا مضمون لکھا تھا، جو اوراق (لاہور) میں شائع ہوا تھا۔ مابعد جدیدیت کے بارے میں ان کے تحفظات تھے۔ انہوں نے اپنے ایک مضمون، بعنوان ''مابعد جدیدیت' ادب اور سرمایہ دارانہ نظام ''میں لکھا:

> ''ویسے تو امریکہ اشیائے صارفین کے کوڑے کے ساتھ اپنی مباحث کی راہ داریوں سینتنے۔ مباحث کا کوڑاWASTE بھی پھینکتا رہتا ہے۔ ہمارے یہاں مباحث کا کوڑا یا باقیات بھی کچھ دیر سے ہی سہی لیکن درآمد ہوتی رہتی ہیں۔ مابعد جدیدیت کے مباحث بھی اسی قسم کی ایک لایعنی بحث ہے جسے ہمارے بعض درآمد شدہ خیالات سے مرعوب کرنے والے دانشوروں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

مابعد جدیدیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے ان پر بعض اوقات برہمی کی سی کیفیت طاری ہوجاتی تھی۔ اور وہ اس کا بین الاقوامی مالیاتی نظام کے فوق الملکی کارپوریٹ سرمائے کی مطلق العنانیت'' کی پیدا کردہ سازشوں سے رشتہ جوڑتے تھے۔ ایک ادبی تقریب میں کراچی میں اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے یہ کہہ دیا تھا کہ ہمارے یہاں اور ہندوستان میں تو کچھ ادیبوں کو مابعد جدیدیت کو پروموٹ کرنے کیلئے غیر ملکی اداروں کی جانب سے مالی منفعت سے بھی نوازا جاتا ہے۔ اس حوالے سے ہندوستان اس موضوع پر مسلسل لکھنے والے نقاد ڈاکٹر وہاب اشرفی اور پاکستان میں مابعد جدیدیت پر اتھوریٹی مانے جانے والے نئی نسل کے ناقد ڈاکٹر ناصر عباس نیر کے نام بھی لئے تھے۔ پروفیسر علی حیدر ملک جو وہاں بیٹھے نوٹس لے رہے تھے، انہوں نے دوسرے ہی ہفتے ہفتہ وار ''اخبار جہاں'' (کراچی) کے کالم ''کراچی کا ادبی منظر نامہ'' میں سارے واقع کو پیش کر دیا۔ محمد علی صدیقی کی نظر پڑی تو اسی روز رات میں تقریباً دس ساڑھے دس بجے مجھے فون کیا اور پوچھا کہ میں نے حیدر کا کالم پڑھا ہے، تو میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ کہنے لگے کہ

بھی گفتگو یا تقریر میں تو بہت ساری باتیں کی جاتی ہیں مگر سب کچھ رپورٹ تو نہیں کیا جاتا۔ آخر میں بھی بُرسوں سے کالم لکھ رہا ہوں۔ ملک صاحب کو وہاب اشرفی اور ناصر عباس کا نام نہیں لینا چاہیے تھا۔

میں کیا جواب دے سکتا تھا، بس اتنا کہا کہ میں حیدر سے بات کروں گا۔ مجھے علم نہیں ڈاکٹر وہاب اشرفی تک یہ بات پہنچی یا نہیں سخت علیل تھے، اور چند ہفتے بعد ہی اللہ کو پیارے ہو گئے، مگر ناصر عباس منیر تک اس کی خبر پہنچ چکی تھی، اور دو ایک ماہ بعد جب وہ آرٹس کونسل کے منعقد کردہ ورلڈ اردو کانفرنس میں شرکت کے لئے کراچی آئے تو اپنے خطاب کے دوران دبے لفظوں میں اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔

محمد علی صدیقی صاحب جو وہاں موجود تھے۔ ان کی باتیں مسکرا کر سنتے رہے۔ سہ روزہ کانفرنس کے دوران دونوں کی بار مجلسِ صدارت کے ارکان کی حیثیت سے ایک ساتھ بیٹھے باتیں کرتے رہے، مگر صدیقی صاحب نے کسی تلخی کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ ان کے انتقال کے بعد الطاف اسد سے گفتگو کرتے ہوئے ناصر عباس منیر نے ان کے بارے میں جس رائے کا اظہار کیا تھا اس کا ایک حصہ نقل کر رہا ہوں:

> " He has reservations as regards the theory of Post Modernism and here, I will not go into the details of his objections and their validity. His commitment to progressive values was very genuine and rare. He will be remembered for a very long time."
>
> The News, Karachi, January 20/2013

محمد علی صدیقی نے اپنی ادبی زندگی کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے اپنے مضامین کی کتاب ''ادارک'' کے پیش لفظ میں ''حرفے چند'' کے عنوان سے لکھا ہے:

> ''مجھے اپنے پچاس سال ادبی سفر میں ناقدری زمانہ کی کوئی شکایت نہیں۔ میرا خیال ہے کہ عمر گذراں کے ساتھ ادبی پذیرائی کے تدریج کم ہوتے ہوئے دور میں ناقدری زمانہ کا شکوہ نہ کرنا، بذاتِ خود خوش قسمتی کی دلیل ہے۔''

محمد علی صدیقی کی پوری زندگی محنت اور جدوجہد سے تعبیر ہے۔ وہ کبھی کسی موڑ پر دم لینے کو نہیں رکے۔ کسی نہ کسی ادبی کام میں یا تعلیمی استعداد کی تعمیر میں لگے رہے۔

یہی وجہ ہے کہ وہ ذاتی زندگی اور پروفیشنل کیریئر دونوں اعتبار سے آخری دنوں میں نہایت مطمئن اور آسودہ نظر آتے رہے۔

☆☆☆

(۲)

جگنو سے آگ لگانے والا شاعر: صدیق مجیبی

● ڈاکٹر رونق شہری

جھارکھنڈ میں جن شعراء کو معاصرین کی صف میں رکھتے ہوئے ان کے فکر وفن پر گفتگو کی جاتی ہے ان میں صدیق مجیبی، پرکاش فکری، وہاب دانش کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ شعراء کی تثلیث کا ذکر کئے بغیر جھارکھنڈ کی غزلیہ شاعری کے خدوخال روشن ہی نہیں کئے جاسکتے ہیں۔ ظفر اقبال کے شاعرانہ قامت کے حوالے سے انڈو پاک کے رسائل میں ہندوستان کے مستحکم لہجے کے شعراء میں چند ناموں کا ہی ذکر ہورہا ہے اور وہ بھی دبی زبان سے۔ اس ادبی بدعت میں ایک جملہ شرارتاً اچھالا جارہا ہے کہ ہندوستان میں بڑے شعراء کہے جانے والے محض موزوں گوئی کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس آندھی میں صاحب دامن ہونے کی توفیق اسے ہی حاصل ہوسکتی ہے جو سچ کو سچ کہنے کی جرأت رکھتا ہو۔

واقعہ ہے کہ جھارکھنڈ سے محض پرکاش فکری کا نام اردو کی جدید غزلیہ شاعری کے باب میں لیا جاتا رہا ہے۔ ان کے نام کو خصوصی طور پر Promote کرنے والوں کے ساتھ فکری کی معقول پی۔ آر۔ شپ بھی ذمہ دار رہی ہے۔ صدیق مجیبی کی طبیعت کی قلندری نے اس حربے کی افادی پہلو سے انہیں یکسر گریزاں رکھا۔ اس کا خمیازہ انہیں کئی مواقع پر بھگتنا پڑا ہے۔ صدیق مجیبی شب خون، کتاب، شاعر، آج کل، شعر و حکمت، سطور، جواز، جیسے مقتدر رسائل میں شائع ضرور ہوئے لیکن تواتر سے اپنی شعری موجودگی کو قائم نہ رکھ

سکے۔ جب کہ ان کے بقیہ معاصرین مدیران کے اذہان کے میدان کی جاروب کشی میں صبح وشام لگ گئے۔
ان کے دو شعری مجموعے کی اشاعت کس طرح ہوئی اور بخیل ہاتھوں میں سمٹ گئی اس کا اندازہ اسی بات سے ہوتا ہے کہ مجیبی کا کوئی شعری مجموعہ بشمول خاکسار جھارکھنڈ کے بھی متعدد اہل قلم کے بک شیلف میں موجود نہیں ہیں۔

میں نے اپنے ایک مضمون اردو غزل کے اہم دستخط ''لکیریں'' گریڈیہہ میں شائع ہوا تھا اس میں انہیں اردو غزل کی آبرو کہا تھا جس سے مجیبی بہت شاد ہوئے تھے۔ لفظ آبرو کا استعمال میں نے بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ اسلئے کہ اقتدارِ شکستہ کی بحالی میں صدیق مجیبی جیسا شاعر ہی اس نوع کا شعر کہہ کر معاون ہو سکتا تھا۔

تمہاری تہذیب کے صحیفے تمارے کلچر کے آئینے ہیں
یزید مانگے جو سر تو دیدو مگر تم اپنی زبان مت دو

شعر و ادب کی تاریخ کے حوالے سے صدیق مجیبی تک پہنچنا کار دشوار نہیں ہے اس لئے کہ صدیق مجیبی کا کھلا ذہن زندگی کے صحت مند رویوں، سمتوں کو فروغ دینے والوں کے ذہنی ترفع کو غیر مشروط طور پر قبول کرتا تھا۔ اس کے باوجود حسنِ کلام میں طبیعت کی سخت گیری سے ایک خوش وضع ڈسپلین بھی خلق کرتے نظر آتے تھے۔ صدیق مجیبی کی شاعرانہ طبیعت کا ایک سراسر کش موجِ شعر سے ملتا ہے تو دوسری طرف تہذیب کی عمارت کے انہدام و زوال کو بھی حسِ ثانی چھوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ جن لوگوں نے غزل کو چاول پر قل ہو اللہ لکھنے کا فن قرار دیا تھا اس نظریئے سے بھی صدیق مجیبی غزل کی معنوی ہیتی در و بست پر نہ صرف نظر رکھتے تھے بلکہ نیا جہانِ معنی دریافت کرنے میں روح کے چھالے اور پھپھولے کی ٹیس سے بھی درد و کرب کو نقطۂ عروج پر دیکھنے کی تخلیقی قوت رکھتے تھے۔ بابِ دانشوری میں غزل کی اپنی تہذیبی تاریخ ہے۔ غزل کی عمارت کھڑی کرنے میں قلی قطب شاہ اور حضرت امیر خسرو خشتِ اوّل کی تلاش کی تھی اس میں بنیادی طور پر اگر ذرا سی کجی آئی ہوئی ہوتی تو اس کا ارتقائی سفر سنگِ میل کی روپوشی کا خوبصورت اور پر فریب بہانہ بن گیا ہوتا۔ آج غزل پر مکالمہ قائم کرتے وقت لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ رُسوا، داغ، میر غالب، اقبال، حسرت، جذبی، مجاز، جوش، جگر، فیض، خلیل الرحمٰن اعظمی، بانی، زیب غوری، مصور سبزواری، شاذ تمکنت، حسن نعیم، بشیر بدر، سلطان اختر، بشر نواز، مظفر حنفی، فضیل جعفر، مظہر امام، شمس الرحمٰن فاروقی، عادل منصوری، محمد علوی، کمار پاشی، راز نرائن راز، مخمور سعیدی، مغنی تبسم، عرفان صدیقی اور کئی دوسرے اہم ناموں کے ساتھ جو عصری اور تہذیبی انسلاک ہے اس کو جتنی تہہ داری اور فکری جامعیت کے ساتھ غزل نے انعکاس کا ذریعہ فراہم کیا ہے غالباً کسی دوسری اصناف سخن نے نہیں۔ غزل کے حوالے سے جن جدید شعراء کے نام مذکور ہوئے ہیں ان میں صدیق مجیبی بہر طور رفت ہونے کا جواز و صلاحیت رکھتے ہیں لیکن خام اور متعصب ذہن نے اب تک ملک گیر حیثیت

سے صدیق مجیبی کو پرموٹ نہیں کیا ہے۔ میں اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہوں۔

اس پس منظر میں مجھے راہی قریشی کا ایک شعر ذہن میں آرہا ہے۔

لوگ تحریر میں لاتے نہیں مجھ کو راہی
اور تقریر میں دیتے ہیں حوالہ میر

صدیق مجیبی کو اپنے فکروفن پر اعتماد تھا۔ اپنے لہجے کی بازیافت، کا بھی احساس تھا کبھی کبھی یہ احساس ان کے شعر سے بھی ظاہر ہوتا تھا۔

میری نظر کا جمال شامل تیری نظر میں
کہاں کا مہتاب تیرے آگے ہلال کیا
اصول کی رہ گزر میں ردِ خیال کیسا
منافقوں سے مفاہمت کا سوال کیا

محولہ دو اشعار سے صدیق مجیبی کی طبیعت کی سرکشی اور انا گیریت کا معاملہ بہت واضح ہو کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ صدیق مجیبی کی شاعری پر محیط عنوان ''جگنو سے آگ لگانے والا شاعر: صدیق مجیبی'' شاعر کے مختلف شعری ابعاد کو ظاہر کرنے میں مدد و معاون ہیں۔ ان کی شاعری کا استعاراتی نظام تہذیبی، تاریخی، سماجی، جغرافیائی اقدار کی شکست وریخت سے متصف ہے۔ یہ منفرد وسیلۂ اظہار اور بلیغ معنوی دروبست سے عصری تقاضے کی روح سے ہم آہنگ ہو کر غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔ نئی غزل کے سنجیدہ قارئین کے اذہان میں صدیق مجیبی کی فکری صلابت، بلاغت، فصاحت کا سکہ جما ہوا ہے۔ سبب اور پیش سبب کے نکات کو تہہ داری سے ظاہر کرنا اور صدیق مجیبی کا وسیع شعری کائنات کے خالی کینوس میں موزوں اور استعاروں سے رنگ بھرنا ایسے شعری عوامل ہیں جو انہیں ممتاز و منفرد کرنے کیلئے کافی ہیں۔

صدیق مجیبی ''غزل کی سلطنت میں نہیں ڈوبنے والا سورج'' کی ایک ایسی مثال ہے جن کے مخصوص استعاروں سے موصوف کرنیں شعاعِ امید پیدا کرنے کا سلسلۂ لازوال قائم رکھتی ہیں۔

نئی غزل میں سلطنت کی بات آگئی تو کہتا چلوں کہ ہر عہد اور صنف میں راتوں رات مقبولیت کی بلندی چھونے کے لئے ایک بھیڑ چال موجود رہتی ہے۔ تتبع کرنے کی ایک فطری اور معصوم وجہ تو یہ رہی ہے کہ ہم نے اپنے پیش رؤں سے انحراف نہ کرنے کی جیسے قسم کھا رکھی ہے جس کی وجہ سے اگر ہمارے ذہن پر کچھ نیا اگتا بھی ہے تو وہ اپنی مصنوعی موت مرجاتا ہے۔ دوسری اہم وجہ غزل گویوں کی ایک لمبی قطار بھی ہے جو محض ردِ عمل کی شاعری کرتی رہتی ہے۔ ان دونوں صورتوں کی واجب نفی کرنے کا ہمارے پاس نہ جواز ہے اور نہ احتسابی عمل، غزل جب کہ ایک پرآشوب دور سے گزر رہی ہے ایسے وقت میں ہماری نگاہ جن معدودے چند شعراء پر پڑتی ہے ان میں نمایاں نام صدیق مجیبی کا ہے۔ صدیق مجیبی کے یہاں نہ باسی جگالی ہے اور نہ ردِ

عمل سے پیدا شدہ بائی پروڈکٹ۔ صدیق مجیبی کا ان کے معاصرین سے تقابل مطالعہ ان کے معاصرین سے کرنے سے قبل کسی بھی مضمون نگار کو متعدد بار سوچنا ہوگا کہ مجیبی کا فکری نظام کن معنوں میں استعاراتی سطح پر مختلف ہے۔ اگر انفرادی یا منفی صورت حال موجود ہے تو اس صورت حال کے مظاہر میں کن اقدار کی پامالی کا نوحہ زیریں لہر بن کر سانس لیتا ہے۔ صدیق مجیبی مظلوم انسانیت پر ہوتے عذاب سے جب بہرہ ور ہوتے ہیں تو ان کا لہجہ مزاحمت آمیز ہو کر تلخ و ترش ہو جاتا ہے۔

مسیحِ وقت اب آئے تو بس خدا آئے
پیمبروں کی زمیں اور عذاب چاروں طرف

اس شعر کا پس منظر روحِ عصر کی گونج سے پیدا شدہ لاتعداد امکانات کی نفی نہیں بلکہ مضبوط دلائل اور جواز سے مسیحِ وقت کا بے مصرف ہونے کا خلاصہ بھی ہو جاتا ہے۔ مجیبی نے جب یہ شعر کہا ہوگا تو درج ذیل شعر بھی اسکے ذہن کے ایک گوشے میں یقینی طور پر ہوگا

اے روحِ عصر جا کے کہاں کھو گئی ہے تو
آواز دے رہے ہیں پیمبر صلیب سے

روحِ عصر کی بات دہرانے سے زیادہ ضروری اس کی معنوی صداقت کو فہم کے قریب لا کر سوچنا ہے۔ صدیق مجیبی سماج کے ٹوٹنے بکھرنے در و بست سے پیدا شدہ انتشار زمانی کو محسوس کرتے ہیں بلکہ خود کو بھی اس کا ایک بے مصرف حصہ سمجھتے ہوئے رائیگانی کے مرحلے سے گزرتے ہیں۔ انسان کی ساری جد و جہد قربانی، عدم حصولیاتی، بے بضاعتی، بے یقینی، فرایت کا عمل رائیگانی سے دوچار ہو کر صفر نتیجہ ہو جاتا ہے۔ اس سلیقے سے شاید ہی کسی نے رائیگانی اور بے مصرف ہونے کی تاویل پیش کی ہوگی۔

اک صدا پھیلے گی چاروں اور گھبرائی ہوئی
رائیگاں سب رائیگاں سب رائیگاں سب رائیگاں

محولہ شعر میں لفظ رائیگاں ردیف بھی ہے اور تین بار اس میں تکرارِ رائیگاں موجود ہے۔ صدیق مجیبی کا مطالعہ کافی وسیع تھا قرآن حکیم میں ارشاد باری کے حوالے سے "رب کما تکذب" بیان کی تکرارِ لفظی بھی انہیں کافی متاثر کرتی تھی۔ اردو غزل کی تہذیبی جمالیات کا یہ بھی روشن پہلو ہے کہ اسے جب ہم معاشرہ میں

مائک پر شعر پڑھتے ہیں تو اس کا عوامی وقار پیش نظر ہوتا ہے۔ لیکن جب اسے سنجیدہ رسائل میں قرأت کرنے کی نوبت آتی ہے تو محفوظ ہونے کے لئے ذہن، چشم اور سماعت ایک ساتھ متحرک ہو جاتے ہیں۔ صدیق مجیبی کی شاعری کا بھی یہ پر لطف پہلو ہے۔ جو صدیق مجیبی کی شاعری کی ذہنیت کے قریب نہیں پہنچ پاتا ہے وہ خاکم بدہن کہ کر کوستا رہ جائے گا۔ جدید غزل میں فردیت کے تصور نے عملاً بھی زندگی کے ہر محاذ پر تنہا کیا ہے۔ پہلے فرد اور معاشرے کے بیچ جو صحت مند ربط تھا ہماری مادیت پسندی یا صارفیت پسندی نے اسے خاک سے اٹھا کر خون میں ڈال دیا ہے۔ تنہائی، خلوت پسندی سے متعلق جدید شعراء کے لاتعداد اشعار دامن دل کو کھینچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں لیکن صدیق مجیبی کا اس ضمن میں انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے اکیلے پن کو دوزخ سے نہ صرف تعبیر کیا ہے بلکہ آواز کے محض بھیگنے سے ہی شعلہ کی شکل اختیار کرنے کا اظہار یہ اس طرح نہیں کیا ہے کہ لازوال استعارے خلق ہو گئے ہیں۔

اکیلے پن کا اک دوزخ لئے پھرتا ہوں سینے میں
ذرا بھیگی میری آواز اور شعلہ نکل آیا

غالب نے بیشتر جگہوں پر خدا سے مکالمہ کیا ہے۔ اس کی شوخی نے ظرافت کے اس مقام و معیار کو چھولیا ہے جہاں خدا اور بندہ نواز کی جبینِ نیاز کی دوری کم ہو جاتی ہے۔ صدیق مجیبی کی ذہنی رویے کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ اپنی عاجزی سے مختارِ کل کو بھی لاجواب کرنے میں قباحت محسوس نہیں کرتا ہے۔

حرف آئے گا تو آئے گا کرم پر تیرے
میرا کیا ہے میں تو بہر حال گدا گر ٹھہرا
جنم دیا ہے دکھوں نے غموں نے پالا ہے
خدا سے پوچھئے میرا حسب و نسب کیا ہے
اٹھے ہیں بات تو اب اپنے کرم کی لاج بچا
وگر نہ میری دعا کی مری طلب کیا ہے
مجھے بھی دیکھ میرے حوصلے بھی دیکھ ذرا
مرا تو کوئی نہیں تو نہیں خدا بھی نہیں

اس قبیل کے متعدد اشعار صدیق مجیبی کی خوش کلامی اور قادرُ الکلامی پر دال ہیں نئی غزل میں تحیّر خیزی وصفِ شعر رہی ہے۔ مزید کہ اس ہنر میں اگر طنز کی کاٹ اور نئے استعارے تلازے کی شمولیت ہو تو

شعر کا فلک بہت وسیع ہو جاتا ہے۔صدیق مجیبی کے یہاں Pathos اور Sentiment مخلوط ہو کر حیرت انگیز منظرنامے کی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں۔

عجیب دھند ہے آنکھوں کو سوجھتا بھی نہیں
ابھی تو دن کا ورق ٹھیک سے جلا بھی نہیں
سورج کو کس نے رکھ دیا میزانِ شام میں
یہ کج کلاہ خاک بسر کیسے ہو گیا
سوچتے ہیں کہ مرح اس شہر میں جیتے رہے
آستیں میں سانپ تھے اور زہر پیمانوں میں تھا

محولہ شعر میں دن کا ورق میزانِ شام جیسے استعارے بانی کے ذہن کی تخلیقی فضا سے مماثل ہو کر بھی الگ تھلگ ہیں۔اس وصف کو میں ہم عصریت کے خانے میں رکھتا ہوں۔اس لئے کہ مجیبی کا پیرایۂ اظہار ہم عصریت ہی نہیں ہم سری کی میزان پر بھی بھاری بھر کم معلوم ہوتا ہے۔

زوال آمادگی ہر بشر کا مقدر ہے اور خسارہ اس کی منزل۔لذت کام و دہن سے سرشاری اور جزوقتی تسکین ہی اسے ہری آگ کی طرف لاشعوری طور پر لئے چلتی ہے۔

میں بیچوں بیچ کھڑا ہوں سلگتے جنگل میں
حصار باندھے ہوئے آفتاب چاروں طرف
آگہی نتیجۂ آشوب میں دل کو تھامے
محبسِ غم میں کہیں در نہ دریچہ دوزخ

صدیق مجیبی کی غزلوں میں دانشوری کی دبیز تہیں سر ابھارتی نظر آتی ہیں۔صورت حال پر شاعر محض تبصرہ کر کے گزرنا نہیں چاہتا۔ظاہر ہے کہ اس کے لئے مختلف النوع علوم کی ادق مطالعے کے ساتھ اپنی ذات کی تہہ میں اتر کر عرفانِ ذات حاصل کر دشوار کن عمل ہے۔مجیبی ان تمام مراحل سے گزر کر ہی شعر کی شکل میں دُرِ نایاب لے کر سامنے آتے ہیں۔

جانے کس فیاض ساعت میں کھلے بند سکوت
خشک ہے میری زبان اور تشنہ لب اس کا بھی ہے
تمہاری مرجانہ سیاست یقیں کا چہرہ جھلس چکی ہے
ہمارے سہمے ہوئے مکانوں پر امتیازی نشان مت دو
ایک ہی سانس کو سو رنگ میں دہراتے رہے
محض اک جبر کے صدیوں کا سفر تھا بھی کیا

محولہ اشعار میں فیاض ساعت ٗبند سکوت ٗمرجانہ سیاست، یقیں کا چہرہ، امتیازی نشان، صدیوں کا سفر، جیسے بلیغ اشعار صدیق مجیبی نے جس خوش ہنری کے ساتھ پیش کیا ہے کیا اس سے اندازہ نہیں ہوتا کہ جدید غزل کے اہم دستخط قرار دیئے جانے والوں میں اس بلند بانگ، لہجے کے شاعر کی نشت سدا کے لئے محفوظ ہونی چاہئے؟ غزل کے متعصب ناقدین اور علاقائی عصبیت کے شکار انعام فروشوں سے تو مجھے کوئی امید نہیں کہ صدیق مجیبی کے ساتھ معقول انصاف ہوگا۔ آج سے چند دہے قبل احمد فراز کے حوالے سے ہندوستانی رسائل میں بحث چھڑی تھی کہ معاصر غزل پاکستان میں ہندوستان کے مقابلے میں اعلیٰ معیار کی حامل ہے میں نے اس کے خلاف پہلے ہی آواز بلند کی تھی اور آج بھی احتجاج کرتا ہوں۔

صدیق مجیبی بھی اس معاملے میں میرے ہمنوا تھے۔ اور ''آئندہ'' پاکستان میں شائع ہونے والی غزلوں کے مزاج ومعیار سے واقف ہو چکے تھے۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ اس کام میں بھی اپنے شعری مجموعوں کی تاخیر اشاعت کی طرح پاکستانی رسائل میں بھی تاخیر سے شناخت قائم کر سکے تھے۔ مجیبی کے تعلق سے باتیں ضمنی طور پر ہی سہی اس لئے بھی اہمیت کی حامل ہیں کہ وسائل وذرائع کی عدم فراہمی کی وجہ سے ہی اس البیلے شاعر کو وہ مقام ومرتبہ حاصل نہ ہو سکا جس کے وہ مستحق تھے۔ جہاں تک میری معلومات ہے رانچی کے قریب ایک درجن تازہ کار شعراء کی ذہنی وعلمی تربیت انہوں نے کی ہے۔ ڈاکٹر سرور ساجد، ڈاکٹر راشد انور راشد، انور ایرج کا نام میرے ذہن میں فوری طور پر آرہا ہے۔ اب رانچی کی ادبی فضا ان کی ہی ذہانتوں سے مہکے گی۔ صدیق مجیبی نے زندگی کو اپنے ڈھنگ سے جینے کی کوشش کی۔ گدی برادری میں یہ پہلے پی۔ ایچ۔ ڈی ڈگری ہولڈر تھے۔ نشتر خانقاہی کا شعر صدیق مجیبی پو پوری طرح منطبق ہوتا ہے۔

میں بھی خوابوں میں ملا تو بھی دھندلکوں میں مجھے
زندگی دیکھ کبھی غور سے چہرہ میرا

مجیبی غالب جیسی طبیعت کا ایک حصہ تھے۔ شراب وشعر کی آمیزش سے لذت کام ودہن کی سیرابی محض ایک تماشہ بن کر رہ گئی۔ مخاطب کے سادہ لوحی پر طنز کرنا اور پھر اپنا گرویدہ بنا لینا حسن شعار کی طرح تھا۔ مجیبی کی

شاعری میں جمالیاتی حس ابھر کر سامنے آتی تھی۔ شاذ تمکنت کا یہ شعر

یوں نزاکت سے تیرے جی سے اتر جاؤں گا
جس طرح تیرے بدن سے تیرا زیور اترے

میں نے جب انہیں سنایا تھا تو اسی وقت اپنا یہ لافانی شعر سنا کر مجھے چپ کر دیتے تھے۔

پازیب باندھتی ہے قیامت جھکی ہوئی
دیکھ اے فلک یہ تیری دھنک کا جواب ہے

مجتبیٰ کے یہاں احساس جمالیات کبھی کبھی بوالہوسی کا رنگ بھی اختیار کر لیتی ہے۔

اے شہر ستم پیشہ کر ہاتھ قلم میرا
دیکھے نہیں جاتے ہیں پھلدار شجر مجھ سے

طبیعت کی سرکشی مجتبیٰ کے شعری حس سے بھی بے حد مطابقت رکھتی ہے۔ پرکاش فکری کے ساتھ صدیق مجتبیٰ اور میں نے 1982 میں نگار ہوٹل میں زیادہ تر شامیں گزاری ہیں۔ وہاب دانش بھی کبھی کبھار پہنچ جایا کرتے تھے۔ جمالیات پر بات کرتے کرتے Sex اہم موضوع بن جاتا تھا۔ میں ان دنوں بانی پر پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی Synopsis کی تیاری کے لئے کوشاں تھا۔ ڈاکٹر وہاب اشرفی رانچی یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو ہوا کرتے تھے۔ میں ان دنوں رونق گیاوی کے نام سے لکھ رہا تھا۔ صدیق مجتبیٰ مجھے وہاب اشرفی کے یہاں لے گئے اور میرا مدعا بیان کیا۔ وہاب صاحب سے میرا تعارف کرانا چاہا تو انہیں روکتے ہوئے وہاب صاحب نے کہا ہاں بھائی میں انہیں جانتا ہوں۔ ''چوزے کی آنکھوں میں اجگر بیٹھے تھے والی رونق گیاوی ہیں نا'' میں نے اثبات میں سر ہلایا تو مجتبیٰ کو وہاب صاحب نے کہا کہ انہیں بانی پر تحقیقی مقالہ لکھنے کے لئے کہیے۔ یہ اچھا کر سکیں گے۔ پھر اسی وقت مجتبیٰ نے وہاب صاحب کو کہا کہ آپ ہی انہیں تفصیل سے Synopsis لکھوا دیجئے۔ پھر میں کاغذ اور قلم لے کر تیار ہو گیا۔ تقریباً آدھ گھنٹے میں ہی وہاب صاحب نے مجھے ڈکٹیٹ کر بانی پر سات ابواب پر مشتمل Synopsis تیار کرا دیا۔ موضوع تھا ''بانی فکر و فن ایک مطالعہ''۔ وہاب صاحب نے مجتبیٰ سے اسکا انگریزی ترجمہ کرنے کو کہا۔ مجتبیٰ نے "Bani his mind and Art" لکھوایا۔ وہاب صاحب کچھ دیر خاموش رہے پھر کہا یہاں Mind سے زیادہ Mentality زیادہ فکر انگیز ہے۔ لیکن مجتبیٰ نے انہیں Mind لفظ کی بلاغت سے لاجواب کر دیا۔ وہاب صاحب بھی دلائل سے مطمئن ہو گئے۔ اس ضمن میں وضاحت ضروری ہے کہ مجتبیٰ انگریزی کے ساتھ فارسی زبان پر بھی قدرتِ کاملہ رکھتے تھے۔ ان کی ہندی کمزور تھی۔ ہندی کے جدید شاعر دشینت کمار کے مقام و مرتبے سے بھی وہ ناواقف تھے۔ غزل ان کی کمزوری اور طاقت دونوں تھی۔ نظموں کی طرف انہوں نے کبھی سنجیدگی سے دھیان نہیں دیا۔ غزل میں ان کی کمزوری یہ تھی کہ نئی ردیف خود دریافت نہیں کرتے تھے بلکہ کسی ابھرتے ہوئے شاعر کی دریافت شدہ ردیف

اور زمین میں فصل شعر اس سلیقے سے اگاتے تھے کہ نیا شاعر پشیمان ہو کر رہ جاتا۔ اردو غزل میں میں نے سب سے پہلے مومن کی مشہور غزل جس مصرع '' میں الزام اس کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا'' پر پہلی غزل کہی تھی۔ اس کے بعد اسی طرح پر صدیق مجیبی ، بشر نواز اور نجم عثمانی نے بھی اشعار کی تخلیق کی۔ اس کے بعد مجیبی سے جب میری ملاقات ہوئی تو انہوں نے میری غزل کا حوالہ دیکر کہا کہ '' دیکھو رفیق! غزل یوں کہی جاتی ہے''۔ مجیبی کا یہ شعر آج بھی مجھے یاد ہے جو طبیعتاً غیر تقلیدی ہے اور مومن کے بعد میرے پاؤں کے نیچے کی زمین کی ایک پرت جیسی ہے۔ اسی طرح میں مجیبی کا یہ شعر '' اکیلے پن کا اک دوزخ لئے پھرتا ہوں سینے میں ☆ ذرا جگی میری آواز اور شعلہ نکل آیا۔ میرا ایک شعر تھا وجود اپنا کسی ڈھتے مکاں کا پیش خیمہ ہے ☆ ذرا دیوار کی اونچی تو دروازہ نکل آیا۔ مجیبی نے اسے کافی پسند کیا اور اس کے حوالے سے کہا کہ تمہارے معاصرین میں جتنے لوگ ہیں سب تمہاری تلے چاٹ رہے ہیں۔ مجیبی کے اس جملے میں مبالغہ آمیزی کم اور تمسخر زیادہ تھا۔ میں نے مجیبی کو شراب کے ساتھ نصیحت بھی پلائی ہے۔ وہ مجھ سے تقریباً پچیس سال بڑے تھے۔ وہ دوست بھی تھے اور بزرگ بھی۔ میں نے انہیں پرکاش فکری کے ساتھ ہند پیڑھی سے ڈورنڈا تک پہنچانے پھر واپس لانے میں اکثر و بیشتر معذوری ظاہر کی تھی۔ کیونکہ میرے بہکنے کی بھی ایک خوشنما حد تھی۔ مجیبی کے یہاں طبیعت میں بلا کی شوخی اور جو کھلنڈراپن تھا وہ محض مصنوعی تماشے کی حیثیت رکھتے تھے۔ مجیبی کی ذات کے اندھے کوئیں میں بہتوں نے اترنے کی کوششیں کیں لیکن ناکام رہے میری تحقیق کا موضوع جنوبی چھوٹا ناگپور میں گدی برادری کی ادبی خدمات تھا۔ میں نے ان کی نگرانی میں بانی پر پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کا منصوبہ بنایا تھا لیکن یہ قدرت کو منظور نہ تھا۔ اس کے الٹ میں نے خود اپنی نگرانی میں صدیق مجیبی کو مقالے کا موضوع بنایا۔ میں نے اپنے تحقیقی مقالے میں اسے پاجی شاعر قرار دیا ہے۔ لفظ پاجی اردو غزل میں صرف غالب پر منطبق ہوتا ہے۔ میں نے اس طلسم کو بخوبی توڑا ہے۔ اور نتیجہ برآمد کیا ہے کہ بہتوں کو غیر ضروری طور پر مجیبی فہمی کا غرہ ہے۔ مجیبی کی شاعری سے اکثر لوگ دھوکہ کھاتے ہیں۔ شراب کے نشے میں ولی اللہ کی کرامتوں کے ظہور اور اس کے اسباب وعلل میں گہرائی تک پہنچتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد تک کو کانٹوں میں گھسیٹتے رہے ہیں۔ جگنو سے آگ لگانے والا یہ شاعر اپنے گرد و پیش کے مظاہر فطرت سے بہت زیادہ علم و آگہی رکھنے کے باوصف قہر درویش بر جان درویش کی عملی معنویت کا جب اظہار کرتا ہے تو پوشیدہ وقوع اور خدشات سر ابھارنے لگتے ہیں۔ میں نے اپنے تحقیقی مضمون جنوبی چھوٹا ناگپور میں گدی برادری کی ادبی خدمات میں جس اہم شاعر پر اپنا ذہن مرتکز کیا ہے وہ صدیق مجیبی ہے۔ مجیبی کے تعلق سے میں نے لفظ پاجی کا بھی استعمال کیا ہے۔ اس کے لغت میں کئی معنی ہیں۔ جیسے نالائق، کمینہ، بے ہودہ، بے فائدہ، ناحق، باطل۔ کیا یہ چھ منفی اشارات غالب جیسے بلند مرتبت شاعر کی طبیعت کا اٹوٹ حصہ نہیں ہیں؟ کیا صدیق مجیبی غزل میں غالب کی شاعرانہ ذہنیت کے قریب نظر نہیں آتے ہیں۔ منفرد تاویلات کے سہارے صدیق مجیبی کی شعری حس کے قریب بھی کسی

راستے سے ہم پہنچ سکتے ہیں۔ میرے اس دعوے کو معتبر کرنے میں صدیق مجیبی کی ناآسودگی لازوال استعارے میں تحلیل ہوتی نظر آتی ہے۔ مجیبی کے یہاں شعری تلازمے اہم رول نبھاتے ہیں۔ میں صدیق مجیبی کو جھارکھنڈ کا ''صاحب عہد'' شاعر سمجھتا ہوں۔ اس ضمن میں پاکستان کے غلام حسین ساجد کا دھیان مرکوز کرنا چاہوں گا اور انہیں گوش گزار کرنا چاہوں گا کہ جغرافیائی تقسیم سے پیدا شدہ تہذیب کا بحران بھی منقسم خطے میں رہنے والے شاعر صدیق مجیبی کسی بھی اہم پاکستانی شاعر کے مرتبے کے قریب پہنچتے ہیں۔ درج ذیل اشعار کی نفسیات پر ہم غور کرتے چلیں تو مجیبی کے اشعار کی تفہیم میں آسانی ہوگی۔

میں نے ہنسنے کی اذیت جھیل لی رویا نہیں
یہ سلیقہ بھی کوئی آسان جینے کا نہ تھا
اے غبارِ جاں تجھے لے جاؤں کس صحرا کی اور
میری مٹی نے تو اب تک رائگاں مجھ کو کیا
تمہاری مرجانہ سیاست یقیں کا چہرہ جھلس چکی ہے
ہمارے سہمے ہوئے مکانوں پر امتیازی نشان مت دو
یہ شاخ ہی شاید میری کاوش کا ثمر دے
اک نقش سرِ آبِ رواں کھینچ رہا ہوں

محولہ تمام اشعار کی روشنی میں کہہ سکتا ہوں کہ صدیق مجیبی کا فکروفن اس صدی کے المناک حوالوں اور لازوال استعاروں سے مزین ہے۔

☆☆☆☆☆

شہر آئینہ

(۱)

احمد زین الدین کے افسانوں کے اسلوب

● صبا اکرام [پاکستان]

احمد زین الدین کے افسانے سماجی، ثقافتی اور بعض جگہوں پر معاشی تجربوں کی ایک دنیا پیش کرتے ہیں، جسے دیکھنے کے لئے قاری کو بیانیہ کی راہ میں کبھی تلمیحی، تمثیلی، استعاراتی، علامتی اور پیکر تراشی کے رہگزاروں سے ہوکر آگے بڑھنا ہوتا ہے، اور کبھی تجربہ کی کسی چھوٹی سی پگڈنڈی سے ہوکر نکلنا پڑتا ہے۔ مگر کسی بھی مرحلے پر اسے نہ تو بے معنویت اور نہ ہی عدم ابلاغ کے دھندلکوں کا راستا ہوتا ہے۔ وہ پورے سفر کے دوران محویت کی سرشاری میں کھویا رہتا ہے۔ اس محویت کی وجہ شاید احمد زین الدین کے بیانیہ اور اس کی نثر میں موجود وہ روانی ہے جو قاری کو بہائے لے جاتی ہے۔ بیانیہ کی ایسی ہی روانی کے لئے انتھونی ٹرولوپ نے کہا تھا:

> " His Language must come from him as music comes from the rappid touch of the great performer's fingers, as words come form the month of an indignant orator......"
>
> (Anthony Trollope- "Autobiography")

احمد زین الدین کے یہاں مختلف افسانوں میں الگ الگ تکنیک اور اسلوب کو دیکھتے ہوئے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس کے یہاں اس حوالے سے کوئی پہچان نہیں بن پائی ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ اس کی وجہ اس کے یہاں موضوعات کا تنوع اور بیشتر افسانوں میں مرکزی خیال کی رنگارنگی ہے۔ فورم کے اعتبار سے ہر ایک کا اپنا الگ تقاضہ بھی ہوگا۔ میں یہاں معروف فکشن رائٹر نیر مسعود کی رائے نقل کرنا چاہوں گا جو ایسی صورت کی تفہیم میں معاون ہے۔ انہوں نے کہا ہے:

"یہ فیصلہ کرنا افسانہ نگار کا کام ہے کہ کون سا افسانہ کس تکنیک اور کس اسلوب میں

لکھا جائے اور تکنیک، اسلوب اور موضوع کو کس طرح ہم آہنگ کیا جائے۔

(''افسانے کی تلاش'' از غیر مسعود، شہرزاد کراچی، ۲۰۱۱ء)

احمد زین الدین کے افسانوں کے حوالے سے کچھ اسی قسم کی بات ایک اہم افسانہ نگار شوکت صدیقی نے کی ہے۔ ان کا خیال ہے:

''احمد زین الدین مشاق افسانہ نگار ہیں۔ لکھنے کا فن جانتے ہیں۔ تخلیق کے عمل میں موضوع کو اپنی گرفت رکھتے ہیں، اور اس اظہار و ابلاغ کے لئے وہ اسلوب اختیار کرتے ہیں، جو موضوع سے مطابقت اور ہم آہنگی رکھتا ہو۔''

(دریچے میں ججی حیرانی، از احمد زین الدین، کراچی، ۱۹۹۷ء)

احمد زین الدین کے موضوعات اور مرکزی خیالات کے حوالے سے اس کے افسانوں پر نظر ڈالیں تو سماجی آگہی کی کربنا کی بھی نظر آتی ہے، ہجرت کا درد بھی، لسانی اور فرقہ وارانہ فسادات کی لرزہ خیزی کی تصویریں بھی، خیر وشر کے درمیان کھینچا تانی کی جھلکیاں اور شہر آشوب کی ڈراونی پرچھائیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ ذرا قبل کی اس کی افسانوی تخلیقات پر نظر ڈالیں تو Romantic Sensibility کی فضا میں تمثیل کا رنگ جگاتی کہانیاں بھی سامنے آتی ہیں۔ ان ـ موں کی پیش کش میں اس نے وہی اسلوب اپنائے ہیں جو ان سے ہم آہنگ ہو سکتے تھے۔ ایک آدھ جگہ ایسا بھا ہوا ہے کہ اس نے کئی اسالیب کے رنگوں میں برش ڈبو کر ہیئتی اعتبار سے ایک نیا Shade سامنے لانے کی کوشش کی ہے، جیسا کہ سن ساٹھ کے بعد تجربہ کرنے والے کچھ افسانہ نگاروں کے یہاں نظر آتا ہے۔ مگر احمد زین الدین کی خوبی یہ ہے کہ اس کے سارے نقوش ہی چھپ جائیں اور وہ بے معنویت اور لایعنیت کی حدوں کو چھونے والی ایسی تجرید کا نمونہ پیش کرنے لگے جو ترسیل سے عہدہ برآ ہونے کی اہلیت نہیں رکھتی ہے۔ اس حوالے سے احمد زین الدین کے ایک افسانہ ''اندھیرے میں سبز کونپل''، جس میں اس نے تلمیح، پیکر اور استعارے کے ساتھ جگہ جگہ تجرید کا سہارا بھی لیا ہے، ایک اقتباس پیش کرنا چاہوں گا۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ اس وقت کے جدیدیت کے رویے سے کسب فیض کرتا ہوا نظر آتا ہے:

''قبروں کے اونچے نیچے ٹیلوں کے درمیان تیز روشنی کی سیاہ چادر اوڑھے، ناچتی روحوں کی آوارہ چیخیں سنتے سنتے وہ مردہ ہو چکا تھا۔ اب اس میں گھنگھروؤں کے بلکتے ہوئے بے ربط نوحوں کے سننے کی سکت باقی نہ تھی۔ تیز ہواؤں کا شور چنگھاڑتے ہوئے سمندر کے اوپر سے گزر رہا تھا، اور وہ چپ کی چادر کے نیچے سسکتی ہوئی آوازوں پر ماتم کناں تھا۔ روشنی کی متلاشی آوارہ روحیں ببول کے گھنے جنگلوں میں گم ہو گئی تھیں۔ جذبوں کی کڑیوں میں پروئے ہوئے مردہ لاشے پھولوں کے رقص میں کھو گئے تھے۔ پھر اس نے کسمساتی روح کی دیوار گرادی اور اونگھتے جذبوں نے

سیاہ چادر سے منہ نکال کر صبح کی دستک کا جواب دیا۔''

افسانے کو کردار، ماحول اور پلاٹ کے حصار سے آزاد کرانے کے لئے روایت سے بغاوت میں کچھ افسانہ نگار تو اتنا آگے بڑھے کہ بھول بھلیوں میں افسانے کو پہنچادیا اور وہ ذہنی انتشار اور پر اسرار ماورائی اور باطنی احساسات کا آئینہ دار نظر آنے لگا، مگر احمد زین الدین جدیدیت کی راہ میں ہمیشہ اعتدال پسند پیش روؤں کو نظر میں رکھ کر آگے بڑھتا رہا۔ اس نے جملوں کی روایتی ساخت سے تو دامن بچایا، مگر تخلیقی بیانیہ سے رشتہ کبھی نہ توڑا اور اسے بیان کی حد تک نہیں قید کیا۔ جس کے بارے میں اپنے ایک مضمون'' بیان و بیانیہ کی آویزش اور اردو افسانہ'' میں اپنی رائے کا اظہار ڈاکٹر (پروفیسر) صغیر افراہیم نے کچھ اس طرح کیا ہے:

''.....جدید افسانوں میں بیان تو موجود تھا مگر بیان کنندہ بڑی حد تک غائب تھا اور یہی غیاب بیان کو بیانیہ بننے سے روکتا ہے۔''

(معاصر اردو ادب۔ مرتب قمر الہدیٰ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۲۰۰۷ء)

احمد زین الدین کے افسانہ'' تازہ ہوا کے شور میں'' کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے پروفیسر سحر انصاری نے لکھا ہے:

''اس افسانے کا پس منظر انقلاب روس سمیت ایسے تمام انقلابات ہیں، جو انسان کی فلاح و بہبود کے لئے برپا کیے گئے ہیں۔ ان کی ایک نظریاتی اساس رہی ہے جسے نہ صرف ان کے مقامی اذہان بلکہ عالمی اور بین الاقوامی سطح پر بھی انسانوں کی بڑی تعداد مانتی رہی، لیکن ایک وقت آیا جب اکابر نظریہ سازوں کے مجسموں کی گردنوں میں رسے ڈال کر انہیں زمیں بوس کردیا گیا۔ یہ واقعات تو اخبارات میں بھی شائع ہوئے، لیکن احمد زین الدین کے ٹریٹمنٹ اور افسانے کے آخر میں سوال اٹھانے کی تخلیقی جرأت نے اس افسانے کو اثر انگیز بنادیا ہے۔''

احمد زین الدین نے اس سیاسی واقعہ اور اخبار کی سُرخی کو بڑے فنکارانہ انداز میں ایک ایسے اسلوب کو اختیار کرتے ہوئے پیش کیا ہے جس کا جز وغالب مکالمے ہیں۔ اس کی ایک جھلک افسانے کے ایک اقتباس کے ذریعے پیش کرنا چاہوں گا:

''ماں، یہ مجسمہ جھوٹ ہے۔''

نہیں بیٹا! یہ ایک قوم کی ستر سالہ تاریخ ہے، ایک کلچے کی علامت ہے۔ حقوقِ انسانی کے خواب کی تعبیر ہے۔ مظلوموں کا منشور ہے اور ایک تاریخی سچائی ہے۔''

''نہیں ماں! میں نہیں مانتا۔ اس نے ایک طبقے کو سب کچھ دیا اور دوسرے کو سہانے خواب...... وہ بھی گونگے کے خواب...... یہ ڈھونگ ہے۔ یہ ڈھونگ ہے۔

اسے ڈھادوں گا۔"

("دریچے میں سجی حیرانی" از احمد زین الدین، فکشن گروپ، کراچی، ۱۹۹۷ء)

"آنکھ کا عذاب" احمد زین الدین کا ایسا افسانہ ہے جو کراچی میں سن ۱۹۹۲ء میں ایم کیو ایم کے خلاف شروع کئے گئے فوجی آپریشن کے نتیجے میں جنم لینے والے شہر آشوب کو بیان کرنے کے لئے اپنے ساتھ ایک مضبوط اشاراتی نظام ساتھ لے کر آیا ہے۔ ملاحظہ ہو افسانے کا یہ اقتباس:

"آپ نے یہ سفر کیوں اختیار کیا تھا؟ کیا وہاں کی زمین تنگ کر دی گئی تھی؟

"نہیں، یہ بات نہیں"

"تو پھر........!"

"تیرے، آنے والے اچھے دنوں کے لئے ہم نے ایسا کیا تھا اور اب؟"

وہ کچھ نہ کہہ پاتے، بس روتے چلے جاتے اور میں ان کے آنسوؤں کو دیکھتا رہ جاتا۔

پچھلے دنوں وہ بھی اپنوں کی گولیوں کا رزق بن گئے۔"

شہر آشوب کے موضوع پر کراچی کے تقریباً تمام افسانہ نگاروں نے کہانیاں لکھی ہیں، اور اس کی کربنا کی کو اپنے اپنے انداز میں منعکس کیا ہے۔ احمد زین الدین کا یہ افسانہ بھی اپنی اثر انگیزی اور کیفیت کے اعتبار سے نہایت کامیاب ہے۔ اس افسانے کی خوبی یہ ہے کہ اوپری سطح پر ٹھہراؤ قائم رکھتے ہوئے اپنے بطون میں ایک کالی آندھی کی خوفنا کی چھپائے ہوئے ہے۔ احمد زین الدین چونکہ خود بھی دہری ہجرت سے گزرا ہے، لہٰذا خوب اچھی طرح واقف ہے کہ ایسی دردناک صورتِ حال کا سامنا کرنے والے لوگ Identity Crisis کے کس عذاب کو اپنے اندر روح میں اُتار کر زندگی جیتے ہیں۔ اسی افسانے سے ایک اور اقتباس دیکھیں:

"زندگی سفر میں کٹ گئی پھر بھی کچھ نہ ملا۔ نسلوں کی تباہی کا غم سہتے سہتے ہم کہاں نکل آئے۔ نہ کوئی شناخت، نہ کوئی حوالہ۔"

"درد کی بازگشت" احمد زین الدین کا ایسا افسانہ ہے، جس میں کشمیر میں جاری تحریک میں اپنی جانیں نچھاور کرنے والوں کی دردناک کہانی پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ وہاں کی صورتِ حال کا بیان مرکزی کردار صادق کے توسط سے اس طرح کیا گیا ہے کہ فضا درد اور سسکیوں میں ڈوبی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اس افسانے کی اصل خوبی اس کی فضا بندی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وادی کے حالات اور وہاں کی فضا کردار بن گئے ہیں۔

احمد زین الدین نے اپنے افسانہ "زندگی کے ساز پر" میں (جو بنگلہ دیش کے پس منظر میں لکھا گیا ہے) منٹو کے پسندیدہ موضوع یعنی جسم فروشی کے حوالے سے عورت کی مجبوری کو پیش کیا ہے۔ مگر اسے ذرا مختلف Shade دینے کے لئے اس نے جنسی اور نفسیاتی تہوں میں جھانکنے کی بجائے، سماجی اور معاشی پہلوؤں کو اُجاگر

کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کے لئے اس نے حقیقت نگاری کے فورم کو اپنایا ہے۔مگر یہ وہ سماجی حقیقت نگاری نہیں ہے۔جس کا پیش رو منشی پریم چند کو قرار دیا جاتا ہے۔
احمد زین الدین نے اس افسانے میں کچھ تمثیلی ،اور تشبیہی پیرائے کو اس طرح بیانیہ کا فطری حصہ بنایا ہے کہ حقیقت کی شعائیں خارج نہیں، بلکہ داخل سے پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔شاید ایسی ہی حقیقت نگاری کے بارے میں ڈاکٹر سلیم آغا نے لکھا ہے:''حقیقت نگاری سے مراد یہ ہے کہ جس چیز کو پیش کیا جائے وہ اپنے منجمد خدوخال یعنی "Still Life" کی صورت میں سامنے نہ آئے بلکہ ایک دھڑکتی ،حرکت کرتی ذی روح حقیقت کے طور پر اُبھرے(''جدید اردو افسانے کے رجحانات'' از ڈاکٹر سلیم آغا،کراچی،۲۰۰۰ء)
احمد زین الدین کے اس افسانے سے ایک اقتباس یہاں نقل کرنا چاہوں گا:
''مگر آپ جیسے کتنے ہی لوگ میری مسکراہٹ کے سہارے آئے اور اپنا مطلب پورا کر کے چلے گئے۔کسی نے اس قدر نہیں سوچا۔آخر آپ کیوں اتنا سوچ رہے ہیں۔آپ بھی تو انہیں جیسے مرد ہیں۔اس کی آواز میں ایک چیلنج تھا اور وہ اپنی سیمابی طبیعت کی چنچلتا سمیٹے اداس ہو گئی تھی۔لیکن اس کے انگ انگ میں ایک تھمی تھمی سی تڑپ اور ایک سہا سہا سا اضطراب کروٹیں لے رہا تھا۔پھر میرے ذہن سے اس کا یہ جملہ...''آپ بھی تو انہیں جیسے ہیں۔''ٹکراتا ہوا میرے احساس میں بکھر گیا۔میرے کان لال ہو گئے اور میرا جی چاہا کہ میں بھی انہیں جیسا مرد بن جاؤں،لیکن میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا،مجھے دکھ کے نغمے ،بہت متاثر کرتے ہیں ۔اس لئے کہ ان میں بڑی نغمگی اور ابدیت ہوتی ہے۔''(''زندگی کے ساز پر'')
اُوپر پیش کی گئیں آراء اور مثالوں سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ احمد زین الدین نے اپنے افسانوں میں بلاغت کے جو پیرائے استعمال کئے ہیں وہ استعاراتی ،اشاراتی ،تمثیلی اور علامتی اظہار کا مظہر ہیں جو تخلیقی حقیقت نگاری کے سہارے افسانوں کی بنت میں شامل ہو کر ان کا حصہ بن گئے ہیں۔ایسا لگتا ہے کہ ان کو افسانہ خود اپنے ہمراہ لے کر آیا ہے،اور افسانہ نگار کی شعوری کوشش کو اس میں کوئی دخل نہیں۔احمد زین الدین کے افسانوں کے اسلوب کے حوالے سے اپنی اس تحریر کا اختتام میں یہاں اینٹوں شیہوف کی رائے کو نقل کر کے کرنا چاہوں گا جو افسانے یا فکشن میں اسلوب کے حوالے سے حقیقت کو سمجھنے میں معاون ہے:

" I come more and more to the Conviction that it is not a question of new or old from, but what matters is that a man should write without thinking about forms at all, write because it springs freely from his soul."(Anton ....- "The Seagul")

☆☆☆

(۲)

پروین شیر کی نظمیں اور تنہائی کی بولتی تصویریں

● صبا اکرام [پاکستان]

شمس الرحمن فاروقی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے ''شاعر زندگی کے تجربات کا اظہار کرتا ہے اور تنہائی بھی ایک تجربہ ہے''، اسی مضمون میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

> ''عمومی حیثیت سے تنہائی کا احساس شاعر کی شخصیت کی تعمیر میں نمایاں رول ادا کرتا ہے۔ انسان شاعری ہی اس لیے کرتا ہے کہ وہ تنہا محسوس کرتا ہے۔ اگر وہ سب کی طرح سوچتا دیکھتا ہوتو اسے ایک الگ زبان کی ضرورت ہی کیوں پڑے؟''
>
> (''جدید ادب کا تنہا آدمی، نئے معاشرے کے ویرانے میں''
> ''شعر، غیر شعر اور نثر''، الٰہ آباد، ۱۹۷۳ء)

میں نے اپنی تحریر کے آغاز میں تنہائی کے حوالے سے فاروقی صاحب کے مضمون سے اقتباس پیش کرنا اس لیے مناسب سمجھا کہ پروین شیر کے شعری مجموعہ ''چہرۂ گل دھواں دھواں سا ہے'' کے مطالعے کے دوران اداسی کی جس فضا اور روح میں اُترتی ہوئی تنہائی کے احساس کی جن پرچھائیوں سے گزرا ہوں ان کو مثبت صورت میں بیان کرسکوں تا کہ قاری کا ذہن تنہائی کے حوالے سے ''عدمیت اور نیستی'' کی وجودی سوچ کی طرف نہ چلا جائے، جو ہاتھ پکڑ کر زندگی کے Waste Land میں چھوڑ آتی ہے۔ وجودی نقطۂ

نظر سے تنہائی کو بیان کرتے ہوئے ہمارے دوست ڈاکٹر لطف الرحمن نے اپنی کتاب ''جدیدیت کی جمالیات'' میں لکھا ہے:

''......عصری معاشرہ تنہا اکائیوں کی ایک بھیڑ ہے۔ بہت قریب رہ کر بھی لوگ ایک دوسرے سے دوری پر ہیں۔ داخلیت کی گہرائیوں میں نادیدہ مسافت حائل ہے۔ باہمی گفتگو بھی ترسیل کی ناکامی کا المیہ ہے۔ تنہا لوگوں کی بھیڑ یا ہجومِ تنہائی میں فرد خود کو خلا میں محسوس کرتا ہے۔ یہ تنہائی داخلی ہے، خارجی نہیں۔''

(''جدیدیت کی جمالیات''، از لطف الرحمن، بھاگلپور، بہار، ۱۹۹۳ء)

وجودی صورت حال کے تحت تنہائی بھی اپنی جگہ، اس کے اثرات بھی کہیں کہیں پروین شیر کی نظموں میں نظر آجاتے ہیں۔ محرومی و ناامیدی، اضطراب و انتشار، دکھ درد اور خوف کی صورتوں میں بھی تنہائی کا احساس اُجاگر ہوتا ہے۔ مگر اس کے یہاں تنہائی اور اُداسی کا جو کارن ڈاکٹر سیّد محمد عقیل نے اس کی نظم ''اب کہاں جاؤں گی'' کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے بیان کیا ہے وہی دراصل بنیادی source ہے اس کیفیت کا۔ وہ کہتے ہیں:

''نظم اپنے وجود کے عمومی تحرک سے اس طرح شروع ہوتی ہے جیسے قاری اور سامع ایک بے سہارا اور متجسس (Inquisitive) بچی کو اِدھر اُدھر بے یار و مددگار بھٹکتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ 'منھ اندھیرے جو گھر سے نکلی تھی میں' یہی بے سہارا اور بے یقین (Un-certain) تصور اور ماحول نظم کو پھر آگے لے کر چلتا ہے جہاں ایک گھر ہی بچی کا سہارا تھا۔''

(''جوش بانی''، ترقی پسند نظم نمبر۔ مرتبین: اقبال حیدر، علی احمد فاطمی، الہ آباد ۲۰۱۱ء)

پروین شیر نے اس نظم میں ایک جگہ جن مناظر کی تصویر کشی کی ہے، اس سے بے گھری کا احساس بھی جنم لیتا ہے، اور ایسا لگتا ہے کہ کوئی بہت عزیز شخصیت جو اس کی زندگی کا بہت بڑا سہارا تھی، اور جس کی وجہ سے اس کا مکان گھر بنا ہوا تھا، وہ اب موجود نہیں، اور یہ غیر موجودگی اسے بے سہارا کر گئی ہے:

آج جب پو پھٹے
گھر سے نکلی انہی جنگلوں کی طرف

راستے میں ہوا نے، درختوں نے اور طائروں نے بتایا مجھے

میری جائے اماں

سخت موسم کے جوکھم میں میرا سہارا، وہ پارینہ گھر

ڈھ گیا ہے !

("اب کہاں جاؤں گی")

ایسا لگتا ہے کہ اس کی جان سے بھی زیادہ عزیز یہ شخصیت اس کی ماں تھی، جو اب اس دنیا میں نہیں رہی۔ اور اس بات کی تصدیق اس وقت ہو جاتی ہے جب ہم پروین شیر کی نظم "سفید کپڑوں میں اک مسیحا" پر نظر ڈالتے ہیں:

ضرور کچھ سانحہ ہوا تھا

ایک لمحے میں کچھ سے کچھ کر کے رکھ دیا تھا!

سفید، بُراق ایک چادر سے ڈھانپ کر اپنے زخم سارے

تو چل پڑی تھی ان اونچے نیچے سے راستوں پر

تو سوگواری کی دردانگیز اوڑھنی میں

بلائے جاں، دل خراش صدموں کو سہتے سہتے

تھی اپنی بچی کی ایک ضامن!

سفید کپڑوں میں اک مسیحا

جو باپ بھی تھی اور ایک ماں بھی!

عام طور پر دیکھا گیا ہے، یا سمجھا جاتا ہے کہ لڑکیوں میں بچپن سے ایک احساس عدم تحفظ کا چھپا ہوتا ہے جو اسے باپ کی جانب کھینچتا ہے، کیونکہ خاندان میں اس کی حیثیت چھتر چھایا کی ہوتی ہے اور وہ تحفظ کی علامت تصور کیا جاتا ہے جب کہ لڑکے ماں، ممتا اور محبت کے متلاشی ہوتے ہیں اور ماں کی قربت میں انھیں سکون ملتا ہے۔ مگر عجیب بات ہے پروین شیر چاہے ممتا اور محبت کی ٹھنڈی چھاؤں کی تلاش میں نکلی ہو یا تحفظ کے گھنے برگد کی کھوج میں، دونوں صورتوں میں وہ ماں کی جانب ہی دیکھتی نظر آتی ہے۔ ایسا لگتا ہے اس کا سب کچھ بس اس کی ماں تھی۔ بعض اوقات محسوس ہوتا ہے کہ وہ باپ کی شخصیت کو Ignore کر رہی ہے۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ اس حوالے سے وہ کسی دکھ کا بوجھ لیے پھر رہی ہے، یا شاید نسائیت کی سوچ کے تحت Male Chauvinism کے خلاف جذبات کے اظہار کی یہ ایک صورت ہو؟ مگر پروین شیر کی نظم ''یذبذب'' میں کسی کے انتظار کی جانب جو ایک اشارہ ہے وہ ایسے تمام منفی خیالات پر خطِ تنسیخ کھینچ دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو نظم کا یہ حصہ:

اسی اک آس پر ہے منحصر اب تو مری ہستی
کہ شاید پھر تمھیں تشنہ لبی واپس یہاں لائے
تمھیں تسکین دینے سے مجھے تسکین مل جائے
مگر ڈرتی ہوں تم شاید بہت تاخیر سے آؤ
تو پھر ایسا نہ ہو کچے کنوئیں کا ٹھنڈا پانی
خشک ہو جائے
تمھاری تشنگی کو میں تشفی میں بدلنے سے بہت پہلے
تہی داماں ہو جاؤں

پروین شیر کے یہاں جہاں ایک طرف ماں کے حوالے سے ہمیشہ کے لیے کسی کو گنوا دینے کے احساس کے گہرے بادل اُتر آئے ہیں، وہیں دوسری جانب کسی بچھڑے ہوئے سے ملنے کی آس کی لو کی مدھم سے روشنی میں وہ بہت ہمت سے اپنا سامنا کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ کبھی اس لو میں وہ خود سلگتی بھی ہے اور کبھی اس کو وسوسوں کے جنگل میں اندھیروں سے گزرتے ہوئے اپنا سہارا بناتی ہے۔ ان کیفیات کو اور اس پوری فضا کو اپنی نظموں میں پیش کرنے کے لیے میرا جی اور کچھ دیگر جدید شاعروں کی طرح مناظرِ فطرت کو جگہ جگہ استعارے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ یہی استعارے اس کے یہاں اشاراتی نظام کی بھی تعمیر کرتے ہیں اور لفظوں کے ذریعے پیکر تراشنے کے عمل میں بھی، یعنی امیجری کی تخلیق میں بھی مددگار و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ملاحظہ ہو اس کی نظم ''جاوداں'' کی یہ چند لائنیں:

یہ کیوں ہے؟
کہ نغمے بھی بے نشان ہو گئے ہیں
فلک چشمِ تر ہے

لٹاتا ہے قطرے گہر کے

شجر اپنی مغموم آنکھوں سے

تکتا ہوا آسماں کو

کسی سوچ میں گم کھڑا ہے

وہ سورج درخشانیاں جو لٹاتا رہا

وہی آج تھک کر بجھا ہے

ایک اور نظم ''سکوت'' سے بھی یہ مثال دیکھیں اور پروین شیر کے یہاں خوب صورت پیکر تراشی کی داد دیں:

ہوا بھی اپنی آنکھیں مُوندے

خاموشی سے اک کونے میں

بیٹھ گئی ہے

اس کے ساتھی

چنچل تارے

آنکھ مچولی بھول کے بادل کے آنچل سے

سہمے سہمے جھانک رہے ہیں

ریٹائرمنٹ یا ملازمت سے سبکدوشی کا لمحہ اس شخص کی زندگی میں ایک بار ضرور آتا ہے جو کسی نہ کسی ملازمت سے منسلک ہے۔ یہ لمحہ ایک ایسے درد کو جنم دیتا ہے جس میں نسبتاً خوشحال ماضی سے بچھڑنے اور مستقبل کے حوالے سے عدم تحفظ کا احساس بھی شامل ہوتا ہے۔ سالہا سال تک ساتھ کام کرنے والے دوستوں سے الگ ہونے کا دکھ بھی ہوتا ہے اور اس جگہ کے چھوٹ جانے کا افسوس بھی جو مالی طور پر تحفظ کا ضامن رہا ہے۔ ریٹائرمنٹ کے لمحے کو پروین شیر نے جس طرح اپنی نظم میں قید کیا ہے، ایسی مثال مجھے اب تک کہیں اور نظر نہیں آئی۔ نظم پڑھ کر وقت کے سامنے انسان کی بے مائیگی کا شدید احساس ہوتا ہے:

عجیب وقت ہے یہ آج

مدت مدید جیسے ایک لمحے میں سمٹ کے رہ گئی

نظر اٹھا کے تک رہا ہے سامنے لگی ہوئی گھڑی کو وہ

دھڑک رہا ہے دل عجیب وسوسوں سے، خوف سے

کہ پانچ تک کلاک کی سوئی پہنچ کے اغلباً

سدا رکی رہے گی اس کے واسطے!

(''ریٹائرمنٹ'')

جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا ہے پروین شیر کی نظمیں پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کی زندگی سے کوئی بہت عزیز شے کھوگئی ہے۔ لگتا ہے اس کا یہ احساس درد بن کر اس کی آتما کی گہرائیوں میں دور تک پہنچ چکا ہے اور جب وہ فطری مناظر کے مشاہدے سے ہم آہنگ ہو کر شعری روپ اختیار کرتا ہے تو ایک ایسی اداسی کا احساس ہوتا ہے جس میں خاموشی سرگوشیاں کرتی اور اس کا اکیلاپن بانٹتی محسوس ہوتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں اس کی نظم ''غم گسار'' کی یہ لائنیں، آپ کو لگے گا کہ ''درخت'' جو ایک استعارے کی صورت میں پیش ہوا ہے، اس کے احساسات کی دنیا میں ایک سانس لیتے ہوئے وجود کی صورت اختیار کر گیا ہے:

کھڑا ہے درخت جو برسوں سے میرے گھر کے قریب

ہے میرا ہمدم جاں، میرا غم گسار ایسا

کہ میں نے اپنے دریچے سے اس کو تکتے ہوئے

گِنا ہے نبضوں کو اس کی ہر ایک موسم میں

فطرت سے قریب تر یہی رشتہ پروین شیر کو تمام تر صورت حال کے باوجود کسی موڑ پر خود ترحمی کا شکار نہیں ہونے دیتا۔

پروین شیر کے یہاں ڈکشن کے اعتبار سے دیکھیں تو بہت کم صورتوں میں فارسی الفاظ سے امتزاج کی کوشش نظر آتی ہے۔ ہندی کے شبد بھی نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اگر کہیں فارسی ڈکشن کا امتزاج نظر آتا بھی ہے تو محسوس یہی ہوتا ہے کہ نظم اسے خود اپنے ساتھ لے کر آئی ہے اور اس کے امتزاج کے لیے شاعر کی شعوری کوشش کو دخل نہیں۔

☆☆☆

مجیب تین اہم نام ہیں۔قوم وملت کے نمائندہ دانشوروں میں ان تینوں کے نام سرفہرست ہیں۔انگریزی زبان وادب کے عالم تو تھے ہی، اردو زبان وادب کے نمائندہ مشاہیر میں آج بھی ان لوگوں کے نام لئے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر سید عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب ان دونوں نے مل کر ملک وقوم اور ملت اسلامیہ کے درپیش مسائل وموضوعات پر جم کر تصنیفی کام کیا۔عابد صاحب کی دو کتابیں (۱) ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں اور (۲) قومی تہذیب کا مسئلہ۔فکروسوچ کے اسی نہج پر اردو زبان میں لکھی گئی، شاہکار ہیں۔عابد صاحب نے خود ان دونوں کتابوں کا انگریزی اور جرمن زبان میں ترجمہ کر کے شائع بھی کرایا۔اس کے علاوہ ادب اور فنون لطیفہ کے بھی وہ عالم تھے۔گیٹے کا منظوم ڈرامہ ''فاوست'' کا جو اردو ترجمہ انہوں نے کیا ہے وہ شاہکار ہے۔اس کتاب کے مقدمہ میں ادب اور فنون لطیفہ کے حوالے سے انہوں نے جو خامہ فرسائیاں کی ہیں وہ عدیم المثال ہیں!

پروفیسر محمد مجیب سماجی مفکر اور دانشور کے ساتھ ساتھ ادبیات کے بھی عالم تھے۔روسی ادب پر دو جلدوں میں ان کی کتاب پڑھنے کے لائق ہیں۔وہ کلاسیکی روسی زبان سے کما حقہ واقف تھے۔ چنانچہ انہوں نے براہ راست کلاسیکی روسی ادب کا مطالعہ کیا۔وہ ان قلمکاروں میں سے نہیں تھے جو ترجمہ کے راستے دوسری زبانوں کے ادبیات پر گفتگو کرتے ہیں۔وہ ایک ذمہ دار اور محتاط قلمکار تھے۔بے حد وسیع المطالعہ اور غیر معمولی فکروسوچ کی حامل شخصیت کے مالک تھے۔اردو میں ان کا ایک اور اہم کارنامہ ''انڈیا ونس فریڈم'' کا ''ہماری آزادی'' کے نام سے ترجمہ ہے۔یہ کتاب پہلی بار ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی۔اس کے علاوہ یاد پڑتا ہے کہ ''کیمیاگر'' کے عنوان سے ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ بھی ہے۔اردو زبان پر مجیب صاحب کی گہری نگاہ کی جانب صفدر امام صاحب نے بھی روشنی ڈالی ہے۔

> ''محمد مجیب کی کتاب اسلامیان ہند کی فکری جدوجہد کا نتیجہ ہے۔بھلے ہی یہ کتاب انگریزی زبان میں لکھی گئی۔لیکن لکھنے والے کی مادری زبان اردو ہی ہے۔کتاب کے مشتملات پر غور کریں تو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ اردو تہذیب کا پروردہ شخص ہی ایسی کتاب اور ایسے مضامین لکھ سکتا ہے۔''

یہ واقعہ ہے کہ مجیب صاحب کی غیر معمولی دانشورانہ فکرونظر میں اسلام کی مہتم بالشان روایات و اقدار رچی بسی تھیں۔صفدر امام صاحب نے ٹھیک ہی لکھا ہے کہ ان کی ذہنی اور فکری نشو ونما اردو تہذیب کی مرہون ہے۔

میرا خیال ہے کہ جامعہ کے متذکرہ تینوں بنیادگزار ارکان ثلاثہ کی تحریری دلچسپیوں اور سرگرمیوں کا میدان بنیادی طور پر انگریزی زبان تو تھا ہی، لیکن فکرونظر کی عقبی زمین اردو تہذیب ہی تھی!

خیر اس گفتگو سے قطع نظر عرض یہ کرنا ہے کہ تبصرہ نگار، صفدر امام صاحب نے پروفیسر محمد ذاکر کی اس مترجمہ کتاب پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

تبصرہ نگار نے ایک کام یہ بھی کیا کہ انگریزی متن کے ساتھ اس کا اردو ترجمہ بھی بہ طور موازنہ پیش کر دیا تا کہ آپ اندازہ لگا سکیں کہ مترجم اصل انگریزی متن کی ترجمانی میں کس حد تک کامیاب ہوا ہے۔ اس سلسلے میں عرض یہ کرنا ہے کہ ترجمے کی زبان کے وسیلے سے فن پارے کی اوریجنلٹی کا گمان ہونا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ پروفیسر محمد ذاکر کے اس اردو ترجمہ کو اسی تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔ ۱۴ صفحات پر مشتمل یہ تبصرہ، مبصر کی معروضیت پسندی کا اشاریہ ہے۔

کتاب کی پہلی شق کا دوسرا اہم تبصرہ ریاض الرحمٰن شروانی کی مختصر خودنوشت ''دھوپ چھاؤں'' پر ہے۔ مختصر اس معنی میں کہ یہ ان کی زندگی کی صرف آٹھ برس (۱۹۴۱۔۴۹) کی داستان حیات کو محیط کرتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ خودنوشت شروانی صاحب کی زندگی کے شب و روز کی ایک Selective داستان ہے۔ مزید یہ کہ اس کے مبصر، صفدر امام قادری نے اس پر تبصرہ کر کے اپنے Selective مطالعاتی ذہن کا ثبوت بھی پیش کیا ہے۔ یہ ضرورت اس لیے بھی پڑی کہ اس خودنوشت میں شروانی صاحب کا تصنیفی مرکز ومحور کا دائرہ اس زمانے کے دو کلیدی واقعات وحالات کے گرد گھومتا نظر آتا ہے۔

مبصر نے یہ اطلاع بہم پہنچائی ہے کہ ۱۹۴۶۔۴۸ کا زمانہ شروانی صاحب کی زندگی کا بڑا ہی اہم اور نازک زمانہ تھا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شروانی صاحب کی ہنگامہ خیز تعلیمی زندگی کا دور اور دوسرا تحریک آزادی اور تقسیم ملک کی ہولناکیاں۔ مطلب یہ کہ اس خودنوشت میں علی گڑھ اور تقسیم کی ہولناکیوں کو بنیادی حیثیت حاصل ہے!

شروانی صاحب کی زندگی کے یہ دو غیر معمولی دھارے، مبصر صفدر امام صاحب کے فکری تحرک کے سبب بنے۔ تب ہی تو انہوں نے اس خودنوشت پر اپنی گفتگو کے لیے ڈیمائی سائز میں مطبوعہ ۲۱ صفحات وقف کیے۔ ان ۲۱ صفحوں میں انہوں نے شروانی صاحب کی زندگی کی دھوپ چھاؤں کا جو تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے وہ بڑا ہی دلچسپ اور Readibility سے بھرا ہوا ہے۔ دوران مطالعہ قرأت کی گراں باری کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ تحریر کو دلچسپ اور قابل مطالعہ بنائے رکھنے کے لیے فن نگارش کا یہ بنیادی نکتہ ہے۔ جس کو مبصر نے اس تبصرے میں ملحوظ رکھا ہے!

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے علمی اور تہذیبی ماحول کے جلو میں ریاض الرحمٰن شروانی کی جملہ شخصیت میں جو نکھار پیدا ہوا، یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ زیر گفتگو خودنوشت کے ایک سو صفحات اس کے لیے وقف کیے۔ ان ایک سو صفحات میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تہذیبی، علمی اور سیاسی سرگرمیوں کی ایک مکمل تصویر انہوں نے پیش کر دی ہے۔ صفدر امام صاحب نے ٹھیک ہی لکھا ہے۔

(۳)

صفدر امام قادری کی ''نئی پرانی کتابیں''

● اظہار خضر

''نئی پرانی کتابیں'' جناب صفدر امام قادری کے ۳۲ تحقیقی، تنقیدی اور علمی کتب و رسائل پر مشتمل تبصروں کا مجموعہ ہے۔ جس کا سنہ اشاعت ۲۰۱۳ء ہے۔ زیادہ تر تبصرے طویل ہیں اور کچھ مختصر بھی ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ کتاب میں مشمولہ بیشتر تحریریں، تبصرہ نما مضامین کے زمرے میں آتی ہیں۔ تبصرہ نگاری کے معیار و اقدار کے پیمانۂ فن کے سلسلے میں مصنف نے قاضی عبدالودود کے تبصروں کو پیش نظر رکھا ہے۔ ''التماس'' کے عنوان کے تحت کتاب کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں۔

> ''اُن (قاضی عبدالودود) کے تبصرے پانچ اور سات قسطوں میں رسائل میں شائع ہوئے اور چالیس پچاس صفحات سے لے کر ڈیڑھ دو سو صفحات تک پھیلتے چلے گئے۔ لیکن وہ سب تھے تبصرے''

قاضی صاحب کو سوئی کے ناکے سے اونٹ کو گزارنے کا ہنر آتا تھا۔ انہوں نے اپنی ایک کتاب کا نام ہی ''اشتر و سوزن'' رکھا۔ طوالت میں جامعیت کا فن اگر کسی کو سیکھنا ہو تو ان کی تبصراتی تحریروں سے سیکھے۔

صفدر امام قادری صاحب کے تبصروں میں طوالت کے اس جواز کو پیش نظر رکھیے۔ اور غور فرمایئے کہ وہ اپنے پیش رو بزرگ قلمکاروں کے اس طریقۂ نگارش سے کس حد تک متاثر ہوئے اور کیونکر متاثر ہوئے!

اس سلسلے میں پیش لفظ کا ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمایئے!

''یوں بھی قاضی عبدالودود'' کلیم الدین احمد، رشید حسن خاں اور ظ۔انصاری کی
تحریروں کے زیر سایہ ہماری تربیت کچھ ایسی ہوئی کہ صاف اور دوٹوک انداز میں
بغیر کسی مصلحت کے اپنی بات کہنے سے گریز کرنا نامناسب معلوم ہوتا ہے۔''

بیشتر تبصروں میں وہ ایک سخت گیر تبصرہ نگار کی حیثیت سے ہی نظر آتے ہیں۔ جن سے ان کی صاف گوئی اور دوٹوک طریقۂ نگارش کا پتا چلتا ہے۔ بعض تبصرے ایسے بھی ہیں جن کے مصنف نابغۂ روزگار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان مصنفین کے علمی وادبی مقام ومرتبہ کے اعتراف واقرار میں صفدر امام صاحب نے جو گفتگو کی ہے انہیں آپ ان کی نرم روی پر محمول نہیں کر سکتے، بلکہ ان کے وقار واعتبار کے تئیں، تبصرہ نگار کا ایماندارانہ اور ذمے دارانہ اظہاریہ ہے۔ البتہ بعض ہم عصر تحریروں کے حوالے سے تبصرہ نگار نے جو گفتگو کی ہے ان میں ان کے نرم گوشے جاگزیں ہوتے نظر آتے ہیں!

اس مختصر سی تمہیدی گفتگو میں صفدر امام صاحب کی تبصرہ نگاری کے تین بنیادی رجحانات نشان زد کیے گئے ہیں!

(۱) طویل تبصروں میں جامعیت کو ملحوظ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یاد رکھئے کہ طویل تحریروں کو جامعیت کے دائرے میں رکھنا بڑا ہی دشوار گزار تصنیفی عمل ہے۔

(۲) بعض تبصروں میں مبصر کی سخت گیری اپنی انتہا پر نظر آتی ہے۔

(۳) بعض ہم عصر تحریروں کے حوالے سے لکھے گئے تبصروں میں وہ ایک نرم رَو، تبصرہ نگار کی صورت میں نظر آتے ہیں!

میرے نزدیک پیش کردہ یہ تین بنیادی نکات، زیر گفتگو کتاب کا شناخت نامہ ہیں۔ ان امور پر تفصیلی گفتگو آگے کی سطور میں کی جائے گی!

تحقیقی تبصروں کے تحت سات تبصرے شامل کئے گئے ہیں!

پہلا تبصرہ پروفیسر محمد ذاکر کی تازہ مترجمہ کتاب ''ہندوستانی سماج پر اسلامی اثر اور دوسرے مضامین'' (سنہ اشاعت ۲۰۱۱ء) پر ہے۔ یہ پروفیسر محمد مجیب کے ۱۶ انگریزی مضامین کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ ایک اہم دستاویزی کتاب ہے۔ پروفیسر محمد ذاکر نے اس کتاب کا اردو ترجمہ کرکے بزرگوں کی زندہ تحریروں کو ہم اردو والوں کے درمیان پہنچانے کی جو سعی مشکور کی ہے، اس کے لئے اردو کا سنجیدہ علمی حلقہ ان کا احسان مند رہے گا۔ مزید یہ کہ جناب صفدر امام قادری نے اس کتاب پر تبصرہ کرکے بزرگان علم وفن کے علمی کارناموں کا اعتراف واقرار کرنے میں اپنی سنجیدہ مزاجی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ اس سے ان کے Selective مطالعاتی ذہن کا پتا چلتا ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بنیاد گزاروں میں ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر سید عابد حسین اور پروفیسر محمد

مجیب تین اہم نام ہیں۔قوم وملت کے نمائندہ دانشوروں میں ان تینوں کے نام سرفہرست ہیں۔انگریزی زبان وادب کے عالم تو تھے ہی، اردو زبان وادب کے نمائندہ مشاہیر میں آج بھی ان لوگوں کے نام لئے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر سید عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب ان دونوں نے مل کر ملک وقوم اور ملت اسلامیہ کے درپیش مسائل وموضوعات پر جم کر تصنیفی کام کیا۔عابد صاحب کی دو کتابیں (۱) ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں اور (۲) قومی تہذیب کا مسئلہ۔فکر وسوچ کے اسی نہج پر اردو زبان میں لکھی گئی، شاہکار ہیں۔عابد صاحب نے خود ان دونوں کتابوں کا انگریزی اور جرمن زبان میں ترجمہ کر کے شائع بھی کرایا۔اس کے علاوہ ادب اور فنون لطیفہ کے بھی وہ عالم تھے۔گیٹے کا منظوم ڈرامہ ''فاوست'' کا جو اردو ترجمہ انہوں نے کیا ہے وہ شاہکار ہے۔اس کتاب کے مقدمہ میں ادب اور فنون لطیفہ کے حوالے سے انہوں نے جو خامہ فرسائیاں کی ہیں وہ عدیم المثال ہیں!

پروفیسر محمد مجیب سماجی مفکر اور دانشور کے ساتھ ساتھ ادبیات کے بھی عالم تھے۔روسی ادب پر دو جلدوں میں ان کی کتاب پڑھنے کے لائق ہیں۔وہ کلاسیکی روسی زبان سے کما حقہ واقف تھے۔ چنانچہ انہوں نے براہ راست کلاسیکی روسی ادب کا مطالعہ کیا۔وہ ان قلمکاروں میں سے نہیں تھے جو ترجمہ کے راستے دوسری زبانوں کے ادبیات پر گفتگو کرتے ہیں۔وہ ایک ذمہ دار اور محتاط قلمکار تھے۔بے حد وسیع المطالعہ اور غیر معمولی فکر وسوچ کی حامل شخصیت کے مالک تھے۔اردو میں ان کا ایک اور اہم کارنامہ ''انڈیا ونس فریڈم'' کا ''ہماری آزادی'' کے نام سے ترجمہ ہے۔یہ کتاب پہلی بار ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی۔اس کے علاوہ یاد پڑتا ہے کہ ''کیمیا گر'' کے عنوان سے ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ بھی ہے۔اردو زبان پر مجیب صاحب کی گہری نگاہ کی جانب صفدر امام صاحب نے بھی روشنی ڈالی ہے۔

> ''محمد مجیب کی کتاب اسلامیان ہند کی فکری جدوجہد کا نتیجہ ہے۔بھلے ہی یہ کتاب انگریزی زبان میں لکھی گئی۔لیکن لکھنے والے کی مادری زبان اردو ہی ہے۔کتاب کے مشتملات پر غور کریں تو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ اردو تہذیب کا پروردہ شخص ہی ایسی کتاب اور ایسے مضامین لکھ سکتا ہے۔''

یہ واقعہ ہے کہ مجیب صاحب کی غیر معمولی دانشورانہ فکر ونظر میں اسلام کی مہتم بالشان روایات و اقدار رچی بسی تھیں۔صفدر امام صاحب نے ٹھیک ہی لکھا ہے کہ ان کی ذہنی اور فکری نشو ونما اردو تہذیب کی مرہون ہے۔

میرا خیال ہے کہ جامعہ کے متذکرہ تینوں بنیاد گزار ارکان ثلاثہ کی تحریری دلچسپیوں اور سرگرمیوں کا میدان بنیادی طور پر انگریزی زبان تو تھا ہی، لیکن فکر ونظر کی عقبی زمین اردو تہذیب ہی تھی!

خیر اس گفتگو سے قطع نظر عرض یہ کرنا ہے کہ تبصرہ نگار، صفدر امام صاحب نے پروفیسر محمد ذاکر کی اس مترجمہ کتاب پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

تبصرہ نگار نے ایک کام یہ بھی کیا کہ انگریزی متن کے ساتھ اس کا اردو ترجمہ بھی بہ طور موازنہ پیش کر دیا تاکہ آپ اندازہ لگا سکیں کہ مترجم اصل انگریزی متن کی ترجمانی میں کس حد تک کامیاب ہوا ہے۔ اس سلسلے میں عرض یہ کرنا ہے کہ ترجمے کی زبان کے وسیلے سے فن پارے کی اوریجنلٹی کا گمان ہونا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ پروفیسر محمد ذاکر کے اس اردو ترجمہ کو اسی تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔ ۱۴ صفحات پر مشتمل یہ تبصرہ، مبصر کی معروضیت پسندی کا اشاریہ ہے۔

کتاب کی پہلی شق کا دوسرا اہم تبصرہ ریاض الرحمن شروانی کی مختصر خودنوشت "دھوپ چھاؤں" پر ہے۔ مختصر اس معنی میں کہ یہ ان کی زندگی کی صرف آٹھ برس (۴۹۔۱۹۴۱) کی داستان حیات کو محیط کرتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ خودنوشت شروانی صاحب کی زندگی کے شب و روز کی ایک Selective داستان ہے۔ مزید یہ کہ اس کے مبصر، صفدر امام قادری نے اس پر تبصرہ کر کے اپنے Selective مطالعاتی ذہن کا ثبوت بھی پیش کیا ہے۔ یہ ضرورت اس لیے بھی پڑی کہ اس خودنوشت میں شروانی صاحب کا تصنیفی مرکز ومحور کا دائرہ اس زمانے کے دو کلیدی واقعات وحالات کے گرد گھومتا نظر آتا ہے۔

مبصر نے یہ اطلاع بہم پہنچائی ہے کہ ۴۸۔۱۹۴۶ کا زمانہ شروانی صاحب کی زندگی کا بڑا ہی اہم اور نازک زمانہ تھا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شروانی صاحب کی ہنگامہ خیز تعلیمی زندگی کا دور اور دوسرا تحریک آزادی اور تقسیم ملک کی ہولناکیاں۔ مطلب یہ کہ اس خودنوشت میں علی گڑھ اور تقسیم کی ہولناکیوں کو بنیادی حیثیت حاصل ہے!

شروانی صاحب کی زندگی کے یہ دو غیر معمولی دھارے، مبصر صفدر امام صاحب کے فکری تحرک کے سبب بنے۔ تب ہی تو انہوں نے اس خودنوشت پر اپنی گفتگو کے لیے ڈیمائی سائز میں مطبوعہ ۲۱ صفحات وقف کیے۔ ان ۲۱ صفحوں میں انہوں نے شروانی صاحب کی زندگی کی دھوپ چھاؤں کا جو تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے وہ بڑا ہی دلچسپ اور Readibility سے بھرا ہوا ہے۔ دوران مطالعہ قرأت کی گراں باری کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ تحریر کو دلچسپ اور قابل مطالعہ بنائے رکھنے کے لیے فن نگارش کا یہ بنیادی نکتہ ہے۔ جس کو مبصر نے اس تبصرے میں ملحوظ رکھا ہے!

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے علمی اور تہذیبی ماحول کے جلو میں ریاض الرحمن شروانی کی جملہ شخصیت میں جو نکھار پیدا ہوا، یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ زیر گفتگو خودنوشت کے ایک سو صفحات اس کے لیے وقف کیے۔ ان ایک سو صفحات میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تہذیبی، علمی اور سیاسی سرگرمیوں کی ایک مکمل تصویر انہوں نے پیش کر دی ہے۔ صفدر امام صاحب نے ٹھیک ہی لکھا ہے۔

''یہ خودنوشت مصنف کی یونی ورسٹی کی زندگی سے متعلق ہے۔ اس لیے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کتاب کے ہر صفحے پر نمایاں ہے''

یہاں تفصیل میں جانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ ویسے بھی تبصرے پر تبصرہ کرنا طرفہ تماشا بن جاتا ہے۔ یہ تو کہیے کہ یہ تبصراتی تحریریں باضابطہ مضمون کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لہذا گفتگو کے چند گوشے نکل آئے۔

خودنوشت کا دوسرا جاندار پہلو تقسیم کی ہولناکیاں اور اس کے نتائج کے بیان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے لیے سوانح نگار نے ۴۰ صفحات وقف کیے ہیں۔

ان ۴۰ صفحات سے شروانی صاحب کے سیاسی نقطہ نظر کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ مبصّر نے چھوٹے بڑے کم و بیش ۳۰ اقتباسات اس حصے سے پیش کیے ہیں۔ ان کو پڑھنے سے شروانی صاحب کی سیاسی بصیرت اور ملک و قوم کے تئیں ان کی دردمندی کا اندازہ ہوتا ہے۔

ریاض الرحمٰن شروانی کا خانوادہ نیشنلسٹ مسلمانوں کا خانوادہ تھا۔ یہ لوگ دوقومی نظریہ کے مخالف تھے۔ مسٹر جناح کی سیاسی شدت پسندی سے حد درجہ دل برداشتہ تھے۔ مسلم لیگ کی سیاسی ریشہ دوانیوں سے مولانا آزاد کی طرح شروانی صاحب کی فکرمندیاں بھی فطری تھیں۔ تقسیم کے لیے مسلم لیگ کو سراسر ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ خودنوشت کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے!

> ''میری یہ قطعی رائے ہے کہ ملک کی تقسیم کی اصلی ذمے داری مسٹر محمد علی جناح کے حُبّ جاہ (Ambition) اور ناعاقبت اندیشی اور مسلمانوں کی بھاری اکثریت کی جذباتیت پر عائد ہوتی ہے۔ برادران وطن کے ایک طبقے کی تنگ نظری بلکہ مسلم دشمنی اور کانگریس لیڈرشپ کی آزادی کے لیے جلد بازی ان سب امور نے ملک تقسیم کو ممکن بنایا۔ لیکن اس کے لیے تحریک مسلم لیگ نے چلائی تھی۔''

اس اقتباس پر مزید کسی تبصرے کی ضرورت نہیں ہے۔ عرض یہ کرنا ہے کہ یہ خانوادہ بڑا ہی پُر وقار خانوادہ رہا ہے۔ علم و فضل اور ملک و قوم کی جاں نثاری کے حوالے سے اس کی ایک تاریخ رہی ہے۔

حبیب الرحمٰن شروانی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے درمیان فکر و دانش کی سطح پر جو گہرے روابط تھے وہ اظہر من الشمس ہیں۔ ''غبار خاطر'' اور ''کاروان خیال'' مکاتیب کے یہ دو مجموعے اس کے گواہ ہیں۔ ریاض الرحمٰن شروانی، علم و فضل کے حوالے سے اس خانوادہ کے آخری چشم و چراغ ہیں۔ جو اپنے بزرگوں کی جملہ وراثت کو سینے سے لگائے اپنی کبر سنی کے باوجود حد درجہ فعال و متحرک ہیں۔ علی گڑھ کا حبیب گنج کا علاقہ اسی خانوادے کے تعلق سے جانا جاتا ہے۔

مذکورہ دونوں کتابوں پر لکھے گئے تبصرے علم و فن کے اکابر قلمکاروں کی بیش بہا نگارش عالیہ پر تبصرہ

نگار، صفدر امام قادری کا ایماندارانہ اور ذمے دارانہ اعتراف و اقرار ہے!

تحقیقی تبصروں کے اس حصے میں ہم عصر قلمکاروں کے حوالے سے ایک تبصرہ ظفر کمالی کی کتاب ''متعلقات احمد جمال پاشا'' پر بھی شامل ہے۔ احمد جمال پاشا اردو طنز و مزاح کا ایک جانا پہچانا نام ہے۔ پاشا صاحب اردو ادب میں ظفر کمالی کے استاد رہے ہیں۔ اس میدان میں انہوں نے پاشا صاحب کی رہنمائی میں ہی قدم رکھا۔ رہنمائی ٹھوس اور مستحکم تھی۔ اس لیے جلد ہی قدم جم گیا۔ انہوں نے پاشا صاحب پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی حاصل کی۔ کہہ سکتے ہیں کہ ادبیات میں احمد جمال پاشا ان کا اختصاصی میدان ہے۔ لیکن ان کی علمی و ادبی سرگرمیوں کے اور بھی میدان ہیں۔ تا حال وہ شاعر، ظرافت نگار اور محقق کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔

۲۰۸ صفحات کی اس کتاب پر تبصرہ کے لیے مبصر نے ۲۲ صفحات وقف کیے ہیں۔ یہ تبصرہ اس کتاب کا ایک جامع جائزہ ہے۔ تبصرہ نگار، صفدر امام قادری ظفر کمالی کے ہم عصر قلمکار ہیں۔ عام طور پر ہم عصر تحریروں پر گفتگو کرتے ہوئے معاصرانہ رقابت کی جھلک کسی نہ کسی صورت میں نظر آ ہی جاتی ہے۔ لیکن خوشی کی بات ہے کہ اس میں کسی قسم کی ایسی کوئی جھلک دیکھنے کو نہیں ملتی ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ زیر گفتگو تبصرہ میں ظفر کمالی مبصر کے ممدوح کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ تبصرے کا آغاز صفدر امام صاحب کے اس Remarkable جملے سے ہوتا ہے!

''رشید حسن خاں، حنیف نقوی، نثار احمد فاروقی کے بعد کی نسل کے محققین میں ظفر کمالی نے اپنی متفرق تحقیقی مضامین کی وجہ سے دھیرے دھیرے قومی سطح پر ایک اعتبار حاصل کر لیا ہے۔''

پوری گفتگو اسی نہج پر کی گئی ہے۔ جس سے ظفر کمالی کی استعداد علمی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اچھے لکھنے والوں کی تبصراتی اور تعارفی تحریریں مصنف کا شناخت نامہ بن جاتی ہیں۔ اس تبصرے میں مبصر کی نرم روی، فکر و شعور کے خنک و لطیف جھونکوں کا احساس دلاتی ہے۔ یہ نرم روی کچھ اور تبصروں میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے! مثلاً (۱) ''مولانا آزاد کا قیام رانچی: احوال و آثار'' اور (۲) رسالہ ''زبان و ادب'' پٹنہ کا حفیظ بنارسی اور نگارشات خواتین نمبر۔

تنقیدی تبصروں والے حصے میں پہلا تبصرہ کلیم الدین احمد پر لکھا گیا وہاب اشرفی کے مونوگراف کے حوالے سے ہے۔ عنوان ہے ''وہاب اشرفی بنام کلیم الدین احمد''۔ ۱۰۸ صفحات پر مشتمل ساہتیہ اکادمی کی جانب سے شائع کیا گیا یہ مونوگراف، مبصر کے لیے تنازع کا سبب بن گیا۔ کیوں بنا اس کی تفصیل تبصرے میں موجود ہے۔

مبصر کی سخت گیری اس تبصرے میں انتہا پر نظر آتی ہے۔ گرفت سخت ہے! گفتگو ٹھوس دلیلوں کی بنیاد پر کی گئی ہے۔ جس سے مفر ممکن نہیں ہے۔

تبصرہ تو کلیم الدین احمد کے مونوگراف پر ہے۔ لیکن گفتگو کی بے شمار شاخیں اس سے پھوٹتی نظر آتی ہیں جو وہاب اشرفی کی علمی و تنقیدی سرگرمیوں کو زیر سایہ کیے نظر آتی ہیں۔ اس تبصراتی تحریر کی نوعیت سیاقی تیز منظر و پس منظر کی ہے۔ اس کی ضرورت اس لیے پڑی کہ وہاب اشرفی کا یہ مونوگراف عجلت پسندی اور غیر ذمے دارانہ طریقۂ نگارش کے ایک ملغوبے کی صورت میں وقوع پذیر ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس مونوگراف سے بہت ساری غلط فہمیاں راہ پا گئیں۔ جو نتائج اخذ کیے گئے ان میں منطق و جواز کی بے حد کمی تھی۔ ممکن ہے کہ کلیم الدین احمد کے تئیں وہاب صاحب کے کچھ ذہنی تحفظات ہوں!

اب کچھ منظر و پس منظر کی باتیں سن لیجیے!

وہاب اشرفی کی علمی، ادبی اور تنقیدی سرگرمیاں، گیا اور رانچی کے زمانہ قیام کے دوران ان کی سنجیدہ طبعی اور دل جمعی سے عبارت نظر آتی ہیں۔ اُسی زمانے میں اردو ادب میں ان کی پہچان مستحکم ہو چکی تھی۔ وہاب صاحب بے حد وسیع المطالعہ، انگریزی زبان و ادب کے عالم، اردو زبان و ادب میں ان کا تنقیدی شعور اور ادبی ذوق بے حد نکھرا ہوا اور رچا ہوا تھا۔ ہوا یہ کہ ۱۹۹۴ء میں پٹنہ آنے کے بعد ان کی منصبی مصروفیتیں بے حد بڑھ گئیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علم و ادب کے میدان میں وہ رواروی اور عجلت پسندی کے شکار ہو گئے۔ اس پر طرّہ یہ کہ نئی نئی کتابیں شائع کرانے کا جنون تھا۔ سب سے زیادہ کتابیں پٹنہ کے زمانہ قیام کے دوران ہی شائع ہوئیں اور سب سے زیادہ نامقبول بھی اسی زمانے میں ہوئیں۔

یہ ہے وہ پس منظر جس کو صفدر امام صاحب نے اپنے تبصرے کی گرفت میں لے کر گفتگو کو ایک نتیجے تک پہنچایا ہے!

مبصّر نے اپنے پیش کردہ اعداد و شمار کے گوشوارے کے توسط سے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کتنی سطریں وہاب اشرفی نے لکھی ہیں اور کتنی دوسروں کی ہیں۔ ایک چھوٹا سا اقتباس ملاحظہ فرمائیے!

> ''سخن ہائے گفتنی اور عملی تنقید پر وہاب اشرفی نے ایک ساتھ گفتگو کی ہے چار صفحات میں وہاب اشرفی نے صرف ساڑھے سات سطریں اپنی طرف سے لکھی ہیں۔ باقی تمام کلیم الدین احمد کے اقتباسات درج کر دیے گئے ہیں۔''

کلیم الدین احمد کے مونوگراف پر تحریر کردہ تبصرے کا یہ ایک جاندار پہلو ہے۔ پورے تبصرے میں گفتگو کی یہ صورت حال دیکھنے کو ملتی ہے۔ بالکل اعداد و شمار کی بنیاد پر۔ جس سے انکار ممکن نہیں۔ اس قسم کے تسامحات وہاب اشرفی کی وہی بیان کردہ رواروی اور عجلت پسندی کا نتیجہ ہیں۔ یاد رکھیے کہ زیادہ لکھنا کمال نہیں ہے، بلکہ اچھا لکھنا کمال ہے۔

اسی حصے میں جناب احمد محفوظ کی مرتبہ کتاب ''شمس الرحمٰن: شخصیت اور ادبی خدمات'' کے حوالے سے ایک تبصرہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس کا عنوان ہے۔ ''شمس الرحمٰن فاروقی کی مدح پر قدح'' ۱۹۶

صفحات کی اس کتاب پر تبصرہ کے لیے صرف ۷ صفحات وقف کیے گئے ہیں۔ زیرِ گفتگو کتاب کے دو مختصر تبصروں میں سے یہ ایک ہے۔

مبصر جناب صفدر امام قادری، احمد محفوظ کی اس مرتبہ کتاب سے اپنی بے اطمینانی کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی سخت گیری دیکھنے کے لائق ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس تبصراتی تحریر کی نوعیت قیاسی اور مفروضاتی ہے! کیونکہ تبصرے میں کہیں بھی فاروقی صاحب کے تسامحات کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے۔ ''شعر شور انگیز'' کی چار جلدوں کے ۲۰۷۰ صفحات میں ممکن ہے کہ کمیاں ہوں۔ لیکن ان کمیوں کی نشاندہی کون کرے۔ تبصرہ نگار لکھتے ہیں۔

> ''آج اگر کلیم الدین احمد، قاضی عبدالودود یا امتیاز علی عرشی ہوتے تب بھی کیا ان کتابوں کے تعلق سے ایسا ہی چاپلوسی سے بھرا منظرنامہ ہوتا''

گویا اردو ادب آج قحط الرجال کے دور سے گزر رہا ہے۔ کسی میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ بہ حیثیت شارحِ میر فاروقی کی کمیوں کو نشان زد کر سکے۔ لیکن مبصر کا یہ قیاس ہے کہ فاروقی صاحب کی تحریروں میں بھی کمیاں ہیں جن کو نشان زد کیا جانا چاہیے۔ خاکسار کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ادب کے حوالے سے Advance studies کی مفروضاتی اور اقداری تحریروں میں اختلاف کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ البتہ اس بات کا خیال ضرور رہے کہ فاش غلطیاں راہ نہ پا جائیں۔

اب یہ دیکھیے کہ مبصر نے اپنی بے اطمینانی اور برہمی اظہار کس طرح کیا ہے:

> ''۱۹۶ صفحات کی کتاب میں مشکل سے پانچ صفحے ہوں گے جن پر فاروقی کی خامیوں یا کجی کا ذکر ہوا ہو۔''

مبصر کا یہ اصرار ہے کہ جناب احمد محفوظ نے اپنی اس مرتبہ کتاب میں فاروقی صاحب کی خامیوں کی نشاندہی کیوں نہیں کی۔ ممکن ہے کہ جناب احمد محفوظ فاروقی صاحب کے ممدوح ہوں یا ان کی اور دوسرے مضمون نگاروں کی نگاہ فاروقی صاحب کی تحریروں کی کمیوں اور خامیوں پر پڑی ہی نہ ہو۔ لیکن یہ اصرار کیوں کہ خامیاں یا کمیاں نشان زد کیے ہی جائیں یہ بھی ممکن ہے کہ مبصر کی یہ سوچ ہو کہ اس قسم کے کاموں سے ادب میں علم و فن کے حوالے سے غلط تصورات کے رائج ہو جانے کا خدشہ بن جاتا ہے۔

خاکسار کا ارادہ تھا کہ سات صفحات کے اس تبصرہ پر سات سطروں میں ہی گفتگو کی جائے۔ سطروں کے تجاوز کے لیے معذرت خواں ہوں!

تحقیقی تبصروں والے اس حصے میں ایک تبصرہ مظفر اقبال کی کتاب ''بہار میں اردو نثر کا ارتقا'' پر بھی ہے۔

تبصرہ بہت عمدہ ہے۔ مبصر نے اس کتاب کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ دراصل یہ مظفر اقبال

صاحب کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر انہیں ڈاکٹریٹ کی سند ملی۔ کتابی صورت میں یہ مقالہ ۱۹۸۰ء میں اشاعت پذیر ہوا۔

اس لحاظ سے یہ پرانی کتابوں کے زمرے میں آتی ہے۔ یہ ان کی واحد کتاب ہے جو واقعی وقار و اعتبار کا درجہ رکھتی ہے۔ اس جانب صفدر امام صاحب نے بھی اشارہ کیا ہے غرض یہ کرنا ہے کہ تعداد کوئی معنی نہیں رکھتی ہے۔ اصل چیز معیار و اقدار ہے۔ آج اگر ۲۰۱۴ء میں ان کی اس کتاب پر گفتگو ہو رہی ہے۔ تو اس کی وجہ ان کا اعلیٰ تحقیقی مزاج و معیار ہے۔

انگریزی زبان میں ایک شاعر Gerard Manley Hopkins گزرا ہے۔ ایک مختصر سا شعری مجموعہ کتابچے کی صورت میں اس کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ اس کی زندگی میں کوئی چیز شائع نہیں ہوئی کلیسا سے عقیدت مندی اور ڈبلن یونیورسٹی میں یونانی زبان کے استاد کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔

لیکن غور فرمایئے کہ وفات کے بعد جب اس کا شعری مجموعہ شائع ہوا تو اس کو ایسی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی کہ انگریزی ادب کے مورخین اور ناقدین لکھتے ہیں کہ بیسویں صدی کا انگریزی کا ایسا کوئی شاعر نہیں تھا جو ہاپکنس کی غنائی شاعری (Lyrical Poetry) سے متاثر نہ ہوا ہو اور کچھ نہ کچھ نہ سیکھا ہو۔ یہ ہے فکر و فن کا معیاری پیمانہ۔ جسے ہمارے قلمکاروں اور تخلیقی فنکاروں کو پیش نظر رکھنا چاہئے! خاشاک کے تودے کو کوہِ دماوند قرار دینے سے کیا فائدہ۔ فکر و فن کے میدان میں سرپٹ گھوڑے کی طرح دوڑنے سے بچنے کی ضرورت ہے۔

زیر گفتگو کتاب کے تبصرے بلا تخصیص نہیں لکھے گئے ہیں۔ بلکہ مبصر نے اپنے علمی و ادبی ذوق کے پیش نظر لکھے ہیں۔ لہٰذا ان میں آپ مبصر کی فکری اور ذہنی ترجیحات کی چھاپ بہ آسانی دیکھ سکتے ہیں!

اس مختصر سی تبصراتی تحریر میں مشمولہ تمام تبصروں پر گفتگو ممکن نہیں ہے! توقع ہے کہ اردو کا سنجیدہ علمی و ادبی حلقہ اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لے گا!

نام کتاب: نئی پرانی کتابیں، مصنف: صفدر امام قادری، مرتب: الفیہ نوری

مبصر: اظہار خضر، ضخامت: ۲۴۰ صفحات، قیمت: تین سو روپے سنہ اشاعت: ۲۰۱۳ء

دستیاب: بک امپوریم، سبزی باغ۔ پٹنہ ۸۰۰۰۰۴

کتاب دار: ممبئی۔ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ۔ اردو بازار۔ نئی دہلی۔ ۶

☆☆☆

(۴)

ضیا فاروقی کی شاعری:

تہذیبوں کی آویزش کا المیہ

• عشرت ظفر

شاعری کے مروجہ میلانات رجحانات اور لفظیات سے ایک نیا جہان معنی برآمد کر لینا ہی اصل میں ایک تخلیق کار کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ کائنات وسیع و بسیط نہیں لامحدود ہے اس کے افق غیر مختتم ہیں جو مظاہر فطرت کی جولان گاہیں اور بازی گاہیں ہیں یہاں اشیاء و مناظر کا ایک انبوہ کثیر ہے جن کا رشتہ کسی نہ کسی طور پر انسان سے وابستہ ہے کیونکہ تخلیق کائنات کا سنگ بنیاد آدم ہی ہے جس کے گرد تموج و تحرک اور گردشوں کا ایک جہان بے نہایت ہے۔ اجزائے آفرینش کا زوال آمادہ ہونا ہی اصل میں تخلیق کا تنوع ہے اگر مہر گردوں ہوا کی راہ کا چراغ ہے تو یہ ایک نئے آفتاب کے طلوع کی علامت بھی ہے۔ تعمیر و تخریب کے مسلسل عمل سے گزرتی ہوئی کائنات ایک حقیقی شاعر کے اندر سانس لیتی ہے اور اسی سے معنی کی نئی دنیائیں طلوع ہوتی ہیں جن میں آفریدہ نا آفریدہ بہت سے مناظر ہوتے ہیں۔ تہذیب و تمدن، معاشرہ زندگی کا تغیر، عشق کی مستی، تاریخ کی گرفت میں پھڑ پھڑاتی ہوئی مثبت و منفی پرچھائیاں، اقتدار و جبر، ذہانت و ذکات، دانش، شقاوت، رحم دلی، عقل، شعور سب اسی آب طوفاں گیر سے طلوع ہوتے ہیں۔

ضیا فاروقی کی عمر شاعری ابھی زیادہ نہیں ہے لیکن انھوں نے اپنا منفرد لہجہ تراش لیا ہے لفظوں کے مزاج اور ان کے بطون معنی خیز تک رسائی حاصل کر لی ہے۔ ان کے دو شعری مجموعے "پس گرد سفر" اور "دشتِ شب" شائع ہوئے ہیں جن میں غزل و نظم دونوں اصناف کی بساط جمی ہوئی ہے، بہت کم عرصے میں بحر دانش و بینش کے شناوروں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے میں کامیاب رہے ہیں۔

ضیا فاروقی کے تخلیقی جزر و مد میں ''پس گردِ سفر'' اور ''دشتِ شب'' ایک ستارہ روشن کی طرح ہیں کیونکہ سفر اور پھر گردِ سفر کے عقبی دریاؤں میں انسانی زندگی کے استعاروں کا ایک طلسم ہے۔ دشتِ شب اس کائنات کا عظیم و بلیغ استعارہ ہے کیونکہ دنیا شب دراز عدم ہے ظلمت ہی اس کی اصل ہے روشنی اس کی حریف ہے، اسی لئے کائنات نور و ظلمت کی آویزش سے عبارت ہے اور انسانی زندگی سے اس کا گہرا رشتہ ہے۔ سفر انسان کا مقدر ہے چنانچہ یہ بیکراں کائنات اس کے اشاروں پر رقص کر رہی ہے۔ دلچسپ پہلو یہ ہے کہ دونوں اس بات سے بے خبر ہیں کہ وہ ایک زنداں کی فصیلوں کے حصار میں ہیں دیکھئے ضیا فاروقی کیا کہتے ہیں۔

شہاب ثاقب سا ٹوٹ کر میں عجیب وحشت میں مبتلا ہوں
ابھی تو چمکا تھا آسماں پر ابھی اچانک میں بجھ گیا ہوں

☆

کون ہے جو اتنے سناٹے میں ہے محوِ سفر
دشتِ شب میں یہ غبارِ ماہ و انجم کس لئے

☆

کہیں نہ کوہ و بیاباں نہ مہر و ماہ و نجوم
تمام حسنِ نظر در نظر خیالی تھا

☆

کیسی آندھی تھی اُڑا لے گئی سب برگ و شجر
شاخ پر ایک بھی پتہ نہ رہا میرے بعد

☆

جو سنگِ میل کی مانند ثبت تھے دل پر
وہ سارے لمحے سمیٹے تو اک زمانہ گیا

☆

گزرتی تھی طلسمِ روز و شب میں زندگی اپنی
یہ باتیں تب کی ہیں جب ساتھ تھی اک چشمِ حیراں بھی

☆

نقشِ پائے عہدِ رفتہ میں بھی ہے میرا سراغ
راستے کا ایک اک پتھر اُٹھا کر دیکھنا

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ طویل مشقِ سخن کے بعد ہی ایک اچھا شعر کہا جا سکتا ہے۔ دراصل فنونِ لطیفہ

کی ہنر کاری کے لئے مشق ضروری   ان نقوش کی ترتیب وتہذیب کے لئے ہوتی ہے جو بساط اظہار پر اُبھرتے ہیں۔ شاعری میں اوزان وبحور الفاظ کی نشست وبرخاست دروبست لفظ ومعنی پر کچھ زیادہ ہی زور دیا جاتا ہے جب کہ شاعری کے لئے کم ازکم اوزان وبحور تو اہمیت کے قطعی حامل نہیں ہیں جہاں تک الفاظ کی نشست وبرخاست دروبست لفظ ومعنی کا سوال ہے یہ گہرے مطالعے مشق ومشاہدے سے طلوع ہوتے ہیں ان میں مشق ومزاولت کچھ اہم نہیں ہیں۔ ضیا فاروقی نے اوزان وبحور کا التزام کیا ہے۔ ہوسکتا ہے زمانے کے طعن وتشنیع سے خود کو بچانے کے لئے ایسا کیا ہو لیکن ان کے یہاں لف ونشر دروبست معنی والفاظ گہرے مشاہدے اور مطالعے سے آئے ہیں۔ مشق ومزاولت سے نہیں، وہ جس تہذیب کے پروردہ ہیں وہاں صحت الفاظ روزمرہ میں پنہاں تھی اہتمام کی ضرورت نہ تھی معنی کا دروبست بھی عام گفتگو سے نمایاں تھا کجا یہ کہ کوئی شعری یا نثری متن بساط قرطاس پر آراستہ کیا جائے انھوں نے اپنے نمود واظہار وجود کی ساعت اوّل سے جو کچھ دیکھا وہی آگے چل کر ان کے مطالعے میں کام آیا ان کی شاعری میں صائب عرفی نظیری حافظ وبیدل کے اثرات نمایاں ہیں۔ نقوش فن ان کے اپنے ہیں اس عصر رواں کے ہیں جس میں وہ سانس لے رہے ہیں لیکن ان لمحات کی پرچھائیاں بھی ہیں جن سے ان کی آشنائی ایام طفلی وجوانی میں ہوئی تھی۔ اس تہذیب کے عکس فروزاں وفراواں ان کے شعر میں مسکن گزیں ہیں جو اب تقریباً غروب ہوچکی ہے لیکن بقول بیدلؔ کچھ نہ کچھ ہے بھی۔

خورشید خرامید، فروغے بہ نظر ماند
دریا بہ کنارو گرا فتاد گہر ماند

خورشید پیکر تہذیب غروب ہوچکی ہے اس کی تنویر نگاہوں میں ہے دریا دوسرے ساحل کی طرف سفر کرچکا ہے مگر آبدار گوہروں کا ایک ہجوم چھوڑ گیا ہے، یہ وہ کائنات ہے جو شاعر کے جود میں سانس لیتی ہے، سورج کا غروب ہونا تنویر کا باقی رہنا، ساحل پر موتیوں کے انبار ہونا ایک بسیط منظر سے عبارت ہیں۔ یہاں مثال میں ضیا فاروقی کے جو شعر پیش کروں گا ان میں ایسے ہی مناظر ہوں گے۔ ان میں ماضی کی نوحہ خوانی لمحات گذشتہ کا مرثیہ جن سے وہ تہذیب عبارت تھی جو اعلیٰ انسانی قدروں کی پاسباں رازداں اور مزاج داں تھیں ان کا عکس بھی ہے اوران کشتہ چراغوں کے مزاروں پر گریہ وماتم کا سماں بھی ہے جن کی حیثیت آج کے زمانے میں ٹھیکروں سے زیادہ نہیں ہے فائق صفاہانی نے کہا تھا۔

سرخی چشم من از گریہ نہ باشد فائق
آفتابے زنظر رفت شفق باقی ماند

ضیا فاروقی کی آنکھوں میں تمام عکس روشن ہیں لیکن ان کے چاروں طرف اندھیروں کی قیام گاہیں بھی ہیں ان کی شاعری میں رات محزونی وکرب لازوال کا استعارہ بن کر اُبھرتی ہے جس میں تمام مناظر

حبابوں کی طرح نظر آتے ہیں یعنی رات آسمان احساس پر محیط ہے اس میں چاند سورج ستارے بلبلوں کی طرح چمک رہے ہیں یہ وہ لمحے ہیں جو رفتہ شاعر کے احساسات کے بے کراں سمندر میں ڈوب رہے ہیں یہ وہ سفینے ہیں جن میں اس نے زندگی کا طویل سفر طے کیا ہے اب وہ شہاب ثاقب کا جسم اختیار کر چکے ہیں وہ ایک لمحہ جو پہلے تاباں تھا منور تھا اب خاکستر بے نہایت کا ڈھیر ہے اچانک ہی وجود پذیری اور فنا انجامی نے اسے بڑی وحشت میں مبتلا کر دیا ہے اور وہ شفق جو آفتاب چھوڑ گیا ہے اس کی سرخی ضیا فاروقی کی آنکھوں سے خون بن بن کر ٹپک رہی ہے اور یہ ساعت لاشئیت اس حد تک ان کے دل و دماغ میں گھر کر لیتی ہے کہ انھیں ساری کائنات کا حسن خیالی محسوس ہونے لگتا ہے اور اس مقام تک پہونچ جاتے ہیں جہاں غالب نے کہا تھا

ہستی کا مت فریب بھی کھائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

اس مقام پر پہونچ کر شاعر کو کسی چیز سے دلچسپی نہیں رہ جاتی ہے اور وہ یہ سوال کرتا ہے کہ جب سفر سفاک سناٹے میں کیا جا رہا ہے تو پھر یہ غبارہ ماہ انجم کیوں ہے یعنی جب رات ہی اصل ہے تو پھر نور کا تموج و تحرک بے معنی شے ہے یہ اشارہ عالم پہنائی کی اس ویرانی وہیبت ناکی کی طرف ہے جو اس کا سنگ بنیاد ہے۔
بیسویں صدی کے نصف اوّل کی آخری دہائی میں یا اس سے پہلے کی چار دہائیوں کے لوگ ہر چند کہ اب ان میں سے بیشتر دریائے فنا میں غرق ہو چکے ہیں ان سب کا المیہ یہ رہا ہے کہ ان کا پرورش خانہ تہذیب کچھ اور تھا اور ان کی بود و ماند کسی اور گھر میں تھی خاص طور پر نصف اوّل کی آخری دو دہائیوں کے جو لوگ موجود ہیں وہ اس نئے عہد سے مفاہمت نہیں کر پا رہے ہیں اپنی اقدار رفتہ اور تہذیب گم گشتہ سے اب بھی چمٹے ہوئے ہیں حالانکہ ان کے پاس اب گریہ و ماتم کے سوا کچھ نہیں ہے۔

اس سے انکار ممکن نہیں کہ زمانوں کا خالق رب کائنات ہے وہ جس طرح کے زمانے چاہتا ہے تخلیق کرتا ہے ارباب دانش و بینش اس راز سے واقف بھی ہیں کہ خالق اعصار و نگارندۂ آفات کون ہے ان حقیقتوں سے واقف ہونے کے باوجود ہم سب انسان ہیں، بنی نوع آدم، آب و آتش و باد و خاک کا ایک مرکب پھر یہ کہ ہمارا ایک معاشرہ ہے اس کی تہذیبی قدریں ہیں جن کے دائروں حصاروں میں ہماری پرورش ہوتی ہے ہم انھیں کو سینے سے لگائے ہوئے پیوند خاک ہو جاتے ہیں نئی قدروں سے مصالحت نہیں کر پاتے کیسے کریں؟ ہماری اعلیٰ اقدار ہمارے شریانوں میں خون کی طرح رواں دواں ہیں، یہ آگ ہمارے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکی ہے، آخر ہم اقدار کش زمانے سے کس طرح نباہ کر سکتے ہیں نیا زمانہ ہمیں قدامت پرست و شکست خوردہ کہہ کر متہم کرتا ہے جب کچھ نہیں بن پڑتا تو کوئی بس نہیں چلتا کیونکہ خنجر تو کف قاتل میں ہوتا ہے تب ہم ان کیفیات کو بساط اظہار تک لاتے ہیں ایسے نقوش تخلیق کرتے ہیں کہ جن میں ہمارے خوں نابۂ دل

کی نمی و سرخی ہوتی ہے اور یہی نقوش ہمیں گونا گوں تسکین کے اسباب کی فراہمی میں معاون ہوتے ہیں اور ہمیں اپنی تہذیبی لسانی شناخت کو برقرار رکھنے کی کوشش میں قریوں بستیوں صحراؤں نخلستانوں کی خاک چھاننے پر مجبور کرتے ہیں۔ ضیا فاروقی نے بھی یہی کہا ہے کہ گئے زمانوں کے نقوش پا میں میرا سراغ ملے گا اگر تم راستہ کا ایک ایک پتھر اُٹھا کر دیکھو گے یعنی یہ وہ راہیں ہیں جہاں سے ہزاروں قافلے گزرے ہیں ان کے یہاں اقدار کے نخل بے برگ وثمر کا نوحہ بھی ہے کہ اس میں ایک بھی پتہ نہیں ہے اور نئے پتوں کے آنے کی امید بھی نہیں ہے ان کی شاعری میں چشم حیراں کی رفاقت کے منقطع ہو جانے کا درد بھی ہے یعنی حیرانی ختم ہو چکی ہے آنکھیں پتھر بن چکی ہیں۔

مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں کہ ضیا فاروقی کی شاعری قدیم، جدید یا پھر مابعد جدیدیت کے زمرے میں آتی ہے ان کی شاعری سچی ہے بے باک ہے اور ان تمام تلازمات سے آراستہ ہے جو اچھی شاعری کے لئے ضروری ہیں اس گداز اس شعور غم سے لبریز ہے جس میں ان کا اپنا زمانہ ہی نہیں دیگر زمانے بھی ہیں قدیم ادبیات پر ان کا مطالعہ مبسوط و وسیع ہے ان کا فکری افق غیر مختتم ہے منور ہے ضوفشاں ہے ان کی اپنی لفظیات اپنا اسلوب اپنا لہجہ ہے جس میں معنی کا جہاں نو آباد ہے شاعر کا ذہن اس کے احساس کی بساط بیکراں ایک ایسے آئینے کی طرح ہے جس میں مناظر ڈوبتے اُبھرتے رہتے ہیں۔ ہم ٹیلی ویژن انٹرنیٹ موبائل جیسے تمام برقی آلات سماعت و بصارت کے حصار میں سانس لے رہے ہیں جن کے لئے غالب نے بہت پہلے کہا تھا

بجام و آئینہ حرف جم و سکندر چیست
کہ ہر چہ رفت بہر عہد در زمانۂ تست

میں محسوس کرتا ہوں کہ غالب کا یہ شعر شاعر کے احساس کی بساط بیکراں پر آویزاں آئینے کی طرف اشارہ کرتا ہے کیونکہ جام جمشید و آئینۂ سکندری تو ان زمانوں کی باتیں ہیں جو ماضی کی گود میں دفن ہو چکے ہیں لیکن وہ جو ہر زمانے میں باقی رہتا ہے غالب کے عہد میں بھی اور آج کے زمانے میں بھی وہ ایک ایسا بسیط آئینہ ہے جس کی حساس شاعر کے ذہن میں اس کی تنصیب اس طرح ہوتی ہے کہ اس کی سرشت کا حصہ بن کر اُبھرتی رہتی ہے، اس کے جمالیاتی تخیل کی ہمہ گیری و فراوانی کی طرف اشارہ کرتی ہے اس میں تصویروں کا اور عکسوں کا ایک جہان لامتناہی و غیر فانی قید ہے ایسی تصویریں جو سارے ماضی سے مستقبل تک محیط ہیں جن کے خدوخال میں غروب زمانے بھی ہیں رواں ساعتیں بھی ہیں اور نا آفریدہ لمحوں کا سیل بیکراں بھی، دیکھئے یہ اشعار ؂

مجھ کو خود اپنے ہی قدموں کے نشاں ملتے ہیں
دشت امکاں سے گزرتا ہوں جہاں ہو کر میں

☆

منتظر اس ابر پارے کا رہا میں عمر بھر
خشک ٹہنی پر جو اک پتہ ہرا روشن کرے

☆

وہ راہ جس میں شجر تھے نہ سایۂ دیوار
سفر اسی پہ بہ حال تباہ میں نے کیا

☆

سو گیا تھا میں سرِ شام مقفل کر کے
کھل گیا رات گئے بند دریچہ کیسے

☆

کل رات بھی تھا چودھویں کا چاند فلک پر
کل رات بھی اک قافلہ نکلا تھا کھنڈر سے

☆

علی الصباح جو رخشِ صبا پہ آئی ہے
فغانِ طائرِ وحشت اثر تمہارے نام

☆

وہ غرق کرتے ہیں پہلے مرے سفینے کو
پھر اس کے بعد سمندر میں جال ڈالتے ہیں

☆

سفر کی ابتداء سے انتہا تک
بس اک نقشِ قدم ہے یاد مجھ کو

☆

نطق کے عارض پہ پڑتی جا رہی ہیں جھریاں
ختم ہوتا جا رہا ہے میرے لفظوں کا سفر

☆

کیسی آندھی تھی اڑا لے گئی صدیوں کا وقار
میں تہی دست ہوا اپنی قبا سے کل رات

☆

میں تو سمجھا تھا کہ کچھ میں بھی ہوں دنیا آشنا
اک صدا آئی کہ تو خود سے بھی ہے نا آشنا

☆

جس سے وابستہ تھا بوسیدہ مکانوں کا وقار
میں نے ہر منظر میں ڈھونڈی وہ نشانی دیر تک

☆

تمام رات نگاہیں تلاش کرتی ہیں
مرا ستارہ مگر آسماں میں تھا ہی نہیں

☆

مدتوں سے راہ میں حائل ہے اک دریائے غم
اور عصا بردار میر کارواں کوئی نہیں

☆

اب اس کے بعد کوئی قہر شب ٹوٹے گا دھرتی پر
فلک سے ٹوٹتا کوئی ستارہ ہم نے دیکھا ہے

☆

تمام عمر کے صبر آزما یقیں کے ساتھ
جھٹک کے پھینک دی آنکھوں سے جستجو کل رات

☆

تنہا سورج دھوپ اُٹھا کر گزر گیا خاموشی سے
اپنا سایہ بانٹ رہے تھے سبز قبا والے درویش

گہرا اندوز استعاراتی نظام سے آراستہ ان اشعار میں شاعر کا وہ کرب پوشیدہ ہے جس میں حرف و ہنر کی ایک وسیع دنیا ہے رات کے حوالے سے انھوں نے ماضی وحال دونوں کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے اور نئی نسل کو آگاہ کیا ہے کہ ہمیں عصر رواں کے طائر کی فغان وحشت اثر سے سامنا کرنا ہوگا جو اس رات کے بعد ہونے والی ضیائے سحر کے ساتھ صبا کے اشہب تیز رفتار پر سوار ہو کر آتی ہے جو رات ہمارا مقدر بن چکی ہے۔ ضیا فاروقی کے یہاں تہذیبوں کی آویزش وتصادم کا المیہ ہے جو ان کے معاصرین کی فکری تحویل میں نہیں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان میں سے بعضوں کا کرب یہ نہ ہو یا پھر بعضوں نے اس اقدار کش دور سے مفاہمت کرلی ہو۔

بہر حال ایک کھنڈر کے عظیم ملبے میں نقوش عہد رفتہ کی تلاش یا ماضی کی اہرام نما خاکستر بے نہایت میں چنگاریوں کی جستجو بھی تمام عمر کے صبر آزما یقین کے ساتھ ختم ہوتی جارہی ہے۔ بقول صائب تبریزی۔

از بال و پر غبار تمنا فشاندہ ایم

تا شاخ گل گراں نہ شود آشیانِ ما

ضیا فاروقی کی نظموں میں بھی ایک منفرد فضا ہے جہاں تخیل آفرینی کے حوالے سے انہوں نے اپنے عہد کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ لفظوں کا اسلوب، بیانیہ کی پختگی، عرفان حیات کی خوش چہرگی ان میں قابل دید ہے۔ آواز جرس، بے خواب دریچوں سے، تھکن، مرگ عشق ان کی بہترین نظمیں ہیں، دیکھئے ان کی ایک نظم جوان کے کرب دروں کا ثمر شیریں ہے۔

برسوں پہلے ر میں جب گھر سے نکلا تھا ر ماں نے کہا تھا ر دیکھو بیٹا ر دور نہ جانا ر

شام سے پہلے گھر آجانا ر باپ نے بھی سمجھایا تھا ر بھیڑ میں جا کر کھو مت جانا ر

اپنی اک پہچان بھی رکھنا ر اپنے لہجے اپنی زباں سے ر دنیا میں جانے جاؤ گے ر

میرے بیٹے کہلاؤ گے ر برسوں پہلے ر گھر سے جب میں نکلا تھا ر

ماں کی ممتا باپ کی شفقت ر سر پر میرے سایہ فگن تھی ر گھر سے نکل کر راہ طلب میں ر

دشت جنوں سے شہر خرد تک ر چلتے چلتے اک یگ بیتا ر شام کا سورج دور افق میں ڈوب رہا ہے ر

اور ابھی میں محو سفر ہوں ....

ہمارا ادبی زمانہ بھی ایک مخصوص مزاج رکھتا ہے، جن قدروں نے بیسویں صدی کے نصف آخر کے آغاز میں جنم لیا ہے ان کی پرچھائیاں ادب کے کاغ وکو پر بھی پڑ رہی ہیں اور یہ بہتر بات ہے وہی کچھ لکھا جارہا ہے جو ہو رہا ہے لیکن لازم یہ بھی ہے کہ اس ادب پر بھی بات جاری رکھی جائے جس میں ہمارا بے حدود و بیکراں ماضی کروٹیں لیتا ہے۔ ضیا فاروقی کی شاعری اسی عہد کا بیانیہ ہے اس کی طرف بھی توجہ ہونی چاہئے تا کہ نئے برگ و بار سے آنکھیں تر و تازہ ہو سکیں۔

☆☆☆

(۵)

سلام بن رزّاق اپنے افسانوں کے آئینے میں

[ایک تجزیاتی مطالعہ]

● جابر زماں

سلام بن رزاق ساتویں دہائی کے بعد ابھرنے والے امتیازی افسانہ نگاروں میں اہم نام ہے۔ ان کا باضابطہ ادبی سفر 1962ء میں ماہنامہ 'شاعر' ممبئی میں افسانہ 'رین کوٹ' کی اشاعت سے شروع ہوا۔ ان کا پہلا مجموعہ 'ننگی دوپہر کا سپاہی' [1977ء] میں اور دوسرا مجموعہ 'معبر' [1987ء] میں شائع ہوا۔ ان کے افسانوں کی تیسری کتاب 'شکستہ بتوں کے درمیان' [2001ء] میں اور چوتھا مجموعہ 'زندگی افسانہ نہیں' [2012ء] میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔ اس طرح ان کے چھتیس سال کے طویل ادبی سفر میں صرف چار مجموعے؟ اور ان سبھی کی اشاعت کے مابین پوری ایک دہائی یا اس سے زائد کا فاصلہ؟؟ ایسا تو ممکن نہیں کہ ان برسوں میں انھوں نے یہی گنتی کے افسانے لکھے ہوں۔ سوچنا، لکھنا اور پھر سوچنا غالباً ان کی مخصوص روش ہے جو ان کے مزاج میں موجود استقلال، ٹھہراو اور سخت انتخاب کا بین ثبوت ہے۔ انسانی زندگی کے عمیق مشاہدے کے سبب ان کی تخلیقات کے سماجی سروکار مٹی میں پیوست نظر آتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا شناخت نامہ وہ اسلوب ہے جس میں کہانی پن ہر جگہ واضح ہے۔ اس میں مناظر کے سہارے کہانی کو آگے بڑھانے کی خاص روش ملتی ہے جس کے عقب میں ایسا بیانیہ جنم لیتا ہے جس سے تمثیل اور استعارہ سازی کی مہارت کا ادراک ہوتا ہے۔ انھوں نے کہانی سنانے کے انداز میں استعارہ و علامت کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ نبھایا ہے۔

سلام بن رزاق کے فکری و فنی ارتکازات اس لائق تھے کہ اس طرح کی کتاب پہلے ہی شائع ہو جانی چاہیے تھی۔

یہ حالات کی ستم ظریفی ہی کہی جائے گی کہ ہندوستان کے دو بڑے جامعات جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں سلام بن رزاق کے فکر و فن پر ایم فل کی ڈگری کے لیے مقالے لکھے جانے کے باوجود شائع نہیں ہو سکے۔ وقت یوں ہی چلتا رہتا ہے اور افراد اس کے پیچھے؛ شاید اسے کسی شاکر تسنیم کی تلاش تھی۔ اور اب ان کی مرتب کردہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ شاکر تسنیم بہ ذات خود فکشن اور تھیئٹر سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ حال ہی میں انھوں نے سنٹرل یونیورسٹی آف جھارکھنڈ کے 'سینٹر فار پرفارمنگ آرٹ' کو اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے جوائن کیا ہے۔ یہ ان کی پہلی کتاب ہے جو اشاعت کے مراحل سے گذر کر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ خدا کرے کہ ان کا مرحلہ شوق ہمیشہ بگورت کے مراحل میں ہی رہے۔

زیر مطالعہ کتاب باقاعدہ تنقیدی مطالعہ نہیں بلکہ اس میں ان مضامین کو جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو وقتاً فوقتاً سلام بن رزاق کے افسانوں کے تجزیاتی مطالعہ کے بہ طور شائع ہوتے رہے ہیں۔ شاکر کی یہ کوشش لائق صد مبارک باد ہے کہ انھوں نے اس جانب سنجیدہ توجہ کی۔ یہ دراصل بازدید کی کوشش ہے اور اس بازدید میں مختلف نقطہائے نظر پر مبنی مطالعے قاری کے ذوق کو کسی قدر تسکین دینے کے لیے حاضر ہیں۔ ان مطالعات میں صف اول کے ناقدین کے مضامین کے ساتھ نئی نسل کے وہ افراد بھی شامل ہیں جنھیں ہم طالب علم کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح ان تخلیق کاروں کے تجزیے بھی شامل کتاب ہیں جو بہ ذات خود اسی نسل کے افسانہ نگار ہیں۔ اس طور پر اس کتاب میں کم از کم تین نسلوں کی نمائندگی ہے۔ مرتب نے قاری کے لیے یہ موقع فراہم کیا ہے کہ سلام بن رزاق کے فنی اجتہاد اور فکری ارتکاز سے متعلق ان تینوں نسلوں کی رائے کو محنت اور خوش اسلوبی سے جمع کر دیا ہے۔ اب قاری کے لیے یہ موقع ہے کہ ان مضامین کی روشنی میں یہ بات اخذ کرے کہ معاصر منظر نامے میں سلام بن رزاق کی کہانیوں کی کیا اہمیت ہے۔ بزرگ ناقدین کے ساتھ نئی نسل انھیں کتنی سنجیدگی سے پڑھ رہی ہے۔ اس طور پر قاری کے لیے اس کتاب میں مختلف ذائقے کا سامان بہم ہے۔ ان مضامین کے مطالعہ سے قاری کا جو نظریہ سامنے آئے گا بہت حد تک تجزیاتی ہوگا جو کہانی کی معنوی جہات میں اضافہ کا موجب بنے گا۔

کتاب کی ترتیب بھی لائق تحسین ہے۔ مرتب نے پہلے زیر تجزیہ افسانے کا مکمل متن دیا ہے اور اس کے خاتمے پر اس کا تجزیہ۔ یہ صورت متن اساس تنقید کے لیے خوش گوار ہے۔ تمام طرح کے نظریات اور پس منظر کو ایک جانب رکھ کر پہلے متن کی قرات اور اس کے بعد اس کی تفہیم سے مکالمہ کرنے کا پورا موقع فراہم کیا گیا ہے۔ یوں تجزیہ کہیں بھی بذاتہ مقصود نہیں ہوتا لیکن اس کے ذریعہ متن کے باطن میں اترنے کے مواقع ضرور حاصل ہوتے ہیں اور اس کی روشنی میں جو نظریہ/ آئیڈیالوجی تشکیل پاتا ہے وہ متن اساس ہوتا ہے۔ اس میں ایک حد تک شدھتا ہوتی ہے۔ زیر مطالعہ کتاب میں کل بارہ افسانے شامل ہیں لیکن تجزیوں کی تعداد چودہ ہے۔ وہ یوں کہ 'معبر' اور 'چادر' ایسے افسانے ہیں جن کے متعلق دو۔ دو مضامین شامل ہیں۔ ظاہر کہ ان افسانوں کا انتخاب کرنے میں مقالہ نگار/ تجزیہ نگار آزاد تھے؛ اس لیے کہ یہ تجزیے فرمائشی نہیں ہیں۔ ایسی صورت میں یہ واضح ہے

کہ تمام تجزیہ نگاروں نے انھیں متون کو منتخب کیا ہوگا جو ان کے تحفظات کی روشنی میں مفید تر رہا ہوگا۔ بہ الفاظ دیگر انھوں نے سلام بن رزاق کے بہترین افسانوں کو ہی تجزیے کے لیے منتخب کیا ہوگا۔

کتاب میں شامل پہلا تجزیہ 'انجام کار' کا ہے جس کے معنوی انسلاکات کو گوپی چند نارنگ نے بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ نارنگ صاحب واحد ایسے ناقد ہیں جنھوں نے فکشن کو بڑی توجہ کے ساتھ پڑھنے کی کوشش کی ہے اور پھر انھیں متون سے ایسے نکات اخذ کیے ہیں جو فکشن تنقید میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سلام بن رزاق نے اس کہانی کا ڈھانچہ بڑے احتیاط سے تیار کیا ہے۔ انھوں نے شامو دادا کے ذریعہ قانون اور اس کے رکھوالوں پر سوالیہ قائم کیا ہے۔ انسان بدی کے مقابلے کا حوصلہ رکھنے کے باوجود اس پر قادر نہیں ہے۔ موجودہ ناقص نظام میں پولیس اور غنڈوں کی سازباز عام ہے۔ وہ برائی کو عام زندگی کا ایک حصہ تصور کرتے ہوئے قبول کر رہے ہیں۔ کہانی کا مرکزی کردار بھی خود کو اس برائی کے ساتھ مفاہمت کرنے پر مجبور پاتا ہے۔ نارنگ نے اس کہانی کا تجزیہ کرتے ہوئے سلام بن رزاق کے یہاں بیانیہ کی حرکیات پر خصوصی توجہ دی ہے۔ یہ مطالعہ مابعد جدید نظریات خصوصاً ردتشکیل تناظرات کو اساس فراہم کرتا ہے۔

قمر رئیس نے سلام بن رزاق کے مشہور افسانہ 'ندی' کا تجزیہ مارکسی جمالیات کے تناظر میں کیا ہے۔ اس افسانے میں سلام بن رزاق نے لوگوں کی آپسی نااتفاقی کو مینڈک کے کردار کے ذریعہ درشایا ہے۔ جس طرح مینڈکوں کے مختلف گروہ ایک مخصوص کنویں/تالاب پر قابض ہو کر خود کو سب سے بڑا سمجھتے ہیں۔ ان کے رفقا/حوارین اس بات کی نہ صرف تائید کرتے ہیں بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر دوسروں کو تشنیع و تعریض کا نشانہ بنانے سے باز نہیں رہتے۔ اسی طرح انسانی معاشرہ بھی انتشار کے سبب کئی حصوں میں منقسم ہے۔ ہر شخص اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے میں مصروف ہے۔ دوسرے کے بارے میں اس کا رویہ اکثر معاندانہ یا کم از کم غیر دوستانہ ضرور رہتا ہے۔ انسان خود انسانیت کو سانپ بن کر ڈس رہا ہے۔ اور اپنے وجود کو کھوکھلا کرنے پر تلا ہوا ہے۔ افسانے میں ندی اور اس کے رہنے والے مینڈک، مچھلی، مگر مچھ اور دوسرے جانور استعاراتی اور علامتی روپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ قمر رئیس نے اس کہانی کو عالمی سیاسی تناظر میں دیکھا ہے اور اس کی تمام جزئیات/تلازمات کو معنوی سیاق اس طرح عطا کیا ہے کہ اس کہانی کا معنوی چہرہ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ تخلیق کار نے بھی کہانی میں ندی کا پس منظر اس طرح پیش کیا ہے کہ اس کے استعاراتی اور علامتی انداز کے باوجود سماجی، سیاسی اور تہذیبی منظرنامہ قاری کے سامنے روشن ہو جاتا ہے۔ اس طرح 'ندی' کا تمثیلی بیانیہ سامنے آتا ہے اور یہ کہانی بلاشبہ بین الاقوامی اتحاد کے پس منظر میں بہترین کہانی ٹھہرتی ہے۔

سلام بن رزاق کا افسانہ 'بجوکا' کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اسی عنوان سے سریندر پرکاش کا بھی افسانہ ہے لیکن وہ اپنے موضوع اور اظہاریہ میں اس سے مختلف ہے۔ زیر بحث کہانی میں پہلے اختتام سامنے آتا ہے۔ پھر جیسے جیسے قاری افسانے کی گہرائی میں اترتا ہے اس کے حقیقی مناظر سے واقفیت حاصل کرتا جاتا ہے۔ یہ افسانہ انسانی شعور کی تہوں کا احاطہ کرتا ہے۔ وارث علوی نے اس افسانے کا تجزیہ کرتے ہوئے اسے شاہکار افسانہ بھی قرار دیا ہے۔ ان کا یہ تجزیہ متن کے معنوی انسلاک کے بجائے قاری کے تاثر کو زیادہ مرکز میں رکھتا ہے۔ یہی وجہ

ہے کہ انھوں نے بیشتر از سرِ نو کہانی کی تشکیل کی ہے اور آخر میں افسانے کے مرکزی کردار 'اشوک' کی نقل وحرکت کے تناظر میں اسے 'بجوکا' سے منسلک کر دیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ تجزیہ کمزور محسوس ہوتا ہے۔

افسانہ 'معبر' کے دو تجزیے شامل ہیں۔ پہلا مضمون حامدی کاشمیری کا ہے اور دوسرا یاسمین محمدی بیگم سے منسوب ہے۔ حامدی کاشمیری کی تنقیدی روش میں متن کو اساس حاصل ہے۔ انھوں نے افسانے کا تجزیہ کرتے ہوئے بھی متن ہی کو اساس بنایا ہے اور بیانیہ میں ڈرامائی عمل اور داستانوی تجسس کی شمولیت کا انکشاف بڑی خوبی کے ساتھ کیا ہے۔ انھوں نے افسانے کو کثیر جہت تو ضرور کہا ہے لیکن ان کا یہ تجزیہ یک جہتی ہے۔ یاسمین محمدی بیگم نے کہانی کو مادی اور روحانی تناظر میں پڑھنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے تجزیے میں کافی محنت کی ہے لیکن ایک کسر باقی رہ گئی ہے۔ کہانی کے اقتباسات کچھ زیادہ ہی ہیں۔ اسی طرح مضمون کے شروع کے دو پیراگراف جو بہ طور تمہید قلم بند کیے گئے ہیں، زائد معلوم ہوتے ہیں۔

مہدی جعفر نے اپنے تجزیے کے لیے 'آوازِ گریہ' منتخب کیا ہے جسے 2001ء کے کتھا ایوارڈ سے بھی نوازا جا چکا ہے۔ انھوں نے اس کہانی کو 'دلچسپی' کے ساتھ پڑھا ہے اور 'سلونا او کیمپوؤ کے افسانے' آزاباخ' سے تقابل کیا ہے۔ یہ مضمون تجزیہ نہ ہو کر تقابلی مطالعہ بن گیا ہے۔ انھوں نے سلام بن رزاق کی کہانی میں جو کمزوریاں نشان زد کی ہیں وہ بھی متن سے اخذ کرنے کے بجائے تقابل متن کی روشنی میں متعین کی گئی ہیں۔ اس طور پر یہ مضمون تنقید کے بجائے تحقیق کو اعتبار عطا کرتا ہے، جس میں تقابل متن سے حاصل شدہ اختلافات کو بیان کر دیا گیا ہے۔

آزادی کے بعد ہندوستان میں فسادات کا جو سلسلہ شروع ہوا اس نے کتنے زرخیز شہروں کو بنجر اور کتنے شاداب علاقوں کو بے آب وگیاہ بیابان میں تبدیل کر دیا یہ کہنے کی بات نہیں۔ فسادات کے دوران فلسفہ، مذہب اور انسانیت تمام باتیں کتابی ہو کے رہ جاتی ہیں۔ دوست، دشمن کی تمیز اٹھ جاتی ہے۔ انسان اپنے پڑوسی تک کو مارنے پر تل جاتا ہے۔ ایسا دونوں گروہوں کے آپسی تعصب کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اس درمیان جن کرب ناک حالات سے گذرنا پڑتا ہے وہ کسی بھی صحیح دماغ انسان کے لیے مشکل ترین مرحلہ ہوتا ہے۔ سلام بن رزاق نے بھی ان باتوں کو قریب سے محسوس کیا ہے۔ 'چادر' اور 'باہم' ایسی ہی کہانیاں ہیں۔

'چادر' بھی ایسی ہی کہانی ہے جس کے دو تجزیے شامل ہیں۔ پہلا تجزیہ انور قمر کے قلم سے اور دوسرا انور ظہیر خان کے قلم کا نتیجہ ہے۔ دونوں نے اس کہانی کو فرقہ واریت اور ممبئی فسادات کے تناظر میں دیکھا ہے اور بڑی توجہ اور دلچسپی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مذہبی جنون اور فرقہ وارانہ تناظر میں سلام بن رزاق کی دوسری کہانی 'باہم' ہے جس کا تجزیہ طارق چھتاری نے کیا ہے۔ مرتب نے اس تجزیے کے تعلق سے اپنے مقدمہ میں ایک دلچسپ واقعہ یہ بیان کیا ہے کہ ساجد رشید نے یہ کہانی کسی سمینار میں بہ طور مقالہ پڑھے جانے کی غرض سے اشاعت سے پہلے ہی تخلیق کار کے نام کے بغیر طارق چھتاری کو تجزیہ کے لیے بھیجا تھا۔ طارق چھتاری جب سمینار میں یہ تجزیہ پڑھنے جا رہے تھے تب انھیں معلوم ہوا کہ یہ افسانہ سلام بن رزاق کا ہے۔ یہ مضمون تجزیے کے حدود میں رہتے ہوئے بڑی توجہ اور سنجیدگی کے ساتھ کہانی کے معنوی سیاق کو روشن کرتا ہے۔ انھوں نے

جزئیات کو بھی کہانی کے مجموعی معنوی سیاق سے منسلک کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔
'ایک جھوٹی سچی کہانی' کا تجزیہ نورالحسنین نے اور 'آخری کنگورا' کو م. ناگ نے اپنے مطالعے کے لیے منتخب کیا ہے۔ 'زندگی افسانہ نہیں' کا تجزیہ اسلم پرویز نے 'زندگی افسانہ ہی ہے' کے عنوان سے کیا ہے۔ اس تجزیے کا اظہاریہ جداگانہ ہے۔ ناقد/مصنف نے نسوانی کردار بن کر بہ صورت مکتوب یہ مضمون قلم بند کیا ہے۔ انھوں نے اس تحریر کے آغاز میں یہ وضاحت کردی ہے کہ ان کی توجہ صرف 'جمیلہ' کے کردار کو سمجھنے کی کوشش ہے۔ واقعی انھوں نے جمیلہ کے کردار کو نیا رخ عطا کیا ہے۔
سلام بن رزاق نے اپنے کئی افسانوں میں عام آدمی کے استحصال، سیاسی جبریت، ماحول اور حالات کی جکڑ بندیوں کو موضوع بنایا ہے۔ 'کلہاڑی' بھی ایسی ہی کہانی ہے۔ اس کا تجزیہ قاسم ندیم نے دلت تناظرات میں کرتے ہوئے اسے 'مزاحمت کا استعارہ' قرار دیا ہے۔ شاکر تسنیم نے سلام بن رزاق کے افسانے سبق کا تجزیہ کیا ہے۔ یہ افسانہ بودھ تعلیمات سے متاثر ہے۔ حقیقت مطلقہ کو لفظوں کے ذریعہ پیش نہیں کیا جاسکتا؛ صرف تجربہ/بصیرت ہی اس کو جان پائی ہے۔ اس تجزیے کو انھوں نے سبق کو درس کے معنی سے منسلک کرتے ہوئے معاصر دور کے تعلیمی منظرنامے کی بے کسی کو بھی واشگاف کیا ہے۔ بودھ کے فلسفے پر گفتگو کرتے ہوئے شنکراچاریہ کے فلسفے کا تقابل واقعی برمحل ہے اور نئی سطحوں پر معنی کشائی کے عمل میں شریک بھی۔ ہاں خلیل جبران کے اقوال ضرور زاید معلوم ہوتے ہیں۔
کتاب کے شروع میں آٹھ صفحات پر مبنی مقدمہ بھی شامل ہے جو مرتب کی ترجیحات کو آئینہ کرتا ہے۔ انھوں نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ سلام بن رزاق اور ستر کے بعد کی نسل کے مسائل و مباحث کی روشنی میں سلام بن رزاق کے فکری وفنی اجتہاد کو واضح کیا ہے۔ ساتھ ہی مختصراً تمام مضامین پر اظہار خیال بھی کیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب سلام بن رزاق کے حوالے سے دستاویزی حیثیت اختیار کرلیتی ہے۔ کتاب میں جابہ جا پروف کی خامیاں راہ پاگئی ہیں جو مطالعہ میں ضرور حارج ہوتی ہیں لیکن ان کی تعداد کم ہے۔ پھر بھی تھوڑی توجہ سے انھیں درست کیا جاسکتا تھا۔ یہ کتاب طالب علموں کے ساتھ عام قاری کے لیے بھی لائق مطالعہ ہونے کے ساتھ مجموعی طور پر بہتر پیش رفت ہے۔

نام کتاب: سلام بن رزاق اپنے افسانوں کے آئینے میں [ایک تجزیاتی مطالعہ]
مرتب: شاکر تسنیم / اشاعت: 2013ء
صفحات: 240 قیمت: 250/ =
زیر اہتمام: مکتبہ صدف، مظفرپور، بہار / مبصر: جابر زماں

☆☆☆

شہرِ آمد

پٹنہ سے ''آمد'' کی آمد: ادب میں نجات کی تحریک کا آغاز

''ادب میں کوئی نظریہ عام آدمی رمکمل آدمی کے حق میں نہیں تھا۔'' [خورشید اکبر]

• علی حیدر ملک

دنیا نئی ہے، لوگ نئے، سوچ بھی نئی۔ ہر شے بدلتی جاتی ہے۔ لمحوں کے پھیر سے تغیر کا عمل جاری ہے۔ ہر شے تبدیل ہورہی ہے۔ ترقی پسندی اور جدیدیت کے درمیان جو دیوار برلن تھی نئے رجحانات کی آندھیوں نے اسے بھی گرادیا ہے۔ آج کا ادب اور ادیب نئے نظریوں کے خلاف نہیں لیکن نظریوں کو تخلیق کی راہ میں دیواروں کا نہیں بلکہ نئے راستوں کا کردار ادا کرنا چاہئے ورنہ ادب زندگی سے کٹ کر جمود کا شکار ہوسکتا ہے۔ میں اپنے گذشتہ کالموں میں احسن سلیم کے جریدے ''اجراء'' کے حوالے سے لکھ چکا ہوں کہ انھوں نے اپنے ادبی جریدے کا منشور ''ادب برائے تبدیلی'' ایک تحریک بنانے کی کوشش کی ہے۔ اسی طرح پٹنہ سے شائع ہونے والے سہ ماہی ''آمد'' نے ادب میں نجات پسندی کی تحریک کا آغاز کیا ہے۔ ''آمد'' کا اداریہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اپنے اس مختصر کالم میں خورشید اکبر کے اداریے کا ایک مختصر اقتباس نذر قارئین کررہا ہوں۔ خورشید اکبر لکھتے ہیں کہ: ''ادب اور زندگی: خیال رہے کہ زندگی ادب کا بنیادی مرکزی اور سب سے بڑا حوالہ ہے جس کے بغیر ادب کی تخلیق وتشکیل اور تعمیر کا تصور بھی محال ہے لیکن سوال پھر پیدا ہوتا ہے کہ ادب میں کیسی اور کس کی زندگی کے احوال وآثار کا اظہار وبیان ہو؟ کیا اس سلسلے میں ترجیحات متعین کی جاسکتی ہیں؟ شاید نہیں۔ لیکن ہمارے بعض ناقدین اور ادب کے ماہرین نے مغرب سے مستعار

نظریات کی بنا پر زندگی کو بے شمار خانوں میں تقسیم کر کے اپنے الگ الگ ادبی دبستانوں کو خوب چمکایا ہے جو ہماری ادبی تحریکات اور رجحانات کے اہم اور نا قابل فراموش حوالے ہیں۔ گویا زندگی کو اس کے تمام تر حسن و قبح کے ساتھ کلی طور پر انگیز کرتے ہوئے اظہار و پیشکش کو خاطر خواہ اہمیت نہیں دی گئی کہ اس سے نظریاتی وابستگی اور سیاسی وفاداری پر حرف آنا لازمی تھا جس کا خطرہ بہت کم لوگوں نے اٹھایا۔ اس طرح مکمل زندگی سے بے وفائی اور بے اعتنائی کا ایک عبرت آموز ادبی منظر نامہ تواتر سے ہمارے سامنے پیش ہوتا رہا اور ادب کے سیدھے سادے لوگوں کے پاس سوائے تماشائی بننے کے دوسرا کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ ''ادب کا عام آدمی'' کسی تنظیم کے پلیٹ فارم یا انجمن امداد باہمی سے وابستہ نہیں تھا اور یہی اس کی تاریخی بھول تھی جو آج بھی دہرائی جا رہی ہے۔ کہنے کی مراد یہ ہے کہ اردو ادب میں اب تک کوئی بھی نظریہ عام آدمی رکمل آدمی کے حق میں نہیں تھا تو پھر عام آدمی ادب کے حق میں کس طرح کھڑا ہو سکتا تھا۔ حالانکہ ہمارے کچھ اکابرین نے طبقاتی کشمکش اور عوامی شعور کے زیر اثر ادبی سرمایہ فراہم کرنے کا دعویٰ ضرور پیش کیا لیکن انھوں نے بھی آدھے ادھورے آدمی کا آدھا ادھورا ادب ہی سامنے رکھا جس کی قلعی بہت جلد اتر گئی اور ادب کے فراری دستے نے اس پر بری طرح شب خون مار دیا کہ اب تو ادب کے نئے ٹھیکے داروں کی لسانی موشگافیوں سے بھی اس منصوبہ بند چکرویوہ کو توڑ کر نکل پانا ممکن نہیں تو قدرے دشوار ضرور ہو گیا ہے، آگے اللہ ہی جانے''۔

☆☆☆

شہرِ خیر و خبر
مکتوبات

● اقبال مجید، بھوپال [مدھیہ پردیش]: ۵/مارچ ۲۰۱۴۔ کل آپ کا پرچہ ملا۔ اسے دیکھ کر یاد آیا کہ زرسالانہ کی مدت شائد اب ختم ہوگئی ہوگی اس لئے -/600 روپے کا چیک منسلک ہے۔ قبول فرمایئے۔ کچھ دنوں پہلے ایک افسانہ ہوگیا تھا سو، اسے مرحوم ساجد رشید کے سہ ماہی "نیا ورق" [ممبئی] کو بھیج دیا۔ ان کا لڑکا شاداب کتنی بار فون کر چکا تھا اور میں نے وعدہ بھی کر لیا تھا۔ کیا اب لوگوں نے بالکل ہی لکھنا بند کر دیا ہے؟ آپ کے اس شمارے میں ایک بھی کہانی دیسی نہیں ہے۔ پرائی ہانڈی کی کھرچنیں ہیں۔ خیر آپ کیا کر سکتے ہیں۔ خدا کرے آپ بہ خیر ہوں!

دوسرا خط: ۵/اپریل، ۲۰۱۴۔ برادرم خورشید اکبر صاحب۔ ایک افسانہ ہوگیا ہے۔ اس کی تکمیل کے بعد آپ اس لئے بھی یاد آئے کہ آپ سے وعدہ کر چکا تھا۔ یہ افسانہ اپنی ٹیکنک خود ہی لے کر آیا ہے جس کے لئے مجھے خود سے کوئی کوشش نہیں کرنا پڑی۔ ایسا غالباً آپ بھی محسوس کریں گے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس میں آپ کو آورد کے بجائے آمد ملے گی۔ بہر حال برائے ملاحظہ ارسال ہے۔ خط مل جائے تو فون کر دیجئے گا۔ دوستوں کو مناسبات۔ مخلص اقبال مجید

تیسرا خط: ۱/مئی، ۲۰۱۴۔ عابد سہیل کی سوانح 'جو یاد رہا' پر اپنے مختصر تاثرات قلم بند کر کے آمد کے لئے ارسال کر رہا ہوں۔ اگر کسی لائق ہوں تو اشاعت کے لئے شامل کر لیجئے۔ مری صحت دعاؤں پر چل رہی ہے۔ تھوڑا تھوڑا لکھ لیتا ہوں کہ چور ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ امید کہ مزاج بخیر ہوں گے۔ دوستوں کو مناسبات۔

آپ کا مخلص اقبال مجید۔ Mob:09893764746

● جسٹس ایم۔ سہیل اعجاز صدیقی، گیٹ نمبر: ۴، فرسٹ فلور، جیون تارا بلڈنگ، ۵۔ سنسد مارگ، پٹیل چوک، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۱: مورخہ ۲۹/مئی، ۲۰۱۴ء۔ مکرمی۔ آمد کا تازہ شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ شکریہ۔ آپ نے آمد میں جو اداریے قلم بند کیے ہیں وہ یہ بخوبی ثابت کرتے ہیں کہ آپ کا مطالعہ بہت گہرا ہے اور آپ صاحبِ نظر مدیر ہیں۔ آمد میں شائع ہونے والے ادبی تحقیقی مضامین، افسانے، نظم و غزل اس جریدے کو ایک مستند معیاری ادبی دستاویز کا روپ دیتے ہیں۔ رشید امجد کا افسانہ "کچھوے کی موت" بے حد معیاری ہے اور اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

مخلص سہیل اعجاز صدیقی Ph011-2336776O[O]/011-23385904 [R]

● احمد صغیر صدیقی، A-102۔ مرجینا کمپلیکس، گلشنِ اقبال: B-13، کراچی [پاکستان]: برادرم، سلام مسنون۔ آج میں سہ ماہی "ثالث" [مونگیر] کے لیے اپنی کچھ تحریریں بھیج رہا ہوں۔ اس میں آپ کے جریدے کا اشتہار دیکھا سو آپ کو بھی اپنی ایک غزل اور ایک نظم بھیج رہا ہوں۔ میں انڈیا کے پرچوں میں نہیں

چھپتا (سوائے 'سرسبز' اور 'شاعر' کے)، کہ وہ مجھے وہ شمارہ تک نہیں بھیجتے جس میں میری کوئی چیز چھاپتے ہیں۔ آپ سے بھی درخواست ہے کہ اگر میری کوئی چیز چھاپیں تو وہ شمارہ ضرور بھیج دیں۔ میں ممنون ہوں گا۔ دعا کررہا ہوں کہ یہ خط آپ کو مل جائے۔ Ph:021-34820506/Mob:0346-2377854

● شاہد عزیز، بھکاری ناتھ جی کا مٹھ، بھوپال پورا، اودے پور۔۳۱۳۰۰۱ [راجستھان]: ۸/مارچ، ۲۰۱۴ء۔ "آمد" نمبر ۱۰ مجھے مل گیا تھا۔ اب تک بھی یہ میرے مطالعے میں ہے۔ 'ادب برائے نجات' کا فلسفہ ابھی زیر بحث ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ابھی اس کے کچھ پہلوؤں پر غور ہیں۔ اس موضوع پر لوگوں کی کچھ دلچسپی بڑھ ضرور گئی ہے۔ کافی لوگوں نے اس کا ذکر اپنے خطوں میں کیا ہے اور کچھ لوگوں کے خطوں کو تو آپ نے مضمون کے طور پر بھی شائع کیا۔ انور سدید صاحب نے لکھا ہے کہ: "ادب برائے نجات کا مفہوم واضح نہیں ہے۔" ادب میں ایسا ہو رہا ہے کہ جب کوئی موضوع رکوئی تحریک رکوئی نیا رجحان سامنے آتا ہے تو اس پر جم کر باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ جب حالی نے ادب میں نئی جان پھونکنے کی کوشش کی تو ایک ہنگامہ مچ گیا۔ جب ترقی پسند تحریک کی ابتدا ہوئی تو کچھ لوگ اس تحریک سے خوش نہیں ہوئے اور اس کے انحراف کے طور پر جدیدیت سامنے آئی۔ مگر ۸۰ کے آس پاس جدیدیت کی موت کا اعلان کر دیا گیا اور مابعد جدیدیت کے بعد اب باری ہے ان تمام تحریک اور رجحان سے نجات پانے کی یعنی "ادب برائے نجات" کی۔ کیوں کہ ادب میں جو مافیا کام کر رہا ہے اس کا ظلم ضرورت سے زیادہ بڑھ گیا ہے۔ اور اس ادب مافیا سے نجات پانے کا ایک طریقہ ہے کہ بے خوف وخطر تخلیقی سفر جاری رکھا جائے۔ اس جملے کے بعد ممکن ہے وضاحت کی ضرورت نہ پڑے کہ "ادب کا مقصدِ نجات اس کی خود مختاری اور آزادی میں پوشیدہ ہے"۔ ایک بہت ہی بھرپور خط مصداق اعظمی کا پڑھنے کو ملا جس میں پرچے میں اشاعت پذیر تمام تخلیقات پر بڑا اچھا تبصرہ کیا گیا۔ آپ کے اداریے نے "ادب برائے نجات" پر ایک بار پھر "آمد" کے قارئین کو سوچنے پر مجبور کر دیا ہے مگر انور سدید کی یہ بات بھی غور طلب ہے کہ ابھی ہندوستان کے دیگر رسالوں نے اس موضوع پر کوئی خاص توجہ نہیں دی ہے۔ اس کی وجہ بھی مصلحت کے سوا کچھ نہیں۔ اور انہی مصلحتوں سے پردہ اٹھانے کا کام "آمد" کر رہا ہے۔ فضیل جعفری، علی احمد فاطمی اور کے ایل نارنگ ساقی نے اردو والوں کی نظر میں اپنا قد بہت چھوٹا کر لیا ہے۔ خیر ایسا ہوتا رہا ہے۔ آپ کا شاہد عزیز۔ Mob: 09252552341

● رفیق شاہین، تعلیم منزل، میرس روڈ، علی گڑھ۔ 202002 [اتر پردیش]: ۱۹/فروری، ۲۰۱۴ء۔ محترم المقام جناب خورشید اکبر صاحب، تسلیمات! 'آمد' کتابی سلسلہ نمبر ۱۰ آج موصول ہوا۔ آپ کا اداریہ اور شہر اشتراک کے تحت مشمولہ دونوں غیر ملکی ناول اور افسانے کے تراجم 'آمد' ہاتھ میں آتے ہیں پڑھ ڈالے۔ جہاں تک 'ادب اور نعرۂ نجات' کا تعلق ہے آپ نے اچھا ہی کیا کہ اپنے موقف کی توضیح وتشریح انجام دے کر مسئلے کو اچھی طرح سلجھا دیا ہے اور اب یہ بات اچھی طرح ذہن نشیں ہو چکی ہے کہ آپ ادب کو ترقی پسندیت، جدیدیت، تجریدیت علامیت، ایمانیت، فردیت، فراریت اور قنوطیت کو بھی نظریاتی جبریت وادعائیت کی

جکڑ بندیوں سے رہائی اور نجات دلانے کے خواہاں ہیں تا کہ ادب کی رگوں میں زندہ لہو گردش کر سکے۔آپ کا ایسا سوچنا یقیناً ایک مستحسن قدم ہے۔اب پوچھنا باقی یہ ہے کہ کیا نجات آراستہ ادب کو لاتحریک ادب سے تعبیر کرنا درست ہوگا؟؟؟ ڈی ایچ لارنس کے ناول 'لیڈی چیٹر لیز لورز' کی بلا مبالغہ بہت اچھی تلخیص کی گئی ہے جس میں کرداروں کے مافی الضمیر اور جذبات واحساسات کو بحسن وخوبی اردو کے پیکر میں ڈھالا ہے۔ اس کے لیے ناصر بغدادی تحسین وتہنیت کے مستحق ہیں لیکن شرجیل احمد خاں کے ترجمے 'جنگلی ہنس' نے مایوس کیا ہے۔انھوں نے نہایت ناقص کہانی کا انتخاب کیا ہے جو سرتاسر بدذوقی کی علامت ہے۔کہانی بس اتنی ہے کہ دورانِ سفر ایک جنس زدہ مرد برابر بیٹھی ایک خاتون کے گھٹنے پر ہاتھ رکھتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ یہ ہاتھ خاتون کے چنگاسوں کے جوڑ تک پہنچ جاتا ہے۔وہ خاتون بعد میں دیر تک اس کے ہاتھ کے لمس کو محسوس کرتی ہے۔کہانی کا غیر ملکی ہونا ہی کیا اس کی خوبی ہے؟ ایسی گھٹیا کہانی تو ہمارے یہاں نوآموز بھی نہیں لکھتے۔کیا شرجیل احمد خاں کہانی کے محاسن بیان کرنے کی زحمت گوارا کریں گے؟ خیر اندیش رفیق شاہین۔

Mob:08979248741

● راشد جمال فاروقی، سی۔۱۴۵۲، آئی ڈی پی ایل ٹاؤن شپ، ویر بھدر (رشی کیش)، دہرہ دون۔۲۴۹۲۰۲ [اترا کھنڈ]: ۳۱ مارچ، ۲۰۱۴۔ بھائی خورشید اکبر صاحب، سلام مسنون۔خدا کرے آپ بعافیت ہوں۔'آمد' کا انتظار رہنے لگا ہے۔شمارہ نمبر۔۱۰ موصول ہوا تو میری طبیعت بے حد ناساز تھی۔یہاں اترا کھنڈ کی ہڈیوں کے گودے میں اتر جانے والی ٹھنڈ اور میں ضیق النفس کا مریض لیکن 'آمد' نے تخلیقی آنچ دے کر بچالیا۔میں ممنون ہوں کہ آپ نے میرا خط شامل فرمایا۔اداریہ میں میری درخواست کو قابل اعتنا جانا اور اس بات کے لئے بھی مشکور ہوں کہ محترم انور سدید صاحب کو میرا تحریر کردہ تبصرہ (جینت پرمار کی کتاب 'نظم یعنی...' پر) پسند آ گیا۔میرے لئے یہ بات ایک سند سے کم نہیں ہے۔آپ کو میں نے جو غزل ارسال کی تھی اس کا صرف ایک بہاریہ شعر حذف کر کے آپ نے تو اس کا شجرہ ہی بدل ڈالا۔اچھا کیا۔میں نے خوشگوار حیرت سے دیکھا کہ 'شکوہ بہ انداز حمد' کے عنوان سے وہ اشعار جیسے مجھ سے پوچھ رہے ہوں: ''کہو کیسی رہی؟'' حمد اور نظموں کی پسندیدگی کے کئی فون بھی ملے۔ناصر بغدادی نے Lady Chatterley's Lover کا جو شاندار تخلیقی ترجمہ کیا ہے اس کی تعریف کے لئے میں واقعی الفاظ تلاش کرتا رہ گیا۔ایم اے انگریزی میں یہ ناول میرے کورس میں تھا اور میں نے حسب توفیق اسے چٹخارے لے کر پڑھا بھی تھا۔لیکن ناصر بغدادی کے اس ترجمے کو پڑھنے کے بعد اسے پڑھنے میں جو لطف آسکتا تھا اس کا تصور ہی گدگدانے کو کافی ہے۔ہائے ظالم نے کیا زبان استعمال کی ہے، کیا کیا جملے تراشے ہیں اور کتنی روانی اور برجستگی ہے کہ لگتا ہے یہ ناول ڈی ایچ لارنس کا نہیں ناصر بغدادی کا ہے۔اور یہ انگریزی کا نہیں اردو کا ناول ہے۔میں شرجیل احمد خان صاحب کی صلاحیتوں کا قائل ہوں لیکن ناصر بغدادی کے ترجمہ کے بعد ان کا ترجمہ متاثر کرنے سے قاصر رہا۔کاش، آپ نے ان کی درخواست پر غور فرما کر ضروری اصلاح کردی ہوتی۔آپ پٹنہ سے دور ہیں اور 'آمد' کے لئے مشکلات محسوس کرتے ہیں ایسے میں آمد کو مالی استحکام کی ضرورت ہے۔لیکن یکے بعد

دیگرے کئی خریدار تجدید کرنے سے قاصر نظر آرہے ہیں۔ شہر خیر وخبر میں سب کچھ خیریت نظر نہیں آتی۔ میں آپ کو اپنے بڑے بھائی صاحب نعمان احمد پرنسپل (ریٹائرڈ) 07417478812 شاہد پٹھان۔ 09372843907 اور تنویر چشتی (مرحوم عنوان چشتی کے برادر خورد) 09897119414 کے فون نمبر بھیج رہا ہوں۔ میں نے ان اصحاب سے آمد کے بارے میں بتایا ہے۔ آپ بات کر کے دیکھیے شاید تینوں ہی تیار ہو جائیں۔ میں آمد کے قارئین سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنے احباب میں سے باذوق لوگوں کو خریدار بنائیں تاکہ یہ معیاری پرچہ جاری رہ سکے۔ زاہدہ حنا کے افسانے ہمیشہ معیاری ہوتے ہیں۔ 'زحال مسکیں' میں زبیدہ کی انٹری ہیجان انگیز ہے آخر کار وہی کہانی کی ،ویمپ ٹھہریں۔ پاکستانی معاشرے کی انارکی، انتہا پسندی ،نفرت، شدت پسندی اور فاشزم ان کہانیوں سے آشکارا ہے۔ خراد مشین (محمد حامد سراج) اور غم حسین کے سوا (اے خیام) خاک وخون میں لتھڑی ہوئی عبرت ناک حقیقتیں ہیں۔ پاکستانی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ سچی تصاویر لوگوں تک پہنچا رہے ہیں۔ بگھیڑا (حسن منظر) اس ماضی میں لے گئی جہاں چھوٹے چھوٹے کاریگر تھے، Professionals نہیں تھے۔ شاباشیاں تھیں، بینک بیلنس نہیں تھے۔ آپ چونکہ دل سے ادارتی ذمہ داریاں نبھاتے ہیں لہٰذا 'آمد' کا حرف حرف معتبر ہوتا ہے۔ کیا نظم، کیا نثر، کیا تنقید۔ لیکن میں شعوری طور پر اس بار سہیل اختر کو ان کی انتہائی خوب صورت غزلوں کے لئے ریکھانکت (रेखांकित) کرنا چاہتا ہوں۔ یہ نوخیز شاعر قاری سے توجہ کا مطالبہ کرتا ہے۔ بے پناہ امکانات کی حامل ان کی غزلیہ شاعری نے مجھے بہت محظوظ کیا۔ ایک غزل اور ایک نظم پھر لے کر حاضر ہوں۔ میری للک یہ ہے کہ مرسلہ چیزیں آپ کے معیار پر کھری اتریں تبھی شامل فرمائیں۔ ورنہ پرزہ پرزہ کر کے ہواؤں کے سپرد کر دیجیے۔ اداریہ میں آپ کا ایک جملہ ہے: ''ادب کا تعلق تو یوگ، بھوگ اور سنجوگ سب سے ہے۔'' خوبصورت جملہ ہے۔ اس میں ویوگ اور جوڑا جا سکتا تھا۔ ۱۹۸۰ء کے بعد اردو ادب میں تنقید کا جو عبرتناک منظرنامہ ہے اس پر لکھتے لکھتے قنوطیت کی حدوں کو چھونے سے قبل ہی اللہ نے آپ سے جو لکھوالیا وہ یہ ہے کہ: ''نئی نسل کا ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو خاموشی سے ادب کی تخلیق میں لگا ہوا ہے کہ اسے نہ ستائش کی تمنا ہے نہ صلے کی پروا۔ کاش، قدرت غیبی ان بکھرے ستاروں کو یکجا ہونے کا اشارہ کرتی۔'' خورشید بھائی! اپنا کام کرتے جائیے۔ انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔ آج میں خیر سے ریٹائر ہو گیا ہوں۔ دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ اس پاری کو بھی پار کرادے، آمین۔ والسلام۔ نیازمند راشد جمال فاروقی

Mob:09456753098

● **قمر جہاں، بھیکن پور گمٹی نمبر۔۳، بھاگل پور [بہار]**: ۹؍اپریل ۲۰۱۴ء۔ برادر محترم خورشید اکبر صاحب، بے شمار دعائیں اور سلام۔ امید کہ آپ مع متعلقین بخیر ہوں گے۔ آمد کا شمارہ۔ ۱۰ موصول ہوئے بھی ایک عرصہ ہو چکا ہے اب تو گیارھواں شمارہ سامنے آرہا ہوگا۔ مجھے بھولیے گا نہیں۔ آمد۔ ۱۰ کے شہر آمد میں ڈاکٹر انور سدید صاحب کا خصوصی تبصرہ، شمارہ۔ ۸ کے مشمولات پر مشتمل ،نظر نواز ہوا۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ موصوف نے صنف نازک تمام مضامین کو نہ صرف قابل مطالعہ سمجھا بلکہ ان تمام پر قدرے تفصیل سے علیحدہ علیحدہ اپنی قیمتی رائیں بھی پیش کی ہیں، ۔ ڈاکٹر انور سدید جیسے معتبر اہل قلم کے تنقیدی محاسبے ہم۔۔ موں کے

لیے مسرّت بخش اور حوصلہ افزا ہیں۔ شکریے کے ساتھ میں ان کے انتقادی نظر کی داد دیتی ہوں۔ بہت پہلے موصوف نے اس ناچیز کی کتاب ''اختر شیرانی کی جنسی اور رومانی شاعری'' کو احاطہ تحریر میں لایا تھا اور اس کا تذکرہ بھی مختصر ہی سہی کیا تھا۔ بات کافی پرانی ہوگئی ہے مگر ذہن میں محفوظ ہے۔ 'شہر نقد و نظر' کے بعد شہر غزل ،شہر افسانہ، اور یکے بعد تمام حصوں کو اپنے مطالعے کی روشنی میں ایک خاص پہچان عطا کی ہے، اللہ ان کی عمر دراز کرے اور قلم کا رشتہ ہندوستان و پاکستان کے روابط کو مضبوط تر بنائے۔ آمین۔ 'ہم ہیں وہاں اردو ہے جہاں' والی بات ہمارے درمیان رابطہ اور اشتراک کی ایک اہم ڈور ہے۔ نئی نسل کے شاعر راشد طراز کے الفاظ میں۔

خطوط ہم نے جو کھینچے تھے خونِ دل سے کبھی　　　سنا ہے اب وہی تصویر بولتی ہے........

آمد-۱۰ کے مشمولات سے متعلق بھی تھوڑی گفتگو ہونی چاہیے: 'شہر افسانہ' چونکہ میرا سب سے پسندیدہ شہر ہے اس لیے سب سے پہلے میری نظر اسی پر ٹھہرتی ہے۔ زاہدہ حنا تو منجھی ہوئی افسانہ نگار ہیں۔ 'زحالِ مسکیں مکن تغافل' عنوان، موضوع اور بیان ہر اعتبار سے 'چیزے دیگر است' کا درجہ رکھتا ہے۔ مغربی فکشن کے ترجمہ میں نوبل انعام یافتہ افسانہ 'جنگلی ہنس' (ترجمہ: شرجیل احمد خاں) اور لیڈی چیٹرلی کا عاشق (ترجمہ: ناصر بغدادی) بہت پسند آیا۔ شہر ملال میں تعزیتی مضمون بعنوان 'محمود واجد ہاشمی کا ادبی سفر' (انور سدید) بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھا۔ موصوف سے متعلق بہت ساری باتوں کا علم ہوا۔ میں تو انھیں صرف افسانہ نگار اور رسالہ 'آیندہ' کے مدیر کی حیثیت سے جانتی تھی۔ اب افسوس ہو رہا ہے کہ اس مستند اور مستحکم ہستی کو میں نے اتنا قریب سے دیکھ کر بھی پہچانا نہیں۔ محمود واجد صاحب بھاگلپور ہماری یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے سمینار 31.3.2005 میں ('اردو افسانے کے نئے رجحانات') میں تشریف فرما تھے۔ یہ پروفیسر وہاب اشرفی کی بزرگی تھی، وہی اپنے ساتھ انھیں لائے تھے۔ افسوس صد افسوس کہ میں نے اُن کی قدر افزائی میں کوتاہی برتی، دراصل ایک ساتھ بہت ساری گرانقدر ہستیوں کی آمد نے ہم لوگوں کو حسبِ حوصلہ مہمان نوازی کے فرائض سے محروم کر دیا:

دن تو آتے ہیں گزر جاتے ہیں　　　یادیں رہ جاتی ہیں ڈسنے کے لیے

شہر نقد و نظر میں کئی مضامین قابلِ توجہ ہیں، خاص طور سے شکیل الرحمٰن، سید محمد عقیل اور ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کے مضامین۔ نوخیز قلمکاروں میں قسیم اختر اور فہیم انور اچھا لکھ رہے ہیں۔ آپ کا اداریہ ہمیشہ کی طرح کچھ اہم سوالات کے جوابات چاہتا ہے اور لکھنے والے کو دعوتِ فکر و نظر کے ساتھ ساتھ نئی نسل کی رہبری و رہنمائی کے فرائض انجام دے رہا ہے۔ خط طویل ہوگیا، معاف فرمائیں گے۔ اتنا کچھ ایک ساتھ ہضم کرنا ہم جیسے ناتواں کے لیے اب ذرا مشکل ہو رہا ہے مگر پھر بھی 'آمد' کے ہر شمارے کا انتظار بہت شدت سے رہتا ہے۔ کاش! آپ پٹنہ جلد پہنچ جائیں تا کہ رسالہ پابندی سے نکلتا رہے۔ خوش آیند مستقبل کی اُمید کے ساتھ! ابنِ قمر جہاں (بھاگلپور)

● دوسرا خط: ایک خط تبصرے کی شکل میں ارسال کر چکی ہوں، اُمید کہ مل چکا ہوگا؟ آپ کی فرمائش پر ایک کہانی بعنوان ''ایک اور بُو'' بھیج رہی ہوں۔ بُو سے تحریک ضرور ملی ہے مگر یہ بُو، بوئے دیگر ہے۔ اُمید ہے کہ آپ اور ہمارے قارئین کو پسند آئے گی۔ ان دنوں اپنی آنکھوں کی روشنی سے پریشان ہو رہی ہوں، لکھنے میں بھی دقت ہو رہی ہے۔ بہت ساری چیزیں بکھری ہوئی ہیں۔ نیا لکھنے کا موڈ بھی بنا ہوا ہے ماشاءاللہ! دعا کیجیے کہ انھیں سمیٹ سکوں؟ دعا گو ہوں کہ آپ کا ٹرانسفر جلد پٹنہ ہو جائے اور ذہنی سکون کے ساتھ آپ کام کر سکیں۔ افرادِ خانہ کو دعائیں کہیےگا۔

نوٹ: منٹو کی کہانی 'بُو' کے حساب سے رندھیر کی عمر پر ذرا آپ بھی غور فرمالیں گے کہ اسے 90 کا رکھا جائے یا 75 یا کچھ اور۔ بہن قمر جہاں Mob: 09431422270

بی پی سریواستو رند آر۔۱۶، سیکٹر۔۱۱، نوئیڈا۔۲۰۱۳۰۱ [یوپی]: ۱۶؍ اپریل، ۲۰۱۴ء۔ عظیمہ فردوسی، دعائیں۔ ''آمد'' کا کتابی سلسلہ نمبر۔۷۔ بابت: اپریل تا جون ۲۰۱۳ء کسی طرح میرے پاس پہنچا تھا۔ اور میں نے اس کی رسید اور اپنی کچھ تازہ غزلیات بھی آپ کو روانہ کی تھیں۔ مگر آپ کی طرف سے خاموشی، تشویش کا باعث ہے۔ میرا کلام پٹنہ سے محترم وہاب اشرفی کی نگرانی میں شائع ہونے والے رسالہ ''مباحثہ'' میں اکثر شامل ہوتا رہا ہے۔ سبکدوش سرکاری افسر ہوں۔ پندرہ سے زیادہ کتابوں کا مصنف ہوں۔ اور ''امتیازِ میر'' ''تہذیبِ غزل'' اور اتر پردیش کا شاعری کا سب سے بڑا ایوارڈ ''امیر خسرو ایوارڈ'' جو مبلغ ایک لاکھ پچاس ہزار پر مشتمل ہے، حاصل کر چکا ہوں۔ اس کے علاوہ دہلی، راجستھان اور یوپی اردو اکادمیوں نے بھی بہت نوازا ہے۔ اب ۸۳؍ سال کا ہو گیا۔ پیرانہ سالی نے تحریری دائرے بھی بگاڑ دیے۔ کمپیوٹر کا سہارا ہے۔ جو لکھتا ہوں، محفوظ کروالیتا ہوں۔ دو غزلیات روانہ کر رہا ہوں۔ رسید سے نوازیں۔ Mob:0971142205

● شرجیل احمد خاں [نوئیڈا]: ۱۲؍ مارچ، ۲۰۱۴ء۔ آمد کا شمارہ نمبر ۱۰ موصول ہوا۔ سبھی مشمولات لائق ستائش ہیں۔ آپ نے میری ترجمہ شدہ کہانی ''جنگلی ہنس'' کو بھی جگہ دی، شکریہ۔ ایک ترجمہ شدہ کہانی ''فائٹر پائلٹ'' ارسال خدمت ہے۔ اس کہانی کے مصنف ہمایوں جمیل ہیں۔ یہ کہانی تہذیبی ادب کے ایک معیاری اور مستند رسالہ ''واگردھ'' میں شائع ہو کر کافی مقبول ہوئی۔ خورشید صاحب، آپ کو یاد ہوگا ۱۹۰۲ء کو میرے ساتھ ایک سانحہ ہوا تھا۔ میرا لڑکا SQR.Leader طارق جمیل خان اپنے روزمرہ اڑان پر تھا کہ اچانک رڈار کے اسکرین سے غائب ہو گیا۔ پتہ نہیں کہاں گم ہو گیا۔ اس غم میں آپ بھی شریک تھے۔ کہانی کا مصنف میرا بڑا لڑکا ہے وہ تلاش کی خاطر حادثہ کی جگہ گیا تھا۔ لیکن ناکام واپس لوٹا۔ اسی حادثہ سے متاثر ہو کر اس نے یہ کہانی لکھی ہے (کہانی کیا حقیقت سمجھے) واقعات حقیقی ہیں۔ صرف نام فرضی ہیں۔ میری خواہش کہ میں ان واقعات کو محفوظ کر لوں۔ اُمید ہے کہ اس ترجمہ شدہ کہانی کو آمد کے آئندہ شمارہ میں شریک اشاعت کریں گے۔ میرے لائق کوئی خدمت۔ شرجیل احمد خاں۔

08800584357

● **مدحت الاختر، وارث پورہ، کامٹی، ناگپور۔۴۴۱۰۰۲[مہاراشٹر]**:۶؍مارچ،۲۰۱۴۔ محترم خورشید اکبر صاحب، سلام مسنون۔ آمد کا شمارہ نمبر ۱۰ موصول ہوا۔ عبید حارث کی نظموں کی اشاعت کے لیے ممنون ہوں۔ میری دو غزلیں، میری دانست میں، آپ کی فائل میں تھیں، آپ نہیں چھاپ سکیں گے، یہ صاف گوئی اچھی لگی۔ آپ کی فرمائش نے دعا کا کام کیا اور ادھر کئی غزلیں ہو گئیں۔ ان میں سے دو آپ کی نذر ہیں۔ عبید حارث کی بھی دو غزلیں اور دو نظمیں حاضر ہیں۔ امید ہے بہ نظر اصلاح دیکھیں گے اور حوصلہ افزائی کریں گے۔ میری کتاب 'ارتباط' پر مارچ کے ایوانِ اردو میں تبصرہ نکلا ہے، لیکن، میں تو 'آمد' میں آپ کے یا آپ کے ایما پر کسی اور صاحب کے تبصرے کا متمنی ہوں۔ ہاں، عبید حارث کے موبائل نمبر میں غلطی سے آخر میں 60 کے بجائے 00 شائع ہو گیا ہے۔ صحیح نمبر یہ ہے: 09373222260، امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔ Mob:09421803478

● **علی عباس امید، ا۔اسٹار ریزیڈنسی، عیدگاہ ہلس، بھوپال۔۴۶۲۰۰۱[مدھیہ پردیش]**:۲۷؍فروری،۲۰۱۴۔ برادرِ من، مناسبات! پرسوں آمد موصول ہوا (شمارہ۔۱۰)۔ دو دن ورق گردانی (مطالعہ نہیں) میں گزرے۔ تعداد اشاعت دیکھ کر افسوس ہوا۔ 'ہمتِ مرداں مددِ خدا' پر ایمان ہے اس لئے رنجیدہ نہیں ہوں۔ 'برگِ سبز است تحفۂ درویش' ارسال نہیں نذر کر رہا ہوں، ممکن ہے کہیں کام آجائے۔ Mob:09200846045

● **رئیس فاطمہ، فلیٹ نمبر B1-205، ایچ آر کیڈ، نزد این ای ڈی یونیورسٹی، جامعہ کراچی، پوسٹ آفس مین یونیورسٹی روڈ، کراچی[پاکستان]**: محترمہ عظیمہ فردوسی اور خورشید اکبر صاحب، تسلیمات! نام تو بہت سنا تھا "آمد" کا لیکن دیکھنے کا اتفاق آج حامد سراج صاحب کی مہربانی سے ہوا۔ پرچہ (شمارہ نمبر 5) پڑھنا شروع کیا تو سب سے پہلے صغیر رحمانی کے افسانے "پہلا گناہ" نے اپنے سحر میں جکڑ لیا۔ کیا کہانی لکھی ہے۔ روح کو کرچی کرچی کر دینے والا سفاک سچ ہر جگہ بکھرا ہوا ہے۔ پرچے کا تفصیلی مطالعہ بعد میں کروں گی۔ خدا اردو زبان کو یوں ہی پھلتا پھولتا رکھے اور "آمد" پابندی سے شائع ہوتا رہے۔ فی الحال اتنا ہی، اجازت دیجیے۔ Ph:34835430

● **صوفیہ انجم تاج[امریکہ]**: جناب خورشید اکبر صاحب، السلام علیکم۔ **امید ہے اپ بخیر ہوں گے**۔ چیک روانہ کر رہی ہوں۔ میں انشاءاللہ بہت جلد اپنی نظم اور غزل روانہ کر دوں گی اور پھر سرورق کے لئے بھی کوئی پینٹنگ۔ لیکن مہربانی کر کے سرورق پر پورے صفحے پر پینٹنگ کو ڈلوائیے گا تب ہی بہتر لگے گی۔ یہ میری بنائی ہوئی تصویر رہے گی انشاءاللہ۔ اور سب ٹھیک ہے۔ اللہ کرے یہ لفافہ آپ تک جلد از جلد پہنچ جائے۔ Mob: +1-313-561-8671

جمال اُویسی، صدر شعبہ اردو، جی ڈی کالج، بیگوسرائے۔۸۵۱۱۰۱[بہار]:۱۴؍فروری،۲۰۱۴۔ 'آمد' شمارہ نمبر ۱۰ کے بارے میں کیا لکھوں؟ فون پر گفتگو ہو چکی ہے۔ خط میں صرف اتنا لکھوں گا کہ مزید سختی کرو۔ شعری حصہ کا انتخاب ذرا اور منتخب ہونا چاہیے۔ حمد، مناجات اور نعت میں جو کلام سامنے آرہا ہے اسے پڑھ کر بہت تکلیف ہوتی ہے۔ بے روح اشعار کے پلندے اور جذبہ سے عاری۔ اللہ اور رسولؐ کے نام سے بھی جو کلام نوکِ قلم سے ٹپکتا ہے اس میں کس درجہ کی ہولناکی اور خالی پن ہے۔ "شہرِ نجات" میں جناب سرور جاوید (مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے) اپنی گفتگو میں اُلجھ کر رہ گئے ہیں۔ وہ ترقی

پسندی اور جدیدیت کو نئی نسل کی آنکھ اور اس کے تجربوں کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ صاف طور پر کہنا چاہیے کہ ہمیں ترقی پسندی، جدیدیت یا مابعد جدیدیت سے کسی قسم کا تعارض نہیں ہے بلکہ بعض ترقی پسندوں، جدیدیوں اور مابعد جدیدیوں سے اعتراض ہے۔ یہ وہ Mindset لوگ ہیں جو ہمیشہ اپنی حکمرانی چاہتے ہیں، قلم کاروں سے غلامی چاہتے ہیں۔ یہ ایسے ترقی پسند اور جدیدیے ہیں جنھوں نے کبھی ترقی پسندی یا جدیدیت کو وسیع تر معنوں میں پیش نہیں کیا۔ یہ نہ صحیح معنی میں ترقی پسند تھے اور نہ ہی صحیح معنی میں جدیدیے۔ یہ سب کے سب بورژوائی عصبیت کے غلام تھے۔ یہ سب قلم کے ذریعہ حکمرانی چاہتے تھے اور آج بھی چند بچے کُھچے بورژوائی ذہنیت کے لوگ ادب پر حکم چلانا چاہتے ہیں۔ ادب کو رواں دواں رہنے کے لئے تازہ خون کی ضرورت ہے۔ ''ادب برائے نجات'' کسی قسم کا ادبی نعرہ نہیں ہے۔ ہم لوگ نعرہ بازی کے خلاف ہیں۔ نعرہ بلند کرنا پارٹی ورکروں کا کام ہے۔ 'ادب برائے نجات' ابھی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ ابھی تھوڑی اور سیاہی ختم ہونے دیجیے، باتیں خود بخود صاف ہو جائیں گی۔ ایک تجزیاتی مضمون کے علاوہ چند غزلیں اور نظمیں شمارہ۔ ۱۱ کے لئے روانہ کر رہا ہوں۔

پس نوشت: محترم دوست! کرشن چندر کے چھوٹے بھائی مہندر ناتھ پر یہ مضمون ۲۵ سال پہلے لکھا تھا کہیں چھپنے کے لئے نہیں بھیجا۔ میرے مضامین کے مجموعہ ''تنقید اور تنقید'' میں شامل ہے۔ میں اس کا پروف پڑھ کر بھیج رہا ہوں۔ اتنی فرصت نہیں کہ اسے کمپوزر کے یہاں جا کر درست کرواؤں۔ جو درستی میں نے کر دی ہے اس کے پیش نظر اسے کمپوز کرواؤ۔ شکریہ۔

Mob: 07654677464 / 07654215111

● **جوہر تماپوری، یادگیر، گلبرگہ [کرناٹک]:** مکرمی جناب خورشید اکبر، اسلام علیکم۔ ''آمد'' (9) زیر مطالعہ ہے سب سے پہلے آپ کے اداریہ کے بارے میں عرض کرنا چاہوں گا: اداریہ (1) میں آپ نے جن خود ساختہ بَاباؤں کا ذکر کیا ہے وہ آپکی ہمہ جہت علمی بصیرت کا مظہر ہے اور تمام محبانِ اُردو کو دعوت فکر دیتا ہے اداریہ (2) میں آپ نے ''آمد'' کے اشاعتی سلسلہ کو جاری رکھنے میں جن دشواریوں، صعوبتوں اور اردو والوں کے عدم تعاون کا ذکر کیا ہے میں سمجھتا ہوں کہ یہ اُردو کے بھی رسائل کے مدیروں کا دائمی مسئلہ ہے کچھ ہمت ہار کے رسالہ بند کر دیتے ہیں لیکن جو باہمت ہیں یا ان میں اس طرح کے ''مسائل'' سے نپٹنے کی'' صلاحیت'' ہوتی ہے بس وہی اسکو جاری و ساری رکھے ہوئے ہیں، خدا کرے آپ جلد از جلد ان مسائل سے اُبھر جائیں اور کامیابی و کامرانی کے ساتھ اس تاریخ ساز رسالے ''آمد'' کی آمد بلا کسی تاخیر و عذر کے قارئین تک ہوتی رہے۔ شمارے کے مشمولات کے بارے میں آپ جتنا لکھے ہیں دیکھ کر میں حیرت میں پڑ گیا کتاب میں شامل تمام مواد کو بغور پڑھنا اور اس پر اظہار خیال کرنا وہ بھی اداریہ میں میں سمجھتا ہوں آپکا ہی خاصہ ہے شعری حصے میں سبھی غزلیں معیاری ہیں نظمیں بہت ہی خوب اور دل کو چھو لینے والی ہیں پانچ افسانے ہیں سبھی اپنے موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے متنوع ہیں آپ کی تخلیق کردہ تعزیتی نظمیں مرحومین سے آپکی محبت کی مظہر ہیں دل رو اٹھا اور دعا نکلی کہ خدا مرحومین کو جنت نصیب کرے خطوط کے حصے میں نئی نئی باتیں، نئی تحقیقیں نئے نئے رازوں

سے انکشافات ہوتے ہیں پڑھتے ہوئے حیرانی بھی ہوتی ہے اور مسرت بھی بہر حال پوری کتاب نہ صرف یہ کہ قابل مطالعہ ہے بلکہ کئی نگارشات بار بار پڑھنے کو جی کرتا ہے۔ آخر میں دعا گو ہوں کہ خدا ''آمد'' کو ہر طرح کی ''مصیبتوں'' اور ''بلاؤں'' سے محفوظ رکھے اور مستقبل میں اسکی تعداد اشاعت ایک ہزار سے بھی تجاوز کرے اور محبانِ ''آمد'' سے میری گذارش ہیکہ اسکی اشاعت کے تسلسل کے لئے ہر ممکن تعاون کریں۔ آمین۔ دو غزلیں ارسالِ خدمت ہیں آمد کے معیار کے ہوں تو شاملِ اشاعت کریں، شکر گزار رہوں گا۔

● **محمد حنیف کاتب، مدراس [چنئی]**: محترمی! السلام علیکم۔ چند مہینے پیشتر میں کویت سے اپنا 'بن باس' ختم کرکے اپنے وطن چنئی واپس لوٹا تو اشفاق الرحمن کے ہاں، جو میرے ماموں زاد ہیں، آمد کے شمارے پہلی بار دیکھنے کو ملے۔ طبیعت باغ باغ ہوگئی۔ آپ نے عنوانات کافی دلچسپ قائم کیے ہیں۔ ترتیب بھی اچھی لگی۔ مبارک ہو! میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ جنوب کے ادیبوں اور شعرا کو اکثر نظر انداز کیا جاتا رہا ہے، مگر یہ سچ ہے کہ ان کی حوصلہ افزائی بھی نہیں کی جاتی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جب اردو کی نئی بستیوں کی بات ہو تو جنوب کے ان دور افتادہ علاقوں کا بھی تذکرہ ہو جہاں کے جیالے ناموافق حالات میں بھی اردو کی بقا اور ترویج و ترقی کے لئے کوشاں ہیں۔ 'جنوب سے دس سوغات غزلیں' اس امید پر روانہ کر رہا ہوں کہ آپ کے موقر جریدے میں ان غزلوں کی اشاعت ایک نئے باب کی تمہید ثابت ہوگی اور دیگر جرائد کے مدیران اس جانب متوجہ ہوں گے۔ آپ کا ایک ادارتی نوٹ بھی اس سلسلے میں کافی مفید ہوگا۔ امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ والسلام۔

● **کہکشاں تبسم، بھاگل پور [بہار]**: محترم بھائی! السلام علیکم! امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ اللہ حوصلے کو تازگی بخشتا ہے۔ شمارہ ۔ ملا! شکریہ۔ اداریہ پڑھا۔ عام آدمی اور ادب کے رشتے پر غور کیا جانا چاہیے۔ آج ادب کا سماجی سروکار کیا ہے؟ نگاہ کس طبقے پر مرکوز ہے؟ ضمیر نقد و نظر میں شکیل الرحمن صاحب کا تحلیل نفسی پر مضمون فکر کو روشنی دینے والا ہے۔ خوشی ہوتی ہے کہ ضعیفی اور مسلسل علالت کے باوجود ان کا ادبی کام جاری ہے۔ اللہ ان کی عمر دراز کرے۔ ضمیر آئینہ میں ہم زاد پر تبصرہ بھی پڑھا۔ آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ ان کی کتاب 'ہندوستانی جمالیات' کا ہندی ترجمہ ڈاکٹر آفاق احمد آفاقی (بنارس یونی ورسٹی) نے کیا اور وہ کتاب اب اشاعت کے مرحلوں میں ہے۔ نظام ہاتف کی غزلیں بہت خوب ہیں کہ نئے ذائقے سے آشنا کراتی ہیں۔ فہیم انور اور ظفر اقبال ظفر کی غزلیں بھی اچھی لگیں۔ ضمیر افسانہ میں کس کس کی تعریف کروں کہ زاہدہ حنا اور حامد سراج تو میرے پسندیدہ فکشن نگار ہیں۔ ویسے ساری کہانیاں زوردار ہیں اور الگ الگ زاویے سے آج کی زندگی کی تصویریں پیش کرتی ہیں۔ ضمیر اشتراک میں فارسی اور عربی ادب کو بھی شامل کرتے رہیے کہ وہاں کے منظرنامے سے بھی واقفیت ہوتی رہے۔ عظیمہ بھابھی کو سلام۔

Mob:08651449489

● **حفیظ انجم کریم نگری، جمال بسیرا، اکشمیر گڈہ، کریم نگر [اے پی]**: محترمی خورشید اکبر صاحب، مدیر اعزازی 'آمد'، پٹنہ، سلام مسنون۔ آپ سے فون پر بات ہوئی تھی، بڑا اچھا لگا۔ آپ کو میری غزلیں پسند نہیں آئیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہوئی۔ یہ تو ہمیشہ ہی ہوتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ الگ سے بھجوا دوں۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ کے پاس غزلیں بھیجنا پل صراط سے گزرنا ہے۔ بلکہ وہاں گزرنا آسان ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہر

مومن گزر جائے گا۔ بھائی صاحب، یہ کہاوت بالکل سچ ہے: 'جو پیا من بھاوے وہی سہاگن'۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو یہ غزلیں بھی پسند نہیں آئیں گی۔ لیکن کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ آپ سے ایک گزارش یہ ہے کہ میرا نام دیکھتے ہی Reject مت کیجیے گا۔ پڑھ کر دیکھیے: کیا پتہ کوئی چیز آپ کی پسند کی، ڈھنگ کی نکل آئے! اچھا، تو اجازت چاہتا ہوں۔ امید کہ خیریت سے ہوں گے۔ خلوص کیش حفیظ انجم کریم نگری

Mob:09247479488

● **جمال قدوسی، بڑھنی روڈ، اٹوا بازار، سدھارتھ نگر [یوپی]**: آمد کتابی سلسلہ۔۱۰ ار دستیاب ہوا۔ آپ کی یا 'آمد' کی تعریف میں کچھ کہنا سورج اور چاند کو روشنی دکھانے کے مترادف ہے۔ اس رسالے کے لئے آپ کتنی محنت کرتے ہیں ایک ایک حرف سے عیاں ہے، خدا آپ کی کاوشوں کو قبول فرمائے اور اس کی اشاعت میں کوئی خلل نہ آئے۔ چند مکتوب نے یہ بھید بھی کھول دیا کہ وہ کون ہیں جنھوں نے آمد کے خلاف مورچہ بندی کر رکھی ہے۔ محترم! آپ اعزازی کاپی نہیں دے رہے ہیں اور یہ ٹھہرے اردو ادب کے سب سے معزز و معتبر لوگ، انھیں تو سب کچھ اعزاز میں ہی ملنا چاہیے۔ حبیب سیفی صاحب کا ایسے موقع پر ایک شعر یاد آیا ہے:

رقم اعزازی حق ہے پر رسائل مفت میں چاہیں   قلم کاروں میں اردو کے کمی یہ پائی جاتی ہے

کہنے والے سچ کہتے ہیں کہ اردو کو سب سے زیادہ نقصان انھی سے پہنچا ہے جو اردو کی روزی روٹی کھاتے ہیں اور اردو نے جنھیں دولت، تہذیب اور بلندی عطا کی ہے۔ یہ شمارہ بھی ہر شمارہ کی طرح لاجواب ہے کس کس کی تعریف کی جائے۔ اس شمارے میں بھی حماد ہی حماد نظر آئے، ان کی غزلوں نظموں میں شہداب وغنائیت بھرپور ہے۔ مجھے بھی پہلی بار 'آمد' میں حاضری کا شرف ملا۔ آپ کا بہت ممنون و مشکور ہوں۔ مصداق اعظمی صاحب کا مکتوب بہت ہی اچھا لگا مکرر سہ کرر پڑھ چکا ہوں۔ اللہ سب کو خوش رکھے۔ والسلام۔

Mob:09838813574

● **محمد بشیر مالیر کوٹلوی، دہلی گیٹ، نزد دیو اردو اکادمی، منٹو اسٹریٹ، مالیر کوٹلہ۔۱۴۸۰۲۳، [پنجاب]**:

۲۸ راپریل ۲۰۱۴ء۔ محترمی خورشید اکبر صاحب، سلام و رحمت۔ اردو ادب میں بڑھتی ہوئی بے ضابطگیاں ناقابل برداشت ہوا چاہتی ہیں۔ یہ وبائیں ادیبوں کو ہی نہیں اردو ادب کے لئے بھی نقصان دہ ہیں۔ شاید میں پہلی بار ان وباؤں کے بارے میں قلم اٹھا رہا ہوں۔ دوستوں کے اصرار پر میں اس مضمون کو آپ کی خدمت میں برائے اشاعت ''آمد'' ارسال کر رہا ہوں۔ 'آمد' کی تعریف ادیب دوستوں سے سن رہا ہوں۔ انشاء اللہ عنقریب، میں بھی اس کا خریدار بن رہا ہوں۔ ایک پوسٹ پر اگر آمد کا اکاؤنٹ نمبر وغیرہ مل جائے تو بندے کو سہولت ہو جائے گی۔ محض ایک پوسٹ کارڈ پہ لکھ بھیجئے کہ سالانہ چندہ کیا ہے کس نام پہ یا اکاؤنٹ نمبر پر بھیجنا ہے۔ مجھے انتظار رہے گا۔ مضمون ''ادبی وبائیں'' کی رسیدگی سے بھی مطلع فرما دیں تو کرم ہوگا۔ خدا کرے آپ بہ عافیت ہوں۔

Mob:09417422788

● **رضوان الرضا رضوان، ملیح آباد، لکھنؤ [اتر پردیش]**: مکرمی خورشید اکبر صاحب، ہدیۂ سلام و عقیدت۔ سہ ماہی آمد مل گیا

تھا مگر کالج کی مصروفیات اور دوسرے مجموعہء کلام ”ادراک کے سائے تلے“ کی ترتیب واشاعت نے موقع نہ دیا کہ جواب تک دے سکوں۔ البتہ فون پر ضرور بات ہوگئی تھی۔ آج پروفیسر غیر یوسف صاحب میرے یہاں تشریف لائے ۔انھوں نے یہ بھی اطلاع دی کہ بیٹی کی عنقریب شادی ہونے والی ہے۔ پیشگی مبارکباد قبول فرمائیں اور میری نیک خواہشات اور دعائیں۔ میں نے مجموعہ کی اشاعت پر احباب و متعلقین کا بطور خاص شکریہ ادا کیا ہے۔ جس میں آپ کا نام بھی شامل ہے اور الگ سے رسالوں کی ایک فہرست بھی دی ہے۔ دوسری بار آپ کی خدمت میں ایک دعا، ایک نعت اور چند غزلیں ارسال ہیں۔ امید کہ انھیں آمد میں لگا دیں گے۔ خدا کرے آپ ہر طرح بعافیت ہوں۔

Mob:08090551105

● **نثار احمد نثار، بیگم پور، سمستی پور۔۸۴۸۱۰۱۔[بہار]:** ۱۰ر فروری، ۲۰۱۴ء: ’آمد‘ کا نیا شمارہ نظر نواز ہوا۔ خوشی ہوئی ہے۔ لیکن اداریہ کے آخری صفحہ یعنی آمد کے ۱۴ویں صفحہ پر درج انکشاف نے عجیب کیفیت میں مبتلا کر دیا ہے: ذہن پر زور دیا تو ایک پڑھنے والے کی حیثیت سے مجھے دو تین فکشن سے متعلق حضرات تشویش کے دائرے میں نظر آئے۔ لیکن جب آپ نے اداریہ میں یہ بات عام کر دی ہے تو میں عرض کر دوں کہ آپ کو ’آمد‘ کے پہلے/ دوسرے شمارے سے ہی اقبال مجید، جیسے بڑے افسانہ نگار کا بھی تعاون حاصل ہے۔ چند نگارشات ارسالِ خدمت ہیں ۔اشاعت کے قابل ہوں تو شامل فرمائیں گے۔ آپ کا نثار احمد نثار۔ Mob:09203386520

● **اسلم مرزا، فرسٹ فلور سلیم کمپلیکس، دیوڑی بازار، اورنگ آباد[مہاراشٹر]:** ۶ر مئی، ۲۰۱۴ء۔ گرامی قدر خورشید اکبر صاحب، السلام وعلیکم۔ آپ سے ٹیلی فون پر گفتگو ہوئی، اچھا لگا۔ ای میل بھی کیا تھا وہ شاید آپ نے نہیں دیکھا۔ مراٹھی کے ایک مشہور شاعر نام دیو ڈھونڈ مہانور (قلمی نام: نا۔ دھو۔ مہانور) کی چند نظمیں ’آمد‘ میں اشاعت کے لیے بھیج رہا ہوں۔ ساتھ میں شاعر کا تعارف بھی ہے۔ مہانور سے گفتگو کی تھی وہ خوش ہوئے کہ میں نے ان کی نظموں کو اردو کا جامہ عطا کیا ہے۔ میں طویل عرصے سے انگریزی اور مراٹھی کے عہد ساز شعرا کی تخلیقات کو اردو میں منتقل کرتا رہا ہوں۔ مرے تراجم آجکل، شاعر، شب خون، فنون، شعر و حکمت، سب رس اور دیگر رسائل میں شائع ہو چکے ہیں، چند روزناموں کے ادبی صفحات میں بھی شامل رہے۔ آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ امسال جنوری میں مہاراشٹر اردو ساہتیہ اکادمی نے مجھے ”سیتو ماڈھو راؤ پگڑی (ایوارڈ برائے مراٹھی۔ اردو ترجمہ شاعری) عطا کیا ہے۔ ۲۰۰۹ء میں مجھے ”ولی دکنی قومی انعام“ سے اس اکیڈیمی نے سرفراز کیا ہے۔ اب تک میری دس کتابیں شائع ہو چکی ہیں، کبھی آپ کے مطالعے کے لیے روانہ کروں گا۔ مہانور کی نظمیں پڑھ کر آپ خود اندازہ کر لیں کہ مراٹھی میں جو شاعری ہو رہی ہے وہ اردو شاعری سے کس قدر الگ ہے۔ پسند آنے پر شائع کیجیے اگر پسند نہ آئیں تو مجھے فون پر بھی اطلاع دے سکتے ہیں، کسی اور جگہ پر شائع ہو جائیں گی۔ میرے پاس اس وقت مراٹھی کے تقریباً ایک سو پچاس شعرا کی چار سو ترجمہ شدہ نظمیں موجود ہیں اور انھیں کتابی صورت میں شائع کرنے کا ارادہ ہے۔ والسلام۔ خیر طلب اسلم مرزا۔ Mob:09960053707

● **ڈاکٹر افضال عاقل، پی۔ جی۔ ڈیپارٹمنٹ آف اردو، بھیرو گنگولی کالج، بیلگھریا، کولکاتا۔۷۰۰۰۵۶[مغربی بنگال]:**

۲۶ فروری ۲۰۱۴ء "آمد" کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ آمد کا شمارہ مجھے احمد کمال حشمی کی معرفت حاصل ہوتا ہے۔ اس کے تمام شمارے میرے پاس موجود ہیں اور ادب کے ایک ادنیٰ طالب علم ہونے کی خاطر کافی عرق ریزی سے پڑھتا ہوں۔ گراں قدر مشمولات کے سبب آمد کی اہمیت اور مقبولیت میں روز افزوں اضافہ ہورہا ہے اور اس کا معیار بھی بلندی تک پہنچ چکا ہے۔ آپ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ مشمولات کے تئیں آپ کافی باریک بینی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ سابقہ شماروں کی طرح دسواں شمارہ بھی اپنی انفرادیت کا حامل ہے اور مطالعے کی دعوت دیتا ہے۔ مختلف شہروں کی بنیاد ادب کے نئے جہان آباد کر رہی ہے۔ اداریے کی مثال "دُرِ نایاب" کی سی ہے۔ "شہر نجات" کی تخلیقات متحرک زندگی کی علامت ہے۔ "شہر رحمت" اور "شہر مدعا" راہِ نجات کو وا کر رہے ہیں۔ "شہر نقد و نظر" کے مضامین: "تحلیل نفسی کا سفر، ادب اور دیگر فنون"/ "مثنوی کی کہانیوں میں حکائی صورتیں" نئی تنقیدی جہت تعمیر کر رہے ہیں۔ "قصائد جمیل مظہری" اور "مثنوی خاکہ نگاری" تنقیدی شعور کی زندہ علامت بن چکے ہیں۔ شہر افسانہ کی تمام کہانیاں خصوصاً "بھیڑیا" اور "خراد مشین" قاری کو نئی فکر سے آشنا کرتی ہیں۔ شعری حصے میں آمد کے معیار کی پاسداری ہوتی ہے۔ ستیہ پال آنند، راشد جمال فاروقی اور شکیل اعظمی کی نظمیں پختہ کار ذہن کی تعبیریں ہیں۔ ہاں! ہم عصر غزلوں کے مقابلے میں ظفر اقبال کی غزلیں ہلکی ہیں۔ ظفر اقبال اچھے تخلیق کار ضرور ہیں لیکن ان دنوں وہ خود کو دہرا رہے ہیں۔ شہر آئینہ (تبصرہ) میزان رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ رسالے کو مزید استحکام عطا کرے۔

● **پرویز شہریار، نئی دہلی:** ۸ فروری ۲۰۱۴ء برادرم خورشید اکبر صاحب، سلام مسنون۔ امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔ میں اپنا ایک مضمون بعنوان 'اپنے دکھ مجھے دے دو کا تنقیدی مطالعہ' ارسال کر رہا ہوں، اس التجا کے ساتھ کہ اگر پسند آجائے تو اسے اپنے موقر جریدہ سہ ماہی آمد کتابی سلسلہ کے کسی قریبی شمارے میں شامل اشاعت کر کے شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔ آپ کی عین نوازش ہوگی۔

● **سلطان اختر، "ہیون پرائڈ"، شنی وار پیٹھ، سولاپور ۔۴۱۳۰۰۲ [مہاراشٹر]:** محترم مدیر صاحب، سلام مسنون۔ سہ ماہی آمد کے تازہ شمارے میں عباس خان صاحب کا اشتہار اچھی طرح شائع ہوا ہے۔ دیکھ کر خوشی ہوئی۔ شکریہ۔ لیکن اشتہار میں عباس خان صاحب کا ای میل غلط ٹائپ ہوا ہے۔ صحیح ای میل یہ ہے: jaskani999@gmail.com۔ براہ کرم تصحیح فرمائیں۔ 'سباق' میں بھی یہی اشتہار ہے۔ اس میں صحیح چھپا ہے۔ لگتا ہے آپ نے اشتہار کو دوبارہ ٹائپ کیا ہے۔ محترم اظہار خضر صاحب 'آمد' کے اگلے شمارے میں 'آٹھ آنے کی مٹھاس' پر تبصرہ کرنے والے ہیں۔ تبصرے کے آخر میں فون نمبر اور صحیح ای میل ضرور دیں۔ عنایت ہوگی۔ Mob:07350593794

☆☆☆

شہر رفاقت

اس شمارے میں شریک قلم کاروں کے پتے:

- Dr Afroz Ashrafi,Assoctate Professor Of English, Salman Bin Abdul Azizi University, K.S.A.Mob:09934768855.
- Dr. Khalid Alvi,31-Canning Lane,(Pt. Ravi Shanker Shukla Lane) New Delhi-11001.Ph:9868181236/E-mail:khalidalvi@gmail.com,
- Dr Syed Yahya Nasheet,24- "KASHANA",KALGAON- 445203, DIST. YAVATMAL [M.S] Mob:09421771417.
- Izhar Khizar , Near Uma Petrol Pump, City Court,Patna city-800007 [Bihar]. Mob:09771954313.
- Dr Aftab Ahmad Afaqui,Dept. Of Urdu, B.H.U.,Varanasi-221005 [U.P.]- Mob:09450527733.
- Rahman Abbas,204/A, Poonam Park,Near Haideri Chowk,Mira Road,THANE-401107- [MAHARASHTRA]-Mob:09869083296.
- Sagheer Afraheim, Professor, Dept of Urdu,AMU,Aligarh [U.P.] email:s.afraehim@yahoo.in/Mob:09358257696
- Wasia Irfana,Mohalla: Dharampur,Near RJD Office, Chak Noor Road, Samastipur-848101-[Bihar]. Mob:09031119464.
- Dr. Perwaiz Shaharyar,Flat No. 4/48, NCERT Campus,Sri Aurobindo Marg, New Delhi-110016.Mobile No. 09910782964
- AkramParwez,142-SutlejHostel,JNU,NewDelhi-110067.Mobile:9868323179
- Sajid Zaki Fahmi,Research Scholar,Department Of Urdu,Jamia Millia Islamia,New Delhi-25.Mob: +91 9990121625 Email: sajidzakifahmi@gmail.com
- Dr. Zeba Mahmood, Associate Professor, Dept. Of Urdu, Ganpat Sahay College, Sultanpur [U.P.]
- Aftab Alam Arvi, Research Scholar, Dept. of A .M.U., Aligarh [U.P.] Mob:9411212172
- Hafiz Jahangir Akram,E-101/A-Hari Kothi Lane,Abul Fazal Enclave -1, Jamia Nagar, Okhla,New Delhi - 110025.

- Rashid Ashraf,L-2, Block-13D-1,Adjacent Zuberi Family Park, Gulshan e Iqbal,Karachi [Pakistan], zest70pk@gmail.com
- Dr. Krishan Bhavuk,Kothi No. 201-A, Street No.18-K,Guru Nanak Nagar,PATIALA-147003(Punjab), Mob:09815165210
- Nida Fazli,Sunrise Apartments,201-B, Aram Nagar, Versova, Andheri, Mumbai-400061. Mob:09967782878.
- Sultan Akhtar, Maulana Azad Colony, FCI Road, Phulwari Sharif, Patna, Mob:09835843286.
- Abdur Rahim Nashtar ,Plot no .7, Behind Markaz Teacher's Colony ,Jafar Nagar,Nagpur-440013.Mobile:09272908151
- Dr. Safdar,18-B, Kohe Noor Colony,Post V.M.V.,Amravati-444604(M.S.) Mob : 07304755117
- Midhat ul Akhtar,Warispura,Kampti-441001[M.S.]- Mob:07109282202.
- P.P.Srivastava "Rind",R-16,Sector-11,Noida-201301. Mob:09711422058.
- Sardar Asif,Deputy Director(PR),Moradabad Division,Panchayat Bhawan, Company Bagh,Moradabad [U.P]. Mob: 09412678897.
- Abid Ali Abid, 10- Gulistan Colony, Badam Nagar, Aligarh-202002 [U.P.] Mob:09219401945
- Md.Haneef Katib, C/O K.M.Ashfaqur,Plot No.30 Nagar,Vardhammalnagar, Puthur Main Road, Red Hills,Chennai-600052.Mob:09840873716
- Jamal Owaisi, Mohalla: Faizullah Khan,Lal bagh, Darbhanga-846004 [Bihar]- Mob: 07654677464 / 07654215111.
- Shakeel Azmi, 201-Malwani Ramkrishna,Plot No. 52,Mahada Complex, Malwani, Malad (w),Mumbai-400095 (M.S.)Mob : 09820277932
- Madan Mohan Danish,D-2, Pearl Residency,Gandhi Road, Gwalior-474002 . email: danish@gmail.com - Mob: 09425114435.
- Shakeel Ahmad Shakeel, Ground Floor, Room No.-3, Doodhwala Building Gaibi Nagar,Bhiwandi-421302 [Maharashtra].Mob:09823627734.
- Dr. Afzaal aaquil, "Kashana e Hussain", 72- Musalmanpara Road, P.O. Garulia, Dist, 24 Parganas.[W.B.]- Mob: 09831364521 / 09331931356.
- K.M.Ashfaqur Rahman Mazhar,Plot No.30, Vardhammal Nagar,Puthur Main Road, Red Hills,Chennai-600052.- Mob:09840338716.
- Tariq Mateen, Editor: "Ilm o Adab", At+P.O : Lakhminia, Dist. Begusarai PIN:851211 [Bihar]. Mob: 07549807809.
- Asghar Shamim, C/O Baitul Qasim, 12/3/H/1- Patwar Bagan Lane, Kolkata-700009. Mob:
- Kaleem Akhtar, Aman Colony, Isapur Nahar, Phulwari Sharif,

Patna-801505, [Bihar]. Mob:09334099096.

- Nesar Ahmad Nesar, At: Begumpur, P.O+Dist, Samastipur-848101 [Bihar]. Mob: 09204386520.
- Hafeez Anjum,Jamal Basera, H.No.7-2-775(old),7-2-1005,Kashmeer Gadda, Karim Nagar-1 [A.P.]- Mob:09247479488.
- Nawab Arzoo, Mumbai- [M.S.]
- Ahmad Sagheer Siddiqui,Morgina Complex, Gulshan e Iqbal 13-B. Karachi [Pakistan]. Ph:021-34820506 / Mob: 0346-2377854.
- Afroz Alam, P.O.Box No. 451,Farwaniya 81015, KUWAIT.
- Shahid Aziz, Bhikharinath ji ka Math,Bhopalpura, Udaipur [Rajasthan].Mob: 09252552341.
- Rashid Anwar Rashid, Dept. of Urdu, AMU, Aligarh-202001 [U.P.] Mob: 09358257137.
- Kahkashan Tabassum. C/O Prof. Z.I. Rizvi,Dept. Of Urdu, Sabour College, Sabour,Bhagalpur-813210 [Bihar].Mob:08651449489.
- Saba Ekram[N.Haque],G.M. Admin & H.R., Cornpark Ltd.,Plots: 11 & 26, Sector:20,Korangi Industrial Area, Karachi-74900- Mob:00923002164282.
- Ayub Khawar,4-Rahman Hsg State,Near B. O. R. Society;E- Block, Johar Town, Lahore [Pakistan]. Mob:00923223966639.
- Parvin Shere, 128- Vineland Crescent, Winnipeg, R 3 Y I T C , Manitoba, CANADA. Mob:002048960124.
- Laxman 309-Natasha Society, Opp. Old Petrol Pump,Mira Bhayander Road, Bhayander [E], Mumbai-401105.
- Iqbal Majeed,B-132, Housing Board Colony, Koh e Fiza, Bhopal-462001 [M.P.]- Mob:09893764746.
- Zaheda Hina, E-1,Junaid Plaza, Block-6, Gulshan e Iqbal, Rashid Minhas Road, Karachi [Pakistan]. Mob: 0092-300-9247085.
- Prof. Baig Ehsas, Dept. Of Urdu, University of Hyderabad, Prof. . C.R.Rao Road, P.O. Central University Campus,Hyderabad-500046. Mob : 09849256723.
- Saira Ghulam Nabi, [Pakistan].
- Prof. Qamar Jahan, 3- Bhikhanpur Hatia, Bhagalpur-812001 [Bihar]. PMob: 09431422270.
- Ali Imam,Former Principal:D.I.T.,Daryapur,Sabzi Bagh,Patna-800004 [Bihar].Mob:09905464164.
- Yaseen Ahmad, 17-2-1159/2,Waheed Colony, India function Hall Lane, Yakutpura, Hyderabad-500023 [A.P.]- Mob:07207287506 / 09848642909.

- Noor Shah, 14- Laldeo Colony, Gouripora Link Road, Rawalpora, Sri Nagar-190005[J&K]. Mob:09906771363.
- Kamal Ahmad,34/1D- Sir Syed Ahmad Road, Kolkata-700014. Mob: 09432593837.
- Raees Faima,FlatNo.B1-205,Image Arcade,Near NED University,Jamia Karachi, Post Office: Main University Road,Karachi,[Pakistan].Ph:3483543
- Muneera Surati,Zohra Agadi,Yari Road, Versova, Andheri[w]; Mumbai-400061.Mob:09920365583.
- Nusrat Shamsi, Anjuman Street, Domehla Road, Rampur-244901 [U.P.] Mob: 9045380276.
- Rajiv Prakash Sahir,20/84-Ring Road, Indira Nagar,Lucknow-226016.[UP] Mob:09839463095.
- Mosharraf Alam Zauqui, D-304, Taj Enclave, Geeta Colony, New Delhi-110031, Mob: 09310532452.
- Shahid Hinai , C/O Afroz Alam, Kuwait.
- Dr. Naushad Alam,Academy Of Professional Development Of Urdu Medium Teachers,Jamia Millia islamia , New Delhi-110025. email :naushadalam1@gmail.com
- Humayun Jameel, 69/8-G.E.C. Colony,Bandra[W], Mumbai- Mob: 09869687171.
- Md.Asadullah,30-Gulistan Colony,Near Panday Lawns,Jafar Nagr, Nagpur-440013 [M.S.]
- Rafeeq Anjum,Sun Flower Garden,Tower-2,Flat-1G, 74-Topsia Road, Kolkata-700046. Mob:09831123548.
- Aslam Mirza, Salim Complex, 1st Floor,Deodi Bazar, Opp.Burhan N.E. High School,Aurangabad-431001[MS]. Mob:09960053707.
- Md. Basheer Maler Kotalvi,Delhi Gate, Near Urdu Academy,Manto Street,Malerkotla-148023[Punjab]. Mob: 09417423788.
- Dr.Faisal Haneef 'Khayal',Founder & President:"Guzargaah e Khayal" Doha [Qatar].
- Dr. Atiqullah, Delhi. Mob:09810533212.
- Dr. Raunaque Shahri, Gol Ghar, Jharia, Dhanbad. Mob:09905185658.
- Md. Jabir Zaman,134-Sutlej Hostel,J.N.U. New Delhi-110067 Mob:+91-9999017802/Email: jabirzama@gmail.com

☆☆☆

وفیات[obituary] :

گزشتہ مہینوں میں پدم شری عشرت علی صدیقی [مجاہدِ آزادی و اُردو صحافت کے اہم ستون]، فاروق شیخ [معروف و منفرد فلم اداکار و اردو کے بے لوث پرستار]، ڈاکٹر عبید الرحمن [اردو کے ہونہار شاعر، نثر نگار اور مشہور زرعی سائنسداں]، حیدر نایاب [اوڈیشا کے معروف کہنہ مشق شاعر و انجینیر]، پروفیسر محمود الٰہی [اردو کے ممتاز محقق، ادیب، شاعر، نقاد، اتر پردیش اردو اکادمی کے نہایت کامیاب سابق چیئر مین اور اُردو کے مایہء ناز استاذ]، خشونت سنگھ [انگریزی کے صفِ اوّل کے صحافی، بے بدل کالم نگار، ادیب اور اردو کے رسیا]، صدیق مجیبی [اردو کے معتبر شاعر و مقبول استاذ]، ڈاکٹر منصور عمر [معروف شاعر، نقاد، ادیب اور اردو کے ہردلعزیز استاذ]، سیّد شکیل دسنوی [مشہور شاعر، ادیب اور انجینیر]، سید ضمیر حسن دہلوی [دہلی تہذیب کے نمایندہ و مقبول ادیب]، ڈاکٹر شمیم انہونوی [مشہور ادیب، محقق، صحافی، نسیم بک ڈپو کے وارث اور مقبولِ عام ادیب و ناول نگار نسیم انہونوی کے لائق فرزند] عبد الرب کاردار [معروف ڈرامہ نگار اور ماہرِ تعلیم]، اطہر سہارن پوری [نعت اور مرثیے کے شاعر]، مشتاق پردیسی [اردو و ہندی کے بزرگ صحافی]، صوفی عبد العزیز قادری [قادریہ و چشتیہ سلسلے کے صوفی شاعر اور مشہور صحافی و رسالہ 'ادب ساز' کے مدیر نصرت ظہیر کے والدِ بزرگوار]، سیّد ابو تراب خطائی ضامن [کرناٹک کے مشہور اردو شاعر، ادیب اور محقق] اور محبوب انور [مغربی بنگال کے کہنہ مشق بزرگ شاعر و ادیب اور عوامی مقبولیت کی حامل شخصیت] ہمیں داغِ مفارقت دے گئے جو پورے اُردو معاشرے اور بالخصوص تمام انسانی برادری کے لیے ناقابلِ تلافی خسارہ ہے! ادارہ 'آمد' اس دُکھ کی گھڑی میں پسماندگان سے اظہار، تعزیت کرتا ہے اور ان کے غم میں خود کو برابر کا شریک تصور کرتا ہے!! اللہ ربّ العزت مرحومین کو جوارِ رحمت میں بلند و بالا مقام عطا کرے، آمین۔ ☆☆☆

Editor, Printer, Publisher and Proprietor Azeema Firdausi Printed at Pakeeza Offset, Shahganj, Patna-6 and Published from Arzoo Manzil, Sheesh Mahal Colony, Alamganj, P.O. Gulzar Bagh, Patna-800007, Bihar [INDIA].

Joint Special Issue

Arpil-September 2014 Vol: 2, Issue : 7-8 RNI: BIHBIL 00337/04/1/2012-TC

Sehmaahi Aamad

सेहमाही आमद

A document of liberation against ideological dogmatism

Editor : Azeema Firdausi Honorary Editor : Khursheid Akbar

Printer, Publisher, Editor and Proprietor Azeema Firdausi printed at Pakeeza Offset, Shahganj, Patna - 800 006 and published from Arzoo Manzil, Sheesh Mahal Colony, Alamganj, Patna - 800 007 [Bihar] INDIA